صوبہ بہار کے اسکولوں و کالجوں میں سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالۂ ندیم گیا

یعنی

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

قیمت سالانہ :- للعہ
قیمت ششماہی :- عہ/
فی پرچہ چھ آنے

مرتبہ :- سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۴ | ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۷

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

نیا سال شروع ہوا۔ ندیم نے بھی اپنی عمر کے ایک اور سال کو ختم کیا۔ اور اپنی زندگی کی گیارھویں منزل میں قدم رکھا۔ ندیم نے خصوصاً صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم، اور زبان کے پھیلانے اور نوجوان ادیبوں کو ایک راہ پر لگانے کی کیا خدمتیں انجام دی ہیں یہ صوبہ والوں کے سوچنے کی چیز ہے۔ ندیم کا پہلا پرچہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت صوبہ سے کوئی دوسرا رسالہ نہیں نکلتا تھا۔ اس گیارہ سال کی مدت میں بہت سے ہفتہ وار اور ماہوار نکلے، کچھ ایک سال، دو سال اور تین سال تک نکلے بھی، مگر پھر آگے نہ جا سکے۔ یہ ندیم کیلئے کوئی فخر کی بات نہیں کہ وہ اپنی زندگی کی گیارھویں منزل میں پہنچ گیا۔ مگر اس کی سخت جانی اس لائق ضرور ہے کہ اس کے کارکنوں کی ہمت بڑھائی جائے۔

ندیم کی امداد آپ دو طریقوں سے کرسکتے ہیں۔ ایک تو اس کے خریداروں کا دائرہ وسیع کیجئے۔ اور دوسرے یہ کہ اپنی چھپنے والی چیزیں اس کے پریس میں چھپوائیے۔ ندیم نے ادھر چند مہینوں کے اندر لکھائی اور چھپائی میں جو نمایاں ترقی کی ہے، وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اب اس کی لکھائی چھپائی خدا کے فضل سے ایسی ہے کہ ہم دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے اور بالواسطہ ندیم کو مدد پہنچانے کی دعوت دیں۔ تاکہ کاغذ اور چھپائی کے دوسرے سامانوں کی دن پر دن بڑھنے والی گرانی کا مقابلہ کیا جا سکے۔

مسلم لیگ کی نئی زندگی کی داغ بیل لکھنؤ میں پڑی جانے والے جانتے ہیں کہ مشہور قومی کارکن چودھری خلیق الزماں کے ہاتھوں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے ایک اور نیا قدم اٹھایا ہے۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے "اسلامی نظام" کی تشکیل کی آواز اٹھائی گئی ہے۔ چنانچہ یو پی مسلم لیگ نے ایک کمیٹی بنائی تھی کہ وہ اس نظام کا ایسا نقشہ تیار کرے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور بین الاقوامی ضروریات و تفصیلات پر حاوی ہو۔ اس کمیٹی کا جلسہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی عمارت میں نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور اس نے ایک سب کمیٹی منتخب کی، جس کے ارکان میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا آزاد سبحانی اور نواب صاحب چھتاری ہیں، اس موقع پر مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہوتی ہے، کاش کہ آج وہ

ہم میں موجود ہوتے تو اس جماعت کیلئے بہترین مشیر کار ثابت ہوتے ——— ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کہا گیا ہے کہ وہ سیاست، معیشت اور حکومت کے متعلق مغربی نظریے اور خیالات کا مواد فراہم کرکے اس کو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے سپرد کریں تاکہ وہ دوسرے مفکرین سے مشورہ کرکے "اسلامی نظام" کا مفصل خاکہ ایک مستقل تصنیف میں تیار کرکے کمیٹی میں پیش فرمائیں۔ دیکھنے میں یہ بات شاید معمولی ہو اگر اس وقت کی یہ کوششیں ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا بنیادی پتھر قرار پا سکتی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ تحریک تمام حوادث سے گذر کر صحیح راہ پر آئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ اجتماعی زندگی کا مرحلہ ہمیشہ کیلئے طے ہو جائے

دن آے دن وہ واقعات پیش آتے جائیں گے جن کی تازہ مثال کلکتہ ہائیکورٹ کا ایک تازہ فیصلہ ہے۔ جس کے رو سے ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نومسلمہ مجبور کی گئی ہے کہ وہ اپنے پہلے ۔ ۔ ۔ ۔ غیر مسلم شوہر کیساتھ قانون کیمطابق زوجیت کی زندگی گذارے۔ کلکتہ ہائیکورٹ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ تصریح کردی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ذاتی معاملات کیلئے بھی اسلامی قانون رائج نہیں یعنی وہ اپنے "پرسنل لا" میں بھی آزاد نہیں ہیں۔ ان کے نکاح، طلاق اور وراثت کے فیصلے غیر اسلامی قوانین کیمطابق ہوں گے۔ اور مسلمانوں کیلئے انھیں ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت مسلمانوں کیلئے ایک لمحہ بھی قبول کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ امید ہے کہ اسلامی نظام کا جو خاکہ ان اکابر کے ہاتھوں تیار ہوگا، اس میں اس قسم کے مسائل بھی ہمیشہ کیلئے طے ہو جائیں گے اور متفقہ طاقت سے ان کو منوا لیا جائیگا۔

اسلامی انسائیکلو پیڈیا، جو یورپ کے ممتاز اہل علم کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی۔ اور یورپ کی تین زبانوں فرانسیسی، جرمن اور انگریزی میں قسط وار شائع ہوئی تھی، تقریباً چار سال ہوئے کہ اس کا مستند عربی ترجمہ مفید حاشیوں کیساتھ قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوا ہے یہ دیکھکر دلی خوشی ہوئی کہ ہمارے صوبہ کے چند بلند ہمت اہل علم نے اس عربی ترجمہ سے اسکے اردو ترجمہ کو شائع کرنیکی ہمت باندھی ہے۔ اس مقصد کیلئے انھوں نے ایک پریس قائم کیا ہے۔ اور ایک سو صفحہ کے حجم کیساتھ ہر دو ماہ پر اس کے ایک نمبر کو شائع کرنیکا قصد رکھتے ہیں۔ چنانچہ پہلا نمبر ماہ جولائی میں شائع ہوا ہے اس پر تفصیلی نظر ہم کسی آئندہ ماہ میں ڈالیں گے۔ سردست ضرورت ہے کہ ملک کا اردو داں طبقہ اسکے کارکنوں کی ہمت بڑھائے۔ اور اس کے خریداروں کی مستقل فہرست میں نام لکھائے جائیں۔ اس کی سالانہ قیمت تین روپے ہوگی۔ اور ہر نمبر کی قیمت ۸ رکھی گئی ہے۔ اگر یہ کام اس طریقہ سے انجام پا گیا تو اردو میں بغیر کسی بڑے سرمایہ کے کسی بڑے کام کو شروع کرکے اسکے ختم کرنے کی ستایش کے لائق مثال قائم ہوگی۔ خریداری کیلئے "جدید پریس بیگم پور، پٹنہ سٹی" کے پتہ سے خط وکتابت کی جائے

بزرگوں کے لطیفے بھی سبق آموز ہوتے ہیں۔ سر سید مرحوم کا ایک مشہور لطیفہ ہے کہ ایکمرتبہ ایک طالبعلم انکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کی کہ جناب والا میں مشہور ہونا چاہتا ہوں، کوئی صورت بتائیے۔ انھوں نے فرمایا کسی مشہور آدمی کے خلاف لکھنا شروع کردو۔ تم خود بخود مشہور ہو جاؤگے یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ تقریباً مہینہ دو مہینے کے بعد کوئی رسالہ سید صاحب کی خدمت میں پہونچا۔ ایک ہمنشین نے ایک نوخیز طالبعلم کی ایک تحریر کا ذکر کیا

جو سید صاحب کی مخالفت میں تھی۔ سید صاحب نے دیکھتے ہی برجستہ فرمایا اس نے میرے ہی تیر سے مجھ ہی کو نشانہ بنایا۔ پھر حاضرین سے مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا۔ اُس وقت کے وہ نوخیز نوجوان اس وقت کے سن رسیدہ بزرگوں میں ہیں اور ملک میں وہ واقعی کسی نہ کسی طرح کی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مگر آج تک وہ اس قسم کی نت نئی حرکتوں سے باز نہیں آئے ہیں۔ اور نہ وہ کوئی مستحکم منزلت حاصل کر سکے ہیں۔

آج کل اتفاق سے ایک ایسے ہی تعلیم یافتہ نوجوان کو بعض سلیقہ مند دوستوں کی صحبت کے فیض سے قلم پکڑنے کا بڑا اچھا سلیقہ آگیا ہے۔ انھوں نے بھی تحریروں میں بڑے ادیبوں کی تحریروں پر اعتراض کرنے کا شیوہ اختیار کیا ہے اور اپنا قلم چلانے کیلئے انھوں نے زمین بھی نرالی منتخب کی ہے یعنی سنین کا اختلاف۔ مثلاً ایک مشہور صاحب علم (جنھیں اسوقت ہندوستان کے علمی حلقہ میں بلند رتبہ حاصل ہے) کے ایک مضمون میں ذکر آیا ہے کہ سید انشا کی دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ ہے۔ اس پر وہ نوخیز مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں۔

"سید انشا کی دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ نہیں، یہ سن (؟؟) تکمیل ہے کتاب کی ابتدا شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی، جن کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ہی دریائے لطافت کا دھارا بہہ نکلا تھا۔"

اب یہ صاحبزادے سے کوئی پوچھے کہ غریب مضمون نگار نے دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ لکھا تھا یا یہ لکھا تھا کہ اس تصنیف کا آغاز ۱۲۲۲ھ میں ہوا جس کی تردید میں لاحاصل عبارت لکھنے اور معلومات کے اظہار کی یہ نمایش کرنی پڑی۔ پھر اسی طرح غیر ضروری معلومات کے بے جوڑ اور بے محل استعمال اور اظہار سے پورا مضمون بھرا پڑا ہے۔

ہمارے نوخیز مضمون نگار کو خود فریبی و خودنمائی کیساتھ ایک اور بھی عجیب قسم کی "دونمائی" کا مرض لاحق ہے جسکو "پدرنمائی" سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ قریب قریب اپنے ہر مضمون میں کسی "نادر" قلمی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں جس کا عمدہ نسخہ "حضرت مولانا ...... صاحب قادری استاذ (اور کبھی پروفیسر) دینیات وحدیث جامعہ (یعنی مدرسہ) ......" کے کتبخانہ میں انکی نظر سے ضرور گذرا ہے۔ گویا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ موصوف علم کی پیاس بجھانے کیلئے مولانا موصوف کے کتبخانہ کے سرچشمہ میں جا پہنچتے ہیں۔ اور وہاں اتفاق سے وہ قلمی کتاب انکی نظر سے گذر جاتی ہے۔ اور اس مضمون کے لکھتے وقت انکی یادداشت سے اس مطالعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور بر سبیل تذکرہ وہ اسکو ذکر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مولانا موصوف ہی کے صاحبزادے ہیں۔ اسی گھر میں رہتے سہتے ہیں۔ اور ایسی کتاب خانہ کی خدمت شرعاً جائز وراثت ہیں۔ مگر ذکر ایسے تعلق سے آتا ہے کہ گویا ان دونوں اہل علم میں محض علمی روابط قائم ہیں۔ اور ان کے کتبخانہ میں بجز قلمی کتابوں کے مطالعہ کے اور کبھی کی کوئی پدرشتہ نہیں ہے۔

ہمیں ان نوجوانوں کے حال پر رحم آتا ہے جو تھوڑی بہت صلاحیت پیدا ہو جانیکے باوجود کسی اچھی راہ پر لگنے کی بجائے کسی ایسے راستہ پر پڑ جاتے ہیں جس سے انکی آئندہ ترقیاں مسدود ہو جا سکتی ہیں۔ ابھی ہم اسی صوبہ کے ایک آزادی صاحب کمال کی "تحقیقی بحثوں" و نفسیاتی ابتہاجیت لطیف تصویرات اور تحقیقاتی پسندی" سے کچھ کم مستفید نہ ہوئے تھے کہ انکی جانشینی کیلئے یہ دوسرے صاحب فضل پر تولنے لگے۔ آپکے نقطہ انتخاب میں بھی ان دونوں نے اپنی ہم مذاقی کا ثبوت دیدیا ہے۔ اب دیکھیں اس قران السعدین سے آگے چلکر کیسی کیسی گلکاریاں منصۂ شہود پر آتی ہیں۔

ہم عزیز موصوف کے والد محترم کو جو ہمارے صوبہ کے لائق احترام اہل علم میں ہیں ان سطور کے ذریعہ سے خاص طور پر مخاطب کرتے ہیں کہ وہ اپنے صاحبزادے کی خبر لیں۔ اس طرح بگٹٹ چھوڑ دینا اور انکو ملک کے مستند اہل علم پر نا ملائم بلکہ غیر مہذب طرز انشا میں مضامین لکھنے کی اجازت دینا نہ علم کی خدمت ہے نہ دین کی اور نہ انکے لخت جگر کے حق میں کسی حیثیت سے مفید ہے۔ عزیز موصوف میں صلاحیتیں موجود ہیں کہ اگر وہ اچھی راہ پر لگائے جائیں تو ان کے ذریعہ آئندہ مفید خدمات انجام پائیں۔ ہمیں امید ہے کہ مولانا موصوف اس مخلصانہ گذارش پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

مقالات

حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ

از
جناب محمود بریلوی ریاست منگرول

حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۹ء میں، افغانستان میں، کابل کے قریب بمقام اسدآباد، پیدا ہوئے۔ ان کا یہ مولد خود ان کے قول کے مطابق ہے، ورنہ ایرانی تو انھیں اپنی ہی قوم کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اسی نام کے مقام پر پیدا ہوئے تھے جو ایران میں شہر ہمدان کے متصل واقع ہے۔ اگر وہ واقعی ایرانی النسل تھے تو کوئی صحیح وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے خود کو افغانی کہلانا کیوں پسند کیا، کیونکہ ان کی اوائل عمری کے بیشتر حالات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کے اس زمانۂ عمر کے متعلق ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں وہ زیادہ تر خود انھیں کی زبان و قلم سے وابستہ ہیں۔ البتہ ان کی آخر عمر کے حالات کے متعلق کافی مواد موجود ہے۔ انگریزی زبان میں ان کا بہترین سوانح نگار پروفیسر ای جی براؤن اپنی مشہور تصنیف "انقلاب ایران" (Persian Revolution) کے صفحات ۳، ۴ پر رقم طراز ہے کہ "انھوں نے خود کو بہ نسبت ایرانی کے افغانی کہلانا یوں زیادہ پسند کیا کہ اول تو وہ خود کو دوسروں کی نظروں میں کثر ٹُنی ظاہر کرنا مناسب سمجھتے تھے، دوئم یہ کہ وہ ایران کی برائے نام حفاظت کو اپنے لئے بے معنی جانتے تھے۔ اور اس سے محترز رہنے میں مصلحت خیال کرتے تھے جیسا کہ بعد ازاں واقعات نے ثابت کر دکھایا۔ بہر نوع صداقت کچھ بھی ہو وہ 'الافغانی' کے نام سے موسوم ہو گئے۔" مذکورہ بالا انگریزی تصنیف کے صفحہ ۴۰۲ پر نوٹ کے ضمن میں یہ حوالہ بھی موجود ہے کہ ڈبلیو ایس بلنٹ نے اپنی ڈائری (مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۸۸۳ء) میں لکھا ہے کہ "سید جمالؒ کا خاندان عربی النسل تھا۔" محمد رشید رضا مصری مصنف نے "المنار" باب ہشتم صفحہ ۳۸۹ (۱۹۰۵ء) میں لکھا ہے کہ "سید جمالؒ باوجود ایک نہایت اچھے عربی مقرر و ادیب ہونے کے اپنی عربی تقریر و تحریر میں ایرانی زبان کے اثرات سے کبھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔"

موصوف کے والد کا نام نامی سید صفدر تھا، جو خود تو نادار و غیر تعلیم یافتہ تھے مگر اپنا سلسلۂ نسب مشہور و معروف محدث اسلام السید علی الترمذیؒ سے ملاتے تھے (جنکا انتقال ۹۹۳ھ میں ہوا تھا) اور ان کے توسط سے خود کو حضرت حسینؓ شہید کربلا کی اولاد میں بتاتے تھے۔

پانچ سے لیکر دس کی عمر تک حضرت جمال الدین افغانیؒ نے اپنے وطن کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ زاں بعد انھوں نے ایران و افغانستان کے مختلف مقامات میں رہ کر تحصیل کی۔ حتیٰ کہ اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم نقلیہ و عقلیہ میں انھوں نے کمال حاصل کر لیا۔ عربی صرف و نحو، لسانیات، علم کلام، تاریخ اسلام، الہیات، تصوف، منطق، فلسفہ، علم موجودات، ریاضی، ہیئت، طب، علم تشریح الاعضا، اور علم ما بعد الطبعیات وغیرہ پر انھیں کامل عبور تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور یہاں وہ قریباً ڈیڑھ برس مقیم رہے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں انھوں نے انگریزی زبان بھی سیکھی تھی۔ پشتو، فارسی، ترکی اور عربی میں تو وہ پہلے ہی سے ماہر تھے۔ ہندوستان سے وہ مکہ معظمہ گئے جہاں وہ سنہ ۱۸۵۷ء میں پہنچے۔ وہاں سے وہ افغانستان آکر امیر دوست محمد خاں کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ وہ امیر کے ساتھ اس وقت بھی تھے جبکہ اس نے ہرات کا محاصرہ اور آخر کار اسے فتح کیا تھا۔ ہرات پر ان دنوں امیر کے چچیرے بھائی اور داماد سلطان احمد شاہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور شیر علی تخت افغانستان پر متمکن ہوا۔ اس کے تخت پر بیٹھتے ہی اس کے اور اس کے تینوں بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ حضرت سید جمال الدین نے ان میں سے ایک بھائی محمد اعظم کی رفاقت کی، جو سیکڑوں مصائب برداشت کرنے کے بعد بالآخر امیر افغانستان ہوا۔ اور حضرت جمال الدین کو اس نے اپنا وزیر اعظم بنایا۔ جن کی عمر اسوقت ستائیس ۲۷ سال کی تھی۔ محمد اعظم کے امیر ہوتے ہی پھر خانہ جنگی کی تجدید ہو گئی۔ اور شیر علی انگریزوں کی مدد سے دوبارہ تخت و تاجِ افغانستان کا مالک بن بیٹھا۔ شکست خوردہ محمد اعظم رو بفرار ہوا اور غریب الوطنی کی ہی حالت میں جاں بحق ہوا۔

امیر شیر علی نے حضرت جمال الدینؒ کی بظاہر تو کوئی مخالفت نہیں کی کیونکہ اول تو وہ سید تھے، دوسرے یوں بھی ان کا جمہور میں کافی اثر و اعتقاد تھا، مگر در پردہ وہ ان کی جان کا دشمن ہو گیا۔ دریں حالات حضرت سید نے مصلحتاً افغانستان سے ہجرت کی اور سنہ ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کی راہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حکومت ہند نے ان کی پذیرائی عزت سے کی مگر انھیں یہاں رہ کر سیاسی امور میں حصہ گیر ہونے اور مسلمان قائدین سے تبادلۂ خیال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ ایک ہی ماہ کے قیام کے بعد وہ ہندوستان سے آگے روانہ ہو گئے۔ حکومت ہند نے سرکاری جہاز میں انھیں سوئز تک پہنچایا جہاں سے وہ قاہرہ پہنچے مگر صرف ۴۰ روز مقیم رہے۔ اس مختصر دوران قیام میں انھوں نے متعدد بار ازہر یونیورسٹی کا دورہ کیا۔ اور وہاں کے معلمین و متعلمین کو ہدایات و نصائح سے مستفیذ فرمایا۔

یہاں سے وہ بجائے مکہ شریف جانے کے قسطنطنیہ چلے گئے جہاں سلطان عبد الحمید، وزرائے سلطنت اور دیگر عمائد و اکابرین نے ان کا غیر معمولی جوش و مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔ جیسا کہ ان کا معمول تھا انھوں نے فوراً نہایت انہماک اور تندہی سے اپنے مذہبی و سیاسی خیالات کی ترویج شروع کر دی اور بہت جلد اپنا رسوخ قائم کر لیا۔ ان کی اس قدر جانک اور غیر معمولی ہر دلعزیزی نے شیخ الاسلام کو ان سے بدظن و متنفر کر دیا۔ سنہ ۱۸۷۰ء کے اختتام پر انھوں نے ناظم دار الفنون یعنی ڈائرکٹر ٹرکش یونیورسٹی کی دعوت پر اساتذہ و طلبا کے روبرو صنعت و تجارت کی اہمیت پر ایک لکچر دیا۔ حالانکہ یہ لکچر

انھوں نے سلطنت کے بعض سربرآوردہ حکام کو دکھایا تھا۔ اور ان کی رضامندی کے بعد پڑھا تھا مگر شیخ الاسلام نے ان کے بعض جملوں پر سخت اعتراض کیا اور ان کو اسلام کی شان کے منافی بتایا۔ پبلک پریس نے شیخ الاسلام کا ساتھ دیا۔ حضرت جمال نے دنداں شکن جوابات دیئے۔ اور ایسا شور و شر پھیلا کہ ترکی حکومت نے امن و امان کی مصلحتوں کے پیش نظر ان کو ملک چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ ترکی سے وہ واپس مصر گئے اور قاہرہ میں ۲۲ر مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے۔ مصر میں حضرت جمال کا زیادہ عرصہ تک قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا، لیکن ریاض پاشا کی وساطت و مساعی سے جو ان دنوں وزیر اعظم تھے حکومت مصر نے ان کا دس مصری پونڈ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور انھیں مصر کو اپنا مستقر بنانا پڑا۔ یہاں طلبا کا ان کے دروازے پر ہجوم رہنے لگا، جو الٰہیات، فلسفہ، سیاست، قانون، ہیئت اور تصوف وغیرہ میں حضرت سید سے درس لیتے تھے۔ انھوں نے نوجوان اہل قلم کی ایک جماعت تیار کرنے کا ارادہ کیا جو ان کی تعلیمات وعقائد کو نزدیک و دور پھیلائے اور اس غرض سے انھوں نے ہونہار طلبا کو منتخب کیا اور انھیں اس فن کی تعلیم و تربیت دینی شروع کی۔ انھوں نے خود بھی مصر کے سیاسی معاملات میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش سے ملک مصر کو اجنبیوں کی مداخلت بیجا و تسلط کے خلاف ابھارا اور جو مضامین اس سلسلہ میں انھوں نے اخبار میں شائع کرائے ان سے ان کے انگریزوں کے خلاف جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔

آٹھ سال کی طویل مدت تک مصر اور اہالیان مصر کے مفاد کی خاطر ان کی یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ آخر کار ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ پرانے خیال کے علما، ان کے فلسفیانہ و جدید خیالات کے باعث مخالف اتر آئے اور حکومت مصر چونکہ اس وقت یورپین طاقتوں خصوصاً انگریزوں کے پنجہ میں گرفتار تھی۔ ان کی سیاسی کارروائیوں سے خوف زدہ ہو گئی کیونکہ مصر کے برطانوی حکام حضرت سید کے وجود کو نہایت خطرناک سمجھتے تھے۔ حضرت جمالؒ کے مصر میں دوران قیام کے اندر ملک کی مالی واقتصادی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ خدیو اسمٰعیل پاشا کی فضول خرچیوں نے خزانہ خالی کر دیا۔ اور حکومت یکسر دیوالیہ ہو گئی تھی۔ بالآخر یورپین طاقتوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک مصر کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی۔ نتیجتاً خدیو اسمٰعیل پاشا کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا اور ۲۵ر جون ۱۸۷۹ء کو اس کا بیٹا توفیق پاشا تخت پر بیٹھا۔ توفیق حضرت سیدؒ کا پہلے بہت خیال کرتا تھا۔ اس نے حضرت جمال الدین کے ہوا خواہوں کو وعدہ دیا تھا کہ جب وہ پاشا ہو گا تو ملکی اصلاح کی خاطر ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن خدیو پاشا ہوتے ہی اس نے ستمبر ۱۸۷۹ء میں حضرت جمال الدینؒ کو مع ان کے ایرانی شاگرد ابو تراب کے مصر سے باہر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت جمال الدینؒ نے توفیق پاشا سے وعدہ لے لیا تھا کہ جب وہ خدیو ہو گا تو ملک کو دستوری طور پر چلائے گا۔ اور کاروبار سلطنت کے لئے انگلستان اور فرانس کی طرح پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لائے گا۔ مگر انھیں دونوں یورپین سلطنتوں نے اس اصلاح کی سخت مخالفت کی اور ما

رعایا کو بدستور شخصی حکومت کی غلامی میں مبتلا رکھنا چاہا۔ کیونکہ اس طرح ان کا اقتدار غیر محدود وقت تک قائم رہنا ممکن تھا۔ ای جی براؤن نے اپنی تصنیف "انقلاب ایران" (Persian Revolution) کے صفحہ ۸ پر لکھا ہے کہ "جمال کی سیاسی تحریکات سے گھبرا کر حکومت برطانیہ نے نوجوان خدیو پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور اس طرح جمال کو مصر چھوڑنا پڑا۔"

مصر سے نکل کر حضرت جمال پھر ہندوستان آئے اور حیدرآباد دکن میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں رہ کر انھوں نے فارسی زبان میں ایک معرکۃ الآرا کتاب اسلام کی موافقت میں اور جدید خیال لوگوں کے حملوں کی مدافعت کیلئے جو وہ اسلام پر کرتے تھے لکھی۔ یہ کتاب ردّ دہریہ (The Refutation of The materialists) کے نام سے شائع ہوئی۔ ایس جی ولسن نے اپنی تصنیف "جدید اسلامی تحریکات" کے صفحہ ۱۷ پر لکھا ہے کہ "حضرت جمال الدین افغانی کی ایک تصنیف جو مسئلہ خلافت پر مبنی تھی حکومت ہند نے ضبط کر لی تھی۔"

۱۸۸۲ء میں "تحریک شبان المصریہ" Young Egyptian movement جس کی حضرت سید روح رواں رہے تھے "عربی بغاوت" کی شکل میں مختتم ہوئی اور آخر کار برطانیہ عظمیٰ کا قبضہ مصر پر ہو گیا۔ اس زمانہ میں حکومت ہند نے حضرت جمال کو کلکتہ میں نظر بند رکھا۔ مگر جب مصر کی قومی تحریک کا زور ٹوٹ گیا تو انھیں ہندوستان چھوڑنے کی اجازت دیدی گئی۔ ہندوستان سے وہ لندن گئے جہاں وہ کچھ روز ٹھہرے اور پھر وہاں سے پیرس چلے گئے جہاں وہ تین سال تک مقیم رہے۔

پیرس میں رہ کر انھوں نے نہایت زور و شور سے اپنے سیاسی خیالات کا بین الاقوامی پروپگنڈا شروع کیا۔ یہاں کے قیام میں انھوں نے کسیقدر فرانسی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ ان کے سیاسی خیالات جن کی اشاعت فرانسیسی پریس میں ہوئی ان یورپین حکومتوں کی بدرجۂ غایت توجہ کا باعث ہوئے۔ جو اسلامی ممالک میں سیاسی دلچسپیاں رکھتی تھیں۔ ایسی یورپین حکومتوں میں برطانیہ عظمیٰ پیش پیش تھا۔ ۱۸۸۴ء میں حضرت سید جمال الدین افغانی سے، ان کی طلب پر انکے دوست اور سابق شاگرد محمد عبدہ بھی مصر سے یہاں آملے، جو عربی بغاوت میں ماخوذ ہونے کے الزام میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ پیرس میں دونوں استاد شاگرد نے ملکر ایک ہفتہ وار عربی اخبار جاری کیا جس کا مقصد اسلامی دنیا کو مغربی طاقتوں کے استعمارانہ استبداد کے خلاف ابھارنا تھا۔ حضرت سید جمال کے جو مضامین اس میں شائع ہوتے تھے ان کی زبان اور لہجہ انگریزوں کے سخت خلاف ہوتا تھا۔ اس اخبار کا پہلا نمبر ۵ جمادی الاولی ۱۳۰۱ھ المطابق ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔ اس کے صرف اٹھارہ نمبر شائع ہوئے۔ آخری نمبر ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کا نام "العروۃ الوثقیٰ" فرانسیسی زبان میں Le Lien Indissoluble اور انگریزی میں The Indissoluble Bond تھا۔ برطانیہ عظمیٰ نے اس اخبار کا داخلہ ہندوستان اور مصر میں بند کر دیا تھا۔ محمد رشید رضا "المنار" صفحہ ۵۵

میں کہتے ہیں کہ "اگر یہ صحیفہ جاری رہتا تو عام اسلامی بغاوت کا بہت امکان تھا۔ یہ جریدہ ایک خفیہ جماعت کا آرگن تھا، جسکا نام بھی وہی تھا جو اس پرچہ کا تھا۔ حضرت سید جمال ؒ نے اس سائٹی کی بنا ڈالی تھی۔ اس جماعت میں ہندوستان، مصر، شمالی افریقہ اور شام وغیرہ ممالک کے مسلمان شامل تھے اور اس کے اغراض میں مسلمانوں کو متحد کرنا، ان کو جمود و خواب غفلت سے بیدار کرنا اور ان کو یورپین اقوام کی غلامی و تسلط سے آزاد کرانا تھا۔" مگر اس انجمن کا فوری قصد مصر اور سوڈان کو برطانیہ کے قبضہ سے آزاد کرانا تھا۔ حضرت سید جمال ؒ نے مکہ معظمہ میں بھی ایک "پان اسلامک سوسائٹی" "ام القریٰ" کے نام سے قائم کی تھی جس کا مقصد تمام اسلامی دنیا کے لئے ایک خلیفۃ المسلمین کا انتخاب تھا۔ مگر یہ سوسائٹی ایک سال کے اندر ہی اندر سلطان عبد الحمید کے حکم سے توڑ دی گئی ("انقلاب ایران" صفحہ ۱۵، "جدید اسلامی تحریکات" صفحہ ۷۲) حالانکہ سید جمال افغانی ؒ کا عربی اخبار جو انھوں نے محمد عبدہ کے ساتھ پیرس سے شائع کیا تھا، زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا مگر اس نے تمام اسلامی دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہلکہ ڈالدیا تھا۔ اور مائل بہ تنزل مسلمانان اقوام میں قومی جوش و افتخار کا احساس پیدا کردیا تھا۔ اس اخبار کے بند ہونے کے بعد حضرت سید ؒ لندن گئے جہاں وہ ایک قلیل مدت تک مقیم رہ کر برطانی مدبروں سے سوڈان میں خروج مہدی کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال کرتے رہے یہ سلسلۂ جنبانی ۱۸۸۵ء میں کی گئی تھی ("انقلاب ایران" صفحہ ۴۰۲، "مشاہیر" صفحہ ۵، "المنار" صفحہ ۵۴) برطانوی وزیر خارجہ نے حضرت سید جمال الدین افغانی ؒ اور محمد عبدہ کے انتداب کے نتیجہ کے طور پر سوڈان کی تسخیر کے خیال کو ترک کر دیا تھا۔ ڈبلیو ایس بلنٹ اپنی تصنیف "انقلاب ایران" کے صفحہ ۴۰۳ پر رقم طراز ہے کہ "جمال ؒ اسلئے انگلستان آیا تھا کہ برطانیہ سے مہدی سوڈانی کی صلح کرادے۔ انگلستان میں گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ جمال ؒ ایک خاص برطانی مشن کی مشایعت میں قسطنطنیہ جائے اور وہاں سلطان عبد الحمید اور حکومت ترکی کو راضی کرکے انگلستان اور ترکی میں مصالحت کرادی جائے جس کی شرائط میں سے ایک شرط برطانیہ کی مصر سے دستبرداری بھی تھی۔ اور دوسری شرط یہ تھی کہ روس کے خلاف ترکی، ایران، اور افغانستان برطانیہ کے حلیف بن جائیں۔ مگر آخری لمحہ میں جبکہ برطانی مشن تیار تھا اور جمال نے ٹکٹ بھی خرید لیا تھا برطانوی مدبرین کی رائے پلٹ گئی۔ چنانچہ جمال ؒ سخت شکستہ دل اور ناراض ہو کر ماسکو چلا گیا اور انگلستان کے خلاف ایک روسی ترکی معاہدہ کا انتظام کرنے لگا۔" غرضکہ حضرت جمال ؒ لندن سے ماسکو اور وہاں سے سینٹ پیٹرز برگ گئے۔ ان دونوں مقامات (یعنی ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ) پر ان کا خیر مقدم بڑے زور و شور سے کیا گیا۔ یہاں سے بھی حضرت جمال ؒ نے اخبارات میں افغانستان، ایران، ترکی اور انگلستان کے متعلق جو سیاسی مضامین شائع کرائے ان کا دنیائے سیاست میں بڑا شہرہ ہوا۔ روس میں وہ چار سال سے زیادہ عرصہ تک مقیم رہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے اس درمیان میں وہ ایران بھی گئے۔

۱۸۸۹ء میں جبکہ حضرت سید جمال ؒ شاہ ایران کی طرف سے ایک خفیہ مشن پر میونخ گئے ہوئے تھے، انھیں وہاں شاہ ناصر الدین والئی ایران ملے جو وہاں بغرض سیر و سیاحت آئے تھے۔ شاہ ایران نے انھیں ترغیب دی کہ وہ ایران کی

وزارت عظمیٰ قبول کرلیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دوسرا موقع تھا جبکہ حضرت جمالؒ شاہ ایران کے وزیر ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں آپ کو بذریعہ تار شاہ ایران نے بلایا اور وزیر جنگ بنا دیا تھا۔ ان کے تبحر علمی، بے پناہ قوت تقریر، اور اخوت اسلامی کے جذبے نے ان کو ایران کے ہر طبقہ میں بیحد عزیز بنا دیا تھا۔ ان کی اس روز افزوں ہر دلعزیزی سے شاہ خوف زدہ و بدگمان ہوگیا تھا جس پر حضرت جمالؒ نے ملک چھوڑ دینا قرین مصلحت سمجھا اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے بہانہ سے روس چلے گئے تھے۔

جب حضرت جمالؒ شاہ کی درخواست پر ۱۸۸۹ء میں دوبارہ ایران آئے تو باشندگان ایران نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا کیونکہ اس مبارک ہستی کی دوبارہ آمد سے ان کی یہ توقعات تازہ ہوگئی تھیں کہ ایران کی سیاسی ابتری بہتر صورت اختیار کرسکے گی۔ حضرت سیدؒ وزیر اعظم ہوگئے اور کچھ عرصہ تک ان کے اور شاہ کے درمیان اچھے تعلقات رہے مگر شاہ کی بدظنی پھر عود کرآئی اور حضرت جمالؒ نے پھر ایران چھوڑنے کی اجازت مانگی مگر اس مرتبہ اجازت نہ ملی۔ اب ان کا جام صبر لبریز ہوچکا تھا۔ انھوں نے علی الاعلان شاہ کی مخالفت کا آواز بلند کیا اور ملک سے اپیل کی کہ اس کو معزول کردیا جائے۔ ان کے متبعین اور ہمدرد لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ ان کے انھیں ایرانی پیروؤں میں بالآخر ایرانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جس نے آگے چلکر قومی انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ پیروان جمالؒ میں سے ایک نے یکم مئی ۱۸۹۶ء کو شاہ ایران کو قتل کردیا۔ قاتل کا نام مرزا رضا کرمانی تھا اور عدالت میں جرح کے وقت اس نے اقبال کرلیا تھا کہ اس قتل کے مشورے میں حضرت سیدؒ اس کے شریک تھے۔ (انقلاب ایران ص۶) حضرت جمالؒ جب لندن اور قسطنطنیہ میں مقیم تھے اس زمانے میں انھوں نے شاہ ایران کی اخبارات میں بیحد مخالفت کی تھی اور اپنی تقاریر میں بھی اس کے خلاف بولا کرتے تھے۔ جب شاہ ایران کو مار ڈالا گیا تو حکومت ایران نے حضرت جمالؒ اور ان کے ساتھیوں کو جن پر اس قتل کی مشورت کا شبہہ کیا جاتا تھا حکومت ترکی سے مانگا مگر سلطان ترکی نے حضرت جمالؒ کو دینے سے انکار کردیا۔ مگر دیگر تینوں اشخاص واپس ایران بھیجدیئے گئے جن کو تبریز میں خفیہ طور سے قتل کردیا گیا ("انقلاب ایران" ص۸)

ہاں تو شاہ ایران نے آخرکار مسجد کا بھی احترام نہ کرتے ہوئے حضرت جمالؒ کو وہاں سے گرفتار کرالیا۔ حالانکہ گرفتاری کے وقت حضرت سیدؒ علیل اور صاحب فراش تھے۔ گرفتاری کے بعد نہایت ذلت کے ساتھ شاہ کے حکم سے انھیں ترکی حد پر بیجا کر چھوڑ دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۹۰ء کے اواخر یا ۱۸۹۱ء کے اوائل کا ہے۔ زاں بعد حضرت جمالؒ بصرہ میں اس وقت مقیم رہے جب تک ان کی تندرستی مکمل نہ ہوگئی۔ اور وہاں سے لندن پہنچے۔ لندن سے وہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے۔ اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ اگرچہ وہ ترکی میں نہایت عزت و احترام سے رہتے تھے اور سلطان عبدالحمید ان کی بہت وقعت کرتا تھا مگر فی الحقیقت وہ ایک نوع کی حراست میں تھے۔ ان کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو ہوا۔ ان کے جبڑے میں سرطان کا زخم ہوگیا تھا۔ جو گردن تک پھیل گیا تھا۔ آخرکار اس مہلک مرض نے اس عجیب و غریب انسان کی جان لیکر چھوڑی۔ حضرت جمالؒ کے ایرانی احباب کا بیان ہے کہ اگرچہ مرحوم کا مرض

بظاہر سرطان تھا مگر درحقیقت ان کے کھانے میں ایک زہر آلود ہڈی شامل کردی گئی تھی جس کے چبانے سے ان کے ہونٹ میں خفیف سی خراش پیدا ہوئی اور اس طرح وہ زہر ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ لیکن اس حکایت کی ترک مخالفت کرتے ہیں۔ ("انقلاب ایران" ص۱۲ اور ص۹۶) کتاب "القضا والقدر" کے دیباچہ میں بھی حضرت سیدؒ کی طبعی موت میں شک کیا گیا ہے۔ مرحوم کو نہایت شان و شوکت سے قسطنطنیہ میں شیخین کے مشہور قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اس حیرت انگیز انسان کی مذہبی و سیاسی تحریکات کی جولانگاہ عملی طور سے تمام اسلامی ممالک تھے۔ نیز وہ یورپین ممالک جن کی حکومتیں مسلمانوں سے کسی جہت سے تعلق رکھتی تھیں۔ افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور ہندوستان سب کسی نہ کسی وقت، مرحوم کے قیام و تعلیمات سے مستفید و متاثر ہوئے تھے۔ "انقلاب ایران" جو تمباکو کے اجارے (۱۸۹۱ء) کے خلاف پرزور احتجاج کے ساتھ شروع ہوا اور جس کا اختتام ۵ راگست ۱۹۰۶ء کو دستوری حکومت کے قیام کے ساتھ ہوا تھا، ابتدائی ایام میں محض حضرت جمال افغانیؒ کی ترغیب و تحریک سے صورت پذیر ہوا تھا۔ حضرت جمال افغانیؒ نے اپنے ایک خط کے ذریعہ سے حاجی مرزا حسن شیرازی کو جو ایران کے مجتہد اعظم تھے ایرانی تمباکو کے غیر ملکی اجارے کی اطلاع دی تھی جس پر مجتہد موصوف نے اپنے فتوے کی اشاعت سے اس وقت تک ایران میں تمباکو کی کاشت کو ممنوع قرار دیا تھا جب تک کہ مذکورہ غیر ملکی اجارہ اٹھا نہ دیا جائے۔ باشندگان ایران نے اس فتوے کی متابعت کی اور تمباکو کا مکمل بائیکاٹ کیا حتیٰ کہ حکومت کو مجبور ہو کر یہ اجارہ توڑ دینا پڑا۔ عوام اور علماء کے درمیان اس اتحاد کا نتیجہ اول تو شاہ ایران اور وزیر اعظم کے قتل کی شکل میں رونما ہوا اور پھر آخر کار دستوری حکومت قائم ہو کر رہی۔ یہ تھیں وہ سیاسی برکات جو مرحوم کے باعث محض ایک ملک ایران پر نازل ہوئیں۔

۱۹۰۸ء میں کامیاب "تحریک نوجوانان اتراک" مرحوم کی ہی ان تھک مساعی و پیہم احتجاج کے باعث قائم ہوئی تھی۔۔۔ ترکی کے علاوہ مصر میں "قومی تحریک" کی مرحوم اور ان کے لائق شاگرد محمد عبدہ ہی نے بنا ڈالی تھی۔ گو یہ تحریک آغاز کار میں "عرابی بغاوت" کے ناکام رہنے کے باعث دب گئی تھی مگر آخر کار کامراں ہو کر رہی۔ مچل (Michel) شیخ محمد عبدہ کی سوانح میں لکھتا ہے کہ "اس میں شمہ بھر مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں کی قومی و ملکی آزادی کی وہ تمام سیاسی تحریکات، یورپین اقوام کے خلاف حقارت و نفرت کے جذبات، اور اسلامی ممالک کو اجنبیوں کے پنجے سے آزاد کرانے کی کشمکش، جو ہم آجکل مشرق قریب و بعید میں ہر جگہ موجود پاتے ہیں، کلیتاً جمال افغانیؒ کی عجیب و غریب شخصیت کے پروپگنڈے کی مرہون منت ہے۔"

مرحوم کی غیر مختتم مساعی کا واحد مقصد عظیم یہ تھا کہ تمام دنیائے اسلام متحد و متفق ہو کر ایک اسلامی حکومت اور ایک خلیفۃ المسلمین کے ماتحت آجائے تاکہ اسلام کا وہی زریں ابتدائی دور ایک مرتبہ پھر واپس آجائے اور دنیائے اسلام مغربی استبداد اور استعمار سے آزاد ہو کر اقوام عالم کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے۔ مرحوم اپنے مقصد کی تکمیل

لیئے کسی اسلامی مرکز کے متلاشی تھے۔ پہلے تو انھوں نے مصر کو اپنی امیدوں کا گہوارہ بنایا اور جب وہاں ناکامی ہوئی تو ہندی
سوڈانی پر نگاہ ڈالی۔ زاں بعد ایران کو آزمایا اور آخر کار ترکی کی طرف اپنی جد وجہد کو مرکوز کر دیا۔ مسلمان ممالک و اقوام کی موجود
ری ہوئی حالت ان سے ایک آنکھ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اسلام کے خیر القرون کی تجدید کے خواہاں تھے۔
مرحوم نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سیاسی انقلاب کو آلۂ کار بنایا۔ وہ یقین کرتے تھے کہ اسی ذریعہ سے وہ بہت جلد اسلامی
دنیا کو آزادی دلا سکیں گے تاکہ وہ اپنے گھروں کی حفاظت کا کام خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ تعلیم اور تدریجی اصلاح (اقتصادی
معاشی و معاشرتی) ان کے نظریہ میں طول عمل اور کامیابی مشکوک کی راہیں تھیں۔ کیونکہ وہ اپنی کوشش کو اپنی زندگی ہی میں بارآور ہوتا
ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ بدیں وجہ انھوں نے اسلامی ممالک کی موجود الوقت طرائق کو الٹ دینا چاہا۔ ان کے خیال سے ایسے حکمرانوں اور
والیان ممالک کی، جو اپنے ضمیر کو یورپین اقوام کے ہاتھ فروخت کر چکے ہوں، تخت و تاج سے معزولی بلکہ قتل بھی ملک و ملت کی
خاطر مباح تھا۔ پروفیسر براؤن کہتا ہے کہ "ایک مرتبہ دوران ملاقات میں حضرت جمال افغانیؒ نے مجھے کہا تھا کہ جب تک چھ یا سات
معزز و با اثر اسلامی شخصیتیں قتل نہ کر دی جائیں اسلامی امور کی اصلاح و ترقی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے اس سلسلہ
میں شاہ ایران اور اس کے وزیر اعظم کا نام بھی لیا تھا۔ اور یہ دونوں بعد ازاں قتل کر دیئے گئے ("انقلاب ایران" ص۴۵) ڈبلیو ایس بلنٹ
اپنی تصنیف "مصر کی خفیہ تاریخ" کے صفحات ۹۵ اور ۱۰۱ میں رقم طراز ہے کہ "۱۸۷۹ء کے موسم بہار میں جمال افغانیؒ اور ان کے
شرکائے کار کے درمیان یہ مشورہ ہوا تھا کہ کس طرح خدیو اسمٰعیل کو معزول یا قتل کیا جائے"۔ کرومر اپنی تصنیف "مصر جدید" کے ص۱۸۱
پر لکھتا ہے کہ "محمد عبدہ کے بیان کے مطابق خدیو اسمٰعیل کے قتل کی تجویز کثرت رائے سے منظور بھی ہو گئی تھی، مگر وہ اس وقت اس وجہ
عمل میں نہ لائی جا سکی کہ کوئی موزوں قاتل موجود نہ تھا"۔ لیکن ان انتہا پسند کارروائیوں کے ساتھ وقت اور محل کی نزاکتوں اور
اور ضرورت کی شدت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اور حضرت جمال افغانیؒ کو ان امور کے باعث جو مجبوریوں کے منت پذیر تھے ایک
خونخوار قاتل اور انارکسٹ نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ برخلاف اس کے وہ اپنی تمام زندگی اسلامی مفاد کی خاطر موت سے کھیلتے رہے۔ اور
ہمیشہ خطرات کو دعوت دیتے رہے اور انھوں نے بے غرضی اور ذاتی قربانی کی وہ عدیم المثال نظیر پیش کی کہ ہمارے موجودہ خود غرض
قومی رہنماؤں اور علمائے سو کو، اگر ان کے اندر حمیت و غیرت کا شائبہ بھی باقی ہو۔ تو ان کے سوانح پر غور اور ان کی تقلید
کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔
حضرت جمالؒ تمام اسلامی علوم عقلیہ و نقلیہ، دینی و دنیوی میں فاضل ہونے کے علاوہ متعدد زبانوں کے ماہر اور بے مثل مقرر
و انشار پرداز تھے۔ فلسفہ پر انھیں کامل عبور تھا اور اسلام کو ایک غیر عقلی مذہب نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ جدید سائنس کی روز افزوں
ترقی سے بخوبی واقف تھے۔ اور اسلام کو انھیں جدید فلسفیانہ اور سائنٹفک خیالات کی روشنی میں ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت
سے پیش کرتے تھے۔ مرحوم مذہبی رواداری کا ایک قابل تقلید نمونہ تھے۔ وہ ہمیشہ اسلام کے دو بڑے مذہبی فرقوں سنی اور شیعہ
کے درمیان مصالحت کے کوشاں رہے۔ اور ان کے شاگردوں اور متبعین میں متعدد شیعہ نوجوان اور دیگر غیر سنی حضرات

شامل تھے، جو مرحوم کو اپنا مذہبی و سیاسی قائد باور کرتے تھے اور ان پر اپنی جان تک نثار کرتے تھے۔ مرحوم کی اسی مذہبی رواداری اور روشن خیالی کے باعث اسلامی ممالک خصوصاً مصر کے علمائے سوء انکے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ البتہ اس مخالفت و عناد میں مرحوم کے تبحر علمی، فضیلت و ہر دلعزیزی کے باعث بغض و حسد کا بھی حصہ تھا۔ اس وجہ سے مصر اور ترکی میں مرحوم کا گرویدہ وہ حصۂ قوم ہوا جو آفندی کہلاتا تھا اور مغرب زدہ شمار ہوتا تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ باوجودیکہ مرحوم نے تعلیمی و مذہبی اصلاح کی بڑی کوشش کی مگر اس نہج پر ان کے معتقدین کی تعداد ہمیشہ کم ہی رہی۔ چنانچہ یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب مرحوم نے اپنا انتہا پسندانہ سیاسی پروگرام پیش کیا تو نوجوان محبان وطن جوق جوق سرفروشی کیلئے حاضر ہوگئے۔ کیونکہ نوجوانوں کی نظر میں سیاسی انقلاب ملک کی فوری قومی آزادی کا ذریعہ ہونے کے علاوہ اظہار جوانمردی و زور آزمائی کا بھی آلہ ہوتا ہے جس کا یہ طبقہ ہمیشہ جویا رہا کرتا ہے۔ دوسری طرف زیادہ سنجیدہ اور بنیادی اصلاح جو فطرۃً تدریجی اور دیر طلب ہوتی ہے۔ نوجوانوں کی نظر میں کوئی کشش نہیں رکھتی۔ محمد عبدہ نے اپنے استاد کی جو سوانح عمری شائع کی ہے اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مرحوم تعمیری و بنیادی اصلاحات کے کس قدر خواہاں تھے۔

مرحوم کے دو نہایت مشہور و معروف سوانح نگاروں نے، جن میں سے ایک مغربی فاضل ہے اور دوسرا مشرقی، مرحوم کے کیرکٹر اور شخصیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:۔

(۱) پروفیسر ای جی براؤن اپنی مشہور عالم تصنیف "انقلاب ایران" کے صفحات ۲ و ۳ پر لکھتا ہے کہ "جمال ایک بیداغ کیرکٹر اور چال چلن کا مالک تھا۔ وہ ایک نہایت جید عالم فاضل، کبھی نہ جھکنے اور شکست قبول کرنیوالا لیڈر، جری اور بہادر، بے مثل مقرر اور بے نظیر ادیب تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز مقناطیسی شخصیت رکھتا تھا۔ اس کی رفتار و گفتار اور انداز شاہانہ تھے۔ وہ بیک وقت فلسفی، انشا پرداز، مقرر اور صحافی اور سب سے زیادہ یہ کہ سیاستدان تھا۔ اس کے مداح اسے ایک عظیم الشان قوم پرست کہتے تھے اور اس کے دشمن اس کو ایک نہایت خطرناک ہستی سمجھتے تھے۔"

(۲) حضرت سید جمال الدینؒ کا شامی سوانح نگار جرجی زیدان اپنی تصنیف "مشاہیر" دوئم کے صفحہ ۱۱ پر اس طرح گویا ہوتا ہے کہ "جمال کا اصلی مقصد اتحاد اسلامی تھا۔ اور اس مقصد کے حصول کیلئے اس نے اپنی تمام طاقت صرف کردی تھی اور تارک الدنیا ہو گیا تھا۔ کیونکہ نہ تو اس نے تمام عمر شادی کی اور نہ حلب منفعت کی کبھی فکر کی۔ حالانکہ اس عظیم الشان شخص نے اپنی تصانیف زیادہ تعداد میں نہیں چھوڑیں لیکن وہ اپنے احباب، ہم نشینوں اور شاگردوں کے دلوں میں ایک ایسی زندہ آرزو پیدا کر گیا جو اسوقت تک مردہ نہیں ہو سکتی جب تک کہ مرنے والے کا مقصد بحسن احسن پورا نہ ہو جائے۔"

تعلیق۔ حضرت السید جمال الدین الافغانیؒ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے حسب ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے:۔

(۱) انقلاب ایران۔ از ای جی براؤن ۱۹۱۰ء باب اول۔ (۲) اسلامی قاموس العلوم۔ از گولڈ زیہر۔ (۳) تاریخ الصحافۃ العربیہ۔ از وکاؤنٹ فلپ بیراٹ ۱۹۱۳ء (۴) مشاہیر الشرق۔ از جرجی زیدان، جلد دوم۔ (۵) العروۃ الوثقیٰ۔ از مصطفےٰ عبد الرزاق۔ قاہرہ ۱۳۴۶ھ۔ (۶) المنار۔ جلد اول تا ۲۸ (۷) القضا و القدر۔ از جمال الدین افغانی۔ قاہرہ

دورآخر میں گیا کے چند شعراء

از

جناب سیّد ضمیرالدین صاحب عرشؔ گیاوی مرحوم

جناب عرشؔ گیاوی نے اس مضمون میں دورآخر کے چند شعرائے گیا کا مختصر تعارف کرایا تھا آج اس مضمون کا لکھنے والا بھی اس دنیا میں موجود نہیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔ اس مضمون سے کچھ ایسے لوگوں کے احوال مطبوع ہوجاتے ہیں جو تذکرہ شاید آئندہ تلاش سے بھی نہ مل سکے۔ اسی نقطۂ نظر سے اس مسودہ کے ناکمل ہونے کے باوجود اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ مرحوم نے آخر میں دورحاضر کے چند شعراء اور اپنے چند تلامذہ کا تذکرہ بھی کیا ہے چونکہ وہ خود ان کے قلم سے ہے اس لئے اس حصہ کو بھی اس مضمون میں باقی رہنے دیا گیا ہے۔ گرچہ عنوان مضمون سے وہ علاوہ ہے۔ "ندیم"

عرشؔ ؎ زندہ جو کل تھے آج انھیں کا فسانہ ہے   کس کس کو روئیے یہی رنگ زمانہ ہے

(۱) کاہشؔ:- حکیم مولوی اولاد علی صاحب کاہشؔ۔ متوطن جونپور سنی المذہب تھے۔ لکھنؤ میں تکمیل علم عربی و فارسی کے بعد جب کہ کچھ ہی دن غدر کو گذرے تھے گیا میں آئے۔ ترک وطن کا سبب رنجش خاندانی ہوا۔ طبابت پر اچھی طرح گذری۔ سُلّم پڑھنے کے زمانہ میں جب کہ اٹھارہ برس کی عمر تھی۔ غلام ہمدانی مصحفیؔ کے شاگرد ہوگئے تھے۔ تذکرہ شعرا مولفہ مصحفیؔ دیکھئے اِن کی شاگردی کا بھی حال لکھا ہے مصحفیؔ کے بہترین تلامذہ میں جہاں مظفر علی اسیرؔ و آتشؔ تھے یہ بھی ہیں۔ یہ جمیع اقسام نظم پر قادر تھے۔ یہانتک کہ مرثیہ گوئی میں بھی ہمعنانِ انیسؔ و دبیرؔ رہے عظیم آباد کی معرکۃ الآرا مجلسوں کے دیکھنے والوں کی زبانی سنا ہے کہ انھوں نے بھی ایک مرثیہ مرزا دبیرؔ کے مرثیہ کے جواب میں تین سو پینسٹھ بند کا غیر منقوط پڑھا تھا۔ جن کے چند بند مجھے بھی یاد تھے جو فراموش ہوگئے [1] یہ سات دواوین اردو کے مالک تھے جن کو زمانہ نے غیر مطبوعہ منتشر کردیا۔ اُن کے پوتے حافظ ارادۃ الحق کاوشؔ مرحوم گیا میں رہگئے تھے۔ انکو

---

[1] ندیم یاد آتا ہے، کاہشؔ کا ایک قلمی دیوان حضرت سید شاہ حسین الدین احمد صاحب مرحوم سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ گیا کے کتبخانہ میں ہے غالباً خود کاہشؔ کے قلم سے نہایت خوشخط مکتوب ہے۔ "ر"

بھی خرابیٔ صحت نے شباب ہی کے عالم میں پیوند خاک کر دیا۔ یہ بھی کچھ شعر کہتے تھے اور شاہ محمد اکبر صاحبؒ داناپوری کے شاگرد تھے۔ اک زمانہ میں ان کی آمد و رفت میرے یہاں تھی۔ اور اک بیاض مشکوک و غلط میرے پاس لائے تھے جن کے یہ چند اشعار مشکل سے محفوظ حافظہ ہیں اور ان کا ذکر خاکسار عرشؔ نے ہندوستان کے بعض رسالوں میں تیس سال آگے کیا ہے۔

کلام کاہشؔ:۔ شیشے کی طرح یار کا ایسا ہے بدن صاف — چھنے سے نظر آتی ہے چوٹی کی شکن صاف

قفس میں جو تڑپا چمن یاد آیا — مصیبت زدوں کو وطن یاد آیا
مرقع میں دیکھی جو مجنوں کی صورت — مجھے اپنا دیوانہ پن یاد آیا

اک اور مرثیہ کے بند میں یہ چار مصرعے تھے جو یاد ہیں ملاحظہ ہو:۔

رکتی ہے کب کسی سے مری طبع نکتہ گیر — مونسؔ ہوں یا انیسؔ ہوں یا اُنسؔ یا دبیرؔ

جولانیوں پہ طبع اگر میری پھر پڑے — چکر وہ دوں کہ ابلق ایام گر پڑے

تاریخوں میں دو تاریخیں امام باڑہ گیا میں محفوظ ہیں۔ سر دروازہ شہزادہ یوسف مرزا کے مزار پر سنگ سیاہ میں یہ تاریخ تعمیہ موجود ہے۔ ع:۔ یوسف گم گشتہ در چاہِ عدم۔ دوسری تاریخ اوس دالان کی پیشانی پر دیکھیے جو ہمیشہ سے مجلس گاہ ہے۔ چند زبردست شاگرد چھوڑ کر عمر اخیر میں اپنی لڑکی کی ضد سے وطن گئے وہاں سانپ نے کاٹا اور رحلت کی۔ سید انشاء کی طرح دنیا سے گمنام اُٹھے اون کی تو تاریخ بھی رہ گئی ہے یہاں وہ بھی نہیں مگر اندازہ ہے کہ ناسخؔ و آتشؔ کی زمانۂ رحلت میں یہ بھی راہیٔ جنت ہوے۔ گیا میں ایک بندہ نام میراسن رہ گئی ہے جو زنانہ مجلسوں میں ایک نوحہ اون کا پڑھا کرتی ہے اس کے سنے سنائے دو اک اشعار یاد ہیں

لالہ ساں سب خوں میں ڈوبے گلعذارِ فاطمہ — ہو گئی فصل خزاں فصل بہار فاطمہ
کس مصیبت میں تھی اوس دم مومنو جانِ حسینؑ — شمر تو سینے پہ تھا اور انتظار فاطمہ

۲۔ کیفیؔ:۔ مولوی منا صاحب۔ صد حیف میں نے اک زمانہ میں اُن کے نام مردہ کو زندہ کیا تھا۔ مگر اب بجز عرف اور تخلص کے نام بھی یاد نہیں۔ یہ کاہشؔ کے بہترین شاگردوں میں تھے جن کو درجہ تکمیل حاصل تھا۔ مرزا کامران بخت بہادر مرحوم رئیس اعظم گیا کے عہد میں جب مرزا رجب علی بیگ سرورؔ مصنف فسانۂ عجائب شاگرد ناسخؔ آئے ہیں۔ تو ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ دو قافیوں میں کیفیؔ نے ایک غزل پڑھی تھی واقعی جس کا جواب مشکل ہے۔ غیر مطبوعہ دیوان چھوڑ کر عمر طبعی میں دنیا

سے گمنام اُٹھے۔ تاریخ رحلت معدوم۔

اشعار:- ہمارے نالۂ آتش نشاں کا شور سن سن کے ｜ ہزاروں بلبلیں مرگئیں جل جل کے بُھن بُھن کے
فراقِ شمع رو میں اس طرح سے ہم نے دَم توڑا ｜ تڑپ کے۔ جل کے۔ بُھن کے۔ تھرتھرا کر جو کے دُھن کے
نشان بے نشاں اب کیا رہیگا دوستو میرا ｜ گرے پڑتے ہیں تختے قبر کے سر زمیں کے گھن گھن کے

اُن کے دو تلامذہ منشی درگا پرشاد مستتم اور رہبند ومیرے کرم فرما تھے۔ اور برابر میرے مشاعروں کو زینت بخشتے رہے افسوس جس تذکرہ میں ان کے اشعار بھی قلمبند کئے گئے تھے ناقدردانیوں اور خاندانی تباہیوں کے بدولت دیمک کی نذر ہوگیا۔

۳ جادو:- سلیمان خاں نام۔ محکمۂ آبکاری گیا سے متوصل تھے۔ موضع روہائی ضلع گیا وطن ان کا تھا۔ قلمی دیوان کتبخانہ موضع ارول ضلع گیا میں دیکھا گیا ہے۔ کیفی کے نامی شاگرد تھے۔ دوستوں کی زبانی ایک شعر ان کا خاکسار نے عنفوان شباب میں سنا تھا آدمی بڑے رنگین مزاج گذرے شعر سنئے

چکن جو آسمانی رنگ کی ہے یار نے ｜ گردوں سے چھین لیجے کنٹھا ہلال کا

علاوہ اس کے جب راجہ رنگ بہادر سنگھ گیا نے امام باڑہ کے نزدیک ایک تالاب کھدوایا تھا اور رام سلہ پہاڑ پر سیڑھیاں بنوائی تھیں۔ تو انھوں نے تاریخ لکھی تھی سیڑھیوں کی تاریخ صراط المستقیم یادگار جادو ہے۔

۴ نواب لیاقت علیخاں علیش:- داؤدنگری۔ وثیقہ دار گورنمنٹ انگلیشیہ تھے۔ مٹی ہوئی ہستی پر بھی شان نوابی باقی تھی۔ نواب داؤد خاں کی اولاد میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ اولاد ابل چھوڑی یعنی لطافت علیخاں پیشکار عدالت گیا۔ اور عظمت علی خاں مرحوم مختار گیا۔ (جن کی اولاد آج بھی موجود ہے) یہ کیفی شاگرد کاہش کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان اُٹھے مگر وہ غیر مطبوعہ ہے میں نے ان کی صحبتیں بہت اٹھائیں۔ ستار اور اسرار کے شایق تھے۔ تقریباً اسی برس کی عمر ہوگی کہ عالی قدر نوابوں کی طرح بڑی شان سے پیوند خاک ہوئے۔ اکثر مشاعروں میں ان کو پڑھتے ہوئے سُنا۔ ایک مرتبہ پڑ بولتے نہیں۔ اور جگر بولتے نہیں طرح ہوئی تھی۔ اس میں ہم بھی اپنے بھائی سید امیرالدین احمد صاحب امیر پیشکار عدالت گیا کیساتھ شریک ہوئے تھے صرف ایک شعر نواب صاحب کا یاد ہے۔

کیا جانے بلبلوں نے کہا گوش گل میں کیا ｜ پتّے پتّے کی کہتے ہیں پر بولتے نہیں

۵ فریاد: مولوی غلام حسین مرحوم۔ گیا گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ مولوی تھے۔ فارسی کے فاضل اور علم عربی سے باخبر حمزہ پور شہر گھاٹی ضلع گیا کے رہنے والے تھے اپنے کو اصغر علی خاں نسیم دہلوی کا شاگرد بتلاتے تھے۔ اپنے عہد کے کسی شاعر کو بجز شیخ امیراللہ تسلیم لکھنوی کے آنکھ میں نہیں لگاتے تھے اپنے کو ناسخِ وقت فرماتے تھے اور خود کو مخاطب کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم نہیں آئے بلکہ ہ:- پیدا ہوئے پھر ناسخ مرحوم گیا میں۔ نمونۂ افکار نام ایک کتاب اپنی حیات میں چھپوائی تھی

جس میں ارباب عناصر امیر۔ داغ۔ جلال۔ تسلیم کی غزلوں کا بطرح جواب بھی لکھا ہے۔ مومن سے سلام پر سلام رہے۔ جسکا ایک شعر یاد ہے کہ ؎

عکس اس مہتاب کا جاکر پڑا اس ماہ پر چاندنی پر چاندنی ہے چاندنی پر چاندنی

انکوں کی شاگردی کا شرف بڑے بڑے اقبال مند دکلا کو حاصل تھا۔ سنجر طہرانی سے اخبار "بہار پنچ" میں خوب خوب ہنگامہ آرائی رہی۔ صاحب دیوان اردو و فارسی تھے۔ مگر سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ مفصل حال ان کا حافظ عبدالاحد صاحب مشفق تاجر کتب شہر گھاٹی ضلع گیا سے طلب فرمایئے ان سے ان کا کلام بلاغت نظام بھی مل سکتا ہے۔ کوئی ستر برس کی عمر ہوگی کہ اعلیٰ علیین تشریف لے گئے۔ سنہ انتقال لاعلوم۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ یہ امیر و داغ کے پہلے مرے۔ کلام اوستادانہ تھا گر پڑھنے پر ایک طرف سے آوازہ اور دوسری طرف سے ان کا بگڑنا قابل دید ہوتا تھا۔ کوئی شاگرد فن شعر میں نظر نہیں آیا۔

سلطان: خواجہ سلطان جان۔ صاحب مذاق رئیس تھے۔ رام سلہ پہاڑ پر والے مکان میں رہتے تھے۔ کلام اور مفصل احوال جسٹس خواجہ نور صاحب سے پوچھیے۔ میں نے قلمی دیوان ان کا آب زر سے لکھا ہوا سید اکرم صاحب کے پاس دیکھا تھا[1]

حشر:۔ جناب مولوی سید فصیح احمد صاحب مرحوم بیتھو ضلع گیا کے صاحب علم سادات سے تھے۔ گیا صاحب گنج اسکول کے مولوی رہے۔ مصحفی کی طرح تلامذہ کی کثرت سے تنگ رہتے تھے۔ صورت یہ تھی کہ طباع بہت تھے۔ غزلیں مشاعرہ کی تیار کریں اور تبرک کی طرح اہل شہر کو بانٹ دیں۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ جب کوئی محروم رہ گیا تو اس نے انھیں کی غزل اڑالی۔ اور پڑھ دی ان کو خبر تک نہ ہوئی۔ اب جو وقت ان کے پڑھنے کا آیا تو غزل نہ پائی۔ معذرت کیساتھ غیر طرحی پر اکتفا کرتے۔ صاحب دیوان اردو تھے۔ مرزا محشر دھلوی کا شاگرد اپنے کو بتاتے تھے۔ بنہایت منکسر۔ نیک نفس وارستہ مزاج تھے۔ خاکسار کے ملنے والے تھے ایک شعر بھی ان کا یاد نہیں۔ عمر طبعی کے پہونچنے سے پہلے ان کے صاحبزادہ مولوی مسیح احمد نشتر بھی مرگئے۔ بیتھو کے ساکنان ان کا کلام بہم پہونچا سکتے ہیں۔ سال رحلت لامعلوم۔ تقریباً ۶۵ برس کی عمر پائی ہوگی مرض طاعون میں مبتلا ہو کر بیتھو میں انتقال کیا اور مدفون ہوئے۔ ممکن ہے کہ تذکرہ شعرائے گیا مولفہ لالہ خلش صاحب سے اکثر شعرا کیساتھ ان کا کلام بھی دستیاب ہو۔ حشر کے شاگردوں میں اب شاہ مقصود عالم باقی ہیں اون کا ایک شعر کبھی نہ بھولوں گا۔

ایک وہ دن تھا کہ گلشن میں بسر ہوتی تھی آج دو پھول کو محتاج ہے تربت میری

ان کی عمر تقریباً پچاس برس کی ہوگی۔ ناوا گنج گیا میں مقیم ہیں۔ پڑھنا نہایت پرسوز ہے۔

آہ:۔ شیخ ذوالفقار علی آہ۔ گیا محلہ پیر منصور کا شیعہ مذہب کا شریف زادہ تھا۔ جس کے حسن وجمال کی طرح طباعی

---

[1] سلطان کا دیوان راقم سطور کے پاس بھی موجود ہے۔ سلطان کے سوانح حیات وکلام پر ایک مفصل مضمون راقم سطور کا ندیم کے بہار نمبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ " ر "

بھی جواب نہ تھا۔ اگر یہ نوجوانی میں مر کر نہ جاتا تو حشر کا نام نہ ملتا۔ علوم مروجہ سے آشنا تھا۔ اور میرا بھی دوست یکرنگ تھا۔ نوجوانی کی بدعنوانیوں میں مبتلا ہو کر دق وسل میں مر گیا۔ مرتے وقت یہ کہہ گیا کہ۔

قبر میں بعد فنا آئیں گے حیدر بیشک　　اتنی مرنے کی خوشی ہے کہ زیارت ہوگی

ان کا میرے یہاں شام کو آنا ضرور تھا۔ آخری ملاقات میں ایک مطلع پڑھ گیا جو اب تک دل پر زخم کا حکم رکھتا ہے۔

آہ ہے شعلۂ غم یوں بھڑکتا ہے دل مایوس میں　　جھلائے شمع کی لو جس طرح فانوس میں

اللہ بخشے عرصہ ہوا کہ داغ مفارقت دے گیا۔ "آہ بہار آخر شد" سے میں نے سال انتقال نکالا ہے جو میرے دیوان میں درج ہے۔ مزار اس کا امام باڑہ گیا میں ہے اور لفظ آہ اس پر موجود ہے۔ کلام سب ضایع ہو گیا۔ فیروزہ طوائف کا بھائی امجد حسین ماہ ان کا شاگرد تھا وہ بھی غریب مر گیا۔

۹ شرر:۔ شیخ حسین بخش گیاوی۔ ساری عمر سید ظفر نواب رئیس گیا۔ اور سررشتہ دار مولوی غلام صمدانی صمد شاگرد شوق نیموی کی مصاحبت میں گذاری۔ علوم مروجہ سے باخبر تھے۔ ظریفانہ اور عاشقانہ دونوں رنگ پر قادر پائے گئے دیوان چھپ گیا ہے تاریخ میں نے بھی لکھی ہے مگر کلام ان کا بجز اس شعر کچھ یاد نہیں۔

گئے وہ دن کہ رباعی پہ اشرفی پاؤں　　کہ اب قصیدوں پہ ملتا ہے اک چھدام نہیں۔

۱۰ کوثر:۔ حکیم مولوی عابد علی صاحب خیرآباد کے رہنے والے تھے۔ اور قابلیت فاضلانہ رکھتے تھے۔ زمانہ کہوریت میں گیا کو سرفراز فرمایا۔ اور شہر کے متعدد اہل مذاق کو فیضیاب کیا۔ منشی مظفر علی اسیر اور ان کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہو گئے تھے اور جس صف میں ریاض۔ مضطر۔ وسیم۔ جلیل کو جگہ ملی تھی۔ اسمیں آپ بھی تھے۔ حشر۔ عشرت و ہلال سے معاصرانہ تعلقات رہے۔ خاکسار عرش پر بھی نظر شفقت رکھتے تھے۔ صاحب دیوان غیر مطبوعہ ہیں۔ وقت اخیر ساری عمر گذار کر وطن کی طرف رخ فرمایا اور وہیں آسودہ ہوئے۔ دیرینہ یادگار و نہایت منکسر تھے۔ گیا میں محلہ کرانی گھاٹ مرزا امیر مرحوم کے مکان میں مطب رکھا تھا۔ اور اہل تلامذہ میں جناب شفق عماد پوری۔ جناب ایجاد و جناب رضا کو گیا میں چھوڑا۔ یہ سب کے سب واجب القدر ہستیاں ہیں۔ صرف ایک مطلع حکیم صاحب کا یاد ہے۔

اب نبض مریض تپ غم دیکھتے کیا ہو۔　　یہ وقت دوا کا نہیں مصروف دعا ہو؟

صاحب ریاضت بزرگ تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ سال تاریخ یاد نہیں۔　　حال آپکا مجالس عرش میں بھی ہے

۱۱ عشرت:۔ منشی احمد علی عشرت۔ رئیس موضع اردل ضلع گیا۔ علم فارسی و عربی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ کہنا تو کہنا پڑھنا قابل دید تھا۔ آواز اتنی بلند تھی جو ایک محلہ پر چھا جاتی تھی۔ نادر شاہ خاں صاحب شوخی رامپوری شاگرد غالب کے شاگرد تھے دیوان غیر مطبوعہ جناب حسن امام صاحب رئیس گیا کے پاس موجود ہے۔ جو ان کے شاگرد ہیں۔ رباعیوں کا مجموعہ مع تصویر

ندیم موصوف ان دنوں عشرت کا دیوان صاف کرا رہے ہیں اور عنقریب چھپوانے کا قصد رکھتے ہیں "۔ ر"

وہ چھپوا چکے ہیں۔ عشرت صاحب بغیر سُرور پڑھنے کے لایق نہ ہوتے تھے۔ رندانہ بسر کی۔ یہی وہ ذات واحد تھی جس کے مرنے کے بعد میرے مشاعرے درہم برہم ہوگئے۔ ایک شعر ان کا حشر تک نہ بھولوں گا ؎

پہونچی نہ اپنی خاک بھی جب کوئے یار تک | جا تجھسے اے نسیم سحر بولتے نہیں

حشرؔ۔ حکیم ننو صاحب ہلالؔ بنارسی اور کوثرؔ وغیرہ ان کے معاصر تھے۔ پنچایتی اکھاڑہ گیا میں قیام تھا پٹنہ جاکر انتقال پایا۔ پچپن ۵۵ برس کی عمر پائی ہوگی۔ مولوی انوار صاحب ان کے صاحبزادے موجود ہیں۔

۱۲ ہلالؔ:۔ حکیم ننو صاحب ہلالؔ بنارسی۔ صاحب علم و کامل الفن تھے۔ بڑا باغ گیا میں پچاسوں برس گذار دئے۔ میری ان کی بہت صحبتیں رہیں جن میں عشرت کا ہونا بھی ضرور تھا۔ مولوی نورالدین بلخیؔ وکیل گیا بھی ہوتے تھے۔ یہ علوم و فنون میں کامل تھے۔ استعارہ نازک خیالی و بلند پروازی میں ان کا جواب نہ تھا۔ دو دیوان اردو کے مالک ہیں۔ مگر غیر مطبوعہ رہ گئے۔ امید نہیں کہ طباعت ہو سکے عمر طبعی میں کہ ستر برس کے قریب ہوں گے آنکھوں سے معذور ہوکر وطن کو یعنی بنارس گئے اور وہیں آسودہ ہوے۔ مرزا محمد حسن فائزؔ بنارسی کے ہمصحبت اور نادر شاہ خاں شوخیؔ کے شاگرد تھے۔ تاریخ رحلت ۱۳۴۰ھ

کلام ہلالؔ

سیہ رنگ حنا سمجھو نہ دست رشک گلشن کا	عجب ہے شاخ مرجان میں لگا ہے برگ سوسن کا
ہزاروں جانیں ہنس ہنس کر فدا کرتے ہیں پروانے	گرے ہے زعفرانی رنگ شعلہ شمع مدفن کا
ہوا ہوں خاک خوف رہزنی سے چشم جاناں کے	ہلالؔ اک دن ہونگا میں غبار اس چشم رہزن کا

۱۳ ایجادؔ:۔ منشی شیخ الٰہی بخش صاحب ایجادؔ۔ علوم مروجہ سے باخبر اور فخر التلامذہ کوثرؔ سے ہیں۔ اور میرے کرمفرمائے قدیم بھی کوزہ سازی سے فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ گیا محلہ سرائے میں مقیم ہیں کلام اور مفصل احوال براہ راست پوچھئے۔

۱۴ سلطانؔ:۔ قاضی فرزند احمد صاحب رئیس اعظم گیا۔ فارسی گو صاحب دیوان تھے۔ آغا سنجر طہرانی کے شاگرد دیں ناموِ ہوے۔ ایسا اہل شاگرد اس دور بہترین میں دیکھا نہیں گیا۔ صاحب علم و فن اُمرہیں اُن کا جواب مشکل سے ملیگا۔ پچاس برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ گیا میں اپنے خانہ باغ میں مدفون ہوے۔ کمتر غزلیں اردو میں بھی کہتے تھے۔ خاکسار کے مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے حسن وجمال نشانِ اجلال کے لیے اور دستگیر بیکساں بھی ہے۔ اب ان کے پوتے علی گڈھ کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ اُن سے غیر مطبوعہ کلام اور مفصل حال مل سکتا ہے۔ مجھے ایک شعر بھی یاد نہیں۔

۱۵ اوجؔ:۔ حافظ یعقوب صاحب اوجؔ تاجر کتب گیا۔ خلف حافظ نادر مرحوم ساکن گیا کتھو کرتالاب۔ قرآن اور اردو خوانی تک علم محدود۔ عرش کی شاگردی میں سالہا سال تک گذارے سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک کا لاہور پنچ واقعات اور کلام سے بھرا پڑا ہے۔ ایک شعر بطور یادگار نوٹ کرتا ہوں ؎

ندیم ۱:۔ جناب قاضی احسان احمد صاحب ان دنوں پٹنہ محلہ قدم کنواں میں قیام پذیر ہیں۔

نہیں ہے عالم اسباب میں اسباب کی حاجت   جسے جانتے ہوئے دیکھا ہے بے اسباب دیکھا ہے

شنکر رنجی کے بعد کوثر کی شاگردی پر عمر تمام کی۔ نوجوان اُٹھ گئے۔ کریم گنج گیا میں مدفن ہے۔ سال وفات معلوم نہیں

۱۶ء اثر:۔ نواب امداد امام اثر پدر بزرگوار سر علی امام و حسن امام کے مفصل احوال اون کے پوتے صفدر امام صاحب وغیرہ بیرسٹر پٹنہ سے دریافت فرمائیں۔ عمر کا آخری حصہ گیا میں گذرا اور آبگلہ کی خاک میں آسودہ ہوئے۔ ناول فسانۂ عجیب بھی شاہد احوال ہے۔

۱۷ء مست:۔ بابو نند کشور وکیل و رئیس گیا۔ صاحب علم و فن تھے۔ میرے مشاعروں کی برابر آبرو بڑھاتے رہے۔ طبیعت معنی رس پائی تھی۔ شاہ محمد اکبر صاحب داناپوری کے شاگرد تھے۔ جب مسٹر ہادی حسن صاحب بار ایٹ لا ولایت سے پلٹے تو انھوں نے ایک سجع لکھا تھا۔ جو یاد ہے۔ جناب مولوی خیرات احمد صاحب محب کو رجوع کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

ع:۔ "آپ کے حامی علی ہوں آپ کے ہادی حسن" عمر طبعی کو پہونچکر انتقال فرمایا۔ مسٹر لالجی بار ایٹ لا آپ کے صاحبزادہ ہیں جن کے پاس کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔

۱۸ء قیس:۔ بابو رام پرشاد وکیل گیا۔ بہت طباع تھے۔ اک بیاض اون کی مع تصویر چھپ گئی ہے۔ شاہ اکبر صاحب داناپوری کے شاگرد تھے۔ اپنے وقت میں ایک ادبی کمیٹی قائم کر کے بہت بڑا مشاعرہ کیا تھا۔ یہ طرح تھی کہ۔

زباں سخن کیلئے ہے سخن زباں کیلئے:۔ اس میں میر مہندی کمال خلف جلال۔ بدر آروی وغیرہ آئے تھے۔ ضیا شاگرد شوق بھی تھے وہ عجب شعر پڑھ گئے۔

پکارتی ہے سرِ شام دل کی ویرانی   چراغ دے کوئی اُجڑے ہوئے مکاں کیلئے

افسوس کہ قیس نے بعمر پچاس سال اولاد اہل چھوڑ کر رحلت کی۔ قیس کا ایک مطلع یاد ہے۔

لحد میں سونے دو بار رو کہ چین آیا ہے مشکل سے   بڑا لمبا سفر تھا آرہا ہوں دور منزل سے

۱۹ء محب:۔ خان بہادر مولوی خیرات احمد صاحب محب گیاوی۔ یادگار سلف رہ گئے ہیں۔ مفصل احوال ان کا سلطان پیلس پٹنہ سے طلب فرمائیں۔

۲۰ء آزاد:۔ مولوی فضل حق آزاد موضع شاہو گیا، سب ڈویژن جہان آباد میں موجود ہیں براہ راست اون سے حالات دریافت کیجئے۔

۲۱ء برق:۔ حافظ نواب علی صاحب برق لکھنوی مقیم گیا شاگرد جلال سے بہ نشان گیا موریا گھاٹ مسجد شخ نواب، اون کا احوال اور کلام نیز واجب التذکرہ شعرا، کا نام براہ راست دریافت فرمائیں۔

۲۲ء سریر:۔ مولوی محمد عباس صاحب سریر کابری (ببیں بہار) حسین آباد۔ ڈاکخانہ جیلا ضلع پلاموں میں تحصیلدار ہیں۔

ندیم:۔ ان دنوں گیا میں قیام فرما ہیں اور ندیم کے دور اول سے اس کے ہمدردوں میں ہیں۔

اُن سے خود ان کی حالت معلوم ہوگی۔

۲۳۔ انجم:۔ مولوی نور محمد صاحب ــــــــ ان کے احوال براہِ راست طلب فرمائیں۔

۲۴۔ شفق:۔ مولوی حسن مرتضیٰ شفق زندہ و سلامت ہیں براہ راست ان کے احوال معلوم ہو سکتے ہیں

۲۵۔ رسا:۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رسا بہارانی بی ایل ایم اے۔ بہار شریف میں وکالت کرتے ہیں، آن سے احوال طلب کریں۔

۲۶۔ گشتہ:۔ بابو اودھ کشور پرشاد صاحب وکیل ان کے احوال براہ راست طلب فرمائیں۔

تلامذہ عرش گیاوی

۲۷۔ ماہ:۔ شیخ محمد عباس علی ماہ گیاوی خلف شیخ محمد مقصود علی جمعدار پولس۔ پیدائش ۱۹۱۶ء ساکن محلہ دلہن گنج گیا۔ علم مروجہ سے باخبر۔ انگریزی کی استعداد میٹرک تک۔ حکیم شاہ محمد قاسم کی تحریک سے عرش کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ عمر ۲۰ سال کی ہوگی۔ طبیعت مضمون رس پائی ہے۔ پڑھنا ترنم کے ساتھ ہے۔

اشعار:۔

ہمارے درد دل کے او مسیحا — دوا کچھ ہے بتاتا ہے دوا کچھ

ہجوم بیخودی میں اس کے آگے — ہمیں کہنا تھا کچھ ہم نے کہا کچھ

کہوں کیا ماہ قصہ زندگی کا — ہے اسکی ابتدا کچھ انتہا کچھ

سچ ہے کہ وہ مٹائے کسی کے نہ مٹ سکا — نکلا ازل میں جو قلم کردگار سے

جنگل بھی دو دپہر کو ہے جنت فقیر کو — کیا راحتیں ملیں شجر سایہ دار سے

۲۸۔ ضیا:۔ مرزا اکبر شکوہ ضیا بنارسی خلف شہزادہ مرزا محمود سلطان دہلوی۔ وزنا ئے بڑا باغ گیا سے ہیں — عرش کو اپنا کلام دکھلاتے ہیں۔ عمر بیس سال۔ علم حسب ضرورت۔ اچھا کہتے ہیں ایک شعر یاد ہے۔

مجرم قرار پائے ہیں جرم عشق کے — آخر کو لڑ جھگڑ کے یہی فیصلہ کیا

۲۹۔ خلش:۔ لالہ جگیشور پرشاد صاحب خلش شاگرد عشرت لکھنوی۔ مولف تذکرۂ شعرائے گیا ان کے احوال کو خود ان سے یا مولانا انجم صاحب سے پوچھئے۔

۳۰۔ عروج:۔ خلف و شاگرد عرش۔ سید صلاح الدین نام۔ عمر ۲۲ سال۔ علوم ضروری سے باخبر۔ محکمۂ آبکاری گیا میں ہیڈ اوفیسر ہیں۔ "بہارستان عروج" نام مجموعۂ کلام ان کا دفتر مدینہ میں شائع ہو چکا ہے۔ نانہال ان کی فراشخانہ دہلی میں ہے۔ طبیعت تصوف اور داخلی مضامین کی طرف زیادہ رجوع ہے۔ بطور نمونہ یہ اشعار پیش کش ہیں ؎

بظاہر شیشۂ دل گو نہاں معلوم ہوتا ہے — مگر اس جام جم میں اک جہاں معلوم ہوتا ہے

خدا نے جن کے دل روشن کئے ہیں انکی آنکھوں سے — زمین ہے آسماں کیا لامکاں معلوم ہوتا ہے

بقیہ صفحہ ۴۴ پر دیکھیے

افسانہ و محاضرات

حسن جعل ساز

از جناب نثار احمد صاحب نارودی

۱۲؍ اگست کا آفتاب خدا خدا کر کے طلوع ہوا۔ یہ میری زندگی کا ایک مشغول ترین دن ہے۔ آج کا دن روزانہ کے خشک پروگرام کی پابندیوں سے آزاد ہوگا۔ میں آج کالج کی بکواس سننے کیلئے تیار نہیں، ابھی پلنگ پر ہوں آنکھیں مل رہا ہوں (یہ خیالات دماغ میں چکر لگا رہے تھے) غسل کر رہا ہوں اور خیال ہے کہ آج درزی نے کپڑے دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ کپڑے پہن سا تھا مگر غور کر رہا ہوں کہ ٹائیاں سب پرانی ہوگئی ہیں۔ کالر تو ایک بھی نیا نہیں، ہاں سوٹ کیس بھی ایک اچھے قسم کا ہونا چاہئے، چمڑے کے بڑے بکسوں پر روغن کرا لوں گا ٹھیک ہو جائیں گے۔ اُف، آج بہت کام ہیں، اگر ناشتہ کا انتظار نہ کروں اور بازار چلا جاؤں تو شاید سب کام بخوبی تکمیل پا جائیں، ورنہ مشکل ہے، ہاں! ایک بات اور ڈائری میں نوٹ کرنا بھول گیا، اپنے میزبان کے بچوں کیلئے کچھ کھلونے خریدنا ہیں۔ ہاں، حجامت بھی بنوانی ہے، اوہو، کریم کی شیشی بھی کمبخت خالی ہے، یہ بھی خریدنی ہے۔ بس ایک طومار تھا کہ تاحد شوق تخیل کے اندر نافذ ہوتا چلا جاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں کپڑے پہن کر اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے تیار ہوگیا، بازار میں ایک دوکان سے دوسری دوکان میں چیزوں کی خریداری کیلئے پھر رہا ہوں، ٹائیاں چھانٹ رہا ہوں مگر لحاظ اس امر کا ہے رنگ ایسا ہو کہ مزاج کی نفاست کا مظاہرہ کرے، سوٹ کے رنگ سے مطابقت کرے اور موسم کی موافقت، کھلونے خریدتے وقت یہ بات ضروری تھی کہ چیزیں جدید قسم کی ہوں، جن سے طبیعت کی جدت پسندی کا پورا پورا اظہار ہو، کھلونے اسقدر اعلیٰ قسم کے ہوں کہ جن سے میری ثروت و عالی دماغی کا پتا چلتا ہو، اس لئے کہ یہی چیزیں ہیں جن سے ایک آدمی اور اسکے نفسی خصوصیات کے متعلق کچھ معلوم ہو سکتا ہے، ورنہ ایک دو دن کے قیام و ملاقات سے کوئی کیا میری نسبت معلوم کر سکے گا۔ اور ضروری تو یہ ہے کہ اپنے متعلق لوگوں کو بہترین رائے قائم کرنیکا موقع دوں، کامیابی کا راز اسی میں ہے۔

غرض اسی طرح شام ہوگئی۔ یہ شام بھی کسقدر منتظر شام تھی، میں جلدی جلدی بستر لپیٹ رہا تھا۔ بکسوں میں سامان تیزی سے بھر رہا تھا، سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا، مگر کسی محبوب مقام کی تیاری کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی سینما ہال میں متحرک روحانی منظر کا نظارہ کرنا، میں ہوں تو الہ آباد کے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرہ میں مگر پھر رہا ہوں دہلی میں جو میری محبوب منگیتر نعیمہ کا وطن ہے، وہیں کے حدود پیش نظر ہیں وہاں کی گلیاں وہاں کے لوگوں کی اور خصوصاً نعیمہ کی معصوم تصویر ذہنی پردہ

پر اس طرح متحرک ہے کہ جیسے میں خود وہاں پہنچ گیا ہوں۔

میں اب اس خواب بیداری کو محسوس کرنے لگا تھا۔

جوں جوں وقت گذر رہا تھا، وفور شوق سے تخیل کی فراوانی اور اسکی آمد ورفت کی ایسی بھرمار ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک آندھی ہے جو دماغ کے شعبۂ یادداشت کے نظام کو درہم برہم کئے دیتی ہے، مجھکو خریدنا چاہئے تھا استرے کی آہنی پتیاں اس کے بجائے خرید لایا استرا حجامت بنوانے کیلئے حجام بلوایا اور اس کے انتظار میں ذرا آرام کرنے کے لئے کرسی پر لیٹ گیا، خیال کی ربودگی بھی کیا پاکیزہ شئے ہے، میں پھر وہیں تھا۔ چائے پیوں پیوں گا، نعیمہ پردہ کے اوٹ سے، کیواڑ کے شیشہ سے یا چلمن کی پشت سے ضرور جھانکر دیکھے گی۔ (رخساروں پر ہاتھ پھیر کر) آجکل میں کچھ فربہ ہوں، انشاءاللہ پرسنل انٹرویو (Personal Interview) میں ضرور کامیاب ہونگا۔

میں بستر باندھ چکا تھا پھر کھولڈالا۔ اس کے بعد خیال کیا کیوں کھولا کچھ یاد نہیں آیا، بکسوں کے تالے کھولڈالے اور پھر بند کردیئے، اسی طرح بوکھلاہٹ میں ایک ایک کام دو دو مرتبہ کرتا پھر بھی یاد نہ رہتا کہ آخر کام پورا ہوا یا نہیں، بدقت تمام اسٹیشن روانہ ہوا، جس وقت میں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تھا، اسوقت چھ بج چکے تھے اگر گاڑی اتفاقاً لیٹ نہ ہوتی تو اسکا ملنا بھی مشکل تھا، بہرحال گارڈ روانگی کی جھنڈی لہرا رہا تھا، گاڑی کی سیٹی صور اسرافیل بنکر روانگی کی اطلاع مسافروں کو دے رہی تھی، انجن اپنے سینہ کا دھواں فضا میں بلند کرتا ہوا اپنی مختلف سامعہ شکن آوازوں کے ساتھ مستعدی کا اظہار کر رہا تھا، ایسی صورت میں پہلا ڈبہ جو سامنے پڑا اس میں کھڑکیوں کے ذریعہ جلدی جلدی سامان پھینک یکایک ڈنڈے کو پکڑ کر پائیدان پر کھڑا ہوگیا، اب گاڑی حرکت میں آچکی تھی، میں دروازہ کے دستہ کو پکڑے دروازہ کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، اسکو کبھی ادہر گھماتا کبھی اُدہر، دروازہ کو کبھی اپنی پوری طاقت سے آگے کو ڈھکیلتا اور کبھی پیچھے کو، مگر دروازہ تھا کہ کھلنے کا نام نہ لیتا تھا، گارڈ انجن کے قریب مجھسے پچاس قدم کے فاصلہ پر کھڑا میری انٹرنس کی کامیابی کی جدوجہد کو دیکھ رہا تھا، ایک کرخت آواز کے ساتھ بولا "اندر جاؤ ورنہ گر جاؤگے"، گاڑی تھی کہ اپنی رفتار میں تیز سے تیز تر ہو رہی تھی، اور اسی کے ساتھ گارڈ بھی مجھ سے قریب تر ہو رہا تھا۔ اب میں بیحد پریشان تھا کہ اگر میں بہت جلد ڈبہ کے اندر داخل نہ ہوگیا تو گارڈ مجھکو کھینچکر گاڑی سے علیحدہ کردے گا، میرے قلب کی حرکت بھی گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی، مگر دروازہ جو کھل سم سم کہنے سے بھی نہ کھل سکے اسی طرح بند تھا۔ آخر کو میں گھبرا کر اپنے عزم راسخ کو پورا کرتے ہوئے بہادری اور جوانمردی کے آخری قدم لینے کیلئے تیار ہوگیا، "جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا" کہتا ہوا پہلے ایک ٹانگ اور پھر پورا جسم دروازہ کی کھڑکی کے اندر کرکے اندر کی جانب کو جست کرنا چاہتا تھا کہ دوسری ٹانگ کی مہری کا مڑا ہوا حصہ کھڑکی کے کناروں میں الجھ گیا، اب میں ڈبہ کے فرش پر پڑا تھا، ایک ٹانگ تو میری آزاد تھی مگر ایک کھڑکی میں پھنسی تھی، اور ایک پیر اوپر ہونے کی وجہ سے میں جلدی سے اٹھ نہ سکتا تھا، بیتابی میں ہاتھ پیر پھینک رہا تھا کہ کسی طرح اس مصیبت سے چھٹکارا ملے، خدا خدا کرکے چند لمحوں کے بعد پتلون کا وہ پھنسا ہوا حصہ کھڑکی میں نچکر رہ گیا، تب میں آزاد ہوا، کاش پتلون پرانا ہوتا، تو یہ مشکل جلد آسان ہوگئی ہوتی، خیر، کھڑا ہوگیا، کپڑوں کو گرد سے پاک کیا، جسم کے ان حصوں کو ٹٹولا جراحت اپنا نشان چھوڑ گئی تھی، کہیں پر ورم تھا، اور کہیں پر خراش۔

ایک لمحہ سیدھی سانس لینے کے بعد میں نے اپنا بستر کھولکر بنچ پر بچھایا، جلدی میں تکیہ نکالکر اوپر کی سیٹ پر بحیثیت تمام رکھدیا، اور اس کے بجائے ہیٹ (ٹوپی) کو رکھکر ایک مرتبہ جو اس پر ٹیک لگاکر بیٹھا تو ٹوپی چرچراکر ٹوٹ گئی، تب اپنی حماقت کا احساس ہوا، کہ تکیہ کے بجائے ٹوپی استعمال ہوگئی، جو اس کی تباہی کا باعث تھا، فوراً کھڑا ہوگیا اور اوپر سے تکیہ اتار کر بستر پر رکھا اور ٹوپی کو سر پر رکھکر پھر بیٹھ گیا، اب خیال تھا کہ ساری گڑبڑیاں ختم ہوگئیں، اطمینان سے ایک رسالہ نکالکر اپنا وہ مضمون پڑھنے لگا جس کے ساتھ میری تصویر بھی شائع ہوئی تھی، تصویر دیکھ رہا تھا اور مسرور تھا کہ میری تصویر بہت خوبصورت ہے، یقیناً یہ صنف نازک کے دلوں کو گرمائے بغیر نہیں رہ سکتی، دیکھئے آنکھیں کیسی عمدہ ہیں، نقشہ کس قدر سبک ہے، ان خیالات کے ساتھ غسل خانہ میں آئینہ دیکھنے کی غرض سے گیا، عکس میں دیکھا کہ سر پر ٹوٹی ہوئی ٹوپی جمی ہے، لاحول پڑھتا ہوا سر سے ٹوپی اتار کر کھڑکی کے باہر پھینک دی، اور پھر اپنی تصویر اور عکس کے موازنہ میں مشغول ہوگیا، خیال کر رہا تھا کہ اگر نعیمہ کے ملاحظہ سے یہ رسالہ گذرا ہے تو اس نے میری تصویر ضرور دیکھی ہوگی، اور پسند بھی کی ہوگی، یہ خیال کچھ ایسا مسرت آمیز تھا کہ جس کے نشہ میں میں اپنی بھیانک آواز کے ساتھ یہ گنگنانے لگا "چلی جا تو گاڑی مدینے شریف"۔

اب تک تو میں کچھ فراوانیٔ شوق کچھ پے در پے غلطیوں کے ارتکاب کی وجہ سے اپنے وجود کے سوا دنیا و مافیہا کے وجود سے بے خبر تھا۔ مگر ابھی چند ہی لمحے اطمینان سے گذرے تھے کہ میں نے دیکھا کہ کشیدہ قامت لچیلے انداز کی ایک حد درجہ نازک لڑکی ڈبہ کی دوسری جانب کی نشست سے میری جانب چلی آرہی ہے، اس کا ضوفشاں جسم جو نور اور خالص نور کے انجماد کا نتیجہ ہو ایک سرخ اور بالکل سرخ ریشم کی ساری میں اس طرح تھا جیسے مشعل فروزاں اور اس کے گرد فضا میں لہراتے ہوئے سرخ شعلے۔ اس حسن مجسم کو دیکھکر چشم بینا تو فرط شوق سے محو نظارہ تھی مگر میرا منہ فرط حیرت سے اپنی پوری وسعت کے ساتھ کھلا تھا، جوں جوں وہ اپنے خرام ناز کے ساتھ مجھسے قریب ہوتی تھی، میں اپنی جگہ سے آہستہ آہستہ پیچھے کھسکتا اور زبان سے "چل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو........" پڑھتا جاتا تھا۔ وہ آئی اور سامنے کی بنچ پر بیٹھکر نورانی فضا کو اپنی آواز کے ترنم سے یوں پر کیا۔

"آپ کو معلوم نہیں؟ یہ ڈبہ زنانہ ہے"۔

میں نے کہا۔ "زنانہ تو اسوقت تھا جب تک آپ یہاں اکیلی تھیں۔ اب تو یہ زنانہ بھی ہے اور مردانہ بھی"۔

میرا جواب سننا تھا کہ اس کے جبین شگفتہ پر بل آگئے، ترش لہجہ میں کہا "آپ کو اس پر سے اترنا ہوگا"۔ یہ کہکر وہ فوراً اٹھی اور خطرہ کی زنجیر کی طرف بڑھی، یہ دیکھکر میرے اوسان خطا ہوگئے، کہ اول تو اپنی غلطی کی پاداش میں کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا، دویم وقت کی تنگی کی وجہ سے ٹکٹ بھی نہ خرید سکا تھا۔ بس میں ایک ڈاکو تصور کیا جاؤں گا۔ دوڑکر زنجیر کے پاس پہنچا جہاں وہ کافرہ زنجیر کی طرف اپنا نازک اور سڈول ہاتھ بلند کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا "زنجیر کو کھینچنے کیلئے کافی قوت کی ضرورت ہوتی ہے، آپ سے نہ کھنچ سکے گی، میں کھینچتا ہوں"۔ یہ کہکر میں اپنے ہاتھ سے زنجیر کو چھوکر ایک جھٹکے کے ساتھ "اوہ" کہتا ہوا ہاتھ کو زنجیر سے علیحدہ کیا۔ جیسے اسے زنجیر نے دکھا دیا ہو، اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ "کیا ہوا؟" میں نے کہا زنجیر میں برقی اثر ہے

اس لئے ہاتھ کو اسے چھو کر سخت تکلیف ہے" نصف منٹ وہ میرے پاس کھڑی مجھکو دیکھتی رہی جبکہ میں اپنے مصنوعی مجروح شدہ ہاتھ کو ٹٹول رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ستمگر دوسری جانب والی زنجیر کی طرف رجوع ہوئی۔ میں نے کہا" دیوی جی اس طرف بھی برقی اثر ہوگا ذرا احتیاط سے"۔ یہ سننا تھا کہ وہ رک گئی جیسے کچھ غور کر رہی ہو، اتنے میں ساری کے بیچ سے ایک رومال نکالکر ہاتھ کو بلند کرنا چاہتی تھی، کہ زنجیر کو اپنی گرفت میں لے لے، مگر ہمت ساتھ نہ دیتی تھی۔ ہاتھ کو زنجیر سے کبھی قریب کرتی اور کبھی دور، اس پس و پیش نے مجھکو بتا دیا تھا کہ نتیجہ میرے ہی موافق ہوگا، آخر کو وہ واپس ہوکر اپنی جگہ پر جا بیٹھی، اب میں خوش تھا کہ میرا جادو چل گیا، میرا خوف اب بالکل دور ہو چکا تھا، اور یہ یقین ہوگیا تھا کہ آئندہ اسٹیشن آنے سے پہلے اب یہ مجھکو یہاں سے نکال نہیں سکتی، میں نے کہا" دیوی جی۔ آپ پریشان نہ ہوں میں اگلے اسٹیشن پر اتر کر دوسرا دروازہ دیکھوں گا"۔ اس نے دریافت کیا۔

"آخر آپ ہیں کون"؟

میں نے کہا:" اسٹوڈنٹ (Student) ہوں"۔

اس نے:" اسٹوڈنٹ (Student) کسے کہتے ہیں"۔

یہ سوال سنکر متعجب ہوا کہ انگریزی کا ایسا عام فہم لفظ کا نہ سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سوا اس کے کہ سمجھکر نہیں سمجھتی۔

میں نے کہا" اسٹوڈنٹ (Student) مجھے کہتے ہیں"۔

وہ:" اسٹوڈنٹ (Student) کیا کرتے ہیں"۔

میں:" جو میں کرتا ہوں"۔

وہ:" اسٹوڈنٹ (Students) کہاں رہتے ہیں"۔

میں:" جہاں میں رہتا ہوں"۔

اس نے جھنجھلا کر کہا" آخر آپ کہاں رہتے ہیں"۔

میں نے بہ ادب عرض کیا" جہاں اسٹوڈنٹ رہتے ہیں"۔

وہ۔" آخر اسٹوڈنٹ کون بلا ہوتے ہیں"۔

میں کہا:" جنس عام Commongender ہوتے ہیں"۔

اس جملے سے مسکراہٹ اس کے چہرہ پر رقص کرنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ نے ہمت افزائی کی اور میں نے نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں دریافت کیا" کیا میں آپکے جاننے کا شرف حاصل کرسکتا ہوں"، آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر ایک سفاکانہ بانکپن کے ساتھ۔" میرے سر میں درد ہوتا ہے۔ میں آپ کے لغو سوالات کے جواب دینے کیلئے تیار نہیں ہوں"، اس جواب کے بعد میری مخاطبت سے منہ پھیر کر نشیت کو دیوار سے سہارا دیکر اخبار پڑھنا شروع کیا۔ میں خاموش اس کے نظارہ میں گم تھا، اس کے خط و خال کی نفاست، رنگ روپ کی صباحت اور چہرے مہرے کی مناسبت قدرت کے ہاتھوں اس قدر تکمیل کے ساتھ ہوئی تھی کہ نگاہ جس جگہ پڑ جاتی وہیں آسودہ ہوکر رہ جاتی، اب اوپر کا برقی قمقمہ روشن ہو چکا تھا، اس کے جسم کی تابانی کا یہ عالم تھا کہ یہ امتیاز دشوار ہوگیا تھا کہ آیا برقی قمقمہ اس سے کسب نور کر رہا ہے یا یہ برقی نور سے منور ہے، بڑی بڑی پرکیف آنکھوں میں معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں کوٹ کوٹ بھری گئیں ہیں۔

زاہد قریب گلرخ کافر دراز مژگاں
سیمیں بدن پری رخ تو چیز حشر ساماں

جوں جوں اس کے حسن بے پناہ کا بے حجاب نظارہ کرتا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک سیلاب ہے جو تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا، اور میرے پائے استحکام اس سیلاب میں آہستہ آہستہ اپنی

جگہ پر کمزور ہو رہے ہیں۔ اس کی آواز ایک مستقل موسیقی تھی جو بوقت گفتار فضا کو اپنے افسوں سے معمور کرتی۔ یوں گویا ہوئی "آپ کا وجود میرے لئے باعث خلل ہے، لہذا آپ اپنی جگہ پر تشریف لیجائیے"۔
اب میں اپنی جگہ بدل ناخواستہ واپس جا رہا تھا۔ مگر خیال کر رہا تھا کہ کاش اس کے بھی پہلو میں بجائے برف کی قاش ہونے کے ایک دھڑکتا ہوا دل ہوتا تو اس لڑکی کی تباہ کاریاں احاطے میں نہ آتیں۔ اف، یہ سن و سال کی سحر آفرینی اور جذبات کی یہ بےحسی۔ میں نے دیکھا کہ غصہ سے اس کا چہرہ ایک گونہ شعلۂ جوالہ بنا ہوا ہے، اس کی ہر سریع حرکت غضب آلود تھی۔ اس کی سیاہ زلفوں کا ایک بھی چھلا چہرے پر آ جاتا تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ چھلے کو چہرہ پر سے علیحدہ کرتی بغصہ میں وہ ایک ماہی بے آب کی طرح بیقرار تھی، کبھی پشت کو دیوار کا سہارا دیتی، کبھی تنکر بیٹھتی، کبھی میری طرف سے پشت کرتی، غرض وہ ایک برافروختہ ناگن تھی جس کو کسی پہلو کل نہ آئے، اس کی اس بیقراری کو میں غصہ و ہیجان سے تعبیر کرتا رہا۔ آخر کو وہ جلدی جلدی اخبار کو تہ کرکے اپنے سر کے نیچے رکھکر پوری بنچ پر دراز ہو گئی۔ آنکھوں کو بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گاڑی تھی کہ اپنی پوری قوت و رفتار سے خراٹا بھرتی ہوئی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی رفتار کے آہستہ آہستہ ہچکولوں نے ساری گاڑی کو ایک پالنا بنا دیا تھا جسمیں یہ ماہ پیکر محو خواب ہونا چاہتی تھی۔ مگر میں یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ افسوں محو خواب ہو، یہ سحر کبھی خاموش ہو، یہ اضطراب مائل سکون ہو، بلکہ خواہش یہ تھی کہ یہ نور اسی طرح متلاطم رہے، یہ ساز اسی طرح مترنم رہے، اس لئے میں نے اپنے پھٹے بانس کی سی آواز کے ساتھ یہ الاپنا شروع کیا۔

"موٹی موٹی روٹیا پکائے رے دھوبنیا
چلے ہوئی گھاااٹ"

میری سامعہ خراش آواز نے اس کو اور پریشان کر دیا۔ فوراً اٹھ بیٹھی، کانوں میں انگلیاں دے لیں، اب چہرہ فرط عتاب سے اور سرخ ہو گیا، آنکھیں شعلہ ریز تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو شاید میرا گلا گھونٹ کر مجھکو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیتی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے کانوں میں انگلیاں دے لیں تو میں نے اور بلند آواز سے چلانا شروع کیا۔

"دھوبنی رے دھوبنی سجو تو ہارو پیارو جوبن سجو تو ہارو ٹھاٹ
اے ہو سجو تہارو ٹھاٹ"

پھر وہ اٹھی اور تنی ہوئی غسل خانہ میں جا کر کواڑ کو ایک زور کی آواز کے ساتھ بند کیا جس سے اس کے پارہ کی بلندی کا پتا چلا۔ میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آہستہ آہستہ سے دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ میں نے پھر چیخنا شروع کیا، اس نے پھر دروازہ بند کر لیا، میں پھر خاموش ہو گیا۔ غرض واکردن دستورکرا کے مصادر طرفین سے اسی طرح کچھ دیر گردانے جانے کے بعد آخر کو وہ ہمہ تن غصہ میں انگارہ بنی ہوئی آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ اس کے اس بگڑنے میں اس کا بنانا بس مر رہنے کا سامان تو جینے کا سہارا"۔ وہ اپنی دانست میں اپنی پوری قہر انگیزی کے ساتھ مجھ پر شعلہ فگن تھی۔ معلوم ہوتا کہ ایک بجلی ہے جس کی چمک سے فضا منور ہے ایک کڑکت جس کی جھنکار سے دنیا و مافیہا معمور ہے۔ اسوقت میرے نظام کی ساری قوتیں حل ہو کر سامعہ و باصرہ میں تبدیل ہو چکی تھیں میرے معمولی ہوش و حواس بھی بجا ہوتے تو شاید میں اس کی شان کی قدر کر سکتا۔ بہرحال میں خاموش تھا مگر چشمہائے شوق ہی

نسظر میں گم تھیں۔
اب گاڑی کی رفتار میں کم وکاست کا احساس ہوا یعنی
تچپور اسٹیشن قریب ہے، میں نے اپنے بستر کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "دیوی جی
پ اس صوبہ کی نہیں معلوم ہوتیں۔ فتحپور اور کانپور کے اسٹیشنوں
کے درمیان اکثر ڈاکے پڑا کرتے ہیں اور خصوصاً زنانہ ڈبوں میں
صنف نازک ڈاکوؤں کے آہنی ہاتھوں کا شکار بنا کرتی ہیں۔
ج اتفاق سے گاڑی بھی خالی ہے خدا ہی خیر کرے میں تو جاتا
ہوں۔" میرا جملہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ اس کے لطیف سینہ سے
"اوہ" ایک طویل مگر نہایت مہین آواز نکلی جیسے کسی نے
ساز کے نازک ترین پردہ کو چھو لیا ہو۔ اب اس کے چہرے کا گلاب
یسمن میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس کا غم و غصہ خوف و ہراس سے
ل رہا تھا۔ اس کی شوخی و تیزی سنجیدگی و اضمحلال کی طرف
ل تھی۔ وہ شعلہ زار آنکھیں اب چشم بادہ ریز تھیں، وہ شعلہ فشاں
ہن اب بصد ناز یوں گہربار تھا۔ "نہیں! اگلے اسٹیشن پر —
ر جائیے گا، یہاں نہیں۔" پھر ایک اضطراب کے ساتھ "کیوں"؟
میں نے کہا میرے سر میں درد ہوتا ہے، میں آپکے لغو سوالات
کے جواب دینے کیلئے تیار نہیں۔" اب گاڑی رک چکی تھی میں
پنے سامان کے اکٹھا کرنے میں اسی طرح منہمک تھا۔
" وہ غرق جذبۂ آرزو ہو کر، چلے آنا مگر ڈر ڈر کے گھبراتے ہوئے۔"
ئی اور میرے بستر پر بیٹھ گئی۔ میں مسرور تھا کہ میرا فریب کامیاب
ہو گیا۔ بڑے پندار کے ساتھ میں نے کہا "مجھکو معلوم ہو گیا ہے کہ
یہ ڈبہ زنانہ ہے، لہذا مجھکو جلد یہاں سے اتر جانا چاہیئے۔" اس نے
میرا منہ تکتے ہوئے جیسے مجھکو خوش کرنے کی کوشش میں کہا "زنانہ
تو اسوقت تھا جبتک میں تنہا تھی۔ آپکے آنے کے بعد تو یہ زنانہ بھی
ہے اور مردانہ بھی۔" اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے: "میں بہت
بھوکی ہوں براہ کرم میرے لئے ہوٹل سے کچھ منگوا دیجئے۔" میں سمجھ
رہا تھا کہ گاڑی کے قیام کے وقفہ کی دفع الوقتی ہے۔ یہ سمجھکر بہت
خوش تھا۔ بہر حال کھانا منگانے اور کھانے کے درمیان گاڑی
پھر روانہ ہو گئی۔ وہ میرے بستر پر اسی طرح بسکون خاطر بیٹھی رہی
میں قریب کی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "آپ کا وجود میرے
قریب میرے لئے، باعث خلل ہے۔ لہذا آپ اپنی جگہ پر تشریف
لے جایئے، اس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ میری طرف پشت
کرکے بیٹھ جایئے اور سمجھ لیجئے کہیں چلی گئی۔" میں چپ تھا اور اسکی
اشتعال انگیزی کا مطالعہ کر رہا تھا، آخر کو میں اپنی وارفتگی
کا اندیشہ کرتے ہوئے، آنکھ بند کرکے لیٹ گیا، اب چونکہ وہ
ڈاکوؤں کے ڈاکے سے خائف ہو چکی تھی، اس لئے اس نے میرا
یوں سونا یا سوتے بن جانا پسند نہ کیا۔ میرا گرامفون رکھا تھا
اس کو اٹھا کر کالو قوال کا ایک چیختا ہوا رکارڈ چڑھایا۔ اور آواز
کو ترتیب دینے والے پرزے کو گھما گھما کر آواز کو بلند کیا۔ میں
سمجھ رہا تھا کہ یہ حرکت کیسی ہے، میں خراٹے لینے لگا، اس نے
آواز کو اور تیز کیا، میں نے اپنے خراٹے کو اور بلند کیا، آخر کو
اس نے پرزہ کو گھما کر آواز کو اس کی آخری منزل تک
پہنچا دیا۔ مگر میں ویسے ہی خراٹے لے رہا تھا۔ پھر اس نے
گرامو فون کو میرے کانوں کے قریب کرنا شروع کیا۔
یہاں تک کہ اس کے ہارن اور میرے کانوں کے درمیان
ذرا بھی فاصلہ باقی نہ رہا، مگر میں تھا کہ ویسے ہی خراٹے بھر
رہا تھا۔ الغرض اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور
اور گراموفون کے اس ہاتھ کو جس کی گرفت میں ساؤنڈ
بکس تھا جس کی آہنی پتلی انگلی اس رقصان کالے توے
کو چھو کر لحن داؤدی پیدا کر رہی تھی، توے سے علیحدہ کر دیا۔

وفون کا بند ہونا تھا کہ میں بھی جاگ اٹھا، گاڑی تھی کہ فضا کے گھٹا ٹوپ
میرے میں پرواز کر رہی تھی، تاریکی اسقدر کثیف تھی کہ کھڑکی کے باہر
ذرا بھی قابل نفوذ نہ تھی، معلوم ہوتا تھا کہ لفظ "کن" سے پیدا ہونیوالی
وسیع کائنات کے ہزاروں سیاروں میں میرا ڈبہ بھی ایک سیارہ
جہاں کی آبادی بس ایک دیوی اور ایک دیو پر مشتمل ہے، اور
سیارہ اپنی گردش کے مقررہ دائرہ پر رواں ہے، گاڑی اپنی
انی کے درمیان جب چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی
جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چھوٹا سیارہ قریب سے گذر گیا،
ں کی صرف ذراسی روشنی ظاہر ہو سکی۔

اندازسے معلوم ہوا کہ کانپور اسٹیشن اب قریب ہے،
ں نے کہا "مجھکو اس اسٹیشن پر ضرور اتر جانا چاہئے، اس لئے کہ یہ زنانہ
بہ ہے۔" لبوں کی پنکھڑیاں کھل کر یوں ترنم ریز ہوئیں۔ "آپ
صنف مشترک ہیں آپ کے لئے زنانہ مردانہ دونوں یکساں
ہیں۔" میں نے جواباً کہا "یہ تو صحیح ہے، اگر کسی ریل کے باو نے
میرے اس اشتراک پر شبہ کیا تب؟" فوراً کہا "ثبوت پیش کردیگا"
ب اس کی دراز مژگاں آنکھیں جھک گئی تھیں، چہرہ عنایت حیا سے
لارنگ تھا، وہ مسکراتی ہوئی کھڑکی کے باہر جھکی اس کا جھکنا اسکی
نازک کمر کے لئے سخت خطرہ میں آجانے سے کم نہ تھا، جب اسکا
ہاتھ پھر اندر آیا تو دیکھا کہ اس کی دو حنائی انگشت کے درمیان
وہ کارڈ دبا ہے جس پر لفظ "زنانہ" جلی حرفوں میں تحریر تھا۔
جو کھڑکی کے باہر اس کے قبل اپنے خانہ میں آسودہ تھا، مجھے کارڈ
دکھا کر کہنے لگی۔ "دیکھئے میں ڈبہ کی صنف اختصاص کو فنا کرتی
ہوں،" یہ کہتی ہوئی اس نے کارڈ کو پاک کر ڈالا اور کہا "آپ
اطمینان رکھئے، یہ ڈبہ ہم دونوں میں مشترک ہے۔" اس کی
اس حرکت نے مجھ میں وہ پندار پیدا کر دیا کہ نہ پوچھئے، میرے

دل میں کیسے کیسے لڈو پھوٹ رہے تھے، ایک نشہ بخش انبساط
تھا جو میری ساری روح پر مستولی تھا۔ خون کی تولید اور روح
کی افزائش کا یہ عالم تھا کہ میرا جامہ میرے جسم کے لئے تنگ ہو رہا
تھا، اس کا حسن تو احاطۂ تحریر سے باہر تھا مگر میں بھی اسوقت اپنے
کو یوسف ثانی سمجھتا تھا۔

گاڑی کے ٹھہراؤ، گرم چائے کی صدا، پان بیڑی سگریٹ
کی رٹ نے یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ کانپور اسٹیشن آگیا، مجھے خیال تھا
کہ میں وقت کی تنگی کی وجہ سے ٹکٹ نہ لے سکا تھا، مبادا اگر
کسی ٹی ٹی آئی صاحب نے ٹکٹ کی پرسش کی تو میرے پاس ٹکٹ
کا نہ ہونا اس محبوبہ کے سامنے میری شوکت کیلئے مضر ہوگا،
میں نے چاہا کہ گاڑی کے باہر تیزی سے نکل جاؤں تاکہ وہ مجھ
سے جانے کا سبب نہ دریافت کر سکے اور اس کے قبل ہی میں
باہر پہنچ جاؤں، لہذا میں جھپٹ کر گاڑی سے باہر آنا چاہتا ہی
تھا کہ پلیٹ فارم کے کنارے کنارے گارڈ صاحب گاڑی
سے لگے ہوئے انجن کی طرف جا رہے تھے، بس عین اسی وقت
جبکہ میں گاڑی کے ڈبہ سے باہر آیا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی،
ہم دونوں کا سر ایک دوسرے سے اسقدر زور سے ٹکرایا
کہ میرا سر تو چکر کھانے لگا اور گارڈ صاحب کا سر کم از کم چھٹا
تو ضرور گیا ہوگا، سر کے چکر کی وجہ سے میں لڑکھڑاتا ہوا ایک بادہ نوش
کی طرح ٹکٹ گھر کی طرف چلا گیا، ڈر یہ تھا کہ کہیں اس کے بعد گارڈ
صاحب میری اس گھبراہٹ اور اپنی جراحت کے سلسلہ میں
جواب نہ طلب فرمائیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ گارڈ صاحب آنکھ بند
کئے گاڑی کا سہارا لئے وہیں کھڑے ہیں، اور سر کے ورم کو
ہاتھ سے ٹٹول رہے ہیں، خیر
گاڑی پھر روانہ ہوئی۔ مگر وہ دیوی جیسی کی تیسی

میرے بستر پر قبضہ مخالفانہ جمائے بیٹھی تھیں، مگر اس کی نیم باز آنکھیں
نیند سے مخمور ہو رہی تھیں، کچھ دیر تو وہ ایک مست بادہ نوش
کی طرح اپنی جگہ پر جھومتی رہی پھر پوری بنچ پر دراز ہو کر سو گئی
اس برقی نور میں اس کی پوری شبیہ کا بے حجاب نظارہ میرے لئے
سخت صبر آزما تھا، اس کی بیداری کا عالم ایک ایسے درخشندہ
الماس کی طرح تھا جو اپنی حرکت کے ساتھ اپنے انعکاسی پہلو
پر آ آ کر نظر میں ایک بجلی سی چمکا جائے، اور عالم خواب یہ تھا کہ
وہ پارہ الماس اپنے ایک انعکاسی پہلو کا پورا رخ دکھا کر
آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لئے ٹھہر جائے، چہرے کا گلاب،
ابرو کی محراب، رنگ کی میگونی، شباب کی سنگینی، اعضا کی موزونیت
کمر کی نزاکت اور .... کا نشیب و فراز، اس پر قیامت
انگیز نفس کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ .... تھا جو دعوت
... کے لئے اشارہ تھا، گاڑی ہم لوگوں کو اسی زناٹے سے اڑائے
لئے جا رہی تھی، پھپھوندا اسٹیشن بھی آیا اور گذر گیا ساری کائنات
میں گھٹا ٹوپ اندھیرا پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا اب سرد ہوا کے
جھونکوں کے ساتھ بارش کی ننھی ننھی بوندیں بھی شریک ہو گئیں
تھیں، ساون کی وہ سیاہ رات، رات کی وہ امنڈنے والی
تاریکی پھر اس میں وہ موسلا دھار بارش، معلوم ہوتا تھا کہ یہ بارش
کائنات کی ہر چیز کو بہا لے جائے گی، بارش کے زور شور نے
اس ماہ پیکر کو بیدار کئے بغیر نہ چھوڑا، پہاڑوں اور جنگلوں کو
ہلا دینے والی بادلوں کی گرج اور پھر فطرت کا وہ زہرہ گداز
تبسم برق خیال ہوتا تھا کہ شاید اب اس رات کی صبح ہونا مشکل ہے
ٹھیک اسی وقت جبکہ اس گرج کے سلسلہ کی پہلی آواز اس کے
کانوں میں پڑی وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ ہاتھوں سے کانوں
کو دبائے ہوئے میرے قریب پہلو میں آ گئی، گرج کا سلسلہ
جاری رہا، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان و زمین اس گرج سے پاش
پاش ہو جائیں گے، اور برق تمام عالم کو پھونک کر رکھ دے گی، وہ حسینہ
اس خوفناک حالت میں بتدریج سہمتی ہوئی سمٹتی ہوئی میرے پہلو سے
لگی جا رہی تھی، مجھے یقین تھا کہ اسوقت انسانی آبادیوں میں
کوئی آرام و سکون سے نہ ہوگا، لوگوں کے دل کانپ رہے
ہوں گے جسم لرز رہے ہوں گے، جانیں گھل گھل کر تحلیل ہو رہی
ہوں گی، سینے منظر فطرت کے وحشت انگیز رخ سے دہل رہے
ہوں گے، لیکن کوئی میرے اس ڈبہ میں آوے اور میرے مقابل
والی بنچ پر بیٹھکر اس حسن مجسم کا نظارہ کرے، اور پھر میری مسرت
کا اندازہ، میری مسرت کی منزل اس سرخ نقطہ پر پہونچکر اس
طرح خطرہ میں تھی کہ اس کی ذرا بھی زیادتی قلب کی حرکت کو ساکت
کر دینے کیلئے کافی ہوتی، وہ ماہ پارہ میری آغوش میں تھی، میری
خواہش بس یہی تھی کہ بارش کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، اور بادل اپنی
گرج میں سخت سے سخت تر ہوتا جائے، برق اپنی کڑک
میں ویسی ہی تیز رہے، میرے آغوش کا وہ درخشندہ پہلو جسے
اس دیوی نے منور کر دیا تھا، اس جانب جسم میں خون کی
روانی اس قدر تیز تھی کہ خیال ہوتا کہ خون پسلی کی ہڈیوں کو توڑ کر
قالب سے باہر نکل جائے گا، جب بجلی دفعتاً آسمان کو شق کرتی
ہوئی تمام عالم کو منور کر دیتی تو اس روشنی میں شجر و حجر لامحدود بسیط
زمین کا ایک جگمگاتا ہوا عالم آپ گاڑی کے ساتھ ساتھ پیچھے کھاتا
اور گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا، لیکن بجلی کے گم ہونے کے بعد میری
نگاہ کا ہر جزو پھر اس درخشاں منظر میں گم ہو جاتا جو میرے آغوش
کا تھا، میں اس تصور سے خوش تھا کہ یہ احوال صرف میرے لئے
قدرت کی طرف سے پیدا کئے گئے ہیں، اگر میں نہ ہوں تو
یہ سارا انتظام بدل جائے، ہوا ساکن ہو جائے، بارش کا پانی

جم جائے، بجلی چمکنا اور بادل برسنا چھوڑ دے، میں کیسا مسرور ہوں کہ یہ مناظر کی دوشیزگی بلا شرکت غیرے میرے لئے اور صرف میرے لئے ہی ہے اگر میرے ڈبہ میں بھی بوچھار نے پانی بھرنا شروع کر دیا ہے تو کوئی حرج نہیں مگر ابھی یہ برسنے والا طوفان کم نہ ہو، میری دعا بس یہی تھی،

"الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے"

اٹاوہ اور شکوہ آباد کے مقامات بھی یکے بعد دیگرے گذر گئے

اب ٹونڈلا اسٹیشن قریب تھا جہاں اسکو اترنا تھا، وہ نہایت منت پذیری کے انداز میں مجھ سے ملتجی تھی کہ میں چند گھنٹے کے لئے ٹھہر جاؤں اور صبح تک اس کے معیت میں رہ کر دوسری گاڑی سے دہلی روانہ ہوں، طوفانی سلسلہ جاری رہا، موقع کو میں نے غنیمت جانا، اسکی اس نئی استدعا کیساتھ میں نے کیسی کیسی امیدوں کی جنتیں آباد کیں، تخیل کی وارفتگی نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچایا، میں بغیر کسی عذر اور بغیر اس خیال کے کہ وقت معینہ پر دہلی اسٹیشن پر میرے ہونے والے اعزا میرے خیر مقدم کیلئے آویں گے، جب مجھکو نہ پاویں گے تو کیا ہوگا، نقصان کتنا اہم کیوں نہ ہو مگر میرے اختیار سے باہر تھا کہ میں اس کی استدعا کو مضمحل دیکھوں، یہ ناممکن تھا کہ

"دست بیچیں وہ بڑھائے۔ اور کہوں میں دور باش"

گاڑی نے سکون اختیار کیا، ہم لوگ اترے اور مسافر خانہ میں قیام پذیر ہوئے۔ میرے ساتھ سامان بہت تھا، اسکے پاس ایک ہینڈ بیگ کے سوا اور کچھ نہ تھا جس کو کہ میں نے اپنے سامان کے ساتھ اتروا لیا تھا، وہ آتے ہی غسل خانہ کی طرف روانہ ہوگئی، میں ایک جانب کرسی پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا، گھنٹہ کے تین ثلث گذر چکے تھے، مگر ابھی تک وہ باصرہ نواز نہ ہوئی تھی، انتظار کی گھڑیوں کا انتشار دور کرنے کی غرض سے سامان کو شمار کرنے کیلئے متوجہ ہوا، ابھی نظر ثانی کر ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ اسکے ہینڈ بیگ کے دونوں جانب والے تالے کھلے ہیں، یہ دیکھکر تعجب ہوا، کھڑے ہی کھڑے اپنے جوتے کی نوک سے ذرا اشارہ کیا تو وہ کھل گیا، اس کے اندر روئی کے پہاڑوں کے درمیان لیٹی ہوئی ایک نوزائیدہ بچے کی لاش تھی، ہائیں!! خوف سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جسم کا سارا خون جمتا ہوا معلوم ہونے لگا، دل کی دھڑکن بتدریج کم ہو رہی تھی، میں اسطرح لرز رہا تھا کہ جیسے لرزہ باری کیوقت جسم تھرتھری کا شکار ہوتا تھا کہ میری گرفتاری کیلئے چار دیواری کمرہ کی وسعت کو تنگ کرتی ہوئی میرے قریب ہو رہی ہے، ہر آنے جانیوالا شخص جو نظر کے سامنے سے گذرتا پولیس کا ایک شخص دکھائی دیتا تھا، ہینڈ بیگ کو فوراً بند کیا اور یقین ہوگیا کہ وہ ساحرہ غائب ہو چکی مجھے بھی جلد سے جلد بغیر کسی سامان کو اٹھائے یہاں سے چلا جانا چاہئے، ورنہ جیلخانہ میں جانا پڑیگا، بس ایک گاڑی آگرہ فورٹ کو جانے کیلئے تیار تھی، اسپر بیٹھکر روانہ ہوگیا، راستہ میں جسنا برج اسٹیشن پر اتر کر دوسری گاڑی بدلکر آگرہ پہنچ گیا، غرض اسی طرح راستہ میں جس اسٹیشن پر کہیں جانیوالی گاڑی ملتی ہٹ دو ٹکٹ کا لیتا اور [illegible] چلدیتا، راستہ میں دوسری گاڑی بدلتا غرض اسی طرح متھرا، پھر توڑ، بیانا، دھولپور، گوالیار، جھانسی، کانپور، لکھنؤ، بریلی، پرتاپگڈھ اور بنارس ہوتا، مختلف ریلوے لائنوں کا ایک جال سا بنتا ہوا تین چار یوم کی مسافت کے بعد الہ آباد تمام پھر پہنچگیا، راستہ میں دوسرے دن ایک اخبار میں اس واقعہ کی خبر اسطرح مندرج تھی

"لاوارث سامان کے ساتھ ایک بچہ کی لاش"

"۲۱ر۲۲ اگست کی درمیانی شب کو قریب ڈھائی بجے ایک نوجوان مع ایک نوعمر حسین خاتون کے ٹونڈلا اسٹیشن پر درجہ دوم کے مسافر خانہ میں مقیم ہوئے، بعد ازاں معلوم نہیں کسوقت وہ لوگ سارا سامان چھوڑ کہیں روانہ ہوگئے، افسران ریلوے نے معاملہ کو پولیس کے سپرد کر دیا ہے جو تفتیش کر رہی ہے"

میرے اعزا کے تار یعنی میرے ہونیوالے قانونی والد، قانونی بھائی، اور قانونی بہنوئی کے علیحدہ علیحدہ خیریت کے تار جو مختلف اوقات میں ان تین چار دن کے درمیان روانہ کئے گئے تھے ہوٹل کے دفتر میں میرا انتظار کر رہے تھے، میں نے سب کو جواباً تار دیئے کہ "علالت کی وجہ سے دہلی نہیں پہنچ سکا، اب اچھا ہوں"۔

جب آئینہ میں میں نے اپنی صورت دیکھی تو سر کے بال پریشان تھے۔ داڑھی اور مونچھ کی نمو نے نصف چہرہ کو قدرتی میں شامل کر لیا تھا، جسم پر اچکن کے دھوئیں نے سیاہ استر کر دیا تھا، کپڑوں نے اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر خاکی رنگ اختیار کر لیا تھا، میں نے اپنے عکس سے پوچھا، کہئے؟ اپنی محبوبہ منگیتر صاحبہ سے ملاقات کر آئے۔ انٹرویو کیسا رہا؟ پھر میں نے خود ہی جواب دیا

"جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے"

ایثار

بنگال کے ایک مشہور ناول نویس کے ایک شاہکار کا لطیف عکس

از

جناب سہیل عظیم آبادی

(۱)

اگر کسی بیوپاری کو یہ خبر ملے کہ اس کا سارا بیوپار بیٹھ گیا، تو اس کے دل کی حالت کیا ہو گی؟ اس کے چہرے کا رنگ بدل کر کیسا ہو جائیگا؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن جب صبح سویرے ہی اظہر حسین کو یہ خبر ملی کہ اللہ نے انھیں ساتویں بیٹی کا بھی باپ بنا دیا۔ تو ان کے دل کی حالت بیوپاری کے دل سے زیادہ خراب ہو گئی، چہرے پر برسوں کے بیمار سے زیادہ اداسی چھا گئی، سر میں چکر، اور آنکھوں تلے اندھیرا سا ہو گیا۔

شرافت اور غریبی اگر ساتھ ساتھ ہو تو بڑی مصیبت ہوتی ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ سر پر بیٹی کا بوجھ بھی ہو تو پھر زندگی عذاب بن جاتی ہے، بیچارے اظہر حسین اسی عذاب میں گرفتار تھے، ان کو اپنی زندگی تھکے ہوئے مسافر کے سر کا بوجھ معلوم ہوتی تھی، مگر وہ اس بوجھ کو امیدوں کے سہارے اور دوسروں کے خیال سے اٹھائے ہوئے تھے۔

اظہر حسین ایک سرکاری دفتر میں معمولی کلرک تھے، پچاس روپئے ماہوار ان کو ملتے تھے، اس میں اپنا، بیوی، چھ بیٹیاں ایک یتیم بھتیجی اور بوڑھی ماں کا خرچ پورا کرنا پڑتا تھا، ان کے چہرے پر کبھی کسی نے ہنسی کو کھیلتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس بھیانک خوشخبری کو سن کر تو وہ پتھر کی مورت بن گئے، جیسے سانس لینے کی بھی طاقت ان میں نہ تھی،

یہ خبر دے کر ان کی تیسری بیٹی زرینہ آئی تھی، خبر سن کر اظہر حسین اس کو دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، اور پھر آہستہ آہستہ اور رکی رکی آواز میں بولے۔

"بیٹی ایک گلاس پانی تو لے آ، پیونگا"۔

لڑکی پانی لانے چلی گئی، اور اظہر حسین دروازہ کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے رہ گئے، ان کے دماغ کی عجیب حالت تھی سب سے پہلے تو سَور کے خرچ کا خیال آیا، پھر بہت سے خیالات تیزی کے ساتھ ان کے دماغ میں بھرنے لگے، جیسے کسی بڑے میلے سے واپسی کے وقت ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس میں مسافر بھرتے ہوں۔ ان کو یاد آیا کہ پچھلے ہی برس بڑی بیٹی کے بیاہ میں مکان رہن ہو چکا ہے، اور چھ مہینہ کا سود بھی نہیں دیا جا سکا ہے، عید کا مہینہ بھی نزدیک ہے، اور اس تہوار میں کافی خرچ ہوگا، بیوی، بچوں اور ماں کے

کپڑے، جوتیاں اور پھر سوتیاں، پھر امداد بھی ضرور ہی آئے گا، اس کی سلامی، اس کے آنے جانے کا خرچ اور جاتے وقت اس کے ساتھ سوغات دینا ہی پڑے گا ——— کل دفتر کا سارا کام نہیں ہو سکا تھا، اور ایک ضروری کام تھا، آج اس کو ختم کر کے بھیجنا ضروری ہے ——— اور یہ نیا صاحب تو بڑا اکڑ آدمی ہے، آتے ہی حکم جاری کر دیا کہ ہر آدمی صاف کپڑے اور کوٹ یا شروانی پہن کر ضرور آئے، نہیں تو جرمانہ دینا ہوگا، لیکن مہینوں سے دھوبی غائب ہے ——— گھر بھر کا کپڑا لے گیا ہے۔ نہ جانے اب وہ آئے گا، یا بھی نہیں؟

بیچارے اظہر حسین دیر تک اسی قسم کی باتیں سوچتے رہے۔ ان کو تھکن معلوم ہونے لگی، وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھکر چارپائی پر لیٹ گئے، اور دل ہی دل میں کہنے لگے ——— یا اللہ! اس شہر میں ہر سال سینکڑوں آدمی گاڑی سے کچل کر مر جاتے ہیں، کیا وہ تیری نظر میں مجھ سے بھی زیادہ مصیبت کے مارے ہیں، اگر کوئی موٹر، میری چھاتی کو کچل کر ایک دن نکل جاتی تو میرا بیڑا پار ہو گیا ہوتا۔

زرینہ نے پانی لا کر دیا، لیکن پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر بھی لیٹے رہے، تو زرینہ بولی۔

"ابا جان اٹھکر پانی پی لیجئے نا!"

اظہر حسین نے اٹھکر ایک ہی سانس میں گلاس بھر پانی پی لیا، اور پی کر بولے۔

"لے جاؤ بیٹی گلاس"۔

زرینہ گلاس لیکر چلی گئی، تو وہ پھر لیٹ گئے، اور چھت کو دیکھنے لگے۔

ان کی یتیم بھتیجی بلقیس نے کمرے میں آکر کہا۔

"چائے لیکر آئی ہوں، پی لیجئے نا"۔

چائے کا نام سن کر اظہر حسین اٹھ بیٹھے، بلقیس کو دیکھتے ہی جیسے ان کے دل میں غم کا دہکتا ہوا جہنم ٹھنڈا ہو گیا۔ انھوں نے کہا۔

"کل رات بھر تو جاگی ہے بیٹی، آ بیٹھ، آرام کر لے"۔

بلقیس شرماتی ہوئی ایک کونے پر بیٹھ گئی، اور بولی۔

"میں بہت زیادہ نہیں جاگی تھی بڑے ابا"۔

مصیبتوں کے پہاڑ کے نیچے دبے ہوئے چچا کی حالت کا اندازہ بلقیس سے زیادہ اور کسی کو نہ تھا۔ اظہر حسین سمجھ گئے کہ یہ جاگی ضرور ہے لیکن چھپا رہی ہے، اس کی عادت نہیں کہ جو اس کے دل پر گذرے اس کو دوسروں سے بھی کہے۔ اظہر نے کہا۔

"خیر، نہیں جاگی ہے تو بلا سے۔ میرے پاس بیٹھو بیٹی۔ آہ بیٹی! تیرا باپ مجھے اکیلا چھوڑ گیا، وہ جیتا رہتا تو آج مجھے یہ دکھ اٹھانے نہ پڑتے، میں تیرے ساتھ بھی کچھ نہ کر سکا، رہی تو اپنے غریب چچا کے ساتھ، یہ تیری محبت ہے، لیکن بدنصیب چچا کے گھر میں تجھے آرام نہ ملا، دن رات لونڈیوں کی طرح کام کرتی ہے، اور روکھا پھیکا کھا کر سو جاتی ہے"۔

بلقیس چچا کی حالت کو ٹھیک سمجھی۔ اظہر حسین کے چہرے پر گہری اداسی اور آنکھوں میں آنسو کی چمک دیکھ کر اس نے بات بدلکر کہا۔

"بڑے ابا! آپ تو مفت ہی پریشان ہوتے ہیں، کام کون نہیں کرتا، میں ہی اکیلی تھوڑے ہی کرتی ہوں، دادی اماں ترکاری چھیلتی کاٹتی ہیں۔ بڑی اماں کھانا پکاتی ہیں۔ کل تک تو انھیں نے پکایا۔ زکیہ پانی بھرتی ہے۔ زرینہ لکڑی لا کر چولھے کے پاس رکھتی ہے، میں سالن پیتی ہوں، نجمہ اور سلمہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں۔ آپا سسرال ہی چلی گئیں، بھلا بتایئے تو کون کام نہیں کرتا، آپ میرے لئے اتنے کیوں پریشان ہیں ——— اور ہاں سب سے تو زیادہ آپ کام کرتے ہیں ——— کیوں؟

بلقیس جواب دیکر مسکرا دی۔ اظہر حسین بھی یہ بات سنکر

ہنس پڑے، اور بلقیس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولے۔

"تو آج کھانے کا کیا انتظام ہوا بلقیس؟"

"بلقیس جیسے چونک سی پڑی اور بولی۔

"ہاں بڑے ابا! کہا نا میں ہی پکار ہی تھی، ترکاری چولہے پر چڑھی ہے۔"

یہ کہکر بلقیس تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ اظہر حسین محبت بھری نظروں سے اس کے جانے کے بعد بھی دروازے کی طرف دیکھتے رہے، پھر ان کے منہ سے آہستہ سے دعا نکلی۔

"خدا تجھے خوش رکھے۔"

اظہر حسین دل ہی دل میں بلقیس کو دعائیں دے رہے تھے، یکایک انکی نظر ایک نوجوان پر پڑی، جو سفید شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے مکان کے سامنے راستہ پر تیزی سے چلا جارہا تھا اظہر حسین نے پکار کر کہا:۔

"کون، شاہد؟"

ایک لمبے چوڑے خوبصورت نوجوان نے آواز سنتے ہی پلٹ کر دیکھا، اور مسکرا کر بولا۔

"کیا ہے چچا؟"

"سنو، سنو تو ذرا"

اظہر نے کہا۔ نوجوان آہستہ آہستہ انکے پاس چلا آیا۔ وہ بولے:۔

"اور تم نے کچھ سنا بیٹا؟"

کیا؟ ہاں یاد آگیا۔ چچی کے پھر لڑکی پیدا ہوئی ہے نا؟

"ہاں۔ میری مصیبتوں میں ایک اور مصیبت بڑھ گئی ہے۔"

اظہر حسین اس کا منہ دیکھنے لگے۔ ان کو شاہد سے امید تھی کہ ہمدردی ظاہر کریگا۔ لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ ان کو خیال آیا کہ خود مالدار آدمی کا بیٹا ہے۔ اس کو غریب کا دکھ کیا معلوم۔ مالدار آدمی کیلئے بیٹا بیٹی دونوں برابر، لیکن غریب کے لئے تو بیٹی کا پیدا ہونا مصیبت ہے۔ شاہد نے ان کے چہرے کا رنگ دیکھ کر ان کے دل کا حال معلوم کر لیا، اور مسکرا کر بولا۔

"آپ تو بیکار ہی پریشان ہوتے ہیں چچا، اللہ ہر ایک کو اسکا انتظام کرکے پیدا کرتا ہے۔"

اظہر حسین کو شاہد کی بات پر ہنسی سی آگئی، اور وہ ہنستے ہوئے بولے۔

"تم غریبی کی مصیبت کو نہیں جانتے بیٹا۔ نہیں تو تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس کو میں بھی جانتا ہوں۔

شاہد یہ جواب سنکر شرما گیا۔ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا، تو اظہر بولے،

"ہاں بیٹا سچ کہتا ہوں، تم اس کو نہیں سمجھ سکتے بیٹا، نہیں تو کسی کو اپنا بچہ بھاری ہوتا ہے؟ اب دیکھو میرا کیا حال ہے۔ اس گھر میں ہوں، کبھی یہ میرا تھا، لیکن پچھلے ہی سال مجھے رہن کرنا پڑا۔ تمھارے ابا نے مہربانی کی، رہن رکھکر روپیہ دیدیا، خیر ایک غریبی کی مصیبت کو کیا جانو۔ سوچو، بلقیس کتنی اچھی لڑکی ہے، صورت سیرت ہر لحاظ سے ایسی ہے کہ اس کا کسی بڑے گھر میں بیاہ ہو، لیکن بڑے گھر میں کیسے ہوسکتا ہے، ہیرے کی قدر تو بادشاہی کرتا ہے، کوئی گڈریا کیا کرے گا، لیکن ہیرا کو گڈریا ہی کے سپرد کرنا پڑے، تو بولو کیسے دکھ کی بات ہے، آجکل تو دولت کی چمک نے خوبیوں کو ماند کر دیا ہے، کون اس کو دیکھے گا، آجکل تو ہر لڑکا کا سسرال والوں سے روپیہ چاہتا ہے ـــ اور بتاؤ میں روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔

اظہر حسین کے منہ میں جو کچھ آیا کہہ گئے، ان کا دل بھر آیا، آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے، زبان لڑکھڑانے لگی، وہ کمرے سے اٹھکر باہر سائبان میں گئے، اور ناک صاف کرکے واپس آئے، شاہد بالکل چپ تھا، انھوں نے پھر کہا:۔

"شاہد! تم سے بھی کہدیتا ہوں۔ اگر تمھاری نظر میں کوئی غریب بونہار لڑکا ہو، تو بتاؤ۔ اب بلقیس کی شادی کی فکر بھی کرنی چاہئے، خیر سے اب وہ جوان ہوئی۔ بیٹا تمھارا بڑا احسان ہوگا، اور میرے سر سے بوجھ اتر جائیگا۔ سنو۔ بھولنا مت۔"

شاہد نے جواب دیا۔

"اچھا کوشش کروں گا۔"

اسی بیچ میں بلقیس چائے کی دوسری پیالی لے کر آگئی۔ اس نے سمجھا کہ کوئی دوسرا آدمی ہے۔ اس لئے واپس جانے لگی۔ لیکن اظہر حسین نے پکار کر کہا۔

"شاہد بھائی ہیں تمھارے چلی آؤ بیٹی۔"

بلقیس کمرے میں چلی آئی۔ اور شاہد کو دیکھکر شرماگئی، اور چائے شاہد کو دیکر بولی۔

"آپ تھے، میں سمجھی کہ کوئی اور ہے۔"

یہ کہکر وہ پھر گھر میں چلی گئی۔ اظہر حسین نے پھر کہا۔

"دیکھو شاہد، بھولنا مت۔ بیٹا مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

شاہد ہنسنے لگا۔ اظہر حسین اس کا منہ تکنے لگا۔ سمجھے کہ ان امیر بچوں کو غریبوں کے دکھ کی کیا پروا۔ لیکن شاہد نے کہا۔

"چچا آپ فضول ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھئے۔ آدمی پر بھروسہ کرنا کیا کرے گا؟"

اظہر حسین کچھ جواب دینا چاہتے تھے لیکن بلقیس چائے کی دوسری پیالی لئے آگئی۔ تو وہ بات بدلکر بولے۔

"آج تم اتنے سویرے کہاں جا رہے ہو؟"

شاہد نے جواب دیا۔

"بازار جا رہا ہوں۔"

شاہد نے چائے ختم کی اور اٹھکر جانے لگا تو اظہر حسین بولے۔

"بھول مت جانا۔ یاد رہے گا نا ——"

شاہد پھر ہنسنے لگا، اور سلام کرکے چلا گیا۔ اس لڑکے کی عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ لیکن ایم اے کے بعد وکالت پڑھنا شروع کیا اور وہ بھی ختم کرچکا تھا۔ اور وکالت شروع کردی تھی، اس کے باپ مولوی نصیر صاحب نے چمڑے کے کاروبار میں لاکھوں روپیہ پیدا کرلیا تھا۔ لیکن خود بوڑھے ہوچکے تھے۔ اس لئے کاروبار سے الگ ہوکر اپنا سارا وقت روزہ نماز میں —— گزارتے ہیں۔ بڑا لڑکا زاہد سارا کاروبار سنبھالتا ہے۔ اور چھوٹا شاہد ہے۔ لیکن اس کو کاروبار سے اتنی دلچسپی نہیں۔ یہ اپنا سارا وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتا ہے۔

مولوی نصیر کا مکان اظہر حسین کے مکان سے بالکل ملا ہوا ہے، دونوں گھروں میں آنے جانے کے لئے ایک کھڑکی بھی ہے، عورتوں کا آنا جانا اور میل ملاپ بھی بہت زیادہ ہے۔ کسی طرح کوئی غیریت نہیں پائی جاتی۔ دونوں گھر ایک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مجال نہیں کہ اظہر حسین کے گھر میں کوئی اچھی چیز پکے اور مولوی نصیر کے یہاں نہ جائے۔ یا مولوی نصیر کے یہاں پکے اور وہ لوگ اکیلے کھائیں۔

مولوی نصیر کی محلہ میں تو کیا، شہر بھر میں بڑی عزت تھی، بڑے مذہبی لوگوں میں گنے جاتے تھے، روزہ نماز کے بڑے پابند تھے۔ ایک مسجد انھوں نے بنوائی تھی، موقع موقع سے قومی کاموں میں معمولی سا چندہ بھی دیدیا کرتے تھے، ہاں لوگ ان کی اتنی برائی ضرور کرتے تھے کہ ذرا کڑے مزاج کے آدمی ہیں، کسی کے ساتھ مروت نہیں کرتے، اور سود بھی کھالیا کرتے ہیں۔ اور روپے پیسوں کے معاملہ میں کسی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے۔

(۲)

شاہد ہونہار لڑکا تھا۔ ایم اے بی ایل کی ڈگری، نیک چال چلن کا اچھا۔ وہ کئی آدمیوں کی نظر پر چڑھ چکا تھا۔ اور اس کے بیاہ

کی بات چل رہی تھی، آخر شہر ہی کے ایک دوسرے محلہ میں بات پکی ہوگئی۔ لڑکی کے باپ مالدار آدمی تھے، اور شاہد کے باپ مولوی نصیر بھی چاہتے تھے، انھوں نے اچھا گھر دیکھا۔ کافی جہیز اور آمدنی ملنے کی امید پر بات پکی کرلی۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ نکاح اگلے مہینہ کی کسی اچھی تاریخ دیکھکر کردیا جائے۔ لیکن شاہد کی ماں نے اس کو ٹالدیا، اس نے کہا کہ ظہیر (شاہد کا ماموں زاد بھائی) کی دلہن اس مہینہ کے بعد آنے والی ہیں۔ لڑکی ان کی رشتہ دار ہے، شاہد اپنی بھاوج سے لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھے گا، میں پھر زاہد یا ظہیر کی دلہن کے ذریعہ یہ پتہ چلاؤں گی کہ شاہد کو یہ نسبت پسند ہے یا نہیں؛ تب نکاح ہوگا، شاہد جہاں بہت نیک ہے، وہاں بہت سلیقہ والا لڑکا بھی ہے۔ اگر کہیں لڑکی بے تمیز یا جاہل ہوئی تو دولت کوئی کام نہ آئے گی، وہ ساری زندگی پریشان رہے گا۔

لیکن مولوی نصیر کی نظر لڑکی کے باپ کی دولت پر تھی، بیوی کی یہ بات سن کر بہت گھبرائے، تو بولے۔

"میں نے ساری باتیں معلوم کرلی ہیں، اب اور کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔ شاہد وہاں شادی کرکے ہر طرح خوش رہے گا، تم اطمینان رکھو۔ اگر گڑبڑ کروگی تو پھر ایسا گھر نہ ملے گا۔"

لیکن شاہد کی ماں نہ مانیں، اور نکاح کی تاریخ پکی نہ ہونے دی۔ مولوی نصیر کو اس کا بڑا افسوس ہوا۔ بیوی غصہ ہوگئے، دن بھر باہر بیٹھے رہے، ایک وقت کھانا بھی نہ کھایا دوسرے وقت ہوٹل سے منگا کر کھایا، اور دو تین دن تک بیوی سے بات تک نہ کی۔ اور منہ بنائے رہے، شاہد کی ماں جب کچھ پوچھنے بھی گئی تو کچھ نہ بولے۔

شاہد ذرا صفائی پسند اور شوقین مزاج نوجوان تھا۔ اس لئے وہ سب سے الگ تھلگ دوسری منزل کے کمرہ میں رہتا تھا۔ اس میں ساری چیزیں تمیز کے ساتھ رکھی تھیں، میز سنگھار میز، کرسیاں، کتابوں کی الماری، کپڑوں کی الماری، اور بکس، مسہری اور ساری چیزیں الگ الگ اور خوبصورتی سے رکھی تھیں۔

ایک دن اس کے ہونے والے سسر نے اس کو بلا بھیجا، عورتیں اس کو دیکھنا چاہتی تھیں، باپ نے بھی مجبور کیا، تو وہ جانے کی تیاری کرنے لگا، وہ آئینہ کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ بلقیس وہاں پہنچ گئی دیر تک شاہد کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی:۔

"سسرال جا رہے ہیں؟"

شاہد نے گھوم کر دیکھا اور ہنستا ہوا بولا:۔

"تم آگئیں، اچھا ہوا، خوب اچھی طرح مجھے سنوار دو کہ سسرال والے دیکھتے ہی پسند کریں۔ کہیں لوگوں نے پسند نہیں کیا تو بڑی بے عزتی ہوگی"۔

یہ کہکر اس نے اپنی عادت کے مطابق ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

بلقیس نے ہنس کر کہا:۔

"اس وقت تو مجھے بہت سے کام ہیں۔ صرف آپ سے روپئے لینے آگئی ہوں، اور زیادہ سنوار سنگھار کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بھابی تو دیکھیں گی نہیں"۔

اتنا کہہ کر بلقیس ہنس دی اور تکیہ کے نیچے سے کنجیوں کا گچھا نکالکر ایک دراز کھولا، کچھ روپئے نکال کر آنچل میں باندھے، پھر بولی:۔

"شاہد بھائی! جب بھی ضرورت ہوتی ہے، میں روپئے لے ہی لیتی ہوں، مگر یہ ادا کیسے ہوں گے؟"

شاہد نے مسکرا کر بلقیس کو دیکھا۔ اور میز پر برش رکھتے ہوئے بولا:۔

"روپئے ادا ہونے بھی چاہئے ہیں"۔

بلقیس شاہد کے لفظوں کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اور اسکو دیکھنے لگی۔ شاہد نے ہنس کر کہا:۔

"ابھی نہیں سمجھو گی بلقیس"۔

اور جلدی جلدی کپڑے اور جوتے پہنکر باہر چلا گیا، بلقیس اس کو دیکھتی رہ گئی۔ جب وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو بلقیس نے پکار کر کہا:۔

"اے شاہد بھائی، بھابی کو میرا آداب کہدیجئے گا۔ ضرور"۔

شاہد نے ہنس کر کہا:۔

"شریر"!!

اور باہر چلا گیا ——

رات کا وقت تھا شاہد ایک کوچ پر لیٹ کر کتاب دیکھ رہا تھا، کہ اس کی ماں آگئی، اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، شاہد اٹھ بیٹھا۔ ماں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"ارے سنا ہے کہ ظہیر کی دلہن بھی آجکل وہیں ہیں کیوں ان سے ملاقات ہوئی تھی؟

شاہد ماں کے مطلب کو سمجھ گیا۔ اس نے آنکھیں نیچی کرکے جواب دیا:۔

"جی ہاں"۔

ماں جلدی سے پوچھ بیٹھی:۔

"ارے وہ لڑکی کے بارے میں کچھ لو لیں بھی"۔؟

شاہد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی ماں سمجھ گئی کہ اس سوال کا جواب ہرگز نہ دیگا، وہ کرسی سے اٹھ گئیں اور جاتے ہوئے بولیں۔

"تو مجھے ہرگز نہ بتائے گا، بھیج دیتی ہوں تیری بھابی کو۔"

وہ چلی گئیں۔ شاہد کی ماں کا نام تھا زینب، عمر کوئی پچاس سال تھی، لیکن دیکھنے میں پینتیس چھتیس کی معلوم ہوتی تھیں۔ اب ان کی عمر کافی آچکی تھی، مگر اب بھی ان کے چہرے کا رنگ روغن باقی تھا۔ بدن کا رنگ رنگ سڈول تھا، اور سب سے زیادہ ان کا دل اچھا۔ دیہات کی لڑکی تھیں۔ سادگی میں پالی پوسی گئی تھیں، اور سادگی کے ساتھ اپنی ساری زندگی گذار چکی تھیں۔ ان کو آجکل شہر کی لڑکیوں کا رنگ ڈھنگ اور طور طریقہ پسند نہ تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ لڑکی کیسی ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتی تھیں کہ لڑکی سلیقہ والی اور تمیزدار ہو —— اور سب سے زیادہ یہ کہ شاہد کو پسند ہو۔

شاہد، ماں کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ خود ہنس مکھ تھا، اور ماں بھی خوش مزاج تھیں۔ اس لئے کبھی کبھی ان کو چھیڑ دیا کرتا تھا، پیار سے شرارت بھی کرتا تھا لیکن بے تمیز نہ تھا۔ ماں نے جب سوال کیا تو وہ جواب نہ دے سکا۔ حالانکہ اگر وہ سسرال سے ہو کر نہ آتا اور ماں پوچھتیں کہ لڑکی کیسی ہے، کیا معلوم ہوا، تو وہ ضرور کہدیتا۔ "کالی الٹے توے جیسی۔ بس اس کو کوا سمجھو"۔ اور ہنس دیتا۔ ماں کچھ بولتی تو وہ ابھی چڑ جاتا۔

اس کی ماں کو گئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اس کی بھاوج آ گئیں اور ہنستی ہوئی بولیں:۔

"دکھلا آئے اپنی چاند سی صورت —— ارے وہ لوگ تمہیں دیکھکر آنکھیں ملنے لگی ہونگی —— لیکن یہ تو بتاؤ۔ بھائی ظہیر کی دلہن سے کیا معلوم ہوا۔ لڑکی کیسی ہے؟ ہے نا تمہارے جیسی۔؟

شاہد نے منہ بنا کر کہا ——

"نہیں بھابی۔ بالکل کالی ہے۔ کوے کی دم جیسی"۔

بھاوج نے ہنس کر کہا۔

"اب تم شرارت کرنے لگے۔ بھائی سچ بتاؤ"۔

شاہد نے پھر سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"بہت خوبصورت ہے بھابی۔ بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔

چاند ہی ہے جی۔ بھابی تو کہہ رہی تھیں کہ جس دن وہ ۔۔۔ ارے وہ لڑکی کوٹھے کی چھت پر چلی جاتی ہے، تو چاند شرم کے مارے نہیں نکلتا۔"
بھاوج نے بات کاٹ کر کہا۔
"معلوم ہوگیا۔ ہے خوبصورت جبھی ہری ہری سوجھ رہی ہے۔ کالی ہوتی تو تمھارا منہ بنا ہوتا۔ ۔ ۔"
شاہد نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا
"یہ منہ بھی بن گیا۔ اور کیا چاہتی ہو؟"
بھاوج نے کہا۔
"معلوم ہوگیا۔۔۔ ہاں یہ تو بتاؤ کچھ پڑھی لکھی ہے۔ اور اب بھی پڑھتی ہے یا نہیں۔۔۔؟
شاہد نے سنجیدہ بنکر کہا۔
"جی ہاں اس نے بہت کچھ پڑھ لیا ہے، آعوذ۔ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ۔ ابا، اماں، داوا، وادی، اور اب پڑھتی ہے۔ پیر فقیر اٹھا بستر چل مکے کی زیارت کو۔ اللہ نبی جی روزی بھیجو۔"
بھاوج نے تنک کر کہا۔
"معلوم ہوگیا تمھیں لڑکی پسند آگئی۔"
"واہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا بھابی۔ بغیر دیکھے کوئی چیز پسند کیسے کی جاسکتی ہے۔؟"
بھاوج نے ذرا سنجیدہ بن کر کہا۔
"نہیں بھائی سچ سچ بتاؤ۔ کیا کیا معلوم ہوا۔ ظہیر بھائی کی دلہن نے کیا کیا بتایا؟"
شاہد نے سنجیدہ بن کر جواب دیا۔
"میں نے ان سے کچھ پوچھا ہی نہیں، ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ سب کی خیریت پوچھتی رہیں، میں بتاتا رہا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں کچھ پوچھوں، آخر وہ خود ہی اس کی تعریف کرنے لگیں۔ تو میں وہاں سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ اب زیادہ وقت نہیں ہے۔"
شاہد نے اپنا جملہ ختم ہی کیا تھا کہ اس کی ماں دروازے سے کمرہ میں آئیں۔ اور آتے ہی بولیں۔
"میں سمجھ گئی۔ وہاں شادی کرنا پسند نہیں ہے۔"
شاہد نے سر جھکا لیا۔ اتنے میں وہاں بلقیس بھی پہنچ گئی۔ شاہد نے نظر اٹھا کر ماں کو دیکھنا چاہا۔ اس کو سامنے بلقیس نظر آئی۔ اس نے پھر سر جھکا لیا۔ شاہد کی ماں نے بلقیس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا۔
"کیوں بیٹی؟"
بلقیس نے آہستہ سے کہا۔
"کچھ نہیں اماں ۔۔۔"
بلقیس پہلے شاہد کی ماں کو چچی اماں کہتی تھی۔ لیکن ایک دن انھوں نے اس سے کہا۔
"میں تیری چچی کیوں ہوں، ماں کیوں نہیں؟ میں تیری ماں ہوں۔ مجھے اماں کہا کر۔"
اسی دن سے بلقیس شاہد کی ماں کو اماں کہنے لگی۔ شاہد کی ماں کہتی تھیں کہ جب بلقیس مجھے اماں کہتی ہے تو دل خوش ہوجاتا ہے، وہ مجھے اپنی ہی بیٹی جیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ پھر بولیں۔
کیوں بیٹی اپنی بھاوج کے بارے میں پوچھنے آئی ہے نا، تیرے بھائی کو وہ پسند نہیں ہے۔
یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ شاہد نے اپنی بھاوج سے کہا۔
اماں اس بیچاری سے تو بیکار ہی بات کرتی ہیں۔ اس غریب کو بات کرنے کی فرصت کہاں۔ گھر پر نہ جانے کون کون کام کرنا باقی ہوگا۔ کیوں بلقیس کھانا پکتا چھوڑ کر آئی ہونا؟ اتنا لکھکر وہ مسکرا دیا۔ بلقیس اس طعن کو سمجھ گئی۔ لیکن اسکا

بھاوج نے کہا۔

"واہ! بلقیس کھانا کیوں پکانے لگی"۔

بھاوج کا جواب سنکر شاہد سمجھ گیا کہ اس کی ماں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا ہے، کہ دونوں وقت کھانا پکواکر بھجوا دیا کرتی ہیں، شاہد نے ایک اطمینان کی سانس لی اور چپ ہو رہا۔

ایک مہینہ اور گذر گیا، ایک دن شاہد اپنے کمرہ میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا، بلقیس آئی، اور تکیہ کے نیچے سے کنجیوں کا گچھا نکالکر دراز کھولنے لگی، اس سے کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی، شاہد نے کتاب سے نظر ہٹائے بغیر کہا:۔

"کیا ہے؟"

بلقیس نے کہا:۔

"روپئے لے رہی ہوں"۔

شاہد نے ایک بار کہا "ہوں"۔ اور اسی طرح کتاب پڑھتا رہا، بلقیس روپئے لیکر آنچل میں باندھنے لگی۔ آج وہ خوب بن سنور کر آئی تھی، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ شاہد اسکو ایک نظر دیکھ لے۔ اس نے کہا:۔

"شاہد بھائی دس روپئے لئے ہیں"۔

اس نے کہا "اچھا" لیکن بلقیس کی طرف نہ دیکھا جب بلقیس نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف نہیں دیکھتا، تو چیزیں اٹھا کر ادھر ادھر رکھنے لگی، جب اس نے دیکھا کہ شاہد دیکھتا ہی نہیں تو تھک کر کواڑوں کے پاس کھڑی ہو گئی، وہ چاہتی تھی کہ شاہد دیکھے تو اس سے اجازت لے، اور اس کے لئے شاہد سے حکم لینا ضروری تھا، وہ شاہد کے حکم بغیر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔

کسی نے بلقیس سے یہ نہ کہا تھا کہ شاہد کے بغیر کوئی کام نہ کرو، بلکہ خود اسکا دل کہتا تھا کہ شاہد کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہئے، کیوں، یہ خود وہ نہیں جانتی تھی، مگر یہ سمجھتی تھی کہ چاہے جو بھی ہو جائے اپنی مرضی کے مطابق کام نہ کرے، مگر اس کو شاہد کی مرضی کے مطابق کرنا چاہئے،

بلقیس نے کواڑ کی آڑ میں ہو کر آہستہ سے کہا:۔

"شاہد بھائی ہم لوگ بائسکوپ جا رہے ہیں"۔

لیکن شاہد نے اس کی آواز نہ سنی، اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ تو پھر وہ ذرا زور سے بولی:۔

"سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں"۔

اس بار شاہد نے اس کی آواز سنی، اور کتاب الگ رکھکر پوچھا "کیا کہا، کیا کہتی ہو"؟

بلقیس نے منہ بنا کر کہا۔

"اتنی دیر میں آپنے سنا، ہم لوگ آج بائسکوپ جا رہے ہیں"۔

شاہد نے کتاب کو الگ رکھتے ہوئے کہا۔

"کون لوگ؟"

بلقیس نے جواب دیا:۔

"میں، آپا، زرینہ، اور امتیاز بھائی اور پھوپھی اماں"۔

شاہد نے پوچھا۔

"امتیاز بھائی۔ کون؟

بلقیس نے جواب میں ہنس کر کہا:۔

"آپ نہیں جانتے، وہ میری بڑی پھوپھی کے بیٹے ہیں ان کو آئے ہوئے بارہ دن ہوئے، کالج میں نام لکھوایا ہے، بی اے میں۔ چار دن ہوئے انھوں نے پاس والا مکان کرایہ پر لے لیا ہے، اسی میں رہتے ہیں، امتیاز بھائی بڑے اچھے آدمی ہیں بھائی"۔

شاہد نے پھر کتاب اٹھا لی، اور ایک ورق الٹکر دیکھتے ہوئے بولا

یہ بات ہے، جبھی تو تم چار پانچ دنوں سے نظر نہیں آئیں۔ آخر بھائی ہیں، کیوں تاش اور کیرم بورڈ بھی چلتا ہے نا؟ اب تو تمھارا اسکول جانا بھی بند ہوگیا، اور کام بھی کچھ نہیں۔"

بلقیس شاہد کی گفتگو کا رنگ بدلا دیکھکر چونک پڑی اسکو اس بات کا خیال تک نہ تھا کہ کبھی ایسا بھی سوال اٹھ سکتا ہے، وہ چپ ہو رہی، شاہد نے پھر اسی طرح نظر کتاب پر جمائے ہوئے پوچھا۔

"اس طرف روز تاش چلتا ہے نا؟"

بلقیس نے اپنی لاچاری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"امتیاز بھائی کے کہنے سے"۔

"امتیاز کے کہنے سے، کیا کہنے سے"،

یہ کہتے ہوئے شاہد نے بلقیس کو دیکھا، بلقیس سہم گئی، ایک لمحہ دیکھتا رہا، وہ کچھ جواب نہ دے سکی، تو شاہد نے کتاب پر نظر جماتے ہوئے کہا:۔

"ایک دم تیار ہو کر آئی ہو، پھر پوچھنا کیا ہے؟ جاؤ"

لیکن بلقیس نہیں گئی، چپ چاپ کھڑی رہی، امتیاز پہلے صرف ایک بار آیا تھا، شاہد ان دنوں امتحان دیکر باہر سیر کے لئے چلا گیا تھا، اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، اسلئے امتیاز کو نہ جانتا تھا، اس نے پھر بلقیس کو دیکھا، وہ کھڑی تھی، اور کچھ سوچ رہی تھی، شاہد نے کہا۔

"اب سوچ کیا رہی ہو، جاؤ نا"

یہ کہکر سوفے پر لیٹ گیا، اور کتاب پڑھنا شروع کیا، بلقیس پہلے ہی کی طرح کھڑی سوچتی رہی، پھر بولی۔

"تو جاؤں؟"

شاہد نے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا:۔

"میں تو کہہ ہی چکا، جاؤ"۔

شاہد کا رنگ دیکھکر بلقیس کے دل سے سینما دیکھنے کا خیال جاتا رہا، لیکن بات ایسی تھی کہ سینما گئے بغیر بھی نہ بنتا تھا، طے ہو چکا تھا کہ سینما کا آدھا خرچ امتیاز دیگا اور آدھا بلقیس دیگی، سب تو تیار ہو چکے تھے، اب اس کا وہاں انتظار ہو رہا ہوگا، نہ جائے گی تو سب لوگ ملکر چڑھائیں گے، کہیں گے کہ شاہد نے روپئے نہ دیئے ہوں گے، بڑے ابا بھی آج کی اجازت دیدی ہے، روز روز اجازت نہ دیں گے، پھر بھی وہ جانا نہیں چاہتی تھی، لیکن بچنے کی کوئی صورت نہ تھی، وہ دو تین منٹ تک یہی سوچتی رہی، پھر بولی۔

"بس صرف آج ہی بھر جانا چاہتی ہوں"۔

شاہد نے کتاب ایک طرف پھینک دی، اٹھکر بیٹھ رہا، اور ذرا چڑھ کر بولا:۔

"بلقیس تنگ نہ کرو، جانے کا جی چاہتا ہے تو جاؤ، میں کیا کہوں، اپنا بھلا برا اب خود سوچ سمجھ سکتی ہو"

بلقیس یہ سنکر چونک پڑی، شاہد نے ڈانٹ دیا تھا۔ یہ اس کیلئے کوئی نئی بات نہ تھی، وہ بچپن سے اس سے بہت محبت کرتا تھا، اس کو خود پڑھاتا تھا، پڑھنے کے زمانہ میں اس کو کبھی کبھی مار دیا کرتا تھا، جب وہ سیانی ہوئی اور اسکول جانے لگی تو اس نے پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر ڈانٹنا کوئی نئی بات نہ تھی، بلقیس اس کی ڈانٹ سننے اور سہنے کی عادی ہو چکی تھی، لیکن ادہر ایک دو سال سے شاہد نے اس کو اس طرح ڈانٹا نہ تھا، ادہر سب انتظار۔۔۔۔ کر رہے تھے، اور وہ خود بھی تیار تھی، صرف روپئے لینے کے لئے آنا راہ کا کانٹا بن گیا، اب ساتھیوں سے جاکر کیا کہے گی،

کہیں آنے جانے کے لئے بلقیس کو آجتک آزادی تھی وہ کبھی روک ٹوک نہیں کرتا تھا، اور اسی اطمینان پر وہ آج بھی بالکل تیار ہوکر روپئے لینے آئی تھی، لیکن اب اس کو

معلوم ہو رہا تھا کہ شاہد نے اس کو جو آزادی دے رکھی تھی، اب چھین لی، وہ اپنی بے بسی پر دل ہی دل میں کڑھنے لگی، نہیں جاتی ہے تو گھر جاکر ذلیل ہوتی ہے، اور اگر جاتی ہے تو شاہد رنج ہو جاتا ہے اور یہ اس کو کسی حال میں بھی پسند نہ تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے گھر چلی آئی۔ اور زرینہ کے ہاتھ میں پانچ روپئے دے کر بولی۔

"تم لوگ جاؤ۔ امتیاز بھائی سے کہدو کر میں نہ جاسکوں گی"۔

زرینہ نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ کیسی طبیعت ہے"۔

بلقیس نے کہا۔

"میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے"۔

اتنا کہہ کر پلنگ پر کروٹ بدلکر منہ کو چھپالیا۔ زرینہ نے جاکر امتیاز سے کہا، وہ خود آیا، سب نے ملکر اسکو لے چلنا چاہا، لیکن کوئی بھی اس کو راضی نہ کرسکا۔ زرینہ کو پانچ روپئے مل گئے تھے اس لئے وہ سینما جانے کیلئے چھٹپٹا رہی تھی، کہیں اس گڑبڑی میں جانا رہ نہ جائے۔ اس نے امتیاز کو روپئے دکھا کر کہا۔

"آپا کی طبیعت خراب ہے، انھوں نے روپئے دیدیئے ہیں، وہ نہ جائینگی تو کیا ہرج ہے چلئے امتیاز بھائی ہملوگ چلیں۔ آپا نہیں جاسکیں گی"۔

امتیاز نے ضد نہ کی، اور دوسروں کو ساتھ لیکر سینما چلا گیا۔ بلقیس اپنے بستر پر پڑی روتی رہی، اسکو بار بار شاہد کا رندھا ہو چہرہ یاد آرہا تھا، اس کے کانوں میں شاہد کی غصہ ملی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔

"تیار ہو چکی ہو تو پھر پوچھنا کیا ہے۔ جاؤ"۔

(باقی آیندہ)

(بقیہ صفحہ ۲۱)

لگادی آگ کیا صیاد نے آکر نشیمن میں　　چمن کے اک شجر میں کچھ دھواں معلوم ہوتا ہے

~~~

۳۱۔ ابر:۔ حافظ ولایت اللہ شاہجہانپوری۔ تلمیذ عرشؔ۔ ڈرافسمین گیا دسٹرکٹ بورڈ۔ مولوی نورالدین مرحوم بلخی وکیل گیا، کی بزم کی آخری شمع ہیں۔ اور خاکسار عرشؔ کے ان مشاعروں کو تقریباً تیس سال تک دیکھا ہے، جن میں اساتذہ شریک ہوتے رہے۔ علوم ضروری سے باخبر، نیک مزاج، کم سخن آدمی ہیں۔ پچاس سال کی عمر ہوگی، صاحب دیوان غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک شعر یاد ہے ؎

وہ دیکھو چار کے کاندھے پہ لاش آتی ہے قاصد کی　　یہی خط کی رسید آئی یہی خط کا جواب آیا۔

~~~

۳۲۔ عرشؔ:۔ خاکِ پا سید ضمیرالدین احمد عرشؔ۔ مفصل احوال کلیات عرشؔ و کتبۂ جواہر میں موجود، علامہ ضیا احمد بدایونی، لکچرار علیگڈھ یونیورسٹی سے عاریت طلب فرما کر ملاحظہ فرمالیں۔ اب تو امیدوار فاتحہ رہ گیا ہوں۔ تذکرہ کیسا؟۔

(بقیہ مضمون ص ۵) سہنا پڑیگا، دکھ اور مصیبت اٹھانی پڑے گی، ذلت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا، اذیتیں اور کلفتیں برداشت کرنی پڑینگی لیکن خاموش ہونا پڑے گا، فریاد نہ کرنی پڑیگی، لب نہ ہلانا پڑیگا، یہاں کا اصول یاد کرئیے:-

جس کو کسی سے عشق ہو اسکو یہ حکم عشق ہے　　رنج اٹھائے غم سہے اُف نہ مگر ذرا کرے

لیوں ٹراٹسکی کی موت

ازجناب سید ابوعاصم صاحب دسنوی، بی،اے

پانچ بجے سہ پہر کا وقت اور اگست کی بیس تاریخ تھی، لیوں ٹراٹسکی چائے پیکر چمن میں چہل قدمی کر رہا تھا، وہ آج اس باغ سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس کیلئے پرژدا طبقہ بدنام ہے۔ لیکن شاید اسے سکون کی تلاش تھی عیش کی نہیں، چمن میں قسم قسم کے پودے لہلہا رہے تھے، رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے، وہ کبھی ایک نازک کلی کو چھیڑتا، اور کبھی کسی دوسرے غنچہ سے کھیلتا تھا، جو ریشم گملوں سے سر نکال رہے تھے، گلاب کی کلیاں شباب کی آخری منزل پر پہنچ چکی تھیں، مرغیاں قطار در قطار سبک خرام تھیں، خرگوش ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے، چڑیاں غروب آفتاب کی وجہ سے بسیرے کے لئے گھونسلوں میں لوٹ رہی تھیں، درخت کے آخری سائے جدائی کے لئے حیلے ڈھونڈ رہے تھے۔ شہر میکسیکو میں آسمان بالکل صاف اور نیلا تھا۔ کہیں کہیں دور بادل کے چند آوارے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔

ٹراٹسکی ان مناظر میں آج غیر معمولی لذت محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ساری زندگی انقلاب اور خفیہ سازشوں میں گذری تھی۔ لیکن دنیا کے اس بڑے انقلابی کی زندگی اب حد سے زیادہ پرسکون ہو چکی تھی۔ اس کا حلقہ اب چند جانبازوں اور وفادار رضاکاروں تک محدود ہو چکا تھا، اس کی تصانیف اب انقلاب انگیزی اور شعلہ فشانی کے لئے نہیں بلکہ اپنے غیر معمولی ادب اور کمال انشاپردازی کی بنا پر قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں، ساٹھ سال کا بوڑھا ٹراٹسکی ایک کامیاب مصنف ایک جاں نثار بیوی کا شوہر، ایک خوش منظر اور خوبصورت مکان کا مالک اور دولتمند ہو چکا تھا۔ ان سامانوں نے اس کی زندگی کو خوش و خرم بنا دیا تھا۔ جس شخص کی زندگی کا نصب العین اور سب سے بڑا مقصد متوسط طبقے کو نیست و نابود کرنا تھا وہ خود بھی اسی طبقہ کا ایک فرد ہو چکا تھا۔ گو ٹراٹسکی اس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا، ایک انقلابی فضا اس کے دماغ اور خیالات پر چھائی رہتی تھی۔ جو ممکن ہے کچھ دھندلی اور مدھم ہو چکی ہو، مگر اب بھی اس کی مختصر سی داڑھی، اس کے پتلے اور بے قرار ہاتھوں، اسکی دبلی اور چمکیلی آنکھوں، اس کے تیز مگر چوکنے قدم اور اس کی دوسری پراسرار خصوصیات سے انقلاب اور سازش کی بو آتی تھی۔ اس کے سازشی دماغ میں اب بھی انقلاب کی ایسی لہریں اٹھتی تھیں جنھوں نے، اس کو روس کے دور جدید کا بھی سب سے بڑا انقاد بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسٹیلن اس کو اپنے لئے کانٹا اور اپنی جماعت اور حکومت کے لئے مستقل خطرہ سمجھتا تھا۔ عام انقلابیوں اور سازشیوں کی طرح ترکستان سے لیکر میکسیکو تک جہاں کہیں وہ گیا ہر جگہ اپنی زندگی کا خطرہ محسوس کرتا رہا۔ اس کے بن باس کے زمانہ میں اس کا لڑکا اور دوسرے اعزہ عجیب و غریب طریقہ سے موت کا شکار ہو گئے، تین مہینے قبل وہ خود بھی قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ شہر میکسیکو ایسے بہت سے مردوں

اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا، جو ٹراٹسکی کے خیال میں سٹیلن کے کارندے تھے۔
اسی سہ پہر کو پانچ بجکر تیس منٹ پر فرینک جیکسن اس سے
ملنے کے لئے آیا، اس شخص کے متعلق میکسیکو میں عجیب وغریب
افواہیں تھیں، لوگ عموماً اس کو اس لئے مشتبہ سمجھتے تھے
کہ وہ کبھی اپنا نام لیون جیکو یا ایسے مختلف فرانسیسی و یہودی
نام بتاتا تھا، لیکن ٹراٹسکی اس کو اپنا محبوب رضا کار سمجھتا تھا
جس نے دوسرے ممالک میں غیر معمولی خدمتیں انجام دی
تھیں، چھ مہینے ہوئے کہ میں ہٹن کے کارکن سلویا اگلوف نے
جس کی بہن ٹراٹسکی کی سکریٹری رہ چکی تھی، اس کا تعارف کرایا تھا،
جیکسن ایک قدآور، قوی اور ترش رو نوجوان تھا، اس کی پیدائش
یگوسلاویہ کی تھی، کنیڈا کے پاس پورٹ پر میکسیکو آیا تھا، اس کا
انگریزی تلفظ کچھ عجیب قسم کا تھا، مسلح پولیس اور سکریٹری جو ٹراٹسکی
کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ رہتے تھے، کبھی اس کے آنے
میں مزاحمت نہ کرتے تھے، اس لئے اس دفعہ بھی بلا روک ٹوک
چمن میں چلا آیا، اور ایک مسودہ پر اس کی رائے چاہی، ٹراٹسکی
خندہ پیشانی کے ساتھ اسے گھر کے اندر لے گیا، ایک اوورکوٹ
اپنے شانوں پر ڈالے جیکسن آگے آگے جارہا تھا، طعام خانہ میں
سرنتالیا سریو ٹراٹسکی (مسز ٹراٹسکی) سے ملاقات ہوئی، اس نے
روسی آداب اور اخلاق کے مطابق چائے پیش کی، جیکسن نے
پانی مانگا، اطمینان سے پیا، اس کا اوورکوٹ اپنی جگہ سے اب
بھی نہیں ہٹا۔ جو اس کے بائیں بازو کو چھپائے ہوئے تھا، اس
کے بعد جیکسن اور ٹراٹسکی مطالعہ کے کمرہ میں چلے گئے، یہاں
بھی اوورکوٹ جسم سے علیحدہ نہ ہوا۔

مطالعہ کا کمرہ کس مپرسی کی حالت میں تھا، یہاں نہ کوئی
فرش تھا اور نہ کوئی زیبائش، البتہ بڑے بڑے نقشوں سے
ٹپا ہوا تھا، بیچ میں ایک بڑا سا ٹیبل تھا جس پر بہت ساری کتابیں
اور مسودے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے، ٹراٹسکی وہیں پر بیٹھکر
مسودہ دیکھنے لگا، جیکسن اسی کے شانوں پر جھک کر گویا خود
بھی مسودہ دیکھنے لگا، اس کے اوورکوٹ کے نیچے ایک پستول،
چھرا، اور ایک آہنی گڈانسہ چھپا ہوا تھا، اس نے سونچا تھا کہ
ایسی کاری ضرب لگائے کہ بغیر کسی شور کے ایک ہی وار میں کام
تمام ہوجائے، لیکن جیکسن اس میں ناکام رہا، اس ضرب سے
ٹراٹسکی کا سر تو پھٹ گیا لیکن تن سے جدا نہ ہوسکا، ٹراٹسکی سنبھلا
رہا، وہ سمجھا کہ شاید اس پر گولی چلائی گئی ہے، وہ کرسی سے اچھل کر
اپنے قاتل سے گتھ گیا، اور اس کا ہاتھ مروڑ دیا، جیکسن چھری، پستول
اور جوانی کی قوت کے باوجود بھی بوڑھے ٹراٹسکی پر قابو نہ پاسکا،
ٹراٹسکی نے زور زور سے چیخنا شروع کیا، اور گرتے پڑتے طعام
خانہ تک چلا گیا، وفادار نتالیا دوڑی ہوئی پہنچی اور جیکسن
کو دروازہ ہی پر دبوچ لیا، پھر فوراً ہی بوڈی گارڈ جنک کوپر
اور جوزف ہنس دوڑے، کوپر نے جیکسن کو ڈنڈوں سے مار مار
کر گرادیا، اور اس کے سر اور جسم کو پاگلوں کی طرح ٹھوکروں
سے مارنے لگا، جوزف ہنس ٹراٹسکی کو صحن تک لایا، خون سے
شرابور اور مجروح ٹراٹسکی نے کوپر کو پکار کر منع کیا" اس کی جان
نہ لو، اس شخص سے ایک واقعہ کا انکشاف ہوگا"

مورخ ٹراٹسکی کو آخری وقت بھی اتنا ہوش رہا کہ آئندہ
تاریخ میں اس کا ذکر کتنا شاندار ہو، اس نے اپنی بیوی سے
سارے واقعات بیان کئے "میں محسوس کررہا ہوں" اس نے
دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس مرتبہ وہ کامیاب ہوگئے"
گرچہ اس کا سر پھٹ چکا تھا، اور بائیں جانب فالج کا حملہ
تھا، لیکن گرین ہسپتال میں آخری وقت تک اس نے حواس مجتمع کرکے

صحیح دماغی قوتوں کے ساتھ ہینسن کو اپنا بیان نقل کرایا،

"میں ایک سیاسی قاتل کی ضرب سے موت کی آغوش میں ہوں
اس نے میرے مطالعہ کے کمرے میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا، میں نے
حتی الوسع مقابلہ کیا۔ وہ مجھ سے فرانسیسی اعداد شمار کے متعلق کچھ گفتگو
کرنے آیا تھا، اسنے اپنا وار کیا، لیکن میرے دوستوں سے کہدو کہ مجھے چوتھی
بین الاقوامی کی کامیابی کا یقین ہے، قدم بڑھاؤ۔"

پچیس گھنٹہ تیس منٹ تک وہ موت سے اسی قوت سے جنگ کرتا رہا، جو سترہ برس کی عمر سے اس کا خاص امتیاز تھا، اسپتال میں اس کے دماغ کے دو آپریشن ہوئے، اور اس کے اصرار سے اس کے قاتل کا علاج دوسرے کمرے میں ہوتا رہا۔ اس کی بیوی اس سے ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہ ہوئی، ایسے وقت میں اگر انسان کو پچھلے واقعات یاد آتے ہیں تو ٹراٹسکی کے سامنے سارے واقعات سینما کی طرح یکے بعد دیگرے آرہے ہوں گے۔ نو برس کی عمر میں کھیت چھوڑ کر اوڈیسہ کے اسکول میں اس داخلہ، سکول ہی میں مارکزم سے اس کا اختلاف، پھر جیل خانہ میں ایک عورت وڑا کا اپنے کو جلا کر خاک سیاہ کردینے کے واقعہ سے متاثر ہو کر مارکزم سے اس کا ایمان لے آنا، ۱۸۹۸ میں سب سے پہلی بار اس کا گرفتار ہونا، ماسکو میں اس کا مقید ہونا، جہاں اس نے الکزنڈرا سے شادی کی، پھر ۱۹۰۰ میں سائبریا میں محبوس ہونا، ۱۹۰۲ میں الکزنڈرا کو چھوڑ کر اس کا انگلستان فرار ہونا، پھر ٹراٹسکی کے جعلی نام پر پاس پورٹ بنانے کے سلسلہ میں لندن میں لینن سے اس کی ملاقات، ۱۸۶۴ میں مارکز اور انجلز کے کمیونسٹ اصولوں پر پہلی بین الاقوامی کا دستور العمل مرتب کرنا، لیکن چند نشستوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہونا، ۱۸۸۹ میں پیرس میں دوسری بین الاقوامی کی تشکیل اور اس میں اس کا اور لینن کا اشتراک عمل، لیکن اس جماعت میں قومی مزدور سبھا اور سوشلسٹ پارٹی کا کمزور اتحاد اور اس میں روسی پارٹی کا دور دورہ۔

اس غیر معمولی انسان کو جو اب آخری سانسیں لے رہا تھا، وہ دن بھی یاد آرہے ہوں گے جب روس میں انقلاب کی طوفان انگیز آندھیاں چل رہی تھیں، ۱۹۰۵ کا ابتدائی انقلاب جسمیں وہ دوسری مرتبہ سائبریا میں نظربند ہوا، وہاں سے فرار ہوکر آسٹریا پہنچا، وہیں سے پروڈا کے لئے برابر مضامین لکھتا رہا، ۱۹۱۳ میں بلقان کے مسئلہ میں قسطنطنیہ سے خط وکتابت کیں، ۱۹۱۶ میں پیرس سے اخراج، وہاں سے اسپین اور پھر دس ہفتہ امریکہ میں کلیر کمبل ینگ کے ساتھ "مائی آفیشل وائف" کے تماشہ میں کام کرنا، مین ہیٹن سکسنتھ او بینیو کے رسترانٔ میں ایک بیرے کی خدمت انجام دینا، یرو نکس اخبار کو اڈٹ کرنا، ۱۹۱۷ کے مارچ کے انقلاب کے بعد روس میں اس کی واپسی جہاں لینن سے مل کر اکتوبر کا عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، جرمنی سے برسٹ لٹوسک سمجھوتہ کی تکمیل جس کو وہ پرولتاری حکومت کے قیام کے لئے بے حد ضروری سمجھتا تھا، اس نے لینن کو تار دیکر پوچھا تھا کہ سمجھوتہ کے رسوم میں کیا میں لمبا کوٹ پہنوں، اس کا لینن کی طرف سے جواب کہ سمجھوتہ کے لئے ضروری سمجھو تم پیٹی کوٹ بھی پہن سکتے ہو۔

اسے وہ شاندار دن بھی یاد آرہے ہونگے جب وہ جنگی کمشنر کی حیثیت سے شکست خوردہ، بے ترتیب اور پریشان شاہی فوج کو لال فوج کے قالب میں تبدیل کر رہا تھا، اور تمام سفید نما (Whites) اور ان کے حامیوں کو روس سے خارج کر دیا تھا، پھر تیسری بین الاقوامی کا اعلان اس وقت جب اسے مستقبل قریب میں عالمگیر انقلاب نظر آرہا تھا۔

لینن کی موت کے وقت ماسکو میں اسکی ناعاقبت اندیشانہ غیرحاضری کی یاد، یہی وہ غلطی تھی جس نے عوام میں اسکی وقعت گھٹا دی اور سٹیلن کی سازش کامیاب ہوگئی، پھر اپنا وطن چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑا، ترکستان کی جلاوطنی، وہاں سے ترکی، فرانس، ناروے کی در بدری، آخر میں میکسیکو میں اس ڈرامہ کے آخری سین کا حسرتناک اختتام۔

جنگ سے پریشان، روس میں یکے بعد دیگرے مسلسل انقلابوں کی کامیابی نے ٹراٹسکی کو سازشوں کے کامیاب اثر کا غیر متزلزل یقین دلا دیا تھا۔ گو اس کے بین الاقوامی انقلاب کا تخیل ناکام رہا لیکن اس شکست کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ یہ ماننے پر آمادہ ہوا کہ اس کی زیادہ تر سازشیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اسکی چوتھی بین الاقوامی ۱۹۲۸ء میں مین ہٹن میں قائم ہوئی، اس کے روح و رواں کمیونسٹ پارٹی کے تین نکالے ہوئے ممبر تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ مزدوروں اور کسانوں کی اصلی انقلابی پارٹی یہی ہے۔ لیکن اس کے اندر خود اختلافات تھے، بعد میں اس کے ممبروں کی تعداد ۵۰۰۰ سے بھی کم تھی۔ لیکن ٹراٹسکی کو پھر بھی یقین تھا کہ مزدوروں کی نجات کا باعث ہو کر رہے گی۔ اس یقین کی قوت نے اسے اسٹیلن سے زیادہ باوقار بنا دیا تھا۔ انہی خیالات کی قوت اور استحکام نے اسکو ہٹلر اور سٹیلن کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، جنھوں نے دنیا کے طبقات ہلا دئیے ہیں۔

اس کی موت نے ساری دنیا میں ہیجان پیدا کر دیا۔

لیکن اس کے ماسکو کے پرانے رفیقوں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس وقت دنیا نے یہ بھلا دیا کہ یہ خود بھی دہشت انگیز انقلابی تھا، دنیا کے مہذب دماغوں نے اس لئے ماتم کیا کہ دور حاضر کا غیر معمولی نثار اور انشاپرداز اٹھ گیا۔ لوگ سوالات کر رہے ہیں کہ اس عجیب و غریب دماغ نے اپنے قاتل ڈکٹیٹر اسٹیلن کی سوانح مکمل کر لی، لیکن اس کتاب کا آخری باب رہ گیا۔ جس میں شرمناک جرم کی غرض و غایت کا بیان ہوتا، اور شاید اب کبھی سامنے نہ آئے، عام طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حیات اسٹیلن کا نصف حصہ انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔ اور دوسرا حصہ مکمل تھا لیکن نظرثانی کی وجہ سے پریس میں نہ جا سکا، اور پبلشر بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

جہاں تک ٹراٹسکی کی تصنیفی حیثیت کا تعلق ہے اس کتاب کی اشاعت سے کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی۔ کیونکہ تاریخ انقلاب روس کی تین ضخیم جلدیں دنیا کے بڑے ادیبوں اور مصنفوں میں اس کا پایہ بہت بلند کر چکی ہیں، شورش ہیجان اس تحریک کی ابتدا، اس کی رہنمائی اور اس کی کامیابی تک پہنچانے کی تفصیلات جس خوبصورتی سے اس نے لکھی ہیں اسی کا حصہ تھا۔

ٹراٹسکی کے قتل میں ڈکٹیٹر کا مضبوط ہاتھ کرہ ارض کے ایک نصف سے دوسرے نصف حصہ میں پہنچکر اپنا کام کر گیا لیکن اشتراکیوں اور کمیونسٹوں کی ذہنی اور اخلاقی پستی بھی آشکارا ہوگئی۔ کہ اس بہادر کی موت پر کسی نے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ جس نے اپنی زندگی قوم اور ملک کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ جو ایثار کا پتلا، قربانی کا پیکر اور خدمت کا مجسمہ تھا جس نے روس میں نام نہاد "زارازم" کو نابود کر خاک کر دیا تھا، اسے کیا معلوم کہ اسکی ایک چنگاری سے وہ خود بھی جل جائیگا۔ جس نے لینن کی موت پر ایسے تیرہ فقرے کہے تھے جو روسی ادب کے شہ پارے تصور کئے جاتے ہیں، اسے کیا خبر تھی کہ خود اس کی موت پر اسکی قوم کی آنکھوں سے محبت اور خلوص کا ایک آنسو بھی نہ نکلے گا۔ روس کا مسلم الثبوت نثار اور انشا پرداز دنیا سے کوچ کر جاتا ہے لیکن اس حادثہ عظیم پر نہ کوئی قومی مرثیہ کہا جاتا ہے، تاہم اپنا کیا جدید روس کی تخلیق میں ٹراٹسکی کے ہاتھ نہ تھے؟ سچ ہے جس قوم اور ملک کی بنیاد نفرت، قتل اور خون پر ہو اس سے کسی بھلائی کی امید رکھنی بیکار ہے، وہ قوم کی خاصیت

خس و خاشاکِ آشیانہ ما

افسانہ

جناب اظہر قادری سونبرساوی

گرمی کا زمانہ تھا۔ کالج بند ہو چکا تھا لیکن مجھے اور متین کو چند اہم ضرورتوں کے باعث پٹنہ ہی میں ٹھہر جانا پڑا۔ گرچہ میری اور متین کی رفاقت اسکول کی تو نہ تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ ہم دونوں ایک ہی ضلع کے رہنے والے تھے۔ اور جب انہوں نے ہماری ہی کالج میں داخلہ کرایا تو قدرتاً ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے پھر ایک ہی محلہ میں رہنے کا اتفاق بھی ہو گیا۔ اور ہم دونوں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے لگے اور وقت کا بڑا حصہ ہم لوگوں کی خوش گپیوں میں گذرتا اور محلہ سے کچھ دور پارک تھا۔ جہاں ہم لوگ سرشام بغرض تفریح چلے جاتے یہاں کافی ہجوم رہتا اور یہی ہم دونوں کے روزانہ کا معمول تھا۔

چودھویں کی چاندنی شب تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ اور سطح آسماں پر منور ہونیوالی قندیلیں کرۂ ارض پر ضیا باری کر رہی تھی۔ ماہتاب کی ٹھنڈی چھاؤں میں لڑکے آنکھ مچولی اور کھیل کود میں مشغول تھے ا———— انجام مستقبل سے بالکل ناآشنا ———— ہم لوگ اک بنچ پر بیٹھے ان کی طفلانہ شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یکایک پارک کے اک گوشہ سے گانے کی آواز آنے لگی ع "شکوہ ہے تو بس اپنے مقدر کا" میں ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے اس گانے میں اک دل گداز سُر پنہاں تھا ———— سراپا رنج و غم کا نمونہ ———— شاید کسی دوسرے کو اس سے کوئی لطف نہ ملے۔ . . . لیکن میں . . . . کیا انسان کی زندگی کا پانسہ یک بیک الٹ جاتا ہے ؟ . . . میں اس کے حقیقی مقصد کے سمجھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا ———— صرف اتنا سمجھ سکا کہ یہ اس کی آپ بیتی کا سرچشمن ہے میری متحیر نظریں اس کی تلاش میں سرگرداں تھیں' وہ پودوں کے جھرمٹ میں دیر تک بیٹھا صرف اسی ایک مصرعہ سے اپنا پر درد افسانہ سناتا رہا اس کی آواز رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ وہ وہاں سے اٹھا اور لوگوں سے نظریں بچاتا ہوا پارک کے باہر چلا گیا کچھ فاصلہ پر تھا۔ اس لئے اس کی صورت و شباہت کا مطالعہ کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن اک سفید پوش نوجوان معلوم ہوا۔

میری یہ انتہا کی کیفیت دیکھکر میاں متین نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیوں میاں کس خیال میں

غرق ہو۔ کیا کسی کی یاد ستا رہی ہے"؟ اتنا کہکر وہ ہنسنے لگے، پھر سلسلۂ کلام جاری کیا" اس پارک کو بھی تم نے کالج کا کچھ بال تصور کر لیا ہے، یا کچھ فلسفہ حل کر رہے ہو"؟

گانا سن رہا تھا" میں نے جواب دیا

تو تم کو گانے سے بھی شوق ہے "

"ہاں تو نغمہ جو دل کی گہرائی سے نکل کر دوسروں کے دلوں کو بھی ٹٹولے "

اسی اثنا میں گھڑیال نے نو بجائے اور پارک کا مجمع بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ اس روز کافی گرمی تھی اس لئے ہم لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے ۔اب پارک میں ہم لوگوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ بارہ سے کچھ زیادہ بج گئے ہوں گے ۔ فضائے بسیط پر ایک دل سوز سکوت طاری تھا۔ ماہتاب ہنوز منور تھا۔ میاں متین کو کچھ گانے سے بھی شوق تھا۔ وہ گنگناتے رہے پھر گانے پر بحث چھڑ گئی۔ لیکن وہ شکست کا نام ہی بہتر ہے آخر وہ جھنجھلا کر بولے

" تو کیا تم علم موسیقی کو برا سمجھتے ہو"۔

" تم بات سمجھتے ہی نہیں خواہ مخواہ الجھ پڑتے ہو میں تو ان حضرات کے بارہ میں کہہ رہا تھا جنھوں نے گانا بجانا اپنا پیشہ .... "

ابھی اتنا بولنے پایا تھا کہ وہی نوجوان جس کے دل کے ویران کھنڈر سے چند گھنٹہ قبل دکھ اور بپتا کی صدا آرہی تھی آپہونچا۔ میرے خیالات پلٹ آئے یہ نزدیک کھڑا ہو گیا۔ جسم کے سارے کپڑے بھیگے ہوے تھے۔ اس کی عمر بیس سے زیادہ نہ ہوگی ـــ قد بالا اور حسین نوجوان - ہاتھ میں اک سرخ ریشمی رومال تھا۔ جس کے اندر چند کاغذات ملفوف معلوم ہو رہے تھے ۔ کچھ دیر خاموش دیوانہ کی طرح کھڑا رہا۔ ہم لوگوں نے بھکاری تصور کرتے ہوے کہا "" ارے یار آگے جاؤ۔ یہاں کیا ملیگا"

" مجھے اک ریلوالور دیجئے"" اس نے طلسم خاموشی کو توڑتے ہوے کہا " زندگی کا کوئی فائدہ نہیں ـــــ اس کو مٹی میں ملا دینا ہی اچھا ہے"ــــــ

اس کے انداز بالکل مجنونانہ تھے ۔

" تم زندگی سے اتنا بیزار کیوں ہو۔ دماغ تو ٹھیک ہے" میں نے پوچھا

" آہ ـــ یہ نہ پوچھئے! میں پاگل نہیں۔ دیوانہ نہیں، بھکاری نہیں، ـــ اک انقلاب عظیم ـــــ زیادہ اس مجروح دل کو مت ستائیے بس مجھے اک ریوالور یا ایک تلوار کی ضرورت ہے۔ میں آج خودکشی کروں گا"

وہ بیخودی کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ ہم لوگ اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

" یہ تمھارے کپڑے بھیگے کیوں ہیں" میں نے پھر دریافت کیا

" ابھی میں گنگا کے عمیق دامن میں پناہ لینے حیات ابدی حاصل کرنے گیا تھا۔ آہ لیکن بدقسمتی ہر جگہ میرا پیچھا کرتی ہے۔ وہاں ایک سادھو نے جو دھونی رمائے کٹیا میں بیٹھا تھا۔ پانی سے نکال کر پھر مجھے تاریک دنیا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اب زیادہ کچھ نہ پوچھئے بس میری مدد کیجئے" اس نے گڑگڑاتے ہوے کہا اور فرش زمین پر قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔

میں مطمئن انداز میں اس کی زندگی کے انقلاب کے معمہ کو حل کرنے میں مصروف تھا...... کونسا راز اس کی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ — لیکن میرا دماغ واقعہ کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

"کیا میری گذارش قبول نہ کی جائے گی" اس نے پھر استفسار کیا

"بشرطیکہ اپنے راز مضمر کا انکشاف کرو"

میں نے جواب دیا۔

وہ ہم لوگ کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا

"میری داستان گناہ کی داستان ہے یا پھر غم کی۔ اور دنیا میں گناہ اور غم کے سوا اور رہے ہی کیا؟ رنگین ہیبت ناک گناہ — سرد تاریک چھبتے ہوئے غم — میں نے صرف گناہ ہی دیکھا ہے یا پھر اس کا عکس — غم — میں نے نفس و ہوس کی دہکتی ہوئی آگ دیکھی ہے۔ جس سے میرا رواں رواں ٹھٹھر گیا اور دکھ کی تپش سے میں جل اٹھا...... یہی گناہ..... فریب ہوس کی داستانیں ہیں جو میرے دماغ میں ہلچل مچاتی ہیں۔ جو میرے تمام احساسات و تفکرات کا گلا گھونٹے ڈالتی ہیں۔ میں اس داستان کے کہنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں تو اچھا سنئے۔ ہاں صرف اس لئے کہ میرے دل کا کچھ بار ہلکا ہو جائے۔ اور تم دونوں نوجوان ہو شاید اس سے سبق حاصل کرلو۔"

"دہقانی زندگی سے میں عاجز آگیا تھا۔ ایام طفلی سے دیہات کی سرسبز و شاداب فضا میں پرورش پائی اور شہر کی نیرنگیوں سے بالکل بے نیاز تھا۔ اس دیہات میں اک ہائی انگلش اسکول بھی تھا اور میں وہیں میٹرک کلاس میں تعلیم پا رہا تھا شہر کا خیالی تصور مجھے شہری زندگی کی طرف مائل کر رہا تھا۔ میں نے والد صاحب پر اپنے خیالات کا انکشاف کیا۔ والد صاحب نے مجھے منع کیا۔ لیکن افسوس میں کب ان کی باتوں کا ماننے والا تھا۔ شاید میرے جانے کا وقت میٹرک پاس کرنے پر موقوف کیا گیا تھا۔ تاکہ میں کالج میں داخلہ کرا سکوں۔

"پٹنہ پہنچنا تو آسان تھا۔ پہنچ گیا۔ اور اک ہوسٹل میں قیام پذیر ہوا۔ خیال رہ رہ کر یہی ستاتا کہ آخر اوقات گذاری کا سامان کیا ہوگا؟ یکایک یہ سوجھا کہ آخر بہتیرے نادار طالب علم ٹیوشن کے ذریعہ اپنے پڑھنے کے ماسوا اپنے گھر کی بھی کچھ مدد کرتے ہیں میں بھی کیوں نہ یہی زندگی اختیار کر لوں۔ لیکن وقت یہ تھی کہ میں پٹنہ میں نووارد تھا۔ لیکن اک روز میری نظر اک اخبار پر جا پڑی اور داشتہار کے کالم میں دیکھا بچوں کے لئے ایک بی۔ اے۔ معلم کی ضرورت ہے۔ نوجوان اور تندرست ہونا چاہیے مشاہرہ بعد میں طے ہوگا۔ درخواست جلد آنی چاہیے"

میں اس کو پڑھ کر قدرے حیرت زدہ ہوا کہ بچوں کے لئے ایک بی۔ اے۔ پاس شدہ معلم کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ اور وہ بھی نوجوان و تندرست تاہم میں نے اک عرضی بھیج دی۔"

اتوار کا روز تھا۔ درخواست دہندگان طلب کئے گئے — آہ! انجام سے بےخبر —

خدا کو بھی مجھ سے خوفناک انتقام لینا منظور تھا" اتنا کہہ کر اس کی آنکھیں گوہر بار ہوگئیں لیکن پھر سنبھلتے ہوئے کہا"

" آہ ——— میری سادہ لوحی اور بھولے پن سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مجھ ایک دلکش شکار تصور کرکے اس جال میں پھنسا لیا گیا"۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو رہا اور وحشیانہ انداز میں اِدھر اُدھر تاکنے لگا۔

وہ پھر گویا ہوا ——" اب کیا تھا مجھے اک کمرہ ملا جو اندرون حویلی سے بالکل ملا ہوا تھا۔ بیچ دیوار میں ایک دریچی تھی۔ جس کے کواڑ بند تھے۔ جس روز وہاں رہنے کا پہلا دن تھا کھڑکی کو یکایک جنبش ہوئی اور سعد و صورتیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے اس معمہ پر کوئی خاص توجہ نہ کی اور نہ تو اس امر کی خبر خانہ مالک تک پہنچانے کی ضرورت محسوس کی اور پہنچاتا بھی تو کیوں۔ کیا مجھ میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ان کی جذبات انگیز شرارتوں کا جواب میں خود نہ دیتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور واقعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا ——— اضافہ ہوا ——— بری طرح ——— کھڑکی اب ہمیشہ کھلی رہتی"

" ایک روز حسب معمول میں اپنے کمرہ میں بیٹھا کتب بینی کر رہا تھا کہ ساجد (میرا شاگرد) جو کہ زمانہ کی کج رفتاری سے بیخبر تھا ایک سرخ لفافہ دیکر معصومانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے بیٹھ گیا کہ 'باجی' نے دیا ہے۔ میں خوشی کے مارے پھولا نہ سما رہا تھا۔ دل کے اندر گدگدی سی معلوم ہوئی اور میں زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اشتیاق بھرے دل سے مکتوب شوق کھولا اور پڑھنے لگا" اتنا کہہ کر اس نے اک لفافہ جو کہ رومال میں تھا مجھے دیکر کچھ سوچنے لگا۔

نشاط روح ——— تسلیم

میں نے بار بار ہمت کی کہ آپ سے اک سوال کروں۔ لیکن شرم و حیا دامنگیر ہوئی۔ طاقت گویائی کھو جاتی اور قلم اٹھاتے بار گراں معلوم ہوتا ہے۔ افسوس آج دل پر قابض نہ رہ سکی اپنے نفس کے خلاف بغاوت کرنے پر تل پڑی ——— آخر کیوں میں غریب ہوں ——— کیوں شریف کے گھرانہ میں پیدا ہوئی ———

والدین غریب نہیں کہلاتے اس لئے کہ سفید پوش ہیں میں برملا کیوں نہ آپ سے کہدوں کہ ان کی یہی سفید پوشی میرے لئے وبال جان بن گئی ہے۔ ان کی جیب میں وہ روپیلے سکے نہیں جو اچھے داماد کو گھر لا سکیں جو مطالبے ہوتے ہیں وہ یہی بات ہے کہ ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ آخری صورت وہ اختیار کی گئی جس کے نتیجے میں آپ میرے گھر میں آگئے ہیں۔ اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ صحیح صورت حال سے آپ کو آگاہ کردوں اور میں خود سے اپنے کو آپ کی کنیزی میں پیش کردوں ——— آہ ساج ———

یہ ظالم اور بیرحم سماج ——— نہ معلوم یہ کتنوں کی زندگی برباد کرکے رہیگا۔

مجھے معاف کیجئے گا۔ میں بہت زیادہ بہک گئی

جذبات کا سیلاب ہے جو اُمڈا آرہا ہے۔ ہاں تو
میں پھر آپ سے سوال کرتی ہوں لیکن نہ معلوم کیوں
قلم میں تھرتھراہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ دل بیٹھ رہا
ہے "نہ کوسکی نامہ یار بھی" میں نے عمر کی بیس
بہاریں دیکھیں اور خزاں کا وقت بھی آپہنچا۔ بہار آئی
لیکن کوئی اس کا حقیقی معنوں میں قدرداں نہ ہوا
آپ جانتے ہیں عورت کے سینہ میں بھی دل ہوتا
ہے۔ اور دل میں حرکت بھی۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ
خود ہی قلب کی حرکت معلوم کرکے میرا مدعا سمجھ
بیٹھتے۔ اور میں ہنس کر اقرار...... کرتی۔
شاید آپ میرے اس بے حجابانہ انداز سے مجھے
دیوانی سمجھتے ہوں گے۔ لیکن کیا کروں میں
مجبور ہوں۔ مجھے امید ہے آپ معاف
کریں گے ——— آپ کی
شاہدہ

میں نے خط پڑھکر رحمٰن کو دیتے ہوئے کہا "صحیح
ہے کسی نے خوب کہا ہے "عشق اول در دل معشوق
پیدا میشود"
رحمٰن کانپ اٹھا اور کہنے لگا "للہ اس کو
عشق نہ کہیے۔" جوانی دیوانی" صحیح ثابت ہوئی۔ میں
نے اس کے انجام پر غور ہی نہیں کیا"۔
"تو پھر تم نے کیا جواب دیا" میں نے پوچھا
"ایک لامعلوم جذبہ کے رو میں بہا جا رہا تھا
جس کا ہر خواب جیش بہا مناظر پیش کر رہا تھا۔ لیکن افسوس
خواب کی تعبیر پوری نہ ہوسکی۔ کئی خطوط اور آئے جن کے

جواب میں خاموشی سے دیتا رہا"
"دسمبر کا مہینہ تھا۔ فسٹ امتحان کو ایک
ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ رات کا وقت تقریباً دو بجے
میں پلنگ پر لیٹا کتابیں دیکھ رہا تھا کہ شاہدہ نے کھڑکی
سے یہ شعر پڑھا۔

تیری تلاش میں چھانی ہے خاک دیر و حرم
کہاں کہاں نہیں ہم ہر جستجو نکلے

میں فوراً کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا ———
لیکن فوراً ہی باہری سائبان میں چلنے کی ہلکی ہلکی مگر
تیز قدموں کی آواز آئی۔ بیتابیوں نے آنکھیں بچھا دیں
میں نے اپنے کمرہ کا در کھول دیا۔ شاہدہ سہمی سہمی
اور شرمائی ہوئی علیحدہ اک کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔
اور دبی زبان سے پوچھا "میرے آنیسے آپ کو
تکلیف تو نہ ہوئی"

——— بالکل نہیں"———
"تم اسوقت کیوں کر آئیں۔ شاید کوئی
دیکھ لے تو........"
"اس وقت کون دیکھے گا"
"شاید———
"امید تو نہیں ہے لیکن ذرا آہستہ بولئے
آپ میرے خطوں کے جواب میں خاموش
کیوں رہے؟
"کیا خاموشی نیم رضا نہیں" میں نے جواب دیا
شاہدہ مسکرا گئی اور کچھ دیر بعد یہ کہتی
ہوئی کہ میں پھر کسی روز ملوں گی اللہ رون جوئی

چلی گئی۔

"اعتراف محبت کے بعد موضوع کلام کتنا مختصر اور سادہ رہ جاتا ہے وہی محبت کی باتیں، شیریں فرہاد کی کہانی اور راز و نیاز کی داستاں —— یہ تھی مری زندگی کی انبساط و شادمانی کی ساعت —— اب روزانہ شاہدہ کمرہ میں آتی اور دو تین گھنٹہ کے بعد چلی جاتی، محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں اسی اثنا میں میری یونیورسٹی کا امتحان بھی ختم ہو چکا"

اپریل کا مہینہ تھا۔ سر شام سے چند احباب نے آکر مجھے سینما چلنے کیلئے آمادہ کیا۔ فلم اچھی تھی اس لئے میں بھی جلد ہی تیار ہو گیا۔ تماشگاہ سے تقریباً ۱ بجے شب میں مکان واپس آیا۔ باہر کا برآمدہ خالی پڑا تھا۔ لالٹین مدھم کر کے سو رہا تھا کہ شاہدہ مسکراتی ہوئی آپہنچی اور لالٹین کو تیز کیا۔

'سینما دیکھ چکے'

ہاں ——'

'کون سی فلم تھی'

نیو تھیٹرز کی' زندگی'

شاہدہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے بھی اس فلم کو دیکھا ہے۔ میں خاموش ہو رہا

یہ تو سماجی فلم معلوم ہوتی ہے؟ ہے نا'

ہاں ——' میں نے بے پرواہی سے جواب دیا چونکہ غنودگی طاری ہی تھی۔

'شاید میں نیند میں خلل انداز ہو رہی ہوں، اچھا تو لالٹین مدھم کر کے جاتی ہوں' اتنا بول کر وہ لالٹین مدھم کر رہی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو روکنا چاہا نتیجہ یہ ہوا ہاتھا پائی میں لالٹین گل ہو گئی کمرہ تاریک ہو گیا۔ پرواز خیالی کی رفتار تیز ہو رہی تھی شاہدہ بحیس و حرکت گود میں دراز تھی۔ میں کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن زبان میں گرہ پڑ گئی سارے بدن میں لرزہ تھا —— کانپ رہا تھا —— ہونیوالی غلطیوں پر —— اک دوشیزہ اور وہ بھی آغوش میں ——

رات کی سیہ کاریاں ختم ہو چکیں اور شاہدہ خاموش سر جھکائے کچھ دیر بیٹھی رہی"

زمانہ گزرتا گیا۔ ایک روز دوپہر کا وقت تھا۔ میں کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ شاہدہ نے دریچے سے کہا' اے سنتے ہو! اب میں ماں ہونے والی ہوں' —— میں یہ سن کر سہم گیا۔ واقعات ماضی میرے سامنے آئینہ کی طرح جھلکنے لگے، اس وقت میں ندامت سے عرق عرق تھا —— نادم ہو رہا تھا اپنی غلط کاریاں پر —— پشیماں تھا اپنی ناتجربہ کاری پر۔

شاہدہ کیا تم سچ کہہ رہی ہو —— ؟

جھوٹ کیوں بولوں گی' یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی

میں اس کے مستقبل پر غور کرنے لگا جس کی عصمت کو خاک میں ملا ڈالا تھا۔ اسے دنیا والے عصمت فروش کہیں گے اور سماج ٹھکرائے گی لوگ حقارت کی نظر سے دیکھیں گے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میرے سامنے دو صورتیں تھیں پہلی یہ کہ یہاں سے بغیر کسی کو اطلاع کئے ہوئے نکل بھاگو

ور دوسری یہ کہ شادی کروں۔ شادی کرنا کارِ عظیم
ا۔ والدین مجھ سے ناراض تھے۔ اتنے دنوں تک
ہوں نے پوچھا بھی نہیں کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر
ا ہوں انھیں یہاں شادی کرنے کے قصد سے کیونکر
طلع کروں اگر ان کی مرضی اور علم کے بغیر کروں تو آئندہ
ا صورتِ حال سامنے آئے۔ اور اس سے کیوں کر
ات ہو۔ یہی خیالات میرے دماغ میں تھے۔ کہ شاہدہ
، والد نے مجھے طلب کیا۔ میرا سارا جسم خوف سے
انپ اٹھا ـــ آخر بحالت زاران کے سامنے پہنچا۔

' مغموم کیوں ہیں '

نہیں تو ـــ بناوٹی مسکراہٹ کیسا تھ
ہیں نے جواب دیا۔

' آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے '

ضرور ـــ ' ضرور تو کہہ دیا لیکن خوف
وحشت بھری نگاہوں سے ان کا منہ تک رہا تھا

' اگر یہ مشورہ ـ آپ ہی سے تعلق رکھتا ہو '

' کوئی حرج نہیں ' ـــ میرے چہرہ پر ہوائیاں
ڑنے لگیں اور گھبرا کر جواب دیا

' گھبرایئے نہیں کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ میرا
ارادہ ہے کہ شاہدہ کی شادی آپ سے قرار
ہی جائے تو کچھ مضائقہ تو نہیں ہے !!!

میرے چہرہ پر خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں۔
ے منہ مانگی مراد ملی۔ اور ایک بڑی مصیبت
ے نجات مگر معاً خیال آیا اور میں نے کہا میں تو
حاضر ہوں۔ لیکن والدہ سے بھی دریافت کروں۔

آپ یقین مانیے وہ راضی ہو جائیں گے '

بہت خوب ' مجھے اطلاع کر دیجیے گا ' یہ
کہتے ہوئے وہ اندر چلے گئے۔

" کچھ عرصہ کے بعد والد کا جواب آیا ـــ

آہ جواب نہ تھا قرطاس کی شکل میں میری تباہی کا
سفینہ تھا۔ انھوں نے اس گھر سے قطعی کنارہ کشی اختیار
کر لینے کا تہدیدی حکم بھیجا۔ اب میری حالت اس
ناخدا کی طرح تھی جو دو بے جوڑ کشتیوں کے درمیان
بیٹھ کر دریا کو عبور کرنا چاہتا ہو اور اگر ذرا سی بھول
ہوئی تو دونوں کشتیوں کی تباہی یقینی ہو۔ بس میں نے
ایک ہی راستہ پسند کیا یعنی شاہدہ کے والد کو کہہ دوں
کہ گرچہ میرے والدین راضی نہیں ہیں لیکن میں آپ کی
رائے کے موافق کروں گا۔

کہنا آسان تھا کہہ دیا مگر اس کو عملی جامہ پہنانا
دشوار تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی مجھے مخاطب
ہو کر کہہ رہا ہے۔ والدین سے منہ موڑنا اچھا نہیں۔
ان کے تلخ الفاظ روح پرور نغموں سے بدرجہا بہتر ہیں
میں بحر تفکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا کہ شاہدہ آپہنچی۔

ملول کیوں ہو رحمٰن! ـــ آئندہ مہینہ میں ہم
لوگوں کی شادی ہے نا۔

میں خاموش تھا۔ شاہدہ نے محبت سے میرا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے آبدیدہ ہو کر آنکھیں
جھکا لیں ـــ

' رحمٰن دیوانہ نہ بنو۔ الجھن میں کیوں ہو۔ شاہدہ
نے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ (بقیہ صفحہ ۵۷ پر)

جنگلی مکھیوں کا خواب

مترجمہ:۔ حضرت تمنائی

ایک ماں اکیلی کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی، ببول کے نیچے کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں اور گرم سہ پہر کی ہوا، اس کھڑکی سے ہوا اندر رہی تھی، مدکھیاں، جنگلی مدکھیاں جن کے پر زرد لئے گل سے پیلے ہو رہے تھے، بھنبھناتی ہوئی ببول کے درخت سے کمرے میں آ جا رہی تھیں۔ وہ ایک نیچی کرسی پر میز کے سامنے بیٹھی پھول کاڑھ رہی تھی، میز پر رکھی ہوئی پٹاری میں سے وہ دھاگے نکالتی۔ کپڑا اس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب کو آدھا چھپائے تھا۔ وہ سوئی کو کپڑے میں گھستے اور نکلتے دیکھ رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ کام کرنے میں مدکھیوں کی دھیمی بھنبھناہٹ، بچوں کی آواز سے مل جل کر اس کے کانوں میں عجیب قسم کے نغمہ کی آ رہی تھی۔ ۔ مدکھیاں، لمبے پروں والی بھڑوں جیسی مدکھیاں جو شہد نہیں بناتیں۔ بھنبھناتی اس کے سر کے قریب ہونے لگیں، اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی، اور اس نے اپنا ہاتھ کپڑا سمیت میز کے کنارے پر رکھدیا اور اپنا سر ہاتھ پر ٹیک دیا، اور باہر کے بچوں کی آواز میں اور خواب آلود ہو گئیں کبھی دور کبھی نزدیک۔ پھر وہ ان کی آواز بھی نہیں سن رہی تھی لیکن اپنے دل کے نیچے وہ جگہ محسوس کر رہی تھی۔ جہاں نوزائیدہ بچہ تھا! ـــ وہ آگے جھکی ہوئی سوئی تھی، اور مدکھیاں اس کے سر کے گرد اڑ رہی تھیں..... اور اس حالت میں اس نے ایک عجیب دماغی تصویر دیکھی، اسے خیال ہوا کہ مکھیاں لمبی ہوتی جا رہی ہیں، یہاں تک کہ وہ انسان ہو گئیں اور اس کے گرد گھوم رہی ہیں۔ تب ایک اس کے پاس آہستہ آہستہ یہ کہتی ہوئی آئی۔

"مجھے اپنے جسم کے اس حصہ پر ہاتھ رکھنے دو جہاں بچہ سویا ہے، اگر میں اسے چھوؤں گی تو یہ میرے جیسا ہوگا۔"

ماں نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

وہ بولی: "میں صحت ہوں۔ جسے میں چھوؤں گی اس کی رگوں میں ہمیشہ سرخ خون ناچتا رہے گا۔ وہ نہ تھکان جانے گا اور نہ دکھ، زندگی اس کے لئے ایک طویل قہقہہ ہوگی۔"

"نہیں" دوسری نے کہا "مجھے چھونے دو کیونکہ میں دولت ہوں، میں اسے چھوؤنگی تو مادی فکریں اس کے پاس نہ پھٹکیں گی۔ اگر وہ چاہے گا تو اپنے ہمجنسوں کا گوشت اور خون اپنے مصرف میں لائے گا اور اس کی آنکھیں جس چیز کی تمنا کریں گی اس کے ہاتھ اسے پالیں گے۔ اسے کبھی یہ احساس نہ ہوگا کہ مجھے حاجت ہے"۔ ـــ اور بچہ ابھی تک سیسہ کی طرح بے حرکت تھا۔

اور تیسری بولی: "مجھے اسے چھونے دو۔ میں شہرت ہوں جس آدمی کو میں چھوتی ہوں اسے ایک اونچی پہاڑی پر لے جاتی ہوں۔ جہاں تمام دوسرے اسے دیکھیں۔ جب وہ مرتا ہے تو وہ بھول نہیں جایا جاتا۔ اس کا نام صدیوں تک گونجتا رہتا ہے ہر کوئی دوسرے کو اس کی گونج سناتا ہے، خیال کرو ـــ زمانہ میں کبھی فراموش نہ ہونا!"۔

اور ماں بڑے اطمینان سے سانس لے رہی تھی لیکن دماغی

صویر میں وہ اسے اصرار کر رہی تھیں:

"مجھے بچہ کو چھونے دو۔" ایک بولی "میں محبت ہوں
ر میں اسے چھو لوں تو وہ زندگی کی راہ پر تنہا نہ ہوگا۔ بھیانک ور
ندھیرے میں جب وہ اپنا ہاتھ پھیلائے گا تو ایک دوسرا ہاتھ بھی
ے گا، ساری دنیا جب اس کے خلاف ہوگی، ایک ہستی اس
کہے گی "تم اور میں"! بچہ کانپ گیا۔

لیکن ایک بہت نزدیک آئی اور بولی "مجھے چھونے
دو میں قابلیت ہوں، میں سب کچھ — جو پہلے کہا گیا ہے۔
سکتی ہوں۔ میں ہی سپاہی، سیاست داں اور مفکر کو، جو کامیاب
ہوتے ہیں۔ چھوتی ہوں، اور اس مصنف کو بھی جو نہ اپنے زمانہ سے
آگے ہوتا ہے اور نہ پیچھے۔ اگر میں اس بچہ کو چھوؤں گی تو وہ اپنی
کامی پر نہ روئے گا۔"

ماں کے سر کے گرد مدھکھیاں اپنے لانبے جسم سے اسے
چھوتی ہوتی اڑ رہی تھیں۔ اور اس کی دماغی تصویر میں کمرہ کے
سایہ میں سے ایک ہستی آگے آئی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ جھریاں
پڑی تھیں۔ گال دھنسے تھے۔ اور سوکھے ہونٹوں پر کانپتی ہوئی
مسکراہٹ تھی۔ اور ماں پیچھے ہٹ گئی اور چیخ پڑی۔ "تم کون ہو!"
اس نے مجھکو جواب نہ دیا۔ اور ماں سے اپنے پلکوں کے درمیان
دیکھتی ہوئی بولی۔ "تم میرے بچے کو کیا دے سکتی ہو — صحت؟"

اور اس نے کہا: "جسے میں چھوتی ہوں اس کے خون
میں ایک جلتا ہوا بخار جاگ اٹھتا ہے، جو اس کے خون کو آگ
کی طرح چاٹ لیتا ہے، جو بخار میں اسے دوں گی، وہ اسوقت
اچھا ہوگا، جب اسے زندگی کے روگ سے شفا ہوگی۔"

تم دولت دیتی ہو؟

اس پر اس نے اپنا سر ہلایا: "جس آدمی کو میں چھوتی
ہوں جب وہ سونا اٹھانے کو جھکتا ہے تو یکایک اپنے اوپر آسمان
میں ایک روشنی دیکھتا ہے، جب وہ اسے دیکھنے کو نگاہیں
اوپر اٹھاتا ہے، سونا اس کے ہاتھوں سے پھسل کر گر جاتا ہے،
یا کبھی کوئی دوسرا گذرنے والا ہاتھ ان میں سے لیتا ہے۔

"شہرت"؟

وہ بولی: غالباً نہیں۔ کیونکہ جس آدمی کو میں چھوتی ہوں
اس کیلئے بالو پر ان دیکھی انگلیاں ایک راستہ بنا دیتی ہیں۔
اس پر اسے چلنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی یہ راہ اوپر ایکدم چوٹی پر لے
جاتی ہے۔ لیکن پھر یکایک وادی کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اسے
اسی پر چلنا ہوگا، گرچہ کوئی دوسرا اس نشان کو نہیں دیکھتا۔"

"محبت؟"

اس نے کہا: "وہ اس کی تمنا کرے گا لیکن پائے گا نہیں۔
جب وہ اپنے بازو اس کے لئے پھیلائیگا اور اپنی محبوب ہستی کو
سینہ سے لگائے گا تو بہت دور افق پر وہ ایک روشنی دیکھے گا۔
اسے اس کی طرف جانا پڑیگا، اس کی محبوب ہستی اس کے ساتھ نہیں
جائے گی۔ اسے تنہا سفر کرنا ہوگا۔ جب وہ کسی کو اپنے سینہ سے
چمٹائے گا اور کہیگا، "میری جان! میری جان! وہ ایک آواز سنے
گا، اسے چھوڑ! چھوڑ! یہ تیری نہیں ہے۔"

وہ کامیاب ہوگا؟

اس نے کہا: "وہ ناکام رہے گا، جب وہ دوسروں
کے ساتھ دوڑے گا تو سب اس سے پہلے منزل پر پہنچ جائینگے۔
کیونکہ عجیب آوازیں اسے پکاریں گی اور عجیب روشنیاں اسے
اشارے سے بلائیں گی اور اسے ٹھہرنا اور سننا پڑیگا۔ اور سب سے
عجیب بات تو یہ ہوگی کہ بہت دور جلتی ہوئی ریت سے پرے
جہاں دوسروں کی نظر میں صرف ویراں دشت ہوگا، وہ

ایک نیلا سمندر دیکھے گا؛ اس سمندر پر سورج ہمیشہ چمکتا ہے اور اس
کا پانی جلتے نیلم کی طرح نیلا ہے اور ساحل پر سفید جھاگ ہے، اس میں
ایک جزیرہ اٹھا ہوا ہے، اور اس کے پہاڑ کی چوٹیوں پر اودا سونا ابلتا نظر آتا رہیگا۔

ماں نے پوچھا: "وہ وہاں پہنچے گا؟"

وہ پراسرار انداز سے مسکرائی۔

ماں نے پھر پوچھا: "کیا یہ سچ مچ ہے؟"

اور وہ بولی: "کیا سچ مچ؟"

اور ماں نے اس کی آدھی کھلی ہوئی آنکھوں میں اس کی پلکوں
سے جھانکا اور کہا: "چھوؤ!"

اور وہ ہستی آگے جھکی اور سونیوالی پر اپنا ہاتھ رکھا، اور مسکراتے
ہوئے سرگوشیوں میں کہا — ماں نے صرف اتنا سنا: "تیرا انعام
یہ ہوگا — کہ خیال تیرے لئے حقیقت ہوگا!"

اور بچہ کانپ گیا۔ لیکن ماں گہری نیند میں سوتی
رہی۔ اور اس کی دماغی تصویر غائب ہوگئی۔ لیکن اس کے اندر
گہرائی میں جو نا مولود شے تھی، اس نے ایک خواب دیکھا۔ ان آنکھوں
میں جنھوں نے ابھی دن نہیں دیکھا تھا، اس دماغ میں جو ابھی
نصف تخلیق شدہ تھا، ایک نور کا احساس ہوا؛ روشنی کا —
جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ روشنی کا — جسے شاید یہ کبھی دیکھے گا
بھی نہیں۔ روشنی — جو نہیں تھی!

اور اس کا انعام اسے مل چکا تھا۔ مثال
(آئیڈیل) اس کے لئے حقیقت ہو چکی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۵۶) ہر خاندان کے پاس کثرت سے گائے بیل، خچر، اور گدھے رہا کرتے تھے، اور انہی جانوروں سے یہ قوم باربرداری کا کام لیا کرتی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں جب کونٹ ڈے بوسی (Count de Bussy) فرانسیسی جنرل ہندوستان کی فرانسیسی فوج کا کمانڈر بنکر آیا تھا تو وہ اسی قوم کی مدد سے ایک جنگ میں بازی لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب فرانسیسی فوج کا نظام حیدرآباد کی فوج نے محاصرہ کر لیا تھا تو اسی قوم کے تدبر و دانشمندی سے فرانسیسی فوج کو رسد پہنچی تھی۔ نیز صوبہ مدراس میں انگریزی فوج نے بھی رسل و رسائل کے لئے اسی قوم سے مدد لی تھی۔ اور لارڈ کارنوالس Lord Cornwallis نے میسور کی لڑائی کے موقع پر رسد کی بہم رسانی کی تمام تر ذمہ داری اسی لبانی قوم کے سپرد کر دی تھی۔ اور اس نے بہت ہی خوش اسلوبی کیساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا تھا

(بقیہ صفحہ ۱۵ کا) بجلی کی سرعت سے زیادہ تیزی کے ساتھ ایک خیال ذہن میں آیا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے دو ٹوک فیصلہ کے ساتھ شاہدہ سے کہا "شاہدہ
میری خطاؤں کو بخش دو، ہاں تم ماں ہونے والی ہو، آہ! جس سماج نے ہم دونوں کو اس درجہ پر پھینکا ہے — وہیں وہ دنیا کا نہ رکھا — میں اس سے برطرف ہونا چاہتا ہوں
میں منہ دکھلانے کا مستحق نہیں ہوں، — وہ کشتیوں کو چھوڑ کر میں خود بھی غرق اب ہونا چاہتا ہوں۔ شاہدہ! میری خطاؤں کو معاف کرنا" "رحمٰن تم تنہا نہیں جاتے
اب پوچھتے کو ہے۔ اور ہم دونوں گنگا ماں ہی کی گود اپنی ابدی خوابگاہ بنا لیں؟"
جنون ہم دونوں کے سروں پر سوار تھا۔ لب دریا آئے۔ اور ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا تھ دریا میں اتر گئے۔ میں کچھ تیرنا بھی جانتا تھا۔ ڈوبتے باؤ
بے ارادہ ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ شاہدہ میری کمر سے لپٹی تھی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے اور آغوش دریا میں پہنچ گئی۔ اور میں اس ظالم سادھو کے ہاتھوں پھر ساحل دریا پر آگیا۔ مگر
زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ یہ داستان غم دنیا کے کانوں تک پہنچانی تھی۔ اب دو پچھلے ماتم شب کی تنہائی میں مل گئے۔ اور وہ دل شاد دیا۔ اب اجازت ہ
دیر ہو گئی، میرا دم گھٹ رہا ہے۔" یہ کہتے ہی مجنونانہ انداز میں تیزی کے ساتھ اٹھ کر پارک کے باہر چلا گیا۔

تلخیصات

"لمبانی"
ہندوستان کے قدیم باشندے

از

جناب ایچ ایم عبدالوکیل صاحب عزیزی

ہندوستان کے اصلی باشندے، کول، بھیل، سنتال اور ناگا وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستان پر آریوں کے حملہ آور ہونے سے پہلے اتنے غیر مہذب اور جاہل و وحشی نہ تھے جتنا کہ آریوں کی پرانی کتاب وید میں لکھا ہے۔ بلکہ ان کی کتابوں کے مطالعہ اور تاریخ کی ورق گردانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اچھے خاصے مہذب تھے۔ عالیشان شہروں میں آباد ہوتے تھے، سونا، چاندی اور جواہرات کو کام میں لاتے تھے، سوت بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ پتھروں کے مکانات بنا کر رہتے تھے، اور رموز سلطنت سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے دشمنوں کی مدافعت کیلئے قلعے بنائے تھے۔ اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔

پنجاب کے مانٹ گومری اور لڑکانہ ضلعوں میں محکمہ آثار قدیمہ نے جو دفینے دریافت کئے ہیں اور ان سے جتنی چیزیں برآمد ہوئیں۔ وہ بتا رہی ہیں کہ آج سے تقریباً سات آٹھ ہزار سال پہلے ان کی تہذیب کا معیار بہت ہی بلند تھا۔ اور زمانہ کے لحاظ سے یہ لوگ یقیناً مہذب تھے۔

ہمیں یہاں اس شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی ہے کہ جتنی چیزیں محکمہ آثار قدیمہ نے دریافت کی ہیں وہ آریوں ہی کی تہذیب کے نشانات ہیں۔ اس لئے کہ محققین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اسوقت تک ہندوستان پر آریوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ تمام چیزیں ہندوستان کے انہی مذکورہ بالا اصلی باشندوں کی تہذیب کے نشانات ہیں۔

بہرکیف ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ ہندوستان کے جن قدیم باشندوں کو غیر مہذب اور وحشی کہتے آئے ہیں۔ وہ حقیقت میں ایسے نہ تھے۔ البتہ جب آریوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو انھیں جنگ میں سخت شکست ہوئی۔ اور یہ ہزیمت اٹھا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہونے پر مجبور ہوئے۔ اور عرصہ دراز تک آریوں کی خونخواری اور درندگی کے خوف سے اپنی جائے قیام سے باہر قدم نہ نکال سکے۔ بلکہ جنگلوں کے شکار پر گذر اوقات کیا کرتے۔ اور پہاڑوں کی کھوہ میں سو رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنی تہذیب و تمدن کی ترقی و حفاظت تو کجا ایک حرف پڑھنے کا بھی موقع نہ مل سکا جس کی وجہ سے ان میں جہالت روز بروز بڑھتی گئی۔ اور جنگلوں اور پہاڑوں کی زندگی نے غیر مہذب، وحشی اور خونخوار بنا ڈالا۔

انہی غیر مہذب قوموں میں ایک قوم لمبانی یا بنجاری بھی ہے جس کو ابتک تمدن کی ہوا نہیں لگی ہے۔ اور جو ہنوز عہد وحشت و جاہلیت میں پڑی ہوئی ہے۔

یہ قوم جنوبی ہند اور مغربی ہند میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔
چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہتی ہے، جسے تھنداس (Thandas)
کہتے ہیں، ہر ایک گاؤں پر ایک حکمراں (سردار) ہوتا ہے جو اسی قوم
سے منتخب کیا جاتا ہے، اسے نایک (Nayak) کہا جاتا ہے،
اس قوم کے افراد اب مزدوری یا کاشتکاری کرتے ہیں۔ پہلے سوداگری
اور ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں مال پہنچانا انکا کام تھا۔

اگر لمبانی قوم کے مردوں کے لباس و اطوار پر تمدن
جدید کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہے لیکن ان کی عورتیں ہنوز عہد قدیم
کی معاشرت کی سچی تصویر نظر آتی ہیں، جو آج سے ہزاروں سال
قبل ان کے آبا و اجداد کی تہذیب تھی۔

یہ عورتیں زیورات کی بہت ہی شوقین ہوتی ہیں، اور
ہر لمبانی دوشیزہ متفرق قسم کی انگوٹھیوں اور ایک درجن سے زیادہ
زیورات سے اپنے جسم کو مزین کرتی ہے، جو ہر قسم کے دھاتوں مثلاً
سونا، چاندی، تانبا، پیتل، لکڑی اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے
ہوتے ہیں۔ ان کے لباس یا گھر کے بنے ہوئے کپڑوں سے بنتے ہیں۔
بحد وزنی ہوتے ہیں۔ اور ان پر ایسی گلکاریاں ہوتی ہیں جن کا رنگ
کبھی بھی خراب نہیں ہوتا۔ ہر لمبانی عورت کے لئے سینا پرونا
سیکھنا اسی طرح ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح کھانا پکانا اور خانہ داری
کی دوسری باتوں کا جاننا۔ اس قوم کے یہاں اکثر رسم و رواج
زمانہ قدیم سے نسلاً بعد نسل چلے آرہے ہیں۔ ان میں ذرا سا بھی تغیر
و تبدل نہیں ہوا ہے۔

ایک رسم اس قوم میں یہ ہے کہ شادی کے موقع پر جب
پنڈت Priest شادی کے رسوم انجام دہی کیلئے آتا ہے تو
اس کے ساتھ یہ لوگ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یعنی جب
پنڈت شادی کے تمام مراسم کی ادائی سے فارغ ہوتا ہے تو
بہت سی عورتیں چاروں طرف سے اسے گھیر لیتی ہیں، اور اس
کے سارے جسم میں چٹکیاں لینی شروع کرتی ہیں، اس کے دونوں
گالوں میں خوب زور زور سے طمانچے مارتی ہیں اور اس کے کپڑوں
کی دھجیاں اڑاکر اسے گھر سے نکال دیتی، لیکن ان تمام اذیتوں اور
تکالیف کے معاوضہ میں ایک گرانقدر رقم پنڈت کو نذر کیجاتی ہے۔

دوسری دلچسپ اور خوفناک رسم یہ ہے کہ جب قوم
کسی گاؤں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ بود و باش اختیار کرنے جاتی ہے
تو پہلے گاؤں کی جگہ ایک زندہ بکرا دفن کردیتی ہے، اور قبیلہ کے
تمام افراد مرد، عورت بوڑھے، بچے، اور تمام جانوروں کے
غول اس مدفون بدقسمت جانور کے سر پر سے گزرتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بکرے کے عوض
لوگ زندہ آدمی کو دفن کرکے اس رسم کی انجام دہی کرتے تھے
Abbe Dubois کی ایک کتاب میں اس رسم کے
متعلق یہ الفاظ تحریر ہیں۔

"جس آدمی کو اس رسم کی بھینٹ چڑھانا ہوتا تھا، اسے ایک
گڑھا کھود کر گردن تک زمین میں دفن کردیا جاتا تھا۔ اس کے
بعد اگر وہ زندہ رہتا تو آٹا گوندھ کر ایک چراغ بنایا جاتا۔ اور
اس چراغ کو اس کے سر پر رکھکر اسے تیل سے بھر دیا جاتا۔
پھر اس میں چار فتیلے ڈالکر انھیں روشن کردیا جاتا۔ اس کے بعد
اس قوم کے تمام مرد عورت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑکر اس کے
گرد حلقہ بناکر ناچنا شروع کرتے تھے، اور اس وقت تک
ناچتے گاتے رہتے جبتک کہ وہ جلکر خاکستر نہ ہوجاتا تھا"

اگرچہ اب سڑکوں اور باربرداری کے مکمل انتظام
نے انھیں زراعت پیشہ بنا دیا ہے لیکن اس سے قبل بار
کیلئے ان کی بحد مانگ رہتی تھی۔ اور اسوقت اس قوم

تصویرِ جذبات

خیالاتِ پریشاں

از جناب سید محمد حسنین عالم صاحب بھاگلپوری

اندھیری رات کی سنسان فضا میں جب کائنات محوِ خواب ہے۔ زمین نے چکر، فلک نے گردش، ہوا نے چلنا، آگ نے جلنا موقوف کر دیا ہے۔ ایک میں ہوں ــــــ اور ایک تیرا باوفا خیال۔ وہ دیکھو کس کی جستجو میں چاند ستاروں کی فوج لیکر نکلا۔ اے قمر تجھے کس کی تلاش ہے۔ تیرا مدعا کون ہے۔ تو کسے ڈھونڈھتا ہے۔ تیرے دل میں کس کی تمنا ہے یہ نیند کا وقت ہے۔ یہ آرام کی گھڑی ہے۔ یہ خواب کا لمحہ اور تو حیران و پریشان! سیارو تمھیں کس کا سودا ہے تم کیوں دیوانے ہو۔ تمھیں کونسا جنون ہے کہ اپنا عیش و طرب۔ اپنی خوشی۔ اپنا سرور چھوڑ کر سرگرداں اور دیوانہ وار پھرتے ہو۔ اُف! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں!! کیا یہ حقیقت ہے؟ کیا میں جاگ رہا ہوں؟

اللہ ــــــ زمین دشمن! زمین کا ذرہ ذرہ۔ فلک کا ٹکڑا ٹکڑا سب میری ہی جان کا خواہاں ہے۔ اچھا تو اے زمین مجھے نگل جا۔ اے فلک تو مجھے پیس ڈال۔ نہیں تو ایسا نہیں کرے گا۔ تجھ سے یہ بھی نہ ہوگا۔ اے پیکرِ حسن تو ہی انصاف کر۔ تجھی پر فیصلہ۔ سچ بتانا۔ صداقت سے کام لینا۔ انصاف کو رہبر بنانا۔ کسی کی طرفداری نہ کرنا۔ جانچ کر کہنا۔ پرکھ کر بولنا کہ تیری محبت تیری عشق میں کون سچا ہے۔ اُف رے غلطی! انصاف اور پیکرِ حسن سے!! فریاد ظلم اور ستمگر سے!!! امید وفا! اور بیوفا سے!! اے دل کیا تجھے معلوم نہ تھا۔ کیا تو جانتا نہ تھا۔ کیا تجھے خبر نہ تھی۔ تھی اور ضرور تھی۔ بیشک تھی۔ مگر میں کیا کروں مجبور ہوں۔ لاچار ہوں بیکس ہوں۔ بے بس ہوں۔ کہاں جاؤں کس سے کہوں کیا کہوں اور کس سے کہوں۔ مجھے علم نہ تھا کہ دیارِ حسن میں کیا ہوتا ہے۔ وہاں کس کو سزا دی جاتی ہے۔ اور کون چھوڑ دیا جاتا ہے

حسن کی بارگاہ میں ہوتا ہے الٹا فیصلہ
دیتے اسی کو ہیں سزا جو کوئی خطا کرے

گر میں اسیرِ غم نہیں ہوں۔ مجھے اسی میں لذت ہے مجھے اسی میں لطف آتا ہے

لطف جب ہے کہ تجھی سے فریاد کروں

اچھا اے نالۂ شبگیر ذرا اثر دکھا۔ عرشِ بریں کو جنبش میں لا۔ اے آہِ سوزاں نکل اور فلک کو جلا دے۔ اے دردِ دل اٹھ اور دنیا کو ہلا دے۔ اے اشکِ رواں آ اور دنیا کو ڈبو دے۔ خبردار! یہ اچھا نہیں قانونِ الفت کے خلاف ہے۔ طرزِ محبت کے منافی ہے۔ آئینِ عشق کے مخالف ہے۔ یہ دنیائے الفت ہے۔ یہ وادیٔ عشق ہے۔ یہ دشتِ محبت ہے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ، یہاں کی طرزِ روش، یہاں کا چال چلن سب نرالا ہے۔ یہاں کا دستور الگ، قانون سست، طریقہ اور عادات سب علیحدہ ہیں۔ دل دیوانہ! تو کس بیابانِ غم

بقیہ صفحہ ۳۷۲ پر

ادبیات

زمزمۂ سال نو

از

بلبل بہار حضرت سریر کابری گیاوی، مینائی

لو مبارک کھل گیا خود آج باب سال نو جگمگا اٹھا افق پر آفتاب سال نو
کون جانے ہوگی کیا تعبیر خواب سال نو رنگ کیا کیا اور لائے انقلاب سال نو

گو نئی رنگت نہیں کچھ پر تو خورشید میں
جان سی اک پڑ گئی ہے قالب امید میں

ہے وہی دن بھی وہی شب بھی وہی شام و سحر ہے وہی ساعت وہی گھنٹے وہی آٹھوں پہر
ہیں وہی سورج کی کرنیں ہے وہی نور قمر ہیں وہی سارے مہینے بھی جو گزری سال بھر

پھر بھی دنیا بھر میں ہے اک اہتمام سال نو
ذرہ ذرہ ہم کو دیتا ہے پیام سال نو

ہے وہی پیش نظر سال گذشتہ کا سماں آہ وہ دنیا کی جنت ہن برستا تھا جہاں
بجگئی ہے اینٹ سے اینٹ اسکی اڑتا ہے دھواں خاک کا اک ڈھیر ہے باقی نہیں نام و نشاں

کیا خبر تھی اک قیامت ہی بپا ہو جائیگی
ساری دنیا مورد قہر خدا ہو جائے گی

غرق کر ڈالے گئے دریا میں کتنے بے گناہ موت کے منہ میں کہیں انساں کو ملتی ہے پناہ
کر دیئے ہٹلر کے طیاروں نے ملکوں کو تباہ سارے عالم میں ہوئی امن و اماں کی بیدراہ

آتشیں حربوں نے جنت کو جہنم کر دیا
عقل نے کیا نوعِ انساں کو بہائم کر دیا

ہوش میں اپنے نہیں ہرگز کوئی چھوٹا بڑا فاقہ مستی کی مصیبت میں ہے دنیا مبتلا
مرتے ہیں فاقے مفلس دیکھتے ہیں اغنیاء ہے عجب بدلی ہوئی ساری زمانے کی ہوا

خاک بھی انساں میں کچھ ہمدردی انساں نہیں
کون ہے جو شکوہ سنج گردش دوراں نہیں

آگے چلکر ہو مآل جنگ عالمگیر کیا انقلاب سال نو پیدا کرے تاثیر کیا
ہوتی ہے تدبیر کیا ہو خواہش تقدیر کیا رخ دکھائے دیکھئے یہ دورخی تصویر کیا

جان دیتا ہے زمانہ نیک نامی کیلئے
ہے مگر اپنا گلا طوق غلامی کے لئے

قطعہ

"ساغر کسی کا ہے نہ پیمانہ کسی کا"

از

حضرت حمید عظیم آبادی

اک رات جو پہنچا میں خمستانِ سخن میں
قصہ کسی میکش کا تھا، افسانہ کسی کا

تھے لب پہ کسی مست کے اشعار کسی کے
پڑھتا تھا کوئی مطلعِ رندانہ کسی کا

کہتا تھا کوئی ختم ہوئی مستیٔ سخن اب
اگلی سی نہ مے ہے نہ وہ پیمانہ کسی کا

یہ سن کے مرا دل ہوا مایوسِ تمنا
جیسے کہ ہوا اجڑا ہوا کاشانہ کسی کا

ساقی نے جو دیکھی مری وحشت زدہ صورت
سمجھا کہ ہے یہ بھی کوئی دیوانہ کسی کا

بولا کہ نہ گھبرا یہ ہے میخانۂ رحمت
خالی نہیں رہتا یہاں پیمانہ کسی کا

بخشش ہے مری عام سدا دور ہے جاری
مے خاص کسی کی ہے نہ میخانہ کسی کا

ہے ذوقِ طلب حاملِ سرمستی و رندی
ساغر نہ کسی کا ہے نہ پیمانہ کسی کا

یہ سنتے ہی قدموں پہ حمید اس کے گرا میں
اللہ رے الطافِ کریمانہ کسی کا

رنگ تغزل

از

یادگار غالب و شوخی حضرت سید احمد علی صاحب عشرت مرحوم مغفور رئیس گیا

جو اپنے ہوش سے گذرا نہ ہوگا　　وہ کوئے یار تک پہونچا نہ ہوگا
جو کوئے یار کا نقشا نہ ہوگا　　گذر جنت میں بندے کا نہ ہوگا
ستم پرور جفا جو بے مروت　　زمانے میں کوئی تمسا نہ ہوگا
صدائے لن ترانی سنکے پھر آئیں　　یہ ہم سے حضرت موسیٰ نہ ہوگا
خدا کا ہوگا وہ مقبول بندہ　　جو اپنے نفس کا بندا نہ ہوگا
الٰہی کب شب فرقت کٹے گی　　خدایا دن بھی ہوگا یا نہ ہوگا
نہیں پیش نظر گر جلوۂ یار　　کبھی مقبول وہ سجدا نہ ہوگا
ہم ان کی جستجو میں ہوگئے خاک　　وہ آئیں قبر پر اتنا نہ ہوگا
یقیں ہے ہم کو ان کی نازکی سے　　کہ پیمان وفا ٹوٹا نہ ہوگا
نتیجہ کیا ہے اس ظلم و ستم کا　　ستاؤ تم مجھے شکوہ نہ ہوگا
جفائے یار کا شکوہ نہیں ہے　　تحمل رشک دشمن کا نہ ہوگا
ستم سہتا ہوں میں اتنا وہ کہدیں　　کہ اس میں غیر کا حصہ نہ ہوگا
جو لطف خانہ ویرانی ہے ہمدم　　جنوں منت کش صحرا نہ ہوگا
جہاں ہے اس بت یکتا کی منزل　　کسی کا وہم بھی پہونچا نہ ہوگا

بری حالت میں کل تھا عشرت زار
یقیں ہے آجتک زندہ نہ ہوگا

ہے عید چلے آؤ

از جناب حکیم سید مظفر علی صاحب مظفر بلگرامی

اس درجہ نہ تڑپاؤ
کچھ دل میں تو شرماؤ
اب رسم بھی فرماؤ
ایسے میں تو آجاؤ
ہے عید چلے آؤ

یہ دن ہیں مسرت کے
یہ روز ہیں عشرت کے
ایام ہیں بہجت کے
موقعے نہیں حجت کے
ہے عید چلے آؤ

انا ہے تو آجاؤ
شاید کہ ہمیں پاؤ
یہ مان بھی اب جاؤ
تقصیر تو بتلاؤ
ہے عید چلے آؤ

کیا مجھ پہ شباب آیا
گویا کہ عذاب آیا
کیوں مجھ پہ عتاب آیا
ابتک نہ جواب آیا
ہے عید چلے آؤ

پھر فصل بہاراں ہے
ویرانہ گلستاں ہے
حیوان بھی شاداں ہے
انسان تواناں ہے
ہے عید چلے آؤ

میں سخت پریشاں ہوں
تقدیر پہ گریاں ہوں
جینے سے میں نالاں ہوں
اک قالب بے جاں ہوں
ہے عید چلے آؤ

دریا میں روانی ہے
موجوں میں دوانی ہے
بہتا ہوا پانی ہے
ہر شے میں جوانی ہے
ہے عید چلے آؤ

گرویدہ تمہاری ہو
پھر عید ہماری ہو
نالہ ہو نہ زاری ہو
نے لب پہ یہ جاری ہو
ہے عید چلے آؤ

"پرجوش" بہاراں ہے
فردوس بداماں ہے
گلزار بیاباں ہے
دیکھو جسے نازاں ہے
ہے عید چلے آؤ

کب تک یہ ستم آخر
کب تک میں رہوں مضطر
ہے تار نفس خنجر
آرام سے کیوں کر
ہے عید چلے آؤ

نقد و تبصرہ

تفسیر سورۂ عبس

مترجمہ :- مولنا امین احسن صاحب اصلاحی
حجم ۵۷ صفحے، قیمت ۶ /، پتہ :- دائرہ حمیدیہ، سرائمیر اعظم گڈھ،

ترجمان القرآن حضرت مولانا حمید الدین صاحب فراہی مرحوم کے عربی کے تفسیری اجزاء کے اردو ترجمہ کا جو سلسلہ جاری ہے، تفسیر سورۂ عبس اس کی تیرہویں کڑی ہے، اس جزء میں بھی مولانائے مرحوم کی تفسیر کے جملہ خصوصیات موجود ہیں، اس سورہ کی متعلق عموماً تفسیر و ں میں کہا گیا ہے کہ ایک نابینا سے بیرخی برتنے پر توبیخ کے طور پر اس سورہ کی آیتیں نازل ہوئیں۔ لیکن مولانائے مرحوم نے دلنشین پیرایہ میں اس سورہ کے جو مطالب بیان فرمائے ہیں ان سے نتیجہ کے طور پر یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ

"(۱) آنحضرت صلعم جوش تبلیغ و دعوت میں کسی قدر آگے نکل گئے..... (۲) اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آپکو متنبہ کر دیا کہ آپ نے اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اُٹھائی ہے۔ اور کلام کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے بظاہر عتاب مترشح ہوتا ہے۔ لیکن عتاب کا اصلی رخ کفار و منکرین کی طرف ہے..... آنحضرت کیلئے، تو اس عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جاں نوازادائیں پنہاں ہیں ـــــ"

سورہ کے الفاظ کی تحقیق، آیتوں کا باہم ربط، سورہ کا ماقبل و مابعد سے تعلق اور پھر پوری سورہ کی مفصل تفسیر کو اسی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جیسے دوسرے اجزاء میں ہے۔ امید ہے کہ دوسرے اجزاء کی طرح یہ جزء بھی قبول عام حاصل کریگا ـــ

دھرتی ماتا

:- مصنفہ پرل بک مترجمہ جناب ابو سعید صاحب قریشی بی اے، ناشر :- ہاشمی بکڈپو انارکلی لاہور، قیمت ۱۲/

دھرتی ماتا پرل بک کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ اس تصنیف پر مصنف کو نوبل پرائز مل چکا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں ہو چکا ہے اس میں ایک کسان خاندان کی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو اپنی مصیبت کے سخت دنوں میں بھی زمین کو بیع نہیں کرتا۔ وہ قحط سالی کے باعث گاؤں سے ہجرت کر جاتا ہے۔ شہر میں بیچ کر بچے بھیک مانگتے ہیں۔ مگر زمین کو بیچ کر پیٹ نہیں پالتا یہانتک کہ پھر وہ گاؤں میں واپس آتا ہے دولت نے سرے گھر آتی ہے اور بوڑھا کسان دولت کی فراوانی سے مدہوش ہو کر عیش پرستی میں گرفتار ہوتا ہے اور اس کی بیوی اپنی وفاداری پر استوار رہتی ہے۔ یہ افسانہ اپنے دور کی بہترین کتابوں میں ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانہ میں اس انداز پر بہتر کتابیں تیار ہو چکی ہیں مگر اس کتاب کو دنیائے ادب کی ترقی میں ایک درجہ حاصل ہے اس لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے امید ہے کہ اردو داں طبقہ میں بھی اس کو مقبولیت حاصل ہو گی۔

پیام کیف

:- از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی

حجم ۲۰۰ صفحے قیمت عمر

مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ کے کلام سے ناظرین ندیم نا آشنا نہیں اور جب تک اردو شاعری میں جگر کا نام روشن ہے مرزا صاحب کا نام جذبۂ احسان پذیری کیساتھ لیا جائے گا۔ کہ مرزا صاحب ہی وہ سب سے پہلے صاحب ذوق ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ جگر کے جواہر کو پرکھا اور ارباب ذوق کو ان سے لطف اندوز کیا۔ جگر کا پہلا مجموعہ کلام "داغ جگر" موصوف ہی کا مرتب کیا ہوا تھا اور اس کا مقدمہ بھی موصوف ہی نے لکھا تھا۔ اب "پیام کیف" کے نام سے اپنے کلام کے مجموعہ کو پیش کیا ہے اس میں مرزا صاحب کے مختلف اصناف سخن جمع ہیں۔ اس کا مقدمہ موصوف نے خود اپنے قلم سے لکھا۔ اور اس میں بھی انھوں نے ایک نئی شاہراہ اختیار کی ہے۔ جس میں انھوں نے سادگی اور سنجیدگی کیساتھ خود اپنی شاعری پر دلآویز طریقہ سے نقد کیا ہے۔ اور اپنے ذاتی اور خاندانی حالات قلمبند فرمائے ہیں

نمونہ کلام ملاحظہ ہو —

ہزار تشنہ ہو وارفتۂ جنوں لیکن — حریم حسن میں جائز نہیں ہے بے ادبی

پردۂ خورشید و انجم سے نمود حسن کیا — سامنے آ دیکھنے والی نظر رکھتا ہوں

بآنکہ درد میں لب پر تبسم — یہ دیوانوں کا انداز فغاں ہے

پھونک دے گو مجھ کو سوز تشنگی سرتا قدم — پی کے لیکن اپنی رسوا شان رندانہ نکر

بزم رندانہ سا غر رنگیں کی سمت دست بڑوں — کہ اصل بادہ کشی ہے یہ کیف تشنہ لبی

احتیاط شیشہ و ساغر کی منت بیجا — خود اپنے کیف نظر سے شراب پیدا کر

اچھال دے یہ ذرا اپنا ساغر رنگیں — شعاع حسن کا دن کی جواب پیدا کر

پردن آشفتہ میرا ہے وہ نخل آرزو — جس کو موج برق سے شاداب تر رکھتا ہوں میں

کتاب معارف پریس اعظم گڈھ میں بہترین لکھائی چھپائی کیساتھ اچھے کاغذ پر چھپی ہے اور مصنف سے اعظم گڈھ کے پتہ سے مل سکتی ہے

سیرت شہید کربلا

از مولانا محمد ایوب صاحب عثمانی

حجم ۲۵۶ صفحے تقطیع $\frac{20 \times 26}{4}$ قیمت عمر

پتہ :- مدرسہ معارف القرآن' اورنگ آباد ضلع گیا

علی جلال حسینی مصری کی تصنیف "الحسین" دو جلدوں میں ہے۔ "سیرت شہید کربلا" اس کی پہلی جلد کا ترجمہ ہے۔ جس میں حضرت امام حسین کے سوانح حیات' عادات' اخلاق' علم و فضل غرض واقعہ شہادت سے پہلے کے جملہ سوانح زندگی بہ تفصیل بیان کئے گئے ہیں۔ غالباً اردو میں اس تفصیل سے اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب نہیں ترجمہ صاف اور سلیس ہے' کہیں کہیں کھٹک موجود ہے مسودہ پر نظر ثانی کی ضرورت تھی لیکن مضامین کے افادی پہلوؤں کی موجودگی میں اس کا احساس ہونا بھی بہت دشوار ہے۔ ایسی کتابیں ہماری حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں۔ امید ہے کہ جو لوگ حضرت امام کے مفصل اور مستند سوانح حیات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کا مطالعہ کریں گے اور اس سے فایدہ اٹھائیں گے۔

تحفۂ عید الاضحیٰ

مرتبہ :- مولنا قمر الدین صاحب فردوسی'

حجم ۸۸ صفحے تقطیع

پتہ :- دفتر دار الہدایۃ جامع مسجد شکوہ آباد یوپی

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے' عید الاضحیٰ کے متعلق چھاپا گیا ہے' اس میں حج' قربانی' اور عید کے احکام و مقاصد اور اس کی پچھلی تاریخ اور عید قربان کے ضروری مسائل بیان کئے گئے ہیں مصنف نے دار الہدایۃ کے نام سے

ایک ادارہ کی تشکیل کی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مطبوعات کے ذریعہ علم دین کی آگاہ کرنا ہے۔ اسی سلسلہ میں دہ رسائل چھاپ کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ کئی رسالے اس سے پہلے چھاپ چکے ہیں۔ اور یہ تحفہ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے خداوند تعالیٰ مصنف کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور حسن نیت کیساتھ نیک خدمات ان کے ہاتھوں انجام دلائے۔ یہ رسالہ بھی محصول ڈاک کیلئے صرف پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیا جاسکتا ہے۔ ....

روح اسلام یا جیل و اذاں از مولانا سید حسن آرزو صاحب اسسٹنٹ سکریٹری و انچارج لائبریرین گورنمنٹ اردو لائبریری، بانکی پور پٹنہ حجم ۷۶ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت درج نہیں ۔

مولانا سید حسن آرزو صاحب خلافت کی اسلامی تحریک کے زمانہ کے پرجوش قومی خادم ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں بھاگلپور کے قیدخانہ میں جناب شاہ محمد زبیر صاحب بیرسٹر مرحوم جو ان دنوں سیاسی قیدی تھے، اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ صوبہ بہار کے درمیان جیل میں اذاں کے متعلق کچھ تیز گفتگو ہوگئی تھی۔ جس سے اذاں کی توہین متصور ہوتی تھی۔ مولانا حسن آرزو نے اسی زمانہ میں اس واقعہ سے متاثر ہوکر ایک رسالہ "جیل اور اذاں" لکھا تھا۔ جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ اب جب کہ چودھری جگ لال صاحب سابق وزیر صوبہ بہار کی عنایات سے اس رسالہ کے چھپنے کی باری آئی تو مولانا موصوف نے اس رسالہ کا قالب بدل ڈالا اور اس میں اسلام کی ایسی روح ڈالی جس سے اسلامی ارکان وعبادات کی توضیح وتشریح نہایت دل پذیر پیرایہ اور حکیمانہ انداز میں ہوجاتی ہے آخر میں ایک ضمیمہ منسلک ہے جس میں بعض اتفاقی اغلاط کی تصحیح اور رسالہ پر چند اکابر کی رائیں درج ہیں۔ امید ہے کہ رسالہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اور ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا۔

نثار خواجہ مرتبہ:- مولانا معین الدین صاحب اجمیری مرحوم حجم ۱۶۰ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اچھی قیمت ۸؍ پتہ- منیجر اخبار معین، معین پریس اجمیر،

مولانا معین الدین صاحب اجمیری مرحوم، جنھوں نے ابھی حال ہی میں اس دارفانی سے رحلت فرمائی ہے، دور حاضر میں ہندوستان کے ممتاز علماء میں سے تھے، موصوف نے "نثار خواجہ" کے نام سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات مرتب کئے تھے۔ خیال آتا ہے ان کی یہ تصنیف اس سے پہلے چھپ چکی ہے۔ بہرحال حضرت خواجہ رحمۃ کے سوانح میں اس وقت تک بجز ایک آدھ مختصر رسالے کے کوئی قابل ذکر تصنیف نہ تھی، مولانا مرحوم نے اس کتاب کے ذریعہ بڑی کمی پوری کی ہے ....

...... واقعات کی صحت وعدم صحت کی جانچ پڑتال کی ہے روایات کے اختلافات کو سمیٹنے اور ان کے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان میں حضرت خواجہ کی تشریف آوری کے سلسلہ میں پس منظر کے طور پر ہندوستان کے مسلمان حملہ آور سلاطین کے تاریخی واقعات بیان کئے ہیں اور مقدمہ میں درگاہ کے موجودہ حالات وانتظامات پر روشنی ڈالی گئی ہے - یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اجمیر کی "اولیا مسجد" جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ نے سب سے پہلی نماز اسی میں پڑھی تھی اس کی نئی تعمیر، مع سامان زیبائش مہاراجکی سخاوت ہمارے صوبہ کے ماور رئیس جناب خان بہادر چودھری محمد بخش صاحب حمانی نے حاصل کی ہے نیز اس کتاب کی چھپائی کے جملہ اخراجات موصوف ہی نے برداشت کیے ہیں خداوند تعالیٰ جزائے خیر دے

دُنیائے کاروبار

دی وارثی کمپنی لمیٹڈ:- یونانی ادویہ کو نئے سائنٹفک طریقوں سے تیار کرنیکا سب سے پہلا خیال، مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کو ہوا تھا۔ اور اس سلسلہ میں وہ یونانی ادویات کی تحقیقات کیلئے ایک وسیع پیمانہ پر ایک بورڈ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور ابتدائی اقدام وہ کچھ کرچکے تھے کہ اس دنیا سے تشریف لیگئے۔ اور یہ اہم کام انجام پانیسے باقی رہ گیا۔

یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اسی ضرورت کا احساس چند ہمت در کارکنوں کو ہوا مگر ایسا کام ذاتی سرمایہ سے نہیں چل سکتا تھا اسلئے انہوں نے معقول اختیار کر "دی وارثی کمپنی لمیٹڈ" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی اور اس کے دائرہ عمل کو وسیع کر دیا گیا یعنی اس کمپنی کے ذریعہ ایک طرف یونانی دوائیں تیار کی جائے گی اسی کے ساتھ ایلوپیتھک دواسازی کا کام بھی پورے اہتمام سے انجام پائیگا۔ کیونکہ موجودہ جنگ کی تیز رفتاری سے یورپ سے دواؤں کا آنا دشوار ہو رہا ہے۔ اور ہندوستان میں دواسازی کے جو کارخانے قائم تھے، ان کی تیار کی ہوئی دوائیں پورے ہندوستان کی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتیں۔

ان ہی وجوہ سے چند ماہ گذرے اس کمپنی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کا منظور شدہ سرمایہ ایک لاکھ روپیہ ہے۔ اور فی حصہ کی قیمت دس روپے رکھی گئی ہے۔ اس کمپنی کے ہیڈ آفس نے ہمارے پاس تفصیلی کاغذات ان پر نظر ڈالنے کیلئے بھیجے ہیں۔ ہم نے اس کے پراسپکٹس کو دیکھا۔ نیز ان رایوں کو پڑھا جو بنگال کے ممتاز اکابر اس کمپنی کے متعلق ظاہر کرچکے ہیں۔ ان میں جناب رجب الدین صاحب طرفدار ام ال اے بوگرا۔ جناب حکیم محمد ابراہیم صاحب سکریٹری اطبائے ہند کلکتہ۔ وغیرہ کی کمپنی کے متعلق گرانقدر رائیں ہیں۔ اور جن لوگوں نے کمپنی کے مصدقہ حصص خریدے ہیں ان میں جناب ابو ہاشم ام ال اے، بردوان اور جناب عبدالرشید صاحب ام ال اے صاجزادہ جناب خان بہادر محمد عبدالمومن سی ای ای بر داری وغیرہ ہیں۔ کمپنی کے حصے تیزی سے فروخت ہو رہے ہیں اس کا افتتاح ایک روحانی پیشوا حضرت حاجی شاہ وارث علی صاحب رحمتہ اللہ کے اسم گرامی کیساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے حصے ہر قوم کے افراد کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ مسلمان خاص طور پر آگے بڑھیں۔ اسکی ہر دلعزیزی سے فائدہ اٹھائیں اور قبل اس کے کہ اسکے حصے فروخت ہو جائیں اسکے حصونکی خریداری حاصل کرلی جائے تفصیلی معلومات کیلئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کیجائے۔

"دی وارثی کمپنی لمیٹڈ ۱۵ کلائیو رو، کلکتہ"

بخشی پاکٹ ڈائری سنہ ۱۹۴۱ء حجم ۱۳۰ صفحے، جیبی تقطیع، قیمت صرف پانچ پیسے، پتہ:- ایس اے بی بخشی گوری ڈالی کوٹھی ۲۲ کورونیلہ اسٹریٹ کلکتہ

کلکتہ کی مشہور بخشی کمپنی ہر سال بخشی پاکٹ ڈائری کے نام سے ایک جیبی جنتری شائع کرتی ہے۔ جو جنتری اور ڈائری دونوں کا کام دیتی ہے۔ اسمیں جنتری کے صفحوں کیساتھ ہر ماہ کیلئے سادہ صفحے تاریخ وار یادداشت لکھنے کیلئے ہیں۔ پھر بخشی کمپنی کے قابل فروخت اشیاء کے تفصیلی معلومات، دلچسپ منظومات، طبی معلومات، فالنامہ، اور لطیفے وغیرہ عام معلومات اور دلآویزی پیدا کرنے کیلئے درج کئے گئے ہیں۔ اگر ڈاکخانہ کے ضروری قواعد، فہرست تعطیلات اور تنخواہ کے صفحے بھی بڑھا دیئے جاتے تو زیادہ کار آمد ہوتے۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے یہ ایک سستی کار آمد ڈائری ہے اسکو اپنے شہر کے کتب فروش کے یہاں تلاش کریں ورنہ دفتر سے مذکورہ بالا پتہ سے پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر طلب کریں۔ سید علی مظفر امام"

فوراً ضرورت ہے

چند مستقد اور صاحب اثر ایجنٹوں کی جو وارثی کمپنی لمیٹڈ" کے حصے فروخت کر سکیں طب یونانی کے اصول پر دواسازی و دکیمیاگری کے کاروبار کے لئے یہ پہلی کمپنی ایک لاکھ روپے سرمایہ سے لمیٹڈ کی گئی ہے جس کے ایک حصہ کی قیمت دس روپیہ ہے؛

سیدنا و مرشدنا حضرت حاجی وارث علیشاہ قدس سرّہ (دیوہ شریف)

کے نام نامی سے موسوم کی گئی ہے۔ اس کے حصے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں۔ جو صاحب اس کے حصے خریدنا چاہیں یا فروخت کرنیکا کام انجام دینا چاہیں۔ وہ فوراً اپنی درخواستیں بھیجیں۔ پراسپکٹس مفت طلب کریں۔

مینجنگ ایجنٹس: دی وارثی کمپنی لمیٹڈ ۱۵ کلابور کلکتہ

میری عدم موجودگی میں طلاق ثلاثہ ایک کتاب، جو ندیم پریس میں چھپ گئی اگر اس سے سید ظفر الدین صاحب شمس اڈیٹر ہمزاد کو تکلیف پہنچی ہو تو مجھے افسوس ہے۔ اور معذرت کا خواستگار ہوں۔ سید بشارت علی ندوی پرنٹر ندیم پریس، ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

نئی کتابیں

شاہجہاں :- محمد رفیق خاور ایم اے ایل ایل بی - اردو کا بہترین ڈرامہ

مغلیہ دربار کے جاہ و جلال اور شاہی حرم کی اندرونی زندگی کا ایک دلفریب مرقع ہے اسمیں شاہجہاں کی سطوت وحشمت شاہزادوں کی تخت و تاج کے حصول کیلئے سیاسی چالیں چنچل کنیزوں کے قہقہے بذلہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں سینکڑوں رنگوں میں نظر آتی ہیں - ایک باپ کی شفقت پدری اور ایک بادشاہ کی سیاسی مصلحتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں دکھائی دیتی ہیں - لکھائی چھپائی دیدہ زیب بہترین سفید کاغذ مجلد قیمت صرف ..... /4/1

دھرتی ماتا :- مشہور امریکن مصنف پرل بک کی شہرہ آفاق کتاب (Good earth) کا اردو ترجمہ ہے - اس کتاب پر مصنف کو نوبل پرائز مل چکا ہے /8/1

بخشتے علیکم :- ایم اسلم کے تازہ افسانے /8/1

مشاہیر عالم کی داستان غم ..... /1

فلم ایکٹریسوں کی آپ بیتیاں ..... /1

مہرداہ :- احسان علیشاہ بی اے (افسانے) /8/1

موپساں کے افسانے ..... /-1

دوشیزۂ صحرا :- صادق الخیری ایم اے (ناول) /4/1

لالہ رخ :- لطیف احمد (ناول) /8/2

داستان :- دنیا کی رنگین ترین کتاب اوزوڈایت کا ترجمہ /-2

قلوپطرہ :- سرزمین مصر کا زبردست تاریخی رومان /8/2

مصر کی رقاصہ :- احمد شاہ بخاری پطرس ایم اے کا تازہ شاہکار /-1

افادات سلیم :- مولانا وحید الدین سلیم کے ادبی مضامین کا مجموعہ /2/1

خنداں :- رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ /8/2

پھول اور کلیاں :- سر رابندرناتھ ٹیگور کے افسانوں کا مجموعہ 8/1

انصاف :- گالزوری کے ڈرامہ کا ترجمہ /-1

معمار اعظم :- ابسن کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ /-4/1

اضافیت :- ڈاکٹر رضی الدین /-4/1

مبادی سیاسیات :- محمد ہارون شروانی /-5

ڈاچی اور دیگر افسانے :- اوپندرناتھ اشک /-4/1

صدائے جرس اور دیگر افسانے :- مسز عبدالقادر

بھوک اور دیگر افسانے :- پروفیسر حمید الدین ایم اے - /1

ہاشمی بکڈپو انارکلی لاہور

صوبہ بہار کے اسکولوں و کالجوں میں سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

یعنی

صوبہ بہار میں علم ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

قیمت سالانہ: للعہ
قیمت فی پرچہ ۴ر

قیمت ششماہی عہ؍ر
چھ آنے

مرتبہ: سید ریاست علی ندوی

نمبر ۲	۱۵ محرم تا ۱۵ صفر سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ فروری و مارچ سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۱

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم سے شائع کیا

افسوس ہے کہ اس ماہ میں بعض الجھنوں کے سبب سے نظرات کے صفحے لکھے نہ جا سکے۔ — منیجر

خریداران ندیم کیلئے ایک ضروری اطلاع

اب تک ندیم کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کا آخر ہفتہ تھی۔ مختلف مخلصوں کے خطوط پے در پے آتے رہے کہ پرچہ کو ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہونا چاہئے۔ اتفاق سے بعض ناگزیر اسباب کے باعث فروری کے پرچہ کی اشاعت میں تاخیر پیش آئی۔ اسی اثنا میں حسن اتفاق کہ الہ آباد، پٹنہ اور کلکتہ سے پرچہ کی تاریخ اشاعت کے متعلق تقریباً ایک ہی قسم کی تجویز دفتر میں آئی۔ کہ فروری اور مارچ کا نمبر مشترک شائع کر دیا جائے۔ صفحات بڑھانے کے بجائے خریداران ندیم کی مدت خریداری میں ایک ایک ماہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ یعنی مثلاً جس خریدار کی مدت خریداری اپریل میں ختم ہوتی ہو اس کو مئی تک بڑھا دیا جائے اور جس کی مئی میں ختم ہوتی ہو اس کی جون تک توسیع کی جائے۔ اسی طرح جن لوگوں کی مدت فروری میں ختم ہوتی ہے ان کا نیا سال اپریل سے شروع کیا جائے۔

اس طریقہ کار سے ندیم کا ایک پرچہ ضائع ہوئے بغیر پرچہ کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کے آخر ہفتہ سے شروع ہفتہ میں آجاتی ہے۔

کارکنان دفتر نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ اس لئے یہ پرچہ فروری اور مارچ کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے اس کے بعد اپریل کے پہلے ہفتہ میں انشاء اللہ اپریل کا پرچہ خریداروں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اور کوشش کی جائے گی کہ آئندہ اس تسلسل میں فرق نہ آنے پائے۔ امید ہے کہ خریداران ندیم بھی اس صورت کو مناسب تصور فرمائیں گے۔ — مدیر ندیم

تصحیح

پچھلے مہینہ میں فسانہ "حسن و خاشاک آشیانہ" کے آخر حصہ میں جو صفحہ ۴۵ پر چھپا ہے کتابت کے وقت بعض الفاظ و فقرے بھی لکھنے سے رہ گئے اور تصحیح میں ان کی گرفت نہ ہو سکی۔ اس فقرہ کو ناظرین یوں پڑھیں

"رحمان تم تنہا نہیں جا سکتے۔ اب آؤ ہم دونوں گنگا مائی کی گود میں اپنی ابدی خواب گاہ بنائیں"

اسی طرح صفحہ فہرست مضامین میں جلد ۱۴ نمبر کے بجائے جلد ۱۵ نمبر ۱ چھپنا چاہئے تھا ——— پھر اس فہرست میں جناب حمید کے مراسلہ کا عنوان بھی غلط چھپ گیا۔ عنوان "شورش کا تذکرہ اردو زبان میں بھی ہے"۔ ناظرین ان اغلاط کی تصحیح کر لیں۔ — مدیر

مقالات

حضرت امام حسین علیہ السلام

نے

شہادت کیوں قبول کی

از
جناب آنریبل سید حسین امام صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ رئیس گیا

"یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۱۰ فروری ۱۹۴۲ء کو نشر کی گئی، اور باضابطہ اجازت ذیل میں شائع کی جاتی ہے۔" "ندیم"

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے کہ تیرہ سو برس گذرنے کے بعد بھی آج تک لاکھوں انسان اس پر رونے پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ حضرت امامؑ نے شہادت کیوں قبول فرمائی۔ اس کا جواب صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے لئے سبق آموز ہے۔ اس کے صحیح جواب کے تلاش کرنے میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یا تو شہادت نتیجہ تھی جاہ طلبی کی جنگ کا، یا ایک قربانی تھی قوم اور اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کی۔

اگر یہ جنگ سلطنت کے حاصل کرنے کے لئے کی گئی ہوتی تو اس کے لئے چند ابتدائی باتوں کا پایا جانا ضروری تھا۔ مثلاً سب سے پہلے آپ اپنے عزیزوں اور قرابت والوں سے مشورہ لیتے اور ان کے کہنے پر چلتے۔ اپنے دوستوں اور مددگاروں کو اکٹھا کیا ہوتا۔ اسلام کے مرکز میں لوگوں کو اپنا ہمنوا اور طرفدار بنایا ہوتا۔ اپنی خلافت کا اعلان کیا ہوتا۔ مختلف اسلامی ملکوں سے اپنے حامیوں اور جاں نثاروں کی فوج اکٹھا کی ہوتی۔ جب یہ سب باتیں جمع ہوجاتیں تو یزید کے خلاف قدم اٹھاتے۔ مگر واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ان ضروری چیزوں میں سے آپ نے کسی کو بھی مہیا نہیں کیا، بلکہ اس کے خلاف مشیروں نے جنگ چھیڑنے سے منع کیا اور شیعوں نے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ آپ نے شہادت کے وقت تک ایک مرتبہ بھی اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا اور فوج کے بجائے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہمراہ لے گئے۔

کیا عقل سلیم اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہوسکتی ہے کہ اس بے سروسامانی کے ساتھ اس قدر کمزوروں کے ہوتے ہوئے اس طریقے پر سفر کوئی سلطنت کا طالب کرسکتا ہے۔ یہ بھی سوچئے حضرت امامؑ نوجوان نہ تھے کہ ناعاقبت اندیشی ہوتی۔ سن شریف چھپن ستاون تھا۔ زمانہ کی نیرنگی اور اس کے اونچ نیچ کو جانتے تھے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اقدام بغیر سوچے سمجھے نہ کیا [illegible]

یہ سمجھنے کی بات ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کو انیس سال گذر چکے تھے، اس عرصہ میں سلطنت کے حاصل کرنے کی آپ نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ خاموشی کے گوشہ میں مدینہ میں زندگی کے دن گذارتے رہے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ اتنے سال گذرنے کے بعد آپ یکایک لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے سمجھنے کے لئے حضرت علیؓ کی شہادت سے حضرت امام حسینؑ کے شہادت پانے تک کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۴۰ھ سے ۶۰ھ تک اسلامی سلطنت ایک خاص دور سے گذری ہے۔ اس میں دو قسم کی طاقتیں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں، ایک طرف بنو ہاشم تھے یہ لوگ اسلامی حکومت کے ڈھانچے کو اسلامی جمہوریت کی بنیاد پر چاہتے تھے دوسری طرف بنو امیہ تھے جو اسلام کے جمہوری نظام حکومت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی شہنشاہیت کے قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ ابتدا میں حضرت علیؓ پہلی جماعت کے امام تھے، اگر اس جماعت کو اس زمانے کی پوری اسلامی دنیا میں غلبہ حاصل ہو جاتا تو اسلامی جمہوریت کا صحیح نظام مضبوط بنیادوں پر قائم رہتا۔ لیکن دوسری جماعت کے رہبر امیر معاویہ کو شام میں اقتدار حاصل تھا۔ وہ اپنی طاقت کے بھروسے پر حضرت امیر علیہ السلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اور اپنی سیاسی تدبیروں سے اپنی حکومت قائم کر لی، اور آہستہ آہستہ شام کی سلطنت کو دنیائے اسلام کی واحد سلطنت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

جبتک اسلامی خلافت کا مرکز عرب میں رہا اس وقت تک اسلامیت چھائی ہوئی تھی، مدنی اخوت اور اسلامی مساوات کی جگہ شاہی فرق مراتب نے لے لی۔ اسلامی جمہوریت کو بنی امیہ کی شخصی حکومت نے ملیامیٹ کر دیا، تبلیغ اور جہاد کی جگہ عیش پرستی اور تن آسانی نے لے لی۔ عربی سادگی گم ہوئی۔ اور عجمی تکلفات بھر گئے، یہ سب خرابیاں آئیں مگر مذہب کا نام پھر بھی باقی رہا، چوری چھپے اسلام کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی تھی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جرأت نہ تھی، یہ اس لئے تھا کہ اگرچہ امیر معاویہ مہاجرین میں نہ تھے، پھر بھی حضرت رسول کریمؐ کی صحبت سے بہت کچھ حاصل کر چکے تھے، اس لئے وہ متانت اور برگزیدگی جو صحابہ کرام میں پائی جاتی تھی اس کا پرتو کچھ نہ کچھ امیر معاویہ میں موجود تھا، اس لئے حضرت امام علیہ السلام نے امیر معاویہ کے دور سلطنت میں کسی قسم کا اقدام نہیں کیا۔

امیر معاویہ شروع ہی سے اس کے خواہشمند تھے کہ سلطنت کو اپنے خاندان میں رکھیں اور اس نیت سے عربی قبیلوں کے سرداروں کو اپنے آس پاس جمع کرتے رہے، مخالفوں کو داد و دہش سے ملاتے رہے، اس کے ساتھ وہ اپنے آیندہ منصوبہ کو کبھی زبان پر نہیں لائے کیونکہ اس وقت تک جمہور مسلمان موروثی سلطنت کے تخیل کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، یہانتک کہ جب امام حسنؑ نے وفات پائی تو انھوں نے خواص کی مجمع میں اپنے لڑکے یزید کو اپنا ولیعہد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور آہستہ آہستہ ان کے اس ارادہ کی شہرت ہوتی گئی، یہاں یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ ابتک کسی خلیفہ یا امیر نے اپنا ولیعہد اپنے خاندان میں سے کسی کو نہیں چنا تھا، خلیفہ اول عام انتخاب سے چنے گئے تھے، پھر خلیفہ اول نے اپنے خاندان کے مشہور و معروف لوگوں کو چھوڑ کے اپنی جگہ حضرت عمرؓ کو نامزد کیا، اس کے بعد خلیفہ دوئم نے اپنے مشہور و معروف لڑکے حضرت عبداللہؓ کو ان چھ لوگوں

بھی جگہ نہ دی جن میں انھوں نے خلافت کو محدود کردیا تھا اس لئے امیر معاویہ کی یہ خواہش اسلام کی جمہوری سلطنت کے بالکل خلاف تھی، چنانچہ جب وہ ولیعہد کے مسئلے کو طے کرنے کو مدینہ تشریف لائے اور بڑے بڑے صحابیوں کو مشورہ کے لئے بلایا اس موقعہ پر جن بزرگوں نے مخالفت کی ان میں سب سے زیادہ پرجوش مخالفت حضرت امام حسینؓ کی تھی چنانچہ آپ نے امیر معاویہ کو مخاطب کرکے فرمایا :-

"یزید...... ایک معلوم شخص ہے، تم اس کی یہ حالت کیوں نہیں بیان کرتے کہ وہ کتوں کی لڑائیوں، کبوتروں کی بازیوں گانیوالی لونڈیوں کے گانوں، اور طرح طرح کھیل کود کے تماشوں میں لگا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنے ارادے سے باز آجاؤ، ورنہ مجھے حیرت ہوگی کہ کیوں تم اس مخلوق کا بھاری بوجھ اپنے سر لیکر اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم تم نے ظلم کا پیالہ نفسانیت اور باطل سے بھر دیا...... جبکہ تمھارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی موجود ہیں جن کی صحبت اور قرابت اور جن کا دین اور مذہب خالص اور اعتماد کے قابل ہے۔ تو ایسے لوگوں کو چھوڑ کر تم اس شخص کو کیوں سامنے لاتے ہو جس میں یہ خوبیاں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ حد سے گذرا ہوا اور فتنہ میں پڑا ہوا ہے۔ کیا تم یہی چاہتے ہو کہ لوگوں کو فتنہ میں ڈالدو۔"

امام حسین کی اس تقریر سے پوری طرح معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یزید کی ذاتی نااہلیت ظاہر ہوتی تھی اس وقت صحابیوں میں سے اس سے زیادہ اہل موجود تھے، جو اپنی ذاتی قابلیت کے باعث یزید پر ترجیح پانے کے مستحق تھے، اس لئے وہ یزید کو بڑے بڑے صحابیوں کی موجودگی میں اس عہدہ کے لائق نہیں سمجھتے تھے اور ان کی مخالفت کے اسباب خالص مذہبی، اخلاقی، اور سیاسی تھے، یعنی وہ اس لئے مخالفت نہ تھے کہ وہ خود اس کے خواہاں تھے، بلکہ اس لئے مخالف تھے کہ یزید اس کا اہل نہ تھا، لیکن اس کے باوجود امیر معاویہ نے یزید کی ولیعہدی کا عام اعلان کردیا۔ اور یہ بھی مشہور کرایا کہ حضرت امام حسینؓ نے بھی بیعت کرلی ہے، لیکن امام علیہ السلام نے اس کی تردید کی اور یزید کی ولیعہدی پر اتفاق حاصل کرنے میں امیر معاویہ کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اور وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

امیر معاویہ کی وفات کے بعد امام حسین علیہ السلام کے سامنے دو راہیں تھیں۔ یا تو وہ خود وظیفہ قبول کرکے انسانیت اخلاق اور نسل انسانی کی اجتماعی زندگی سے علیحدہ ہوکر اپنی زندگی گذار دیتے یا دنیا کو یہ سبق سکھاتے کہ انتہائی بے سروسامانی کے باوجود ظلم کے خلاف کھڑا ہوجانا انسانیت کی بہترین خدمت ہے، چاہے اس راہ میں اپنی پیاری جان بھی اپنی جان کے پیدا کرنے والے کے سپرد کیوں نہ کردینی پڑے، اگر باطل کے آگے جھک جانا اخلاق اور انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے، اسلام روم و ایران کی بادشاہتوں کو مٹا چکا تھا، اور دنیا کو عدل، انصاف، اور مساوات کا سبق سکھا چکا تھا۔ اس لئے اگر امیر معاویہ کی قایم کی ہوئی شخصی اور موروثی سلطنت کا بول بالا ہوگیا، اور اس کے خلاف حق کی آواز نہ اٹھائی گئی تو جمہوریت کا نام ونشان بھی اس دنیا سے اُٹھ جائے گا۔

یہی اصلی اسباب تھے جن کی بنا پر امام حسین علیہ السلام یزید کی خلافت کا اعلان ہوتے ہی اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا اٹھنا صرف یزید کی مخالفت میں نہ تھا، بلکہ اس حملے کی مدافعت میں تھا جو بنو امیہ کی طرف سے اسلام کے قایم کئے ہوئے جمہوری تخیل پر ہوا تھا۔

آپ نے کربلا کے دردناک واقعات سنے ہیں، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت امامؑ کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ ایک لمحہ میں دور ہوسکتی تھیں۔ بشرطیکہ آپ باطل کے سامنے جھک جاتے، اس کی اطاعت کا اقرار کر لیتے۔ دنیا میں بڑے بڑے سورما سپہ سالار گذرے ہیں، نپولین آخر زمانے کا سب سے بڑا فاتح سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی زندگی سینٹ ہیلینا کے قید خانے میں گذری، یورپ کی موجودہ لڑائی میں بڑے بڑے ملکوں نے بیچارگی میں ہتھیار ڈال دیئے، حالانکہ ان کو نازی اور فسطائی طاقتوں کی گمراہیوں کا یقین تھا، لیکن حضرت امام کی ایسی بلند اخلاقی مثال دنیا میں کوئی دوسری موجود نہیں ہے کہ انتہائی بیچارگی و بیکسی کے باوجود سپر نہ ڈالی، کیونکہ ان کے سپر ڈالنے کے معنی نسل انسانی کو ایک بہت بڑی تعلیم سے بے بہرہ چھوڑ دینے اور حق کے علم کو باطل کے آگے ہمیشہ کے لئے جھکا دینے کے تھے، اگرچہ شہادت کے واقعہ کے بعد یزید کی حکومت قایم ہوئی مگر یہ ماننا پڑیگا کہ اس کی حکومت سے جو بدترین نتیجے پیدا ہونے والے تھے ان کا سدباب اس واقعہ کے اخلاقی اثر سے ضرور ہوا، اسلامی دنیا نے اس کو اور اس کے ایسے اخلاق اور طرز حکومت رکھنے والے بادشاہوں کو غاصب اور ظالم سمجھا اور ان سے گلو خلاصی کو انسانیت کا فریضہ جانا، اگر حضرت امام نے یزید کی اطاعت قبول کر لی ہوتی تو اس اخلاقی سبق سے انسانیت ہمیشہ کے لئے محروم رہتی، اس واقعہ سے ظلم کی حمایت سے باز رہنے، اس کے خلاف آواز اٹھانے اور ایثار و قربانی کا نمونہ پیش کرنے کا کبھی نہ بھولنے والا سبق حاصل ہوا، اور اسلامی جمہوریت کی روح جو شہنشاہیت اور مطلق سلطنت کی وجہ سے دبی جا رہی تھی، نئے سرے سے تازہ ہوگئی، اس لئے حضرت امامؑ نے شہادت کی راہ کو اختیار فرما کر حق کی حمایت کی ایسی مضبوط نیو ڈالدی جو قیامت تک ہلائے نہیں ہل سکتی، اسی فلسفہ کو خواجہ اجمیری نے کیا خوب فرمایا ہے:

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ　　دین است حسینؑ و دین پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لا الہٰ است حسینؑ

چولی دامن کا ساتھ

از
جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی

یہ ساتھ چھوٹا نہیں کرتے، ان میں افتراق کی کوشش سعی لاحاصل ہے۔ اردو کو فارسی یا عربی سے معرا کر دینا یا اس کا ہندی اور سنسکرت سے ناتا توڑ دینا، امر محال اور ان ہونی بات ہے، دو بھائیوں نے مل کر ایک گھر بنایا، ایک گارا لایا ایک اینٹیں، ایک سفیدی لایا دوسرا چونا، اب یہ تنگ ہو کر چونا نکال پھینکیں یا اینٹیں الگ کر دیں، اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے مترادف ہے۔

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش، ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ آپ اپنے اس فعل سے باز آ جائیں، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس کے نتائج سمجھ لیں، اس راہ کے نشیب و فراز جان جائیں، اس کے بعد اپنی من مانی کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ عقل کی آنکھوں پر جذبات اور تعصبات کی پٹی باندھ کر آپ گھر کی نیو کھود ڈالیں، پھر جب چھت سر پہ آن پڑے تو سر پکڑ کر بیٹھیں، نیز یہ بھی کان کھول کر سن لیجیے کہ یہ گھر آپ کا بنایا ہوا نہیں اسلاف کی امانت ہے جو اسلاف تک پہنچائی ہے، بڑوں کا ورثہ ہے، جو چھوٹوں کو سونپ جاتا ہے، آپ متولی ہیں مالک نہیں، اگر اس عمارت کو ذرا بھی گزند پہنچا تو جواب دہی کرنی پڑے گی اگر اس مکان کی ایک اینٹ بھی بغیر سمجھے بوجھے سرکائی تو آپ سے پوچھ گچھ کی جائے گی، غور کر لیجیے اور اونچ نیچ سوچ لیجیے، پھر جو چاہے سو کیجیے۔

اس زبان کا ہر محاورہ، ہر ترکیب، طرز ادا، عبارت کی ساخت، زندگی کی ہم آہنگی، روزمرہ کے اختلاط اور معاشرت کے شیر و شکر ہونے کا بین ثبوت ہے، اس بولی کا ہر بول منہ سے بولتا ہے کہ رسی سے جیوڑا گھسا ہے، چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اب اس محاورہ ہی کو لے لیجیے۔ دامن ایران سے آیا چولی یہاں کی لی، مل جل کر گذر کیا، امتداد زمانہ نے، برسوں کے ساتھ نے، گھلا ملا کر ایک کر دیا، اب اس میں سے چولی نکال دیجیے یا دامن، ہر صورت میں فقرہ بے معنی، بے جان، بے لطف و بے مزہ رہ جائے گا۔

دور نہ جائیے، آپ جو کپڑے پہنتے ہیں، ان کی ایک ایک چیز پر غور کیجیے، ان زبانوں کے اختلاط کا آپ بین ثبوت پائیں گے، آپ کی روزمرہ کی زندگی میں ان کا میل جول ہر جگہ اپنا رنگ دکھاتا اور رنگ جماتا چلا جاتا ہے۔

رنگ ہی کو لے لیجیے، جس طرح سرخ کے ساتھ ملگجا ہر اسی بے تکلفی کے ساتھ دھانی سے میل کھاتا ہے۔ نہ ایرانی سبز ادھر پہلو بچاتا نہ بت ہندی سے کتراتا ہے، یہ باہمی جذبۂ رواداری اور اختلاط ہے جو زبان کو رنگین بناتا ہے۔

آپ جو پاؤں میں جوتی پہنتے ہیں، جسکو ہر ہندو مسلمان

جوتی ہی کہتا ہے، اس کو اگر کوئی اپنی ضد میں آکر اور کچھ کہنے لگے، تو اپنے شہر میں اجنبی بن جائے۔ لوگ اس کی بات نہ سمجھیں غور کیجئے، یہ جوتی کہاں سے آئی؟ بندہ نواز! ایران سے جفت چلی ہندوستان آتے آتے ہی داخل ہوئی، فت خارج شکل بدلی، جوتی بن گئی۔ تلا ہندوستان کا لیا، پاتابہ ایران کا داخل کیا، مل جل کر کام چلایا۔ جوتی کی ایک قسم ہے جس کو وصلی کی جوتی کہتے ہیں، وجہ تسمیہ یہ کہ جس کاغذ سے یہ بنائی جاتی ہے ذوصلی ہے، اس مترادف ہندی میں موجود ہے، ملٹ، لیکن اگر اس جوتی کو ملٹی کہتے پھریئے تو سارا شہر چھان مارئے انشاءاللہ کوئی نہیں سمجھے گا، وہی مثل ہے کہ آب آب کرتا مرگیا اور پانی سرہانے دھرا رہا۔

اب پاجامہ پر غور کیجئے، یعنی جامۂ پا، مقلوب ہو کر پاجامہ بنا، اسکو ہندی کے پجاری پیر ڈھک بنا دیں، یا پیر کپڑا، ترویج دیں برسوں تو کوئی سمجھتے ہم نہیں، اور فارسی کے پرستار اگر موقع کے لیے کوئی اختراع کریں، ہم جانیں جو کوئی سمجھ جائے بیکار کی صدمۂ خدا، کوہی سے ستم لشا تضیع اوقات بنی بنائی چیز کو خاک میں ملانا، بڑوں کی محنت پر پانی پھیرنا کس خدا نے بتایا ہے، کون سے مذہب میں آیا ہے؟

اب متذکرہ بالا لباس کے مختلف حصوں پر غور کیجئے پائچہ کا نسخہ نون داخل کرکے پائنچہ بنا، ہر کندۂ ناتراشیدہ، کندہ سے واقف ہے جو ایران سے آکر ہمارے لباس کا جز بنا۔

نیفہ، نافہ سے بگڑ کر بنا، چونکہ ناف پر ٹکتا ہے، نافہ کہلایا، پاجامہ کی ایک قسم ہے جو آڑا پاجامہ کہلاتا ہے، اس کے لئے دو اور لفظ ہیں، ایک اریبی، اور دوسرا چوڑی دار، اریب عربی میں آڑے کے معنی دیتا ہے، اب چوڑی دار کی ترکیب ملاحظہ ہو، چوڑی ہندی، دار فارسی

آج یہ الفاظ ہندو مسلمان دن رات استعمال کرتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ ان کے اجداد کہاں سے آئے، اور کیوں کر تال میل کھایا۔

آپ کے یہاں ایک کپڑا ہے دوسوتی، دو ایران کا آیا سوت ہندوستان کا، استعمال کے کرگہ پر چڑھا، کام کا بنا کر لے لیجئے، کارگاہ کا بگڑا ہوا ہے، یاد رکھئے اگر ان رشتوں کو توڑا جائے گا تو زبان کا تار و پود بکھر جائے گا۔

اب فرمائیے ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کون صاحب فہم اردو سے ہندی اور فارسی کو نکالنے کی صلاح دے سکتا ہے

اب کرتہ کی طرف غور کیجئے، نہ صرف تہ کا رخ ایران کی طرف ہے بلکہ کوتہ آستینانِ ایران کا دیرینہ لباس ہے، اس کی دراز دستی روکنے کو عربی کف لگایا گیا جس کے معنی روکنے کے ہیں۔

نیز اس کے دامن میں بخیا ایران کی سوزنکاری ہے۔ اور یہ پچی دست ہندی کی کارگذاری، مزید براں ایرانی گریبان میں دیسی چیر اس لگا دی گئی،

قینچی نے دامن ایران چاک کیا، ہندی اوٹ آڑے آئی، چاک اوٹی یا چکوٹی کہلائی، ذرا یہ ترکیب ملاحظہ ہو، چاک فارسی اوٹ ہندی ملکر چاک اوٹی بنی، کثرت استعمال میں الف غائب ہو گیا، چکوٹی کہلائی۔ خیال کیجئے کہیں یہ باہمی تعلقات منقطع ہو سکتے ہیں؟

مانا کہ گوشت ناخن سے جدا کیا جا سکتا ہے، لیکن انگلی کی ہیئت بگاڑے بغیر ممکن نہیں۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو بسم اللہ، ورنہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی اس ضرر رساں کوشش سے نہ صرف اس عمارت کے کنگرے ڈھے جائیں گے، آرائش میں فرق آئے گا۔ بلکہ اس کی بنیادیں ہل جائیں گی، لرزہ براندام

ہوئی زلزلہ آئے گا، بہت ممکن ہے کہ یہ بڑوں کا بنایا ہوا گھروندا مٹی میں مل جائے۔

نہ صرف زبان کو نقصان پہنچے گا، بلکہ ہماری معاشرت معیشت، تمدن اور سماج کو اتنا سخت جھٹکا لگے گا کہ شاید وہ صدیوں نہ سنبھل سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جانے بھی نہ دیں ہماری روزمرہ کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ لین دین نا ممکن ہو جائے گا، گاہک دکاندار کی بات نہ سمجھ سکے گا، دکاندار گاہک کا منہ تکے گا، ایک شدھ ہندی بول رہا ہوگا دوسرا خالص فارسی۔

اعلیٰ قدر! یہ زبان ہماری ضروریات پوری کرنے بنی تھی، اس میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو کام چلانے والی چیز میں ہونی چاہئے۔ یہ تنگ حوصلہ نہ تھی اس لئے کم مایہ نہ رہی یہ تنگ ظرف نہ تھی، ہر صورت سے بہرہ مند ہوئی، اس کی حیثیت ایک ہوٹل کی سی تھی جس کے دروازہ پر ہندو مسلم سکھ عیسائی کچھ نہیں لکھا تھا، نہ اس پر سواستیکا تھا نہ خنجر ہلال، یاد رکھئے ہوٹل کو فرقہ وارانہ رنگ دینے سے نہ صرف اس کی رونق کم ہو جائے گی بلکہ بالکل ختم ہو جانے کا بھی پورا پورا امکان ہے۔

اتفاق کے ہاتھوں نے اس کھیتی کو پانی دیا تھا، یک جہتی سے سینچی گئی تھی، ایکتا کی دھوپ میں پکی، پروان چڑھی تھی اب اس پر نفاق کی اوس پڑ رہی ہے، نا اتفاقی کا پالا اس کو برباد کھائی دیتا ہے، پھوٹ کی آندھی برباد کرتی نظر آتی ہے، آپ لوگ اس کے رکھوالے ہیں، آتش سوزاں کو اور ہوا نہ دیجئے، اس چنگاری کو نہ بھڑکائیے،

ایک گھر کے رہنے والے اگر دو زبانیں بولنے لگیں تو وہ گھر چل نہیں سکتا، ایک دیس کے رہنے بسنے والے اگر یک زبان نہ ہوں تو اس دیس کا اللہ والی، آج آپ کی آنکھوں کے سامنے دنیا والے ایک ایسی زبان کو بگاڑیں، جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں، بڑوں کی گرانی محنت خاک میں ملا رہے ہیں۔ اپنے ہاتھوں پیر میں کلہاڑی مار رہے ہیں بنا بنایا گھر ڈہا رہے ہیں، ہماری عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں چولی دامن کا ساتھ چھوڑا رہے ہیں۔

نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں

کیا ہسوہ کی مسجد کامگار خانی ہے؟

از جناب شاہ عبد السبحان صاحب ہسوہ

رسالہ ندیم گیا ماہ اکتوبر و نومبر سنہ ۴۰ء میں جناب حکیم محمد نقی خاں صاحب کے دو مضمون یکے بعد دیگرے نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں کے فاتحانہ کارناموں کی نسبت شائع ہوئے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار خاں حکیم محمد نقی خاں صاحب نے قصبہ ہسوہ کی مسجد کو کامگار خانی قرار دیکر میرے مورث اعلیٰ و نیز میرا بھی تذکرہ زیب قلم فرمایا ہے، قبل اس کے کہ میں اس مسجد کے متعلق کچھ لکھوں اتنا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب کہ بعض حدیثیں بھی موضوع قرار دی گئیں تو پھر ایسی حالت میں سیر و تاریخ و زبانی روایات پر کب یقین کیساتھ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

ہسوہ میں اس مسجد کے علاوہ اور کوئی مسجد نہیں ہے اور نہ بزرگوں کی زبانی کبھی سنا کہ اور کوئی مسجد بھی تھی اس مسجد کے متعلق میں یقین کیساتھ کہنے کو تیار ہوں کہ یہ کامگار خاں کی مسجد نہیں ہے بلکہ شاہ جہاں کے وقت کی مسجد ہے اور اس کے دروازہ پر کامگار خاں کا کتبہ نہیں تھا جس کو بجلی کے صدمہ سے گرنا لکھا گیا ہے بلکہ حقیقت یوں ہے کہ اس قصبہ میں ایک محلہ پٹھانوں کا تھا وہ لوگ مسجد کے اندر تعزیہ بناتے تھے منع کرنے پر آمادہ جنگ و جدال ہو کرتے تھے اس لئے اس کا دروازہ اتنا چھوٹا کر دیا گیا کہ تعزیہ نہ نکل سکے اس طرح مسجد میں تعزیہ بنانا بند ہوا[1]

ہمارے مورث اعلیٰ جناب خلیفہ سید شاہ شیخ غلام قادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی اہلیہ کیساتھ بلخ سے اور تین بزرگوں کے ہمراہ ہسوہ تشریف لائے تھے آپ کے فیوض و برکات و کمالات کی شہرت بادشاہ وقت تک پہنچی بادشاہ وقت نے چار مواضعات لاخراج موضع سرسار موضع ردپورا۔ موضع نیماد و موضع مرھتا نیہ علاقہ تھانہ ہسوہ ضلع گیا۔ آپ کے نام شاہی فرمان کیساتھ بخشے لیکن آپنے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ فرمایا کہ بادشاہ مجکو دنیا میں پھنسانا چاہتا ہے۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا اور نہ بارشاہی میں حاضر بھی نہ ہوئے

---

[1] ندیم :- یہ روایت خود اپنی جگہ تحقیق طلب ہے۔

آپ کے وصال کے بعد آپ کے پوتے فضیلت پناہ جناب سید شاہ شیخ غلام حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے جو مجھ ننگ خاندان کے پردادا تھے قبول کر لیا لیکن یہ خلاف مرضی خلیفہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے تھا اس لئے پوری جائداد میری یادہی میں میرے والد بزرگوار جناب سید شاہ عبد الحسین رحمتہ اللہ علیہ کے وقت میں تلف ہوگئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ میرے قبضہ میں اس وقت متعدد اسناد شاہی موجود ہیں جن میں بعض کرم خوردہ ایسے ہیں کہ بادشاہ کا نام صاف پڑھا نہیں جاتا۔ لیکن دو سے جو کرم کے دست رس سے محفوظ ہیں ایک محمد شاہ بادشاہ غازی دوسرا فرخ سیر بادشاہ غازی کا ہے ان دونوں بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے۔ منصب امامت جمعہ وعیدین مسجد ہسوہ کی او قضایا پرگنہ سماے پچرو کھی کی میرے پردادا جناب سید شاہ شیخ غلام حسن رح کو بخشی تھی اور انہیں دونوں سندوں میں آپکا لقب فضیلت پناہ درج ہے۔ محمد شاہ کا زمانہ ۱۱۳۱ھ و فرخ سیر کا زمانہ ۱۱۲۴ھ تعالٰے

اب اصلی سوال یہ ہے جیسا کہ فاضل مقالہ نگار حکیم محمد تقی خاں صاحب نے لکھا ہے کہ یہ مسجد کامگار خاں کی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ کامگار خاں کا زمانہ ان دونوں بادشاہوں کے بعد گذرا ہے تو ان دونوں بادشاہوں کے وقت کی کونسی مسجد تھی جس کی امامت ہمارے پردادا رح کے حوالہ کی گئی تھی اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کامگار خاں کی مسجد نہیں ہے بلکہ شاہی وقت کی ہے۔ اگر کامگار خاں کی کہی جائے تو صحیح نہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس مسجد کیلئے جائداد وقف تھی وہ بھی کامگار خاں کی نہیں۔ یعنی ۲۴ بیگہ اراضی موسومہ خلیفہ باغ متصل ہسوہ شاہی وقت کی وقف تھی جو ریونو سروے میں ۲۴ بیگہ درج ہے لیکن گذشتہ سروے میں زمیندار نے کل پونے دو بیگہ یا سوا دو بیگہ باقی رکھکر بقیہ کل اپنے نام درج کرالی اور جو باقی ہے وہ بھی قبضہ میں زمیندار ہی کے ہے۔[2] مسجد کے ہر چہار طرف جو حجرے ہیں وہ پردیسی مسافروں کے رہنے سہنے کے لئے ہیں اس وقت بھی اکثر مسافر ان میں آکر رہتے ہیں۔ مسجد کے صحن میں ایک قد آدم کے برابر گہرا حوض ہے اسی کے اندر کنواں بھی ہے۔ جس سے فوارہ کے ذریعہ پانی نکلتا تھا۔ لیکن پانی اتنا تیزی سے نکلتا تھا کہ مسجد کے اندر چلا جاتا تھا اس لئے اس کنویں کو بند کر دیا گیا۔

مسجد کا موجودہ دروازہ یا آذان گاہ مسجد کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے مسجد کی زیب و زینت میرے دم سے نہیں۔ بلکہ ہسوہ کے غریب مسلمانوں ہی کے دم قدم کی برکت سے ہے یہ حکیم صاحب کا حسن ظن ہے جو انہوں نے میری طرف منسوب فرمایا ہے۔

---

[1] ندیم :۔ مقالہ نگار سے درخواست کی گئی ہے کہ ان اسناد کو منظر عام پر لائیں۔ امید ہے کہ وہ ان کے مطالعہ سے شکرگذار فرمائیں گے

[2] ندیم :۔ ابھی یہاں ان کی صحت کی ذمہ داری مقالہ نگار پر ہے محض ندیم نہیں اس کے چھپ جانے سے اس کی صحت و عدم صحت پر کسی محقق پر ثبوت لازمہ نہ ہوگا۔

افسانہ و محاضرات

ردِّ عمل

از
جناب رحمت علی صاحب صابر نور محلوی

پوس کے دن تھے، کڑاکے کی سردی تھی، امیر لوگ تو ابھی تک لحافوں میں دبکے پڑے تھے، مگر غریب کسان منہ اندھیرے سے ہی اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوئے تھے، اوکھ کی کٹائی شروع تھی، اور رس نکالنے کے بیلنے چل رہے تھے، گاؤں کے ہر کونے سے "چوں چوں"، "چیں چیں" کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نمبردار کے دیوانخانے کے سامنے اوپلوں کی ایک دھونی لگی ہوئی تھی، جسے رات چھجو چوکیدار نے سردی سے بچنے کے لئے جلایا تھا، اور پھر اسی کے پاس بیٹھکر "جاگتے رہو" کی سرکاری نوکری سرانجام دیتا رہا تھا، اسوقت دھونی کے اردگرد گاؤں کے . . . . چند عمر رسیدہ کسان موٹی موٹی چادریں اوڑھے بیٹھے تھے، سردی کے خوف سے کانپتا ہوا سورج بھی آہستہ آہستہ افق سے نمودار ہو رہا تھا، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر جابجا روئی کی طرح سفید سفید برف جمی ہوئی تھی، درختوں کے سائے میں گاؤں کے آوارہ کتے ٹانگوں میں سر چھپائے پڑے تھے، سرد ہوا کے لگتے ہی "چوں چوں" کرکے کروٹ بدل کر پھر منہ ٹانگوں میں چھپا لیتے۔ . . . دھونی کے گرد بیٹھے ہوئے کسان باتیں کرنے لگے۔

"کہو جھنڈو کتنی اوکھ باقی ہے" پیرو نے گرم گرم ہاتھ سے پنڈلی سہلاتے ہوئے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"یہی کوئی دس مرے ہوں گے"، اس نے دھوئیں سے چندھیائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"بھئی جنس کا دام دن پر دن گرتا جا رہا ہے"۔ نورو نے ایک تنکے سے آگ کریدتے ہوئے کہا۔ "خدا جانے آبکی معاملہ کس طرح پورا ہوگا"۔

جھنڈو نے پگڑی کے پلے سے ناک صاف کی، اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا: "یہی تو دن رات سوچ . . . . ہے"۔

سبنے ٹھنڈی آہ بھری۔ یکایک نورو جھنڈو کے سر کے اوپر سے کوئیں والی سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا۔

"بھلا وہ بائیسکل لے کون آرہا ہے"۔

"کہاں"، کہتے ہی سب منہ گھما گھما کر ادھر دیکھنے لگے۔

"شاید بنک کے انسپکٹر صاحب ہیں"، جھنڈو نے پرانی اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تم تو آج ہی جاکر گوجر سے عینک خرید لو" پیرو نے جھنڈو کو مذاق کے لہجے میں کہا۔ "کیونکہ تم سے تو اب چوہدری نتھو کا لڑکا بھی پہچانا نہیں جاتا"۔

"کون افضل ہے"، جھنڈو نے آنکھوں کو ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو امرتسر کے اسکول میں پڑھتا تھا نہ؟"

"ہاں ہاں ..... وہاں ڈاکٹری پڑھتا ہے، چھٹی میں آیا ہوگا۔"

جھنڈو نے ایک دفعہ پھر ناک صاف کی، اور گلا صاف کرکے بولا "بڑا ہی نیک اور بھلا مانس لڑکا ہے، میرے خیال میں تو گاؤں بھر میں شاید ہی کوئی لڑکا اسکی جوڑ کا نکلے ...... نہ کسی سے لڑنا نہ جھگڑنا۔ بڑے پن کی تو اس میں ایک بھی بات نہیں!"

"ٹھیک کہتے ہو جھنڈو" نورو بولا۔ "خدا کرے ڈاکٹری پاس کرتے ہی سرکار اسے فرید والے ہسپتال میں لگا دے، تو ہم غریبوں کا بھی کچھ بھلا ہو۔ ورنہ آجکل کا ڈاکٹر تو سیدھے منہ کسی سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتا...... سچ پوچھو تو مجھے اس سے خوف سا معلوم ہوتا ہے۔"

"کوئی اگر گھر پر لانا چاہے تو سواری کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا، حالانکہ اس کے گھر میں دو دو بائیسکلیں موجود ہیں"...... پیرو نے ٹھنڈی آہ بھری۔

اتنے میں وہ سائیکل تھامے تھامے ان کے قریب آگیا۔ اور آتے ہی "السلام علیکم" بولا۔

"وعلیکم" سب نے بلند آواز سے جواب دیا۔

آنے والا لٹھے کی سفید سلوار، سلک کی قمیص اور سرخ رنگ کا بلیزر کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی اور گلے میں اونی گلوبند تھا۔ بیس بائیس سال کا تندرست جوان گندم گوں رنگ، کتابی چہرہ، متناسب اعضا اور اس کے خوبصورت چہرے پر سادگی اور دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"بائیسکل کو کیا ہوا افضل بابو!" نورو نے ہاتھ ملانے کی نیت سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹیوب پھٹ گئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس سواری میں یہی تو عیب ہے" جھنڈو نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ "چلتی رہے گی تو گاڑی...... ورنہ خود لاد کر چلنا پڑتا ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔

"مگر اتنے سویرے آپ کیسے پہنچ گئے؟" پیرو نے نکلتے ہوئے سورج کی طرف دیکھکر پوچھا، "کمالیہ تو یہاں سے دس میل سے کم نہ ہوگا!"

"میں رات ۹ بجے والی گاڑی سے اتر کر مخدوم پور میں آگیا تھا، اور وہاں سے نمبردار کے لڑکے کا سائیکل لیکر روانہ ہوا تو کمبخت نے بیچ راستے میں دھوکہ دیا۔"

اتنے میں بھو چمار دوڑتا ہوا آیا اور لپک کر افضل کے ہاتھ سے بائیسکل لے لی اور خیر و عافیت دریافت کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

افضل کے ابا چوہدری فتو، گو محمد بخش نمبردار کے چھوٹے بھائی تھے، مگر رکھ رکھاؤ اور علاقے بھر کے افسروں سے میل ملاپ رکھنے کی وجہ سے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، پڑھے لکھے تو واجبی ہی سے تھے، مگر تھے بڑے زمانہ شناس اور ہوشیار خاصکر انھیں مقدمے بازی میں ملکہ حاصل تھا جس کی وجہ سے لوگ ان سے مرعوب ہی نہیں بلکہ خوف بھی کھاتے تھے، یوں آدمی دل کے برے نہ تھے۔ اور افضل کو تو وہ دل سے چاہتے تھے، باپ بیٹے کی طبیعت میں زمین و آسمان کا فرق تھا، باپ خوشامد پسند اور آسودہ حال ہونے کی وجہ سے کسی کو نظر میں نہیں لاتا تھا، مگر بیٹا بیحد خلیق اور ملنسار طبیعت کا مالک تھا اور ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کیلئے ہمیشہ کمربستہ رہتا تھا۔ باپ کی تو لوگ اس کے رعب و دبدبے کی وجہ سے عزت کرنے پر مجبور تھے، مگر بیٹے کو اس کی بلند اخلاق اور ہمدردی کی وجہ سے

دل سے چاہتے تھے، انہی کمزوریوں کی وجہ سے اس کے ابا اس سے ناراض سے رہتے تھے، مگر وہ کبھی بھی غریب کسانوں کی امداد کرنے سے باز نہ آتا تھا۔

افضل کو گھر آئے ہوئے دو تین دن گذرے تھے ایک دن حسب معمول وہ منہ اندھیرے ہی گرم چادر اوڑھے ہوئے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا، آسمان ابر آلود تھا، اور ٹھنڈی ٹھنڈی پوروا ہوا چل رہی تھی، جس سے جسم میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی تھی جیسے ہی وہ گاؤں سے نکل کر پگڈنڈی پر چلنے لگا تو اس کے کانوں میں کسی کی سریلی آواز آئی، کوئی درد بھرے لہجے میں "ماہیا" گا رہا تھا۔

بازارو کیندی اے برفی۔ مینوں سے دے نکی جیہی چرخی
دکھاں دیاں پونیاں۔ جیوے ماہیا ......
ڈھول ماہی وا ...... دکھاں دیاں ماریاں نے رحم چاہیا

رات کا پچھلا پہر، پرسکون فضا، سریلی آواز اور پردرد نغمہ، گانے والا کسی فرقت زدہ اور غموں کی ماری ہوئی حسینہ کے دلی تاثرات کو شعروں کے پیرائے میں بیان کر رہا تھا افضل رک کر سننے لگا۔ آخری مصرعہ ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ گانیوالے نے زور کی چیخ ماری، جیسے کسی نے اس پر بے خبری میں حملہ کر دیا ہو اور رس نکالنے کے بیلنے کی چوں چوں بھی ختم ہو گئی، مگر چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں، اگر دھیمی آوازیں، افضل نے زیادہ ٹھہرنا فضول سمجھا اور اندھا دھند ادھر بھاگنے لگا، جیسے ہی وہ بانس کے پھاٹک سے اندر داخل ہوا، تو اس نے لالٹین کی روشنی میں مجو، خیرو کسان کے لڑکے کو دیکھا، جس کا بایاں ہاتھ گنوں کے ساتھ ہی پہنچے تک بیلنوں میں پھنسا ہوا تھا، اور وہ درد کے مارے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ رلدو چار مضبوطی سے بیلوں کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھا۔ اور بڈھا باپ ہاتھ نکالنے کی مختلف ترکیبیں کر رہا تھا مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی، مجو کی گریہ زاری اور بیقراری نے غریب کے ہاتھ پاؤں پھلا رکھے تھے، کوئی چارہ نہ دیکھ کر وہ پوری قوت سے ہاتھ کھینچنے کی کوشش کرنے لگا،

"ہاں ہاں، یہ آپ کیا کر رہے ہیں خیرو چچا"، افضل نے آگے بڑھ کے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "اگر اس طرح آپ زور آزمائی کریں گے، تو ایک بھی انگلی بیلنوں سے ثابت نہ نکلیگی۔"

خیرو جلدی سے گھوما اور بولا "تو پھر کیا کروں"! اور پھر لالٹین ہاتھ میں اٹھا کر افضل کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "اوہ تم ہو فضل بابو... بڑے اچھے وقت میں آئے...... دیکھو جلدی کرو... کسی ترکیب سے مجو کا ہاتھ نکالدو بیٹا"... بڈھے کے چہرے سے مایوسی اور بیقراری ٹپک رہی تھی، اور آنکھیں ملتجیانہ انداز سے افضل کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آپ گھبرایئے نہیں میں ابھی نکالدیتا ہوں"۔ افضل نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ اور پھر لالٹین لیکر آگے بڑھا، رس کی نالی سے خون بہ رہا تھا، اور مجو پر بیہوشی طاری تھی، مگر درد کے مارے وہ اب بھی کراہ رہا تھا۔

"رلدو! تم ذرا بیلوں کو دو قدم پیچھے ہٹاؤ تو!... اور آپ ذرا لالٹین لیکر کھڑے رہیے۔"

بیلوں کے پیچھے ہٹتے ہی ہاتھ نکل آیا، اور وہ بیہوش ہو کر افضل کے ہاتھوں میں آگرا، کچلی ہوئی انگلیاں چپٹی ہو گئی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا، افضل اسے اٹھا کر کوٹھے کے اندر لے گیا، جہاں پر گڑ بنایا جا رہا تھا، اور آگ کے پاس ہی پیال پر لٹا دیا، اور پانی سے انگلیاں دھو کر ان پر رومال لپیٹ دیا، رلدو اور خیرو تعریف بھری نگاہوں سے پاس ہی کھڑے اسے دیکھ رہے تھے

"خدا کا شکر ہے۔" افضل کہنے لگا۔ "کہ بیل موقع ہی پہ رک گئے۔ ورنہ پورا ہاتھ ہی بیلنوں میں چلا جاتا۔"

"میں نے اس سے کئی بار منع کیا۔" خیرو فجو کے پریشان بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولا "کہ گنے لگاتے وقت گانا نہ گایا کرو۔ مگر اس پر کبھی بھی عمل نہ کیا۔"

اتنے میں فجو کو ہوش آگیا، وہ متجسس نگاہوں سے افضل کی طرف دیکھنے لگا اور بولا "کون"!

"میں ہوں افضل"۔ افضل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں نہیں ابھی تم لیٹے رہو۔ خون بہت نکل چکا ہے۔ اس لئے فی الحال تم ہلو جلو مت۔"

"اچھا چچا میں گھر سے دوائی لیکر آتا ہوں۔ آپ اسے سہارا دیکر گھر لے چلئے۔" یہ کہکر وہ روانہ ہوگیا۔

"زلدو بیلوں کو کھول دو۔" خیرو نے کہا "اور لالٹین بھی بجھا دو۔ کیونکہ اب تو سویرا ہی ہوگیا ہے۔"

صبح شام بلا ناغہ افضل، فجو کی مرہم پٹی کی غرض سے آنے جانے لگا۔ اس کے ابا نے ایک دفعہ ٹوکا بھی اور کہا "تم تو فضول ہی اپنا وقت برباد کرتے ہو افضل ان سے کہہ دیتے کہ اسے ہسپتال لیجاتے، وہاں مفت میں دوا دارو ہو جاتا۔"

"افضل نے سنجیدگی سے کہا۔ "کام کاج کے دن ہیں ابا۔ پھر فجو کو بخار بھی آتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ اسے ہسپتال لے جائیں، تو خواہ مخواہ اس کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی رہنا پڑے گا، غریب آدمی اپنے وقت کا ہرج تو کرے گا، مگر ہسپتال کا خرچ کہاں سے دیگا۔"

چوہدری صاحب لاجواب سے ہو گئے۔ اور بولے "میں تو تمہارے ہی فائدے کیلئے کہہ رہا تھا، خیر نہیں مانتے تو نہ سہی۔" افضل خاموشی سے دوائی لیکر باہر نکل آیا۔

دس بارہ روز ہی میں زخم بھرنے لگا، اور بخار تو تین چار روز بعد ہی دور ہوگیا، ایک دن صبح کے وقت افضل زخم صاف کرکے دوائی لگا رہا تھا، اور فجو ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہا تھا، اتنے میں اندر کا دروازہ کھلا، خیرو جو پاس ہی دوسری چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، ادھر دیکھتے ہی بولا۔

"کیوں، چائے لے آئیں نوری؟"

"ہاں میاں"

افضل بھی پٹی باندھتے ہوئے ادھر دیکھنے لگا۔ اسکی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، کوئی بارہ تیرہ برس کی ایک خوبصورت سی لڑکی ہاتھ میں چائے کا پیالہ لئے کھڑی تھی۔ سرو قد، بڑی بڑی .... آنکھیں، فراخ پیشانی، سانولی سلونی رنگت اور چھریرا بدن، اس دہقانی دوشیزہ نے کریپ کی نیلی دھاری دار کرتی، چھینٹ کے سلوار اور سر پر عنابی رنگ کی اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی، جس کا شوخ رنگ اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگا رہا تھا۔ اس کی فطری حیا اور سمٹ کر کھڑے ہونے کا انداز افضل کو کچھ ایسا دلفریب معلوم ہوا، کہ وہ اسے کتنی ہی دیر تک ٹکٹکی باندھکر دیکھتا رہا، وہ شرما کر اور سمٹ گئی، اور افضل چونک کر بول اٹھا۔

"کون نوری! ..... کب آئیں!!

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"کہاں سے! اوہ ..... اپنی نانی کے یہاں سے تو یہ پرسوں ہی فجو کے زخمی ہونیکا حال سنکر آئی ہے۔" خیرو نے اس کی

طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ابتو رہو گی نہ !"

اس نے صورت اثبات سر ہلایا، اور شرماتی ہوئی آگے بڑھی، اور چائے کا پیالہ افضل کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ بھلا آپ نے چائے کی کیوں تکلیف کی چچا!" افضل بولا "آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس کی اتنی عادت نہیں۔"

"اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے بیٹا!" ایک نحیف الجثہ بڑھیا نے دروازے سے اندر داخل ہو کر کہا "ہم بھلا پاس اور ہے ہی کیا، جو تمھارے اس احسان کا بدلہ دے سکیں، جو تم نے فجو کا علاج کر کے کیا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو نوری کی ماں" خیرو حقے کا دم لگا کر بولا "خدا جانے ہسپتال جاتے تو کیا کچھ نہ دکھ سہنا پڑتا۔"

"اس میں احسان کی تو کوئی بات نہیں چچی!" افضل بولا "آخر میرا پڑھا لکھا کس دن کام آئے گا۔"

"خدا تمھیں اس سے بھی زیادہ بلند مرتبہ عطا کرے" میاں بیوی دعائیں دینے لگے۔ اور افضل آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ خالی پیالہ نوری کو دے کر بولا۔ "اچھا جاتا ہوں، پھر شام کو آؤں گا امید ہے کہ میرے جانے سے پہلے پہلے چھوٹی انگلی کا زخم بھی بھر جائیگا۔"

"کیوں جانا ہے آپکو؟" نوری نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں اسکول! کیونکہ چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اور پرسوں شام کو چلا جاؤں گا۔"

"بڑی جلدی چھٹیاں ختم ہو گئیں" نوری نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"گھبراتے کیوں ہو۔ میں ۔۔۔ آتا رہوں گا" یہ کہکر وہ باہر نکل آیا۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھنے لگا، اسے اسی طرح معلوم ہونے لگا جیسے کہ کوئی چیز وہیں بھول آیا ہے ۔۔۔۔ مگر اس چیز ۔۔۔ کو بہت سوچنے پر بھی وہ یاد نہ کر سکا۔ رات کو بستر پر بھی وہ مبہم سے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔

پیر کی شام کو وہ امرتسر روانہ ہو گیا۔

جولائی کے آخری دن تھے، اور دوپہر کا وقت۔ افضل گرمی کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے نمی بھرے ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہو رہے تھے، اور افضل ایک کھری چارپائی پر لیٹا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔

"افضل بھیا!"

افضل اٹھ کر بیٹھ گیا، اور آواز دینے والے کی طرف دیکھتے ہی بول اٹھا "کون فجو! آؤ آؤ!!"

فجو اندر آ گیا، اور ہاتھ ملا کر اس کے پاس ہی چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔

"میں نے کل ہی شام کو آپ کے آنے کا سنا تھا" فجو کہنے لگا "ارادہ تو اسی وقت آنے کا تھا، مگر پھر رات کو آپ کو بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔"

"بے آرام۔" افضل ہنستے ہوئے بولا "گرمی کے مارے تو رات بھر نیند نہیں آئی۔ تم آ جاتے تو شاید یہ وقت مزے میں کٹ جاتا!"

"وہ کیسے!" فجو نے حیرت سے پوچھا۔

"تم گانا سناتے اور میں بیٹھا ہوا سنتا۔"

"ہی ہی ۔۔۔۔ بھیا کی بات تو سنو۔" فجو ہنستے ہوئے بولا

...گانا ہی سننا تھا۔ مجھے بلا لیتے، میں سر کے بل پہنچتا۔" اتنے میں بادل زور سے گرجا۔ دونوں چونک پڑے اور افضل کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا۔

"چلو مربعے چلیں"۔ افضل بولا۔ "بارش کی بہار کا مزہ کچھ کھیتوں ہی میں آتا ہے۔"

"چلیئے..... ایک دن بھی آپ کی صحبت میں گزر جائے تو غنیمت ہے۔"

"کیوں پھر "لام" پر جانا ہے کیا۔" افضل نے جوتا پہنتے ہوئے کہا۔

دونوں ہنسنے لگے، فجو پھر سنجیدگی سے بولا۔ "میں آج کل لائل پور کی منڈی ہی میں کام کرتا ہوں نہ، آپ سے دو روز پہلے آیا تھا، اور پھر کل جانا ہے۔"

"منڈی۔ میں کام کرتے ہو؟" افضل نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں"۔

مگر اس سے زیادہ افضل کو پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، اور وہ سمجھ گیا کہ منڈی میں کیا کام کرنا ہوتا ہے۔

گاؤں سے نکلتے ہی پھوار پڑنے لگی، اور دونوں جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے فجو کے مربع کی طرف بڑھنے لگے۔ ہوا میں پہلے سے زیادہ خنکی تھی، اور بادل جھکے کھڑے تھے۔ جیسے کسی کے اشارے کے منتظر ہیں۔

جیسے ہی وہ کوٹھے کے اندر پہنچے۔ تو ایک دفعہ پھر بادل گرجا، ہوا زور زور سے چلنے لگی، اور مینہ چھم چھم برسنے لگا۔ فجو نے چارپائی بچھائی، اور دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ اتنے میں خیرو بھی پہنچ گیا، اور افضل کو بیٹھا دیکھ کر اس کی خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔

"یہ کہاں بھول پڑے افضل بابو....." وہ کھدر کی چادر کو نچوڑتے ہوئے بولا۔ "لیجئے لیجئے بڑے موقعے سے آئے آپ"۔ یہ کہتے ہی اس نے تین چار خربوزے طاقچے میں سے نکال کر اس کے پاس ہی چارپائی پر رکھ دیئے، فجو نے جیب سے چاقو نکالا، اور چیرنے لگا، خیرو حقہ بھرنے میں مشغول ہو گیا۔

بارش تھم گئی، تو تینوں باہر نکل کر شوق بھری نگاہوں سے اس حسین منظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ بڑھیا کی کمان فاختئی رنگ کے بادلوں میں ایک دلفریب انداز سے کھچی ہوئی نظر آتی تھی۔ ننھی ننھی چڑیاں ترانۂ بہار گاتی ہوئی ادھر سے ادھر اڑتی پھر رہی تھیں، بارش کا پانی ندیوں کی شکل میں ڈھلوان کی طرف بہ رہا تھا۔ درختوں کے دھلے ہوئے پتے نئی زندگی پا کر خاموشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ فجو نے چارپائی باہر نکال کر بچھا دی، اور افضل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بیٹھتے ہی خود بھی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا خیرو بھی حقہ لے کر آ بیٹھا۔

"ایک دن تم نے گانا سنانے کا وعدہ کیا تھا، یاد ہے فجو؟ اور آج سے بہتر شاید پھر موقعہ مجھے گانا سننے کا نہ مل سکے۔"

"ہاں سنا دو فجو"۔ خیرو تائیدی لہجے میں بولا۔ "ہیر کے چاہے "سوہنی مہینوال" کے چند بول۔ پھر خدا جانے تمہاری افضل سے کب ملاقات ہو۔"

فجو نے گلا صاف کیا اور گانے لگا۔

فجو کے گلے میں بلا کا سوز اور غضب کا لوچ تھا۔ آواز تو اس کی شروع ہی سے سریلی اور مدھ بھری تھی۔ مگر جب سے اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے گلے میں پہلے سے زیادہ سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اٹھتے بیٹھتے ہیر گایا کرتا تھا۔

"سسی پنوں" اور "سوہنی مہینوال" کے فراقیہ اشعار گاتا رہتا تھا جس سے سننے والے پر محویت... ایک نہ ٹوٹنے والی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، آج افضل پر بھی اس کے گانے کا بہت اثر ہوا۔ اور اس کا دل نہ جانے کیوں خود بخود ڈانواں ڈول ہونے لگا، اور بے اختیار اس کے منہ سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگیں۔

گانا ختم ہوتے ہی وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں نوری روٹی لیکر آگئی، اور افضل کی نگاہیں بے اختیاراً اس دوشیزۂ دیہات کے خوبصورت اور بھولے بھولے چہرے پر جم گئیں۔ اور وہ بھی آنکھیں چرا چرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی یکایک افضل چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے کہ کوئی بھولی ہوئی بات اسے یاد آگئی ہو۔

"کیوں کہاں چلے افضل" خیرو نے حیرت سے پوچھا، فجو بھی تعجب بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"گھر..... مجھے آج ہی ایک ضروری خط بھیجنا ہے جس کو میں بھول ہی گیا تھا"

"ڈاک تو کہیں شام کو جاتی ہے"، فجو نے قائل کرنے کی غرض سے کہا،

"وہ ڈاک نہیں بلکہ دستی بھیجنا ہے، پھر شاید چھجو گھوڑ لے چلے، اچھا میں چلتا ہوں، پھر کسی وقت آؤنگا" یہ کہکر وہ کیچڑ سے بچتا بچاتا گاؤں کی طرف چلنے لگا، خیرو، فجو، اور نوری حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے دیکھتے رہ گئے

اس رات اس نے کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دی، مگر نیند آج آ ہی نہ سکی، ایک ذہنی اضطراب تھا، ایک روحانی خلش تھی جو اسے کسی پل چین نہ لینے دیتی تھی۔

روز رات کو ارادہ کرتا، کہ کل خیرو چچا کے یہاں نہ جاؤنگا مگر دوپہر ہوتے ہی اسے اپنے ارادوں سے دست بردار ہونا پڑتا، اور وہ پابزنجیر مجرم کی طرح بے اختیار کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتا، اسے اپنی طبیعت پر اس قسم کی پابندی عائد کرنے کا سبب خود بھی معلوم نہ تھا، خیرو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا کبھی کبھی نوری بھی، اس سے پہلے ہی وہاں موجود رہتی، اور وہی چارپائی نکال کر بچھا دیتی، جب خیرو اور وہ حقہ پیتے ہوئے باتیں کرتے تو وہ بھی پاس ہی پیال پر آ بیٹھتی، اور بڑی توجہ سے دونوں کی باتیں سنتی، جو جنس کے بھاؤ، عام کساد بازاری، ملک کی اقتصادی پریشانی، اور ہندوستان کی موجودہ سیاست کے مراحل طے کرتی ہوئی پنجاب کی "اتحادی وزارت" پر آکر ختم ہوتی، اور افضل ایک ماہر سیاست کی طرح "اتحادی وزارت" کے شاندار کارناموں پر تبصرہ کرتا، اسلوب بیان اتنا مدلل اور مطلب آفرین ہوتا تھا کہ خیرو سا سیدھا سادہ کسان بھی کسان کمیٹی اور کانگریس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکتا، بیچ بیچ میں نوری بھی ٹوک ٹوک کر کوئی بات پوچھ بیٹھتی اور افضل اس کی سمجھ کے مطابق جواب دے دیتا۔

ایک دن افضل ذرا سویرے ہی پہنچا، خیرو بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، اس نے دیکھتے ہی کہا۔

"آؤ کھانا کھاؤ افضل"۔

"نہیں آپ کھائیے مجھے ابھی بھوک نہیں"۔

"تھوڑا سا کھا لو"

"آج میں نے دیر کرکے ناشتہ کیا تھا اس لئے....."

"نہیں کھائیں گے میاں" نوری فوراً بیچ میں قطع کلام کرتے ہوئے بولی۔ "پراٹھا کھانے والوں سے بھلا چنے کی روٹی کیونکر کھائی جانے لگی"

افضل نادم ہوگیا، اور پھر بناوٹ سے ہنستے ہوئے کہا۔
"نہیں یہ بات نہیں نوری، تم نے میرے انکار کا غلط مطلب سمجھا... اچھا لائیے، میں کھا کے دکھا دیتا ہوں، کہ چنے کی روٹی بھی کھا سکتا ہوں"۔ یہ کہکر کھانے لگا۔

خیرو ہنستے ہوئے بولا "دیکھا، نوری نے آخر قائل ہی کر دیا تمہیں"۔

"بالکل" افضل لقمہ چباتے ہوئے بولا۔

کھانا کھا کر دونوں نے ہاتھ دھوئے، اتنے میں نوری حقہ بھر کے لے آئی، اور خیرو چند کش لگاتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، اور بولا:- تم بیٹھو میں ذرا بیلوں کے لئے چارہ کاٹ لاؤں.....

نوری نے برتن سمیٹ کر کوٹھے کے اندر رکھدیئے، اور بیلوں کو تالاب سے پانی پلایا۔ ناند صاف کرکے چارہ ڈالدیا، اور پھاوڑے سے گوبر ہٹا کر افضل کے پاس ہی پیال پر آ بیٹھی۔

"ایسا مزے دار کھانا تو میں نے عمر بھر نہ کھایا تھا"، افضل مسکراتے ہوئے بولا۔

"جھوٹ"

"خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہتا"۔ افضل بولا۔ میں نے آجتک چنے کی اتنی دبیز اور ملائم روٹی اور کدو کی ایسی ترکاری نہ کھائی تھی۔

اپنی تعریف سنکر نوری کا خوبصورت چہرہ وفور مسرت سے کندن کی طرح دمکنے لگا۔ اور پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کی فراخ پیشانی پر موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔

"اچھا تو کل سے میں آپ کی روٹی بھی بنا کر لایا کرونگی۔ کھانے لانا!

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"

نوری مسکرانے لگی، اور مسرور نگاہوں سے افضل کی طرف دیکھنے لگی، ان معصوم اور خوبصورت آنکھوں میں بلا کی کشش تھی، جو افضل کو بے طرح اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

دن گذرتے گئے، افضل نے نوری کو بھولنے کی ہر ممکن کوشش کی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میرا اور نوری کا ساتھ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر پاپی من کسی پہلو چین ہی نہ لینے دیتا تھا، رد عمل کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، اور وہ مجبور ہو کر قبل از وقت کالج جانے کیلئے تیار ہوگیا، جانے سے ایک دن پہلے جب وہ دوپہر کے وقت اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا، تو یکایک ایک خیال اس کے دل میں گذرا، اس کے آتے ہی وہ تمام بندشیں اور اپنی عائد کردہ پابندیوں کو بھول گیا، اور بے اختیار خیرو کے مربع کی طرف چل پڑا۔ نوری بیٹھی چارہ کتر رہی تھی، اسے تنہا دیکھکر اسے لوٹ جانا چاہا، مگر قدموں نے پیچھے ہٹنے سے جواب دیدیا۔ ہمت کرکے وہ آگے بڑھا۔

"نوری" ——!

وہ چونک پڑی، اور افضل کو دیکھکر اس نے جلدی سے اوڑھنی اوڑھی، اور اٹھکر کھڑی ہوگئی۔ "آیئے افضل بھیا"

"چچا کہاں گئے؟" افضل نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو صبح ہی سے کلیان پور گئے ہوئے ہیں"، افضل بچھی ہوئی چارپائی پر جا بیٹھا، اور نوری شیشم کے پیڑ سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہوگئی، دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش تھے۔ اور بلا وجہ نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"ایک بات پوچھوں؟" افضل نے کہا۔

"پوچھیے"

"تم جانتی ہو کہ میں آج کیوں آیا ہوں"

"نہیں"

"اچھا تو سنو" وہ قریب آکر کھڑا ہو گیا، "میں اس دن کی حرکت کی معافی مانگنے آیا ہوں، جب چچا چارہ لینے گئے ہوئے تھے، اور تم کوٹھڑی میں برتن رکھ رہی تھیں، اور میں اس وقت دروازے میں آکھڑا ہوا، تم نے مجھے حواس باختہ دیکھ کر وجہ پوچھی، اور میں کچھ کہے بغیر چارپائی پر آکر بیٹھ گیا، تم کھو سی گئیں، آج میں تمہارے اس دن کے سوال کا جواب دیتا ہوں، سنو گی؟"

"ہوں" نوری خیالات کے بحرِ بے پایاں میں غوطے لگاتے ہوئے بولی۔

"جس دن سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، اسی دن سے محبت کرتا ہوں،..... مگر محبت کے ظاہر کرنے کی مجھے کبھی بھی ہمت نہ ہوئی..... آج چونکہ واپس امرتسر جا رہا ہوں، اس لئے اس کا ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھا، اور پھر اپنی اس جرأت کی تم سے معافی بھی مانگتا ہوں۔" اس کے لہجے سے محبت کی مجبوریاں ظاہر تھیں، جسے سن کر نوری بہت متاثر ہوئی، اس کا تمام جسم کسی نامعلوم احساس کے ماتحت لرزنے لگا، اور آنکھیں سیاہ بھوؤں کے نیچے تاریکی میں جھکنے لگیں، جیسے کہ اس کی تمام روح انہی میں سمٹ کر آگئی ہو۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر زبان نے یارا نہ دیا۔

"جو کچھ تمہارے دل میں ہے، وہ بے خوف و خطر کہہ دو نوری۔" افضل نے اسے حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں افضل بھیا، وہ رک رک کر بولی: "مجھے بھول جایئے آپ نہیں جانتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں"..... افضل بولا، "رہا انجام کا سوال..... تو یہ تمہاری "ہاں" یا "نہ" پر منحصر ہے۔"

"نہیں..... ایسا ہونا مشکل ہے، ذرا اپنی اور میری حیثیت تو دیکھو..... کبھی امیر اور ایک نادار بھکاری کا ساتھ ہوا ہے؟"

"ہاں ہو سکتا ہے نوری...... بشرطیکہ تم راضی ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں نہیں افضل بھیا آپ بھول رہے ہیں۔"

تم تو فضول گھبرا رہی ہو، میں تم سے دل و جان سے محبت کرتا ہوں، اور وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا کہ افضل چوہدری کا لڑکا نہیں ہے بلکہ ایک محبت کا مارا ہوا جوان ہے جس کی نظروں میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، میں تمہاری بے بسی اور بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا، میں تم سے بے پناہ اور بے پایاں محبت کرتا ہوں، اور تمہیں اپنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کروں گا۔

نوری کی آنکھوں سے محبت کے آبدار آنسو بہنے لگے، اور افضل انہیں اپنے رومال میں جذب کرنے لگا،... اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے امرتسر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

دو دن بعد جب وہ مربع پہنچا، تو خیرو کو کسی خیال میں غرق پایا، علیک سلیک کے بعد وہ ان کے پہلو میں چارپائی پر بیٹھ گیا، اور حقہ پینے لگا۔

"کیوں کیا بات ہے چچا، جو آپ اس قدر پریشان سے نظر آتے ہیں"

"کچھ نہیں بیٹا..... یونہی بیٹھا سوچ رہا تھا" بڈھے کی آواز بھرا گئی، اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، افضل یہ نظارہ دیکھ کر گھبرا گیا، اور تسلی دیتے ہوئے بولا "کیا سوچ رہے تھے آپ، اگر آپ کو کوئی تکلیف ہے، تو خدارا جلد کہئے، تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔"

"میری تکلیف ڈاکٹری دوائیں سے دور نہ ہوگی افضل..

یہ ایسا روگ ہے، جس کا تعلق دل و دماغ اور روح سے ہے...."
یہ مبہم سا جواب سنکر افضل اور بھی فکرمند ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا، کہ دنیا کا وہ کونسا روگ ہے جسکا کوئی علاج نہ ہو۔ اور اس کا اثر دل و دماغ اور روح پر ہو، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج ہی اور ابھی وہ معلوم کئے بغیر نہ رہے۔ اور چند ہی منٹ کی کوشش کے بعد بڈھے نے اپنی مجبوری کی دکھ بھری کہانی اسے سنا دی۔ وہ کہنے لگا۔
"شاید تمہیں معلوم نہیں، کہ فجو کھیتی باڑی چھوڑ کر لائل پور کی دالمنڈی میں کیوں لوٹیا کا کام کرنے پر مجبور ہوا حالانکہ ہماری زمین کچھ ایسی کمزور نہیں جو چار جانوں کا خرچ نہ چلا سکے۔ مگر ہمیں روپے کی ضرورت تھی، اور اس کا کچھ ملنا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے مجبوراً فجو کو باہر کمانے کے لئے بھیج دیا، اور کھیتی باڑی کا کام اپنے ذمہ لے لیا، اور اس طرح ہم نے تھوڑے ہی عرصہ میں ڈیڑھ سو روپے جمع کر لئے، مگر افسوس..... میری امیدوں پر اوس پڑ گئی اور....." بڈھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اور پگڑی کے پلے سے آنسو خشک کرنے لگا،
"آخر آپ کو اسقدر روپے کی کون سی ضرورت پڑ گئی، جہانتک مجھے معلوم ہے، آپ کے ذمہ سرکاری لگان بھی باقی نہیں اور کسی دوسرے کا قرضہ بھی آپ کے ذمہ نہ ہوگا..... پھر کس لئے یہ رقم جوڑ رہے ہو۔"
"نوری کی شادی کے لئے"..... بڈھے نے آخر کار کہا۔
افضل کو جیسے کسی نے زور سے کنپٹی پر گھونسہ مار دیا ہو، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، [illegible] جسم میں حرکت کرنے لگا۔
نوری کی شادی! وہ دل میں سوچنے لگا، تو یہ لوگ نوری کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں، اور میں کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا، الٰہی میرے دل فریب خوابوں کی یہ تعبیر ہوگی، مجھے بھولکر بھی اس کا خیال نہ آیا تھا، کیا نوری کسی دوسرے کی ہو جائیگی نہیں.... میں جان سے پیاری نوری کو ہرگز غیر کے قبضے میں جانے نہ دوں گا۔ کیا میری تمناؤں کا اسی طرح میری آنکھوں کے سامنے خون ہوگا، تو کیا تو کیا میں کہدوں، کہ میں نوری کو اپنے لئے منتخب کر چکا ہوں، اور وہ میری ....." اس کے خیالات کے سلسلے کو خیرو نے یہ کہکر منقطع کر دیا کہ "پہلے تو اس کے سسرال والے چند زیوروں ہی پر نکاح کرنے پر راضی تھے، مگر اب بولتے ہیں کہ سونے کے پھول اور پہنچیاں بھی ہونی چاہئیں.... کیونکہ لڑکا بہاولپور میں نمبرداری کا امیدوار ہے۔ میں غریب بھلا انکی یہ فرمائش کیونکر پوری کر سکتا ہوں"
"کتنے روپیوں کی ضرورت ہوگی آپ کو..." افضل یکایک اپنے خیالات پر قبضہ حاصل کرتے ہوئے بولا" ہاں ہاں کہئے میں آج شام کو، آپ کو روپے لا دوں گا....."
بڈھا حیرت بھری نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، جس پر ہمدردی ایثار و محبت کا نور برس رہا تھا، اور بولا "سو روپے کی"! افضل یہ سنتے ہی گھر روانہ ہوگیا،

افضل کے مشورے سے خیرو نے نوری کے بیاہ کی تاریخ اپریل کی چھٹیوں میں مقرر کی، برات آئی۔ تو افضل مہمانوں کی آؤبھگت میں پیش پیش رہا، دولہا کے قریب پہنچتے ہی وہ بمشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکا، رخصت کے وقت نوری اپنی سہیلیوں سے مل ملکر خوب روئی، اور باوجود ضبط کے افضل کی آنکھوں سے بھی دو ایک آنسو ٹپک پڑے، جو نیم کے سایہ میں فرش خاک پر گر کر مٹی میں جذب ہوگئے۔

جوڑے کی تلاش

از
جناب کاشف ایم اے

حالانکہ جانے کیلئے کچھ دن باقی ہی تھے گر کلکتہ کی زندگی کے پریشان کن خیالات بھیانک اور ڈراؤنے سیاہ بادل کی طرح ابھی سے میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے جیسے خزاں کی آمد کے خیال سے بہار کے آخری ایام بے کیف اور بے مزہ ہو جاتے ہیں اُسی طرح یہ رہے سہے دن بھی مجھے بے رونق اور سنسان معلوم ہوتے تھے

چارپائی پر لیٹا ہوا تھا کہ میری بچی شہناز ہنستی کھیلتی سامنے آ گئی۔ دل کھل گیا، تھوڑی دیر کے لئے پژمردگی پر تازگی غالب آ گئی۔ اہلیہ نے میری طبیعت کی اس عارضی بشاشت کا فائدہ اٹھایا اور انھیں کچھ کہنے کا موقع مل گیا۔

"ایک تو نہ جانے کلکتہ میں بڑی بھلی کیسی زندگی گذرتی ہے بھلا چھٹیوں کے یہ دن تو گاؤں میں خوشی خوشی کہیں آخر چین کہاں ملے گا۔ یہ بتلایئے کہ یہاں آپ کو کیا میسر نہیں۔ عمارتوں میں رہنے کا شوق میں دیکھتی ہوں کہ خود آپ کے دل میں نہیں۔ تنگ و تاریک مکانوں سے تو آپ کی روح گھبراتی ہے تو یہاں کوئی ایسی بات نہیں۔ پھر آخر آپ نڈھال نڈھال سے کیوں رہتے ہیں۔ آپ کی طبیعت اُچاٹ اُچاٹ سی رہتی ہے۔ اور میرا دل سچ کہتی ہوں اندر سے گھبرانے لگتا ہے۔ پڑے پڑے بھی طبیعت سست اور اداس ہو جاتی ہے۔ بس آج شام سے آپ کو سڑک پر ایک میل کا چکر ضرور لگانا پڑیگا۔ ہاں کہہ دیا ہے۔ ہمیں تو میدانوں کا خیال آتا ہے تو دل میں لہریں اُٹھنے لگتی ہیں، آپ مرد ہو کے کھلی فضا میں کیوں نہیں جاتے"

میں اس مختصر سی گفتگو میں ایک ہونس کی مخلصانہ ہمدردی کی بُو پا رہا تھا۔ پھر اس میں ناز آفرینی کی آن بان بھی جھانکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ بزار فکر اور تردد کی وجہ سے دلِ زندہ کا ساتھ چھوٹ چکا تھا مگر سن و سال کے دبے دبائے تقاضے راہ ملنے پر کبھی کبھی اُبھر ہی آتے ہیں اِن جملوں میں مجھے بڑی لذت محسوس ہوئی۔ دل گدگدانے لگا، شوخی بھڑک اُٹھی اور چٹکیاں لینے کی سوجھی۔

"تو گویا میرے لئے یہ تجویز ہوئی کہ اب مجھے گھر میں بھی پناہ نہیں ملے گی اور کہیں باہر اپنا ٹھکانا کرنا ہوگا"

(ہنستے ہوئے) "اللہ ری معصومیت! اچھا!" کہتی ہوئی اہلیہ اپنی چارپائی سے اُٹھ کر میرے سرہانے میں آموجود ہوئی (میرا شانہ ہلاتے ہوئے) "آخر چلتے پھرتے یہ چپ کیسی لگ جاتی ہے۔ آپ اسی طرح ہنس بول لیا کریں تو کاہے کو آپ کے ساتھ دوسروں کا بھی دل ملول ہو۔ یقین مانئے اماں جان (میری والدہ) تو آپ ہی کی فکر میں ہو گئی ہے خدا کی قسم آپ کا نام لیکر کہتی تھیں کہ رات کی طرف سے

بڑے سوچ میں پڑ جاتا ہے"

"اٹھتا بیٹھتا ہوں کھاتا پیتا ہوں اور کیا چاہیے"

"اسی پینا کی خوراک پر یہ دعوے"

"اب یہ بات کہ تیزی اور طراری کیوں نہیں تو یہ اپنی اپنی زندگی کا انتخاب ہے۔ ابتدا ہی سے میری طبیعت میں ایک ٹھہراؤ اور سنجیدگی ہے"

(ہنستے ہوئے) "اور چار پانچ دن پہلے آپ کی سنجیدگی کہاں تشریف لے گئی تھی"

(۲)

وطن سے کلکتہ آئے ہوئے آج سولہواں دن تھا اپنے دوست خاں کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ خیال یہ تھا کہ حسب خواہش مکان مل جانے پر یہاں سے چلا جاؤں گا آج پورے سولہ دن ہو گئے تھے مگر تشفی بخش مکان نہ مل سکا صبح سے ادھر اُدھر ڈھونڈھتا پھرتا —— اور شام کو خاں سے اکر کہتا کہ بھئی آج بھی ناکامی ہوئی۔ ہوسٹل کا واسطہ تھا گو خاں کی طرف سے اور رہنے کا اصرار ہی ہوتا مگر آنکھوں کی حیا بھی کوئی چیز ہے طبیعت کھل رہی تھی۔

کم آمیزی بھی بری بلا ہے، دیکھئے ایک معمولی سی بات ہے اور مجھ سے نہ ہو سکی۔ خود کہتا تھا تو دوست احباب ہونے کہ ان کا ملاقی و مشاق ہونا اس وقت کام آتا ہے۔ ہیں تو مجھ برے نظر آتے ہیں۔ آخر زندگی کا یہ انداز کہاں تک تباہ کن ثابت ہوگا اور اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ پھنسی کو پھوڑا اور تل کو پہاڑ بنایا جا رہا ہے لکیر کو سانپ سمجھنے والے اور ہوں گے آنکھوں ہی سے ہوا کا رخ معلوم ہوتا ہے۔ آنکھیں بند کئے رہنا اور بات ہے مگر یہ ایسی باتیں نہیں کہ نظر انداز کر دی جائیں۔ گھٹنے ٹیکنے کو آئے ہو تو۔ جلو اور خاک کا ڈھیر ہو جاؤ اپنی زندگی کے تم مختار رہو۔ مگر دوسری زندگی جو تمہاری زندگی کی کامیابی سے وابستہ ہیں اُن کو کیوں روندو اور خاک میں ملاؤ!۔ خود ذلیل اور رسوا ہو کہ تمہیں اختیار ہے رہو مگر ان معصوموں کے گلے میں اسکا طوق ڈالنے والے تم کون! ذمہ دار انسان کی یہی تعریف ہو سکتی ہے؟ پھر اس الگ تھلگ خاموش اور بے تعلق زندگی کے کیا معنی! مجھے تو اس میں رہبانیت کی بو آتی ہے۔ جدوجہد کا قائل مسلمان اسے گوارا کر سکتا ہے کہ ساری کی ساری زندگی سوگواری میں ختم کر دی جائے۔ عمل کی سرگرمیاں گوشوں اور کونوں تک محدود رکھنا ہی اسلام ہے —— لاحول ولاقوۃ مکان کا ڈھونڈھنا نہ ہوا" دیار مشرق و مغرب" کا فتح کرنا ہوا ہے۔

آج رات کو سونے سے پہلے دل کے اندر جنگ چھڑ گئی تھی جس کا نقشہ آپ دیکھ چکے۔ اسے آپ میری سیرت کا عیب کہیں یا صفت کہ جب تک ڈھیل دے رہا ہوں ہر طرف سے آنکھیں بند ہیں مگر جہاں چونک پڑا تو پھر ایک محتسب کے طور پر تمام نتائج اور عواقب کا جائزہ ہی لیکر اٹھتا ہوں۔ سخت شست اور لعنت و ملامت کے بعد دل میں یہ بات ٹھان لی کہ بس دو ایک دن میں کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ ہی کر رہوں گا۔

صبح اُٹھتے ہی کلیم بھائی کے یہاں پہنچا۔ ملاقات نہ ہو سکی پھر تین بجے گیا۔ ملاقات ہوئی اور اپنی دشواری بتلائی۔ انھوں نے شیروانی پہنی اور مجھے ساتھ لیا۔ ایک دو منزلہ مکان پر پہونچے۔ بڑا سا کمرہ تھا۔

زمین پر چاندنی کا اُجلا فرش بچھا تھا، چار پانچ تکئے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے مرادآبادی پاندان اور اس سے ذرا آگے اُگالدان رکھا تھا۔ خوبصورت ڈنڈیوں کے پنکھے جابجا رکھے ہوئے تھے۔ دن کا وقت تھا گربتی روشن تھی۔ فرش پر دو تین صاحب شیروانی پاجامہ پہنے لیٹے ہوئے تھے سیاہ داڑھیاں بھی چہرے پر موجود تھیں۔ پہلو بدلتے تھے اور "ہائے ہائے اور اُف اُف" ہو رہی تھی۔ ایک صاحب جوش (ملیح آباد ی) کے کلام کا مجموعہ "نقش ونگار" ہاتھوں میں لئے ہوئے لیٹے لیٹے اس کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ برآمدے میں ایک تندرست و توانا نوجوان کرسی پر بیٹھے میز سامنے رکھے ہوئے شیونگ کر رہے تھے۔ کلیم بھائی کو دیکھتے ہی یہ حضرت اُچھل پڑے اور بڑی خندہ پیشانی کیسا تھ کمرہ تک لے گئے ہم سب کا جانا تھا کہ ان حضرات نے بھی لہراتے ہوئے ایک والہانہ انداز میں جوش کا ایک مصرعہ۔ " کون اٹھاتا ہے شرماتا" پڑھتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ یہ رنگین مزاجوں کی منڈلی ہے

(ایک صاحب) "کلیم صاحب آپ (میری طرف اشارہ تھا) کے متعلق معلوم نہ ہو سکا۔ بھولے بھالے پیارے مہان کے تعارف کی حسرت ہی دل میں رہجائیگی"

میں ــــ "نہیں نہیں!! اطمینان رکھیں انشاءاللہ ایک ایک آرزو پوری ہوجائے گی" پھر اپنا نام بتایا۔

(یاروں کا ماتھا ٹھنکا)

وہی صاحب ــــ "اپنا نامۂ اعمال تو یہی ہے کہ میں اسکول میں ٹیچر ہوں نہ جانے لوگ مجھے وجد کیوں کہتے ہیں اور آپ کیفی صاحب ہیں اُسی اسکول میں ہیڈ مولوی کے فرائض انجام دے رہے ہیں ــ

(ہکلاتے ہوئے) حکیم قنبر صاحب! شرمائیے نہیں سامنے آئیے!! ہاں صاحب آپ پٹنہ کے رہنے والے ہیں اپنے یاروں کا حال پوچھنے کے لئے گاہے گاہے ادھر بھی قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ اور جناب کا شغل" ؟

میں ــــ "بندہ نواز! داستان طول طویل ہے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یونیورسٹی کے خانہ خرابوں میں ہوں"

کیفی ــــ "خوب! نہایت شگفتہ طبیعت پائی ہے آپ نے۔ صاحب اپنا بھی ایمان یہی ہے کہ ــــ زندگی زندہ دلی کا نام ہے"۔

میں ــــ "کیا عرض کروں آپ کی عنایتوں سے اور بھی بہت سے اوصاف ابھی پوشیدہ ہیں"۔

حکیم قنبر ــــ (زبان بڑھاتے ہوئے) "لو بھئی وجد مشقت سے حاصل کئے ہوئے فن کا آج کمال دکھلاؤ۔ دیکھیں کہاں کہاں کے فیوض حاصل کئے ہیں"

وجد ــــ "بھئی کیفی صاحب کے سامنے یہ گستاخی مجھ سے نہیں ہوسکتی۔ آج یہ کبھی کی شفقتوں کی یاد تازہ کریگے"

کیفی ــــ "کاش۔ غا صاحب ہوتے گوریوں کا حق تو کچھ انھیں سے ادا ہوتا"

وجد ــــ " (پانوں کی طشتری سب کی طرف بڑھاتے ہوئے) "رندو! شہیدوں کی یاد تازہ کرو"

میں ــــ " صاحب آپ حضرات شوق فرمائیں۔ مجھے ندامت ہے بڑا ہی بدذوق واقع ہوا ہوں"

وجد ــــ " آپ کو ہماری قسم! اور پھر نہیں مانتے تو کیفی صاحب کے دست حنائی کی سوگند۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ بندہ پرور جرم

یاد کیوں کر آئیں گے

میں —— "میرا قیاس ہے کہ آپ حضرات کو شعر و سخن کا بھی مذاق ہے"

وجد —— "اے صاحب اب شاعری کا دماغ کہاں! ہاں شاعری کا دم بھرتے ہیں۔ بس یوں ہی سی تُک بندیاں بیٹھے بیٹھے کر لیتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ایک گھڑی کے لئے دوستوں کا جی بہل جاتا ہے"

میں —— "تو پھر تازہ افکار سے محظوظ فرمایئے شعر فہمی تو خیر بڑی چیز ہے کم از کم دل کی بھڑاس تو نکلے"۔

وجد صاحب نے اپنی ایک نظم "کمسن بیوہ" کے عنوان سے سنائی۔ ان کے بعد کیفی صاحب نے "جوان بھکارن" اپنی شباب آور نظم بڑے انداز سے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھی بالآخر کلیم بھائی وجد صاحب کو الگ لے گئے۔ کچھ دیر تک باتیں ہوا کیں۔

وجد (میری طرف مخاطب ہو کر) "ضرور تشریف لایئے۔ خوب نبھ جائے گی مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ —— واللہ مجھے بھی ایک جوڑے کی تلاش تھی"

یہاں سے روانہ ہوئے راستہ میں کلیم بھائی نے مجھے کہا کہ سولہ روپے کا کمرہ ہے آپ کو آٹھ روپے دینے ہوں گے اور وجد صاحب اکیلے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اول تو آٹھ روپے کرایہ کے دے نہیں سکتا پھر اس ماحول میں بھلا میں ایک دن بھی ٹھہر سکتا ہوں۔ آپ میری طبیعت سے واقف ہیں۔

کلیم صاحب تو رخصت ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ ابھی سات بجے ہیں۔ چلو پارک میں بیٹھ کر اپنی گتھی سلجھائیں۔ آج مجھے کوئی نیا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ایسے بھٹکے ہوئے، حالات زمانہ سے بیخبر، شاعر مزاج اور حسن پرست نوجوانوں سے کالج، یونیورسٹی اور ہوسٹل بھرے پڑے ہیں مگر اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ یہاں تو رہ نہیں سکتا، پانچ یا ساڑھے پانچ روپے سے زیادہ کرایہ میرے بس کی بات نہیں اور یہاں کوئی کمرہ بارہ اور دس روپے سے کم کا نہیں تھا۔ ساجھے کا کمرہ ہوگا اور کسی کو اپنا شریک بنانا ہی پڑیگا۔ اس کا خیال مجھے وطن میں بھی پریشان کرتا تھا۔ اپنے جیسا خیال کا آدمی کہاں سے ڈھونڈھ نکالیں۔ بڑی الجھن میں گرفتار رتھا، سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا اکیلا رہنا چاہتا ہوں تو گرہ میں دام نہیں۔ اور کسی کا ساتھ ڈھونڈھوں تو یہ قابل برداشت نہیں مجھے تو ایسا ہی آدمی پسند آسکتا ہے جس کی جوانی میری طرح رشک پیری ہو۔ جو عیش و نشاط کی بزم میں شریک نہ ہو۔ بلکہ دور سے ایک حماقت آمیز نقادانہ نگاہیں ڈالے۔ ایسا بدبخت کون ملے گا۔ میں اپنی انوکھی طبیعت کے اضطراب اور بےچینی سے سخت عاجز تھا۔ "دل بیدار" اور "چشم بینا" نعمت زندگی ہیں بلائے جان ہی کہوں گا۔ دم گھٹتا ہے اور جاں نہیں نکلتی۔ کیا کوفت ہے۔ ان ہی خیالات میں غرق تھا۔ کہ سلیم پہنچے۔ پاس ہی بیٹھ گئے۔

سلیم —— "چہرہ زرد آنکھوں میں حلقے پڑے آخر یہ کیا گت بنائی ہے"

میں —— "بھئی نہ پوچھو الجھن ہے الجھن! زندگی بے کیف معلوم ہوتی ہے"

سلیم —— "ایں! ابھی تو شباب کے ہرے بھرے

پچھلے پھولے باغ میں اکیلا بک رہے ہو۔ میاں اس عمر میں جوئے شیر لاتے ہیں لوگ۔ یہ بتلاؤ قیام کہاں ہے آج کل ؟ - کیا کسی "خفتانہ و پریخانہ" کے زیر سایہ تو نہیں ہو اُستاد قدم نہ ہٹیں، ابھی جوانی کی منتیں کرو جناب شاد سے پوچھو کہتے ہیں ہے

خدا کے واسطے تیغ نگہ سے جی نہ چُرا

یہی تو دن ہیں جوانی ہمارے مرنیکے

ہیں۔ ـــــ "بھئی مجھے دوسرا ہی پھیرا ہے۔ تم کو اور ہی سوجھی ہے۔ مکان کی یہ ہے کرایہ سُن کے منہ اتر جاتا ہے"

سلیم ـــــ "کمال کیا آپ نے! مکان کیلئے اتنے پریشان کسی سے کہنا بھی مت لوگ ہنسیں گے۔ بھئی کرایہ زیادہ ہے تو شریک ڈھونڈھ لو۔ ابھی نصیر صاحب نے اپنی سیٹ چھوڑی ہے چلو وہاں تمہیں جگہ مل جائیگی اپنے ساتھ تم کو لے لیتا مگر میرے ساتھ تین آدمی شریک ہیں۔ کمرہ چھوٹا ہے صرف چو کیاں بچھتی ہیں پاخانہ اور غسل خانہ دونوں کی تکلیف بھی ہے، پھر ماحول بڑا بھیانک ہے۔ پڑوس بھی ویسا ہی گندا ہے نیچے جوتے بنتے ہیں۔ دھوبی اور ٹوپی والے تو خیر آج کل میں شاید چلے جائیں گے۔ مگر پھر بھی ہنگامہ ہی رہتا ہے"۔

میں سلیم کے ساتھ ہولیا

مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا سامنے ایک کھڑکی تھی۔ روشنی تو آسکتی تھی مگر ہوا کا رخ نہ تھا۔ چھت بھی نیچی تھی۔ ایک شیروانی کھونٹی میں لٹک رہی تھی شوربہ کے کچھ دھبے اس پر پڑے ہوئے تھے۔ کونے میں دو چھڑیاں اور ایک پرانی چھتری رکھی تھی۔ مکان کے دیگر لوازم کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی مولوی صاحب ہوں گے۔ میں نے طے کیا کہ اگر یہاں جگہ مل گئی تو یہیں آجاؤں گا۔ کیوں کہ اندازہ ہے کہ کرایہ بھی کم ہی ہوگا۔ پھر مولوی صاحب ہیں ان کالج والوں کی سطحیت تو نہ ہوگی۔ وہ اپنا کام کریں گے میں اپنا کام کرونگا رہنے کو ساتھ رہیں گے مگر وہ الگ اور میں الگ ہوں گا۔

اننے میں قیاس کے مطابق مولوی صاحب قبلہ لوٹا لیے تشریف لائے۔ سلیم نے نصیر صاحب کی جگہ کے متعلق پوچھتے ہوئے مجھے اس کا خواہشمند بتلایا۔ وہ راضی ہوگئے۔

خان سے میں نے کہا کہ بھئی آج تو خدا خدا کرکے سامان ہوگیا۔ کل صبح کو یہاں سے سامان اٹھائے جاؤنگا وہ بھی خوش ہوئے کہ چلو تمھاری ایک وقت تو ختم ہوگئی۔

لیجئے صاحب رکشے پر سامان لاد کر وہاں پہنچا دیا پھٹے جوتے، پرانی کھڑاؤئیں، اور پچکے لوٹے سب کو ایک طرف ہٹا کر اپنا سامان سیمنٹ دیا۔ آج کیلئے زمین ہی بستر کر دیا۔ خیال تھا کہ دوسرے دن ایک چوکی لے آؤنگا۔ ڈور روپے بارہ آنے کو مل جائے گی۔ پرانی ملتی تو سستے چھوٹتے خیر۔

میں سمجھے ہوئے تھا کہ اس کمرہ میں اکیلے مولوی صاحب ہوں گے اور اب دوسرا میں ہونگا۔ مگر رات کو کئی بھوت نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب اور اس کمرہ میں شریک ہیں اور مولوی صاحب نے کمال ہمدردی سے ایک بیکس کو بھی یہاں رہنے کا حکم دیدیا ہے۔ مجھے اب مشکل معلوم ہوئی۔ ذرا سے کمرے میں اتنے آدمیوں کا کیونکر گذر ہوگا۔ خیر دیکھا جائے گا۔ ہر طرح کی بات کہاں سے حاصل ہوگی۔ ایک چیز ملے گی تو دوسری چیز کو ترسنا

ہی ہوگا کم از کم یہاں رنگین مزاجوں کا سامنا تو نہ ہوگا۔ خیر کسی طرح دل کو سمجھا دیا۔ مولوی صاحب سے میں نے چوکی کے متعلق کہا۔ کہنے لگے کہ صاحب چوکی تو نہ لائیے کیونکہ ذرا بے موقع ہوگا۔ ہم سب زمین پر اور آپ چوکی پر رہیں گے تو دیکھنے میں بُرا معلوم ہوگا۔ آزردہ تو تھا ہی صاف صاف کہدیا کہ قبلہ ایسے میں میرا رہنا دشوار ہوگا۔ میں زمین پر فرش بچھا کے سونے کا عادی نہیں ہوں۔ اس میں کیا مضائقہ ہے آپ ایک طرف رہیں اور میری چوکی ایک طرف پڑی رہے گی۔ غرض وہ بھی چپ ہوگئے اور میں بھی اپنی شرمناک زندگی کی پستیوں کے خیال میں گم ہوگیا۔ سب کو نیند آگئی۔ چھوٹے سے کمرے میں چار انسان سوئے ہوئے تھے۔ مجھے نیند کیا خاک آتی دل جل رہا تھا۔ میرے برابر جو صاحب سوئے تھے انھوں نے نیند میں کروٹ جو لی تو پورا ایک پاؤں مجھ پر گر پڑا اور میں "الٰہی خیر" کہتا ہوا چونک پڑا۔ انھیں بھی ہوش آیا اور "اوہو!" کہتے ہوئے ذرا ہٹ گئے۔ اور سچ پوچھئے تو ہٹنے کے لئے جگہ بھی کہاں تھی۔ خیال آیا کہ یونیورسٹی جائے جہنم میں اور ایسے مر مر کے جینے سے باز۔ جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ یکبارگی ان صاحب کا ہاتھ میرے گلے پر پہنچا۔ یہ حضرت بنگالی تھے بنیائن تک اُتار کر سوئے تھے۔ ان کی بغل تھی اور میری ناک۔ اب کس سے ٹھہرا جاتا ہے۔ آخر وہاں سے اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ آہٹ جو لوگوں نے پائی تو پھر سوالات کی بھرمار ہوگئی۔ میں وہاں سے اُکتا گیا پھر وہیں پہنچا۔ اب دیکھتا ہوں تو آپ کا آدھا دھڑ تو اپنے بستر پر ہے اور بقیہ میرے بستر پر۔ میں نے انھیں ہوشیار کیا۔ پھر ذرا سنبھلے۔ احتیاطاً ایک تکیہ بیچ میں رکھدیا۔ بارے کچھ سکون ہوا کمبخت نیند اب آگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد یکایک آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا ہوں تو مولوی صاحب کو کھانسی کا دورہ شروع ہوگیا ہے۔ غرض جوں توں رات جاگتے سوتے کٹی۔ صبح ہوئی تو سارا بدن چور، آنکھیں چڑھی ہوئی اور آنکھوں کے ڈورے سرخ اور کھنچے ہوئے، سر بھاری بھاری۔ نہانے کے بعد بھی طبیعت ہلکی نہ ہوئی۔ یونیورسٹی کون جائے۔ کونسی بات اس وقت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ دوسرے ہی دن یہ فیصلہ کیا کہ یہ مکان بھی مناسب نہیں۔ شرکاء کی تلاش جاری رکھنی پڑے گی اور دوسرا مکان ڈھونڈھنا ہوگا۔ ہاں اطمینان ہے کہ اب بحیثیت مہمان کسی کی گردن پر سوار نہیں ہوں

بقیہ صفحہ ۹۱ :- کہا سکتے ہوئے ——— "نسیم" نے چاہا کہ "سلیمہ" کی اس آرزو کا جواب دے جو آج بھی اس عالم سے اُس دنیا کو رخصت ہو چکی تھی جہاں سے کوئی واپس لوٹ کر پیام تک نہیں آتا ——— مگر نسیم کچھ جواب دے سکا ——— اُس کی آواز گلوگیر ہو چکی تھی ——— اُس کی جان نے نکلتا ——— وہ خواب سو کچھ رہا تھا ——— ایک سچا خواب ——— گذری ہوئی کہانی کی ایک جھلک ——— اُس کے تکیہ کا غلاف جو آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا ———

فسانۂ "آرزو"

از جناب سید منیر حیدر رضوی حسن پوری

آرزو ـــ "ہاں آرزو" ـــ "سلیمہ" نے "نسیم" سے پان کی گلوری بڑھاتے ہوئے کہا "اُف ایک حسرتوں کا محشر اور تمناؤں کا طوفان وہ لفظ جو اپنی صورت اور اپنے معنیٰ دونوں کے اعتبار سے قابلِ غور ہے لفظ کی پراگندگی اور حروف کی جدائی بتاتی ہے کہ آرزو کا شیرازہ کبھی مرتب نہیں ہوتا اور معنی کے لحاظ سے اس قدر دلکش اور وسیع کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں جس کی تپش، سوزش اور آگ چھپی ہوئی ہے ۔ سب کچھ سہی لیکن اگر تمھیں میری سچی محبت ہے تو میری ہر خواہش کی تکمیل اور اس کا احترام تمھارا عاشقانہ فرض ہے ۔ تمھیں خوب معلوم ہے کہ میرا دل کتنا نازک ہے ۔ مجھ ہی پر کیا منحصر بلکہ ہر وہ دل جسمیں کوئی رِستا ہوا زخم خلش پیدا کرتا ہو اگر کوئی آرزو اس کی ٹھکرا دی جائے تو وہ اس سے خون کی دو بوندیں آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے ٹپکا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے ـــ میرا ابھی دل جیسا کہ تمھیں کچھ دنوں کی بدگمانی کے بعد معلوم ہوا کہ ایک رِستا ہوا زخم اور آبلوں کا مسکن ہے تو برائے خدا مجھے بتاؤ کہ میرے دل کی یہ کیفیت معلوم کرنے کے بعد بھی تمھاری حسیت کیونکر گوارا کرے گی کہ یہ میری آرزو صرف تمھاری ایک "نہیں" پر یوں فنا ہو جائے جیسے ایک آوارہ وطن اور مفلس کی قبر پر رات کے پچھلے پہر کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہوا کے ایک ہلکے تھپیڑے سے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائے ـــ ہاں کیوں نہ ہو اگر اسی شمع حیات کو بجھانے کی سعی کرو تو کوئی تعجب نہیں ۔ ـــ شمع اپنی زندگی بجھنے میں سمجھتی ہے ـــ حباب اپنی بقا سمندر کی موجوں میں گم ہو جانا ہی سمجھتا ہے ـــ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اپنی زندگی میری یاد میں تمام کر دینے کی ٹھان لی ہے لیکن ـــ "نسیم" ـــ میرے بھولے "نسیم" ـــ شاید قدرت کی آئے دن واقعات تمھارے دل و دماغ پر پوری طرح مسلط ہو چکے ہیں اور تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ زندگی نام ہے غم و الم سے رہائی کا ۔ نہیں "سلیم" ۔ تم مرد کا دل رکھتے ہو ۔ فلسفی ہو ۔ ادیب ہو ۔ قدرت نے تمھیں ایک سوچنے والا دماغ عطا کیا ہے ۔ ذرا ٹھنڈے دل سے فلسفۂ زندگی پر غور کرو تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ زندگی نام ہے ایثار و قربانی کا ـــ اپنی خواہشات و ضروریات کی خودکشی کا ـــ زندگی نام ہے اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی کا ـــ اور کٹھن آزمائش کے تسلسل کا ـــ "سلیم" یاد رکھنا ـــ اگر تم نے اس عمل کی پیروی نہ کی تو میں منافقت کی کرسی پر بیٹھ کر محبت کے قوانین کی دفعہ لگا کر تمھیں مجرم قرار دونگی ـــ میرے پیارے "سلیم" اپنے آپ کو فراموش بعد

ذمہ داریوں سے علیحدہ رہکر کسی کی یاد میں فنا کر دینا کوئی قابل تعریف بات نہ ہوگی — گذارنی ہے تو ایک ایسی زندگی کیوں نہ گذارو جس سے دنیا کو سبق ملے کہ زندگی کے صحیفے کو بانکپن - دلبری - اور فرض شناسی کے گل بوٹوں سے آراستہ کرنا ایک انسان کا کام ہے — دُور کیوں جاؤ - ذرا زندگی کے پچھلے اوراق کو دُہراؤ تو معلوم ہو کہ میں نے کیونکر فرض کی دیوی کے سامنے اپنی خواہشات کی قربانیاں پیش کیں — ضمیر سے لڑائیاں لڑیں — حسرتوں کا خون کیا — تمناؤں کی دنیا کو ویرانہ بنایا ہے - آرزوں کا نشیمن اجڑتے ہوئے دیکھا ہے — وہ آرزوئیں جن کی ہر ہر تڑپ اندھیاری کوٹھری میں آہ و نالہ بنکر ٹکرانے پر ایک ہلکی سی روشنی پیدا کر دیتا ہے — یہ تھیں میری راتیں جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئیں — اور اب جو دیکھتی ہوں تو کائنات کا ذرہ ذرہ میری منہ مانگی داد دے رہا ہے - میرا افسانہ زندگی بھر کا ایک نصیحت آمیز سبق بن چکا ہے - دیہاتی لڑکیاں میری اصول قربانیوں کا گیت گایا کرتی ہیں — میں بہت خوش ہوں — بہت مسرور ہوں — اپنی نیکیوں سے - قربانیوں سے - احسانمند ہوں سماج کی — قدر — کی کہ اُس نے میری قدر کی — مجھے برباد نہ کیا — آج میں بتائے دیتی ہوں کہ جس راستہ پہ میں چل رہی تھی وہ مجھے ہمیشہ کیلئے برباد کر دیتا - تمھیں یاد ہوگا میرے گھر کی انگنائی میں بہت سے بیلے کے درخت تھے — بیلے کے درخت جن سے کچھا آنند میری وابستہ تھی — ان کو میں ہی کلیاں چنتی — پھول کھلے اُن کے گجرے گوندھے — ساتھ ساتھ میں نے بھی اپنے دل کی کلی کو اُن پھولوں کیساتھ گوندھ دیا - ہار تیار ہوگیا — میں ہار لئے انگنائی میں ٹہل رہی تھی کہ اتنے میں تم آئے میں نے ہار بڑھکر تمھارے گلے میں ڈالدیا - تم نے اُسکا کچھ صلہ دینا چاہا لیکن "حامد" بھیا آگئے اور تم مسکراتے ہوئے کمرہ میں چلے گئے - رفتہ رفتہ محبت کی پینگ بڑھتی گئی - یہاں تک کہ تمھارے امتحان اور میرے فرض کا دن نزدیک ہوتا گیا - محبت کے دن گذرتے نہیں وقت ہی کتنا صرف ہوتا ہے بس یوں سمجھو کہ ایک بجلی کوندی اور غائب ہوگئی ہاں تو وہ دن جیسے جیسے نزدیک آتا گیا میرے دل کی تڑپ بڑھتی گئی - میں نے تمھیں اس کی کوئی خبر نہ کی اس کا مجھے اب تک صدمہ ہے - خبر اس لئے نہ کر سکی کہ میرے پاس کوئی آدمی نہ تھا کہ میں تمھیں خط لکھتی - بہرکیف جو ہونا تھا وہ ہوا - دل جس دن کی تصور میں لرز رہا تھا وہ دن آگیا میں زندانِ تاریک میں مایوں بٹھائی گئی - میری ہم عمر لڑکیاں میرے آنے والے دن کی مبارکبادیاں دے رہی تھیں لیکن افسوس اُن میں سے کسی کو میرے جذبات کا خیال نہ آیا اور آتا کیوں کر جب کہ ہر عورت کے دل و دماغ پر مرد کی بیوفائی بری طرح مسلط ہو چکی تھی — میرے کان باہر کی آوازوں کا جائزہ لے رہے تھے - ڈھونڈ رہے تھے کہ شاید کوئی آواز ایسی مل جائے جس سے میرے دکھے ہوئے دل کو کچھ لمحہ کیلئے تسکین مل جائے لیکن یہ تسکین کا ذریعہ کسی طرح بھی پورا نہ ہوا اور ہوتا کیونکر جب کہ وہ آواز کسی دوسری فضا میں گونج رہی تھی ہاں تو میں رخصت کر دی گئی - اپنے عزیزوں سے ملنے والوں سے اپنی آرزوؤں سے - بچپن اور جوانی کی

امنگوں سے اپنی زندگی کے نصب العین سے اور خوشی
گذاری زندگی جیسے کوئی آرزو نہ تھی۔ تصور نہ تھا
لیکن ہاں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ محبت کی خلش بھی
رخصت نہ ہو سکی۔ سورج سے کرن چھینی نہیں جا سکتی۔
آگ سے گرمی جدا نہیں ہو سکتی۔ شبنم کو رونے سے
نہیں روکا جا سکتا۔ پروانوں سے بیتابی سلب
کر لینا کسی کے بس کی بات نہیں		دل میں تمھیں
ڈھونڈتا ضرور تھا لیکن کیا کرتی مجبور تھی اگر مجبور نہ ہوتی
تو اپنے تصورات کی خاموش وادی میں اپنے حوصلوں
کی ایک دنیا آباد کرتی — عورت مکمل مجسمہ ہے مجبوری
کا جس کا ڈھانچہ مجبوری کے آب و گل سے تیار ہوا۔
یہ تھی ہمارے طرز زندگی کی خطرناک غلطی جس کی
اصلاح کیلئے مہذب اور متمدن انسانوں کو ان کی ضمیروں
نے جھنجھوڑا لیکن افسوس دنیا اُس وقت بیدار ہوئی
جب کہ میرے دل کے پھول مرجھا چکے تھے۔ میری دنیا
اندھیری ہو چکی تھی۔ مگر میں خوش ہوں کہ میرے دل
کی فریاد قدرت نے سُن لی اور روح پھونک دی دنیا
والوں کے کانوں میں۔ خدا مبارک کرے وہ دن
میری اُن بہنوں کو جب کہ وہ آزادی کیسا تھ اپنی
آرزوؤں کو سماج کی نرم و نازک بیان کیا کریں گی اور
اپنی تکمیل آرزو پر مسرت کے پھول بکھیرا کریں گی۔ کلیوں کو
مسکراہٹ ملیگی۔ بلبل کو نغمہ کی اجازت ملے گی اور کوئل کو
فریاد کی آزادی نصیب ہوگی۔ میں بھی کبھی تمھاری یاد
سے ..... دنیا کی لذتوں سے آگاہ تھی لیکن آج یہ غم کی
دنیا میں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ صرف تمھاری محبت

کی ایک دھیمی شعاع باقی ہے جس کو میں باوجود کوششوں
کے بجھا نہ سکی — یہ بات ہے عورت کی فطرت کا ایک
کمزور پہلو جو مرد کی فطرت سے بالکل جدا ہے۔ عورت
ایک بار اور صرف ایک ہی شخص سے محبت کرتی ہے اور
آخری سانس تک اُسے خوشی خوشی نبھا دیتی ہے۔ مرد کی طرح
اُس کو ہر چمکیلی چیز نہیں لبھا سکتی۔ اپنی انمول محبت		کو مرد
کی طرح بازاروں میں کوڑیوں کے مول نہیں بیچا کرتی
———— مجھے معاف کرنا یہ اشارہ تمھاری طرف
نہ تھا بلکہ اِس لئے بیان کر دیا کہ تم اپنی جماعت میں گرانمایہ
محبت کی قیمت بڑھانا ———— ہاں تو میری
شادی کے بعد تم میرے یہاں کبھی نہ آئے اور آتے
کیونکر جب کہ تمھیں دوسرے مردوں کی طرح گمان
ہو چکا تھا کہ عورت شادی کے بعد اپنے چاہنے والے
کو فراموش کر دیتی ہے۔ تم لوگ دل کی فلسفے سے کیا
خاک واقف ہو گئے۔ دل آئینہ کی طرح ہزاروں
صورتیں نہیں دکھاتا۔ دل اُس لوح سادہ کی طرح ہے
جس پر ایک اور صرف ایک ہی نقش بٹھایا جا سکتا ہے
جس کی زندگی لوح — کی زندگی سے مربوط ہوتی ہے
———— ہاں تو میرے دل میں تمھارا عکس
اُس وقت تک رہا جب تک میری زندگی کی آخری
ہچکیوں کی زنجیریں ہمیشہ کیلئے ٹوٹ نہیں گئیں ————
تمھاری یاد میں ———— اور صرف تمھاری یاد میں ————
ہاں تو اب آئندہ بھی سُن لو۔ یہ کہ جہاں تک جلد ہو سکے
تم اپنی شریک حیات ڈھونڈ لو تاکہ دنیا یہ نہ کہنے پائے
کہ مرنے والے کا ایک قرض باقی رہ گیا ———— [illegible]

صبر کا پھل

از

مولانا ابو احمد سید عبد الوہاب صاحب شفق ایم اے، بی ایل سابق پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

" صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے " را فع پرادرس کی ۔
ڈنیکڑی (چھوٹوں کے کارخانے) والی گلی سے گذرتے ہوئے
صدا بارہا صابر کے کانوں میں آچکی تھی اور وہ جس طرح
راروں، پیری والوں کے مخصوص نعرے سنتا اور خیال
ں نہ لاتا اسی طرح نقاب پوش "میاں صاحب" کی اس
دا کو بھی ایک فرزیش کی صدا اور ایک بھلا نیکا نعرہ سمجھتا تھا
آج اس صدا میں اسے کچھ ایسی کشش محسوس ہوئی کہ وہ
ں کے ناصحانہ پہلو پر غور کرنے لگا۔ اور اس کی رفتار سست
ہو گئی۔ اس نے چاہا کہ پلٹ کر میاں صاحب کے پاس جائے
ر ان کے ناصحانہ جملے پر کچھ گفتگو کرے لیکن ساڑھے دس بجنے
ں صرف دس منٹ کی دیر تھی اور سامنے سینٹ ہال
عظیم الشان عمارت یاد دلا رہی تھی کہ بی اے کے امتحان
ینے والوں کو کم از کم پانچ منٹ قبل از وقت اپنی اپنی
پر موجود رہنا چاہیے، چنانچہ اس نے واپسی پر ملتوی کیا
ر قدم بڑھاتا ہوا سینٹ ہال چلا گیا۔

صابر ایک ذہین طالب علم تھا اس کو علم کا بیحد
وق تھا اور محنت بھی پوری کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزی
ب کا آنرز لیکر بھی خارجی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا
ا۔ اور مولانا عبد القدوس جیسے متبحر عالم کے فیض تعلیم
سے بہرہ مند ہو کر عربی و فارسی ادب اور علوم دینیات میں
بھی ید طولیٰ حاصل کر چکا تھا اور اس مشرقی اور مذہبی تعلیم کا
عمدہ اثر اس کے اخلاق و عادت اور چال چلن میں موجود
تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا اور منہیات سے بہت
پرہیز کرتا تھا۔

آج صابر کے امتحان کا آخری دن تھا۔ اس نے
امتحان کی پوری تیاری کی تھی۔ اس کو چار بجنے سے پہلے جواب
سے فرصت ہو گئی جس وقت وہ امتحان کے کمرے سے نکلا
اُس کا جی ہلکا تھا اور چہرے پر بشاشت تھی۔ بظاہر وہ
پہلا شخص تھا جو قبل از وقت امتحان سے فارغ ہو کر سینٹ
ہال سے نکلا تھا اور وہ ایسا ہی سمجھ رہا تھا۔ مگر اُسے یہ دیکھکر
حیرت ہوئی کہ وہ برقع پوش لڑکی جو خارجی طور پر امتحان
دے رہی تھی، جو روزانہ سب سے الگ تھلگ ڈیسک کے پاس
لکھتے ہوئے دیکھی جاتی اور اس سے کچھ دور پر اُس کی یوروپین
گورنس (اتالیق) کرسی پر بیٹھی رہتی، وہ امتحان کے کمرہ سے نکلکر
اپنی گورنس کے ساتھ موٹر پر بیٹھ چکی تھی اور چہرہ سے برقع
اُٹھا کر گاڑی کے پردے گرا رہی تھی۔

صابر ایک متشرع نوجوان تھا اور ہمارے دوسرے
نوجوانوں کی طرح کسی نامحرم کو گھورنا اس کی عادت و اخلاق

کے خلاف تھا۔ اُدھر آنکھیں برابر ہوئیں اِدھر صابر نے سر جھکا لیا۔

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس موقع پر اپنی نگاہیں نیچی کر لینا اس جوان صالح کی عادت میں داخل تھا مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس موقع پر اس میں عجب حسن کو بھی بہت کچھ دخل تھا کیوں کہ صابر نے یہ محسوس کیا کہ اِس آنِ واحد کے نظارے میں اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی پیدا ہو گئی' ایک برقی لہر دوڑ گئی اور خفیف لرزہ ہو گیا۔ سینے میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا جس کی آواز سے کان بہرے ہو رہے تھے اور کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ایک بجلی کوند گئی اور اندھیرا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ بیخودی اور سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا۔ جب ہوش سنبھالا تو سمجھا کہ موٹر روانہ ہو چکا ہو گا۔ حسرت بھری نگاہیں اُٹھائیں تو دیکھا کہ کلینر کھڑا ہے خود شوفر موٹر کو چلانے کی کوشش کر رہا ہے' گوری گورنس اُسی طرف متوجہ ہے مگر وہ آفتاب حُسن جس کی شعاعیں دل کے تاریک گوشے کو روشن کر چکی تھیں' اب تک نظر کے سامنے ہے' برقع پوش کا چہرہ اب تک بے نقاب ہے آنکھوں کو ٹکٹکی سی ہے۔ اب نگاہیں پھیر لینا صابر کے بس کی بات نہ تھی اور اگر موقع ہوتا تو شاید گھنٹوں اس دلکش نظارہ سے وہ منہ نہ موڑتا۔ مگر یہ موقع بھی آناً فاناً ختم ہو گیا۔ موٹر کو حرکت ہوئی' برقع پوش چونکی اور فوراً پردے گرا دئے اور گاڑی دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ صابر ہکا بکا سا دیکھتا رہ گیا۔ اور بے اختیاری میں یہ مصرع اُس کی زبان پر آیا ؎ "ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی"

قدم آگے بڑھائے' پھر کچھ سوچکر پیچھے پھرا' سیدھا امتحان کے کمرے میں جا کر ہال کے اُس حصے میں پہنچا جہاں چند لڑکیاں امتحان دینے والی بیٹھا کرتی تھیں اور غور سے اُس ڈسک کو دیکھا جو برقع پوش کی نشستگاہ سے متصل تھا۔ پھر جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکالکر لکھا "اِس بیگم رول نمبر ۲ بی۔"

ہوسٹل کی طرف پلٹتے ہوئے صابر سوچ رہا تھا "اس مختصر نشان سے تو پورا نام بھی معلوم نہ ہو سکا' اس بیگم کیا؟ سعیدہ بیگم؟ ساجدہ بیگم؟ شہیدہ بیگم؟ سکینہ بیگم؟ سلیمہ بیگم؟ خدا جانے کیا نام ہے۔ بالفرض نام معلوم بھی ہو تو کیا؟ مکان' خاندان وغیرہ کا پتہ کس طرح ملے گا؟ اور پھر پتہ ہی ملکر کیا ہو سکتا ہے؟ بیشک وہ برقع پوش لڑکی بڑی حسین ہے' ایسی حسین کہ شاید حوران بہشتی بھی اُس پر رشک کریں۔ مگر مینے جو ایکبار دیکھ لیا وہی غلطی تھی پھر دوبارہ دیکھنے کی تمنا سخت حماقت ہے۔ نہیں نہیں! مینے قصداً نہیں دیکھا بہرحال' اب تو اُس موہنی صورت کو بھول جانا ہی بہتر ہے آخر نہ بھولوں تو کرنا کیا ہے۔ مگر دل میں یہ کھٹک کیسی!؟ کچھ نہیں۔ یہ صرف وقتی اثر ہے۔ دیکھا جائیگا۔ کم از کم اس مختصر پتہ کے ذریعہ اس کے امتحان کا نتیجہ معلوم کرنے میں آسانی ہو گی۔ واقعی مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر یہ دیکھونگا کہ اس بیگم کامیاب ہو گئی۔ دیکھئے خود میرے امتحان کا نتیجہ کیسا نکلتا ہے۔"

صابر ان خیالات میں ڈوبا ہوا ہوسٹل پہنچا۔ اپنا کمرہ کھولا' دیکھا ڈاک میں آیا ہوا ایک لفافہ رکھا ہوا ہے۔ اُٹھا کر مُہر دیکھی "دِلی" دیکھکر سمجھ لیا کہ وطن کا خط ہے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر خط پڑھنے لگا۔ خط تو

اُس کے والد کا تھا۔ مگر جو خبر دیگئی تھی وہ دل و دماغ کو پاش پاش کر دینے والی تھی:۔

"نورچشم سلمک اللہ

غالباً تم کو امتحان سے فرصت ہوگئی ہوگی خدا تمھیں کامیابی بخشے۔ اس خبر سے تمھیں بڑا صدمہ ہوگا کہ میرا کاروبار خراب ہوگیا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ ہمارے ایک لاکھ کے کرنسی نوٹ گم ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیوپاریوں اور کاروباریوں کا پاؤنا دینے سے میں مجبور ہوگیا۔ مجھے قانونی مشورہ ملا تھا کہ دیوالہ کیلئے درخواست کردوں اور کارخانے کا مال ہٹا دوں مگر اس قسم کی بے ایمانی کرنی اور کسی کا پاؤنا ہضم کرنا مجھے گوارا نہیں۔ میں نے عہد کرلیا ہے کہ جس طرح سے ممکن ہوگا دین ادا کردونگا چاہے اس میں میرا کاروبار ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کارخانے میں اسوقت جو کچھ مال تیار ہوتا ہے اس کو فروخت کرکے پاؤنا ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی مشیت ایزدی تھی کہ جوتوں کا بازار گر گیا ہے۔ امید نہیں کہ کچھ بھی سرمایہ بچے۔ آئندہ جیسی مرضی مولیٰ کی ہو۔ صبر و شکر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ والدعا"

محمد احسن

صابر اگر باپ کے مال کو اپنا سمجھتا تھا تو کوئی غلطی نہ تھی کیونکہ ہر ایک بیٹا والدین کی چیزوں کا بھروسہ رکھتا اور صابر تو اپنی مرحومہ والدہ کی واحد نشانی اور باپ کا اکلوتا فرزند تھا۔ اس لئے اس نقصان کی خبر سے اس کو سخت صدمہ ہوا اور گو اُس نے اپنی مذہبی تعلیم پر عمل کرکے انا للہ کہا اور صبر و شکر کیا مگر جو مصیبت پیش نظر تھی اس سے چشم پوشی کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اب وطن سے کسی مالی امداد کی امید نہیں ہوسکتی۔ اس پردیس میں اپنے اخراجات اور بسر اوقات کا سامان خود سے کرنا پڑیگا۔ خیال ہوا کہ دلی چلا جائے مگر دل میں آیا کہ وہاں اب کیا رکھا ہے۔ اس بے سروسامانی میں وہاں جانا دوستوں اور ہمچشموں میں ذلیل ہونا ہے۔ دراصل اُس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ فکر معاش دامنگیر ہوئی مگر جس طرف دیکھتا راہ اندھیری تھی۔ اس تردد میں کھانا تک بھول گیا۔ ساری رات جاگ کر اور پہلو بدل بدل کر گذاری۔ اس بےچینی میں بار بار برقع پوش اس بیگم کا بھی خیال آیا اور وہ ایک عجیب کشش محسوس کرتا تھا مگر اپنی بے سروسامانی کو دیکھکر اُس کی دلکش صورت بھول جانے کی کوشش کرتا۔ صبح سویرے اٹھا اور وضو کرکے نماز پڑھی پھر خیال آیا کہ جاکر ذرا "نقاب پوش میاں صاحب" سے ملاقات کرے شاید کہ تسکین حاصل ہو۔

"نقاب پوش میاں صاحب" ایک چائے فروش تھے جو ایک گلی میں مختصر سی دوکان کرکے چائے بناتے اور بیچتے تھے۔ اس گلی میں صرف چند مہینوں سے تھے۔ کون ہیں! کیسے ہیں؟ کہاں سے آئے؟ یہ باتیں کلکتہ کے باشندوں میں کسی کو معلوم نہ تھیں۔ اُن کے چہرے پر ہر وقت ایک نقاب رہتا اس وجہ سے کوئی شخص ان کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔ ان کی نسبت لوگوں میں طرح طرح کے خیالات تھے اور چونکہ نمازیں بہت پڑھتے تھے اس لئے عموماً لوگ انھیں خدا رسیدہ درویش خیال کرتے تھے اور صابر بھی ایسا ہی

سمجھتا تھا۔

جس وقت صابر پہنچا میاں صاحب آگ سُلگا رہے تھے۔ اس نوجوان کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے، تپاک سے ہاتھ ملایا اور اپنے بستر پر بٹھایا۔ پھر محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میاں! کدھر آئے ہیں؟"

صابر:۔ "مجھے ایک عرصہ سے حضور کی ملاقات کا شوق تھا، بارہا حاضر ہونیکا ارادہ کیا مگر آج سے پہلے یہ سعادت حاصل نہ ہوسکی۔"

میاں صاحب:۔ "میاں! یہ تو تمھاری مہربانی ہے کہ ایک فقیر کے گوشۂ عافیت تک تکلیف کی ورنہ میں کس قابل ہوں۔"

صابر:۔ "حضور! میں ایک خاص غرض سے حاضر ہوا ہوں"

میاں صاحب:۔ "وہ کیا؟"

صابر:۔ "میں آج کل بڑی پریشانی میں ہوں۔ کچھ تو پہلے ہی سے تردد اور الجھن میں تھا، اس پر کل وطن سے کچھ ایسی خبر آئی ہے کہ سخت مالی مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے۔ میرا دل بہت بےچین ہے۔ حضور کچھ نصیحت فرمائیں جس سے قلب کو اطمینان وسکون حاصل ہو۔"

میاں صاحب:۔ "میاں! تم نے تو کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ مصیبتیں انسان کی آزمایش کیلئے آتی ہیں۔ میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ صبر و شکر سے کام لو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

اتنا کہکر میاں صاحب خاموش ہوگئے اور صابر اُن کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ اُس نے خدا کا کلام ہزار دس بار پڑھا تھا کہ خوشخبری دو اُن صبر کرنے والوں کو جن پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم خدا ہی کیلئے ہیں اور اُسی کی طرف پھر جانے والے ہیں۔" مگر آج یہ باتیں کچھ ایسی وضاحت کیساتھ اس کے دماغ میں آئیں کہ اُس کے دل کو پورا سکون ہوگیا اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا آج سے پہلے وہ اس ارشاد سے بےخبر تھا۔

میاں صاحب کی نصیحت کا یہ اثر تھا کہ صابر نے معاشی تنگی کے خیال کو کلیتہً دل سے بھلا دیا۔ امتحان سے فرصت ہی ہوچکی تھی۔ اب سردست سیر و تفریح کے سوا کچھ کرنا نہیں تھا۔ بارہا خیال آیا کہ تفریح طبع کیلئے کچھ دنوں کا سفر کرے مگر اس میں دو روکاٹیں تھیں۔ اول تو یہ کہ تحویل میں کافی رقم نہ تھی اور کسی آمدنی کی بظاہر امید نہ تھی۔ دوسری روکاوٹ یہ تھی کہ کلکتہ سے باہر جانے کو اس کا دل نہیں چاہتا تھا اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی جو امتحان سے فارغ ہوکر اُسے پہلے پہل محسوس ہوئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس شہر میں کوئی مخصوص شے ہے جو دوسری جگہ میں نہیں مل سکتی اور جس کو چھوڑ کر وہ کہیں جا نہیں سکتا۔ "وہ کیا چیز ہے؟" جب یہ سوال دل میں پیدا ہوتا اسوقت برقع پوش اُس بیگم کی دل فریب صورت آنکھوں میں گھوم جاتی اور دل کو ایک غشی سی لگتی۔ اس طرح دو ہفتے گذر گئے۔

اس عرصہ میں ایک نئی اور غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ ایک روز شام کو اِڈن گارڈن سے ٹہل کر صابر واپس آیا تو اُسے ایک بند لفافہ ملا جس کی پشت پر نہ مہر تھی نہ کچھ لکھا تھا۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے دس دس روپیوں کے کچھ نوٹ نکلے۔ صابر گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ یہ کس کے نوٹ ہیں؟ میرے کمرے میں یہ لفافہ کس طرح سے آیا؟ میں نوکروں کو

کیا کروں؟ پھر نوٹوں کو گننے لگا۔ پورے بیس تھے یعنی دو سو روپے۔ پھر لفافہ کو غور سے دیکھا تو اس میں ایک پرزہ کاغذ کا معلوم ہوا۔ اس کو نکالا

"صابر! یہ روپے تمہارے لئے ہیں۔ کہاں سے آئے؟ یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ صرف یہ سمجھ لو کہ یہ روپے تمہارے ہیں۔ ان کو خرچ کرو۔ مناسب یہی ہے کہ سیر و تفریح کی غرض سے کچھ دنوں کیلئے باہر چلے جاؤ۔"

یہ معمہ اس کیلئے ناقابل حل تھا۔ اس نے دماغ پر بڑا زور دیا اور سمجھنا چاہا کہ یہ نوٹ کہاں سے آئے مگر ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں آخر وہ اسی رائے پر پہنچا کہ شاید اس کے والد کے جاننے والے یہاں موجود ہوں اور ان کو میری موجودہ مالی مشکلات کا علم ہوا اور امتحان کے بعد اس کے کلکتہ میں مقیم رہ جانے سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ رازدارانہ امداد پہنچائی ہو۔ بہرحال اس کو اسی ہدایت پر عمل کرنا پڑا کہ "یہ روپے تمہارے ہیں اور سیر و تفریح کی غرض سے کچھ دنوں کیلئے باہر چلے جاؤ۔" اس نے سوچا اس وقت پوری جا کر سمندر میں نہانے کا لطف ہے۔

(۲)

پوری میں صابر کا زیادہ وقت ساحل پر ٹہل ٹہل کر سمندر کے نیلے پانی اور اس کی ناہموار موجوں کا تماشا دیکھنے میں گذرتا تھا۔ صبح و شام کی سیر کے علاوہ اکثر وہ راتوں کو اٹھ کر ساحل پر چلا جاتا اور سمندر کی آواز سنا کرتا پھر بھی اس سفر سے اس کی دلبستگی نہ ہوئی اور وہ اداسی جو کلکتہ سے ساتھ آئی تھی یہاں بھی جدا نہ ہوئی۔ کسی طرح ایک ہفتہ اس نئے شہر میں گذرا پھر وہاں جانے کا خیال پیدا ہوا۔ گاڑیاں سب کے

اوقات معلوم نہ تھے اور اتفاق سے ٹائم ٹیبل بھی پاس نہ تھا۔ خریدنے کی غرض سے اسٹیشن گیا۔ وہاں ایکسپریس پلیٹ فارم سے لگی ہوئی تھی۔ اول درجہ کے ڈبے میں ایک برقع پوش خاتون بیٹھی نظر آئی۔ تاک جھانک کا عادی تو نہ تھا۔ مگر اس موقع پر وہ برقع پوش کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور خاتون کا رخ بھی اسی جانب تھا۔ صابر کو اس بیگم کا خیال بار بار آرہا تھا۔ گاڑی کے کھلنے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ گھنٹی ہو چکی تھی۔ برقع پوش کو دیکھا کہ وہ اٹھی۔ ڈبے سے نکلی اور تیزی کیساتھ پلیٹ فارم سے باہر گئی۔ اور صابر کے ہاتھ میں اس اٹیچی کو غور سے دیکھتی ہوئی گئی جس پر سفید حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"محمد صابر۔ کارمیکل ہوسٹل۔ کلکتہ۔"

صابر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ خاتون کہاں گئی اور کیوں گئی۔ پھر یہ دیکھا کہ چند قلیوں کے سروں پر بکس اور بستر ہیں ان کے پیچھے پیچھے برقع پوش اس کے ساتھ وہ گورنس جس کو اس بیگم کے شامل دیکھا تھا اور سب کے پیچھے ایک خادمہ آرہی ہے۔ قلیوں نے جلدی جلدی اسباب ڈبے میں رکھا۔ دونوں اسی ڈبہ میں بیٹھیں خادمہ نوکروں کے خانے میں بیٹھ گئی۔

اب تو برقع پوش کے اس بیگم ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ صابر چاہتا تھا کہ گورنس سے کچھ گفتگو کرے مگر نہ تو یہ سمجھ میں آیا کہ کیا بولے اور نہ سوچنے کا موقع ملا۔ کیوں کہ سیٹی ہو چکی تھی۔ گاڑی کھلی اور دھک دھک کرتی ہوئی آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئی

"یہ عورتیں کہاں گئیں؟ بیشک کلکتہ گئیں۔" مگر "کلکتہ میں وہ کہاں رہتی ہیں؟" اس کا جواب اب بھی معلوم

نہ ہوا، اس کے بعد پوری میں ٹھہرنے کا تو صابر کو خیال بھی نہ تھا، رہا دلی جانا، وہ بھی نہ ہوا، اس کی وجہ بظاہر یہ ہوئی کہ اسی روز اسکو بخار آگیا، اور چار پانچ روز تک پوری ہی میں رک جانا پڑا، جیسے ہی افاقہ ہوا سیدھے کلکتہ پہنچا، اور امتحان کے نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔

ظاہر ہے کہ صابر کا یہ زمانہ یک گونہ بے شغلی میں گذر رہا تھا، اب کتابوں سے بھی اس کا جی نہیں بہلتا تھا، اس مدت میں اس نے بارہا کوشش کی کہ اس بیگم کے مکان کا پتہ نہ لگا۔ ایک نیا واقعہ جس سے صابر کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی، یہ ہوا کہ ایک روز وہ باہر سے ٹہل کر آیا تو اپنے کمرے میں ایک خط پڑا دیکھا، رسم خط غیر مانوس تھا، اور مہر کلکتہ ہی کی تھی، لفافہ چاک کیا، خط نکال کر پڑھا:

"صابر! تم بڑے بھولے بھالے ہو، جس سے ملنے کی کوئی صورت نہ ہو اس کی تلاش کا کیا فائدہ ہے اور نامحرم کی طرف غور سے تاکنا کہاں روا ہے؟"

نہ لکھنے والے کا نام تھا نہ پتہ، اور مضمون بھی عجیب مبہم مگر صابر کے لئے بجز پتہ کے کوئی بات مبہم نہ تھی، وہ پوری میں اس بیگم برقع پوش کی طرف غور سے تاک چکا تھا، اسے یہ بھی یاد تھا کہ اسی پر نام اور پتہ لکھا ہوا تھا جس کو برقع پوش نے غور سے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ سمجھا کہ بلا شبہہ یہ مختصر تحریر اس بیگم کی ہے۔

..."آہ! کیسا پیارا رسم خط ہے، بیشک یہ اسی کے نازک ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جسکو میں نے... سینٹ ہال سے باہر نکل کر دیکھا تھا، مگر مضمون کیسا مایوس کن اور دل شکن ہے، بیشک یہ میری غلطی تھی، مگر میں نے تو قصداً انھیں نہیں دیکھا تھا، ہاں پوری کے اسٹیشن پر البتہ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا تھا، تو کیا ہوا؟ وہ تو برقع اوڑھے اور نقاب ڈالے ہوئے تھیں۔

"جس سے ملنے کی کوئی صورت نہیں"۔ آہ! بڑا دل شکن جملہ ہے، اس بیگم سے ملنے کی کوئی صورت نہیں! بیشک! کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تو سراسر میری حماقت ہے، اس خیال ہی کو دل سے نکال ڈالنا چاہئے۔ مگر میں کس امید کے سہارے پر جیوں گا؟ اس خیال کو دور کرنے کے بعد زندگی میں کوئی خوشی نظر نہیں آتی"..........

خیالات کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ ہوسٹل کے گھنٹے نے چار بجائے، وہ چونکا" ارے! آج امتحان کا نتیجہ بھی نکلنے والا ہے، چار بج گئے، نتیجہ سینٹ ہال میں نکل گیا ہوگا، جلدی جانا چاہئے"

امتحانات کا نتیجہ دراصل تین ہی بجے نکل چکا تھا، اور بہتیرے امیدوار کامیاب ناموں کی فہرست دیکھکر واپس جا چکے تھے، جس وقت صابر پہنچا بھیڑ کچھ بھی نہ تھی، اس نے فہرست پر نگاہ ڈالی انگریزی ادب کے آنرز میں بہت سے نام دیکھے مگر اپنا نام نہ پایا۔ سر چکرایا آنکھوں تلے اندھیرا ہوگیا، بیٹھ گیا، اور پریشانی کے عالم میں دیر تک بیٹھا رہا، طبیعت کچھ سنبھلی، اٹھکر صرف بی اے کے کامیاب طلبہ کے نام دیکھنے لگا، حالانکہ اس بیگم کا نام ایک ہی نام کے بعد تھا مگر دل کی پریشانی میں صابر اس کو دیکھ نہ سکا، اور ساری فہرست پڑھنے کے بعد یہ سمجھا کہ اس بیگم ناکام رہی، "آہ! اس حسینہ کے نازک دل کو کیسا صدمہ پہنچے گا"۔

صابر کے صدمے کا یہ عالم تھا کہ رات بے خور و خواب بسر کی، دوسرے دن بھی صرف ضروریات اور نمازوں کے لئے اٹھتا، ورنہ دن بھر بستر پر پڑا رہتا، تھوڑا سا دن باقی تھا کہ اٹھکر اونٹ گاڑی کی راہ میں ـــــــــ مغرب کی نماز پڑھی، اور ٹہلتا ہوا سکون کی تلاش میں میاں صاحب کے یہاں پہنچا، وہ اس کا چہرہ میلا دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے

"بڑے افسوس کی بات ہے، خدا کی رحمت سے ناامید ہوا مومن

کی شان نہیں میاں! دنیا رنج و خوشی کا نام ہے۔ انسان نہ صرف خوشیوں میں ہمیشہ مگن رہ سکتا ہے نہ صرف رنج میں ناخوش رہ سکتا ہے۔
ع شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ کیا انبیاء ورسل پر مصیبتیں نہ پڑی ہیں ان کے واقعات تم نے نہیں پڑھے ہیں؟ پھر کس طرح انھوں نے صبر و شکر سے کام لیا؟ کیا ان کے حالات تمھیں معلوم نہیں ہیں؟ انسان نہیں جانتا کہ اس کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔ میاں جاؤ، خدا کو یاد کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

صابر نے محسوس کیا کہ اس کے دل کو صبر و سکون ہوگیا، اور اس نے دل کی آنکھوں سے دیکھا کہ سامنے خدا کی رحمت ہے جو اس زندگانی میں بھی حاصل ہو سکتی ہے، میاں صاحب کو سلام علیکم کہکر ہوسٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس واقعہ کو چار پانچ روز گذر چکے تھے اس عرصہ میں صابر نے اپنے دل و دماغ پر قابو حاصل کر لیا تھا، ایک طرف تو رحمت حق کی امید نے اپنی چمکیلی اور ہمت افزا شعاعیں ڈالکر اس کے دل کو روشن اور ہمت کو قوی بنا دیا تھا، دوسری جانب فکر معقول کا حوصلہ اس کے دماغ میں کام کر رہا تھا۔ دل میں طے کر لیا تھا کہ اب تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا تو مشکل ہے اس لئے حصول معاش کے لئے کچھ کرنا ضرور ہے اور چونکہ کسی کاروبار کے لئے سرمایہ نہیں ہے، سردست کوئی نوکری کرنی چاہئے، ایک روز اسٹیسمین دیکھ رہا تھا، اشتہارات میں دیکھا "ضرورت ہے رافع برادرس کی شو فیکٹری کے لئے ایک منیجر کی جو گریجوئٹ ہو، اور جوتہ سازی کے کارخانہ کا تجربہ رکھتا ہو، تنخواہ دو سو روپئے ماہوار ہوگی اور تقرر صرف چھ ماہ کے لئے ہوگا۔"

صابر نے اس اشتہار کو بڑے شوق سے پڑھا۔ رافع برادرس کون ہیں؟ اس نے سنا تھا کہ یہ کارخانہ دو بھائیوں کا تھا اور چند سال ہوئے کہ بڑے بھائی عبدالرافع اپنی بیوی کے انتقال سے شکستہ دل ہو کر تارک دنیا ہوگئے، اور اپنی اپنی اکلوتی بیٹی کو ہبہ کرکے حج کو گئے، اور پھر مدینہ منورہ میں رہائش اختیار کرلی، کارخانہ مسلم سردست چھوٹے بھائی عبد... کے ہاتھ میں ہے۔ "اگر نوکری کرنی ہے تو میرے لئے یہ بہتر ہوگی، کیونکہ تنخواہ معقول ہے اور کام وہ ہے جس کا تجربہ حاصل کرکے اپنا آبائی کاروبار کر سکتا ہوں، صرف چھ ماہ کی نوکری ہوگی تو کیا حرج ہے؟ اس مدت میں کافی تجربہ حاصل ہو جائے گا، ایک ہزار روپئے پسماندہ کرلوں گا، تو والد صاحب کے کارخانے کو چھوٹے پیمانے پر شروع کر دینا ممکن ہوگا۔"

ان خیالات کیساتھ صابر نے اشتہار کو دوبارہ غور سے ... "گریجوئٹ ہو پورا تجربہ رکھتا ہو۔"

"افسوس! میں گریجوئٹ نہیں ہوں اور تجربہ ضرور رکھتا ہوں، مگر پورا تجربہ کہنا مشکل ہے۔"

صابر یک گونہ مایوس ہوگیا، پھر جی بہلانے کی غرض سے اخبار پڑھنے لگا، کسی آنے والے کی آہٹ پاکر نگاہ اٹھائی تو اپنے ہمسبق اور دوست حامد کو آتے دیکھا، ہاتھ میں کچھ کاغذ اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"السلام علیکم! بھائی حامد" صابر نے کہا۔

"حامد" وعلیکم السلام! مبارک باد! بھائی صابر"

صابر (چونک کر) بھئی! مبارکباد کس بات کی ہے"

حامد۔ "ارے میاں! تمھیں خبر نہیں؟ تم کامیاب ..."

صابر (اچھل کر) سچ کہو۔ تم مذاق کرتے ہو"

حامد۔ "واللہ، تم خود ہی دیکھ لو۔ یہ گزٹ ہے۔"

صابر نے بڑی بے چینی کے ساتھ گزٹ ہاتھ میں لیا، دیکھا تو انگریزی آنرز کے درجہ اول میں اس کا نام تھا، پھر صرف کامیاب ہونے کو دیکھنے لگا، دوسرا ہی نام آمنہ بیگم کا تھا، اس کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ مسٹر عبدالواسع کے پاس پہنچا، شکل و وضع سے وہ دلی والے تاجر معلوم ہوتے تھے۔ صابر سے بڑی شفقت اور اخلاق کے ساتھ پیش آئے، اور محبت کے لہجے میں پوچھا "میاں! کس غرض سے آنا ہوا؟"

صابر۔ مجھے نوکری کی ضرورت ہے، اسٹیٹسمین میں جناب کا اشتہار میں نے دیکھا اس لئے حاضر ہوا، بی اے تو میں نے حال ہی میں پاس کیا ہے، اور انگریزی آنرز کا درجہ اول حاصل کیا ہے، جوتوں کا کارخانہ خود ہمارا دلی میں بڑے فروغ پر تھا، جو فی الحال خراب ہو گیا ہے، گو میں اپنے شغل تعلیم کی وجہ سے اس کام میں مسلسل محنت نہیں کر سکتا تھا، مگر کچھ تجربہ ضرور رکھتا ہوں۔

عبدالوسع۔ "آپ کے والد کا کیا نام ہے؟"

"محمد احسن" صابر نے کہا۔

"محمد احسن!" عبدالوسع اٹھ کر بغلگیر ہوئے، پھر صابر کو بیٹھا کر کہنے لگے۔ "آہا! تم بھائی احسن کے صاحبزادے ہو؟ میاں تم نے کبھی ملاقات نہیں کی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں دلی کا رہنے والا ہوں؟"

صابر۔ حضور! مجھے یہ معلوم نہ تھا"

عبدالواسع" خیر! حالت یہ ہے کہ اس فیکٹری کا انتظام میرے لڑکے محمد منیر کیا کرتے تھے، تو عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ وہ "فن دباغی" میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے ولایت گئے اور ابھی ان کی واپسی میں چھ ماہ کی دیر ہے، تنہا مجھ سے ساری جائداد کی دیکھ بھال اور شو فیکٹری کا انتظام ہونا دشوار ہے، اس لئے صرف چھ مہینوں کے لئے ایک منتظم کی ضرورت ہے۔ درخواستیں آئی ہیں اور بعض امیدواروں کو صرف تجربہ نہیں بلکہ ان کے پاس یورپ اور امریکہ کی ڈگریاں بھی ہیں۔ مگر میں بہر حال تم کو ترجیح دوں گا، تم کل ہی آ کر اپنا کام سمجھ لینا۔

صابر کو مکان کی فکر تھی، مگر کام شروع کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ فیکٹری کے حلقے میں منیجر کو قیام کے لئے بھی جگہ ملی ہے۔ اپنا سامان لے آیا اور نہایت تندہی، خیر خواہی، اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے میں مصروف ہو گیا، ملازمت ہی کے زمانہ میں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسٹر عبدالوسع مالک صرف نصف فیکٹری، مکانات اور دوسری جائداد و املاک کے ہیں۔ کیونکہ ایک روز عبدالوسع نے اسے بلوا کر ایک خط دیا اور کہا کہ اس کو لیکر ہمارے سولیسٹرز ہیگ صاحب وغیرہ کے پاس جاؤ اور جو کچھ وہ ہدایت کریں اس پر عمل کرو۔

سولیسٹرز نے ایک درخواست ٹائپ کر کے دی کہ اسے عبدالواسع کے پاس لے جائیے، وہ نابالغہ کا دستخط کرا کے دیں گے، صابر کو درخواست کے مضمون سے معلوم ہوا کہ عبدالواسع صاحب اپنی نابالغہ بھتیجی کے ولی ہیں، اور چونکہ وہ لڑکی بالغہ ہو چکی ہے، اور بی اے پاس کر چکی ہے اس لئے رافع صاحب ولایت سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ درخواست میں جائداد و املاک کی فہرست تھی، جن میں نصف حصہ نابالغہ کا لکھا تھا، اور حساب و کتاب کی صفائی بیان کر کے "سبکدوش" کئے جانے کی استدعا تھی۔

ان ساری باتوں میں سب سے زیادہ دلچسپ بات صابر کے خیال میں یہ تھی کہ عبدالواسع صاحب کی بھتیجی بی اے ہے اس کی تلاش دل میں پیدا ہوئی اور بار بار یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ

کہیں اس بیگم تو نہیں ہے۔"

صابر کا شک یقین کے درجے کو پہنچ گیا جب عبدالواسع صاحب درخواست پر دستخط کرا کے لائے، اور اس کے ہاتھ میں دی، کیونکہ "شاکرہ بیگم" دیکھتے ہی اس کے دل میں "اس بیگم" کا خیال آیا، شک و شبہ کی گنجائش اگر کچھ رہ گئی تھی، تو وہ یوں جاتی رہی، کہ گلی سے گذرتے ہوئے اس کی نگاہ سہ منزلہ کے دریچہ پر پڑی، خود گلی میں تو سناٹا تھا مگر عبدالواسع کے مکان سے لگا ہوا جو ایک چھوٹا سا حوض تھا اس کے سامنے سہ منزلہ پر گویا جنت تجری تحتہا الانہار سا منظر تھا، یعنی حور روش شاکرہ بیگم بے نقاب دریچہ سے لگی ہوئی کھڑی تھی، گو صابر کا دیکھنا اور شاکرہ کا مسکراتے ہوئے دریچہ بند کر لینا آن واحد کا کام تھا، مگر صورت دیکھی ہوئی تھی، اور بے شبہ وہی اس بیگم تھی۔

اس نئے انکشاف سے جو خوشی صابر کے دل میں پیدا ہوئی وہ ناقابل بیان تھی مگر یہ خوشی دیرپا نہ تھی، کیونکہ اس تحقیق کے بعد اس نے یہ محسوس کیا کہ ایک امید کی شعاع جو کبھی کبھی اس کے دل میں جھلک جایا کرتی تھی، وہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی گو آج تک وہ امید کی تعبیر الفاظ میں نہ کر سکا کہ کیا تھی، اسی معلوم ہوا کہ شاکرہ بیگم کا صاحب ثروت اور شوفیکٹری کی مالکہ ہونا، ایسے واقعات ہیں جنکا وجود اس ناگفتہ امید کو منتشر کر دیتا ہے، کاش اگر اس پریوش دوشیزہ کو مسکراتے نہ دیکھا ہوتا تو شاید آج بھی اس کی مایوسی کچھ نیا گل کھلاتی۔

صابر کی نوکری کے چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اس عرصہ میں اس کی لیاقت کا اعتراف ہر طرح سے ہو گیا تھا۔ مالک عبدالواسع صاحب اس کے کام سے بہت خوش تھے اور اسے خبر ملا کرتی تھی کہ مالکہ یعنی شاکرہ بیگم کو بھی اس کے کاموں کی قدر ہے، اب وہ سنا کرتا تھا کہ مسٹر منیر عنقریب ولایت سے واپس آنے والے ہیں، اور ان کی شادی شاکرہ بیگم سے ہونے والی ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ ان خبروں سے صابر کو خوشی ہوتی تھی، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کو رنج بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس نے اپنا معاملہ مشیت ایزدی کے سپرد کر دیا تھا، اور اس کو یہ امر دلنشین تھا کہ "ہمارے حق میں خدا وہ کریگا جو ہمارے لئے بہتر ہو"۔

اسی اثنا میں صابر کے والد کا خط پہنچا "کہ الحمد للہ ہمارے کھوئے ہوئے نوٹ مل گئے۔ کارخانے کے متعلق سارا یا دنا چکا دیا گیا، کام بخیر و خوبی چل رہا ہے۔ یہ سنکر تمھیں تعجب ہوگا کہ یہ نوٹ ریس کورس (گھوڑدوڑ) میں چوری گئے تھے، مگر خدا جانے کس طرح کلکتہ پہنچے اور جس شخص نے میرے پاس بھیجے ہیں اس کا نام اور پتہ بھی معلوم نہیں۔ یہ معمہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔ اب مناسب ہے کہ تم چلے آؤ، کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔" صابر خط لئے ہوئے عبدالواسع صاحب کے پاس گیا۔ عبدالواسع صاحب خط پڑھکر کچھ پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔

"بھائی احسن صاحب کی گڑتی ہوئی تقدیر کو سدھرتے دیکھکر مجھے بیحد خوشی ہوئی، مگر کیا تم مجھ سے رخصت ہونے کو آئے ہو"۔

صابر "جی نہیں، جب تک حضور کی مرضی نہ ہو میں کوئی ارادہ نہیں کر سکتا"۔

عبدالواسع۔ (آبدیدہ ہوکر) بیٹا صابر تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ منیر کی والدہ کے انتقال کو . . . آٹھ سال گذر گئے اس عرصہ میں میری دلبستگی کا ذریعہ اور زندگی کا سہارا صرف دو بچے تھے۔ منیر بیٹا اور شاکرہ بھتیجی۔ بڑے بھائی مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہو گئے، اور اوہر سال بھر سے ان کا کوئی خط بھی نہیں آیا، معلوم نہیں وہ کس حال میں ہیں۔ منیر کے ولایت جانے

کے بعد میں بہت پریشان تھا، میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارا آنا میرے لئے من کی مانگی مراد تھی، تم نے اپنی لیاقت اور سعادتمندی سے مجھے ایسا خوش کیا ہے کہ میرے دل میں تمہاری جگہ ہرگز منیر سے کم نہیں ہے، میں کہہ نہیں سکتا کہ تمہارے چلے جانے سے میرے دل کو کیسی پریشانی ہوگی۔"

صابر: "حضور۔ خدا جانتا ہے۔ میں حضور کو اس شہر میں اپنے والد صاحب کی جگہ پر شفیق اور بزرگ جانتا ہوں۔ میں اس لئے حاضر ہوا کہ اس خط کو پڑھ کر آپ جو کچھ ارشاد فرمائیں اس کی تعمیل کروں۔"

عبدالواسع: "بیٹا تم کچھ تردد نہ کرو، میں بھائی احسن صاحب کو خط لکھے دیتا ہوں، تم انھیں لکھ دو کہ چچا عبدالواسع نہیں چھوڑتے ہیں۔"

صابر: "بہت خوب"

کیسی وحشت ناک اور دل شکن تھی وہ خبر جس نے نہ صرف عبدالواسع صاحب کے مکان میں بلکہ فیکٹری میں بھی کہرام برپا کر دیا، ایک ہفتہ قبل ہر شخص کی زبان پر یہ تھا کہ منیر صاحب آ گئے اور آج ہر شخص ان کے نام پر روتا نظر آتا ہے، جس وقت صابر عبدالواسع صاحب کے پاس پہنچا، انھیں خاموش دیکھا مگر آنسو جاری تھے۔ ضبط گریہ سے چہرے کا عجب حال تھا، صابر سے ضبط نہ ہو سکا۔ انھیں دیکھتے ہی بیہوش کر دیا، انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا، اور صرف "آہ! آہ!" کرنے لگے۔ دیر تک یہ عالم رہا، آخر وہ یہ کہکر خاموش ہو گئے، خدایا ہر حال میں تیرا شکر ہے، صرف منیر ہی تیرا نہ تھا، صرف میں ہی تیرا نہیں بلکہ وہ سارا جہاز تیرا تھا جسے کو تیرے سمندر نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

کچھ دنوں تک عبدالواسع صاحب .. . . صدمے سے بہت پریشان رہے، صابر کو اپنے کاموں سے جو کچھ وقت بچتا وہ ان کے پاس حاضر باشی میں گذارتا بلکہ اکثر وہ اس کو اپنے پاس کئی کئی گھنٹے روک لیتے اور وہ محسوس کرتا کہ اس کی موجودگی سے بہت کچھ ان کا غم غلط ہوتا ہے۔ ایک دن صبح کو اپنے آفس میں بیٹھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا کہ عبدالواسع صاحب کا خدمتگار آیا اور کہا کہ "صاحب سلام کہتے ہیں" صابر نے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں تو اس نے بیان کیا کہ وہ زنانہ میں ہیں، اور وہیں بلاتے ہیں۔ صابر کو کچھ تردد سا ہو گیا، کیونکہ وہ کبھی زنانہ مکان میں بلایا نہیں گیا تھا جس وقت صابر پہنچا عبدالواسع صاحب خلاف معمول کچھ خوش نظر آئے۔ سامنے کمرے کے تینوں دروں پر پردے پڑے ہوئے تھے جس سے معلوم ہوا کہ شاکرہ بیگم بھی کمرے میں موجود ہیں۔ صابر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

عبدالواسع: "غالباً تمھیں کچھ نہیں معلوم کہ میں نے تمھیں اس وقت کیوں بلایا ہے۔"

صابر: "جی"

عبدالواسع: "بیٹا صابر! میری ایک تمنا ہے جو تمھاری ذات سے وابستہ ہے کیا تم پوری کرنے کے لئے تیار رہو؟"

صابر: "حضور والا کی خوشنودی حاصل کرنا میرا فرض عین ہے۔"

عبدالواسع: "میں چاہتا ہوں کہ شاکرہ اور تم کبھی مجھ سے جدا نہ ہو اور میں تم دونوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے پھولتے پھلتے دیکھوں۔ کیا تم میری یہ خواہش پوری کر سکتے ہو؟"

صابر۔ "یہ حضور کی ذرہ نوازی ہے۔ مجھے آپ کے حکم سے سرتابی کب ہو سکتی ہے"۔

عبدالواسع۔ "شاباش بیٹا! شاباش!"

اس کے بعد عبدالواسع صاحب نے ایک کاغذ بڑھا دیا، اور کہا کہ اس پر تم اپنی گواہی لکھدو۔ صابر نے اس کاغذ کے حاشیہ پر اپنی گواہی لکھی اور کاغذ دیدیا،

عبدالواسع۔ "یہ وہ وثیقہ ہے جس کے رو سے میں شاکرہ بیگم کو اپنی کل جائداد اور املاک کی مالکہ بنا رہا ہوں، اب تک وہ صرف آدھے حصے کی شریک تھی، مگر یہ سارے مکانات، اسباب فیکٹری وغیرہ اب مسلم اس کے ہوتے ہیں"۔

اس بات کے اظہار کی غالباً ضرورت نہ ہوگی کہ صابر جس وقت عبدالواسع کے پاس سے اٹھکر چلا وہ بہت خوش تھا۔ اس نے صرف یہ کہا کہ "غالباً ابا جان کو ان باتوں کی اطلاع حضور خود ہی دیں گے"۔

"بیشک تمھیں کچھ کرنا نہیں ہے۔ میں سب کچھ کر لوں گا"۔

گو شادی کا انتظام شرعی طور پر تھا، پھر بھی بڑے گھر کی شادی تھی، انتظام میں ایک ہفتہ کی دیر ہوئی، اس عرصہ میں دلی سے صابر کے والدین اور دوسرے اعزہ بھی آگئے، صابر نے ایک روز اپنے والد کو لیجا کر نقاب پوش میاں صاحب سے ملایا اور وہ ان دونوں کی شادی کی شرکت پر راضی ہوگئے۔

عقد کے موقع پر تقریباً کل رؤسائے شہر شریک تھے اور خیر و خوبی کیساتھ شادی انجام پائی۔ مہمانوں کی ضیافت و دعوت میں بڑی خوش اسلوبی سے کام لیا گیا۔ نو بجے رات تک فراغت ہوئی۔

مسٹر عبدالواسع، محمد احسن، صابر اور نقاب پوش میاں صاحب زنانہ مکان کے اس عروسی کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے، جو عروسی کمرہ سے متصل تھا، بیچ میں صرف پردے کا آڑ تھا۔ باتوں میں عبدالرفیع صاحب کا تذکرہ آیا، اور عبدالواسع صاحب آبدیدہ ہوکر کہنے لگے "افسوس! آجتک بڑے بھائی کا کچھ پتہ نہ ملا!" نقاب پوش میاں صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"۔ چہرے سے نقاب الٹ دی۔ "ایں بھائی صاحب؟" عبدالواسع صاحب یہ کہتے ہوئے بھائی سے لپٹ گئے، احسن صاحب بغلگیر ہوئے۔ صابر اس نظارہ کو حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھ رہا تھا، کہ سامنے کا پردہ اٹھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ ابر کے ٹکڑے سے آفتاب نکلا۔ حور وش شاکرہ نکلی اور "ابا جان ابا جان" کہتی ہوئی اپنے والد کے قدموں پر گر گئی، شفیق باپ نے اس کا سر اٹھا لیا، پھر احسن صاحب نے کہا کہ "آپکے نوٹ مجھکو ریل گاڑی میں ملے تھے جب میں بمبئی سے کلکتہ آرہا تھا، غالباً کسی چور سے چوک ہوئی، میں نے ایک نوٹ کی پشت پر آپ کا نام لکھا دیکھا اس لئے سارے نوٹ آپ کو بھیجدیے، میں تقریباً ایک سال سے اس گلی میں مقیم تھا۔" پھر شاکرہ کا ہاتھ صابر کے ہاتھ میں دیکر کہا "بیٹا! تم دونوں ہم تینوں آدمیوں کی آنکھوں کی روشنی ہو، پھلو پھولو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"۔

(بقیہ صفحہ ۱۱۲) آپ کے روپے اور جواہرات دونوں ہمیشہ کیلئے ضائع ہو گئے۔ خیر جہاں تک گنجائش ہو سکتی ہے میں آپ کی امداد کرنے میں کوتاہی نہیں کرونگا، مگر ان کے گرفتار ہونے کی امید گویا بالکل ہی نہیں ہے۔ وہ تقریباً ملک کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں یہ کھیل کھیل چکے ہیں ——— اور اب تک ہماری جماعت ان کو گرفتار کرنے سے قاصر رہی ہے"۔

پولیس انسپکٹر

از

جناب سراج مسیحی نگری

"میرے دوست سوداگری کوئی آسان کام نہیں ہم لوگوں کو ہمیشہ اپنی ہی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ میرے خیال میں قانون کی خلاف ورزی کرنا سخت کام ہو سکتا ہے لیکن مجرموں کی نگہداشت اس سے کہیں زیادہ سخت اور دشوار ہے"

میرے دوست انور نے، جو بمبئی کا ایک کامیاب جوہری ہے، مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں ہلکا سا تمسخرانہ انداز تھا۔

اوائل جولائی میں جو سال کا سب سے زیادہ گرم مہینہ ہے، ایک روز دوپہر کے قریب میں دوکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ بے شغلی کے باعث میری آنکھیں بھی جھپکی جا رہی تھیں اچانک ——— میں دروازے کے کھلنے کی آواز پر چونک پڑا۔ میری نظر فوراً ہی دروازے کی طرف اٹھی جہاں میں نے ایک نوجوان شریف آدمی کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کا لباس بہترین قسم کے نفیس اور قیمتی کپڑوں کا تھا۔

وہ لمبے قد کا حسین جوان تھا۔ اس کے گلے میں برف کی طرح ایک سفید نکٹائی پڑی ہوئی تھی۔ چوڑی پیشانی کے نیچے آنکھوں پر قیمتی چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ وہ بظاہر دیکھنے میں کسی بینک کا منیجر یا گورنمنٹ کا کوئی اعلیٰ افسر معلوم ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی وضع قطع سے اس کا معزز اور بڑی حیثیت ہونا آشکارا تھا۔

اس کے آتے ہی میں فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اٹھ کر ایک کرسی اس کے سامنے پیش کی جس پر وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ اگر میں ذرا بھی ہوشیاری اور مستعدی سے کام لوں تو یہ بڑا گاہک ثابت ہو سکتا ہے

"مجھے یقین ہے کہ آپ ہی انور ہیں ———"

میں تعظیماً جھک گیا ——— "مسٹر فضل کی سفارش سے میں یہاں تک آیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے پاس بیش قیمت پتھروں، خوشنما ہیروں اور نادر الوجود جواہرات کا ذخیرہ ہوگا"

"مجھے امید واثق ہے کہ شہر کا کوئی جوہری میرے مقابلے میں مختلف اقسام کے نادر الوجود و بیش بہا جواہر پیش نہیں کر سکتا" میں نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ میں نے جواہرات کے تمام اقسام ایک ایک کر کے

دکھائے اس نے جگمگاتے ہوئے قیمتی پتھروں کو، جو نمائش خانے سے اس کے ہاتھ میں دیئے گئے تھے، مختلف صورتوں سے الٹ پلٹ کر جانچا، اور پھر خریداری کے تہیہ سے چیزیں منتخب کرلیں۔

آخرکار اس نے پانچ روپے کی قیمت کے دو عدد کان کے آویزے، نوسو روپے کے کنگن، سات سو روپے کی انگوٹھی، اور بارہ سو کا ایک چندن ہار منتخب کیا۔ ان کی مجموعی قیمت دو ہزار آٹھ سو پانچ روپے ہوئی۔

خریداری کا عندیہ معلوم کرکے میں ان تمام اشیاء کو سونے کی ایک ڈبیہ میں جس کی قیمت تیس روپے تھی، سجا کر رکھنے لگا جب تک میں اس کام میں مصروف رہا وہ اپنے چمڑے کے منی بیگ کو نکال کر اس کا جائزہ لیتا رہا جس میں نوٹوں کے بیشمار بنڈل پڑے تھے۔

میرے ان اشیاء اور بل کے پیش کرنے پر اس نے بینک کے کچھ نوٹ دیئے جو دو ہزار آٹھ سو کے تھے۔ دوسری جیب سے اس نے ایک دوسرا منی بیگ نکالا، مگر آٹھ آنے کی کمی ہونے کی وجہ سے پانچ روپے پورے نہ ہوسکے اور وہ دوسری جیبوں کی تلاشی لینے لگا

"جناب!" میں نے کہا "آپ اس کا کچھ خیال نہ کریں ایسی رقموں کا کوئی سوال نہیں"

"نہیں جناب! میں ایسے اصول کا پابند نہیں" اس نے سرگرمی سے جواب دیا "میں کسی کا بھی ایک پیسہ باقی رکھنا پسند نہیں کرتا" اس نے سکوں کو تلاش کرنا شروع کیا۔

میں حیران تھا کہ نوٹ کافی تعداد میں ہونے کے باوجود ایک نوٹ بھنا کیوں نہیں لیتا۔ اس کی اس کیفیت کو میں اس طرح دیکھ رہا تھا گویا میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ اسی درمیان میں میں نے پولیس انسپکٹر کو دروازے کے ادھر ادھر جاتے ہوئے دیکھا۔

انسپکٹر زینے کے اوپر آیا اور کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکا۔ پھر فوراً ہی دوکان کے اندر داخل ہوا۔ دروازہ بند کرکے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اس نے کہا "عین موقع پر ——— آخرکار" وہ بڑھکر خریدار کے نزدیک آیا۔ اور اپنا سخت ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اخاہ، حضرت! ——— آپ کی وہ پرانی شاطرانہ چالیں ——— اب آپکو فرار ہونے کا موقع نہیں مل سکتا"

خریدار نے اپنے گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی وہ ہواس باختہ نظر آرہا تھا۔ اس نے فرار ہونے کی انتہائی تدبیریں کیں، لیکن انسپکٹر کی گرفت نے اس کو اپنی جگہ سے ہلنے کا موقع تک نہ دیا ——— میں اپنی جگہ بہت ہی متعجب تھا۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں تھوڑی دیر میں گم رہا۔ پھر ضبط نہ ہوسکا اور جرأت کے ساتھ میں نے کہا:۔

"لیکن انسپکٹر صاحب!" "اس شریف آدمی نے میرے مال خریدے ہیں اور ان کی قیمت بھی ادا کردی ہے"

——— جناب! ان کی قیمت ادا کردی ہے"

خریدار؟ —— سامان خریدا ہے؟ ——
بیشک یہ بہترین اور عجیب خریدار ثابت ہوں گے۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں اس کو آپ بہت جلد سمجھ جائیں ذرا توقف کیجئے۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔
"آخر کچھ بتایئے تو سہی یہ ہیں کون؟ اور انھوں نے کیا کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا
"جناب! آپ خود ہی ملاحظہ کر سکتے ہیں"
انسپکٹر نے عجیب لہجہ میں کہا "شریف انسان کے لباس میں —— ایک خطرناک، دغاباز، اور چالاک لٹیرا ہے
اس نے ان اشیاء کے عوض جو سکے دیئے ہیں وہ بظاہر تو یکدم ٹھیک معلوم ہوں گے۔ لیکن غور سے دیکھیں گے تو بہت سے نقائص آپ کو ملیں گے —— کیا آپ اس کے دیئے ہوئے سکوں کو ملاحظہ کرنے دیں گے؟"
میں نے ان نوٹوں کو جن کو اس آدمی نے ایک منٹ قبل مجکو دیئے تھے، انسپکٹر کے حوالے کیا
"بہت خوب!" انسپکٹر نے کہا "پولیس اسٹیشن تک پہنچنے کے قبل یہ نوٹ میری نگرانی میں رہیں گے" جواہرات اور قیمتی اشیاء کو اٹھاتے ہوئے "اور یہ نگینے اور بیش قیمت جواہرات بھی" انسپکٹر نے یہ تمام چیزیں —— نوٹ اور جواہرات —— اپنے اندر کے پوکٹ میں رکھ لئے۔
خریدار کی قوت گویائی گویکدم سلب ہو چکی تھی وہ اپنی برأت کیلئے ایک لفظ بھی نہ بول سکا — مجھے بھی ان کے ساتھ پولیس اسٹیشن تک جانا ضرور تھا میں نے سنتری کو گاڑی لانے کیلئے کہا۔ گاڑی آنے پر ہم لوگ اندر جا بیٹھے بہت ہی تھوڑی مسافت طے کر کے ہم لوگ پولیس اسٹیشن جا پہنچے
گاڑی ٹھہر گئی۔ انسپکٹر کے مشورے کے مطابق میں گاڑی سے اتر کر سیدھا اوفس میں چلا گیا اور انسپکٹر کا انتظار کرنے لگا کیونکہ وہ اس آدمی کو حوالات میں بند کرنے چلا گیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی مجھے گاڑی کے روانہ ہونے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی
میں نے پانچ منٹوں تک انتظار کیا ——
پھر دس منٹ، پندرہ منٹ، تیس منٹ —— ایک گھنٹہ —— کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔
میری الجھن بڑھتی ہی گئی۔ میں نے پشت کی طرف ایک دروازہ دیکھا۔
اس کے اوپر "سپرنٹنڈنٹ آف پولیس" لکھا ہوا تھا
ایک لمحہ انتظار کئے بغیر میں اندر جا گھسا۔
وہاں کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص سے میں نے دریافت کیا —— "جناب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انسپکٹر صاحب کہاں ہیں؟" سپرنٹنڈنٹ کچھ سوچنے لگا۔ میں نے عجلت سے کہا وہ ابھی ایک شریف آدمی کو گرفتار کر کے لائے ہیں اور اس کو حوالات میں بند کرنے گئے تھے۔ یہ سنتے ہی سپرنٹنڈنٹ بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے پھر پورا واقعہ بیان کیا جسے وہ سن کر اور بھی قہقہہ لگانے لگا۔ "جناب!" اس نے کہا آپ ہوشیار ٹھگوں کے چکلے میں آگئے ہیں۔ آج کل بد معاشوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو اسی قسم کے واردات کر رہا ہے۔ وہ اکثر مصنوعی انسپکٹر بن کر لوگوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ بقیہ ص ۹

ایثار

بنگال کے ایک مشہور ناول نویس کے ایک شاہکار کا لطیف عکس

از
جناب سہیل عظیم آبادی

(۳)

امتیاز اکلوتا بیٹا تھا، اور اس کے باپ کا انتقال بھی ہوچکا تھا، ماں اس کو بہت زیادہ مانتی تھی، اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی اس کے باپ نے بہت روپیہ کما کر چھوڑا تھا، وہ ڈاکٹر تھا، اور خوب چلی بنی تھی، جب امتیاز ماں سے الگ ہوا، تو اس کی طبیعت نہ لگی، وہ بھی چلی آئی، کچھ دنوں تو بھائی کے ساتھ رہی، پھر پاس ہی ایک دوسرا مکان کرایہ پر لیکر رہنے لگی،

امتیاز کی ماں کو تاش کھیلنے کا بہت شوق تھا لیکن جتنا شوق تھا، اتنا کھیلنا نہ آتا تھا، جب سے آئی تھی گھر میں تاش چلتا رہتا تھا، وہ امتیاز کو بھی بیٹھا کر تاش کھیلنے پر مجبور کر دیتی تھی، امتیاز ایک تو مرد تھا، دوسرے کھیلتا بھی اچھا تھا، ماں بیٹے برابر ہارتی تھی، اور اس سے اس کو چڑھ ہوتی تھی، وہ برابر اپنے ساتھ بلقیس کو لیتی، کیونکہ وہ کچھ اچھا کھیلتی تھی، مگر پھر بھی امتیاز سے جیت جانا آسان نہ تھا، ہر روز دوپہر کو تاش پارٹی بیٹھ جاتی تھی،

دوسرے دن وقت پر بلقیس نہ پہنچی، تو اس کی پھوپھی نے اس کو بلانے کے لئے اپنی دائی کو بھیجا، اسوقت بلقیس بیٹھی اپنی کاپی میں کچھ لکھ رہی تھی، دائی نے آکر پھوپھی کا پیغام دیا۔

لیکن وہ نہیں گئی، پھر اس کی بہنوں کو بھیجا، مگر وہ نہ گئی، تو خود کاپی اس کے ہاتھ سے چھین کر بولی:-

"اب اٹھ چل پڑھ لکھکر تجھکو کلکٹر نہیں بننا ہے، بیاہ جائے گی تو تجھے تاش ہی کھیلنا پڑے گا"

لیکن بلقیس نہ اٹھی، پھوپھی کی ضد سے اس کی آنکھ میں پانی بھر آئے، اور وہ منت کے ساتھ بولی۔

"آج نہیں جا سکتی پھوپھی اماں آپ ضد نہ کیجئے۔ کل آ[illegible]"

مگر اس کی پھوپھی نہ مانی، اور زبردستی اٹھا کر لے گئی، [illegible] بیٹھی، زرینہ اور امتیاز ایک طرف، بلقیس اور اس کی پھوپھی [ایک] طرف، وہ مجبور ہو کر کھیلتی رہی، لیکن شروع سے آخر کھیل تک [بگڑی] رہی، اور ایک گھنٹہ سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑی ہوئی، امتیاز نے [اس] کو جاتے دیکھکر کہا۔

"کل تم نے زرینہ کو روپے دیئے، لیکن خود نہ گئیں، چلو کل چلیں، کھیل اچھا ہے،

بلقیس نے جواب دیا،

"جی ہاں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی"

امتیاز نے ہنس کر کہا،

"مگر اب تو تمہاری طبیعت اچھی ہے نا؟ میں کل پھر چلنے کو کہہ رہا ہوں"،

"نہیں کل مجھے چھٹی نہیں ہے"۔

بلقیس نے جواب دیا، اور تیزی کے ساتھ وہاں سے اپنے گھر چلی آئی۔

یہ بات نہیں تھی کہ صرف شاہد کے ڈر سے اس کا جی نہیں لگا، بلکہ خود اس کو امتیاز کے مقابلے میں بیٹھکر تاش کھیلتے شرم محسوس ہو رہی تھی۔

بلقیس شاہد کے گھر میں بچپن سے جاتی تھی، ان لوگوں کے پاس ہی رہنے کی وجہ سے ایک قسم کا خلوص ہوگیا تھا، گھر کے کسی مرد سے پردہ نہ تھا، کسی سے ملنے جلنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی، اور امتیاز تو اپنی پھوپھی کا بیٹا تھا، اس کے سامنے جانے میں وہ کیوں جھجکتی، اس سے کیسے نہ ملتی، لیکن آج وہ اس کے ساتھ تاش کھیلتی رہی، شرماتی رہی، نہ جانے اس کو یہ خیال کس طرح ہوگیا کہ امتیاز اس کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا ہے، اس سے پہلے اس نے کبھی یہ خیال بھی نہ کیا تھا، اور نہ اسکو ایسی شرم محسوس ہوئی تھی۔

اپنے گھر آئی تو ضرور، لیکن ذرا ہی دیر میں، بلقیس شاہد کے گھر چلی گئی، اور وہاں شاہد کی ماں کو سلام کرکے سیدھے شاہد کے کمرے میں گھس گئی، وہاں پہنچ کر اپنا کام کرنے لگی، یعنی شاہد کی کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر رکھنا، میز کا سارا سامان درست کرنا، قلم دوات صاف کرنا، شاہد کے کپڑوں کی دیکھ بھال، سارا کام بلقیس کرتی تھی، اس کے سوا ان چیزوں کی طرف دھیان دینے والا بھی کوئی دوسرا نہ تھا، اس طرف چھ سات دنوں سے ساری چیزیں بے ترتیبی سے پڑی رہیں۔ اس وجہ سے کام بڑھ گیا تھا، اس نے سوچا تھا کہ شاہد کے آنے سے پہلے سارا کام ختم کرکے چلی جائے گی۔

بلقیس شاہد کی ماں کو ماں کہتی تھی، جب بھی اس کو کام کاج سے فرصت ملتی تو آکر اس کے پاس بیٹھتی تھی، اس کو سب لوگ گھر کا ایک آدمی سمجھتے تھے، آٹھ برس کی تھی کہ ماں مرگئی، پھر باپ مرگیا، وہ بچپن سے اس گھر میں آتی جاتی تھی، یتیم سمجھ کر سب لوگ اس سے پیار کرتے تھے، لیکن بعد میں اس نے اپنے طور طریقہ سے سب کے دل میں جگہ پیدا کرلی، بچپن ہی سے شاہد کے پاس زیادہ رہتی تھی، اسی سے پڑھتی لکھتی تھی، پھر شاہد ہی نے ضد کرکے اس کا نام اسکول میں لکھوا دیا، اس کی ضرورت کی ہر چیز وہی پورا کرتا تھا، یہ سبھی جانتے تھے کہ شاہد، بلقیس کو بہت زیادہ مانتا ہے، لیکن وہ ماں وا[illegible] ترقی کرکے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے، اسکی خبر کسی کو نہ تھی۔

سب نے دیکھا تھا کہ بچپن ہی سے شاہد بلقیس کو اتنا زیادہ مانتا ہے، اور اس میں کسی کو بھی کوئی اعتراض کی بات نہ معلوم ہوئی اور نہ شاہد یا بلقیس کی کوئی حرکت ایسی نظر آئی کہ کوئی ان کو شک کی نظر سے دیکھے، مگر پھر بھی، کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ لڑکی اس گھر میں بہو بن کر جگہ پا سکتی ہے، یہ خیال نہ شاہد کے گھر میں کسی کو تھا اور نہ بلقیس کے گھر میں۔

بلقیس نے سوچ رکھا تھا کہ شاہد کے آنے سے پہلے ہی کام ختم کرکے چلی جائے گی، لیکن اس کو خیال نہیں رہا، اور دیر ہوگئی یکایک دروازے سے باہر جوتوں کی چاپ سنائی دی، اس نے نظر پھیر کر دیکھا، اور کھسیا کر کھڑی ہوگئی۔

شاہد نے کمرے میں گھستے ہی کہا،

"اچھا تم ہو! کل سینما سے کس وقت آئی تھیں؟"

بلقیس نے کوئی جواب نہیں دیا، شاہد نے ایک گدی دار آرام کرسی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو سینما سے رات کس وقت واپس آئیں تم؟ تو

[illegible] کیوں نہیں نکلتی"۔

بلقیس پھر بھی چپ چاپ کھڑی رہی، شاہد نے ذرا غصہ بھری آواز میں کہا:۔

"نیچے جاؤ۔ اماں بلا رہی ہیں"۔

شاہد کی ماں باورچی خانے میں بیٹھی شاہد کے ناشتے کی چیزیں ایک رکابی میں رکھ رہی تھیں، بلقیس تیزی سے ان کے پاس آئی اور پوچھا:۔

"آپ مجھے بلا رہی تھیں اماں"۔

شاہد کی ماں نے چونک کر اس کا منہ دیکھا اور بولی:۔

"نہیں تو، میں نے تو نہیں بلایا۔ اے کیوں بلقیس آج تیرا چہرہ ایسا کیوں سوکھا ہے بیٹی؟ معلوم ہوتا ہے کہ آج ابھی تک تو نے کچھ کھایا نہیں ہے، کیا ہے۔ بولو"۔

بلقیس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اس کا چپ رہ جانا شاہد کی عقلمند ماں کے لئے بہت تھا، وہ سب کچھ سمجھ گئی، وہ بولی:۔

"اچھا جاؤ۔ اپنے بھائی کو ناشتہ دے آؤ، پھر جلدی میرے پاس آجاؤ"۔

بلقیس جلدی سے ناشتہ اور پانی کا گلاس لیکر کوٹھے پر گئی، وہاں اس نے دیکھا کہ شاہد آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر پڑا ہے، دفتر کے کپڑے بھی نہیں اتارے، اور نہ منہ ہاتھ دھویا ہے، پاس آکر اس نے آہستہ سے کہا:۔

"ناشتہ لے آئی ہوں"۔

شاہد نے اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے کہا:۔

"کہیں رکھ جاؤ"۔

مگر بلقیس نے ناشتہ کو کہیں رکھا نہیں، ہاتھ میں لئے کھڑی رہی، شاہد نے آنکھیں نہیں کھولیں، لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ بلقیس ناشتہ لئے کھڑی ہے گئی نہیں، دو تین منٹ چپ رہنے کے بعد پھر وہ بولا:۔

"کب تک تم کھڑی رہو گی بلقیس، ناشتہ رکھ دو، شاید تمہارے اعتبار بھائی تمہارا انتظار کر رہے ہوں"۔

بلقیس کے دل میں شاہد کا یہ جملہ تیر کی طرح لگا، وہ تلملا گئی، اس کا خون غصہ سے کھول گیا، لیکن اس نے اپنی اصلی حالت کو چھپاتے ہوئے کہا:۔

"میرا انتظار کیوں کر رہے ہوں گے، آپ اٹھئے ناشتہ کھا لیجئے۔۔"

اب شاہد نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتا ہوا بولا۔

"سچ ہی تو کہتا ہوں، بیچارہ کتنا اچھا آدمی ہے، تم ہی تو تعریف کر رہی تھیں نا؟ اس میں بگڑنے کی کون بات تھی جو تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا، میں نے کون سی غلط بات کہی"۔

بلقیس کا چہرہ تمتما اٹھا، اس نے ناشتے کی رکابی میز پر ذرا زور سے رکھ دی۔ اور بولی:۔

"جی ہاں۔ یہ تو ٹھیک کہا ہے"۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی، شاہد نے ہنستے ہوئے کہا:۔

"بلقیس۔ او بی کس۔ ذرا شام کے بعد پھر آجانا"۔

بلقیس کو شاہد کے اس جملے سے اور بھی تکلیف پہنچی، اور اس نے چڑ کر کہا:۔

"سیکڑوں بار کوٹھے پر چڑھنا اترنا مجھ سے نہیں ہو سکتا"۔

نیچے آتے ہی شاہد کی ماں نے کہا:۔

اپنے بھائی کو ناشتہ اور پانی تو دے آئیں، لیکن چائے اور پان دینا بھول گئیں، پھر ایک بار جانا ہوگا"۔

باب المراسلہ والمناظرہ

شورش کا تذکرہ اردو زبان میں تھا

حمید نواز! سلام و نیاز!

عدیم الفرصتی کے باعث نومبر ۴۰ء کے ندیم کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔ نومبر اور دسمبر کے ندیم کا شکریہ!

ندیم دسمبر ۴۰ء کے صفحہ ۳۸۶ میں قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے۔ ذرا بیرسٹر صاحب کے مراسلہ کا وہ حصہ ملاحظہ ہو جو میرے مضمون "بہار اور اردو" سے تعلق رکھتا ہے: "جناب حمید عظیم آبادی کا مضمون حیرت انگیز بیانات سے مملو ہے۔ شورش کے تذکرہ کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ ۱۱۶۵ھ کے لگ بھگ اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعض اجزا اگی بھی میرے پاس ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے، اس کا زمانہ تصنیف ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ ہے...... سید ہدایت علی خاں ضمیر کی زبان اور شاعری کس پایہ کی تھی اس کا اندازہ ذیل کی نظم سے ہو سکتا ہے.........."

میں نہیں سمجھ سکتا کہ میرے بیانات بیرسٹر صاحب موصوف کو کیوں حیرت انگیز معلوم ہوئے! کیا بغیر کسی تحقیق یا تحریری سند کے کوئی ذمہ دار اہل قلم تاریخی واقعات لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ اوروں کو تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن میں ایسی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ بہرکیف مندرجہ بالا تحریر میں تین باتوں پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ پہلے شورش کے تذکرے کا اردو زبان میں ہونا۔ دوسرے اس کی تصنیف کا زمانہ ۱۱۶۵ھ کے لگ بھگ قرار دینا۔ تیسرے سید ہدایت علی خاں کی زبان اور شاعری کا قابل ذکر ہونا۔

جب یہ مراسلہ میری نظروں سے گذرا تو میں نے قدیم انجمن ترقی اردو۔ واقع منگل تالاب۔ پٹنہ سٹی کے کتبخانہ میں تلاش کیا۔ جو تذکرے میرے پاس نہیں۔ ان میں بھی دیکھوں کہ میرے بیانات کی تائید میں اور تحریریں بھی دستیاب ہو جائیں تو بہتر ہے لیکن وہاں تذکرے دستیاب نہیں ہوئے......

میری جس عبارت پر قاضی صاحب کو حیرت ہے۔ ملاحظہ ہو: "ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء ص ۱۵۹، "سب سے پہلے عظیم آباد کے ایک رکن رکین نے تقریباً ۱۱۶۵ھ میں شعرائے ریختہ کا تذکرہ ریختہ ہی میں قلمبند کیا"۔ میرے اس بیان کی تائید میں ملاحظہ ہو تذکرہ گلزار ابراہیم (مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل مع تذکرۂ گلشن ہند، مولفہ مرزا علی لطف، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو، نمبر ۷۲) ص ۱۶۴ "شورش عظیم آبادی میر غلام حسین۔ تذکرہ در ریختہ تالیف نمودہ ...." "ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انھوں نے لکھا ہے......." ملاحظہ ہو تاریخ شعرائے بہار از رانا عظیم آبادی ص ۲۰۴۔ "اور انھوں نے ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا ریختہ میں لکھا ہے"۔ کیا کسی نے اگر کوئی تذکرہ فارسی میں لکھا ہے تو اس سے یہ کیونکر

ستنباط کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اردو میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔ راز مرحوم لکھتے ہیں کہ" وہ تذکرہ عنقا صفت ہے" میں نے وہ عبارت پنی طرف سے نہیں لکھ دی تھی۔ جناب قاضی صاحب کی حیرت کی آئینہ دار اگر ہوسکتی ہے تو یہ دونوں تصنیفیں نہ کہ ناچیز حمید کا مضمون :

اب رہا ۱۱۶۵ھ کے لگ بھگ کا سوال ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ شورش نے دو تذکرے لکھے، یعنی ایک اردو میں اور ایک بقول قاضی صاحب فارسی میں تو یقینی سال تالیف بھی الگ الگ ہوگا، میری نظروں سے جناب قاضی صاحب کے جتنے مضامین گذرے ہیں ان میں زیادہ تر سالہائے ولادت و تصنیف رحلت وغیرہ کی تردید رہتی ہے، لہذا ۱۱۶۵ھ کی تائید میں ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو۔ تاریخ شعرائے بہار از راز عظیم آبادی (بقیہ حاشیہ ص ۶۵) "یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محمد کلیم حسین کی یہ کتاب ۱۱۶۶ھ یا اس کے بعد کی تصنیف ہے اور چونکہ اس سے پیشتر ۱۱۶۵ھ میں میر باقر حزیں (استاد غلام حسین شورش) کا عظیم آباد میں انتقال ہوچکا تھا، اور شورش نے شعرائے دہلی کے حالات ان ہی سے حاصل کئے ہوں گے، اس لئے یہ بھی استنباط کیا جاسکتا ہے کہ تذکرۂ شورش کو، حکیم کی کتاب نثر پر یہ اعتبار زمانہ تقدیم حاصل ہے یا دونوں قریب قریب ایک ہی زمانہ کی تصنیفیں ہیں"۔ تیسرا اعتراض سید ہدایت علی خاں ضمیر کی زبان اور شاعری کے قابل ذکر ہونے پر ہے۔ میں نے عظیم آباد کے اگلے امرا اور نیہ گو اردوں میں ان کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء ص ۱۵۹۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے کہ وہ قریب قریب ذیل کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ اب س پر بھی کسی کو حیرت ہو تو میرے پاس اس حیرت کے دفع کرنے کا سوال اس عبارت کے پیش کر دینے کے اور کوئی علاج نہیں۔

تذکرہ گلزار ابراہیم، ص ۱۷۰ ضمیر دہلوی ملقب بہ سید ہدایت علی خاں، ومخاطب بہ نصیر الدولہ بخشی الملک اسد جنگ بہادر، از دہلی عظیم آباد آمدہ سکنے اختیار کردہ۔ بہ صفات شجاعت و سخاوت مصروف واز خویشاں نواب شجاع الملک محمد علی وردی خاں مہابت جنگ بود و چندے بصوبہ داری عظیم آباد بہ نیک نامی گذرانیدہ ...... اوائل سلطنت شاہ عالم بادشاہ باز بہ عظیم آباد آمدہ اصلی اقامت انداخت و در حسین آباد بہ رحمت الٰہی پیوست۔ گاہے بہ موزونی طبع شعر ریختہ و فارسی می گفت"۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۴)

بلقیس نے ذرا چہرے کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے بڑی بھوک معلوم ہورہی ہے اماں۔ اب مجھ سے اوپر چڑھا اترا نہیں جائیگا، کسی دائی کے ہاتھ کھانا اوپر ہی بھیجدیجئے"۔

بلقیس کے چہرے پر اداسی دیکھ کر شاہد کی ماں نے کہا۔

"اچھا تو کھا بیٹی میں کسی سے پان بھیجدیتی ہوں"۔

بلقیس نے پھر کچھ کہا سنا نہیں چپ چاپ کھانے کے لئے بیٹھ گئی، لیکن اس کا دل دکھ رہا تھا

وہ اس دن تھیٹر نہیں گئی تھی، لیکن شاہد نے خواہ مخواہ اس پر غصہ کیا، جو منہ میں آیا بول گیا، بلقیس کو اس سے بہت تکلیف ہوئی، اسی لئے تین دن بلقیس شاہد سے نہ ملی، بلکہ جب شاہد آفس چلا جاتا، تو جاکر اس کا کمرہ صاف کر آتی، مگر شاہد سے نہ ملتی۔ شاہد کو اپنی غلطی بہت جلد ہی معلوم ہوگئی، اس نے دو بار بلقیس کو بلا بھیجا، مگر وہ نہیں گئی۔

(باقی آئندہ)

ادبیات

غیر مطبوعہ سلام غالبؔ

از ـــ

بیاض جناب سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا

سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

نہ بادشاہ نہ سلطان یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامس آل عبا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبر راہ خدا کہیں اس کو

خدا کا بندہ خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوندگا کہیں اس کو

فروغ جوہر ایمان حسین ابن علی
کہ شمع انجمن کبریا کہیں اس کو

کفیل بخشش امت ہے بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغ جفا کہیں اس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہید تشنہ لب کربلا کہیں اس کو

عدو کی سمع رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے پایۂ گرد رہ حسین بلند
بقدر فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
کہ لوگ جوہر تیغ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کو حسن صبر کی داد
مگر نبی و علی مرحبا کہیں اس کو

زمام ناقہ کف اس کے ہیں ہے کہ اہل یقین
پس از حسین و علی پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبان خدا رہنما کہیں اس کو

امام وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ مانیے گر ہم برا کہیں اس کو

علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین
کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو

نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبؔ دلخستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

جذباتِ مبارک

از حضرت مبارک عظیم آبادی

خدا جانے وفا ہم کیوں وفا دشمن سے کرتے ہیں
کہ پیمانِ وفاداری بت پُرفن سے کرتے ہیں

بہت بجلی نے پھونکا ہے بہت صرصر نے لوٹا ہے
چمن سے دور رہتے ہیں حذر گلشن سے کرتے ہیں

ہماری موت ہے ہاتھوں کا پابندِ رسن ہونا
کہ ہم وحشت کے مارے دل لگی دامن سے کرتے ہیں

برا ہو بدظنی کا مشورہ راہِ محبت میں
سلوک رہبر سے کرتے ہیں نہ رہزن سے کرتے ہیں

لما مدارانِ خوش انداز کے ناوک کا کیا کہنا
یہ تیر انداز ناوک افگنی چتون سے کرتے ہیں

وہی انداز آنے کا وہی انداز جانے کا
جو غمزے تجھ سے کرتے تھے وہ مدفن سے کرتے ہیں

مبارکؔ بات لانا میکشی کی جانِ حسرت سے
ہمیشہ دور کی ہم ابتدا ساون سے کرتے ہیں

کلامِ پرویز

از جناب پرویز شاہدی مدیر جدید اردو

ہے ہر جلوہ رہینِ منتِ ذوقِ نظر میرا
بڑا احسان ہے دنیا میں نمودِ حسن پر میرا

نشیمن بن نہیں سکتا نہالِ شوق پر میرا
تخیل ہے ازل ہی سے اسیرِ بال و پر میرا

سنا ہے ان کے لب پر کل تھا ذکرِ مختصر میرا
تصور دے رہا ہے طول اسی کو کسقدر میرا

الجھ کر رہ گئی تھی عقل تو پردے کے تاروں میں
بڑی مشکل میں کام آیا جنونِ پردہ در میرا

تو ہی شوق کی تسکین ہے تنہا خرامی سے
نہ کوئی ہمسفر میرا نہ کوئی راہبر میرا

یہ دل سوزیِ دردِ آدمیت کیا قیامت ہے،
کسی کی آنکھ سے آنسو گرے دامن ہو تر میرا

تو ہی کچھ سوچ ناصح کس سے آبادی ہے محفل میں
خرد ساغر شکن تیری جنوں پیمانہ گر میرا

یہی عالم رہا گر حسن کی آئینہ بندی کا
تو گم ہو جائے گا جلووں میں شوقِ خود نگر میرا

خدارا کچھ تو نازِ سربلندی رحم کر مجھ پر
ترے بارِ گراں سے اب جھکا جاتا ہے سر میرا

نہیں پرویز کچھ میرے ہی آنسو کی نمی ہی میں
بنا ہے آتشیں دوستاں دامانِ تر میرا

زمزمۂ اردو

از

بلبلِ بہار حضرت سریر کابری

(بہ تقریب تشریف آوری جناب مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری مرکزی انجمن ترقی اردو ہند)

۱۳ فروری کو مولانا عبدالحق مقیم دہلی سکریٹری انجمن ترقی اردو کی تشریف آوری پر بمقام ہیلٹ ہال گیا جو عظیم الشان جلسہ ہوا، اس میں بلبل بہار حضرت سریر کابری بینائی نے ذیل کی نظم سنائی، حاضرین جلسہ میں نہایت مقبول ہوئی۔

سب زبانوں سے ہے ممتاز زبانِ اردو — اور بڑھے اور ہوئی شوکت و شانِ اردو
کچھ وہی جانتے ہیں اس کی حلاوت کا مزہ — مل گئی ہے جنھیں کچھ لذتِ خوانِ اردو
ساری دنیا کی زبانوں سے مرکب یہ زبان — اے زہے وسعتِ دامانِ زبانِ اردو
اس کے دامن میں ہیں انمول جواہر پارے — لفظ و معنی کا خزانہ ہے دکانِ اردو
کیا کہوں اور اگر اس کا نہ اعجاز کہوں — لبِ ناقوس پہ ہے شورِ اذانِ اردو
ہوتے ہوتے یہی ہو جائے گی دنیا کی زباں — ہفت اقلیم کا پرچم ہے نشانِ اردو

اس زباں کو نہ ہماری نہ تمھاری کہیئے
کشورِ ہند کی اک راجکماری کہیئے

کی اشوکا نے تھی ایران میں شادی جس دم (؟) — دس ہزار آئے تھے شہزادی کے ساتھ اہلِ عجم (؟)
فارسی ان کی ہوئی آ کے جو بھاشا سے دوچار — پڑ گئی ہند میں اردو کی بنائے محکم
کس مپرسی میں یونہی جب کئی صدیاں گزریں — مغلیہ دور میں پھر اس نے دوبارہ لی جنم
رفتہ رفتہ ہوئے سامان ترقی ظاہر — سیکڑوں ملک میں پیدا ہوئے اربابِ قلم
آج بھی شاہ دکن نے یہ نوازش کی ہے — وقف ہے خدمتِ اردو میں گرانبار رقم

مرتبہ اس کا زمانے میں دوبالا ہوگا
اس سے عالم کے اندھیرے میں اجالا ہوگا

آج اردو کے جو حامی ہیں انھیں کیا کہیئے — اس کو کہیے چمن، ان کو چمن آرا کہیئے

حضرتِ مولوی عبدالحق فرخندہ صفات — جن کو اردو کی ترقی کا مستارا کہئے

کہئے اردو کو اگر موجہ دریائے علوم — آپ کو سرچشمہ اردو سے مطلع کہئے

یعنی امسال کی قالبِ اردو میں پھر اک روح نئی — ان کی تقریر کو اعجاز مسیحا کہئے

آج ہر صوبے میں ہے ذوقِ ترقیِ زبان — اس کو بھی ایک نویدِ طرب افزا کہئے

شکر ہے کم کسی صوبے سے نہیں اپنا پنجاب — بے تصنع اسے سونے پہ سہاگا کہئے

ایکہ از آمدنت باعث بہبودی ما
می تراود ز لبت لذت خوشنودی ما

تاثرات

از جناب نصیرہ راز اردل

سنہری شام تھی تم تھے یہی رنگین گوشہ تھا
یہیں پر سلسلہ ٹوٹا تھا اپنی اجنبیت کا

نگاہیں شرم سے جھینپی تھیں دل تیزی سے دھڑکا تھا
تمناؤں کی دنیا میں یہیں طوفان برپا تھا

ہمیں احساس الفت تھا نہ احساس الم ہمدم
ہوا کرتی تھی یونہی خامشی میں گفتگو پیہم

دمِ رخصت تمہاری اشک غم سے آگئیں آنکھیں
بتاؤں کس طرح آخر تمہیں بتلاؤ وہ باتیں

ہوا کی سرسراہٹ پر ہے اب بھی چال کا دھوکا
مجھے گذرے ہوئے ماضی پہ ہے اب حال کا دھوکا

وہ حیلہ اسے رحیلہ کی صدا بے خواب رکھتی ہے
رباب روح کے ہر تار کو بیتاب رکھتی ہے

اخبار انجمن ترقی اردو گیا

مولانا عبدالحق کی تشریف آوری گیا میں

مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر دفتر کے اورنگ آباد دکن سے دہلی میں منتقل ہو جانے کے بعد۔ اس کے لئے ایک وسیع حلقہ عمارات کی ضرورت کئی سال سے محسوس کیجا رہی تھی۔ چنانچہ گذشتہ سال انجمن کے سالانہ جلسہ میں عمارت کی تعمیر کا مسئلہ طے پایا۔ اور اردو زبان کے ہی خواہوں سے عام چندہ کی اپیل انجمن کی طرف سے پہلی مرتبہ کیگئی۔ اور اس مقصد کے پورا کرنے کیلئے انجمن کے روح رواں اور جوان ہمت سکریٹری مولانا عبدالحق صاحب کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف ریاستوں اور صوبوں میں دورہ کے سلسلے میں ان کی نظر انتخاب ہمارے صوبہ بہار پر بھی پڑی چنانچہ موصوف نے اس صوبہ میں کام کرنے کیلئے پٹنہ میں ایک مجلس مشورت منعقد فرمائی اور صوبہ میں اس اہم خدمت کی پوری ذمہ داری قبول کر لینے کیلئے مولانائے موصوف کو ایک باہمت درمند گوشہ نشین جناب انیس الحق فخرالدین (سابق ڈپٹی مجسٹریٹ) کے خدمات حاصل ہوے اور موصوف اس صوبہ میں اس تحریک کے انچارج بنائے گئے۔

چنانچہ مولانائے موصوف نے جناب موصوف کی معیت میں بہار کے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ مناسب حال کامیابی حاصل ہوتی گئی۔ اسی سلسلہ میں جناب موصوف نے انجمن ترقی اردو گیا کے سکریٹری کو مولانائے موصوف کے گیا میں تشریف لانے کی اطلاع بھیجی۔ انجمن کے کارکن گیا میں اس وفد کی پذیرائی کیلئے بہ عجلت جو کچھ انتظام کر سکتے تھے۔ انھوں نے اسکو انجام دیا۔

یہ وفد ۱۳ فروری کو گیا پہنچا۔ ارکان وفد میں مولانا عبدالحق صاحب، جناب انیس الحق فخرالدین اور ہمارے صوبہ کے روشناس ادیب جناب تمنائی تھے، انجمن ترقی اردو گیا کی طرف سے اس وفد کا پرتپاک خیر مقدم ۲ بجے دن کو گیا اسٹیشن پر کیا گیا۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ دو سو معززین، عمائد، رؤسا، اور تعلیم یافتہ اشخاص نے حصہ لیا۔ استقبال کرنے والوں میں سے جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب، جناب ازیل سید حسین امام (ممبر کونسل آف اسٹیٹ) جناب مولوی سید اظہار حسین صاحب وکیل، مولانا نور محمد انجم، جناب خواجہ جلال الدین صاحب وکیل، جناب مولوی سید محمد عقیل حسن صاحب وکیل، جناب ڈاکٹر سید منظور احسن صاحب (سکریٹری ہادی ہاشمی ہائی اسکول) جناب ڈاکٹر محمد عطاء اللہ صاحب (ام۔ آر۔ سی۔ اس (لندن) ال ار سی پی انگلینڈ) جناب ڈاکٹر ظفر التوحید صاحب، جناب محمد ایوب صاحب وکیل، جناب

فضل رسول خاں صاحب آفریدی وکیل، جناب ڈاکٹر سید عبدالغنی صاحب، جناب بشیر الحق صاحب وکیل، جناب قاسم غنی صاحب رئیس گیا
جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی وکیل، جناب ظہیر عالم صاحب اور جناب حافظ محمد نور صاحب (سکریٹری مسلم انسٹی ٹیوٹ گیا) وغیرہ کے اسمائے
گرامی، اس وقت یاد آسکے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ مولانائے موصوف کے استقبال میں ہر خیال، جماعت اور طبقہ کے افراد شریک تھے

مولانائے موصوف کے قیام کا انتظام حسنین منزل میں کیا گیا تھا۔ جناب انریبل سید حسن امام نے مہمان نوازی فرمائی شام ا ئندہ سی گنگو
ہوتی ہی ۵ بجے شام کو مولانائے موصوف کو مسلم انسٹی ٹیوٹ گیا میں چائے کی ایک پرتکلف دعوت میں مدعو کیا گیا، جناب شفیق الرحمن صاحب
وکیل (صدر مسلم انسٹی ٹیوٹ) اور دوسرے عہدہ داران مہمانوں کی پذیرائی کر رہے تھے۔ مہمانوں میں جناب سید زین العابدین صاحب
منصف، جناب سید نسیم حیدر صاحب سب ڈپٹی مجسٹریٹ اور شہر کے ممتاز رؤسا اور وکلا وغیرہ شریک تھے۔ اس مجلس میں شہر کے
شہر کے ممتاز عمائد کو مولانائے موصوف سے تبادلہ خیالات کا غنیمت موقع حاصل ہوا۔

انجمن ترقی اردو گیا کی طرف سے ۶ بجے شام کو ہیلٹ ٹاؤن ہال میں ایک عام جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسہ کی عام اطلاع
ایک مطبوعہ اشتہار کے ذریعہ سے صرف چند گھنٹے پیشتر مشتہر کی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود غیر معمولی مجمع اکٹھا ہو گیا جس میں ہر طبقہ
اور سیاسی جماعت کے ہندو اور مسلمان شریک تھے۔ اور شہر گیا میں ایک زمانہ کے بعد کسی مشترک پلیٹ فارم پر خصوصیت کیساتھ
شہر کا پڑھا لکھا طبقہ یکجا ہوا تھا۔ ۶½ بجے جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی انجمن کے سکریٹری نے جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب (صدر مسلم لیگ)
کا اسم گرامی صدارت کیلئے پیش کیا۔ جس کی تائید جناب خواجہ علاؤالدین صاحب وکیل (جو کانگریس کے ٹکٹ پر میونسپلٹی کے منتخب
ممبر ہیں) نے کی۔ پھر جناب حافظ محمد رفیق صاحب پیش امام مسجد جامع گیا نے تلاوت قرآن مجید کی۔ اس کے بعد حضرت سحر کاری
نے ایک نظم سنائی جو تھوڑے وقفہ میں مولانائے موصوف کے خیر مقدم کیلئے لکھی گئی تھی۔ اس نمبر میں وہ شریک اشاعت ہے۔
اس کے بعد انجمن کے سکریٹری نے مولانائے موصوف کے دیرینہ خدمات کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد مولانائے موصوف نے
جلسہ کو خطاب فرمایا مولانائے موصوف نے مرکزی انجمن کی تعلیمی خدمات اور چند سالوں کے اندر زبان کے مسئلہ کی نئی کروٹ
کی تفصیلات بیان کیں۔ آخر میں انجمن کے دفتر کو دہلی میں لانے اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی اور سب سے آخیر میں فرمایا کہ
اب اردو کے لیے ایک مستحکم قلعہ کی ضرورت ہے۔ قلعہ کی تعمیر کیلئے حکومت ہند نے ۱۲ ایکڑ زمین نہایت مناسب مقام پر دینے
کا وعدہ کر لیا ہے۔ اب اس کی مختلف نوعیتوں کی عمارتوں کیلئے چار لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ انجمن چالیس سال سے
خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس نے عام مسلمانوں کے آگے کبھی دست سوال نہیں بڑھایا۔ لیکن اب ضرورت ہے
کہ اردو کے بہی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اردو کے قلعہ کی تعمیر کیلئے زندگی میں پہلی اور شاید آخری مرتبہ صرف ایک روپیہ دیں
انجمن نے ایک روپیہ کی خوبصورت رسیدیں چھاپی ہیں۔ وہ اسوقت یہاں بھی مل سکتی ہیں

مولانائے موصوف کے بیان سے پورا مجمع متاثر تھا چنانچہ اسی وقت چندوں کے اعلانات شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب نے ایک سو ایک روپیہ کے عطیہ کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جناب سید اظہار حسین صاحب وکیل نے اپنے عزیز جناب مظفر نواب صاحب رئیس گیا (خلف جناب ظفر نواب صاحب مرحوم) کی طرف سے پچاس روپے اور اپنی طرف سے دس روپے کا اعلان کیا۔ اسی اثناء میں مولوی سید محمد عقیل حسین صاحب وکیل کانگی نے ایک روپیہ چندہ کی رسید لینے میں پیش قدمی کی۔ اور رسیدیں یکے بعد دیگرے نقد کٹتی گئیں۔ اور وعدے تیزی کیساتھ لکھے جانے لگے چندوں کے اعلان اور وعدوں کے لکھے جانے کے بعد جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

---

۹ بجے شب کو حسنین منزل میں شہر کے ممتاز عمائد اور عہدہ داروں کو کھانے پر بلایا گیا۔ مدعوئین میں جناب محمد یونس صاحب سب جج، جناب محمد یعقوب صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ، جناب عبدالقادر صاحب ایڈوکیٹ، جناب شاہ قیم الدین صاحب وکیل، جناب عبدالحی صاحب وکیل، جناب خواجہ غیاث الدین صاحب وغیرہ تھے۔ اسی فرصت کے لمحہ میں موعودہ چندوں کی وصولی کا کام جاری رہا۔ چنانچہ مولانائے موصوف کی موجودگی میں حسب ذیل چندے نقد وصول ہوگئے۔

۱۔ جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب رئیس گیا — ماعہ
۲۔ جناب مظفر نواب صاحب رئیس گیا — [illegible]
۳۔ جناب انریبل سید حسین امام صاحب رئیس گیا — [illegible]
۴۔ جناب سید شاہ قائم غنی صاحب رئیس گیا — [illegible]
۵۔ جناب سید اظہار حسین صاحب وکیل گیا — [illegible]
۶۔ یک روپیہ فنڈ رسیدیں از نمبر ۱۹۷ تا ۲۶۶ — [illegible]

اس کے بعد ۱۰ بجے شب کی ٹرین سے مولانائے موصوف پٹنہ تشریف لیگئے مولانائے موصوف کے سفر کو مناسب طریق سے کامیاب بنانے والوں میں جناب انریبل سید حسین امام صاحب، جناب نور محمد صاحب انجم، جناب خواجہ جلال الدین صاحب وکیل، اور مسلم انسٹی ٹیوٹ کے عہدہ دار و ارکان جناب شفیق الرحمٰن صاحب، جناب حافظ نور محمد صاحب اور جناب منظور عالم صاحب نے غیر معمولی دلچسپی کیساتھ کارکنان انجمن ترقی اردو گیا کا ہاتھ بٹایا۔ جس کیلئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

مولانائے موصوف ان نقد چندوں کے ماسوا ایک روپیہ فنڈ کی پندرہ جلدیں سکریٹری انجمن ترقی اردو گیا کے حوالہ فرما گئے ہیں۔ یہ جلدیں ضلع گیا میں ختم کیجائیں۔ اور حسب ضرورت مزید جلدیں جناب انیس الحق فخر الدین سے طلب کیجائیں۔ اسوقت تک ان رسیدوں پر شہر میں کام ہو رہا ہے۔ اور دفتر میں حسب ذیل رقمیں وصول ہوچکی ہیں۔

۱۔ جناب ڈاکٹر احسن التوحید صاحب رئیس گیا ۲۵ از رسید نمبر ۱۴۰۲۶ تا ۱۴۰۵۰

۲۔ جناب شاہ قسیم الدین صاحب وکیل سکریٹری مسلم لیگ گیا ۵۰ ۱۳۹۹۱ – ۱۴۰۰۰ و ۱۳۹۵۱

بقیہ جلدوں کیلئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اردو سے دلچسپی رکھنے والے مختلف اصحاب کو جلدیں دیدی گئیں۔ اور وہ اپنے اپنے حلقہ میں کام کر رہے ہیں۔ اس وقت تک حسب ذیل جلدیں تقسیم ہو چکی ہیں۔

نمبر شمار	نام محصل	نمبر رسید		
۱	جناب محمد کریم صاحب ہیڈ ماسٹر ضلع اسکول گیا	جلد مشتمل بر از رسید نمبر ۱۴۰۰۱	تا	۱۴۰۲۵
۲	جناب محمد رفیق عالم صاحب سکریٹری مجلس احرار گیا	″ ۱۴۱۲۶	–	۱۴۱۵۰
۳	جناب محمد ظہیر الحق صاحب وکیل	″ ۱۴۰۵۱	–	۱۴۰۷۵
۴	جناب ڈاکٹر سید عبد المغنی صاحب	″ ۱۴۲۵۱	–	۱۴۲۷۵
۵	جناب حافظ سید نور محمد صاحب سکریٹری کام انسٹی ٹیوٹ گیا۔	″ ۱۴۲۷۶	–	۱۴۳۰۰
۶	جناب سید شاہ قاسم غنی صاحب رئیس گیا	″ ۱۴۲۲۶	–	۱۴۲۵۰
۷	جناب حکیم محمد ابراہیم صاحب بحری شفاخانہ گیا	″ ۱۴۲۰۱	–	۱۴۲۲۵
۸	جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی وکیل اسسٹنٹ سکریٹری مسلم لیگ گیا	″ ۱۴۱۰۱	–	۱۴۱۲۵
۹	جناب خواجہ غیاث الدین صاحب پروپرائٹر پنجاب موٹر سروس	″ ۱۴۳۰۱	–	۱۴۳۲۵
۱۰	جناب حافظ محمد رفیق صاحب پیش امام مسجد جامع گیا	″ ۱۴۱۵۱		۱۴۱۷۵
۱۱	مولوی سید مناظر حسین صاحب عربی ٹیچر ضلع اسکول گیا	″ ۱۴۱۷۶		۱۴۲۰۰
۱۲	جناب بابو مشتاق علی خاں صاحب رئیس بھدیا (بذریعہ جناب شاہ مصطفیٰ احمد صاحب)			

خوشی کی بات ہے کہ ان جلدوں پر کام ہو رہا ہے۔ بعض جلدوں کی رسیدیں نصف سے زیادہ کٹ گئی ہیں۔ بعض میں معتد بہ حصہ اور بعض میں دو چار۔ یہ اصحاب اپنے اپنے حلقہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شہر میں اس کام کو پھیلانے کے بعد ضلع گیا کے دیہاتوں میں اس کو پھیلانا ہے تو اس سب ڈویژن کی ذمہ داری جناب قاضی محمد حسین صاحب وائس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ گیا نے قبول فرمائی ہے۔ افسوس ہے کہ موصوف مولانا عبد الحق کی تشریف آوری کے دن علیل تھے۔ ورنہ ہمیں غیر معمولی تقویت حاصل ہوتی۔ موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ صحت کے بعد اس خدمت کیلئے اپنا خاصہ وقت صرف فرمائیں گے۔ جہان آباد کیلئے جناب سید محمد اصغر صاحب ہیڈ ماسٹر دھنی ہائی انگلش اسکول جہان آباد

نے اپنی آمادگی ظاہر کی ہے۔ توقع ہے کہ موصوف کی سرگرمی سے اس حلقہ میں اچھا کام ہوسکے گا۔ اورنگ آباد سب ڈویزن، جناب شفیق الرحمٰن صاحب وکیل گیا کی فرصت کا منتظر ہے۔ توقع ہے کہ موصوف اس حلقہ کو سنبھال لیں گے۔

ہمارے شہر میں اس کام کے انجام پانے کی یہ مختصر روداد ہے اگر اسی چھوٹے پیمانہ پر بھی صوبہ کے دوسرے شہروں اور ضلعوں میں بھی کیا جائے تو ہمیں توقع ہے کہ ہم جناب انیس الحق فخر الدین صاحب کی سرکردگی میں وہ رقم جلد سے جلد فراہم کرلیں گے جو مرکزی انجمن نے ہمارے صوبہ کے ذمہ عائد کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو کے ہمدرد آگے بڑھیں گے۔ اور اس خدمت کے لئے تیار ہوجائیں تاکہ ہمارے جواں ہمت ۸۵ سالہ بوڑھے کا نذر ڈاکٹر عبدالحق کی یہ آخری تمنا تمام وکمال ان کی نگاہوں کے سامنے پوری ہوجائے۔ اور وہ اپنے ہاتھوں سے اردو کی حفاظت کیلئے ایک مستحکم قلعہ نئی دہلی میں تعمیر کرلیں۔ مختلف شہروں میں چندہ کی تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے جناب انیس الحق فخر الدین، نیا ٹولہ بانکی پور پٹنہ کے پتہ سے خط وکتابت کی جائے۔ سید ریاست علی ندوی سکریٹری

[illegible]ں آمادگی ظاہر کی ہے۔ توقع ہے کہ موصوف کی سرکردگی میں اس حلقہ میں اچھا کام ہو سکے گا۔ اورنگ آباد سب
ڈویژن' جناب شفیق الرحمٰن صاحب وکیل گیا' کی فرصت کا منتظر ہے۔ توقع ہے کہ موصوف اس حلقہ کو سنبھال لیں گے۔
ہمارے شہر میں اس کام کے انجام پانے کی یہ مختصر روداد ہے اگر اسی چھوٹے پیمانہ پر بھی صوبہ کے دوسرے
شہروں اور ضلعوں میں بھی کیا جائے تو ہمیں توقع ہے کہ ہم جناب انیس الحق فخرالدین صاحب کی سرکردگی میں وہ رقم جلد سے
جلد فراہم کرلیں گے جو مرکزی [illegible] نے [illegible] کرنے [illegible] عائد کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو کے ہمدرد آگے
بڑھیں گے۔ اور اس ضرورت کے لئے تیار ہو جائیں گے تاکہ ہمارے جواں ہمت ۷۵ سالہ بوڑھے کمانڈر ڈاکٹر عبدالحق
کی یہ آخری تمنا تمام و کمال ان کی نگاہوں کے سامنے پوری ہو جائے [illegible] اور [illegible] مطالبات اردو کی حفاظت
کیلئے ایک مستحکم قلعہ نئی دہلی میں تعمیر کرلیں۔ مختلف شہروں میں چندہ کی تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے جناب
انیس الحق فخرالدین، بیناٹولہ بانکی پور پٹنہ کے پتہ سے خط و کتابت کی جائے۔ سید ریاست علی ندوی سکریٹری

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

جو بیادگار حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ مئی ۱۹۳۸ء سے پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے اور جس میں سیاستِ حاضرہ کے تمام اہم مسائل کے متعلق کتاب و سنت اور حضرت علامہ کے پیغام کی روشنی میں نہایت بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین کی اہمیت کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ انہیں الگ پمفلٹوں کی شکل میں شائع کرنا پڑتا ہے اور ہر پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوتا ہے۔ سیاسیات کے علاوہ نظامِ اسلامی کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی نہایت جامع مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ایک کارڈ لکھ کر نمونہ کا پرچہ اور پمفلٹوں کا تعارفی منشور حاصل کیجیے

ناظم ادارہ طلوع اسلام

شمیم منزل شیدی پورہ قرول باغ دہلی

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا!
NATIONAL MUSLIM UNIV
DELHI.
سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ
موڈرن سائنس کا معجزہ
ہرمون اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے انتہائی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایلکلائڈ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکشوئل سائنس انسٹی ٹیوٹ اوف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔
اس جادو اثر آبِ حیات کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے
اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوشکن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غایب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور ملائمیت آجائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے چہرہ پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے
اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا حکمی علاج ہیں۔
خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا جلد تھک جانا۔ دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر کا درد۔ جریان و سیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ عورتوں کی پرسوت کی بیماری ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔
اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو بنوائیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔
اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔
15,000 روپیہ کا نقد انعام
اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کر دے کہ اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات کسی حیوانی ہرمون یا وٹامن کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے مبلغ ۱۵۰۰۰ پندرہ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔
اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کر دے۔
Otone An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination
The Elixir of Life
IN SILVER DROPS
سول ڈسٹری بیوٹرز
میسرز گرانڈ فارمیسی (N. ع) پوسٹ بکس ۲۳۲۳ کلکتہ
تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون، بڑا بازار ۵۳۰۰
Sole Distributor
GRAND PHARMACY(
POST BOX 2323 · CALCUTTA

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(جو)

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے نکل رہا ہے

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) سائینس کیا ہے
(۲) مسئلہ جبر و قدر سائینس میں
(۳) غوطہ خور

فروری سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) جنگ میں حیوانات کا حصہ
(۲) ہوائی نائیٹروجن سے استفادہ
(۳) ارتقائے انسان کا راز

چندہ سالانہ پانچ روپیہ سکہ انگریزی۔ نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے۔ رسالہ میں اشتہارات بھی شائع ہوتے ہیں، جن کے نرخ طلب کیے جا سکتے ہیں۔

امید کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائقین سرپرستی فرمائیں گے۔

المشتہر

معتمد مجلس ادارت رسالہ "سائینس" جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

نادر گیا [illegible]

ضروری اطلاع اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں نہ اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جسکے نتیجہ بدترین بالکل بے خبر تھا اچانک عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہوگیا۔ سرعت جریان احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور کمزور ہوتا جاتا تھا دیگر دل ہر وقت دھڑکتا سر چکراتا آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جنکے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا لیکن مجھکو بالکل خاک بھی فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کرکے بھی مایوس ہی رہنا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں میں زندہ درگور رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں پشاور جانا پڑا پشاور جس جگہ جا کر ٹھہرا وہاں ایک فقیر خدا صورت جو کہ پہلے سے وہاں مقیم تھے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے؟ جو میرے پر درد دل نے اس حضرت صورت اور کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہمت کی چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں اس فقیر صاحب کمال نے از راہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا چنانچہ میں نے حسب الارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد جنگلی جڑی بوٹیاں اور کچھ ادویات بازار سے خرید کر ہر دو نسخہ کیمیا کو بدستور اس صاحب کمال نے تیار کرکے استعمال کرنا شروع کیا۔ **ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں**۔ کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہوگئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر کہنے کا مستحق ہوگیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہوگیا۔ مگر بموجب ارشاد اپنے محسن حضرت صورت کامل سنیاسی کے اکیس روز تک بہتر اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین ساڑھے تین سیر دودھ بآسانی ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق بدن مضبوط بینائی تیز ہوگئی اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جسکے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی واپس آ کر با قیماندہ دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت وغیرہ کیلئے اکسیر سے بڑھکر پایا چونکہ ایک خیراندیش احباب کے اصرار پر اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار بنکر خطوط واقعات سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کرکے مایوس ہوچکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کرکے صحتیاب ہوجائیں اور خدا کے فضل کے گیت گائیں قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار پر بمشکل اکتفا کرتی ہے فائدہ بہت کم محفوظ ہے

قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جسمیں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ (عہ) قیمت روغن مالش طلاء جو اکیس روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے فی شیشی دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ۸) جریان کے لیئے

یہ گولیاں از حد مفید ہیں مادرزاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی نامردی کا مرض کیوں نہ ہو اکسیر ہے روغن مالش طلاء سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ جوان اور بوڑھا بآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ مدعا ہے کہ جعلی اشتہار کرکے پبلک سے روپیہ کمانا ہے بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مدنظر رکھکر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے تندرست اور شوقین حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اس دوا کے استعمال سے سست سے سست اور چست سے چست کو طاقتور بن جاتا ہے اگر بڑھاپے میں بھی لطف وجوانی اٹھانا چاہتے ہیں تو ان گولیوں اور روغن مالش طلاء کا استعمال کریں۔ کیونکہ اس دوا کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہوجاتا ہے الغرض جب تمام جسم ڈھیلا ہوگیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور دائمی لذت اٹھائیں مخفی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے۔

ڈاکٹر بھگوان سنگھ
ازامرتسر
یہ دوائی احتلام سرعت انزال کیلئے اکسیر ہے

ڈاکٹر حسین خاں
از سنگاپور
یہ دوائی جلق زدہ مریض کیلئے سرطیہ فائدہ دہ ہے

مسٹر آر چندر را
از امریکہ
اس دوائی کے استعمال سے میرا وزن بڑھ گیا ہے

جناب حکیم محمد عبدالرزاق صاحب
از کراری ضلع الہ آباد
دارالشفاء گولیاں و روغن مالش طلاء بہت سے مریضوں پر استعمال کیا سوفیصدی زود اثر اور مفید پایا۔

حکیم جیون لال
از لاہور
یہ دوائی اولاد پیدا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

حکیم جہانگیر بیگ
از چوبیس پرگنہ
یہ دوائی قابل تعریف ہے

مسٹر ہری رام
از سرکاری ہسپتال گوالیار
یہ دوائی نامردی کے مریض کو استعمال کرائی گئی بہت مفید ثابت ہوئی

ڈاکٹر شاہ خیرات امام
ایم۔ڈی۔ایچ
از حسین آباد مونگیر
یہ دوائی گمشدہ قوت مردمی کو از سر نو بحال کر دیتی ہے

شرطیہ علاج اور شرطیہ عذر ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال کے سبب خواہ فائدہ نہ ہو تو بلا تعلق تحریر بھیجکر قیمت واپس منگوا لیں علاوہ ہمت کی ضرورت میں کسی کا پیسہ کھانا گناہ سمجھتا ہوں اگر کوئی صاحب بلا سبب بھی اس دوائی سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی قسمت۔

ضروری اطلاع یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی سستی جریان، احتلام سرعت کمزوری اور لاغری کیلئے مخصوص ہے یہ امراض خواہ کسی سبب ہو مثلاً جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے سب کیلئے یکساں مفید ہے سوزاک یا آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کیلئے اس کا استعمال کرنا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ مادرزاد نامردی کے سوائے ہر قسم کی [illegible]

ملنے کا پتہ۔ منیجر دارالشفاء گولیاں ترسکی۔ بٹالہ ضلع گورداسپور۔ پنجاب

لیجیے کمی پوری ہو گئی

پیاروں کو خوشخبری

ناظرین۔ ہم نے آپ حضرات کی سہولت اور آسائش کی خاطر اپنی دوکان ۲۴۱ راجہ کٹرہ پان پوستہ بڑا بازار کلکتہ میں کرانہ اور پرچون کے کل سامان فراہم کئے ہیں جس میں کھانے میں ڈالنے کے ہر قسم کے مصالحہ جات (shiee) اور پان کے ساتھ کھانے کے صاف قسم کے مصالحہ جات مثلاً کیسر، ملاس، دکھیلاس وغیرہ، گیلا کتھ و دیگر اقسام کے کتھ اور مختلف قسم کی ڈلی اور تمام مشہور کارخانوں کے زردے پیکٹ کی شکل میں اور کھلا ہوا تمام۔ تازہ عرق کیوڑہ۔ گلاب قسم قسم کے خوشبودار تیل۔ اعلیٰ ترین شربت کے اسنس اور بوتلیں، انگور کے سرکے ہر وقت بازار سے سستے دام پر دستیاب ہوں گے۔ نیز آرڈر آنے پر بنگال اور کلکتہ کا پان بھی ہماری کمپنی سپلائی کرتی ہے امید کہ آپ ایک مرتبہ بطور آزمائش اور مرحمت فرما کر حوصلہ افزائی فرمائیں گے تفصیل خط و کتابت سے یا خود تشریف لاکر معلوم کریں

پتہ۔ امین برادرس کرانہ مرچنٹس راجہ کٹرہ پان پوستہ (پوسٹ بڑا بازار کلکتہ)

متقین لنگی

رنگ کی پختگی ڈیزائن کی خوشنمائی، ارزانی کے باوجود پائیداری میں بے مثل ہے۔ آپ کو اس بات پر ضرور آمادہ کریگی کہ آپ ہمارے کارخانہ کی بنی ہوئی لنگی ایک بار استعمال کریں۔ خاصکر مولانا مارکہ ۸۰ × ۸۰ فیئر ایس ایچ ڈبل پارٹ۔ مولانا سنگاپوری اشرفی مارکہ، جھنڈا مارکہ اور چٹائی خانہ نہایت ہی عمدہ اور رنگ کی پختگی۔ اور پائیداری میں شہرت حاصل کی ہے۔ ایک بار تشریف لاکر یا مال منگوا کر ہماری صداقت کی آزمائش کیجیے

کولمبو مولانا کمپنی، لنگی مرچنٹ، ۶۶ نوچیت پور روڈ کلکتہ

جیشوال شو کمپنی

گیا — بہار

نفیس، پائیدار اور اعلیٰ درجہ کے جوتوں کے لیے صوبہ بہار میں نام پیدا کر چکا ہے۔ ہر سائز اور ہر قسم کے خوبصورت جوتے آپ کو یہیں ملیں گے۔ ایک مرتبہ تشریف لاکر آزمائیے۔ پھر دوبارہ سفارش کی ضرورت نہ ہوگی

المشتہر

جیشوال شو کمپنی

تمباکو میاں صاحب کی کرامت

کرامت میاں صاحب

تمباکو کا رخانہ کیا تقریباً ۵ سال سے قائم ہے اس کارخانے کی تمباکو عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ ہندوستان کے شہروں میں مشکل سے کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں ہمارے کارخانہ کا بنا ہوا تمباکو آپ کو نہ مل جائے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مہاراجہ اور والیان ریاست کے محلوں میں بھی تمباکو سے تواضع کیجاتی ہے اور بڑے بڑے رؤسا اور شائقین حسب خواہش ہمارے یہاں سے ہمیشہ مال منگواتے ہیں جبکہ اس کی مدت میں ہزاروں سارٹیفکٹ اس کارخانے کو ملے ہیں مگر جیسے دراس کارخانہ کا نام سب سے بڑا سارٹیفکٹ اور مال کی عمدگی کا نشان ہے۔ اس وقت تک جن لوگوں نے ہمارے یہاں سے مال منگوا کر ملاحظہ نہیں فرمایا ہے۔ وہ اگر تبادل ضرور طلب فرمائیں ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کیلئے کارخانہ کے مستقل خریدار ہو جائیں گے۔ مال بذریعہ وی۔ پی روانہ کیا جاتا ہے مگر آرڈر کیساتھ کم از کم چوتھائی قیمت ضرور آنی چاہیے۔

جلد (۱۵) | ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر (۴)

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان مرحوم کے ارتحال کا سانحہ ایسا نہیں جسکو ہندوستان خصوصاً ہندوستانی مسلمان مدتوں فراموش کر سکیں۔ وہ صرف ۵۵ سال کی عمر کے تھے۔ اس مختصر عمر میں انہوں نے ایسی منزلت حاصل کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ ۴۳ سال کی عمر میں ہائی کورٹ کی ججی کی کرسی پر بیٹھے۔ وہ پہلے ہندوستانی چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی کی ایسے وقت میں رہنمائی کی کہ اگر وہ نہ ہوتے تو خدا جانے اس عزیز اسلامی درسگاہ کا کیا حشر ہوتا۔ سائنس کے علوم میں ان کے فضل و کمال کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ افسوس کہ ایسی عظیم المرتبت ہستی اسقدر جلد ہمارے درمیان سے اٹھ گئی۔

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان۔ ملک کے ایک ایسے خطہ میں پیدا ہوئے جسکو کبھی شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ وہ ۱۸۸۶ء میں جونپور میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کے امتحان میں اول آئے۔ حکومت کے وظیفہ پر انگلستان بھیجے گئے۔ بیرسٹری اور ڈاکٹر آف لاز کی سند لیکر لوٹے۔ ۱۹۲۰ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے قائم مقام جج اور ۱۹۲۳ء میں مستقل جج مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں قائم مقام چیف جسٹس اور ۱۹۳۲ء میں مستقل چیف جسٹس ہوئے۔ نئی اصلاحات کے رائج ہونے کے بعد فیڈرل کورٹ میں آ گئے۔ اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور فیڈرل کورٹ کے جج تھے۔ انہیں علوم طبعیات و ریاضیات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے مختلف نظریے اور تجربے، دنیا کے مختلف ملکوں کے محققوں کے زیر غور تھے۔ انہیں ان خشک علوم کے ساتھ اردو کے ادب و شعر سے بھی دلچسپی تھی۔ مراثی انیس اور بعض دوسری کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن مرتب کئے اور ان پر مقدمے لکھے وہ خود صاحب علم تھے۔ اور ارباب علم و فضل کے سچے قدر دان تھے۔ ان کی وفات سے ایسی جگہ خالی ہوئی جو شاید مدتوں پر نہ ہو سکے۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے سایہ شفقت میں لے۔ اور اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔

افسوس کہ پروفیسر معتضد ولی الرحمن ام۔ اے استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اس دار فانی کو الوداع کہا۔ مرحوم جناب خلیل الرحمن صاحب مترجم اخبار الاندلس کے نامور خلف تھے۔ مرحوم کے والد بزرگوار کے فیض محبت کا یہ اثر تھا کہ یہ پورا خاندان ایک علمی گہوارہ کی صورت میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس خاندان کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا خاصہ ذخیرہ اردو میں جمع

ہوگیا ہے۔ مرحوم کو فلسفہ کا ذوق تھا۔ فلسفیانہ مباحث اردو میں حسن و خوبی سے منتقل کرتے تھے۔ خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور پسماندوں اور ذی علم بھائیوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

ابھی چند دن ہوئے چند گھنٹوں کیلئے ضلع گیا کی ایک دیہی آبادی اسھوا میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ قصبہ صدیوں سے علم و فن کا گہوارہ رہا ہے۔ قصبہ میں شاہی عہد کے بعض آثار ابتک موجود ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری کے جامعین میں سے دو بزرگ اس قصبے کے رہنے والے تھے۔ ان کے حالات چند سال ہوئے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے مزار ابتک زیارت گاہ خاص و عام ہیں۔ جناب شاہ محی الدین صاحب، جناب شاہ فضل اللہ صاحب۔ اور مولانا سید محمد طٰہٰ اشرف اسی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ اس خانوادہ میں علم کا ذوق وراثۃً آیا ہے۔ قدیم و جدید کتابوں کا ایک مختصر کتب خانہ موجود ہے، جس میں شاہی عہد کے بہت سے فرامین دستاویزات اور قلمی کتابوں کا ذخیرہ بھی ہے۔ ممکن ہے ان قیمتی فرامین کا مجموعہ کبھی ترتیب پاکر شائع ہو تو تاریخ ہند کے طالبعلموں کو قیمتی ذخیرہ ہاتھ آئے۔

قلمی کتابوں میں طب کی معروف کتاب "اختیارات بدیعی" کا ایک نسخہ نظر آیا۔ اگرچہ اسکے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اور نصف صدی پیشتر ۱۸۸۰ء میں کانپور میں چھپ چکی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے لحاظ سے اس نسخہ کی ایک ندرت ذکر کے لائق ہے۔ کتاب صاف اور خوشنما خط میں لکھی ہوئی ہے خاتمہ کتاب پر کاتب کی ذیل کی عبارت مکتوب ہے۔

"تمام شد مرکبات اختیارات بدیعی واقعہ بتاریخ نوازدہم شہر شوال ۱۳ سنہ جلوس والمطابق ۱۱۹۷ فصلی بمکان حکیم قطب الدین صاحب بمحلہ مغلپورہ من محلات بلدہ عظیم آباد سرکار صوبہ بہار بخط خام احقر الانام کنج بہاری قوم کایتھ کرن ساکن بلدہ مذکور مرقوم یافت"

آہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے صوبہ میں عام بول چال کی زبان اردو اور کتابی زبان فارسی تھی اور "حکیم قطب الدین صاحب" کے گھر میں بیٹھکر "کنج بہاری قوم کایتھ کرن" خوشخط فارسی رسم خط میں۔ فارسی زبان کی کتاب نقل کرتے تھے۔ اور اب یہ زمانہ آیا ہے کہ دو ہندو اور مسلمان دوستوں کو اگر کوئی لمبی گفتگو کرنی ہوتی ہے تو طرفین کے ذہن میں ہلکے اور عام فہم لفظوں کے جلد نہ آنیسے دونوں کو اثنائے گفتگو میں انگریزی لفظوں کی مدد لے کر اپنی گفتگو تمام کرنی پڑتی ہے۔

دیہی آبادیوں کی اصلاح ہر مہذب حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے پنجاب میں اسکی مفید اسکیم پر عمل کیا گیا۔ کانگریس کے پچھلے دور حکومت میں مختلف صوبوں میں یہ محکمہ قائم ہوا۔ اور لمبی اسکیم کیساتھ کام شروع کیا گیا۔ ہماری توقعات اسکے ساتھ قائم ہوئیں۔ اور اس محکمہ نے ابتک مختلف مفید خدمات انجام بھی دی ہیں۔ لیکن ہمیں رنج اور افسوس کیساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ آغاز سے اس محکمہ میں چند بنیادی خامیاں بھی پیدا ہوئیں۔ اور انکی اصلاح اسوقت تک نہیں ہو سکی۔

چنانچہ ابھی ہمیں بعض مستند ذرائع سے بعض اطلاعیں ملی ہیں، وہ حد درجہ افسوسناک ہیں۔ اس محکمہ کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ دیہی آبادیوں کے مقامی اداروں اور انجمنوں کو مالی امداد پہنچائی جائے۔ اور آبادیوں میں لائبریریاں قائم کیجائیں مقامی اداروں کو امداد دینے کے لئے

تاثرات

سولہ ہزار روپے سالانہ یعنی ہر ضلع کے لئے ایکہزار روپیہ سالانہ منظور کیے جاتے ہیں اور سنٹروں میں لائبریریاں قائم کرنے کیلئے پچاس روپیہ سالانہ
کی کتابیں منظور کیجاتی ہیں۔ اس محکمہ کے قیام پر اسوقت تیسرا سال گذر رہا ہے۔ اب دیکھنے کی بات ہے کہ اسوقت تک یہ سولہ ہزار روپے سالانہ اور ہر
سنٹر کیلئے پچاس روپے سالانہ کس طور پر صرف کیے گئے ہیں۔

یہ کیسی حیرت کی بات ہے کہ پچھلی قومی حکومت کے پورے دور میں سارے صوبہ کی دیہی آبادیوں میں سے صرف ایک اسلامی
آبادی کی ایک اسلامی انجمن ایسی خوش نصیب نکلتی ہے۔ جس کو اس محکمہ نے ایک حقیر سی رقم حوالہ کی، بقیہ سارے کے سارے روپے غیر مسلم اداروں
کی نذر کردیے گئے، کیا یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ یہ ایک ایسی حکومت کے دور کا واقعہ ہے جو ہندوستان کی سب قوموں اور ملتوں کی نمائندگی کی مدعی تھی؟
اس کے بعد ۴۰-۱۹۴۱ء آتا ہے۔ اس پورے سال میں ۱۶ ہزار روپیوں میں سے سوا سو کی رقم مسلم اداروں کے حصہ میں آتی ہے۔ اور دوسری طرف غیر مسلم اداروں میں سے صرف
ایک ادارہ ہندی دیا پیٹھ دیوگھر سنتال پرگنہ کو تین سو روپے یکمشت دیدیے جاتے ہیں، حالانکہ مسلم اداروں کی یہ کثرت درخواستیں صدر دفتر میں پڑی فائل پر فائل تیار کر رہی ہیں
اسی طرح سنٹروں کیلئے پچاس پچاس روپے جو کتابوں کے لئے منظور ہیں انسے صرف ہندی کی کتابیں خریدی جارہی ہیں اردو کتابوں کی خریداری اسقدر کم مقدار میں ہوئی کہ
ان کی حیثیت برائے نام کہنے کی بھی نہیں۔

ہم محکمہ دیہات سدھار کے ذمہ دار افسروں سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اس صوبہ میں صرف وہی کسان اور دیہاتی ہیں جو ہندی رسم خط جانتے ہیں؟ اور کیا صرف وہی ادارے
امداد کے مستحق ہیں جنکے منتظم غیر اسلامی عقیدہ رکھتے ہوں اگر ایسا نہیں تو پھر محکمہ دیہات سدھار نے ایسی تفریق کیوں وا رکھی؟ اس نے اردو پڑھنے والے کسانوں
دیہاتیوں اور انکے بچوں کیلئے کیا سہولتیں بہم پہنچائیں؟ اسنے ایسے اداروں کو جان بوجھکر کیوں نظر انداز کیا جنکے منتظمین اسلامی عقیدہ رکھتے ہوں۔

ندیم کا دامن فرقہ وارانہ جذبات سے ہمیشہ پاک رہا ہے۔ لیکن .... وہ جسطرح اپنے لئے ان جذبات کی پرورش کو مناسب نہیں سمجھتا ہے
اسی طرح دوسروں کو بھی اس راہ پر جاتے ہوئے خاموشی سے نہیں دیکھ سکتا۔ ملک کے وہ ادارے اور جماعتیں جو فرقہ وارانہ جذبات کو مٹانا اپنا عقیدہ بنا چکی ہیں، انسے ایسی حرکات کا سرزد ہونا حد درجہ
قابل افسوس ہے۔ ندیم کو محکمہ دیہات سدھار سے ذاتی حیثیت سے بھی کوئی گلہ نہیں بلکہ وہ اس کا شکر گذار ہے۔ گذشتہ سال بھی اسکے سنٹروں میں ندیم جایا کیا۔ اور امسال بھی صدر دفتر کی فرمائش
کے مطابق (۱۴۷) (۵) سنٹروں میں رسالہ ندیم جاری ہے۔ لیکن ان سنٹروں میں رسالہ ندیم یا اردو کے کسی دوسرے رسالہ یا اخبار کو جاری کردینے سے ہی آبادیوں کے مسلم اور
اردو خواں باشندوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوجاتیں۔ ضرورت ہے کہ محکمہ کے ذمہ دار عہدہ دار اپنا فرض یاد رکھیں اور ہندو مسلم اور ہندی اردو کی تفریق کئے بغیر دیہی آبادیوں کو حقیقی فائدہ
پہنچانے کی کوشش کریں۔ مختلف دیہاتوں میں ایسے پرجوش مسلم نوجوان موجود ہیں جو انجمن قائم کرکے دیہات کی اصلاح کی نیک خدمتیں انجام دے رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ محکمہ
کی طرف سے انکی سرپرستی کی جائے اور ہندی کیساتھ اردو کتابوں کا بھی ذخیرہ دیہاتیوں کے ہاتھوں تک پہنچایا جائے۔

ہمارا مقصد کسی محکمہ کی خامیوں کی پردہ دری نہیں صرف اصلاح اور رہنمائی پیش نظر ہے۔ پچھلے سالوں میں جو کچھ ہوا وہ ہو چکا۔ نئے سال کی میزانیہ کی وہ رقم اسوقت تک صدر دفتر میں
محفوظ ہے۔ خدارا امسال ایسی بے راہ روی سے محکمہ کے دامن کو بچایا جائے۔ اور رقموں کو ان کے صحیح مصرف میں لایا جائے۔

ہم جناب سید محمد مجتبیٰ صاحب ایم۔ اے، بی۔ ایل، ایگزیکٹو افسر محکمہ دیہات سدھار صوبہ بہار کو خاص طور پر مخاطب کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنی نظر فرقہ وارانہ تصورات سے بلند
رکھتے ہیں۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ندیم بھی انکا ہم نوا ہے۔ وہ ان مسائل پر کسی فرقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں انسانی آبادیوں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اور انسانی آبادیوں
کی تحقیق میں انکی شیوا بیانی حقیقتوں کو منظر عام پر لانے کے لئے آواز اٹھاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موصوف اپنے رفقاء کار اور ماتحتوں کو صحیح روش اختیار کرنے کی ہدایت
فرمائیں گے۔ اگر وہ اپنے پچھلے طرز عمل پر سبق آموز نگاہ ڈالیں۔ اور امسال ایسی روش رکھیں کہ صوبہ کی کسی جماعت یا فرقہ کے لئے اجتماعی حیثیت سے شکایت
کا موقع پیدا نہ ہو اور بلا تفریق تمام غریب دیہاتیوں کی ضرورتیں پوری ہوں۔

مقالات

شیکسپیر

از جناب سید الحق صاحب عاشق دسنوی ام اے

شیکسپیر کا نام تعارف کا محتاج نہیں، انگریزی کے ایک دو فقرے سمجھ لینے والا بھی یہ جانتا ہے کہ وہ انگریزی ادبیات کا سب سے نامور ہیرو ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جن کے کان انگریزی ترانوں سے ناآشنا ہیں، اس کی شیریں بیانی، نغز گفتاری، اور اس کے تخیل کی سحرکاری کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس نے فطرت کے سربستہ رموز کی گرہ کشائی کی، اور شاہد قدرت کے چہ[رے] پر نقاب پڑی ہوئی تھی اس کو تار تار کر کے اس کے حقیقی حسن و جمال کا جلوہ لوگوں کو دکھا دیا۔ بقول اقبال

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

وہ صحیفۂ شاعری کا طغرائے امتیاز تھا، اور فن تمثیل نگاری میں لاثانی اور بے امتیاز۔ اس کے ڈرامے فطرت کی عکسی تصویریں ہیں، انسانی دماغ کے مد و جزر، فطرت کی بوقلمونیوں، قدرت کی رنگارنگیوں، اور کائنات کی جلوہ آرائی[وں کا] مطالعہ اس سے بہتر آجتک کسی نے نہیں کیا۔ ہومر (Homer) اور ورجل (Virgil) میں استعاروں اور تشبیہ[وں] کی شان و شوکت ملے گی، الفاظ کا طنطنہ سنائی دیگا، انشاپردازی کا جوہر چمکتا دکھائی دیگا، خیالات کا دریا امنڈتا ہوا نظر آ[ئے گا] ملٹن (Milton) میں بھی استعاروں کی شوکت عساکر سکندری کے جاہ جلال سے کم نہیں، اور الفاظ کا رعب فوج کے [illegible] سے بڑھکر ہے، شیلے (Shelley) اور بائرن (Byron) کے ہاں عشق و محبت کے رنگین افسانے ملیں گے، مگر شیکسپیر کو تمام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ فطرت انسانی کے جذبات و عواطف کا مطالعہ ہے، کہا گیا ہے کہ وہ شاہد فطرت آئینہ دار تھا۔ آیئے۔ تمثیل نگاروں کے اسی قیصر اعظم کے سوانح حیات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

یہ کس قدر تعجب انگیز واقعہ ہے کہ فطرت کے اس سب سے بڑے قصہ نگار کے قصۂ حیات کا زیادہ تر حصہ قیاس و گ[مان] پر مبنی ہے۔ اس کا باپ جون شیکسپیر (John Shakespeare) اپنے قریہ کا ایک معزز شخص تھا، اور اون کی تجارت کرتا تھا۔ اس کی شادی ۱۵۵۷ء میں میری آرڈن (Mary Arden) سے ہوئی جس کا خاندان اس کے شوہر [کے] خاندان سے زیادہ متمول تھا، اور جون شیکسپیر کو بیوی کے ذریعہ سے کچھ جائداد بھی ہاتھ آئی۔ ولیم شیکسپیر (William Shakespeare)

جو آسمان شاعری پر ایک درخشاں ستارہ ہو کر چمکنے والا تھا اور جس کی ضیاباری سے ایک دنیا فیضیاب ہونیوالی تھی، اسٹریٹفورڈ آن آوَن (Stratford on Avon) نامی ایک دیہات میں کتم عدم سے پردۂ وجود پر نمودار ہوا، اس کی تعلیم کچھ یونہی سی ہوئی۔ وہ دیہات کے اسکول میں تعلیم کی غرض سے بھیجا گیا، بن جونسن (Ben Jonson) جو اس کا ہمعصر تمثیل نگار ہے وہ اگرچہ اس کی تمثیل نگاری کا معترف تھا، لیکن وہ ہمیشہ طنزاً یہ کہا کرتا تھا کہ شیکسپیر لاطینی تھوڑی اور یونانی اس سے بھی کم جانتا تھا۔ ڈائے Dyce جو شیکسپیر کا ایک سوانح نگار گزرا ہے اس کا بیان ہے کہ فرانسیسی اور اطالوی میں بھی اس کی استعداد زیادہ نہ تھی۔ جب شیکسپیر ۱۴ سال کا ہوا تو اس کے باپ کا ستارۂ اقبال زوال کی طرف مائل ہوا، یہاں تک کہ اس کو اپنی بیوی کی جائداد گروی کرنی پڑی، اور بیٹے کو اسکول چھوڑنا پڑا تاکہ کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹائے۔ شیکسپیر کی ظاہری تعلیم بس یہیں ختم ہوجاتی ہے۔ مگر معلم فطرت نے اس کو وہ رموز و اسرار سکھائے کہ دنیا ابھی شیکسپیر کی قوت تخیل پر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ تاریخ ادبیات کا یہ عقدہ اب تک حل نہ ہوسکا کہ اتنی تھوڑی تعلیم کے باوجود کیونکر ایک شخص نے اپنے ادبی شہ پاروں سے دنیا کو انگشت بدنداں کردیا۔

مشہور فرانسیسی انشا پرداز ٹین (Taine) نے شیکسپیر کے سوانح حیات کو فرانسیسی زبان میں قلمبند کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ شیکسپیر دن رات دختر رز کی پرستش میں مصروف رہتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی بستی میں رندی و ہوسناکی کی مثال بن گیا تھا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ وہ نشہ میں مخمور تھا اور ڈگمگاتا ہوا چل رہا تھا، کسی نے اس کو مارا پیٹا اور مخموری کی حالت میں رات اس نے ایک درخت کے نیچے گزاری۔ بلاشبہ اس نے اسوقت تک شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اور وہ گاؤں کی تمام رنگ رلیوں میں شریک رہتا تھا۔ وہ ہرگز تہذیب و نفاست کا نمونہ نہ تھا۔ اٹھارہ سال کے سن میں اس کی شادی این ہیتھوے (Anne Hathaway) سے ہوئی جو اس سے آٹھ سال عمر میں بڑی تھی۔[1] ٹین (Taine) کا بیان ہے کہ شادی کے بعد مقررہ میعاد سے پہلے وہ ایک بچے کی ماں ہوگئی۔ ٹین کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قبل رسمی شادی کے شیکسپیر اور این کے ازدواجی تعلقات شروع ہوگئے تھے، مگر ہیلیول اور دوسرے مفسروں نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں منگنی ہی اصل میں شادی سمجھی جاتی ہے۔ اور منگنی کے بعد منگیتر بیوی ہوجاتی تھی، ان مفسروں نے اس طرح شیکسپیر کی پاکدامنی کو بیداغ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے سرلوسی کا ایک ہرن چرالیا تھا، اکثر اس کی خبر کوڑوں سے لی جاتی اور قید خانہ کی کوٹھری بھی دیکھنا پڑتی تھی۔ اس وقت تک شیکسپیر کا باپ تباہ ہوچکا تھا۔ خود شیکسپیر کی تین اولادیں ہوچکی تھیں، اور زندگی نہایت عسرت میں گذرتی تھی، ایک روایت ہے کہ ۱۵۸۶ء سے کچھ پہلے وہ ایک دیہات کے اسکول میں معلم بھی تھا، آخر کار غربت کے ہاتھوں تنگ آکر اس نے اپنی بیوی، بال بچوں اور وطن کو خیرباد کہا اور لندن پہنچ گیا۔ ایک قصہ ہے کہ کچھ دنوں تک وہ تھیٹر کی ایک کمپنی میں نوکر مقرر ہوا اور اس کا کام یہ تھا کہ تماشہ گاہ کے باہر تماشہ دیکھنے والوں کے گھوڑوں کی نگہبانی کرتا۔ غرضکہ غربت و افلاس کی تمام سختیاں سہنے کے بعد وہ ایکٹر مقرر ہوا، اس کے بعد اس نے ڈرامے لکھنا شروع کئے جو اسقدر مقبول ہوئے کہ اس کے ہمعصر تمثیل نگاروں کے دل میں کینہ اور حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ گرین Greene اور بن جونسن (Ben Jonson) کو حسد کی آگ جلا رہی تھی، ان کو تعجب تھا کہ کیونکر ایک آوارہ روزگار جو کل تک گھوڑوں کی نگہبانی پر مامور تھا

[1] حاشیہ ۱۳۵ پر دیکھئے

آج تمثیل نگاروں کا شہنشاہ بن بیٹھا، سنہ ۱۵۹۴ء سے اس نے اس زمانہ کے دو مشہور ایکٹروں ولیم کیمپ (William Kamps) اور رچرڈ برج (Richard Burbage) کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، ٹین (Taine) کا بیان ہے کہ تھیٹر کے باہر وہ عیاش اور ہوس پرست امرا کی صحبت میں رہا کرتا تھا، شیکسپیر کی وینس اینڈ اڈونس (Venus and Adonis) اس کے شباب کی پہلی صدا ہے، اس نے اس کتاب کو ارل آف سدیمٹن (Earl of Southampton) کے نام سے جو انیس سال کا ایک ہوس پرست نوجوان تھا، معنون کیا، یہ کتاب لندن میں اسقدر مقبول ہوئی کہ ہر حسین اور شوقین عورت کی میز پر اس کتاب کا پایا جانا ضروری تھا، یہ کتاب عشق و وارفتگی کی کہانی ہے، خود شیکسپیر میرین ڈیلورم (Marian Delorm) کے حسن و جمال کا وارفتہ اور اس کی نگاہوں کا گھائل ہوگیا تھا۔

شیکسپیر کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی، ملکہ الیزابتھ نے اس کے ڈراموں سے خاص دلچسپی لینی شروع کی، اس کے دربار میں شیکسپیر کے ڈرامے اسٹیج پر دکھائے جاتے تھے، الیزابتھ کے بعد جیمس اول شاہ انگلستان نے بھی شیکسپیر کی بہت ہمت افزائی کی۔ شیکسپیر نے کافی دولت جمع بھی کرلی اور اپنے باپ کے تمام قرض ادا کردیئے اور اسٹریٹفورڈ میں جو سب سے بڑا مکان تھا اس کو خرید لیا۔ اس کی شہرت کو چار چاند لگتے ہی گئے یہاں تک کہ ہر شاہی جشن میں شیکسپیر اور اس کی کمپنی کا آنا ضروری سمجھا جاتا تھا، باون برس کے سن سے اس کی صحت خراب ہوچکی تھی، اور وہ اسٹریٹفورڈ ہی میں رہا کرتا تھا، بن جونسن (Ben Jonson) اور مائیکل ڈریٹن (Michael Drayton) اس کو اکثر دیکھنے آتے تھے، سنہ ۱۶۱۶ء کے ماہ اپریل کی تیسویں تاریخ تھی اور منگل کا دن تھا، جب اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۲)

شیکسپیر کا دور — ایک انگریز انشا پرداز غالباً ڈاکٹر جونسن کا قول ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کو فطرت کی عکسی تصویریں بتانا گویا شیکسپیر کی توہین ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ فطرت نے خود اپنے ہاتھ میں قلم لیکر نقش آرائی کی ہے، شیکسپیر الفاظ کا مصور تھا، اور فن مصوری کے لحاظ سے استعارۃً وہ گوٹو (Giotto) اور ریمبران (Rembrandt)، ریفیل (Raphael) اور مائیکل اینجلو (Michael Angelo)، ٹیشین (Titian) اور لیونارڈو ڈی ونچی (Leonardo de Vinci) کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس کے ڈرامے گویا مصوری کے البم یا مرقعے ہیں، یورپ میں جب پندرہویں صدی کے وسط میں نشاۃ ثانیہ (   ) کا دور شروع ہوا تو ایک عام بیداری ہوگئی اور علم و فن کے کیسے کیسے لعل و جواہر پیدا ہوئے مگر شیکسپیر اس دور کا سب سے درخشاں گوہر شب چراغ

لہ شیکسپیر ٹویلفتھ نائٹ (Twelfth Night) میں ڈیوک اورسینو (Duke Orsino) کی زبان سے کہتا ہے کہ عورت کو اپنی عمر سے زیادہ سن والے مرد سے بیاہ کرنا چاہیئے۔ تب کہیں عورت شوہر کو بھلی معلوم ہوگی اور اس کے دل پر حکمرانی کرے گی

Let still woman take an elder than herself, so wears she to him so sways she level in h...

خیال ہے کہ یہ بات اس کی ... [illegible]

تھا، افراد کے دماغی اور ذہنی ارتقا کے مطالعہ کے لئے اس دور کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جس کے لیل و نہار نے ان ارباب نظر کو آنکھیں کھولتے اور ان کی صلاحیتوں کو نشو و نما پاتے دیکھا، انگریزی ادب کے مشہور نقاد میتھو آرنلڈ Matthew Arnold کا خیال ہے کہ کسی شخص کی ذہنی نشو و نما کے لئے روح پرور ماحول کا ہونا ضروری ہے، اور ماحول کا اثر اور شخصی صلاحیتیں دونوں ملکر ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی ذمہ دار ہوتی ہیں، چنانچہ اگر شیکسپیر الزابتھ کے عہد زریں کے بجائے کسی دوسرے دور میں آنکھیں کھولتا تو غالباً روح افزا ماحول نہ ملنے کی وجہ سے شیکسپیر شیکسپیر نہیں ہو سکتا تھا،

پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب قسطنطنیہ ترکوں کے دائرہ اقتدار میں آیا تو وہاں کے یونانی علما وہاں سے باہر نکل پڑے اور یورپ کے مختلف امصار و بلاد میں جاکر پناہ گزیں ہوئے، یہ انہی علما کا فیض تھا کہ لوگوں کے دلوں میں یونانی ادبیات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، ذوق مطالعہ کے ساتھ ساتھ تحقیق و تفتیش کی ایک لہر تمام یورپ میں دوڑ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ عقلی استدلال بغیر لوگ کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے، قسیسوں، راہبوں اور یورپ کے مذہبی اقتدار کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ چون و چرا کا دور تھا، لوتھر (Luther) ایریزمس (Erasmus) زونگلی (Zwingli) نے یورپ کی مذہبی حکمرانی کو زبردست چیلنج دیا، کیا خدا اور بندوں کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت ہے؟ کیا پوپ سیم و زر کے معاوضہ میں کسی کے دفتر معاصی کو دھو سکتا ہے؟ کیا وہ جنت کی ابدی مسرتوں کا خزانہ دار ہے؟ یہ سوالات تھے جو نئی تعلیم کی روشنی میں لوگوں نے پوچھنا شروع کیے، لوتھر نے ایک نئے فرقہ کی بنا ڈالی جو پوپ کی مذہبی سلطنت سے بے نیاز تھا، یہ وہ دور تھا جب یورپ میں انسانی عقل کو اوہام باطلہ کی زنجیروں سے نجات دلایا جا رہا تھا، عقل سلیم کارفرما تھی اور جیوں جیوں ذوق یقین بڑھتا گیا زنجیریں کٹتی گئیں، نئی تعلیم کی روشنی سب سے پہلے اطالیہ کے سواحل پر پہنچی، رفتہ رفتہ فرانس سپین، نیدرلینڈس، جرمنی، اور انگلستان کو اس نے مطلع انوار بنا دیا، تدریجاً اس ذہنی انقلاب کا سیلاب روز بروز بڑھتا گیا، یورپ کی روح صدیوں سے خوابیدہ تھی، جاگ اٹھی، اس کے تمام قوائے عمل سرد ہو چکے تھے ان کی تجدید ہوئی، یورپ جس کا آئینۂ فہم مکدر ہو چکا تھا۔ اب اس کو عقل و روشن خیالی کے صیقل نے مصفا کرنا شروع کر دیا، پوپ وہ پوپ جس نے بادشاہوں پر بھی شہنشاہی کی، جس کے ہاتھ میں جنت کے باب راحت کی کنجیوں کے ہونے کا گمان ہی نہیں بلکہ عقیدہ بھی تھا، جو لاکھوں عیسائیوں کے ایمان و ضمیر کا رکھوالا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے دام تزویر کا راز آشکارا ہو چکا اور اس زمانہ کے مصلحوں نے اس کو مرید ابلیس کے لقب سے پکارا ؎

واقعہ یہ ہے کہ یورپ ازمنۂ وسطےٰ میں یاس و قنوطیت کے دور سے گزر رہا تھا، مسیحیت کی راہبانہ تعلیم ایک حد تک اسکی ذمہ دار تھی، رومی سلطنت کے زوال و انحطاط کے بعد یورپ کے ذہنی آسمان پر یاس کی گھٹائیں چھا گئیں، فلاسفروں کی تعلیم دنیا سے منافرت کے جذبات پر مشتمل تھی، ان کی تعلیم کا جزو اعظم یہ تھا کہ دنیا ایک لعنت گاہ ہے اور اس کو ترک کرنا انسان کے لئے نجات ابدی ہے

۵۸ غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ان کا نظریہ راہبوں کے عقیدہ سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی جلد چہارم میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ "دینداری کا سب سے اہم جز تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی۔ ہر قسم کے آرام و آرایش سے جسم کو محروم کرکے ہر قسم کی تکلیف وعذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کر لیا تھا، ماں باپ، عزیز و اقارب، اہل و عیال، دینداری اور تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، ان سے پرہیز بلکہ نفرت، کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا، اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا" (مصنف سیرۃ نے کتاب کے حاشیہ میں یہ حوالہ دیا ہے کہ یہ تمام واقعات لیکی (Lecky) کی تاریخ اخلاق یورپ History of European کی دوسری جلد میں مفصل لکھے ہیں۔) حضرت مسیح کا اصلی مذہب بوسیدہ، بے معنی اور خالی از روح رسومات کا مجموعہ بن گیا تھا، حرص و آز، ریاکاری و ہوس رانی، کے عفونت کی حکمرانی کلیساؤں تک پہنچ چکی تھی، راہبوں اور پادریوں کے چوغے، پارسائی اور تقدس کے حاشیوں سے خالی تھی۔ سترھویں صدی کے انگریز مصنف اور طبیب برٹن (Burton) نے اپنی مشہور کتاب اینٹومی آف میلنکولی Anatomy of Melancholy میں حزن و غم کے اسباب و علل پر بحث کی ہے، اور تجرد کو بھی ایک وجہ قرار دیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ ازمنہ وسطے کے پادری جو تجرد کی زندگی اختیار کر لیتے تھے، وہ ہر قسم کی لعنتوں کے ہاتھ بک جاتے تھے، ہر قسم کے فطری اور غیر فطری گناہوں میں مبتلا تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک دفعہ اپنی ایک تقریر میں جو پٹنہ کی انجمن اسلامیہ کے زیر اہتمام ہوئی تھی ایک نہایت بلیغ فقرہ کہا تھا، "ایک طرف تو پادریوں کا قید خانہ ہے، دوسری طرف ننوں (راہبہ عورتوں) کا زندان خانہ ہے، اور ان دو زندانوں نے مل کر جو گلستاں تیار کیا وہ ہر شخص پر ظاہر ہے" یورپ کے تمدن کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ یکایک اطالیہ کے روزنوں سے نشاۃ ثانیہ کی ایک جھلک نظر آئی، جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تو وہاں کے یونانی علماء نے اطالیہ کو اپنا دارالامن قرار دیا، یونانی اور رومی ادبیات کا مطالعہ سرگرمی سے شروع ہوا، روم اور یونان کی معیاری کتابوں سے علماء نے دلچسپی لینی شروع کی۔ یورپ نے ان ادبی خزانوں کا جنکو وہ صدیوں تک بھلا چکا تھا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا، قدیم یونانی اور رومی تمدن تمام یورپ میں ایک بار پھر ابھر آیا، ازمنہ وسطے کی اسپرٹ کے ردعمل کا دور شروع ہو گیا۔ اس سیلاب کے سامنے تمام پرانی دیواریں ٹوٹتی گئیں، انجیل کی فرمانروائی ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، اور انجیل کی تعلیمات کی جگہ یونانی اور رومی عقیدوں نے لے لی، اس دور کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے تخیل پر رومی اور یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کی حکمرانی تھی، خود شیکسپیر کے ڈراموں میں جابجا ان عقیدوں کی جھلک نظر آتی ہے، عشق کے دیوتا (Cupid)، بیاہ کے دیوتا (Hymen) فطرت کے دیوتا (Pan) اور قسمت اور قدرت کی دیویوں (Fortuna Natura) کا ذکر بار بار آتا ہے، ہزاروں اشارات و کنایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم یونانی اور رومی تمدن لوگوں کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا، ملکہ الزبتھ Elizabeth ... جن کے

(Jane Grey)، ڈچس آف نورفوک (Duchess of Norfolk)، اور کونٹس آف ارنڈل (Countess of Arundal) نے افلاطون اور دوسرے یونانی حکما سے دلچسپی لینی شروع کی اور قدیم معیاری کتابوں کا مطالعہ ایک قومی شعار بن گیا، ازمنۂ وسطےٰ کی طویل اور تاریک رات کے بعد یورپ میں قدیم یونانی تمدن کا آفتاب سواحل اطالیہ سے چمکا، اطالیہ میں پٹرارک (Petrarch) ریزی (Rienzi) اور بوکیچیو کے زمانہ ہی سے لوگوں نے قدما کے ادبی جواہر ریزوں کی تلاش شروع کر دی تھی، پرانے قلمی نسخوں کی ہر جگہ تلاش اور چھان بین ہونے لگی، یورپ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو گیا، زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے، کولمبس نے دریافت امریکہ کے بعد دنیا کے نقشہ کی توسیع کی، جہاز رانوں نے بحری قطع و برید کے بعد ایک ملک کے سرے کو دوسرے ملک کے سرے سے ملا دیا، اسی زمانہ میں زمین کی شکل متعین ہوئی، نظام کائنات کی تشریح ہوئی، لسانیات کی بناڈالی گئی، تمام تجرباتی فنوں کا آغاز ہوا، علم و فن کے باغ میں روح پرور بہاریں آئیں، انسانی عقل کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہ تھا جس میں ترقی کی روح کارفرما نہ تھی، خود انگلستان میں علم و دانش کی مسندیں ہر جگہ بچھ گئیں، تہذیب و تمدن معراج کمال کو پہونچ گیا تھا، لوگ بہت ہی نفاست پسند ہو گئے تھے، ریشم، کمخواب اور تنزیب میں لوگ ملبوس نظر آتے تھے، مخمل کے جوتے جن پر چاندی اور سونے کے کام ہوتے پہنے جاتے، ایک ایک قمیص کی قیمت آٹھ آٹھ پونڈ ہوتی تھی، جب ملکہ الزبتھ کا انتقال ہوا تو اس کی الماری سے تین ہزار کپڑے نکلے، کپڑوں میں ہیرے ٹانکے جاتے تھے، مادی، تمدنی، معاشرتی اور وجدانی نقطہ نظر سے یہ دور یورپ کا ایک زریں عہد تھا، اور عام انسانی ترقی کے اہم دوروں میں سے تھا، اسی روح پرور فضا میں اسپنسر (Spencer)، مارلو (Marlowe) پیل (Peele) کڈ (Kyd) نیش (Nash) بن جونسن (Ben Jonson) اور شیکسپیر نے آنکھیں کھولیں۔ (باقی)

سید جمال الدین افغانی

(۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء — ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء)

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

امام الاحرار سید جمال الدین افغانی پر جناب محمود صاحب بریلوی کا مفید مضمون نظر سے گذرا۔ انگریزی کتابوں سے اخذ و استفادہ کے باعث بعض اسما و اعلام کے تلفظ میں مسامحت ہوگئی ہے، نامناسب نہ ہوگا اگر ان کی تصحیح کردی جائے۔

(۱) احمد عرابی پاشا (۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء — ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء) کی مسلح بغاوت کو بار بار "عربی بغاوت" کہا گیا ہے۔ احمد عرابی مصر کے کسان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوئے، اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کرتے چلے گئے، خدیو اسماعیل کی من مانی کارروائیوں اور اسراف کے باعث مالیات پر غیروں کا تسلط ہو ہی چکا تھا، خدیو توفیق کے عہد میں پیچیدگیاں اور بڑھ گئیں، تا آنکہ ملک میں ایک فوجی انقلاب رونما ہوا، جس کی قیادت احمد عرابی کے ہاتھ میں تھی، قصہ طویل ہے، خلاصہ یہ کہ اسکندریہ میں باشندوں کا "ذبح عام ہوا" (۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء) اور عرابی پاشا کو سیلون میں جلاوطن کردیا گیا، ۱۳۱۹ھ میں یعنی انیس سال کے بعد خدیو عباس نے واپسی کی اجازت دی۔

یہی مصر کی مشہور "عرابی بغاوت" تھی، جسے مضمون میں بار بار "عربی بغاوت" کہا گیا ہے، عرابی کا انگریزی املا [illegible] ہے، اس لئے غلط فہمی ہوئی، رہا یہ سوال کہ اسے بغاوت کہا جائے یا "جہاد حریت" تو ہندی اہل قلم کو سوچنا چاہئے کہ وہ ۱۸۵۷ء کی ... ناکام کشمکش کو کس نام سے ادا کرنا چاہتا ہے؟

(۲) (العروۃ الوثقیٰ) کا املا العروۃ تقی چھپ گیا ہے[1]، العروۃ الوثقیٰ امام سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار کا نام تھا، ابھی اس پیام انقلاب کے دو چار ہی نمبر نکلنے پائے تھے کہ ایوان شہنشاہیت میں زلزلے کی دھمک محسوس ہونے لگی، عرش نشینوں کی نیند اچٹ گئی، بالآخر اس پیامی کے کل اٹھارہ نمبر نکل پائے، مصر اور ہندوستان کے دروازے اس پر بند کر دیئے گئے، اور اخبار بند ہوگیا، لیکن اس کا ہر ہر لفظ کتابی صورت میں بار بار چھپ چکا ہے، اور عربی جاننے والا اس کا پڑھنا فرض سمجھتا ہے، اس کو قریب قریب اردو میں الہلال کی حیثیت حاصل ہے، حقیقت میں الہلال کی دعوت بھی امام جمال الدین کے نعرۂ حق کی صدائے بازگشت تھی، حق یہ ہے کہ اس صدی میں مشرق میں جس کو جو کچھ ملا ... وہ اسی امام الاحرار کے ذریعہ اور واسطہ سے — دعوت "الہلال" کے مبلغ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ

[1] ندیم: مضمون نگار نے صحیح لکھا تھا۔ کتابت میں غلطی سرزد ہوئی۔

تو بار بار اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ "الہلال" کا پہلا نمبر غالباً انہی کی اور ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ کی تصویروں سے مزین تھا۔

(۳) ماخذ کے سلسلہ میں دو کتابیں بہت اہم ہیں۔ جن کا علم ضروری ہے:-

(الف) علامہ سید رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ الاستاذ الامام، سید رشید مرحوم نے یہ تاریخ تین حصوں میں لکھی ہے، اصل میں یہ کتاب شیخ محمد عبدہ (۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء — ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کی مکمل سوانح حیات ہے لیکن شیخ محمد عبدہ کا ذکر، ان کے استاذ اور مشرق جدید کے امام سید جمال الدین کی سیرت کے بغیر کس طرح مکمل ہو سکتا تھا۔؟

سید رشید مرحوم نے ساتھ ساتھ امام جمال الدین کی سیرت بھی لکھ ڈالی۔ بیان کی جامعیت اور معلومات کی فراوانی کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سید رشید مرحوم امام جمال الدین سے بچپن ہی سے واقف تھے، اور ان کے درمیان عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی تھی پھر شیخ محمد عبدہ کی شاگردی سے یہ رشتہ اور مستحکم ہوگیا۔ شیخ محمد عبدہ کے بعد یہ بجا طور پر وارث علوم الحکیمین الامامین" کے نام سے یاد کئے جانے لگے، مصر کے مشہور مفکر ادیب مصطفیٰ صادق رافعی (متوفی ۱۹۳۷ء) خاص طور پر انہیں اس لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

(ب) عہد حاضر کے امام سیاست اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مفکر امیر شکیب ارسلان نے گو اپنے استاذ و امام سید جمال الدین کی سیرت پر کوئی خاص کتاب نہیں لکھی، لیکن ان کی مختلف کتابوں میں "حکیم مشرق" کی سیرت اور کارناموں پر اتنا مواد بکھرا ہوا ہے، کہ اگر انہیں سمیٹ کر یکجا کیا جائے، تو مختصر لیکن جامع سیرت مرتب ہو جائے، میرا اشارہ خاص طور پر ان کی دو کتابوں (حاضر العالم الاسلامی ۴ جلدیں؛ نیا اڈیشن) اور السید رشید رضا او اخاء اربعین سنۃ) کی طرف ہے، موخر الذکر کتاب کی (اور اس کے ساتھ مقدم الذکر کتاب بھی) صحیح قدر و قیمت جاننے کے لئے راقم کا مضمون سیرت سید رشید رضا (معارف ۱۹۳۵ء: نومبر و دسمبر) پڑھئے، بات بڑھتی چلی جاتی ہے، امام جمال الدین کا جتنا بار بار ذکر آئے اچھا ہے، سر دست اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، موقع ملا تو پھر کبھی تفصیل سے عرض کرنے کی کوشش کرونگا۔

انگلستان کی صحافت کا ماضی اور حال

مشہور انگریز صحافی ولیم کاربٹ نے ۱۸۳۰ء میں تصریح کی کہ "تاریخ میں ایسی کم مثالیں ہونگی کہ کسی شئی کے اصل مطمح نظر کو ایسا زوال آیا ہو، جیسا کہ انگریزی صحافت کو پیش آیا''

ولیم کاربٹ کی یہ اہم تصریح دورِ حاضر کی انگریزی صحافت پر آج بھی منطبق ہوتی ہے'

انگلستان میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک اخبارات کا اجراء افراد کی جانب سے ہوتا تھا، جو کسی نہ کسی سیاسی مطمح نظر کیساتھ نکالتے اور اس سے مقصود معین سیاسی یا اجتماعی مبادی اور اصول کی ترویج واشاعت ہوتا' وہ اخبارات چھوٹے چھوٹے دستی مطبعوں میں چھاپے جاتے اون کے ...... پڑھنے والوں کی تعداد مختصر ہوتی کہ سیاسی و اجتماعی مباحث میں دلچسپی لینے والے تھوڑے ہوتے تھے' اس لئے ایک اخبار کے اجراء کیلئے ایک ایسی چھوٹی پونجی کی ضرورت پڑتی' جس کا بار اشخاص انفرادی طور پر اوٹھا سکتے، چنانچہ ۱۸۲۰ء میں ولیم کاربٹ کے ایک بیان میں ذکر آیا ہے کہ اخبار **مارننگ پوسٹ** (جو اس سے تقریباً ۳۰ سال پہلے جاری ہوچکا تھا' اور جس میں ملک کے بلند پایہ انشاپرداز اہل علم کام کرچکے تھے) اوس زمانہ میں روزانہ صرف ۱۲۰۰ چھپتا تھا' اسی طرح ٹائمس کی اشاعت بھی جو مارننگ پوسٹ کے کچھ ہی دنوں بعد نکلا تھا' اس سے زیادہ نہ تھی'

چنانچہ جب ملک میں اخبارات شایع ہونے لگے تو حکومت کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی' انہی دنوں حکومت انگلستان نے ۱۷۱۳ء میں اخبارات پر ایک خاص ٹیکس لگایا جو "اسٹامپ ٹیکس" کے نام سے موسوم تھا' یہ ابتداً ہر اخبار کی ایک کاپی پر ½ پنس پھر رفتہ رفتہ بڑھکر ۱۸۱۵ء میں ہر کاپی پر ۴ پنس تک ہوگیا' اس کی وجہ سے جرائد و اخبارات کے مالکوں کو بہت کم منافع ملنے لگا، کیونکہ ہر پرچہ کی قیمت کم ازکم ۹ پنس اونھیں رکھنی پڑتی' اس طرح صرف ۵ پنس میں عملہ ادارت کی تنخواہ، کاغذ اور لکھائی چھپائی کے جملہ اخراجات کیساتھ مالکوں کا منافع بھی شامل ہوتا'

لیکن اسی زمانہ یعنی انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی صحافت میں ایک انقلاب عظیم آیا' جس سے صحافت کو ایسی ترقی حاصل ہوئی کہ آج اوس کے اعداد و شمار حیرت کیساتھ یقین میں آتے ہیں'

یعنی ۱۸۱۴ء کیونگ (Koenig) پریس کی ایجاد ہوئی' جو ہاتھ کے بجائے بخارات سے چلایا جاتا تھا اس کے ذریعہ پہلے مطبعوں میں ایک معین وقت میں جسقدر کاپیاں چھپ سکتی تھیں[1] وہ اب (۱۰۰۰) چھپنے لگیں' پھر مزید ترقی ہوئی یہاں تک کہ اوسی ایک گھنٹہ میں ۵۰۰۰ فرمے تیار ہوجاتیں' پھر دوسری مطبعی ترقیاں ہوئیں مثلاً حروف ملنے کا ٹپے

[1] اس سے چہار گونہ زیادہ چھپنے لگیں' چنانچہ پہلے ایک گھنٹہ میں ۲۵۰ کاپیاں چھپ سکتی تھیں۔

ہونے لگے، کاغذ لکڑی سے بنایا جانے لگا، اس کے بعد ریل، ڈاکخانہ اور تار کی ایجادوں سے اخبارات کو سہولتیں ہوتی گئیں، پہلے جو خبریں مدتوں میں ملتیں وہ اب چند گھنٹوں اور چند لمحوں میں ملنے لگیں جن سے اخبارات و جرائد بہ تعداد کثیر نکلنے لگے اور ان کے پڑھنے کا ذوق بھی بڑھتا گیا، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۶۰ء میں ایک نو ایجاد مشین کے ذریعہ صحافت کی ترقی معراج کمال پر پہنچ گئی اس ایجاد سے نہ صرف یہ کہ اخبارات جلد چھپنے لگے بلکہ وہ مشین بیک وقت پورا اخبار چھاپ دیتی، اوس کے اوراق طے کر دیتی، اور اخبارات مطبع سے نکل کر فوراً بازار میں پہنچ جاتے،

انیسویں صدی کے آغاز سے اخبارات کو روز بروز ترقی ہوتی گئی، اوس میں ایک ضروری شے کا اضافہ ہوا وہ تجارتی اشتہارات کی اشاعت کی ابتدا ہے، جب اخبارات پبلک میں ذوق و شوق سے پڑھے جانے لگے، تو تاجروں اور صناعوں کو اپنے مال تجارت اور اشیا کو روشناس کرانے کا خیال پیدا ہوا، اور جب اس ذریعہ سے منافع حاصل ہوا تو اس کو بھی مزید ترقی ہوئی، اور اس کا بالواسطہ اثر اخبارات پر پہنچا اس سے مالی منافع کے علاوہ ایک یہ فائدہ بھی پہنچا کہ حکومت انگلستان کو رائے عامہ نے مجبور کیا کہ وہ اخبارات کے "اسٹامپ ٹیکس" کو منسوخ کردے۔ چنانچہ وہ ٹیکس سنہ ۱۸۵۵ء میں منسوخ کر دیا گیا، اس کے منسوخ ہوتے ہی ۱۰۷ نئے اخبارات اسی سال جاری ہو گئے اور پھر جس سرعت سے اس میں ترقی ہوئی اوس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوگا

سال		تعداد
سنہ ۱۸۲۵ء	--	۴۸۳
سنہ ۱۸۶۵ء	-	۱۲۶۰
سنہ ۱۹۰۹ء	-	۲۳۲۲، جن میں ۳۸۶، اخبارات خاص لندن سے نکلتے تھے

سنہ ۱۸۵۵ء کے بعد اخبارات کی اس کثرت کی وجہ محض تجارتی اشتہارات کی کثرت تھی، جن میں سنہ ۱۸۵۳ء کے بعد مزید ترقی اس لئے ہوئی کہ پہلے ہر اشتہار کی اشاعت پر مشتہرین حکومت کو بھی ایک خاص ٹیکس ادا کرتے تھے جسے اب منسوخ کر دیا گیا، یہ ٹیکس کامل ۱۵۰ سال تک عائد رہا۔ اس کے بعد اخباروں کو اشتہارات سے جو وسیع آمدنی ملنے لگی، اوس کا اندازہ ذیل کے چند بیانات، سے کیا جا سکتا ہے

لارڈ بیوربروک (Beaverbrook) اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:-

"صرف لندن کے اخبارات، اشتہارات کی جو اجرت پاتے ہیں وہ ۱۳ ملین پونڈ سالانہ تک پہنچ جاتی ہے، اس میں صبح کے اخبارات کا حصہ تقریباً ۹ ملین پونڈ ہے، شام کے اخبارات باقی ۴ ملین پاتے ہیں"

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برطانیکا طبع سیزدہم میں لفظ "اشتہار" کے ذیل میں ہے کہ

"۱۹۲۶ء میں جریدۂ ڈیلی میل کے پڑھنے والوں کی تعداد ۱۷,۰۰,۰۰۰ لاکھ تھی ۱۴۰۰ پونڈ صفحۂ اول میں چھپنے والے اشتہارات کی اجرت آتی' اسی طرح "نیوز آف دی ورلڈ" جو دنیا کے کثیر الاشاعت ہفتہ وار اخبارات میں ہے اور جس کے پڑھنے والوں کی تعداد ۳ ملین سے متجاوز ہے' وہ ۲۴۰۰ پونڈ اپنے ہر صفحہ کی اجرت ہرایک اشاعت میں لیتا تھا' رسالہ "پنچ" جو ہفتہ وار مزاحیہ رسالہ ہے' اور جس کے قارئین کی تعداد ۲ لاکھ سے متجاوز نہیں' وہ ۸ ہزار پونڈ ہر اشاعت میں اشتہارات کی اجرت وصول کرتا' اور اوسطاً ایک انچ کے اشتہار کی اجرت ۳۷۶ پونڈ تک لیجاتی ہے" اسی طرح کتاب برٹش پریس کا بیان ہے کہ بعض اخبارات جو آج کل صرف ایک پنس میں ملتے ہیں' اون کے صیغہ' ادارت' اہتمام' طباعت' معاوضہ مضامین اور وہ انعامات جو قارئین و ناظرین کو مختلف شکلوں میں دئیے جاتے ہیں' ان جملہ اخراجات کا اوسط ہر پرچہ کا ۲ پنس نکلتا ہے اس طرح جو مصارف ایک پرچہ پر آتے ہیں' وہ اوس سے نصف قیمت پر خریدار کے ہاتھ میں پہنچتا ہے' لیکن ان کی تلافی اونہی تجارتی اشتہارات کے ذریعہ ہوتی ہے' جو نہ صرف اخبارات کے آمد و خرچ کی میزان برابر کرتے ہیں' بلکہ اون کے مالکوں کے درمیان ہزاروں' لاکھوں اور کروروں کا منافع تقسیم کرتے ہیں'

تجارتی اشتہاروں کی آمدنی کی کثرت' اور پریس کی غیر معمولی سہولتوں کا ایک نمایاں اثر یہ پڑا کہ اخبارات کا کسی شخص کی ملکیت میں نکلنا دشوار ہوگیا کہ اس قدر کثیر راس المال کی فراہمی اشخاص کیلئے انفرادی طور پر دشوار ہوتی کہ وہ کسی اچھے پیمانہ پر اخبار جاری کرسکیں' اس لئے ۱۸۹۶ء میں مشہور انگریز صحافی لارڈ نارتھ کلف نے مشترک ملکیت کے اخبار کے اجراء کا آغاز کیا' چنانچہ "ڈیلی میل" سب سے پہلی مرتبہ مشترکہ ملکیت میں انگلستان سے جاری ہوا' اگرچہ اس طریقہ کی ابتداء دو تین سال پیشتر امریکہ میں ہوچکی تھی' اس لئے لارڈ نارتھ کلف کا نام اس طریقہ کے بانی کی حیثیت سے نہیں لیا جاسکتا' تاہم انگلستان کی صحافت کی تاریخ میں وہی اس کے بانی ہیں'

اتفاق کی بات انہی دنوں جنوبی افریقہ میں جیمسن ریڈ کا حادثہ پیش آیا "ڈیلی میل" نے برطانوی شرف و مجد کا علم بلند کیا' اور اسی ذریعہ سے اپنی غیر فانی زندگی قائم کرلی' اس کے بعد لارڈ نارتھ کلف کو مانچسٹر سے ڈیلی میل کے ایک سستے اڈیشن کے جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا' چنانچہ اس کی بھی ابتداء ہوئی' اور یہی اخبار دنیا کے اخبارات میں سے کسی اخبار کا سب سے پہلا "سستا ایڈیشن" تھا'

لارڈ نارتھ کلف نے ڈیلی میل کے اجراء سے پیشتر اسی طریقہ پر ایک چھوٹا سا تجربہ کیا تھا' چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اونھوں نے جریدہ "امیوننگ نیوز" کو خریدا' جو اوسوقت تک ۴ لاکھ پونڈ کا خسارہ اوٹھا چکا تھا' انھوں اوسے ہاتھ میں لیتے ہی خسارہ کی روک تھام کی اور پہلے ہی پرچہ میں ۷ پونڈ کا منافع ہوا۔ پھر پہلے سال کے اختتام پر ۱۴ ہزار پونڈ کا منافع حاصل ہوا' اسی تجربہ سے اون کی ہمت بڑھی' اور ڈیلی میل کی بنیاد ڈالی' لارڈ نارتھکلف

ایہ واضح نظریہ تھا کہ اخبار کی قیمت وہ ہونی چاہیئے جو مالی حیثیت سے اوسے نفع پہنچائے، نہ یہ کہ وہ اپنا کوئی سیاسی اثر و نفوذ پیدا کرے اسی طرح ایک مرتبہ مسٹر کینڈی جانسن نے جو لارڈ نارتھ کلف کے شرکائے کار میں تھے، یہ الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ "اخبارات کے جاری کرنیسے اونکا مقصد وحید محض" مجرد تجارت "ہے"

لارڈ نارتھ کلف اپنے آخر حیات تک "ٹائمس" "ڈیلی میل" اور "ایوننگ نیوز" وغیرہ تقریباً ۷۰ اخبار و رسائل سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق رکھتے تھے، اور وہی سب سے پہلے شخص ہیں جو ایک اخبار کو دوسرے اخبار میں ملانے، یا ایک کمپنی کو کسی دوسری کمپنی میں ضم کر دینے کے طریقوں کے بانی ہیں اور اونھیں اپنے صحافتی نقطۂ نظر میں پوری کامیابی بھی حاصل ہوئی، کہ اونھوں نے انگلستان میں جسقدر سیاسی اثر و نفوذ پیدا کیا اوس سے کہیں زیادہ دولت و ثروت کا انبار جمع کر لیا، اگرچہ آخر میں اون کی یہی سرمایہ داری اون کے سیاسی اثر و نفوذ میں بھی معاون ہوئی اور انگلستان کی رائے عامہ اون کے ہاتھ میں آگئی، لارڈ نارتھ کلف کے بعد اون کے بھائی، لارڈ اوتھر میر اون کے جانشین ہوئے اور "ڈیلی میل" اور "سنڈے پکچرل" وغیرہ بکثرت اخبار و رسائل کی ملکیت کے وہ حصہ دار ہیں، اور وہ اوسی سیاسی اثر و نفوذ کے اسوقت مالک ہیں

انگلستان میں مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے آغاز کے بعد سے اس وقت تک اخبار و رسائل کی تقریباً دس بڑی کمپنیاں قابل ذکر ہیں، جن کا راس المال ۱۰۰ ملین پونڈ سے زیادہ ہے اور یہی کمپنیاں سیاسی اثر و نفوذ کی بھی ٹھیکہ دار بنی ہوئی ہیں، یہ جو کچھ چاہتی ہیں، اوس کے مطابق رائے عامہ تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں ۔

اخبارات کے مشترکہ سرمایہ کی تجارتی کمپنیوں کے ماتحت چلے جانیسے مختلف اخبارات ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے، جس کی وجہ سے اخبار و رسائل کی تعداد میں کمی آگئی، چنانچہ آجکل انگلستان کے اخبار و رسائل کی مجموعی تعداد (۲۱۵۰) ہے، جن میں سے (۳۹۲) لندن کے ہیں برخلاف اس کے سنہ ۱۹۱۰ء میں اس تعداد سے (۱۸۱) پرچے پورے انگلستان اور (۲۲) پرچہ خاص لندن میں زیادہ نکلتے تھے،

علاوہ ازیں اخبارات کے سرمایہ دار کمپنیوں کے ماتحت آجانے ہی سے انگلستان کی صحافت میں وہ انقلاب عظیم برپا ہوا جس کا حوالہ آغاز تحریر میں آیا ہے، جس وقت انگلستان میں صحافت کا آغاز ہوا تھا، اس کی غرض و غایت کسی خاص اجتماعی و سیاسی مسلک و حکمت عملی کی نشر و اشاعت کرتی تھی، اور اخبارات کی پوری ترتیب اس نوعیت سے انجام پاتی کہ اس کے مضامین اور خبریں کسی نہ کسی حیثیت سے اصل مقصد کی موید و معاون ہوں، اور اسی کی وجہ سے اخبارات کو کبھی رائے عامہ سے ٹکرانے کے باعث عوام کے غصہ و غضب و اختلاف کو برداشت رنا پڑتا اور کبھی حکومت کی سزاؤں کو بھگتنا پڑتا، جس کی وجہ سے اخبارات زیادہ تر خسارہ اوٹھاتے تھے لیکن وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق قومی و ملی و وطنی خدمت انجام دیتے رہتے تھے اور یہی اون کے بانیوں کا اصل مقصود

لیکن جب سے اخبارات سرمایہ دار کمپنیوں کے ماتحت آئے، اون کے اغراض بدل گئے، اب وہ عوام اور پبلک کے ذوق و رجحان طبع کی پیروی کرنے لگے، تاکہ خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہو، چنانچہ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ انگلستان کا وزیر اعظم وقت کے ایسے اہم ترین مسئلہ پر تقریر کرتا ہے، جس پر حکومت کی آئندہ حکمت عملی و سیاسیات کے سمجھنے کا دارومدار ہوتا ہے، لیکن وہاں کے شائع شدہ اخبارات میں محض چند سطروں میں اوس کا خلاصہ شائع ہوتا، اور پارلیمنٹ کے کسی دوسرے ممبر کی تو یہ انتہائی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ کبھی اوس کی کسی تقریر کا لب لباب اخبارات میں صحیح طور پر آجائے برخلاف اس کے اوسی دن کی اشاعت میں گھوڑ دوڑ، کتوں کی دوڑ، چوری کی وارداتوں، جرائم کی تفصیلات، طلاق کے مقدمات اور سینما کی ایکٹرس کے حالات سے جلی سرخیوں کیساتھ صفحوں کے صفحے رنگین ہوتے تھے۔

اب اسی لئے کسی اخبار کی ادارت کیلئے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ وہ انگریزی علم ادب پر عبور رکھتا ہو سیاست، علم تاریخ و علوم عقلیہ کا ماہر ہو، بلکہ اب کامیاب اڈیٹر وہ ہے، جو اس سلیقہ سے اخبار یا رسالہ کو مرتب کرے اور ایسی خبریں فراہم کرنیکا سامان کرلے، کہ وہ روزنامہ پبلک کیلئے زیادہ سے زیادہ جاذب توجہ بن سکیں، حالانکہ اس سے پہلے کسی بلند پایہ اخبار کی ادارت کے ذمہ دار ہونے کے دوسرے معنی یہ سمجھے جاتے تھے کہ وہ انگلستان کے ممتاز ادیبوں اور اہل علم میں ہے،

اسی طرح ان اخبارات نے پبلک کو اپنی جانب مائل کرنے کیلئے قسط وار افسانے چھاپنا شروع کئے، جن کے آئندہ دلچسپ ٹکڑے دوسری اشاعت کیلئے باقی رکھ چھوڑے جاتے، مختلف قسم کے معمے شائع کرنے لگے جن کے حل پیش کرنے پر بڑی مقدار میں انعامات دیئے جاتے، اس طرح کئی ملین پونڈ ان اخبارات کا انہی مدوں میں صرف ہونے لگا، اور یہ رقم مختلف طریقوں سے پبلک ہی سے وصول کرتے ہیں، اور اس کا بیشتر حصہ اونہی سرمایہ دار کمپنیوں کے منافع میں جاتا ہے اس کے بالمقابل ملک کی علمی خبریں، سائنٹفک مضامین، ادبی اجتماعی، اور علمی انجمنوں کی کارگذاری اور کارروائیوں کیلئے اخبارات میں جگہ نہیں نکل سکتی، حالانکہ پہلے کے اخبارات و رسائل ان کے حصول کیلئے خاص اہتمام کرتے تھے، اور ملک میں صحیح علمی و ادبی مذاق پیدا کرتے تھے،

یہی وجوہ ہیں کہ آج انگلستان میں یہ ایک امر مسلم ہے کہ کسی سیاسی اثر و نفوذ اور صحیح وطنی خدمت کرنے والے اخبار اور واقعی علمی و ادبی رسالہ کیلئے دوسرے اخبارات و رسائل کے مقابلہ میں کثیر الاشاعت ہونا ممکنات میں نہیں ہے، تاہم جو اخبارات اپنا سیاسی اثر و نفوذ و آواز رکھتے ہیں، وہ اپنی قلت اشاعت کے باوجود اپنا اعزاز و وقار رکھتے ہیں، اور وہ عزت و احترام سے پڑھے جاتے ہیں، اگرچہ اون کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے، چنانچہ یہ حیرت سے سنا جائیگا کہ کثرت اشاعت کے لحاظ سے اخبار ٹائمس کے مقابلہ میں اخبار "نیوز آف دی ورلڈ" میں باہم کوئی موازنہ نہیں کہ موخر الذکر ۳ ملین پرچوں سے بھی زیادہ چھپتا ہے، ہانہم

خود انگلستان میں ایسے لوگ نکلیں گے، جو "نیوز آف دی ورلڈ" کے نام سے آشنا نہ ہوں گے، لیکن ٹائمس کے سیاسی وقار و احترام کا یہ حال ہے کہ وہ زمانہ قدیم سے نہ صرف انگلستان میں بلکہ تمام اقطاع عالم میں شہرت عامہ رکھتا ہے، اور سمجھا جاتا ہے کہ اوس کی آواز انگلستان کے مدبرین اور وہاں کی رائے عامہ کی آواز ہے، حالانکہ اوسکی اشاعت چند ہزار سے زیادہ نہیں۔

اس لئے انگلستان میں جو اخبارات رائے عامہ کی تکوین کرتے ہیں وہ مالی اعتبار سے کسی بڑے منافع میں نہیں، کیونکہ اون کی تمامتر توجہ اونہی اہم امور کی جانب مرکوز رہتی ہے، وہ پبلک کی عام دلچسپی کا سامان فراہم کرنیسے قاصر رہتے ہیں، اسی طرح جو رسالے صحیح علمی و ادبی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، اون کی تعداد اشاعت بھی بہت تھوڑی رہتی ہے، اور اون کو مالی منفعت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے،

لیکن اب دشواری یہ پیش آگئی ہے کہ تجارتی اخبار و رسائل انگلستان پر اس استیلا کے ساتھ چھائے جاتے ہیں، کہ صحیح خدمت انجام دینے والے اخبار و رسائل کی زندگیاں دشوار ہوگئی ہیں، اور اب یہ مسئلہ انگلستان کے مفکرین کے سامنے اہمیت کے ساتھ پیش رہتا ہے، کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالا جائے، چنانچہ اخبار "اکنا مسٹ" اسی مسئلہ پر رائے زنی کرتا ہوا لکھتا ہے،

> "ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ ملک میں اخبار و رسائل کی بکثرت اشاعت ہو گئی اور صحافت نے ایک عمومی حیثیت اختیار کرلی ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ ہم ملکی مصالح اور وطن کی فلاح و بہبود کے لئے ایسے حدود و قوانین وضع کرنیکا مطالبہ کریں گے کہ ان تجارتی کمپنیوں کو ایسے اخبار و رسائل کی خریداری سے باز رکھا جاسکے، جو اس وقت ملک کی صحیح رہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں، کیونکہ اگر مالی دشواریوں کی وجہ سے ان اخبار و رسائل پر بھی ان کا استیلا ہوگیا تو ملک کی صحیح رہنمائی کا خاتمہ ہو جائے گا، جس کے بعد ہمیں سیاسی موت کا سامنا کرنا پڑیگا۔۔۔"

(باقی)

افسانوی محاضرات

حقیقت کی عینک

افسانہ

جناب مخزون چکسکوی

(۱)

صبح کا وقت تھا۔ اور میں ناشتہ سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ معاً مس شمیم کمرہ کے اندر داخل ہوئی۔ یہ پندرہ برس کی ایک حسین اور نوجوان عورت تھی۔ اور اس دیہات میں رہتے سہتے ہمیں ایک دوسرے سے محبت سی ہو گئی تھی۔ اکثر شمیم مجھے عالم وارفتگی میں نہ جانے کیا کیا کہہ جاتی۔ اور مجھے اس پر مجبور کرتی کہ ہم دونوں اس دنیا سے دور کسی رومانی دنیا میں کھو جائیں۔ مگر میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ اور اس صورت میں زندگی کیا بن جائے گی؟

چند دنوں سے میں ایک ایسی جماعت کا صدر بنا دیا گیا تھا۔ جس کا تعلق غریبوں کی زندگی سے تھا اور جس کا مقصد کسانوں اور مزدوروں کو ان تکالیف سے بچانے کیلئے جدوجہد کرنا تھا۔ جو انھیں بیباکہ کے تپتے ہوئے موسم اور برسات کے سیلاب زدہ مہینوں میں بھوک اور پیاس کے ذریعہ اٹھانی پڑتی ہے۔ اس دیہات میں کوئی دواخانہ نہیں تھا۔ اور نہ کوئی ایسا ادارہ تھا۔ جو ان کے مشکلات کو رفع کر سکتا۔

شمیم جب کمرہ میں داخل ہوئی، تو اس کے عطر آمیز بالوں کی خوشبو فضا میں گونج گئی، اور اس کی ساری کا آنچل ہوا کے جھونکے سے اڑ کر جوانی کی نمائش اس طرح کرنے لگا گویا اس کی دید سے انسانوں کو دیوانہ بنایا جا سکے، اس کی آمد نے میرے دماغ پر ایک نشیلی اور دیوانہ کن کیفیت طاری کر دی، اور میں قلم کو میز پر پٹخ کر اس کے نظارہ جمال میں کھو گیا۔

جوانی کتنی عجیب چیز ہے! اور پھر محبت!

اس نے سلسلۂ سکوت کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔ ظفر! میں اس موقع کو جو زندگی میں صرف ایک بار ہاتھ آئے۔ ضائع کر دینا نہیں چاہتی۔ چنانچہ آج میں نے اس کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ کہ ہم چند دنوں کے لئے کشمیر کی فردوس زار وادی میں اپنے رنگین لمحات گذارنے چلے جائیں۔ کیا تم میرے ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہو؟

شمیم کے اس غیر متوقع سوال نے مجھے کچھ

دیر کیلئے پریشان کر دیا اور میں نے اپنے جذبات کے راستہ میں چلتے چلتے ٹھہر کر اپنی عقل کا جائزہ لیا۔ ہمارے سامنے اس وقت زندگی کا سوال پیش تھا۔ اور وہ بھی بہت سے غریب اور فاقہ کش انسانوں کی زندگی کا۔ میرے لئے کم از کم یہ ناممکن تھا کہ میں ان لوگوں کو جنھوں نے میری حمایت کی پناہ لی ہے۔ زندگی کے اجاڑ میدان میں بے آسرا چھوڑ کر اپنی عارضی مسرت پر ان کے مفاد کو قربان کر دوں، مگر میرے لئے شمیم کی درخواست کو مسترد کر دینا بھی مشکل تھا۔ جس کی حسین اور مسرت آگیں معیت کے سامنے میں دنیا اور متعلقاتِ دنیا کو اکثر فراموش کر جایا کرتا تھا۔

کیوں تم میری باتوں کا جواب نہیں دیتے؟ شمیم نے میرے سکوت سے اکتا کر پھر سوال کیا میں اس پر غور کر رہا ہوں" میں نے کہا "کہ آیا مجھے تمھارے ساتھ چلنے کیلئے آمادہ ہو جانا چاہیے یا ان فرائض کی تکمیل کرنی چاہیئے۔ جو فی الحال ہمارے ساتھ وابستہ کر دئے گئے ہیں۔ تم نے تو یہاں کے غریب کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کا مطالعہ غالباً اچھی طرح کیا ہوگا؟ ان کی زندگی کتنی دردناک ہے!

یہ سب صحیح ہے! شمیم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ مگر محبت کرنے والا دنیا اور متعلقات دنیا سے اکثر بے نیاز ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ تو میں تم سے یہی توقع رکھونگی کہ تم دنیا کے موجودہ رخ کو یکدم فراموش کر دینے کی کوشش کرو۔ خواہ اس سے دنیا یا خود تمھاری ذات ہی کو کتنا عظیم نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ کیونکہ محبت تو نام ہی ہے۔ ایثار، قربانی، اور ذاتی نقصان کا۔

ایک عورت، وہ بھی حسین اور جذبہ شباب سے ساغر سیال کی طرح رنگین جب کسی نوجوان مرد کے نفسیاتی ساز کو اس طرح چھیڑنے لگتی ہے۔ تو اس کے لئے سوائے بہک جانے کے چارہ ہی کیا ہو سکتا ہے چنانچہ میں نے بھی زندگی اور حقیقت زندگی کو چند لمحے کیلئے بالکل فراموش کر کے، خواہشات وجذبات کی رو پر بہتے ہوئے اس سے کشمیر چلنے کا وعدہ کر لیا

شمیم کے چلے جانے کے بعد۔ میرے لئے اپنا مضمون مکمل کرنا مشکل ہو گیا جسے میں اس کے آنے کے قبل لکھ رہا تھا۔ خیالات متضاد کشمکش میں الجھ الجھ جاتے اور دماغ پریشان ہونے لگتا تھا چنانچہ میں ... ایک فائل کو میز کے دراز میں ڈال کر کمپاونڈ میں املی کے گنجان اور سایہ دار درخت کے نیچے بچھی ہوئی میز پر جا بیٹھا اور سگریٹ جلا کر اس کے دھواں سے کھیلنے اور خیالات کی دنیا میں گھومنے لگا۔ کبھی اپنی "نفسانی عجلت" کو ملعون کرتا۔ اور کبھی احتراز محبت کو مجرم قرار دیتا۔ یوں ہی کچھ دیر گذر گئی حتیٰ کہ ایک بوڑھی عورت نے دفعتاً درخت کے تلے اپنی لاٹھی کے جھنکار سے مجھے چونکا دیا۔ اور میں کچھ دیر کیلئے سب کچھ بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ ایک عجیب قسم کی بوڑھی عورت تھی۔ جو نہ جانے عمر کی کتنی طویل مسافت طے کر چکی تھی، اور کہنہ سالی کی وجہ سے اس کے چہرے کا خط و خال

قریب قریب مسخ ہو چکا تھا۔ اس کے بال برف کیطرح سفید تھے۔ اور اس کا جسم خشک چھوہارے سے زیادہ جھرّی دار تھا۔ وہ اپنی لاٹھی سے ٹیک لگا کر میری نشست سے محض ایک قدم کے فاصلے پر بیٹھ گئی اور لمبی لمبی سانس کھینچنے لگی۔

تم کون ہو؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔

میں ایک مسافر عورت ہوں، جو صرف اپنی سانس کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے دنیا کی گلیوں میں آوارہ ماری ماری پھرتی ہوں۔

صرف سانس کے سلسلہ کو قائم رکھنے کیلئے!

میں نے اس کے الفاظ کا اعادہ کیا۔ یہ تو کوئی بالغ خیال فلاسفر عورت معلوم ہوتی ہے۔ امیری حیرت کی حد نہ رہی اور میں بہت دیر تک تعجب انگیز انداز میں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے طرز و ادا سے استغنا اور تفکر کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

بوڑھی ماں! تم کہاں سے آتی ہو اور کہاں جاؤگی؟ میں نے بڑی لجاجت کے ساتھ اس سے استفسار کیا۔

یہ تو مجھے بالکل یاد نہیں ہے! اس نے لاپروائی کے ساتھ کہا۔ یا یہ کہ میں اُسے اپنے کوتاہ ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکی ہوں۔ کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ اگر میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو مجھے زندگی کے اس پر اضطراب اور پریشان کن راستے سے گذرنے کی ضرورت مطلق نہیں ہوتی۔ اور نہ میں یوں دنیا کی خاک چھانا کرتی۔

اس کی فلسفیانہ باتوں نے میرے دل میں اس کی جانب سے ایک خاص قسم کی شیفتگی اور گرویدگی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اور سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ یہ عورت ضرور کوئی بزرگ اور خدا رسیدہ ہستی ہے۔ چنانچہ اس خیال کے ماتحت میں نے اس سے اپنے مکان میں ٹھہرنے اور دعوت قبول کرنیکی درخواست کی مگر وہ اسپر رضامند نہ ہوتے ہوئے کہنے لگی میں کسی کی احسانمند بننا نہیں چاہتی۔ جو لوگ خدا اور ضمیر پر اعتماد رکھنا بھول جاتے ہیں۔ ان ہی کو غیر کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

الغرض جتنا میں اس سے قریب ہوتا جاتا تھا اس کی عظمت اور بزرگی مجھ پر اثر انداز ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ میں نے اس کے سامنے اپنے گھٹنے اس طرح ٹیک دئے جیسے کوئی نیا پجاری کسی کہن سال اور تجربہ کار مہنت کے آگے دوزانو ہو کر التجائیں کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ کم از کم اپنی حاصل کردہ روحانیت اور تجربات سے کچھ حصہ مجھے عطا کر دے۔ یا مجھ میں اس ذوق ......ر کا عنصر پیدا کر دے۔

بوڑھیا میری اس والہانہ عقیدت پر مسکراتی رہی اور پھر ایک لمبی جمائی لیکر بولی۔ کیا تو مجھے اپنی دانست میں کوئی دیوی سمجھتا ہے۔ جس کا سینہ روحانیت یا کشفِ علوم کا مخزن رہتا ہو۔

میں نے کہا۔ تمہاری باتوں سے تو ایسا ہی مترشح ہوتا ہے۔

اس نے کہا یہ تیری غلطی ہے۔ جو لوگ اپنی روح کا علاج نہیں کرتے۔ اور زندگی کی حقیقت کا راز معلوم کرنیکی کوشش نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کے متعلق ایسا ہی سوچا

کرتے ہیں بہرحال میں تجھے کچھ سمجھائے دیتی ہوں۔ تو اس پر عمل پیرا رہنا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پوٹلی کھول ڈالی۔ اور اس میں سے ایک رنگین تصویر نکالی جو ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ تصویر ایک حد درجہ دلکش اور حسین عورت کی تھی۔ جس کے رخسار سے کنول کو شرماتے تھے۔ اور جسکی بانکپن پر زندگی قربان کر دینے کو جی چاہتا تھا۔ اس نے تصویر دکھلاتے ہوئے کہا۔ کیا تو پہچان سکتا ہے۔ کہ یہ کس کی تصویر ہے ؟

میں اپنی یادداشت پر زور ڈالنے کے باوجود اس کی شناخت سے مجبور رہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے حیرانی کے لہجہ میں نفی میں جواب دے دیا۔

اس نے کہا۔ کیا تو یقین کر سکتا ہے کہ یہ تصویر اس بوڑھی کھوسٹ عورت کی ہو سکتی ہے۔ جو ترے سامنے بیٹھی ہے ؟ اور جسے اب دیکھنے کے بعد محبت کے بجائے نفرت ہی کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ دنیا کتنی پُرفریب اور عارضی ہے ! جو لوگ اس سے دل لگاتے ہیں وہ ایک دن اسی طرح فریب کھاتے ہیں۔ اگر میں اپنی جوانی کو فانی لذتوں کے پیچھے داغدار بنا لیتی۔ تو آج میری روح کی یہ تابناکی نہیں رہتی میرے بیٹا ! یہ دنیا ایک ہوشیار ممتحن ہے۔ جب انسان جوانی کے در پر پہنچ جاتا ہے۔ تو وہ اسکا امتحان لینا شروع کر دیتی ہے۔ اگر کسی نے علوم حیات کا اکتساب واقعی دل لگا کر کیا ہے تو وہ پاس کر جاتا ہے۔ اور جو آوارہ۔ وبدقماش لڑکوں کی طرح اس مقصد کو فراموش کر کے اپنی زندگی لہو ولعب میں گذار دیتا ہے۔ وہ آخر میں اسی طرح پچھتاتا ہے۔ جیسے بیکار اور لاطائل زندگی گذارنے والے لڑکے معاشی زندگی کا بار پڑنے کے بعد اپنی گذشتہ لاپرواہیوں پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ چنانچہ تجھے اسکا چشم دید سبق پڑھاتی ہوں وہ سبق جو میں نے بغیر کسی استاد کی مدد کے حاصل کیا تھا۔ اور غالبًا ہر انسان تھوڑی سی کوشش سے ایسا کر سکتا ہے۔ اگر وہ اسکا شوق رکھتا ہو۔ یا مستقبل کا خیال اس کے دماغ میں جاگزیں ہو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پوٹلی سے ایک چھوٹی سی مجلد کتاب نکالی۔ اور ایک ڈبیا سے ایک چشمہ برآمد کیا۔ جس کا شیشہ گندمی رنگ کا تھا۔ کمانی نیلے رنگ کی کسی دھات کی۔ اس نے کتاب کھولنے سے قبل پروقار مصلحانہ انداز میں کہا۔ اس کتاب میں ایک مسلسل مضمون کو آرٹ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اس میں وہی مناظر ہیں جنکو تو عام دنیا میں دیکھا کرتا ہے اور جن کی پرفریب رنگینیوں میں کھو کر تو حقیقت کو بھول جاتا ہے۔ لہذا تجھے حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھوں کو اس عینک کی مثال بنانا چاہیئے۔ اتنا کہکر اس نے کتاب مذکور کا پہلا صفحہ الٹ دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ آرٹ کا کتنا بہترین نمونہ تھا۔ عشق ومحبت، اور بوس وکنار کے میں نے بہت سے مناظر دیکھے تھے۔ مگر اس قسم کا ایک منظر بھی ابھی تک میری نگاہ سے نہ گذرا تھا ایک بے انتہا حسین مرد حسن کی ایک دیوی کے ساتھ مصروف بوس وکنار دکھایا گیا تھا۔ جیسے زرّیں تتلی گلاب

کی ہتی سے چمٹ کر گلشن کو رنگین بنا دیتی ہے۔ اسطرح اس تصویر نے اپنی خوبصورتی اور رعنائی سے میرے دل و دماغ کو مسحور و وارفتہ بنا ڈالا۔ چنانچہ میں نے اس نظارہ سے بیخود ہو کر کہا۔ بوڑھی ماں یہ تو اتنا نفیس آرٹ ہے جیسے چرا کر بھاگ جانے کے لئے دل چاہتا ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں بیرونی دنیا کے دلفریب نظاروں میں یوں ہی کھو جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر حقیقت کتنی تلخ ہوتی ہے۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے ذرا اس عینک کو اپنی آنکھوں سے لگا کر دیکھ!"

میں نے اس کی تعمیل حکم کرتے ہوئے جونہی چشمہ کو آنکھوں سے لگایا کہ معاً تصویر کا اصلی روپ بدلنے لگا۔ اور اس تصویر والی حسینہ کا چہرہ یکایک اتنا کریہہ اور خوفناک صورت میں تبدیل ہو گیا۔ کہ خود اسکا پرستار محبت اس نظارہ سے اُسے چھوڑ کر تصویر میں بھاگتا نظر آیا۔ اور اس کے ساتھ میں نے بھی دہشت کے مارے عینک کی کمانی آنکھوں سے کھینچ لی۔ اب تصویر پھر پہلے جیسی ساکت اور دلفریب نظر آرہی تھی۔ مگر اس خوبصورتی کے باوجود بھی اسیر نگاہ ہونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

دیکھا تو نے دنیا کی رعنائی کا حقیقی خط و خال

بوڑھیا نے مستفسرانہ انداز میں کہا۔

خدا پناہ میں رکھے، میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ یہ تو عجیب چیز ہے۔

اس اثنا میں بوڑھی عورت دوسرا صفحہ الٹ چکی تھی، اس میں وہی نوجوان مرد مجو تقلم کے ذریعہ محض عیش و نشاط میں دکھایا گیا تھا۔ شراب کا جام ارغوانی اس کے ہونٹوں سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ اور ایک طرف فرش زنگار پر کشمیر کی حسین چھوکریاں محو رقص تھیں، سازندے اپنے سازوں کو اس طرح بجاتے نظر آرہے تھے۔ گویا نغمۂ ناہید سے اپنا سر ملانا چاہ رہے ہوں۔ اس تصویر نے میری بصارت کو پھر تھوڑی دیر کے لئے اپنی طرف مائل کر لیا۔ مگر اسی بزرگ عورت کی ہدایت کے مطابق میں نے چشمہ لگایا ہی تھا کہ اس کی موجودہ دلفریبیاں تحلیل ہو گئیں۔ تختۂ رقص پر انسانی جسم کا کاسۂ استخواں ناچتا نظر آیا۔ سازوں کے سب تار ٹوٹ گئے اور اس سے دھواں سا نکلنے لگا شراب کا پیالہ انسانی کھوپڑی میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس سے کوئی بدنما اور نجس چیز گرتی نظر پڑی ساتھ ہی تصویر والا نوجوان ہیرو گھبرا کر بھاگتا اور چیختا دکھائی پڑا۔ میں نے عینک آنکھوں سے ہٹا لی۔ اب مجھ میں ایک دلچسپ روحانی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ اور میں تیسری تصویر کے دیکھنے کے لئے مضطرب تھا۔ بوڑھیا نے تیسرا صفحہ الٹا وہی نوجوان قیمتی سکوں اور اشرفیوں سے بھری ہوئی کشتی ہاتھوں پر اٹھائے نشۂ دولت میں سرشار جھومتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے، غریب، بھوکے پیاسے، اور ننگے انسانوں کا ایک زبردست ہجوم تھا۔ جس میں سے ہر شخص اپنی زندگی کی حالت زار کی طرف آہ و فغاں کے ذریعہ اس کی توجہ کو منعطف کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ان کی جانب سے خود کو اندھا اور بہرا بنائے اپنی راہ چل رہا تھا۔ اس نظارہ نے میرے دل میں افسوس کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اور میں نے اس نوجوان کی انسانیت کشی کا نتیجہ معلوم کرنے

کے لیے بدستور چشمہ آنکھوں پر چڑھایا، تصویر میں حسب معمول تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ اُن مفلس اور بدنصیب انسانوں کی آنکھوں سے اشک کا سیلاب جاری ہوگیا۔ اتنا زبردست وخوفناک سیلاب جو سمندر ہی میں اکثر آتا ہے۔ اس سیلاب کی رو پر وہ انسان بہنے لگا۔ اس کے زر وجواہر کی کشتی غرق سیلاب سرشک ہوگئی۔ اور وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوکر ایک بے بس اور درماندہ انسان کی طرح آہ و بکا کرنے لگا۔ میں نے بوڑھی عورت کے حسب ہدایت چشمہ اتارا اور چوتھی تصویر کو دیکھنے لگا۔ اس میں بھی وہی نوجوان ایک عالیشان عمارت میں عیش و نشاط سے ہم آہنگ دکھلایا گیا تھا۔ مگر پھر عینک لگانے کے بعد عمارت آگ میں جلتی نظر آئی اور وہ شخص اس میں جھلستا معلوم ہوا۔ الغرض اس عورت نے اس کتاب اور عینک کے ذریعہ حقیقت کے بے شمار نظارے دکھائے۔ حتیٰ کہ ایک تصویر کے سوا کتاب کی کل تصاویر ختم ہوگئیں گویا اب صرف حقیقت کا نتیجہ دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ یہانتک کہ یہ تصویر بھی نظر کے سامنے آگئی اس میں خلاف معمول وہی سابق نوجوان مرد اپنی طرز زندگی کو تبدیل کئے دکھایا گیا تھا وہ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے بال بڑے بڑے ہوگئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی پہلے کی طرح دلکش نہیں رہا تھا۔ اس کے حرص۔ غرور نخوت کے تمام جذبات فنا ہوچکے تھے۔ عشرت و دولت کے خیال کو اس نے دل سے دور کر دیا تھا۔ وہ اب مخدوم نہیں رہا تھا۔ بلکہ خادم خلق بن چکا تھا۔ کہیں ایک صادق فرزند کی طرح وہ کسی بوڑھی عورت کے پاؤں دبا رہا تھا۔ تو کہیں ایک لائق انسان .... کی طرح وہ کسی غریب آدمی کو سہارا دیے چلا جا رہا تھا۔ کہیں عیش و عشرت کی محفل سے دور گرداں لوگوں کو ہدایت کرتا نظر آرہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ گو بادی النظر میں یہ زندگی بے کیف افلاس زدہ اور نفرت آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا انجام کیا ہے اسے بھی تم آخری بار چشمہ لگا کر دیکھ لو۔ چشمہ لگایا تو دیکھتا ہوں کہ وہ نوجوان آب ماہتاب سے زیادہ حسین نظر آرہا ہے۔ اس کے جسم پر عام انسانی لباس سے مختلف ایک عجیب وغریب قسم کا لباس ہے۔ جو شاید اس دنیا میں نایاب کہا جا سکتا ہو۔ کہیں رنگین پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ تو کہیں چشمہ کا شفاف پانی فردوس جیسی کوئی وادی ہے۔ فضا روح کی وجدانی کیفیتوں سے سرشار ہے۔ فضا پر حسین پریاں محو رقص ہیں جنکے پروں سے پھول جھڑتے ہیں اور ان کی ... پر راز زندگی "حقیقت زندگی" مسرت اور اطمینان کے الفاظ منقوش ہیں اس نظارہ سے میری روح میں ایک انشراحی اور وجدانی کیفیت پیدا ہوگئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی غیر مرئی روح میں تبدیل ہوتا جا رہا ہوں، بوڑھی عورت نے آنکھ سے خود عینک کھینچ لی۔ اور میں اس نظارہ کے چھوٹ جانے پر کمال مغموم چند لمحوں تک کسی خیال میں مستغرق رہا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس نظارہ میں خود کو کھو ڈالوں حتیٰ کہ زندگی کی شام ہو جائے۔

دیکھی تم نے زندگی کی حقیقت بوڑھی عورت نے مجھے اسطرح چونکا دیا۔ جیسے کوئی دلچسپ خواب سے چونکا دیا جاتا ہو۔ لوگ جسے حقیقت کہتے ہیں وہ

حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت پس منظر پوشیدہ ہے جو چیز اس دنیا میں تکلیف دہ ہے اسی کا انجام دوسری دنیا کے لئے راحت بخش ہے۔ تو بھی اس کو اپنا لائحۂ عمل بنا جیسے اس نوجوان نے صدہا ٹھوکریں کھانے کے بعد اختیار کیا ہے۔ اتنا کہہ کر عورت نے کتاب اور عینک کو پوٹلی میں باندھ ڈالا اور استادہ ہو کر چلنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ میں نے بیخودی کے عالم میں اسکا پاؤں پکڑ لیا۔ اور اس سے کچھ اور بتانے کے لئے منت وسماجت کرنے لگا۔

"کتنا احمق انسان ہے" بوڑھیا گرج کر بولی"

"جو سبق تجھے ابھی پڑھا دیا گیا ہے۔ وہ تیرے لئے کافی ہے۔ اسی کو یاد کرکے تو اپنی زندگی سدھار سکتا ہے زیادہ کی ہوس بیکار ہے"۔ میں اس کے انداز کلام سے مرعوب ہو کر ساکت ہو گیا۔ اور بوڑھیا سڑک پر اپنا قدم اٹھاتے ہوئے نظر سے یکایک اوجھل ہو گئی۔ اور میں اپنا سر پکڑے گھنٹوں اس جگہ بیٹھا رہ گیا۔

(۲)

میری زندگی میں عجیب تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ شفق کی رنگینیاں، وادی کی دلفریبیاں، زندگی کے ہنگامے عیش ونشاط کی محفل۔ دنیا اور دنیا کی فریب دہ پالیسیاں دولت اور سرمایہ کا خیال، عورت اور عورت کا حسن غرض ہر چیز مجھے حزن زدہ کر دیا کرتی تھی۔ اور حقیقت کی عینک کے مانند اسکا نتیجہ میری آنکھوں تلے کھنچ جاتا تھا۔ آبشار کا پانی ناچتا چٹانوں سے ٹکراتا گذر جاتا شفق دریا کو لالہ زار بنا دیتی تتلی پھولوں پر ناچا کرتی کبھی کسی کی درد بھری راگنی فضا میں گونج کر میرے دل کے جذبات کو منتشر و پراگندہ کر دیتی۔ تاہم میں دیوانہ کی طرح ساکت اور بیخود کسی خیال میں سب کچھ کو بھلائے کسی خاص تصور میں مستغرق رہتا۔ یونہی صبح سے شام گذر گئی اور بیشمار نظارے آنکھوں تلے گذرتے رہے۔ حتیٰ کہ رات ہوئی اور رات کے ساتھ شمیم بھی شمیم کی طرح اپنی عطر بیز خوشبوؤں کو پھیلاتی میرے کمپاؤنڈ میں آگئی۔ میں ایک کرسی پر پڑا بدستور زندگی کی حقیقت پر غور کر رہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میرے جسم سے لپٹ کر محبت بھرے الفاظ میں بولی۔ میں نے اپنے والدین سے کشمیر جانے کی اجازت لے لی ہے اور صبح کی گاڑی سے چلنا ہے۔ تمہیں جلد سے جلد تیار ہو جانا چاہئے۔

اس کے جسم کا مس اس کی باتوں کی شیرینی آج میرے جسم وخیال میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکی، اور اسے میں بے پرواہ انداز میں اس طرح تکتا رہا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتا ہو۔

کیوں جی تم کوئی جواب نہیں دیتے اس نے میرا شانہ زور سے جھنجھوڑتے ہوئے پھر کہا۔

نہیں نہیں تمہاری فرمائش کی تعمیل سے قاصر ہوں۔ میں نے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کہا کیونکہ اب میں اپنا ارادہ بدل چکا ہوں۔ ارادہ کے ساتھ میرا لائحۂ عمل میری زندگی بھی بدل گئی ہے۔ میری آنکھوں سے حجاب اٹھ گیا ہے اور سود وزیاں میں تمیز کرنے لگا ہوں۔

میں اس کا مطلب نہیں سمجھتی اس نے حیرت سے

...ہ استفسار کیا۔

اسکا مطلب یہی ہے کہ تمہیں اپنے دامن کو
...اہ کے دھبوں سے داغدار بنانا نہیں چاہیئے۔
...بت گناہ نہیں ہوسکتی"

"مگر شہوت ہوسکتی ہے۔ جو عورت شادی شدہ
...و اور شوہر رکھتی ہو اسے محبت کرنے کا کیا حق حاصل ہے"

"شادی یا نکاح محبت کو روک نہیں سکتی۔"

"مگر اسے جذبات کی بدعنوانیوں اور گندگیوں
سے روک سکتی ہے۔ شمیم اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں
اپنے شوہر سے جدائی حاصل ہے۔ مگر اس کی جدائی میں
صرف ایک سال بسر کر دینا اپنے کو آسودہ کرنے سے بدرجہا
بہتر ہے"

خلاف معمول میرے اس طرز کلام سے اسکی
حیرت کی حد نہیں رہی۔ اور اس نے ملتجیانہ انداز میں
کہا۔ میرے پیارے ظفر! میں نہیں کہہ سکتی کہ تم ایسا کہتے
ہوئے مجھے آزمانا چاہتے ہو۔ یا میری محبت کو ٹھکراتے ہو؟

نہ میں تمہیں آزماتا ہوں نہ تمہاری محبت کو ٹھکراتا
ہوں۔ بلکہ میں نے آج زندگی کی حقیقت پر غور کر لیا ہے
اور میری آنکھیں اس مختصر عرصہ میں اتنی روشن اور تیز ہوگئی
ہیں جو وقوع سے پہلے نتائج کو دیکھ لیتی ہوں۔

آہ! ظفر! ایسا کہہ کر تم میری محبت کو پامال
نہ کرو۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ مجھے تم سے پاک محبت ہے۔ میں
تمہارے واسطے شوکت (اس کے شوہر کا نام) کو خیرباد
کہہ سکتی۔ دنیا اور دنیا کے تعلقات کو ٹھکرا سکتی ہوں۔ مگر
تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔

اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں صلاح دوں گا کہ تم
حقیقت سے محبت کرو۔ اگر آج تم میرے لئے اپنے شوہر
کو ٹھکرا سکتی ہو تو کل کسی غیر کے لئے مجھے بھی ٹھکرانے پر آمادہ
ہو جاؤ گی شباب کو جذبات کے رو پر غلط طور سے مت
بہاؤ! کیونکہ ایسی صورت میں ایک دن تم پر ایسا آئے گا
جب دنیا تمہیں پامال کرنا پسند کریگی۔ لہذا تمہارے
لئے بہتر یہی ہے کہ تم خود ہی دنیا پر لات مارنے میں
پیشقدمی کر جاؤ۔

اس وعظ و پند کا مطلب میں نہیں سمجھ سکتی۔ اگر
تم مجھ سے محبت کرنا نہیں چاہتے تو صاف الفاظ میں کیوں
نہیں کہہ دیتے۔ اس نے قدرے رنجیدہ لہجہ میں کہا۔

تم اس طرح نہیں سمجھتیں تو ایسا ہی سمجھ لو۔

اچھا ظفر! اس کا نتیجہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہوگا
اس نے تہدید آمیز طور پر اس جملہ کو پورا کرتے ہوئے اپنے
گھر کا رُخ کیا۔ نہ جانے اسوقت اس کے جذبات کیا تھے؟
مجھے اس کے متعلق سوچنے کی ذرا بھی فرصت نہ مل سکی اور
میں اپنے موجودہ خیالات میں بحر غرق ہوگیا۔ میرا دل بار
بار اپنے پہلو سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میرا دماغ مختل ہو رہا
تھا۔ میرے حواس پر دیوانگی کے جذبات طاری ہو رہے
تھے۔ اور میں اپنے کپڑے پھاڑ کر کہیں دور افق میں تحلیل
ہو جانا چاہتا تھا۔ الغرض ساری رات میری یوں ہی
بے چینی میں گذری نہ جانے صبح کو کیسے آنکھیں لگ گئیں۔
صبح بیدار ہو کر چائے کی ایک پیالی اور بسکٹ کے چند
ٹکڑے زہر مار کر کے میں اپنی لائبریری میں چلا گیا۔ میز پر
صبح کی تازہ ڈاک سے آئے ہوئے مختلف خطوط

پڑے ہوئے تھے۔ اس وقت میری طبیعت ان خطوط کو پڑھنے یا کسی کتاب کو دیکھنے کو مطلق نہیں چاہتی تھی تاہم میں نے دل بہلانے کی خاطر میز پر سے ایک لفافہ اٹھا کر چاک کر ڈالا اور اسے پڑھنے لگا۔ یہ خط میرے ایک دوست کا تھا۔ جو "بنو تھیٹریکل" کمپنی میں ایک کامیاب ایکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا تھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

پیارے ظفر!

چونکہ تمہیں ایکٹر بننے کا شوق بہت زیادہ رہا ہے اس لئے میں نے کمپنی کے ڈائرکٹر سے سفارش کر کے تمہارے لئے اجازت حاصل کر لی ہے۔ تم اس خط کو پاتے ہی فوراً کلکتہ پہنچ جاؤ۔

میں نے بجائے مسرت کے ایک قسم کا غم محسوس کرتے ہوئے مذکورۂ بالا خط کو میز پر ڈال دیا۔ اور پھر دوسرا خط پڑھنے لگا۔ یہ ہمارے ایک دوست کا خط تھا جو ۔۔۔۔۔۔ میں ایک لکھ پتی سیٹھ کے ہاں بطور منیجر ملازمت کر رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

مائی ڈیر ظفر!

اگر تمہیں سیٹھ پنا لال کے یہاں ملازمت کرنے کی خواہش ہو تو تم یہاں چلے آؤ۔ ایک جگہ خالی ہے۔ اور میں نے اُسے تمہارے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ سود کی لین دین کا جو ڈیپارٹمنٹ ہے اس میں نگراں کی حیثیت سے تمہیں کام کرنا ہو گا۔ اور اس کام کو کسطرح فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اس کی پالیسی پر غور کرنا ہو گا۔ مشاہرہ ڈھائی سو روپے ماہوار ملیگا

اور تمہارے رہنے کے لئے ایک علیحدہ کوٹھی بھی ہو گی۔

میں نے اس کے بعد تیسرا لفافہ چاک کیا۔ یہ ہمارے ایک مہربان رئیس کا خط تھا۔ جو گورنمنٹ کے وفادار دوست سمجھے جاتے تھے۔ اور جن کو اس اعزاز میں سر کا ٹائٹل بھی ملا تھا۔ انھوں نے اپنے مراسلہ میں تحریر فرمایا تھا۔

محترم سلام نیاز

گورنمنٹ کو ایک ایسے قابل اور باعتماد شخص کی ضرورت ہے۔ جو تقریر اور تحریر کے ذریعہ گورنمنٹ کی طرف سے یہاں کے اقوام میں جذبۂ وفاداری کی اشاعت کا پروپیگنڈا کرے اور ان میں اختلاف پیدا کرنے کی پالیسی کو بروئے کار لائے۔ میں نے گورنمنٹ کو آپ کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ آپ کی ذات پر مجھے اعتبار حاصل ہے۔ لہذا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گورنر صاحب آپ سے ملاقات کرنے اور اس امر پر تبادلہ خیالات کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ آپ فوراً ہمارے یہاں تشریف لائیں۔

الغرض اس روز کے کل خطوط قریب قریب اسی قسم کی مادی منفعت بخش چیزوں سے لبریز تھے۔ انہیں ختم کر لینے کے بعد میں نے کرسی سے ٹیک لگا کر سوچنا شروع کیا۔ اب سے قبل میں معمولی آمدنی یا نوکری کے لئے کتنا پریشان رہا کرتا تھا۔ بلکہ میں اس کے حصول کے لئے اپنی بڑی سے بڑی قربانی بھی پیش کرنے کے لئے آمادہ تھا لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔ مگر آج جب اُس خدا رسیدہ ہستی نے میرے مادی جسم کو روحانیت سے منور کر دیا۔ اور میری آنکھوں سے بے بصری کا حجاب اٹھا دیا۔ تو دنیا کی تمام مسرتیں میرے قدم چومنے کے لئے خود بخود حاضر

ہوگئیں۔ دنیا حقیقتاً کتنی فریبی اور مکار ہے جسے اسکی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کی خوشامد کرتا ہے وہ اسے ٹھکراتی ہے۔ مگر جو اسے ٹھکرانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے پاؤں پڑتی ہے۔ صرف اس لئے تاکہ وہ اس کی گمراہ کن مسرتوں کی تکمیل کرنے سے انکار کر رہا ہے؟ اور ایسے موقع پر دنیا کو اسے اپنا بنانے کی ضرورت ہے۔ خواہ اس کی دوستی کتنی ہی قیمت پر کیوں نہ حاصل ہوئی ہو؟ مگر اس بوڑھی عورت نے اس قیمت کا راز مجھ پر اچھی طرح منکشف کر دیا ہے اور اب میں اتنا بیوقوف نہیں رہا ہوں کہ دنیا کی اس قیمت پر انسانیت، ضمیر، اخلاق، صداقت، پاکیزگی نفس، اور روحانیت کو فروخت کر دوں مجھے یہ چیزیں ہرگز نہیں چاہئیں مجھے تو وہ چاہیئے جو میں نے حقیقت کی عینک سے کتاب ہستی کے آخری صفحہ پر دیکھا ہے۔ الغرض اسی خیال کے ماتحت میرے جسم میں ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا اور میں نے مستقل ارادہ کے ساتھ ان ذرائع دولت و منفعت پر نفرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے قلم اٹھایا اور ان دوستوں و کرم فرماؤں کو ایک ہی مضمون کے مختلف خطوط لکھ ڈالے۔ اب میری زندگی بدل گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ میری زندگی کی پالیسیوں میں بھی فرق رونما ہوگیا ہے۔ چنانچہ اب میں حق، انسانیت، اور فریب نفسی کی قیمت پر کوئی ملازمت یا حصول معاش کا ذریعہ پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لئے براہ کرم آپ مجھے اس سے معاف رکھیں۔

(۳)

میری زندگی میں انقلاب کا دور شروع ہوا اور بڑھتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری روحانی خلش اور اضطراب میں بھی سکون پیدا ہوگیا۔ کیونکہ میں اپنی زندگی کو اس فرشتہ سیرت عورت کی ہدایت کے مطابق تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اور اس کامیابی نے جہاں میری روح کو روشن کر دیا تھا وہاں مجھ میں عمل سرگرمی، اور خدمت انسانی کا جذبہ بدرجۂ اتم پیدا کر دیا تھا۔ میری زندگی حقیقت کے قریب آگئی تھی۔ اور میں حق و باطل اور علت و معلول کو سمجھنے لگا تھا۔ چراغ کی تابناک اور خوبصورت لَو کو اگر میں دیکھتا تو کسی نادان کی طرح اسے مس کر کے اپنی انگلیاں نہیں جلاتا۔ شہد کی شیرینی سے محظوظ ہونے کے لئے مکھی کی طرح اس سے چمٹ نہیں جاتا بلکہ میں اسے معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ روشنی کے پیچھے کیسی تاریکی ہے۔ شیرینی کے بعد کتنی تلخی۔ اور زر و جواہر کے عقب میں کس درجہ انسانیت کشی، اور روحانیت کشی چنانچہ میں زندگی کے ان تمام محاذوں پر زبردست جنگ کرتا رہا۔ جہاں باطل کی چھاؤں رہی تھی۔ مجھے دنیوی لذت کے خلاف اپنے نفس اپنے دل پر شدید جبر کرنا پڑا۔ سنگدل اور ظالم سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سہے۔ پیسے پیسے کے لئے خود کو محتاج بنا ڈالا۔ ماریں کھائیں جیل گیا۔ الغرض حقیقت کی منزل پر پہنچنے کے لئے تمام تکالیف اور صعوبتیں جھیلیں اور رفتہ رفتہ خود کو وہاں پہنچا کر رہا۔ اب میری زندگی ایک سکون اور روحانی راحت سے ہم آغوش ہو رہی تھی۔ جب میں نے کسانوں

اور مزدوروں کی جماعت کو افلاس اور غلامی کے چنگل سے نجات دلا دی۔ جب میں نے سینکڑوں مصائب بھری زندگی کو پاکیزگی کے راستہ پر لگا دیا۔ جب میں نے خدمت خلق کے ذریعہ اپنے مقاصد حیات کو پورا کر دیا تو میں محسوس کرنے لگا کہ میں وہی نوجوان بن گیا ہوں جسے میں نے اس بوڑھی عورت کی کتاب میں دیکھا تھا۔

اس درمیان میں میرے دوسرے دوست مجھ پر ہنستے رہے۔ وہ مجھے احمق اور نادان کے نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیجا اور غلط طرز زندگی کے ذریعہ انسانیت کو دھوکا دے کر وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا۔ جو زمانہ گذشتہ میں میرے قدموں پر بھی نچھاور ہونے آیا تھا مگر میں نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ مسلمہ امر ہے کہ دنیا سنوارنے کے لئے دولت و عشرت کامیاب شے ہوتی ہے۔ آج وہ کامیاب تھے ان کے پاس ساغر رنگین بھی تھا۔ اور محبوبہ گلعذار بھی۔ مگر میرے پاس غریب انسانوں اور مزدوروں کی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ تھی۔ یا خشک روٹیاں۔ اسطرح ہماری زندگی گذرتی رہی حتیٰ کہ ایک دن ہمارے مآل کار کی منزل نزدیک آگئی۔ قدرت حقیقت کے انکشاف کا دنیا میں ایک دن مقرر کرتی ہے اور یہ دن ہر اس دور کے آخر میں آتا ہے۔ جب دنیا باطل کے راستہ کی تکمیل کر لیتی ہے گویا یہ انسان کی عملی آزمائش کا دن ہوتا ہے۔ حقیقت انکا امتحان لیکر کامیاب شدہ اشخاص کو اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ اور ناکام لوگ مایوس و نامراد زندگی گذارنے کے لئے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک پر بھی یہی دور آیا جب حقیقت کا پردہ الٹ گیا اور یہاں کے ہر ہر فرد کو انکے عمل کا واضح نتیجہ دکھایا جانے لگا۔ گورنمنٹ کے ظالمانہ اور انسانیت کش طرز حکومت کا تختہ [illegible] الٹ چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسکے تمام معاونین کے گردنوں میں ننگ وطن و ننگ قوم کا تمغہ لعنت ڈال دیا گیا۔ سرمایہ داری و زمینداری کے دفن کرنے کیلئے خندقیں منہ کھولے کھڑی تھیں سیٹھ پنا لال جو کبھی ہمارے آقا بننے والے تھے آج [illegible] کے سیلاب میں بہہ رہے ہیں اور انکے سود کا کاروبار کے منیجر کے منہ پر تھوکا جا رہا تھا۔ اور میرے کرم فرما سرکار کے وفادار دوست لوگوں کے خوف سے اپنی جان چھپاتے پھرتے تھے۔ ہمارا "نیو تھیٹریکل" کمپنی کا ایکٹر دوست اپنی بدچلنی کی وجہ سے قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ اور مجھے اپنی نفس پرستی پر قربان کرنے والی مس شمیم اپنی جوانی کو کھو کر اور اپنی زندگی کو داغدار اور سرمایہ معصیت بنا کر در در کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ مگر ان ہی لمحات میں یہ حقیر ظفر اپنے کو حق کے راہ میں پائمال کر کے مسرت و نیک نامی کے انعام حاصل کر رہا تھا۔ اس کی گردن پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ "آزادیٔ وطن" اور روحانیت کے ترانے اُسے مسحور بنا رہے تھے۔ اور وہ صفحہ ہستی پر اس بامراد نوجوان کی طرح کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جو کبھی حقیقت کی عینک ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

نقد سودا

از

جناب خواجہ عنایت اللہ صاحب اسیر سیاسی سنٹرل جیل ہری پور

بہانہ تو صرف ایک بیگہ زمین اور وہ بھی غیر آباد اور بنجر زمین کا تھا۔ مگر بنائے فساد افضل خاں اور شیر احمد خاں کی ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ اس ایک بیگہ کے لئے خواہ پورا موضع کیوں نہ بک جائے۔ مگر مونچھ اونچی رہنی چاہئے۔ پٹھان کی بہادری پر بل نہ آئے۔ خاندانی وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ رعیت اور اسامیوں پر بہادری کا سکہ جما رہے۔ اور دستر خوان پر بیٹھنے والے خوشامدی خان صاحبان کو شیر شاہ سوری سے کم بہادر اور منتظم نہ کہہ سکیں۔ صرف اسی وجہ سے افضل خاں اور شیر احمد خاں جو ایک ہی علاقے کے دو معمولی زمیندار تھے ایک بیگہ زمین کی خاطر ایک دوسرے سے فوجداری پر آمادہ ہو گئے۔

افضل خاں اپنے ملازموں اور چند کرایہ کے بھوکے نوجوانوں کو ساتھ لیکر اس زمین کے ٹکڑے پر اپنا قبضہ ثابت کرنے کے لئے ہل چلانے کو پہونچا۔ شیر احمد خاں بھی چھوٹے باپ کا بیٹا نہ تھا۔ اس کی رگوں میں بھی پٹھانی خون مصاحبوں کی حرکت گرچہ افیون اور چانڈو کے استعمال سے سست پڑ چکی تھی پھر بھی آباؤ اجداد کی بہادریوں کے افسانوں سے جوش میں آیا۔ اور اس ایک بیگہ زمین کو اپنی مملکت کا ایک قلعہ سمجھکر غنیم کے حملے کی مدافعت کو وقت پر پہنچ گیا۔ بس پھر کیا تھا دونوں کمانڈر موقع کی نزاکت اور آنے والے مقدمہ کی پیش بندی کے خیال سے اپنی اپنی فوج کو انعام واکرام کے وعدے کر کے رفو چکر ہو گئے۔ بیچ کے ملازم اپنی روزی کے وسیلے کو قائم رکھنے کے لئے اور بیکار نوجوان کچھ دن پیٹ بھر روٹی ملنے کی امید پر ایک دوسرے کے مقابل تن گئے۔ امارت کی مشین کے پرزے آپس میں ٹکرائے اور اپنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر کرنے کے لئے اپنا اور اپنے ہی جیسے غریبوں کا خون استبدادیت کی دیوی پر بھینٹ چڑھانے پر تیار ہو گئے ایک بھوکا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے بھوکے انسان کا گلا کاٹنے لگا۔ لاٹھی چلی۔ ایک دو گنڈاسے بھی کام میں لائے گئے۔ کسی کا سر پھوٹا کسی کے ہاتھ میں چوٹ لگی شیر احمد خاں کے دو ملازموں کا گرنا تھا کہ گرنے والوں کے ساتھی خون دیکھکر اور مارنے والے پولیس کے ڈر سے ایک دو تین ہو گئے۔ موقع پر صرف دو نیم برہنہ لاشیں خاک خون میں تڑپتی ہوئی رہ گئیں۔ خطرے کا وقت گذر جانے کے بعد چوکیدار نے نزدیک کے تھانے میں اطلاع درج کرائی اور دو گھنٹے کے بعد علاقے کے حفظ و امن کے مالک یعنی پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی۔ مجروح

ہسپتال پہنچائے گئے۔ مگر پولیس اور خان صاحب کے سودے میں اتنی دیر ہو گئی کہ اُن میں سے ایک تو دیر سے طبی امداد پہنچنے کی وجہ سے ہسپتال پہنچتے پہنچتے مر گیا۔ اور دوسرا علاج کے لئے یا سرکاری کاغذات کی خانہ پری کے لئے ہسپتال کے ایک کمرے میں ڈال دیا گیا۔ اور کیوں نہ ڈال دیا جاتا۔ وہ غریب تھا۔ اُس کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ اس کی بھوکی بیوی اور ننگے بچوں کے سوا جن کے پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی خاطر وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ اُس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ غریب ہونے کی وجہ سے وہ زمین کی پیٹھ کا ایک بوجھ تھا۔ اسکے دشمن چاہتے تھے کہ وہ مر جائے کیونکہ اسکے طاقتور ہاتھوں نے کئی ایک کا سر پھوڑا تھا۔ اور اُس کا مالک بھی جسکی امارت کے محل کی تعمیر اُس کے اور اُس جیسے سیکڑوں غریبوں کے خون اور ہڈیوں سے ہوئی تھی چاہتا تھا کہ اُس کا قصّہ ختم ہو جائے تاکہ اُسکا مقدمہ اور مضبوط ہو جائے۔

پولیس نے بھی اپنا فرض نہایت خوبصورتی سے نباہا۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ ڈائری میں بلوے کے مقدمہ کا اندراج بھی ہو گیا۔ مرنے والے کا آخری بیان بھی قلمبند ہو گیا۔ شہادتیں بھی درج ہوئیں تحقیقات مکمل کی گئی۔ قاتل گرفتار ہوئے اور سات آدمیوں کا چالان ہو گیا۔ مگر یہ سات کون تھے۔ افضل خاں کا ایک چچیرا بھائی جو خاص مصلحت سے۔ باقی ملزموں کا منہ بند رکھنے کے لئے رکھا گیا۔ ایک گماشتہ اور بستی کے پانچ دوسرے غریب نوجوان۔ ان پانچوں کو نہ تو شیر احمد خاں سے کوئی دشمنی تھی نہ شیر احمد خاں کے آدمیوں سے کوئی بیر۔ ہاں بیگاری سے بیگاری بھلی کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی بستی کے زمیندار کی حکم عدولی کی طاقت نہ رکھتے ہوئے بلوے کے دن موقع واردات پر موجود ضرور تھے۔ اور جب لاٹھی چلی، خون میں جوش آ گیا۔ جوانی کے دیوانہ پن نے آگا پیچھا نہ سوچنے دیا۔ شاباش بہادروں کی للکار نے اپنے اور غیر کے فائدے کی تمیز بھلا دی۔ پھر کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کس کی لاٹھی نے کس کا سر پھوڑا اور کس کے گنڈاسے نے کس کی جان لی، ہاں معلوم ہوا تو کئی گھنٹوں کے بعد پولیس کے تجربہ کار آفیسر کو جس نے قاتلوں کو چُن چُن کر گرفتار بھی کر لیا۔ اور سب ملزموں کے خلاف چشم دید شہادتیں بھی فراہم کر لیں۔ اور کمال تو یہ ہے کہ دونوں زمیندار بھی خوش رہے۔

(۲)

مکان کے کھنڈر بتا رہے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ عظیم عمارت تھی۔ مگر آجکل اس کے در و دیوار سے غربت اور حسرت ٹپک رہی ہے۔ شکستہ دیواریں اور ٹوٹی ہوئی چھتیں زبان حال سے مکینوں کی مفلسی کا رونا رو رہی تھیں۔ شائد کبھی اس گھر کا ہر گوشہ مصرف میں لایا جاتا ہو مگر آجکل تو گھر بھر میں ہو کا عالم ہے۔ شام ہو چلی ہے اس ویرانے کے ایک کونے میں ایک عورت جس کے حسن و جمال اور خوبصورتی پر بھوک، دکھ اور غربت نے ایک گہرا پردہ ڈال رکھا ہے۔ دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے کسی گہرے سوچ میں بیٹھی ہے۔ چند ماہ کا ایک بچہ اس کی چھاتی سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش میں ناکام ہو کر رو رہا ہے اور ایک مس سے

ہار روتے روتے تھک کر اس کے پاس ہی زمین پر سو گیا ہے۔ ارد گرد کے گھروں سے اُٹھتا ہوا دھواں بتا رہا ہے لوگ شام کا کھانا پکانے میں مشغول ہیں۔ اور اُس کی آنکھیں بھی اپنے سامنے چولہے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ چولہے کے پاس جنگل کی خشک لکڑیاں بھی پڑی ہیں۔ دھلے دھلائے مٹی کے برتن بھی رکھے ہیں مگر چولہے پر پکانے والی کوئی چیز اندر موجود نہیں۔ اُسکا شوہر منگلی خاں (شائد اُسکا کوئی اور نام بھی ہو مگر دنیا اُس کو اسی نام سے جانتی ہے) آج صبح سے بابو افضل خاں کے کسی کام پر باہر گیا ہوا ہے۔ اس لئے آج اُس کو یقین ہے کہ اُس کی واپسی پر اسکی تین شام کا روزہ ضرور افطار ہوگا۔ اور آج رات کو اُس کا دودھ پینے والا بچہ بھوک سے نہ روئے گا۔ اور بڑے لڑکے کو بھی پیٹ بھر کھانا میسر ہو جائیگا۔ آنے والی دل خوش کن گھڑی کی یاد نے اُسکے مرجھائے ہوئے اور بھوک سے سوکھے ہوئے چہرے پر ہلکی سی مسرت کی جھلک نمایاں کر دی۔ اور اسی جھلک کو منگلی خاں کے داخلے نے مسکراہٹ سے بدل دیا۔ وہ دوڑ کر دن بھر کے تھکے ہوئے شوہر کا استقبال کرنے کو آگے بڑھی۔ جس نے فاتحانہ انداز سے کھانے کا سامان اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کی گود سے بچے کو لے لیا بچہ جو اب خاموش ہو چکا تھا باپ کی گود میں جاکر مسکرانے لگا

منگلی ۔ ۔ "حامد کہاں ہے"

رحیمن ۔ ۔ وہ گیا سو رہا ہے، بڑی ضد کر رہا تھا۔ دوپہر کو ایک پیسے کا ستو کھانے کے بعد بھی اور مانگتا تھا"

منگلی اس کے بعد کوئی سوال نہ کر سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ آج اس کی بیوی دن بھر فاقے سے رہی ہے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور جلدی جلدی بیوی کے ساتھ مل کر کھچڑی پکانے میں مشغول ہو گیا۔ اسی دوران میں وہ دن بھر کے واقعات بھی بیان کرتا گیا۔ کہ کس طرح وہ اور اس کے ساتھی بابو صاحب کے حکم سے ایک کھیت پر قبضہ کرنے گئے، اور وہاں شیر احمد خاں کے آدمیوں سے فوجداری ہو گئی۔ اور کس طرح اس فوجداری میں نہ جانے کس کے گنڈاسے کی ضرب سے دو آدمی مجروح یا شائد مقتول ہوئے۔

کھانا پک کر تیار ہو گیا۔ رحیمن حامد کو جگا رہی تھی کہ دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ کسی نے منگلی خاں کو تحکمانہ لہجے میں پکارا۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر پولیس کے دو سپاہی مکان میں گھس آئے۔ پولیس کو دیکھکر رحیمن سکتے میں آ گئی۔ اس کی بھوک ختم ہو گئی وہ سب کچھ سمجھ گئی اور پیشتر اسکے کہ وہ اپنے شوہر سے کچھ کہے یا اس کا شوہر اس کو دلاسہ دے اور حوصلہ رکھنے کی تلقین کرے پولیس کے سپاہیوں نے اُس کو ہتھکڑیاں پہنا دیں اور کھینچکر لے چلے۔ اس وقت کے منظر کا صحیح نقشہ نہ تو کسی امیر کے دماغ میں آسکتا ہے اور نہ کوئی مدعئ قلم ہی اتار سکتا ہے منگلی کا حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بھوکی اور بے سہارا بیوی کو دیکھنا۔ بیوی کا میاں کی بیچارگی اور بے بسی کے خیال سے سکتہ کے عالم میں ہونا۔ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کا ڈراؤنا خواب میاں پر آنے والی خوفناک مصیبتوں کا خیال معصوم حامد کا سپاہیوں سے ڈر کر ماں کے پاؤں سے لپٹنا۔ ننھے بچے کا بے سمجھی میں باپ کی

گود میں جانے کے لئے ہاتھ پھیلانا۔ اور سخت دل ہیا ہوں کا جن کے دل آئے دن ایسے واقعات کے عادی ہونے کی وجہ سے انسانی محبت کے جذبات سے خالی ہو جاتے ہیں تشدد سے منگی خاں کو کھینچنا۔ یہ سب کچھ چند منٹوں میں ختم ہو گیا۔ ابھی چولہے میں آگ جل ہی رہی تھی۔ کھچڑی پک کر تیار ہو چکی تھی اور کھانے والا یا دوسرے لفظوں میں کھلانے والا قتل کے جرم میں پولیس کی حراست میں جا چکا تھا

(۳)

بارہ برس کی مدت منگی خاں نے جیل میں کسطرح کاٹی۔ اس کے جذبات میں کیا کیا تلاطم آئے۔ اس کے خیالات میں کسطرح کی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کی خودداری کو کتنی ٹھیس لگی۔ وہ اپنی نادار بیوی اور بے سہارا بچوں کے لئے کسقدر تڑپا۔ جس بیوی اور بچوں کے بھوکے معدوں کی سلگتی ہوئی آگ بجھانے کی خاطر اُسنے اپنی زندگی کا بہترین حصہ جیل کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔ اُنکی یاد میں اُس نے کتنے آنسو بہائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ زندہ تھا۔ گرچہ بارہ برس کے بعد نوجوان منگی خاں بوڑھا منگیا ہو کر جیل سے نکلا تھا۔ جیل کے پھاٹک سے باہر نکلتے ہی اُسکو اپنی دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔ جس طرح آج سے بارہ برس پہلے اس پھاٹک میں داخل ہوتے وقت اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اسی طرح آج پھر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کے دل میں ایک سوال اٹھتا تھا۔ کہ اس کی پیاری بیوی کس حال میں ہو گی۔ اُسکے بچے اب کتنے بڑے ہو چکے ہوں گے۔ اس کی عدم حاضری میں

اگر افضل خاں نے جس کے ادنیٰ اشارے پر اُس نے اپنی دنیا اجاڑ لی تھی اُن کی مدد نہ کی ہو گی تو اُن کی زندگی کیسے کٹتی ہو گی۔ وہ کہاں سے کھاتے ہوں گے کون اُن کو سردی سے بچنے کے لئے کپڑا خرید کر دیتا ہو گا ان سب سوالوں کے جواب پانے کے لئے وہ سخت بیتاب تھا۔ اور اسی بیتابی میں وہ اپنے گاؤں کی طرف بھاگا۔ گرچہ رات ہو چکی تھی اور اس کا گاؤں وہاں سے تیس میل پر واقع تھا۔ مگر جیل کی جفاکش زندگی نے اُسے محنت اور تکلیفیں برداشت کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ راستہ بھر چلا۔ اور سورج نکلتے نکلتے وہ گاؤں جس میں اُس نے اپنی بادشاہت یعنی بچپن کا زمانہ گذارا تھا۔ اس کو نظر آنے لگا اس گاؤں کے درختوں۔ پگڈنڈیوں اور کچی دیواروں میں اُس کے لئے ایک کشش تھی۔ وہ ان تنگ اور گندی گلیوں میں پھر ایک بار گھومنا چاہتا تھا۔ بارہ برس ایک پختہ چار دیواری کے اندر قید رہنے کے بعد اسی کھلی فضا میں وہ پھر ایک بار آزاد پرندے کی طرح اُڑنا چاہتا تھا۔ اس کے پست اور مرے ہوئے حوصلے اس کی ٹوٹی ہوئی امیدیں۔ اس کے دُکھی دل کے ایک کونے میں پھر زندہ تھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آج پھر اپنی اجڑی ہوئی دنیا کو آباد کرنے جا رہا تھا۔ اُس کو اپنے شباب کے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب وہ اور اس کی خوبصورت جوان بیوی غربت کے باوجود ہر روز عید اور ہر شب شب برات منایا کرتے تھے۔

آج ابھی صبح ہوئی تھی۔ بستی کے غریب محنت اور مزدوری کرنے والے کھیتوں پر جا چکے تھے۔ کچھ بچے گلیوں

میں کھیل رہے تھے۔ جن میں سے کسی کو بھی وہ نہیں پہچانتا تھا۔ اس لئے گھر پہنچنے تک اُس کو کوئی ایسا آدمی نہ ملا جس سے وہ اپنی غیر حاضری کے ایام کا فسانہ سُن سکے وہ جلدی جلدی چلتا ہوا ایک جگہ پر جا کر رُک گیا۔ اور تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنے حافظے پر زور ڈالنے لگا۔ تاڑ کے درخت۔ تنگ گلی۔ اِدھر اُدھر پھوس کے مکانات اور اس کے بعد کھلا میدان سب چیزیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ مگر اس کے مکان کی جگہ پر اینٹوں اور مٹی کے ڈھیر کو دیکھ کر اس کے دل کی حرکت رُکنے لگی۔ سر چکرایا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر اس ڈھیر کے پاس بیٹھ جانے پر مجبور ہو گیا۔ نہ جانے وہ کن خیالات میں کھو گیا۔ اُس کی خیالی امید دں کا قلعہ جس کو وہ غلطی سے غربت کی ریتلی بنیاد پر تعمیر کر رہا تھا۔ حقیقت کی ایک ہی ٹھوکر سے دھما کے کیساتھ گر پڑا۔ وہ اپنے مستقبل کی خیالی دنیا کو چھوڑ کر پھر ماضی کی یاد میں غرق ہو گیا۔ اور نہ جانے کبتک اسی حالت میں رہتا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی

"کون؟ بھیا منگلی خاں۔ تم کب آئے؟ جیل سے کب چھوٹے؟"

منگلی کے جذبات میں اپنی پڑوسن کو دیکھ کر پھر ہیجان پیدا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر ابھی تک اس کے دل میں امید کی ایک کرن باقی تھی وہ جلدی جلدی واقعات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بڑھیا کے سوال کا جواب دیئے بغیر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اپنے مکان کے ڈھیر کی طرف نگاہ کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کچھ بول نہ سکا۔ بوڑھی پڑوسن اُس کی تر آنکھوں اور اترے ہوئے چہرے سے اُس کا سوال اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے اسکے پاؤں سے اپنا جواب سمجھکر بولی۔

"بھیا۔ اٹھو۔ میرے گھر چلو۔ منہ ہاتھ دھو کر کھاؤ پیو تمہارے دوست بھی اب کھیت سے آتے ہی ہونگے۔ وہ تم کو............"

"بھابی اب مجھ میں زیادہ انتظار کی طاقت نہیں میری تباہی کی کہانی کہہ ڈالو۔ اور خدا کے لئے جلدی کہہ ڈالو۔ کہاں ہے میری بیوی۔ میرے بچے کیا ہوئے میرا گھر کس طرح اُجڑ گیا"

منگلی نے یہ الفاظ ایسے دردناک لہجے میں کہے کہ اُس کی پڑوسن کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اور وہ اپنی آنکھیں ساڑھی کے میلے آنچل سے پونچھتی ہوئی بولی

"بھیا منگلی۔ صبر سے کام لو تم کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ بے چاری رحیمن خدا جانے آج کل کہاں ہے۔ تمہارے مقدمہ کے دوران تک تو افضل خاں اسکو کھانے کو بھیجتا رہا۔ لیکن جس دن اُس کا چچیرا بھائی جو تمہارے ساتھ ہی مقدمہ میں ماخوذ تھا۔ بری ہو گیا۔ اور تم لوگوں کو سزا ہو گئی۔ اُس دن کے بعد اُس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کہ رحیمن اور اس کے بچے کسطرح فاقہ سے تڑپ رہے ہیں۔ غریب محلہ والے حتی المقدور مدد کرتے رہے۔ اور برے بھلے دن گذرتے ہی رہے۔ اُسی سال کے جاڑے میں تمہارا بڑا لڑکا حامد بیمار پڑا۔ اس کی پسلی چلنے لگی۔ غیور رحیمن پہلی اور آخری

دفعہ افضل خاں کے گھر گئی۔ تمہاری وفاداری اور اپنے بچے کی بیماری کا حال سنا کر اسی سے مدد کی بھیک مانگی نہ جانے اُسنے کیا جواب دیا اور کیا کہا۔ آخر بچہ صرف علاج نہ ہونے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ مگر رحیمن پھر افضل خاں کے گھر نہ گئی۔ حالانکہ کئی دفعہ اسنے بلانے کو اپنی دائی بھی بھیجی اور ایک دفعہ خود بھی آیا۔ حامد کے ماتم اور ننھے کی پرورش میں دو برس اور بھی گذر گئے۔ اب ننھا بھی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے دکھی ماں کا دل بہلانے لگا۔ حامد کی یاد بھولنے لگی کہ یکایک زلزلہ آیا۔ زمین اپنی پیٹھ پر بیٹھا رہونے والے گناہوں کی سزا کے خوف سے کانپی عالیشان محلوں میں رہنے والوں کو بھی ایک بار خدا یاد آگیا۔ مگر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسا۔ تمہارا بوسیدہ مکان اس کی شدت کو برداشت نہ کرسکا۔ اور اپنے اندر اپنے دونوں مکینوں کو لئے ہوئے بیٹھ گیا۔ دوسرے دن ننھے کی لاش اور سخت جان رحیمن زندہ مگر مُردوں سے بدتر نکالی گئی۔ ہوش آنے پر وہ بالکل خاموش رہنے لگی۔ نہ بچوں کے لئے روتی۔ نہ مکان کی تباہی کا ذکر کرتی۔ اور نہ تمہاری ہی یاد کا واویلا مچاتی۔ ہر روز شام کے بعد اسی کھنڈر کے چاروں طرف گھومتی رہتی۔ کبھی دوڑنے لگتی۔ کبھی بیٹھ جاتی۔ کبھی جھک کر کسی خیالی بچے کو گود میں اٹھاتی۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی کو گلے سے لگا رہی ہے۔ کبھی ساڑھی کے پلو سے اپنا چہرہ اسطرح چھپا لیتی جیسے نئی نویلی دلہن شوہر سے شرماتی ہے۔ اور ایک رات جبکہ وہ اس طرح کی حرکتیں کر رہی تھی۔ بابو صاحب کے ایک نوکر نے اس کے نزدیک آکر اُس سے کچھ کہا اور وہ اس کے پیچھے بابو صاحب کے مکان کی طرف چلدی۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے جمن دوساد کی بیوی نے صرف اتنا سُنا کہ بابو صاحب کا نوکر یہ کہتا ہوا جا رہا تھا کہ۔

" ہاں وہ شام سے آیا ہوا ہے۔ اور تم کو تلاش کر رہا ہے "

اس کے بعد رحیمن کو کسی نے گاؤں میں نہ دیکھا۔ بابو صاحب اور اس کے نوکر نے دریافت کرنے پر اس واقعہ سے صاف انکار کر دیا۔ گرچہ کئی آدمیوں نے رحیمن کو بابو صاحب کے باہر والے مکان میں داخل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مدد کے لئے پکار بھی سُنی مگر ایک غریب کے لئے ایک امیر کو جھٹلانے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی مگر تھا۔۔۔"

منگلی خاموشی سے سب کچھ سُن رہا تھا۔ مگر اب وہ برداشت نہ کرسکا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور ایک لفظ بولے بغیر کسی مصمم ارادے کے ماتحت افضل خاں کے گھر کی طرف مڑا۔

" کہاں چلے منگلی بھیا " پڑوسن نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا:

" ذرا اپنے مہربان افضل خاں سے دو باتیں کرنے " منگلی نے بغیر رکے ہوئے جواب دیا۔

" ذرا ٹھہرو " پڑوسن نے بڑھکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا " میری کہانی ختم تو ہو لینے دو۔

" نہیں اب مجھے اور کچھ سننے کی ضرورت نہیں "

منگی نے اپنے غصہ کو دباتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کہانی کی تکمیل میری ناشاد زندگی کے ڈرامے کے ایک آخری ہولناک سین کی محتاج ہے۔"

"مگر تم افضل خاں کو کہاں پاؤ گے۔ وہ اب یہاں نہیں رہتا،" بڑھے نے کہا۔

"کیا کہا۔ کیا وہ میرے انتقام کی آگ سے ڈر کر میرے آنے کی اطلاع پاکر پہلے ہی کہیں چلا گیا ہے۔ مگر اب وہ کہاں جائے گا۔ میں اپنی زندگی کی آخری تمنا پھانسی کے پھندے سے جھولنے کے پہلے ضرور پوری کروں گا۔"

"ذرا صبر سے کام لو۔ اور میری کہانی کا دوسرا باب بھی سن لو۔ تب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مظلوموں کی آہ ظالموں کو کس طرح جلا کر فنا کر دیتی ہے۔ اسی مقدمہ کے لئے افضل خاں نے رام نگر کے بنیا سے دو ہزار روپے قرض لئے تھے۔ وہی قرض اس کے لئے وبال جان ہو گیا۔ اُسی کی خاطر بنئے اور افضل خاں میں مقدمے شروع ہوئے دیوانی اور فوجداری کے لگاتار مقدموں نے افضل خاں کو مفلس قلاش بنا دیا۔ اور آخر نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ بنئے نے اُس کا سب کچھ نیلام کرا لیا۔ اور وہ کھانے کھانے کو محتاج ہو کر اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے ایک رشتہ دار کے گھر پہنچا کر کہیں چل دیا۔ وہ افضل جو کبھی یہ سمجھتا تھا کہ وہ صرف دنیا میں عیش کرنے اور حکومت کرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور جس کے خیال میں غریبوں کے دل جذبات سے خالی اور غریبوں کی عصمت کی کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔ سنا ہے کہ آجکل شہر میں رکشا کھینچتا ہے۔ اس کا بڑا لڑکا تین سال ہوئے ڈاکہ کے جرم میں گرفتار ہو کر جیل کی ہوا کھا رہا۔ اُس کی جوان لڑکی رام نگر کے بابو کے گھر میں پہلے دائی کی حیثیت سے مگر حاملہ ہو جانے کے بعد داشتہ کی حیثیت سے رہتی ہے۔ اس کی بیوی کو جو کبھی گاؤں کی مالکن کہلاتی تھی تم تھوڑی دیر میں اپنی گلیوں میں تقریباً برہنہ دیوانہ وار گھومتے ہوئے دیکھو گے۔"

منگی نے مدتوں کے بعد اطمینان کی ایک سانس لی۔ اور اس کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے۔

"یہ سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے"

اس دن کے بعد کسی نے منگی کو بھی گاؤں میں نہیں دیکھا گیا کہ رہنے والے قبرستان کو جاتے ہوئے ریلوے پل کے نیچے اکثر ایک نیم پاگل عورت اور ایک میلے کچیلے چیتھڑے لگائے بوڑھے مرد کو بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں۔ میں نے ایک دن اُس بوڑھے کو یہ کہتے ہوئے سُنا۔

"رحیمن صبر کرو۔ خدا نے ہمارے ظلموں کا بدلہ لے لیا ہے۔ اور اس طرح اُس کی زبردست لاٹھی جس میں بظاہر آواز نہیں ہے۔ ظالموں کا سر کچلتی رہتی ہے۔"

؎ بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

محبّ وطن غدّار

از
جناب سیّد اصغر علی صاحب سکندرآبادی

پیڈرن کے چھوٹے سے گاؤں میں جو ملک گیلیشیا میں تھا تقریباً ۱۸۰۸ء میں ایک شخص کاگارشیار نام کا رہتا تھا اس کی عطاری کی دوکان تھی اس کیساتھ فال نکالنے کیلئے مینڈک، سانپ اور مینھہ کا پانی بیچا کرتا تھا۔ وہ غالباً اس نامور آدمی کی اولاد میں سے تھا جس نے ایک گھونسے میں سانڈ کو مار ڈالا تھا۔

موسم خزاں کی ایک سرد اور تاریک رات تھی آسماں پر گھنے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس خوفناک رات کے تقریباً دس بجے چند پرچھائیاں پارڈیز کے کاگارشیا کے دواخانہ کی طرف بڑھیں جو ٹھیک ½ ۹ بجے سے بند تھا۔

"ہم کیا کریں!" پرچھائیوں میں سے ایک نے گیلیشیا زبان میں کہا۔

"کسی نے ہم کو نہیں دیکھا ہے" دوسرے نے کہا۔

"ہم کو کواڑ توڑ دینے چاہئیں!" ایک عورت نے تجویز پیش کی۔

"اور ان کو مار ڈالو!" تقریباً پندرہ آدمیوں کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔

"عطار کو میں اپنی نگرانی میں رکھوں گا!" ایک لڑکا چلّایا۔

"ہم سب اس کو دیکھیں گے!"

"اس کے یہودی ہونے پر!"

"فرانسیسوں کی طرفداری کرنے پر!"

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ آج میں ... سے زیادہ فرانسیسی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں!"

"دراصل مجھے اس کا یقین ہے! وہ جانتے ہیں کہ ہم یہاں محفوظ ہیں۔ لیکن اب وہ ایک جھگھٹ میں پھنس گئے ہیں!"

"آہ۔ اگر یہ میرے گھر میں ہوتے! میں تین کرایہ داروں کو کنوئیں میں پھینک چکا ہوں!"

"میری بیوی نے تو کل ایک کو قتل کر دیا!"

"اور میں" ایک فقیر نے بھدّی آواز میں کہا "میں نے دو کپتانوں کا دم ان کی کوٹھری میں کوئلہ سلگا کر گھونٹ دیا!"

"اور یہ نامعقول عطّار ان کو پناہ دیتا ہے!"

"وہ کل کس قدر مؤدب تھا جب کہ ان کیلئے

برادری سے خارج لوگوں کے ساتھ گھوم رہا تھا!"

"اسے کس نے پارڈیز کا گارشیا خیال کیا ہوگا؟ ایک مہینہ بھی نہیں گزرا کہ وہ گاؤں کا سب سے زیادہ دلیر۔ سب سے زیادہ محب وطن اور سب سے زیادہ بادشاہ پرور تھا!"

"ہاں اس نے شاہزادہ فرڈیننڈ کی تصویریں اپنی دوکان میں کس طرح فروخت کیں!"

"اور اب وہ نپولین کی تصویریں بیچتا ہے!"

"وہ ہم کو حملہ آوروں کے خلاف اپنی حفاظت کے لئے ابھارا کرتا تھا ——"

"اور جب سے وہ پیڈرن آئے ہیں ان کے ساتھ مل کر سازش کر رہا ہے!"

"اور آج رات وہ سب سرداروں کو دعوت دیتا ہے!"

"سنو وہ کیسا شور مچا رہے ہیں! یہ اچھا ہے کہ وہ یہ نہیں چیخ رہے ہیں کہ خدا شہنشاہ کو سلامت رکھے!"

"صبر کرو" فقیر بڑبڑایا "ابھی بہت سویرا ہے!"

"ان کو خوب شراب پی لینے دو!" ایک بوڑھی عورت نے کہا "تب ہم داخل ہوں گے —— اور ایک بھی زندہ باقی نہ بچے گا!"

"میں کہتا ہوں کہ عطار کے ٹکرے ٹکرے کر ڈالو!"

"اس کے آٹھ ٹکرے کر دو۔ اگر تم چاہو! فرانسیسیوں کا ہمدرد فرانسیسی سے زیادہ قابل نفرت ہے —— فرانسیسی ایک غیر ملک کو پامال کرتا ہے۔ فرانسیسیوں کا ہمدرد اپنے وطن کو بیچتا ہے اور اس کی بےحرمتی کرتا ہے۔ فرانسیسی دوسرے کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے فرانسیسیوں کا طرفدار اپنی ماں کو قتل کرتا ہے!"

ادھر عطار کی دوکان کے دروازے پر یہ سوانگ ہو رہا تھا ادھر وہ اور اس کے مست ساتھی خوش خوش اپنے گھر میں کھانیں بے انتہا محو تھے

وہ بیس فرانسیسی تھے جنھیں دوا فروش نے اپنے دستر خوان پر مدعو کیا تھا اور وہ سب کے سب عہدہ دار اور افسر تھے۔

پارڈیز کا گارشیا پینتالیس سال کا تھا۔ وہ لمبا اور ممی سے زیادہ زرد تھا۔ اس کی پیشانی گردن کی گدی تک پہنچی تھی۔ خدا بھلا کرے چمکتے ہوئے گنجے پن کا کہ اس کے چاروں طرف کچھ کچھ چمک تھی۔ اس کی خواب آلود سیاہ سیاہ آنکھیں بغیر گوشت کے گڑھوں میں دھنسی ہوئی ان جھیلوں کی مانند تھیں جو پہاڑوں میں گھری ہوئی ہیں

کھانا کثرت سے تھا۔ شراب عمدہ۔ گفتگو دلچسپ اور پرجوش۔ فرانسیسی ہنسے۔ قسم کھائی خدا اور مذہب کی توہین کی۔ گایا۔ سگریٹ پیا۔ کھایا اور پیا۔ سب کے سب ایک ساتھ۔

ان میں سے ایک نے نپولین کے درپردہ تعشق کی داستان سنائی۔ دوسرے نے میڈرڈ کے ۲ مئی کی رات کا قصہ دہرایا۔ اور ایک نے اہرادل کی لڑائیوں کے متعلق کچھ کہا۔ اور ایک پولیس شاہزدہم کے بارے میں کچھ بڑبڑایا۔

پارڈیز کے گارشیا نے شراب پی۔ ہنستا رہا

دوسروں کی طرح بے تکلف گفتگو کرتا رہا یا شاید ان سے زیادہ اور وہ شاہی کے حق میں اس قدر رطب اللسان گفتار تھا کہ سینز کے سپاہی اس کو گلے سے لگا لیتے۔ واہ واہ کرتے اور اس کی شان میں قصائد پڑھتے تھے۔

"وہ جناب" عطار نے کہا "لڑائی جو ہم ہسپانوی آپ کے خلاف لڑ رہے ہیں اسی قدر لغو ہے جتنی کہ ناحق ہے۔ آپ سلطنت کے فرزند اسپین کو اس کی روایتی ذلت سے نکالنے۔ اس کو نقصان سے نجات دلانے۔ مذہبی تاریکی کو دور کرنے، فرسودہ رسم و رواج کو بہتر بنانے اور ہمیں ان مفید اور مسلم صداقتوں کی تعلیم دینے کے لئے آئے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ زندگی کے بعد کوئی روح نہیں ہے۔ توبہ۔ روزہ داری۔ پاکیزگی اور دوسرے عام اوصاف بے سروپا بیہودگیاں ہیں جو ایک مہذب انسان کے لئے غیر مناسب ہیں اور نپولین حقیقی مسیح ہے جو انسانوں کو نجات دلانے والا ہے اور بنی نوع انسان کا دوست ہے۔ جناب شہنشاہ خدا کرے اس وقت تک زندہ رہے جیسا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ رہے"

"واہ واہ! شاباش!" فرانسیسی چلائے

عطار نے اپنی پیشانی ناگفتہ بہ اضطراب کے عالم میں جھکا دی۔

جلد ہی اس نے پیشانی کو پہلے کی طرح مضبوطی اور سکون سے اٹھا لیا۔ اس نے شراب کا ایک جام پیا اور اس طرح گویا ہوا۔

میرے ایک بزرگ نے جو ایک پارڈیز کارگارشیا۔ ایک وحشی۔ ایک ملاح۔ اور ایک بہت مضبوط آدمی تھا۔ ایک دن میں دو سو فرانسیسی قتل کر دیئے تھے ——— میرا خیال ہے کہ یہ اٹلی کا واقعہ ہے وہ میری طرح فرانسیسیوں پر فریفتہ نہ تھا! اس نے بڑی بہادری سے لڑائی میں سلطنت گراناڈا کے حبشیوں سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ ہسپانوی بادشاہ نے خود اسے بہادری کا خطاب دیا۔ اور وہ اٹلی میں ایک مرتبہ سے زیادہ محافظ بنا۔ اس وقت پاپائے اعظم الکزنڈر بورجیا پوپ تھا۔ او ہو آپ نے خیال نہیں کیا کہ میرا خاندان کس قدر بہادر ہے۔ اس پارڈیز کے گارشیا نے جو میرا جد امجد ہے ——— جس کی اولاد میں ایک عطار ہوں ——— کوسینز ا اور میں وِنڈینیا کو فتح کیا۔ حملہ کر کے سیری نولا میں داخل ہو گیا اور پیویا کی لڑائی میں شاندار کارنمایاں کئے۔ وہاں ہمنے فرانس کے بادشاہ کو جس کی تلوار تقریباً تین صدی میڈرڈ میں رہی گرفتار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ تین ماہ کا عرصہ ہوا کہ وہ ہم سے چھین لی گئی۔ اس لڑکے نے لے لی جو آپ کے کمروں پر آتا ہے اور جسے آپ جورات کہتے ہیں۔"

یہاں دوا فروش ایک مرتبہ اور رکا کہ کچھ فرانسیسی اسے جواب دینے کی خواہش کرتے ہوئے معلوم ہوئے لیکن اس نے کھڑے ہوتے اور اپنے انداز خاموشی کو تمام پر ایک رعب سا ڈالتے ہوئے ہلا کر ایک گلاس اٹھا لیا اور بجلی کی تڑپ کی طرح چلایا

"صاحبان! میں آپ کی صحت کا جام پیتا ہوں اور میرے جد پر لعنت ہے کیونکہ وہ ایک وحشی تھا اور اب وہ دوزخ کی گہرائیوں میں ہے

خدا کرے کہ فرانس اول اور نپولین بونا پارٹ کے فرانسیسی بہت دنوں تک زندہ رہیں!"

"وہ لوگ بہت دنوں تک زندہ رہیں!"

حملہ آوروں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور سب نے اپنے اپنے گلاس خالی کر دیئے!

اسی درمیان میں انھوں نے گلی یا غالباً دوکان کے دروازہ پر شور و غل سنا۔

"کیا تم سنتے ہو" فرانسیسیوں نے پوچھا

پارڈیز کا گارشیا مسکرایا۔

"وہ مجھے قتل کرنے آئے ہیں" اس نے کہا

"کون"

"میرے پیڈرن کے پڑوسی"

"کیوں"

"اس لئے کہ میں فرانسیسیوں سے ہمدردی کرتا ہوں چند راتوں سے انھوں نے میرے مکان کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ لیکن اس میں ہم سے کیا اختلاف ہے؟ ہمیں اپنی دعوت جاری رکھنی چاہیے"

"ہاں بسم اللہ کیجئے" مست لوگ چلائے "ہم یہاں تمہاری حفاظت کیلئے موجود ہیں"

اور گلاس سے گلاس ٹکرانے کی بجائے وہ بوتل ٹکراتے ہوئے ایک ساتھ چلائے "نپولین بہت دن زندہ رہے! فرڈی نند کو موت آئے! گیلبیشیا کا خاتمہ ہو جائے!"

پارڈیز کے گارشیا کو یقین تھا کہ جام صحت انھیں بالکل ساکت کر دے گا اور وہ سنجیدہ لہجہ میں بولا۔

"کیلی ڈونیا!"

کلرک نے دوکان میں گھسنے کی ہمت نہ کرتے ہوئے اپنا زرد اور خوفزدہ چہرہ ایک دروازہ سے نکالا

"کیلی ڈونیا۔ کاغذ اور دوات لے آؤ" عطار نے اطمینان سے کہا۔

لڑکا لکھنے کا تمام سامان لیکر آیا

"بیٹھ جاؤ" اسکے آقا نے کہا "اب ان ہندسوں کو لکھتے جاؤ جو میں تمھیں بتانے والا ہوں۔ ان کو دو کالم میں تقسیم کرو۔ سیدھے ہاتھ کالم کے اوپر خرچ لکھو اور دوسرے کالم کے اوپر آمد"

"جناب" کلرک کپکپایا "دروازہ پر شور ہو رہا ہے۔ وہ چلا رہے ہیں کہ غدار کو موت آئے اور وہ دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں"

"چپ رہو اور انھیں بکنے دو! لکھو جو میں بتاتا ہوں"

فرانسیسی اس وقت دوا فروش کو حساب درست کرنے میں مشغول دیکھکر تعجب و خوشی سے مسکرائے جب کہ موت اور تباہی اس کے گرد منڈلا رہی تھی کیلی ڈونیا نے اپنا سر اٹھایا اور اعداد کو لکھنے کیلئے اپنا قلم تیار کیا۔

"صاحبان دیکھئے" پارڈیز کے گارشیا نے اپنی میز پر بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ پتہ چلتا ہے کہ تم میری ہر ایک شراب کے

گلاس سے دعوت جاری رکھنے میں مدد کرو۔ ہمیں میز پر نشست کی ترتیب میں شروع کرنا چاہیئے۔ تم کپتان مجھے بتاؤ کہ تم نے جب سے بری نیز کو عبور کیا ہے کتنے ہسپانویوں کو قتل کیا ہے؟"

"کیا خوب! شاندار خیال!" فرانسیسی چلائے۔

"میں نے" مخاطب کئے ہوئے آدمی نے اوپر کو بیٹھتے ہوئے اور اپنی مونچھوں کو شوخی سے کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے قتل کئے ہیں۔ ذاتی طور سے۔ اپنی ہی تلوار سے ـــ اوہ۔ دس بارہ لکھ لو۔"

"ٹھیک ٹھیک گیارہ!" دوافردش نے کلرک سے چلا کر کہا۔

کلرک نے لکھنے کے بعد دہرایا۔

"خرچ گیارہ"

"اپنا کام کیجئے" میزبان نے کہا "اور آپ نے ایم۔ جولی ایس؟"

"میں نے چھ!"

"اور تم نے سردار؟"

میں نے بیس!"

"میں نے آٹھ!"

"میں نے چودہ!"

"میں نے ایک بھی نہیں!"

"مجھے معلوم نہیں ـــ میں نے تو اندھادھند گولیاں چلائیں!"

بس ہر ایک نے جوں ہی کہ اس کا نمبر آیا جواب دیا اور کلرک سیدھے ہاتھ پر اعداد لکھتا رہا۔

"کپتان۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے" پارڈیز کے گارشیا نے کہا "ہم پھر آپ ہی سے شروع کرتے ہیں۔ یہ قیاس کرتے ہوئے کہ لڑائی تین سال تک جاری رہیگی آپ باقی لڑائی میں کتنے ہسپانوی قتل کرنے کی امید کرتے ہیں؟"

"اوہ!" کپتان نے کہا۔ "اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔؟"

"تخمینہ لگائیے" میں آپ سے استدعا کرتا ہوں۔

"گیارہ اور لکھ لیجئے!"

"بائیں طرف گیارہ" پارڈیز کے گارشیا نے حکم دیا اور کیلی ڈونیا نے دہرایا۔

"آمد گیارہ!"

"اور آپ؟" دوافردش نے اسی ترتیب سے پوچھا جیسا کہ اس نے پہلے عمل کیا تھا۔

"میں پندرہ!"

"میں بیس!"

"میں ایک سو!"

"میں پینسٹھ!"

فرانسیسیوں نے اس طرح جواب دیا۔

"کیلی ڈونیا۔ ان سب کو دس کے نیچے لکھو ـــ"

دوافردش نے طنزیہ کہا "اب دونوں کالموں کو علیٰحدہ علیٰحدہ جمع کردو!"

غریب نوجوان جس نے اعداد اپنے بہت زیادہ پسینہ کے قطروں کے ساتھ ساتھ لکھے تھے۔ بوڑھی عورت کی طرح اپنی انگلیوں پر جوڑنے کے لئے مجبور تھا۔ اسکو

موت اسقدر زیادہ تھا۔

ایک ہیبتناک خاموشی کے وقفہ کے بعد اس نے اپنے آقا سے کہا!

"حزیج دوشو پچاسی ۔ آمد دوسو"

"یعنی یہ کہنا چاہیئے" پارڈیز کے گارشیا نے کہا، چارسو پچاسی مظلوم"

اور اس نے ان الفاظ کو اس قدر عمیق اور زوردار آواز سے ادا کیا کہ فرانسیسیوں نے ڈر کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اسی درمیان میں عطار ایک دوسرا احساب قائم کررہا تھا۔

"ہم غازی ہیں!" وہ اس کو ختم کر کے چلایا۔ "ہم نے ستر بوتلیں پی ہیں یا شاید ایک سو پانچ اور شراب کا آدھا پیمانہ جو اکیس کے درمیان تقسیم ہوکر — کیونکہ ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ پیا ہے — ہر ایک آدمی کے حصہ میں پانچ پیمانے آتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہم غازی ہیں!"

اس کے ساتھ ہی دروازے کے جوڑ تڑاخ گئے۔ کیلی ڈو ینا لڑکھڑاتے ہوئے ہکلا کر بولا۔!

"اب وہ گھس رہے ہیں"

"کیا وقت ہے؟" عطار نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"گیارہ۔ لیکن کیا آپ انہیں کواڑ توڑ کر اندر گھستے ہوئے دیکھتے ؟"

"انہیں آنے دو۔ یہی تو وقت ہے!"

"یہی وقت ؟ کس لئے ؟" فرانسیسی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دبی زبان سے بولے۔ لیکن وہ اس قدر پیئے ہوئے تھے کہ اپنی کرسیوں پر سے نہ اٹھ سکے۔

"انہیں گھسنے دو!" انہوں نے اپنی تلواریں بڑی دقت سے کھینچیں لیکن کھڑے ہونے میں کامیاب نہ ہونے کے باوجود۔ شراب سے مست لہجہ میں کہا "ہجوم کو اندر گھسنے دو! ہم انہیں دیکھیں گے!"

"اس کے ساتھ ہی دوکان میں نیچے سے برتن اور بوتلوں کی آواز آئی جنہیں لوگ توڑ رہے تھے اور زینہ سے وحشتناک شوروغل سنائی دیا۔

"فرانسیسی ہمدرد کو موت آئے!"

پارڈیز کا گارشیا اپنے مکان میں اس شوروغل کو سنکر اسطرح اٹھا کہ گویا کوئی چیز فوارہ سے اچھل پڑی ہو۔ اور اپنے آپ کو میز کا سہارا دیا تاکہ پھر کرسی پر نہ گر پڑے اس نے اپنے چاروں طرف غیر معمولی خوشی سے ایک نظر ڈالی اور اپنے ہونٹوں پر ایک فتحمند و ظفریاب آدمی کی طرح غیر فانی مسکراہٹ پیدا کی۔ پھر اس نے موت کے خوف اور دل میں جوش کی وجہ سے صورت بدل کر جب کہ وہ حسین معلوم ہورہا تھا۔ مندرجہ ذیل الفاظ جو...... سنجیدہ تھے۔ اس طرح ادا کئے گویا کہ ماتمی گھنٹے کی پردرد ضرب کی آواز نکل رہی ہے۔

"ہسپانویو! اگر تم میں سے کوئی یا سب کے سب دوسو پچاسی ہموطنوں کی موت کا بدلا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے دوسو کی زندگی بچانے کا کوئی موقعہ پاؤ۔ اگر تم اپنے وجود کو قربان کرکے اپنے اسلاف کی حقیر بدبختی کو دور کرسکو تو دوسو پچاسی پیاروں کے قاتلوں

کو سزا دو اور دو سو بھائیوں کو موت سے آزاد کر دو تاکہ محب وطن فوج کے ممبر بانوں کی تعداد کو دو سو قومی آزادی کے غازیوں سے زیادہ کیا جا سکے۔ کیا تم اپنی نکمی زندگی بچانے کے لئے ایک لمحہ کا بھی توقف کروگے؟ کیا تم سیمسن کی طرح گرجا کے ستونوں اور مرتے ہوئے لوگوں کو خدا کے دشمنوں کو قتل کرنے کی قیمت کے بطور بغل گیر کرتے ہیں ایک لمحہ بھی توقف کر دگے؟"

"یہ کیا کہتا ہے؟" فرانسیسیوں نے سوال کیا

"جناب۔ باغی لوگ پچھلے کمرہ میں ہیں!" کیلی ڈرنیا چلایا۔

"انہیں گھسنے دو!" پارڈیز کے گارشیا نے کہا۔ "ان کے لئے نشستگاہ کا دروازہ کھول دو! ان سب کو آنے دو ـــــ یہ دیکھنے کے لئے کہ ہسپانیہ کے سپاہی کی اولاد کس طرح مرتی ہے!"

بیوقوف فرانسیسی متعجب ہو کر اور یہ یقین رکھتے ہوئے کہ موت جس کا ذکر ہسپانوی کر رہے تھے فتنہ انگیزوں کی تحریک سے کمرہ میں داخل ہونے والی تھی شدید خواب غفلت میں اپنی کرسیوں پر جمے رہے اور تلواروں کو اٹھانے کے لئے جو میز پر پڑی ہوئی تھیں بڑی سخت جدوجہد کی لیکن وہ اپنی کمزور انگلیوں سے ان کے قبضے پکڑنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوہا تختہ سے زبردست کشش کی وجہ سے چپٹا ہوا تھا۔

اسی وقت پچاس سے زیادہ آدمی اور عورتیں جو لکڑیوں۔ خنجروں اور پستولوں سے مسلح تھے چیختے ہوئے چمکتی ہوئی آنکھوں سے کمرے میں جھپٹے۔

"ان سب کو مرنے دو!" ایک عورت جو سب سے پہلے داخل ہوئی چلائی۔

"ٹھہرو!" پارڈیز کا گارشیا اس طرح کی آواز ایسے انداز اور ایسی صورت سے چلایا کہ آواز نے فرانسیسیوں کے سکون اور خاموشی کو اور بھی بڑھا دیا اور ہجوم پر جو اس بلا مزاحمت اور غمگین استقبال کی امید نہیں کر رہا تھا ایک قسم کا خوف طاری کر دیا۔

"تمہیں اپنے خنجروں کو چمکانے کی ضرورت نہیں" عطار نے معدوم ہوتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا، میں نے تم سب سے زیادہ مادر وطن کی آزادی کے لئے کام کیا ہے۔ میں نے فرانسیسی ہمدرد ہونے کا بہانہ کیا! اور تم دیکھتے ہو یہ سردار اور افسر ـــــ حملہ آور ہیں ـــــ انہیں ہاتھ نہ لگاؤ! انہیں زہر دیا گیا ہے!"

ہسپانویوں کے دلوں سے فوراً ایک خوف اور تحسین کا نعرہ بلند ہوا۔ انہوں نے بدمستوں کی طرح ایک اور قدم بڑھایا۔ اور دیکھا کہ ان میں سے بڑی تعداد پہلے ہی سے مر گئی تھی۔ جن کے سر آگے کو گرے ہوئے تھے۔ بازو میز پر پھیلے ہوئے تھے اور ہاتھ تلواروں کے قبضوں پر جمے ہوئے تھے۔ باقی جان کنی کے عالم میں تھے۔

"پارڈیز کا گارشیا سلامت رہے!" ہسپانوی جو مرتے ہوئے غازی کو گھیرے ہوئے تھے۔ چلائے۔

"کیلی ڈرنیا" عطار نے آہستہ سے کہا، "افیون ختم ہو گئی ہے۔ افیون کے لئے بھیجو ـــــ کورونا کو"

اور وہ اپنے گھٹنوں پر گر پڑا۔

اب اس کے پیڈرن کے ہمسایوں کو معلوم ہوا کہ عطار پر بھی زہر اثر کر گیا ہے۔

عورتیں جو زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں اور جنھوں نے اپنی گودوں اور اپنی باہوں میں مرتے ہوئے محب وطن کو لے رکھا تھا۔ اسی طرح اسے دعا دینے اور چھاتی سے لگا کر چھپا لینے میں سبقت کر رہی تھیں جس طرح وہ پہلے اس کی موت کی جستجو میں پیش پیش تھیں۔ آدمیوں نے میز کی تمام بتیاں اکٹھا کر لی تھیں اور جھککر اس محب وطن اور رحمدل انسان کے اوپر تھامے ہوئے تھے۔ آخرکار تاریکی میں بیس مردہ یا مرنے والے آدمی پڑے ہوئے تھے۔ جن میں سے بعض کبھی کبھی خوفناک آواز کے ساتھ کرسیوں سے زمین پر گرتے تھے۔

اور مرنے کے بعد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۰۰۰۰۰ہر ایک فرانسیسی کے زمین پر گرنے پر ایک شاندار مسکراہٹ پارڈیز کے گارشیا کے چہرہ کو روشن کر دیتی تھی۔ جس کی روح جلد ہی بہشت کو سدھار گئی جسے ایک پادری نے تسکین دی اور جس کے لئے اس کے وطن کے بھائیوں نے دلدوز ماتم کیا۔

(ترجمہ)

پریم کا پھل

از
جناب سید محبوب حسین صاحب رضوی

میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مکان کے سامنے ایک گاڑی آکر رُکی نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک شخص دبلا پتلا ننگے سر کوٹ پہنے ہوئے گاڑی سے اُترا۔ میں فوراً کرسی سے اُٹھ کر استقبال کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے بڑھکر کہا بھائی رمیش آداب عرض ہے۔ کہو بھئی خیریت ہے نہ طبیعت گھبرائی میں تمہاری ہی ملاقات کو آگیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور رسمی خیریت پوچھی لیکن میں سخت متحیر تھا کہ یہ شخص ہے کون۔ آواز پہچانی ہوئی ضرور معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی سے سامان اُتارا گیا۔ اور ہم دونوں آہستہ قدمی کے ساتھ کمرے میں آکر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ نوارد نے کہا۔ "بھائی رمیش تمہارے گھر پر تو سب لوگ خیریت سے ہیں نا اور تمہاری بیگم صاحبہ بھی۔ اس آواز نے میرے دماغ کا پردہ کھول دیا اور میں بیخودی کے عالم میں کہہ اٹھا...... ارے تم ہو بھائی موہن اور اٹھکر اس کے گلے سے لپٹ گیا...... معاف کرنا میں تمہیں پہچان نہ سکا آخر پہچانتا کیسے تم تو بالکل بدل گئے ہو...... موہن نے کہا ہاں کچھ ایسا ہی ہے

میں کرسی سے اُٹھا اور مکان کے اندر جاکر کہا "میرے ایک دوست آئے ہیں کچھ کھانے کا سامان کرو......

میرا دماغ اپنی جگہ پر نہ تھا۔ طرح طرح کے خیال میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے........ چھ سال ہوئے موہن مجھ سے جدا ہوا ہے...... کیسا چھیل نوجوان تھا۔ کتنا تندرست تھا۔ اس کا چہرہ کتنا پسندیدہ تھا۔ اس کی آنکھیں کیسی جادو بھری تھیں...... اس کے خوشنما گھونگر والے بال کیسے بھلے معلوم ہوتے تھے...... اس کے جسم کی بناوٹ اس کے خوبصورت چہرہ اور ان گھونگر والے بالوں پر نظر اٹھتی تھی۔ آہ! آج اس کی حالت ہے۔ کہ جسم میں ہڈی چمڑی کے سوا کچھ نظر نہیں گالوں پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ چہرہ کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ آنکھیں حلقہ میں آگئی ہیں۔ سر کے بال بھدّے معلوم ہوتے ہیں۔ آخر اس کو مرض ہے کیا جس نے اسے اسقدر گھلا دیا ہے۔ پرماتما تو میرے دوست موہن کو اچھا کر دے

تھوڑی دیر بعد میں اندر سے واپس آیا اور کرسی کھینچکر بیٹھ گیا۔ گفتگو شروع ہوئی۔

میں:- موہن تم کتنے دنوں سے بیمار ہو۔

موہن :- چار سال کا عرصہ ہوا کہ اس مرض میں مبتلا ہوا ہوں۔

میں :- کس ڈاکٹر کا علاج ہے۔ کونسا مرض ہے۔ دوا استعمال میں ہے کہ نہیں۔

موہن :- ڈاکٹر ......! مرض .....علاج .....! اچھائی دوا کیا کھاؤں میں مرنے ہی کو بہتر سمجھتا ہوں دنیا سے عاجز آ گیا ہوں۔

میں :- نہیں موہن تم ہرگز ایسی بات زبان سے نہ نکالو۔ تمہاری زندگی اس دنیا کے لئے بہت عزیز ہے۔ اچھا سنو تم یہاں میرے ساتھ کچھ دنوں رہو۔ یہاں ہمارے دوست ایک ڈاکٹر ہیں۔ تشخیص اچھی ہے اور دست شفا بھی رکھتے ہیں۔ کل سویرے تمہیں میرے ساتھ ان کی ڈسپنسری میں چلنا ہوگا۔

موہن :- نہیں رمیش ڈاکٹر داکٹر کے قصے کو جانے دو۔

میں :- نہیں موہن ..... یہ نہیں ہو سکتا.. اچھا تم مریض ہو۔ تھکے ہوئے آئے ہو کھانا کھا کر آرام کرو صبح دیکھا جائے گا۔

موہن نے صرف تھوڑا سا کھانا کھایا..... نوکر نے میرے پلنگ سے کچھ فاصلے پر موہن کے لئے ایک پلنگ پر بستر لگا دیا۔ اور ہم دونوں آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ لیمپ جل رہا تھا۔ میں سمجھا۔ موہن کو نیند آ گئی ہے۔ میں بھی سو گیا۔

قریب تین بجے شب کو میری نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ کسی کے کراہنے کی آواز کانوں میں آئی۔ میں نے اسکو غور سے سنا اور کروٹ بدل کر ادھر اُدھر دیکھا ..... یہ آواز موہن کی تھی۔ اس کے منہ سے آہ کی صدا آ رہی تھی ...... وہ بار بار کروٹیں بدلتا تھا۔ میں سمجھا کہ اس کو بیماری کی تکلیف زیادہ ہے۔ اٹھکر اس کے پاس گیا اور پوچھا۔ موہن کراہ کیوں رہے ہو کیا طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہے .... موہن نے کہا۔ تم تکلیف نہ کرو۔ میری یہی حالت چار سال سے برابر رہتی ہے۔ آج کوئی نئی بات نہیں جاؤ آرام کرو...... افسوس میں نے تمہارے آرام میں بھی خلل ڈالا۔ باصرار مجھے اپنے بستر پر واپس جانے پر مجبور کیا۔ نیند اچٹ چکی تھی منتظر تھا کہ جلد صبح ہو...

صبح ہوئی میں ضروریات سے فارغ ہو کر موہن کو لئے ہوئے ڈاکٹر کدار کے پاس پہونچا۔ کدار نے موہن کو اچھی طرح دیکھا لیکن کسی خاص مرض کا پتہ نہیں چلا کدار نے کہا کہ کسی سخت صدمہ سے انکا دل کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ مقوی دوا کھائیں اور طبیعت بہلانے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ اور کوئی علاج نہیں۔ ہم لوگ وہاں سے واپس گھر آئے۔ مجھے آفس جانا تھا۔ آفس کا وقت ہو گیا تھا۔ اس لئے میں کھانا کھا کر آفس چلا گیا اور موہن سے کہتا گیا۔ تم یہاں اطمینان سے رہو۔ میں چار بجے واپس آ جاؤں گا۔

میں آفس گیا لیکن میرا دھیان وہاں بھی موہن ہی کی طرف لگا رہا۔ اگلے واقعات یکے بعد دیگرے دماغ میں آتے رہے۔ موہن ایک ایسا دوست تھا جو ہر وقت خوش رہتا تھا۔ ہر شخص اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ مجال کیا کہ روتا ہوا آدمی اس کی باتیں سنکر ہنس

نہ دیتا...... لیکن آہ - اب وہ کسقدر غمگین رہتا ہے۔ نہ معلوم اُسے کیا تکلیف ہے۔ اور وہ کس سوچ میں رہتا ہے...... چار بجے میں آفس ختم کرکے گھر آیا۔ دیکھا موہن چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کسی گہرے سوچ میں ہے۔ اور سامنے میز پر "ندیم" ۱۹۳۸ء کا ایک پرچہ کھلا پڑا ہے۔ میں اس کے قریب آگیا لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔ میں نے اس کا شانہ پکڑ کر کہا...... موہن کیا سوچ رہے ہو۔ اس نے اپنا رُخ بدلا اور کہا کچھ نہیں دوست......

ناشتہ سے فارغ ہوکر میں نے موہن کو ساتھ لیا اور پاس کی پہاڑی پر سیر و تفریح کے خیال سے چلا گیا۔ تاکہ اس کی طبیعت کچھ بہل جائے پہاڑی پر سبز سبز گھاس اُگی ہوئی تھی...... شام کا سہانا وقت تھا پاس ہی صاف و شفاف پانی کا ایک چھوٹا سا آبشار تھا۔ پانی بل کھاتا ہوا گر گر کر ایک پاکیزہ چشمہ بن گیا تھا اس چشمہ کے قریب پھولوں کا تختہ تھا۔ ان پھولوں کی خوشبو سے پہاڑی کا ایک ایک گوشہ معطر تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ہم لوگ وہیں پر بیٹھ گئے...... میں نے موہن سے سوال کیا...... موہن دیکھو تو یہ منظر کیا اچھا ہے ہر شخص کی طبیعت اس کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے لیکن تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تمہارے چہرے سے خوشی کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ آخر تم کس سوچ میں رہتے ہو کچھ کہو بھی تو........ میرا یہ کہنا تھا کہ موہن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں یہ دیکھ کر سخت متحیر ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ موہن کچھ بولنا چاہتا تھا آواز لبوں تک آکر رک جاتی تھی۔ آخر اس نے کہنا شروع کیا

" دوست رمیش - میں نے بہت ضبط کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ جس طرح یہ راز میرے سینہ میں اس وقت تک پوشیدہ رہا ہے۔ پوشیدہ رہکر میری زندگی کے ساتھ چلا جائے۔ لیکن آہ - یہ نہ ہوسکا مجھے اس راز کو افشا کرنا ہی پڑا۔ لیکن دوست یاد رکھو تم اس کے امین ہو ایسا نہ ہو کہ دنیا اس راز کو معلوم کرے اور میری اصلی حالت نہ جان کر مجھے بدقماش مشہور کرے لوگ سنینگے تو ہنسی اڑائیں گے۔ لیکن انہیں کیا معلوم جو میرے دل پر گذرتی ہے ....

میں موہن کی گفتگو حیرت سے سن رہا تھا.....

.... اس نے کہنا شروع کیا........ بنارس کے تعلیمی سلسلہ کے بعد تم وہاں سے چلے آئے اور میں آگرہ چلا گیا۔ وہاں میرے قیام کو صرف چند ماہ گذرے تھے کہ ایک روز شام کو میں جمنا کے کنارے بیٹھا ہوا قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ایک کار قریب آکر رکی۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ چند عورتیں موٹر سے اتریں۔ ناگاہ میری نظر ایک دوشیزہ پر پڑی جو بلا کی حسین تھی۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ دوسری طرف ان غارت گرانِ عقل و ہوش کا قافلہ آکر بیٹھ گیا...... ہوا ذرا تیز چل رہی تھی۔ اس کے سیاہ گیسو کبھی کبھی بکھر جاتے جن کو وہ اپنے دست نازک سے ہٹا دیتی تھی۔ آنچل اس کے خوبصورت سر سے سرک سرک جاتا تھا۔ اور صراحی دار گردن سے حسن کا فوارہ ابل رہا تھا اس کی نگاہیں میری طرف بیساختہ اٹھ جاتیں۔ اور کبھی کبھی ہلکی مسکراہٹ

اس کے چہرے پر نمودار ہوتی۔ اس کی مسکراہٹ میرے دل پر بجلی کا کام کرتی تھی۔ میرے دل میں ایک میٹھا سا درد پیدا ہو گیا۔ میں دیر تک اس کے چہرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ لیکن رعب حسن کی تاب نہ لا سکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ بمشکل تمام گھر واپس آیا ہوت سے میری حالت عجیب سی ہو گئی۔ میرا دل اسکو ڈھونڈھتا تھا۔ میری آنکھیں اس کے دیدار کے لئے بیتاب تھیں اتفاقاً ایک روز ٹہلتے ہوئے ایک عالیشان مکان کے قریب پہونچا تو میری نگاہ ایک کھڑکی پر پڑی جس سے ایک حسین دوشیزہ جھانک رہی تھی۔ ہم دونوں کی نگاہیں مل گئیں اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا میں بمشکل تمام آگے بڑھا۔ اس روز سے میں روزانہ اسکے دیدار کو جایا کرتا اور وہ بھی ٹھیک وقت پر میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوا۔ ...... اس حسینہ کا نام کملا تھا۔ وہ بھی مجھ سے محبت کا اقرار کرتی تھی۔ اور میں بھی اسپر دل و جان سے فدا تھا اس کے خطوط سے وفاداری ٹپکتی تھی۔ ...... لیکن آہ ...... کملا نے مجھ سے بیوفائی کی اور شاید اس لئے کہ میں غریب تھا، اور وہ امیر ...... اس کے والدین نے اس کی شادی ایک امیر گھرانے میں کر دی میری امیدوں کی دنیا میں تاریکی چھا گئی۔ لیکن مجھے سچی محبت تھی ...... میرا دل اس کو پیار کرتا تھا۔ اب بھی میں اسے اتنا ہی چاہتا ہوں۔ جتنا کہ اس وقت ... اس کی بیوفائی سے میرا دل چور چور ہو گیا۔ میں نے ہزار کوششیں کیں کہ اس بے وفا کو بھول جاؤں۔ لیکن اس کا اثر الٹا ہوتا گیا۔

اسکی یاد مجھے ہر وقت ستانے لگی۔ رات کی نیند غائب ہو گئی۔ بمشکل اگر نیند بھی آتی تو خواب میں اس کو دیکھتا۔ دل بہلانے کے لئے عشقیہ مضمون یا اشعار پڑھتا لیکن اس سے بھی طبیعت نہیں بہلتی ...... ہر وقت آنکھوں کے سامنے اس بے وفا کی تصویر موجود رہتی اور ہر مضمون اور ہر شعر کے ایک ایک لفظ سے میں بے حد متاثر ہوتا ...... میں ایسا محسوس کرنے لگتا کہ جو کچھ میں پڑھ رہا ہوں وہ میرے اور کملا سے متعلق ہے۔ پڑھتے پڑھتے آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے اور میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا .... اب بھی وہی کیفیت ہوتی ہے رمیش .... رمیش میں نے کملا کے لئے اپنی ہستی بگاڑ دی۔ لیکن اسے ترس نہ آیا .... سچ ہے کوئی کسی کا نہیں ہوتا ...... یا شاید اس کو میرے دل کی اصلی حالت کا اچھی طرح اندازہ نہیں ہوا .... سچ ہے کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

نہ آہ نارسا جس بے خبر کے کان تک پہونچی
وہ کیا جانے شکستہ شیشۂ دل کی صدا کیا ہے۔

یہ کہہ کر موہن زار و قطار رونے لگا۔ میں نے اس کو تسلی دی اور کہا ...... موہن روؤ مت .... موہن نے جواب دیا ...... رمیش رونا میرے اختیار میں نہیں ..... میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک سے محبت کی .... وہ بھی بے وفا نکلی .... اس نے میرا شیشۂ دل سنگ جفا سے توڑ دیا۔

میں اپنے دل کو کس امید پر تسلی دوں رمیش ......
میں جانتا ہوں کہ کملا اب میری کبھی نہیں ہو سکتی۔ مگر مجھے اسی سے تسلی ہے کہ میں اب اس دنیا میں صرف تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہوں نہ جانے کس وقت قلب کی حرکت بند ہو اور میرے جسم سے روح پرواز کر جائے۔

یہ کہہ کر موہن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اس کو تسلی دی ...... وقت خاصہ گذر چکا تھا میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ چل کر گھر پہونچا ..

.... موہن کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ وہ شاید ہمارے یہاں اسی لئے آیا تھا کہ مجھے اپنا راز دل بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ آخر ایک روز اس نے آہ کملا کہا اور ہمیشہ کے لئے سو گیا ....

موہن کی موت نے میری زندگی پر مستقل اثر ڈالا۔ میں رسالوں میں افسانے پڑھتا تھا۔ لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آیا کہ ایسے واقعات پیش بھی آتے ہیں۔ موہن کی موت نے پہلی مرتبہ میری نگاہوں سے پردہ ہٹایا۔ اور میں نے آج کل کی دنیا میں بھی ایسے واقعات کو پیش آتا بچشم خود دیکھا۔ اسلئے

دل کا تقاضا ہوا کہ اس سادہ مگر سچی داستان کو پڑھنے والوں کے سامنے پیش کردوں کہ وہ دیکھ لیں کہ "پریم کا پھل" کیا ملتا ہے:

چند سہیلیاں

از

جناب سید محمد ایوب صاحب آبگلوی

ہمارا وطن مالوف اٹاوہ کے مضافات کا ایک گاؤں تھا لیکن اباجان کی ملازمت کی وجہ سے وطن میں قیام نہ رہ سکا پنشن ملی تو مجیب پور میں کچھ دنوں قیام رہا۔ لیکن کہاں ڈسٹرکٹ ۔۔۔ ججی کے سلسلہ میں بارونق اور آباد شہروں کا قیام اور کہاں سنسان اور غیر آباد مقام مجیب آباد کی اداسی۔ چند مہینوں میں طبیعت اکتا گئی۔ مکان بھیانک معلوم ہونے لگا۔ یہاں تعلیم کی بھی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹاوہ اسٹیشن سے متصل ایک کوٹھی جو اباجان نے ملازمت کے دوران میں خرید کی تھی۔ ہم لوگ وہاں منتقل ہو گئے۔ یہ احاطہ کے اندر دو منزلہ مکان تھا جس کے اتر جانب نہایت شاداب خانہ باغ تھا روشوں کے کنارے مناسب طور پر پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی تھیں۔ مکان نہایت سلیقہ سے بنا ہوا تھا چاروں طرف برآمدے بیچ میں ہال اور متعدد ہوادار و روشن کمرے تھے۔ اتر جانب کے دو کمرے میرے لئے مخصوص ہو گئے تھے۔ جن میں سے ایک کا دروازہ باغ میں بھی کھلتا تھا۔ ہمارے مکان سے ملحق ہی دو عالیشان عمارتیں فروخت ہو رہی تھیں ان کو ماموں جان اور چچا جان نے خرید لیا۔ اور عصمت شکیلہ جمیلہ اور رفعت کی تعلیم کی غرض سے یہ لوگ بھی مستقل طور پر یہیں مقیم ہو گئے تھے۔ گویا ایک چھوٹا سا خاندان یہاں آباد ہو گیا تھا۔ اور ان تین مکانوں ہی میں ہماری پوری دنیا آباد تھی۔

میں اپنے کمرہ میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ چار بج چکے تھے۔ دفعتاً چینی ہرنیوں کے آنے کی آواز آنے لگی۔ اضطراری طور پر میں نے چادر اوڑھ لی اور مسہری پر دراز ہو گئی۔ عصمت شکیلہ جمیلہ اور رفعت کمرہ میں داخل ہو کر مسہری کے پاس آئیں۔ اور شرارتیں شروع کر دیں۔

"آج میری چہکتی چڑیا خاموش کیوں ہے؟" عصمت نے کہا "معلوم کیا رہے گی تو ہی ایک نخرے جانے گی۔ چھل کرتی ہے مکار دیکھیں کی شکل ہو بے چاری نخرے کرنا سیکھتی ہو گی۔ عنقریب دولہا میاں سے ملنے والی ہیں نا۔ ہاں سیکھ لو" یہ بی جمیلہ کے فقرے رہے۔ میں نے منہ سے چادر ہٹا لی اور تنک کر بولی۔

شیطانو! میرے پیچھے کیوں پڑتی ہو میں درد سے پریشان ہوں اور تمہیں مذاق سوجھا ہے۔

چل رے چھوکری مجھے ہی سکھاتی ہے۔ یہ کہہ کر رفعت نے چادر بدن پر سے کھینچ لی۔ کل کالج کھلتا ہے۔ دماغ کا توازن درست کر۔ اُٹھ ذرا گلگشت کریں شام کا وقت ہے۔ پھول کھل چکے ہیں۔ فضا معطر ہو رہی ہے۔ تیرا اپنا ڈیڑھ درد سر کافور ہو جائے گا۔

شکیلہ جمیلہ عصمت اور رفعت تھرڈ ایر بی اے میں پڑھتی ہیں۔ ہماری ہمسایہ۔ عزیز ہم عمر اور ہم جماعت ہونے کی وجہ سے اس قدر بے تکلف ہیں کہ رسمیات اور تکلفات کی مطلق رسائی نہیں۔ پہلے تو میں نے گیدڑ بھبکی سے کام لیکر ڈانٹا ڈپٹا بنائی مگر نا کام رہی مجبوراً منت و خوشامد پر اتر آئی سیکڑوں منتیں ہزاروں خوشامدیں کیں تو یہ ہوا کہ رفعت اور جمیلہ نے ہاتھ عصمت اور شکیلہ نے پاؤں پکڑ لئے اور باغ میں سبزہ پر لاکر ڈالدیا۔ لیکن اب میری بن آئی تھی۔ ہزاروں خوشامدوں کے بعد بھی جس طرح ہسپتال کے مریضوں کو نرسیں اپریشن روم لے جاتی ہیں میں باغ میں لائی گئی تو سچ مچ کی اگر مریض نہیں تو طلسم ہوشربا کے........ عمرو عیار کی طرح نقلی مریض بنا کون دشوار تھا۔ فوراً دم سادھ لیا اور آنکھیں پھاڑ کر آسمان پر نظر جما دی۔ دو تین منٹ تک لڑکیوں نے مکر ہی سمجھا۔ کوئی گدگداتی اور کوئی پھبتیاں کستی رہی۔ مگر جب چار پانچ منٹ تک مجھپر یہی کیفیت طاری رہی تو ان احمقوں کے دماغ کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ نوبت باینجا رسید کہ عصمت لخلخہ لانے دوڑی تو رفعت گلاب کیوڑا کہتی بھاگی۔ جمیلہ پانی شور مچاتی ابدار خانہ پہونچی اور شکیلہ لیڈی ڈاکٹر کو فون کرنے چلی۔

مطلع صاف ہو چکا تھا چاروں چار سمت بھاگ چکی تھیں۔ میں کپڑے جھاڑ کر اُٹھی اور دوسری طرف گلگشت میں مصروف ہو گئی۔ ہوش میں لانیوالے سامان کے ساتھ چھوکریاں واپس پہونچیں۔ اور مجھے اسطرح پاکر شکست خوردہ شیرنی کی طرح سب کی سب مجھ پر جھپٹ پڑیں اگر میں اس وقت کترا کر نہ بھاگتی تو سب مل کر بری گت بنا ڈالیں۔ چند منٹوں تک یہی سلسلہ قائم رہا کہ میں اپنے کو بچاتی رہی اور وہ چاروں متحد ہوکر مجھے سزا دینے کے لئے سعی پیہم کرتی رہیں۔ نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ اور اگر میں گرفتار ہو جاتی تو کیا کیا فرد جرم لگا کر کون کون سی سزا میرے لئے تجویز ہوتی کہ خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ مس ٹنڈن اور لیڈی ڈاکٹر دکھائی دیں اور یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مہمانوں کو لے کر ہم لوگ بالائی منزل پر ڈرائنگ روم میں پہونچے۔ عطر سینٹ اور سگریٹ سے ان کی تواضع کی گئی۔ واقعہ ہائلہ کی روداد سنکر ایک زبردست قہقہہ رہا۔ ہمارے حریفوں کی آنکھیں اس قہقہہ پر جھک گئیں جو عین اعتراف شکست...... تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کو دوسرے مریضوں کے یہاں بھی جانا تھا۔ مس ٹنڈن نے کہا اچھا ہوا اس بہانہ سے آپ لوگوں سے ملاقات تو ہو گئی ہم لوگوں نے موٹر تک ان مہمانوں کی مشایعت کی مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم لوگ نماز سے فارغ ہوکر کل کالج کی تیاری کیلئے اپنے اپنے کمرہ مطالعہ کے کمرے میں جا بیٹھے۔

تلخیصات

عرب کے چند غیر مسلم سیاح

از مولوی مسعود الرحمن صاحب ندوی پڑھکوی

عرب کی پاک اور مقدس سرزمین پر دنیائے اسلام کا تنہا اور واحد قبلہ اپنی گوناگوں متبرک خصوصیتوں سے ممتاز ہے۔ پیغمبر اسلام، صحابہ کرام رضا اور تابعین عظام کے علاوہ اکثر اسلامی بادشاہوں کے مذہبی، تاریخی، سیاسی اور علمی کارنامے بھی اس مقدس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالخصوص سلاطین آل عثمان اور سلاطین مصر کی مذہبی اور تاریخی عظمت اس سرزمین سے وابستہ ہے۔

اس بنا پر ہر دور اور ہر زمانہ کے سلاطین کی نظروں میں یہ ایک انمول مقدس خطہ رہا۔ اس سرزمین پاک کی عظمت و تقدیس کو بحال رکھنے کیلئے یہ حکم عام جاری ہوا کہ۔

یا ایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس فلا تقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا

ترجمہ:۔ مسلمانو! مشرک لوگ بالکل نجس ہیں اس لئے وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائیں۔

• چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب حج کا زمانہ آیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ منادی کرتے سنائی دیئے۔

الا لا یحج بعد عامنا ھذا

"خبردار ہو جاؤ۔ ہمارے اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے"

اور جناب رسالت پناہ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ۔

اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب

(یہود اور نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد غیر مسلموں سے ملک عرب کو پاک کرنے میں حضرت عمر رضا نے بھی ان کی روش اختیار کی، اور ان کے بعد بھی آج تک جو خلفاء اور سلاطین ہوئے۔ انہوں نے بھی اسی روش کی پیروی کی۔ اس لئے کسی غیر مسلم کو عرب کی پاک زمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اب تک اہل حرمین غیر ملکی سیاحوں کی سخت نگرانی کرتے رہے۔ اور یورپین حکومتوں کے اثر و نفوذ سے قلب عرب محفوظ رہا۔ مگر تا بکے، آخر مختلف یورپین قومیں اپنے سیاسی مصالح دفر دیات

سے اس مشہور مگر نامعلوم خطہ عالم کے اندرونی رموز و اسرار کی عقدہ کشائی کے لئے صدیوں سے تگ و دو میں مصروف رہیں اور رفتہ رفتہ انہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی اس سلسلہ جد و جہد میں معلوم نہیں کتنے ماہرین فن نے بھیس بدل بدل کر سرزمین عرب پر قدم رکھے۔ بعض اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوئے اور بعض بے نیل مرام واپس لوٹے۔

جن یورپین لوگوں نے مختلف زمانوں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی سیاحت کی ہے۔ اور اپنے سیاسی، مذہبی تمدنی یا جغرافیانہ مذاق کے مطابق وہاں کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی فہرست اگر مرتب کیجائے تو وہ بہت طویل ہوگی۔ ذیل میں صرف ان چند مشہور سیاحوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کے سفر کے کارنامے واقف کاروں کے حلقہ میں شہرت عام رکھتے ہیں۔

جزیرہ عرب کے جغرافیائی، تمدنی، معاشرتی و سیاسی راز ہائے سربستہ کے انکشافات کے لئے سراغرسانی کی مہم غالباً ۱۷۶۳-۱۷۶۲ء سے شروع ہوئی۔ اس سال حکومت برطانیہ نے بعض وسائل اختیار کئے۔ دوسری طرف ایک جرمن ہمت ور نیوبھر (NEUBWHR) رئیس ڈنمارک نے کمر ہمت باندھی اور بلاد یمن میں کچھ کام کر سکا۔ اس کے بعد اس سلسلہ میں۔ بورکارٹ سوئیری (باشندہ سوئزرلینڈ) بورٹون الانکلیزی (انگریز)۔ بورجرج اہولانڈی (باشندہ ہالینڈ) اور کورتلمون الفرنساوی (فرانسیسی) نے نام پیدا کیا ان میں سب سے پہلے بورکارٹ نے اس ملک کی سیاحت کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا وہ پہلے مصر آیا اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا۔ اپنا نام مہدی رکھا پھر جامع ازہر میں داخل ہو کر عربی زبان سیکھی۔ ان تیاریوں کے بعد عرب کا سفر اختیار کیا اور وہاں تقریباً سات سال تک اقامت اختیار کی اس سفر کے نتیجہ میں اس نے ایک کتاب لکھی جو اس سلسلہ کی کتابوں میں سب سے زیادہ قابل قدر ہے خصوصاً ملک عرب اور قبائل عرب کے بیان میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ اس نے اسلامی وضع میں مصر میں وفات پائی اور قرافہ باب الفتوح میں شیخ یونس کے مقبرہ کے متصل مدفون ہوا۔

اس کے نصف صدی بعد اسپانی بادیا (BADIA) نے اپنے سفر عرب میں نام پیدا کیا۔ اور اس نے بھی اس سفر کو کامیاب بنانے کے لئے مسلمانوں کی وضع و قطع اختیار کی۔ اپنے آپ کو علی بک عباس کے نام سے موسوم کیا اور مکہ معظمہ پہونچا۔ اور وہاں سے مصر آیا۔ پھر ۱۸[illegible]ء میں حلب کے لئے رخت سفر باندھا اور وہاں پہونچکر وہاں کے شرفا میں کچھ اس طرح گھل مل گیا کہ بالکل ایک خاندان اور ایک ہی نسل کا معلوم ہونے لگا۔ حد تو یہ ہے کہ اپنا سلسلہ نسب بھی انہیں لوگوں سے جا ملا دیا۔ پھر اپنی پہلی شکل میں دوبارہ عرب گیا۔ اور بلاد عرب کے حالات معلوم کئے۔

اس کے بعد ۱۸۰۹ء میں ایک فرانسیسی نے جو امیر عبدالقادر جزائری کا منشی تھا۔ عربوں کے بھیس میں مکہ معظمہ گیا۔ اور اپنی سراغرسانی کو کامیاب بنانے کے لئے شریف مکہ محمد بن عون پر ظاہر کیا کہ (ایک امر کی) تصدیق کیلئے

امیر عبد القادر کی جانب سے آیا ہوا ہے اور اس طرح واقعات معلوم کر کے مکہ معظمہ سے طایف کی راہ لی۔ مگر نوشتۂ تقدیر کچھ اور تھا۔ جب طائف سے واپسی میں پھر مکہ معظمہ آیا تو اتفاق سے الجزائر کے چند حاجیوں نے اس کو پہچان لیا۔ چنانچہ فوراً گرفتار کیا گیا۔ اور آہنی زنجیروں سے مضبوطی کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔

اسی طرح ۱۸۱۰ء میں المانی سیزن نے یمن کی راہ لی اور وہیں قضا و قدر کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہونچا۔

۱۸۱۴-۱۵ء میں بورک ہارڈ (BUREKHARDE) نے واقعات کے تجسس کا خیال کر کے عیاری کے ساتھ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کا دورہ کیا۔ جغرافیائی معلومات کے خزانہ پر نقب زنی کی اور اپنا دامن مقصود بھر کر وطن کو لوٹا۔ لیکن اس کی خوش نصیبی کا ستارہ چمک چکا تھا۔ رحمت ایزدی سے اس کے دل میں نور اسلام کی حقیقی جھلک پہنچی۔ اور صدق دل سے اسلام لے آیا اور اخیر عمر تک پختہ مسلمان رہا اس کا.......... اسلامی نام عبد اللہ بورک ہارڈ تھا۔ لیکن عوام اسے شیخ برکات کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب مصریوں کے حملے وہابیوں پر ہوئے تو اجنبیوں کے داخلہ کے لئے بہت سہل اور آسان طریقے نکل آئے اور رہے سہا بلاد عرب میں اجنبیوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔

چنانچہ سب سے پہلے سادلیہ نے خلیج فارس سے بحر احمر کا راستہ نکالا اور المانی رابیل نے ۱۸۲۶ء میں حجاز اور اس کے اطراف وجوانب کا سفر کیا پھر ویلسیٹڈ نے ۱۸۲۸ء میں بلاد یمن کا رخ کیا اور بعد کو بوٹا اور طلازم ہا سانے ۱۸۳۷ء و ۱۸۴۲ء میں انکشاف حال کی سعی کی اور بہت کچھ انکشافات حاصل کر کے واپس آیا۔

اسی طرح کرنیل لارنس، عبد اللہ فلبی وغیرہ موجودہ دور کے مشہور سیاح عرب ہیں ان کے واقعات ہمارے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ اس لئے ان کے تذکرہ کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔

غیر زبان کا ادب و شعر

راجستان کے دیہاتی گیت

از

جناب آسی رام نگری

یوں تو راجستان کے سادہ دل دیہاتیوں کا ہر سانس نغمہ اور ہر بول گیت ہے۔ لیکن راجستان کے دیہاتیوں میں "مومل" نام کے گیت کو غیر فانی مقبولیت حاصل ہے۔ "مومل گیت" مومل اور رانا مہندر کی داستان محبت ہے۔ اس گیت کو راجستان میں وہی غیر فانی مقبولیت حاصل ہے۔ جو پنجاب میں "ہیر رانجھا" فارس میں "شیریں فرہاد" اور عرب میں "لیلیٰ مجنوں کے افسانۂ محبت کو"

ان دیہاتی گیتوں میں نسوانی حسن کی عکاسی اس لطیف پیرایہ اور دلکش انداز میں کی گئی ہے کہ سننے والا مسحور ہو کر انھیں میں کھو جاتا ہے۔ ہم ذیل میں ناظرین "ندیم" کیلئے "مومل گیت" کے چند دلکش پارے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ انکی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"مومل" لودرُو" (مغربی راجستان کا ایک قدیم حصہ) میں پیدا ہوئی۔ اور امرکوٹ کا رانا مہندر اس کی پاک محبت کے چشمے سے سیراب ہوا۔ اے راجستان کی مایۂ ناز سندری! رانا مہندر کے دیس کو چل!"

"کاجل کی باریک سی لکیر مومل کی حسین آنکھوں میں ایسی شوبھا دے رہی ہے جیسے بھورے بھورے منوہر پربتوں کے دامن میں بجلی چمک اٹھتی ہے۔ اے پیتم کی پیاری مومل پیتم کے دیس کو چل"

"مومل کی چنچل چتون دیکھکر ہرن بھی شرم سے آنکھیں جھکا لیتے ہیں۔ اے پیتم کی پیاری مومل پیتم کے دیس کو چل"

"مومل کی حسین ناک کھانڈے کی دھار کی طرح تیکھی ہے۔ اور مدبھری آنکھیں شراب کے دو پیالے ہیں۔ اے امرت بھری مومل پیتم کے دیس کو چل!"

"مومل نے آنکھوں میں لکیر کھینچی تو ایسا معلوم ہوا جیسے گھنگھور گھٹا میں بجلی چمک رہی ہو۔ برکھا رت میں پیتم کے دل میں امرت برسانیوالی مومل پیتم کے دیس کو چل!"

"موملی کے ہونٹ ریشم کے تار کی طرح باریک، پتلے اور نرم ہیں۔ اس موتیوں کے سے دانت والی محبوبہ کے حسین دانت انار کے دانوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ ساون کی ہریالی کی طرح پیتم کے دل کو سرسبز و شاداب کرنیوالی موملی پیتم کے دیس کو چل!"

"موملی کا شکم پیپل کے پتے کی طرح نرم اور چمک دار ہے۔ اس کا سینہ صاف سانچے میں ڈھلا ہوا سڈول ہے۔ اے مری سندر موملی! روپ کے رسیا پیا کے دیس کو چل!!"

یہ سیدھے سادے گیت پرشکوہ الفاظ اور پرتصنع بندشوں سے آزاد ہونے کے باوجود کتنے پرکیف اور کتنے موثر ہیں۔ ان گیتوں سے حسن مجازی کے پرستار اور محبوب حقیقی کے طالب یکساں طور پر لذت اندوز ہوسکتے ہیں۔

ایک اور گیت "مرگ نینی" (آہو چشم) میں بھی اسی طرح نسوانی حسن کا انوکھا اور پاکیزہ تخیل پیش کیا گیا ہے۔ ان گیتوں کی ندرت و لطافت اور کیف و لذت کا سرسری جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شاعری تعلیم و تہذیب سے آراستہ و پیراستہ شہریوں ہی کی جاگیر نہیں ہے۔ دیہات کے سادہ دل ان پڑھ گوالوں اور کسانوں کے پہلو میں بھی جذبات و احساسات سے معمور دل ہیں۔ اور ان کے سیدھے سادے گیت ہماری ردیف و قوافی کی قید و بند میں محدود و مقید شاعری سے کہیں تاثیر انگیز ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند گیت ——

"مرگ نینی سندری (آہو چشم حسینہ) کے جسم کی دمک آفتاب کی ضیا پاشیوں کی حریف ہے۔ اور اس کے روئے زیبا کی صباحت و لطافت گلہائے رنگیں اور بوستان فلک کو بھی شرماتی ہے۔

مرگ نینی کی پیاری آواز میں مصری کی مٹھاس اور لونگ کا سلونا پن ہے۔ پیشانی کی ساخت خوبصورت ناریل کی سی ہے۔ سندری کی آنکھیں لیمو کی قاش کی طرح ہیں۔ اور ابرو بھونرے جیسے سیاہ!

ینی طوطے کی منقار کی طرح اور پتلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑی معلوم ہوتے ہیں۔ مرگ نینی کے موتیوں سے دانت انار کے دانوں کی طرح حسین ہیں۔
مرگ نینی کی مرمریں باہیں اتنی سڈول ہیں۔ جیسے بیلن سے بیل کر بنائی گئی ہوں۔ انگلیاں صندل کی شاخ معلوم ہوتی ہیں۔
مرگ نینی کی پشت مخمل کی طرح ہے۔ اور پہلو جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ شکم کی ساخت ایسی ہے جیسے گیہوں کے گوندھے ہوئے آٹے کی لوتھ! اور ناف ہیروں سے بنائی ہوئی چھوٹی حسین پیالی! ——
مرگ نینی کے حسین پاؤں پیپل کے پتے کی طرح نرم و نازک اور چکیلے ہیں۔ اس کی ایڑی سپاری کی طرح سڈول ہے"

اگر ہم تنگ دلی کو راہ نہ دیں اور بنظر انصاف دیکھیں تو دیہاتیوں کے سادے استعاروں اور انوکھی تشبیہوں کی اوٹ میں شاعری کی وہ تمام خوبیاں جلوہ ریز نظر آئینگی جنھیں اپنی پرتصنع نظموں میں پیدا کرنے کیلئے ہم تاحیات سر مار کر بھی ناکام رہتے ہیں۔

طوفان نوح

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح الملک حضرت نوح ناروی

سرحدِ حسن سے نکل حلقۂ عشق اثر میں آ
دل کو نظر کو دیکھ کر دل میں سما نظر میں آ

صورتِ اشک آرزو دل سے الگ ہوئی غم
ضبط کہاں تک اب کروں آمری چشم تر میں آ

لطفِ حیات جاوداں تیرے بغیر کچھ نہیں
مژدۂ عیش ذوق و شوق نامۂ یاس اثر میں آ

تیرِ ادا تجھے قسم تیغِ نگاہِ ناز کی
شوقِ دل و جگر کو دیکھ جلد دل و جگر میں آ

پردۂ حسن جلوہ کر گردشِ روزگار کو
شام میں آ سحر میں آ شمس میں آ قمر میں آ

کب سے ترا ہوں منتظر خوب نہیں یہ اجتناب
اے اثرِ وفا و عشق نالۂ بے اثر میں آ

شرم و حیا کو دور رکھ حسن کو بے نقاب کر
پردۂ رخ اٹھا بھی دے دل میں پہنچ نظر میں آ

خانہ خراب ہوں کیساتھ خاک اڑا رہا ہوں میں
تو بھی حریم حسن سے عشق کی رہ گذر میں آ

وقت سے پہلے حشر اٹھے فتنۂ حشر کیا ضرور
تجھکو یہ کس نے رائے دی قامتِ عشوہ گر میں آ

حسن کرشمہ ساز کا میرے لئے یہ حکم ہے
خلوتِ عافیت کو چھوڑ جلوتِ شور و شر میں آ

بحرِ وفا و جوشِ غم دونوں اسی جگہ تو ہیں
نوح کے آنسوؤں کو جانچ نوح کی چشم تر میں آ

حشرِ جذبات

از

حضرت ثاقب کانپوری

کتنا حسرت ناک یہ انجام ہے
آرزو ناکام تھی ناکام ہے

اللہ اللہ عشق کی نیرنگیاں
ہر نفس اک محشرِ آلام ہے

ضبط کرنے سے بڑھا اور اضطرار
یہ مآل کوششِ ناکام ہے

اے نسیم صبح کیوں آئی یہاں
اب قفس میں کیا ترا پیغام ہے

ہر طرف ہے عشق میں شورش بپا
دل کو اپنے کام ہی سے کام ہے

بزم پر طاری ہے ایسی محویت
ہر طرف گویا سکوت شام ہے

التفات حسن بھی ہے وجہِ موت
عشق بھی آغازِ بے انجام ہے

اس میں کیا شکوہ کسی صیاد کا
خود مری پرواز سوئے دام ہے

میری آنکھوں کو ہے اب تک انتظار
روح میری تشنۂ پیغام ہے

عشق میں ہوں ناشناس ضبط غم
کس قدر تیرا حسین الزام ہے

ثاقبؔ اپنی عشق میں نظم و غزل
وارداتِ دل ہے یا الہام ہے

تجلیاتِ نجم

از جناب نجم ندوی بی، اے

آفریں تیری دمِ نزع جو حاصل ہو جائے
بات کی بات میں آساں مری مشکل ہو جائے

تیری نعمت کے میں قربان الٰہی لیکن
ایسی نعمت نہ عطا کر کہ غمِ دل ہو جائے

سہل ہو جائے انھیں مشق ہر انداز ستم
سانس لینا بھی مرے واسطے مشکل ہو جائے

جو سیہ بخت نہ پائے تری محفل میں جگہ
شوق سے آکے مری بزم میں شامل ہو جائے

دستِ نازک کو خدا کے لیے تکلیف نہ دو
کام اگر جنبشِ ابرو ہی سے حاصل ہو جائے

اضطرابِ دلِ مضطر کی حقیقت کھل جائے
کاش پہلو میں ہر انساں کے مرا دل ہو جائے

دلِ محزوں کو نگاہوں سے گراتے ہو مگر
بیکسی ہی نہ کہیں پیار کے قابل ہو جائے

قیس بننا تو بڑی بات ہے اے وحشتِ دل
لقبِ "بادیہ پیماں" ہی تو حاصل ہو جائے

بزم میں نجمِ حسیں کو بھی دعوتِ شرکت دیدو
شاید افزائشِ آرائشِ محفل ہو جائے

من کی بات

از جناب رضیہ نعمان

گیت اپنا کوئی سناؤ نا!
یاد بیتی ہوئی دلاؤ نا!

یہ جمود و سکوت ایسی فضا!
کیا ہوا ہے تمھیں بتاؤ نا!

کیوں ہے سنسار، سونا سونا سا
ذرے ذرے کو تم جگاؤ نا!

ہے تمھیں یاد؟ وہ "پریم کا راگ"
پھر ذرا بانسری بجاؤ نا!

چاندنی رات کا کوئی "سپنا"
بن کے نینوں پہ چھائے جاؤ نا!

ہو چکے ختم کیا پیار کے دن
کتنے سندر تھے وہ پیار کے دن

بہار

از جناب زکی صاحب اورنگ آبادی

تو شمیم لالہ و گل تو نسیم مشکبار غیرت گلزار جنت تو ہے اے فصل بہار
تیرے دم سے باغ کی قائم ہیں سب رنگینیاں تو ہو تو باغباں کیا کر سکے گل چینیاں
تو شمیم یاسمن بن کر چمن میں آ گئی تو فضائے باغ بنکر میرے دل پر چھا گئی
اک تری امید پر جیتے تھے ہم فصل بہار تیری آمد سے دل مہجور پاتا ہے قرار
قطرۂ آب بقا سے کم نہیں آنا ترا داغ دل سے کم نہیں کچھ آکے پھر جانا ترا
درحقیقت انبساط دہر کا تو راز ہے تیرے دم سے نغمہ زن بلبل کی ہر آواز ہے
طائران خوش بیاں ہیں نغمہ سنجان بہار ہے نشاط عیش سے لبریز دامان بہار
شور ہے سارے چمن میں آگئی فصل بہار اک سحاب نور بن کر چھا گئی فصل بہار
غنچہ و گل ہر طرف ہیں وجد میں مستانہ وار بلبل و قمری سے گلشن بن رہا ہے لالہ زار
جھومتی ہیں مست ہو ہو کر چمن میں ڈالیاں ہو رہی ہیں سبزۂ نوخیز کی پامالیاں
صبح دم جا کر کوئی دیکھے تو گلشن کی بہار پھول کا منہ دھوتی ہے جب وقت شبنم کی پھوار
شرم ان کلیوں کی دیکھو ہیں یہی جان بہار کیوں نہ کہیے ان اداؤں کو عروسان بہار
کیف سے لبریز ہو جب ساغر فصل بہار ہر دو نوشاں چمن پھر کیوں نہ ہو جائیں نثار
جھومنے میں ڈالیوں کی دیکھئے رعنائیاں لے رہا ہو کوئی ظالم جس طرح انگڑائیاں

فصل گل میں اک ستمگر کی ادا یاد آ گئی
نخل دل کی جو کلی کھلتی تھی وہ مرجھا گئی

کمپنی باغ

از

جناب سید مصطفیٰ صاحب ماہر فریدی بہاری

حُسن کی یہ پھلواری مالی　بیل اور بوٹے پریم کی جالی
بلبل چہکے ڈالی ڈالی!　شور مچاوے کوئل کالی

سندر روپ آنکھوں کو بھائے
من ترسے جیا للچائے

چھائی ہوئی ہے کیا خوش حالی　جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی
پات بجائیں ہل مل تالی　لہہ لہہ کرتی ہے ہریالی

سُندر روپ آنکھوں کو بھائے
من ترسے جیا للچائے

دھرتی کے جوبن یہ رسیلے　واہ رے اونچے اونچے ٹیلے
پھول ہیں چمن پر رنگ رنگیلے　اُجلے کالے لال اور پیلے

سُندر روپ آنکھوں کو بھائے
من ترسے جیا للچائے

سانولی صورت زلفیں کالی گال گلابی ہونٹوں پہ لالی

رس کی بھری آنکھیں متوالی سب سے انوکھی سب سے نرالی

سندر روپ آنکھوں کو بھائے

من ترسے جیا للچائے

ماتھا تیرے بل بل جائے کیا کیا روپ انوپ دکھائے

تن من پر جلوے ہیں چھائے کیسے کوئی آنکھ بچائے

سندر روپ آنکھوں کو بھائے

من ترسے جیا للچائے

تقریظ و انتقاد

اردو کے رسالوں کے چند خاص نمبر

ہمایون کا سالگرہ نمبر۔ اڈیٹر جناب بشیر احمد صاحب حجم ۷ ۹ صفحے۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲؍)
پتہ:۔ دفتر ہمایون ۲۳ لارنس روڈ، لاہور

ہمایون اردو کے ادبی رسالوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ ماہنامہ ہے۔ امسال بھی آغاز سال میں اس کا سالگرہ نمبر شائع ہوا ہے۔ "بزم ہمایون" میں لائق مدیر نے اردو کے ماضی و حال کا موازنہ کیا ہے۔ اور اسکی موجودہ ترقیوں پر جامع تبصرہ کیا ہے۔ پھر "جہاں نما" میں سال بھر کے اہم حوادث و واقعات یکجا کیے ہیں۔ اس کے بعد موصوف ہی کا ایک اہم لائق ذکر مضمون "نئے عقیدے" کے عنوان سے ہے۔ جسمیں امریکہ سے ایک شائع ہونیوالی کتاب کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔ اس میں دنیا کے موجودہ مفکرین کے خیالات ان کی زبان قلم سے بیان ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ۱۹۳۹ء میں۔ ان دس برسوں میں مفکرین کے خیالات و رجحانات میں کیسی تبدیلیاں ہوئیں۔ اور مادیت کے موجودہ دور میں روحانی تسکین کی کیسی تلاش ہ

کیساتھ "جج کا فیصلہ" کے عنوان سے شائع کرایا ہے۔ زبان کی صحت اور معیار کے متعلق معترض و مجیب دونوں کے نقطۂ نظر میں بعد المشرقین ہے اگر دونوں چند چند قدم آگے بڑھیں تو یہ اختلافات دور ہو سکتے ہیں۔ مثلاً خاکی کا مصرعہ ہے ۔ ؎
"تکلیف پردہ داری حسرت نہیں رہی" خاور آنی صاحب فرماتے ہیں "تکلیف" دکھ درد کے معنی میں اردو لفظ ہے۔ اسکی اضافت "پردہ داری" کے ساتھ صحیح نہیں۔ ورنہ "دودھ بھینس، چوں چوں مرغ بولنے لگیں گے" مجیب فرماتے ہیں ۔ "بولنے لگیں گے تو اس سے بہتر کیا چاہئے۔ جہنم میں گئی فارسی تکلیف عربی لفظ نہیں ۔ خالص اردو ہے ۔ تکلیف پردہ داری، صحیح ہے" حالانکہ صحیح جواب یہ ہے کہ نفس یہ اصول ہی صحیح نہیں۔ ایسی سختی قدما نے بھی نہیں برتی تعجب ہے کہ اس موقع پر غالب کا مشہور مصرعہ "تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی" طرفین فراموش کر گئے۔ اگر ایسی سختی قبول کیجائے تو اردو کو سیکڑوں لفظوں اور ترکیبوں سے ہاتھ دھونا پڑے ۔ مثلاً "تلاش روزگار" متلاشی حق وغیرہ ۔ ہمیں زبان کے دائرہ کو ہر وقت وسیع کرنا ہے ۔ نہ کہ محدود۔ اسلئے جائز حدود میں رہ کر زبان کی وسعت کو کم کرنا چاہئے۔ مناسب ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینیوں سے ایسے مباحث سرے سے پیدا ہی نہ کئے جائیں۔ پروفیسر شاداتی کے اعتراضات میں سے ایک یہ مثال تھی۔ ایسی ہی محل نظر چیزیں بعض اور بھی ہیں۔ پروفیسر مسلم نے اپنے مضمون "تاریخ اور اسکی قیمت" میں تاریخ پر سیاست کی اثرات دکھاتے ہیں لیکن بعض جگہ موصوف کا قلم جادۂ اعتدال پر قائم نہ رہ سکا۔ اور بعض جگہ طرز ادا میں مزید حزم و احتیاط کی ضرورت تھی ۔ مجموعی حیثیت سے سالنامہ ساقی ۱۹۴۲ء کا بہترین سالنامہ ہے۔ امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ **مکتب خانہ جامعہ**

رجسٹرڈ نمبر ل۔ ۲۹۴

کلکتہ نیشنل بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس:۔ کلایو روڈ کلکتہ — گیا برانچ:۔ کچہری روڈ گیا۔ فون نمبر ۳۷

ایک شیڈولڈ بینک

منظور شدہ سرمایہ ——— ۲۰۰۰۰۰۰ (بیس لاکھ)

ادا شدہ سرمایہ ——— ۱۰۰۰۰۰۰ (دس لاکھ)

سیونگ بینک کا سود ۲½ فی صدی — فکسڈ ڈپازٹ کا سالانہ سود ۴½ فیصدی

دوسری شاخیں

خضرپور۔ بھوانی پور۔ پارک سرکس۔ شام بازار۔ سرام پور۔ سیوراپھلی۔ ڈھاکہ۔
نرائن گنج۔ بھائرب بازار۔ کشور گنج۔ میمن سنگھ۔ چاٹگانگ۔ سلہٹ۔ پٹنہ۔
الہ آباد۔ ناگپور۔ بنارس۔ رائے پور۔ جبل پور

نوٹ:۔ نامی گرامی بڑی کمپنیوں اور فرموں کے حساب اسی بینک میں ہیں۔ کاروبار میں بینک سے سہولت حاصل کیجئے۔ ذاتی سرمایہ اکٹھا کیجئے۔ روپیہ جمع کرنے اور لگانے کے طریقوں میں غیر معمولی آسانیاں رکھی گئی ہیں۔ کاروبار کی ایسی سہولتیں دوسری جگہ آپ کو مشکل سے ملیں گی۔

مرتب کردہ

سید یاسر علی ندوی

من سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا!

دا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

ہرمون اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ
یافت نہ کر سکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے
تانی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایکسٹرکٹ دریافت کیا ہے
انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکشوئیل سائنس انسٹی ٹیوٹ
ف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز
یابی حاصل ہوئی

اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون **Otone** ہے جسے سلور ڈراپ
(SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے

وٹون کے سلور دراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار دردل خوشکن
ری محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور
بیت آجائیگی رخسار کے گوشت دخون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دہکنے لگیں گے چہرہ پر
ن دجوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی
مر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو
بیس سال کے معلوم ہوں گے

وٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا حکمی علاج ہیں۔

خون کی کمی۔ دماغی وجسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا
چڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ پیٹ کا موٹاپا۔ ذیابیطس دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا
ھٹ جلنا۔ دائمی قبض سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر کا
رد جریان وسیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ ومثانہ عورتوں کی پرسوت کی بیماری
شیا (لیکوریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔

وٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو بنوائیں ایک ہفتہ
ستعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز
ثیرات کا اندازہ ہوگا۔

وٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔
س کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

15,000 روپیہ کا نقد انعام

وٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کر دے
وٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیوانی ہرمون یا وٹامن کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے
بلغ ..... ۱۵ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

وٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے
ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنے رکھی ہے
ہم نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کر دے۔

tone *An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination*

The Elixir of Life

SILVER DROPS

سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گرانڈ فارمیسی (N.G.) پوسٹ بکس ۲۳۲۳ کلکتہ

تار کا پتہ۔ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون۔ بڑا بازار ۵۳۰۰

Sole Distributor

RAND PHARMACY( )

OST BOX 2323 · CALCUTTA

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(جو)

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے نکل رہا ہے

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) سائنس کیا ہے
(۲) مسئلہ جبر و قدر سائنس میں
(۳) غوطہ خور

فروری سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) جنگ میں حیوانات کا حصہ
(۲) ہوائی نائیٹروجن سے استفادہ
(۳) ارتقائے انسان کا راز

چندہ سالانہ پانچ روپیہ سکہ انگریزی۔ نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے۔ رسالہ میں اشتہارات بھی شائع ہوتے ہیں، جن کے نرخ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

امید کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائقین سرپرستی فرمائیں گے۔

المشتہر

معتمد مجلس ادارت رسالہ "سائنس" جامعہ عثمانیہ

حیدر آباد دکن

صوبہ بہار — اسکولوں اور کالجوں میں سنہ ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

یعنی

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

مرتبہ سید ریاست علی ندوی

قیمت سالانہ للعہ
قیمت فی پرچہ ۵ر

قیمت ششماہی عگا
چھ آنے

جلد (۱۶) ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر (۵)

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

نظرات

علمی و تعلیمی حلقہ میں یہ خبر دلی رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل **مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی** نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴ مئی ۱۹۷۱ء کو صبح کے وقت اس دارفانی کو الوداع کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم ہماری جماعت میں ایک سنجیدہ، پروقار اور خاموش علمی و تعلیمی خدمات انجام دینے والے تھے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کے عہد میں دار العلوم ندوۃ العلما سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد ندوۃ العلما کے کتب خانہ کی ترتیب کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اسی اثناء میں علامہ مرحوم کی یادگار میں دار المصنفین کی بنا ڈالی گئی۔ اور مرحوم اس علمی مجلس کے اولین رفقاء کی جماعت میں داخل ہوئے پھر رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں طلب کر لئے گئے۔ اسکے بعد خدا بخش خاں مرحوم کی پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں تشریف لے آئے چند سال گذرے کہ کتب خانہ کے مصارف میں تخفیف کی ضرورت پڑی اور حکومت کو ان کے خدمات سے محروم ہونا پڑا۔ یہاں ان کا خالی ہونا تھا کہ ریاست رام پور کے سرکاری کتب خانہ کی خدمت کی انجام دہی کیلئے طلب کئے گئے۔ اسی اثناء میں مدرسہ شمس الہدیٰ میں پرنسپل کی جگہ خالی ہوئی تو حکومت بہار نے ان کے پچھلے خدمات کا لحاظ کرکے اس عہدہ پر انہیں سرفراز کیا۔ اور مدرسہ میں انکی تعلیمی و انتظامی صلاحیتوں کے غیر معمولی اثرات ظاہر ہوئے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور صرف ۴۵، ۵۰ کے سن میں رحلت کی۔ ہماری غیر معمولی توقعات ان سے وابستہ تھیں۔ افسوس کہ اب وہ خواب و خیال ہوگئیں۔

دار المصنفین کے زمانہ قیام کی دو کتابیں اردو زبان میں ان کی یادگار ہیں۔ ایک "خلفائے راشدین" جس میں خلفائے اربعہؓ کے سوانح حیات ہیں۔ اور دوسری سیر المہاجرین جلد اول، مرحوم کا زیادہ وقت بانکی پور کے کتب خانہ میں گذرا یہاں کی نادر قلمی کتابوں کی فہرست کی ترتیب و تدوین میں ان کی تحقیق و تلاش کی غیر معمولی صلاحیتیں صرف ہوئیں۔ اور اس کتبخانہ کی فہرست کی ضخیم مجلدات انگریزی زبان میں مدون کیں جو اہل علم میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

مرحوم طبعاً خاموش، صلح پسند اور سادہ مزاج تھے ملنے جلنے والوں سے اخلاق و محبت سے پیش آتے تھے۔ خداوند تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور صاحبزادوں اور عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

صاحبِ نگار" کے اخلاق و صداقت کو اگر "غیر مشتبہ نگاہوں" سے منظر عام پر دیکھنا ہو تو اپریل ۱۹۴۱ء کے نگار میں ملاحظات کے تحت "ندویوں کے اخلاق" کا عنوان دیکھا جائے۔ اخلاق و صداقت کی بے مائگی کا ایسا افسوسناک مظاہرہ شاید ہی کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں آیا ہو۔ اسمیں ندویوں کو عموماً اور حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کو خاص طور پر جس شرمناک طریقہ سے برا بھلا کہا گیا ہے۔ وہ نگار ہی کو زیب دیتا ہے۔ اور اسکا ہمیں کوئی ملال بھی نہیں۔ کہ جو شخص خدا، رسول، انبیائے کرام، صحابۂ عظام پر افترا باندھ سکتا ہے سب دستم کر سکتا ہو۔ وہ اگر چند عاجز بندوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کرے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے، لیکن اس پر حیرت ضرور ہے کہ اب تک یقین نہ تھا کہ وہ روز روشن میں ایسا سفید جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ جس کے جھوٹ ہونے پر ایک دو نہیں ہزاروں آدمی گواہیاں دے سکتے ہوں۔ ...... پٹنہ سے ایک ہفتہ وار طنزیہ اخبار "دورِ جدید" شائع ہوتا ہے۔ اسکی دونوں اشاعتوں میں انہی صاحبزادے کا تعارف ہم جنوری کے نظرات میں کرا چکے ہیں، نہایت غیر سنجیدہ اور تیز و تند طرز نگارش میں چند مضامین چھپے تھے، صاحب نگار نے حیرت میں ڈالنے والی جسارت کیساتھ کذب و افترا کا یہ طومار باندھا کہ اسی اخبار کی دو اشاعتوں کی دو تحریروں کو دو علیحدہ علیحدہ اخبار دنکی طرف منسوب کیا، اور ان میں سے ایک کی ادارت برادر عزیز مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کیٹلاگر اورنٹیل لائبریری پٹنہ کیطرف منسوب کی، اور دوسرے فرضی اخبار کی ادارت کسی دوسرے ندوی اڈیٹر کیطرف، اور پھر فرضی شہادت کی بنیاد پر ندویوں کی پوری جماعت پر گالیوں کے تیر برسائے چنانچہ لکھتا ہے:۔

"پٹنہ کے دو اخباروں کا کچھ اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ جنکے اڈیٹر و نگراں سب کے سب ماشاءاللہ ندوی ہیں، ایک اخبار میں علامہ سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید حواری مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کسی مستفسر کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں ....
ایک دوسرے اخبار کے دوسرے ندوی اڈیٹر نے کسی اور مستفسر کا جواب دیتے ہوئے یوں خامہ فرسائی کی ہے ...."

حالانکہ یہ دونوں اقتباسات جو دو علیحدہ علیحدہ ناموں سے پیش کئے گئے ہیں اور دونوں کے اڈیٹر اور نگراں ندوی قرار پائے ہیں، صرف اسی ایک اخبار "دورِ جدید" کی دو اشاعتوں کے ہیں۔ اور "دورِ جدید" کے اڈیٹر اور ناشر کو ندوہ یا ندویت سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں۔ ..... کیا صاحب نگار کو اس کا بھی خیال نہ آیا کہ کم سے کم جس حلقہ میں دورِ جدید جاتا ہے، اسمیں نگار کے پہنچنے کے بعد اسکی صداقت بیان کے متعلق کیا رائے قائم کیجائیگی۔ ! مدعیان کذب بیانی و افترا پردازی کا یہ پیکر مجسم معلم اخلاق کے کاغذی پیرہن میں نمودار ہو کر دوسروں کو اخلاق کا درس دیتا ہے۔ اور اذا مروا باللغو مروا کراما کا وعظ سناتا ہے ـــــ صاحب نگار کے اس بیان کی تردید برادر موصوف کیطرف سے اخبارات میں چھپ چکی ہے۔ اور صاحب نگار کو توجہ دلائی گئی ہے۔ اگر نگار کے آیندہ پرچہ میں انہوں نے اس باطل بیان کو واپس نہیں لیا تو شاید کوئی دوسرا قدم اٹھایا جائے۔

جناب تمنائی ہمارے صوبہ کے روشناس ادیب ہیں۔ اور ہمارے صوبہ میں نئے ادب کی ترویج کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، اس مقصد کیلئے انہوں نے "نیا سنسار" کے نام سے ایک مکتبہ قائم کیا ہے اور اسکی طرف سے "اردو لائبریری سیریز" کے نام سے ایسی کتابیں شائع کرنا چاہتے ہیں جو معیاری ہوں۔ اور جنکی قیمت ۸ر سے زیادہ نہ ہو۔ نیز ارباب ذوق کیلئے اسکی ممبری کے قواعد مقرر کئے گئے ہیں چنانچہ عام ممبروں کی فیس صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ انہیں ہر کتاب آدھی قیمت یعنی صرف ۴ر میں دیجائیگی۔ علاوہ محصول ڈاک۔ کتاب کے شائع ہونیکی اطلاع انہیں

دیدیجائیگی۔ بارہ کتابوں کی قیمت یعنی تین روپے جمع کر دینے سے محصولڈاک معاف ہوجائیگا۔ "نیا سنار" کی دوسری مطبوعات بھی ۲۵ فیصدی کمیشن کی رعایت کیساتھ دیجاسکینگی۔ دائمی ممبری کی فیس پچیس روپے رکھی گئی ہے۔ انہیں اس سیریز کی سب کتابیں بلاقیمت دیجائینگی۔ اور دوسری کتابوں میں ۳۳ فیصدی کمیشن دیاجائیگا۔ یہ نوجوان خوش مذاق ہیں۔ ادب کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں ضرورت ہے کہ انکی ہمت افزائی کیجائے، اور اس مکتبہ کی ممبری قبول کرکے کتابوں کی اشاعت میں امداد پہنچائی جائے۔

مئی کے پہلے ہفتہ میں صوبہ بہار کے اسکولوں کا نتیجہ امتحان شائع ہوا ہے۔ ہم نے مسلم ہائی اسکول پٹنہ کے نتیجہ کو غیر معمولی اشتیاق کی نظروں سے دیکھا۔ اور یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی کہ شان امتیازی کیساتھ اس اسکول کے امتحان کا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ اس اسکول کیلئے میٹرک کا یہ دوسرا سال تھا پچھلے سال بھی اس کا نتیجہ اچھا تھا۔ اور امسال اسنے پہلے سے بھی ترقی کی ہے ۲۶ لڑکے امتحان کیلئے بھیجے گئے تھے۔ ان میں ۲۰ طلبہ کامیاب ہوئے جنمیں ۱۴ درجہ دوم اور چھ درجہ سوم میں ہیں۔ ایسا شاندار نتیجہ صوبہ کے بہت کم اسکولوں کا ہے۔ ہم اس کامیابی پر اسکول کے روح رواں جناب حیدر امام صاحب بیرسٹر، جناب ڈاکٹر سید الحفیظ صاحب فردوسی مڈیکل ہال اور جناب محمد ادریس صاحب بی اے، ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ باشندگان عظیم آباد اس مسلم تعلیم گاہ کے افادی پہلوؤں پر توجہ فرمائیں اور اسکو جلد سے جلد اس قابل بنادیں کہ یہ اپنی عمارت میں منتقل ہوجائے۔

نظرات کی کاپی پریس میں جاچکی تھی کہ مئی کا نگار آیا۔ اور جناب نیاز فتحپوری کی اس تحریر پر نظر پڑی جو انہوں نے "معذرت" کے عنوان سے مئی کے ملاحظات میں شائع کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> "پچھلے مہینے ملاحظات کے سلسلہ میں میں نے "ندویوں کے اخلاق" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا تھا اور پٹنہ کے ایک اخبار "دور جدید" کی ایک عبارت نقل کرتے ہوئے اسے مسعود عالم صاحب ندوی سے منسوب کیا تھا ــــــ میں نے یہ ایک تراشہ کی بناء پر لکھا تھا جو پٹنہ کے ایک صاحب نے بھیجا تھا۔ اور جسکے ایک گوشہ میں سرخ روشنائی سے "اڈیٹر مسعود عالم ندوی" تحریر تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مسعود عالم صاحب ندوی اس اخبار کے اڈیٹر نہیں ہیں۔ اور وہ عبارت ان سے منسوب نہیں کیجاسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسعود عالم صاحب ندوی کو اس نسبت سے تکلیف ہوئی ہوگی کیونکہ وہ تحریر ہی ایسی تھی جس کی نسبت سے انسان کو ننگ و عار آنا چاہیئے۔
>
> اور اس لئے میں معذرت خواہ ہوں۔"

اگر جناب نیاز اپنی اس معذرت کیساتھ یہ بھی تحریر فرماتے کہ وہ دونوں اقتباسات اسی ایک اخبار "دور جدید" کے تھے۔ تو وہ اپنی وسعت قلب کا زیادہ ثبوت دیتے۔ اور یہ بدگمانی دور ہوجاتی کہ انہوں نے محض ندوی جماعت کو مورد الزام قرار دینے کیلئے ایک ہی اخبار کے دو تراشوں کو جان بوجھ کر دو "ندویوں" کی طرف منسوب کیا۔ تاہم ہم شکرگذار ہیں کہ انہوں نے توجہ دہانی پر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور علانیہ معذرت خواہ ہوئے۔

(۲)

از جناب سعید الحق صاحب عاشق دیسنوی ایم اے

۳

ہمہ گیری:- جو چیز شکسپیر کے ڈراموں میں سب سے نمایاں ہے۔ وہ جذبات کی ہمہ گیری ہے۔ یورپ کا متمدن انسان ہو یا افریقہ کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، چینی ہو یا جاپانی، عجمی ہو یا عربی۔ ہندی ہو یا افغانی، قطب شمالی کے باشندے ہوں یا خط استوا پر رہنے والے۔ سب کے سب منزل حیات کے کسی نہ کسی سنگ میل پر ایک لیر LEAR یا اوتھیلو OTHELLO یا ایک اورلینڈو ORLANDO یا ایک ڈیوک اورسینو DUKE ORSINO یا ایک رومیو ROMEO یا ایک ٹائمن TIMON کے جذبات اپنے دلوں میں موجزن پاتے ہیں۔ یہ جذبات ہر ملک اور قوم کے افراد پر حکومت کرتے ہیں اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔

شکسپیر کے نگارخانہ میں زندگی کے اعلیٰ ترین اور اسفل ترین شعبوں کے نمایندوں کی تصویریں ملیں گی۔ اگر ایک طرف کسی جلیل القدر، کشور کشا فاتح سیزر CE R کی تصویر ہے تو دوسری طرف ایک فلاسفر ژاک (JAQUES) کی بھی تصویر ہے۔ جو حیات انسانی کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ ٹچ اسٹون TOUCHSTON کے ایسے مسخرے بھی ہیں اور ایاگو IAGO کے ایسے لچے بھی۔ رومیو ROMEO کے ایسے ناکام عاشق بھی ہیں اور اورلینڈو ERLUNDO کے ایسے بھی بامراد۔ فوسٹیف FASTAFF کے ایسے تر دامن بھی ہیں۔ اور میکبتھ MACBETH کے ایسے قاتل بھی، روزیلنڈ ROSALAND کی ایسی شریف النفس خواتین بھی ہیں۔ اور لیڈی میکبتھ LADI MEKBETH کی ایسی خونین مناظر کو دیکھ کر خوش ہونے والی عورتیں بھی ہیں۔ غرضکہ اس آرٹ گیلری میں اعلیٰ ترین اور اسفل ترین لوگ موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شکسپیر کے ڈراموں میں بعض افراد بڑے درجے کے بیہودہ اور فحش کلام ہیں۔ اور تہذیب و نفاست سے سر سے سے ناآشنا ہیں۔ وہ گندہ خیال اور گندہ ذہن ہیں۔ انکا مذاق نہایت ہی نامہذب اور ناشائستہ ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شکسپیر انسانی زندگی کا مصوّر ہے اور جہاں وہ محاسن کو دکھاتا ہے۔ وہاں قبایح کو بھی آشکار کرتا ہے بری بھلی تمام چیزوں کا عکس آئینہ میں چلا آتا ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شکسپیر کو ہمیشہ کیسہ پری کی فکر رہتی اور اس زمانہ کے تماشائیوں کے ذوق کا تقاضا تھا کہ اسٹیج پر بے حیائی اور فحش کلامی ہو۔

ماخذ: شکسپیر کے اکثر ڈرامے اپنے قصوں کے لئے دوسری کتابوں کے رہین منت ہیں۔ لیکن شکسپیر ان قصوں کو اپنی مسیحائی سے کیا سے کیا بنا دیتا تھا۔ وہ پرانی ہڈیوں میں نئی روح پھونک دیتا تھا۔ شکسپیر کے جولیس سیزر JULIS CACAR اور کریولینس CEIROLANO میں چلتے پھرتے رومی نظر آتے ہیں۔ ۔ بن جونسن کے سیجنس SEJANS۔ اور کیٹیلائن CATLAIN میں اگرچہ رومی رسوم و عادات کا ایک صحیح نقشہ ملتا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان ڈراموں میں خوشنما کپڑوں میں ملبوس کٹ پتلیاں کسی ڈورے پر ناچ رہی ہیں۔ شکسپیر نے پلوٹارک PLUTARCE کی کتاب "مشاہیر روما" اور ہولنشڈ HOLLNSHED کی کتاب کرونیکلس (تواریخ) سے ڈرامے اور قصے اخذ کئے ہیں۔ ہیملٹ HAMLET کا قصہ ہولنیڈ کے سکیرگریمٹکس SAXOGRAMMAHCUS نامی قصہ نویس نے بیان کیا ہے اور غالباً شکسپیر نے یہیں سے اپنے ڈرامہ کا قصہ اخذ کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کڈ KYD کی اسپنش ٹریجڈی SHPANS TREGDI نے شکسپیر کے دماغ میں ہیملٹ HAMLET لکھنے کا خیال پیدا کیا۔ کوریولینس CORIOULANS جولیس سیزر JULIES-CAESAR اور انیٹونی وکلیوپیٹرا (ANTONY & CLEOPATARA) کے ماخذ رومی تاریخ میں ملیں گے۔

اطالوی قصص میں بھی شکسپیر کے لئے مواد کافی تھا۔ چوسر CHOCARE کے وقت سے لیکر اس کے زمانہ تک یورپ کے قصہ نویس بوکیچیو BOCCACIO کی ڈی کیمرونی DECAMRONE کے دست نگر رہے بوکیچیو کی اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی تمام مشہور زبانوں میں ہوا۔ سولہویں صدی عیسوی کے انگلستان میں بوکیچیو کی جگہ ایک دوسرے اطالوی قصہ نویس بنڈیلو BANDELLO نے لی۔ انگلستان میں ان اطالوی قصوں کا مجموعہ پینٹر PINTAR کی پیلیس، اور پلیشر PALACE OF PLEASURE (ایوان مسرت) کی شکل میں شایع ہوا۔ قیاس غالب ہے کہ یہ کتاب شکسپیر کے زیر مطالعہ رہی ہوگی۔ اولرزول ویٹ انڈزول۔ کا قصہ بوکیچیو کے ایک قصہ سے جس کا ترجمہ پینٹر نے کیا تھا۔ ماخوذ ہے۔ ان تمام قصوں کے قالب میں شکسپیر نے زندگی کی روح پھونک دی۔ ذیل میں اس کے ڈراموں کے ماخذوں کی ایک فہرست دیجاتی ہے۔

نام ڈرامہ	ماخذ
1-LOVE'S LABOW'S LOST	۱۔ طبعزاد
2-TWO GENTLE-MEN OF VERONA	۲ DIANA ENMORADE GEOGE DE BY MONTEMAYOR

Play	Source
3-COMEDY OF ERRORS	۳ MENAECHMI OF PLAUTUS.
″ ″ ″ ″ ″	یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیکسپیر نے اس کو لاطینی میں
″ ″ ″ ″ ″	پڑھایا۔ اس کا ترجمہ پڑھا یا کسی دوست سے
″ ″ ″ ″ ″	اس کا قصہ سنا یا اسٹیج پر ہوتے ہوئے دیکھا۔
	AEGEON کا کیریکٹر اریوسٹو ARIOSTO
	کی GLI SUPPOSITI سے ماخوذ ہے۔
4-TITUS ANDRNIGWS	۴ ——— ؟
5-KING HENRY VI PANT I	۵۔ RAPPAEL HOLLIN
	SHED'S CHRONICLES
6- ″ ″ ″ PANT. II	۶ EDWORD HALL'S
″ ″ ″ ″ ″	CHRONICLES
7-KING HENRY V. PANT. II	۷
8-A MIDSUMMER	۸۔ طبعزاد
NIGHT'S DREAM	
9-ROMIO & JULIET	۹۔ اطالوی قصہ سے ماخوذ ہے غالباً شیکسپیر نے
″ ″ ″ ″ ″	پینٹر PAINTER کی کتاب
″ ″ ″ ″ ″	PALACE OF PLEASURE سے
″ ″ ″ ″ ″	اس قصہ کا مواد لیا۔
10- KING JOHN	۱۰۔ HOLLINSHED'EDWORD
″ ″ ″ ″ ″ ″ ″	HALL, FALLAN
11- KING RICHORD II	۱۱۔ RAPHAEL HOLLINSHED'S.
	CHRONICLE
12- ″ ″ ″ III	۱۲ ″ ″ ″ ″ ″
13- ″ ″ ″ ″	۱۳۔ اطالوی مصنف GIOVANNI
″ ″ ″ ″ ″	کی کتاب FIORENTINO

IL PECRONE	" " " "
GEORGE. GASCOIGNE -۱۴	14- RE TAMING OF THE SHREW
HOLLINSHED'S CHRONICLES -۱۵	15- KING HENRY IV, PANT I
-۱۶	16- PANT II
۱۷	17- KING HENRY V
GIOVANNI FIORENTINO- -۱۸	18- THE MEARY WIVES OF WINDSOR
THOMAS LODGE -۱۹ کی کتاب ROSALYNDE	19- SAYOU LIKEIT
	" " " "
GOLDEN کی کتاب UPHNES -۲۰	20- MUCH ADO ABOUT NOTHING
اس کا زیادہ تر حصہ شیکسپیر کی ایجاد ہے۔ کچھ حصہ اطالوی مصنف	" " " "
کے ناول سے ماخوذ ہے۔	" " " "
BANDELLO " -۲۱	12- TWELFTH NIGHO
BOCCACIO - بوکیچیو - ۲۲	22- ALL'S WELL THAT ENDS WELL
DECAMERONE - ڈی کیمرون	
PALACE غالباً شیکسپیر نے اس قصہ کو	" " " "
OF PLEASURE میں پڑھا ہوگا۔	" " " "
SIR THOMAS NORTH'S - ۲۳ PLUTARCH	23- JULIUS CAESAR
	" " " "
SAXO GRAMMATICUS -۲۴	24- HAMLET
HISTORIADUNICA کی کتاب	" " " "
CHOUCER چوسر کی -۲۵	25- TROILUS & CRESSIDA
TROILUS & CRSSIDA	" " " " "

JOHN LYDGATE جون لڈگیٹ	″	″	″	″
TROY BOKE کی	″	″	″	″
RECUYELS OF ایک فرانسیسی کتاب	″	″	″	″
TROY کا ترجمہ	″	″	″	″
جو کیکسٹن CAXTON نے لکھا تھا۔	″	″	″	″
ہومر HOMER کی ILIAD کا ترجمہ جو	″	″	″	″
چیمپین CHAMPAIN نے لکھا تھا۔	″	″	″	″
ایک گمشدہ ڈرامہ TROILUS & CRESSIA	″	″	″	″
جو ٹومس ڈکر THOMAS DEKKER اور	″	″	″	″
ہنری شٹل HENRY CHETTLE کی کاوشوں	″	″	″	″
کا نتیجہ ہے۔	″	″	″	″

HECATOMITHI BY GIRALDI CINTHIO (ناولوں کا مجموعہ)	26- MEASURE FOR MEASURE
″ ″ ″ ″ ۲۷	27- THELO
HOLLINSHED ۲۸	28- KING LEAN
″ ″ ″ ″ ۲۹	29- MACBETH
۳۰ - پلوٹارک کی کتاب میں LIVES کا ترجمہ جو سر ٹومس نیش SLR THOMAS NASH	30- ATONY & CLEOPATRA
″ ″ ″ ″ ۳۱ -	31- CORIOLANUS
۳۲ - WILLIAM PAYNTER'S PALACE OF PLEASURE — PLUTARCH'S LIFE OF ANTONIUS LUCIAU'S DIALAGUE	32- TIMON OF ATHENS
۳۳ - اس کا قصہ پانچویں صدی کی ایک یونانی کتاب	33- PERICLES

" " " "	سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی میں ہوا۔ اور
" " " "	لاطینی سے انگریزی میں۔ اس انگریزی ترجمہ کو ۱۵۷۶ء
" " " "	میں لورنس ٹو این LAURENCE
" " " "	TWINE نے
" " " "	THE PATTERN OF PAYNFULLAD
" " " "	کے نام سے شائع کیا۔
34 - CYMBELINE	۳۴ HOLLINSHED
35 - THE WINTER'S TALE	۳۵۔ روبرٹ گرین ROBERT
" " " "	GREENE کی کتاب
" " " "	PANDOSTA
36 - TEMPEST	۳۶ ایک ہسپانوی مصنف ANTONIODE
" " " "	ESLAVA کے ناول سے ماخوذ ہے
37 - KING HENRY VIII	۳۷۔ HOLLINSHED

شیکسپیر کے تصانیف کے مختلف دور | تصانیف کا پہلا دور ۱۵۸۸ء سے لیکر ۱۵۹۴ء تک

۱۵۹۲ء (ROMEO & JULIET)	۱۵۹۴ء (THE MERCHANT OF VENICE)
۱۵۹۱ء (LOVE'S LABOW'S LOST)	۱۵۹۲ء (THE COMEDY OF ERRORS)
۱۵۹۱ء (TWO GENTLEMEN OF VERONA)	۱۵۹۴ء-۱۵۹۵ء (A MIDSUMMER NIGHT'S DREAM)

دوسرا دور ۱۵۹۴ء سے لیکر ۱۶۰۰ء تک

۱۵۹۷ء (HENRY IV)	۱۵۹۸ء (HENRY V)
۱۵۹۵ء (THE TAMING OF THE SHREW)	۱۵۹۸ء (THE MERRY WIVES OF WINDSOR)
۱۵۹۹ء (MUCH ADO ABOUT NOTHING)	۱۶۰۰ء (AS YOU LIKE IT)
۱۶۰۰ء (TWELFTH NIGHT)	(SAN RETA) کا زیادہ تر حصہ ۱۵۹۴ء میں لکھا گیا

تیسرا دور ۱۶۰۰ء سے لیکر ۱۶۰۸ء تک

اس دور میں المناک ڈراموں کی کثرت ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس دور میں شیکسپیر کی زندگی میں کوئی ایسا المناک واقعہ رونما ہوا جس کا اثر اس دور کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔

سنہ ۱۶۰۱ء (JULIUS CAESAR) سنہ ۱۶۰۲ء (HAMLET) (OTHELLO)

سنہ ۱۶۰۴ء (KING LEAN) سنہ ۱۶۰۵ء میکبتھ سنہ ۱۶۰۶ء

چوتھا دور سنہ ۱۶۰۸ء سے لیکر سنہ ۱۶۱۲ء تک (PERICLES)(ANTONI & CLEOPATRA)

سنہ ۱۶۰۸ء (TIMON OF ATHENS) سنہ ۱۶۰۹ء (CORIOLANUS)

سنہ ۱۶۱۲ء (HENRY VIII) سنہ ۱۶۱۰ء (CYMBELINE)

سنہ ۱۶۱۱ء (ZAULRT) سنہ ۱۶۱۱ء (THE WINTER'S TALE)

شیکسپیر کے نام کی ہجا! اس کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ مگر جو سب سے زیادہ رائج ہے SHAKE S PEARE ہے۔ مگر شیکسپیر نے اپنے وصیت نامہ پر جو دستخط کیے ہیں وہ SHAKSPERE ہے۔

ایک امریکی خاتون کا نظریہ! ایک امریکی خاتون نے محض شہرت حاصل کرنے کے لئے ایک از سرتاپا غلط بے بنیاد نظریہ قائم کیا کہ شیکسپیر کے ڈراموں کا مصنف بیکن BACON تھا۔ بیکن (سنہ ۱۵۶۱-۱۶۲۶ء) جیمس دل شاہ انگلستان کے عہد سلطنت میں لارڈ چانسلر کے اعلیٰ منصب پر مامور تھا۔ مگر علم و دانش کا یہ پیکر رشوت ستانی کے جرم میں معزول ہوا۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

(ESSAYS) (NEW ATLANTIS' ADVACEMENT OF LEARING NOVUN ORJANUM)

(THE HESTORY OF HENRY VII)

بیکن جیسے شخص کے لئے جو اپنے مناصب کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اتنی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کرسکا۔ یہ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ اسکو ان ڈراموں کے لکھنے کی فرصت ملی ہوگی۔ بیکن کا ان ڈراموں کا مصنف ہونا ایک ایسی بات ہے جس کو کبھی عقل سلیم قبول نہیں کرسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں میں جابجا نثر کے حصے ہیں۔ بیکن کی نثر اور ان ڈراموں کی نثر کا موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کی نثر میں جابجا شعریت کی جھلک نظر آتی ہے یہاں تک کہ اس کی نثر کے بعض جملے عروض و تقطیع سے بے نیاز نہیں۔ بیکن کی نثر بالکل خالص نثر ہے۔ اور شعریت اور عروض و تقطیع سے بالکل بے نیاز ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۱۰) اس لئے دراصل انگلستان میں پریس کی آزادی محض ادبی آلام و مصائب کا نتیجہ ہے۔ جو ارباب صحائف اپنے پچھلے دوروں میں اوٹھا چکے ہیں۔ اور جس قدر سخت سزائیں اُنہوں نے بھگتیں، اُسی قدر زیادہ وہ حریت و آزادی کی دولت سے مالامال ہوئے۔ یہاں تک کہ اب سقراط کے اس قول پر صحیح طور سے انگلستان ہی عمل پیرا نظر آتا ہے کہ۔ "انسان آفتاب کی حرارت اور اسکی شعاعوں سے تو مستغنی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ بغیر آزادیٔ رائے وہ اجتماعی حیثیت سے ایک لمحہ بھی زندگی گذار سکے" (ملخص از ہلال مصر)

نواب سید غلام حسین اور انکی کتاب کا پایہ!

از جناب حکیم محمد نقی صاحب

ندیم کے دو نمبروں بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء میں نواب اعتماد الدولہ کامگار خاں پر میرا ایک سلسلہ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں نواب سید غلام حسین اور ان کی کتاب سیر المتاخرین بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جناب سید حیات حسین صاحب وفا نے راقم سطور کو مخاطب کر کے چند سوالات کئے ہیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ ان کے جوابات پیش ہیں۔

سب سے پہلے میں عرض کر دوں کہ نعوذ باللہ مجھے نہ تو مورخ موصوف سے ذاتی عناد رہے نہ ان کی ذلت منظور رہی۔ غرض تو صرف تنقیح روایات ہے۔ کسی نقاد کے تنقیدی الفاظ سے یہ سمجھ لینا سراسر ناانصافی ہے کہ اس کے یہ الفاظ ذاتی عناد کی بنا پر ہیں۔ اور رنگ زیب کبھی اکبر کو جد اکفر کہدیا کرتا تھا۔ تو کیا اس کو اپنے ان الفاظ سے اکبر کی توہین منظور تھی۔ اب آپ اپنے سوالوں کے جواب ملاحظہ فرمائیں۔

سیر المتاخرین کا پایہ:

یہ ہمارے اسلامی عہد کی سب سے آخری تاریخ ہے اس کے بعد ہم بہ استثنائے یک دو اس دور کا کوئی دوسرا محقق یا مورخ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور فن تاریخ کے ماہرین کا یہ مذہب ہے کہ کوئی تاریخی روایات اس وقت تک پایہ ثبوت تک نہیں پہونچی جب تک کہ اس پر معتد بہ تنقیدیں نہ کی گئی ہوں۔ اور فن درایت اور روایات کے اصولوں پر نہ پرکھی گئی ہو۔ اور یہ درجہ آج تک سیر المتاخرین کو حاصل ہی نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ تاریخ مذکور ایک ایسی کتاب ہے جس کے واقعات سے مصنف کو بڑا لگاؤ ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے سوانح لکھتے ہیں جن میں انہوں نے زندگی گذاری اور جن کے ہاتھوں مصنف نے خوشی کی گھڑیاں دیکھیں اور کبھی موجب شکایت واقعات بھی پیش آئے۔ اس لئے غیروں کے ساتھ وہ اپنے واقعات اور حالات کو بھی لکھنے پر مجبور ہوئے۔ پھر ایسی حالت میں ان روایات کو تہام طرفداری اور پردہ پوشی کے عیوب سے پاک سمجھنا کہاں تک قرین قیاس ہے۔ جب کہ بعض روایات کی صحت کے باب میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کی جاتی مصنف کی حیثیت ان موقعوں پر ایک طرفدار یا ناطرفدار راوی کی ہوجاتی ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر سیر المتاخرین آج تک تشنۂ تحقیق و تنقیح ہے۔ ہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے واقعات اس کے بالکل صداقت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب سرے سے غیر مستند ہے۔

سلسلۂ فعل ہے۔ جو غیر محسوس طور پر لٹریچر میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے واشگاف اظہار کے لئے کسی اہم وقت اور موقعہ کا متلاشی رہتا ہے۔

جنگِ عظیم سے پہلے

دنیا کی تاریخ میں جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء ایک بہت بڑی حدِ فاصل[1] ہے۔ جس سے اِدھر اور اُدھر مختلف اثرات و عوامل، مختلف خصوصیات و امتیازات اور مختلف میلانات و رجحانات کی صاف صاف اور واضح سرحدیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً جنگ سے پہلے کے یورپ اور بعد کے یورپ میں خیالات کے معاملہ میں اتنا بیّن فرق نظر آتا ہے۔ جس کا اندازہ شاید ہندوستان میں نہ کیا گیا ہو۔ جنگ سے پہلے یورپ کی فضا مادہ پرستی اور قوم پرستی سائینس کے "این جہانی" پس منظر اور روحانیت سے بیزار جارحانہ اسپرٹ سے اس طرح لبریز ہو گئی تھی کہ غیب کی تاریکیوں سے گذر کر حقائق کی درخشاں دنیا پر پڑنے والی نظروں نے پیش گوئی کر دی تھی کہ تہذیبِ مغرب کی قبا کے پرزے اب فضائے آسمانی میں اڑنے والے ہیں۔ کیوں کہ ڈارون کے نظریۂ حیات نے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لئے جو زہریلا مگر سچا تصور عجلت پسند اور فریب خوردہ انسان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس نے خود ہی ڈارونیت کی موت کا بندوبست کر دیا تھا۔ وکٹورین عہد کے اواخر میں انگلستان میں جو تردد اور روحانی بے اطمینانی موجود تھی۔ اس کا اظہار اس عہد کے صاحبان کمال اور اربابِ فن کے کارناموں سے بخوبی ہوتا ہے مثلاً جان رسکن نے آرٹ اور اخلاق میں جو گہرا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ اور آسکر وائلڈ نے ایک ایسا نظریۂ فن پیش کیا۔ جس میں آرٹ کو زندگی سے الگ اور سراسر منقطع حقیقت ثابت کیا۔ یہ شاعر اور مصنف آرٹ محض برائے آرٹ کی خاطر کے خیال کا متبع تھا اور زندگی میں مروجہ اخلاقی اصولوں کا سب سے بڑا مخالف۔ اس کی اپنی زندگی آزاد روش کی آئینہ دار تھی جس کا اثر انگلستان اور ہندوستان کے نوجوانوں پر بہت گہرا پڑا۔ اگرچہ میلوری کی کتاب The WA Y OF [illegible] نے اس کے خلاف دوسری شاہ راہ نکالی لیکن واقعہ یہ ہے کہ آسکر وائلڈ اور اس کے بعد ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے جو راستہ قائم کیا۔ اس کا اثر آج تک محسوس ہوتا ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد

یورپ میں جنگِ عظیم کا اثر مختلف طبیعتوں پر مختلف ہوا۔ ایک فرانسیسی کے یہ الفاظ ایک گروہ کی ذہنیت کو آشکارا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کہ "اگر واقعی خدا ہوتا تو شاید یہ تمام مصیبتیں ظہور میں نہ آتیں۔"[2] مگر ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جس نے اس خوفناک قیامت کو روحانی کمزوریوں کی طرف منسوب کیا۔ اور دنیا میں ایک اخلاقی انقلاب کی ضرورت محسوس کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر جماعت کا نظریہ چنداں ہمہ گیر پہلی ثابت ہوا۔

(1) MUIR, POLITICAL CONSEQUENCES OF THE WAR (1930)

نیز پیامِ شباب (قاضی نذر الاسلام کی نظموں کا مجموعہ) ص ۷

(2) RAUTH-TAWARAR THE 20TH-CAMTURY P. 9:
WILLIAMR — MABERM ENYLIRH WRITAR (1890-1914)

اقتباسات

دنیائے اردو جنگ عظیم کے بعد

از

جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے، ڈی لٹ

عنوان بالا سے اردو کے ممتاز علمی سہ ماہی رسالہ "اورینٹل کالج میگزین" میں ایک قابل قدر مقالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ناظرین "ندیم" کو فائدہ پہنچانے کے لئے یہ مناسب نظر آیا کہ اس کو تمام و کمال ذیل میں پیش کیا جائے۔ اس لئے ہم رسالہ مذکور کے شکریہ کیساتھ اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں۔ "ندیم"

اپنے زمانہ کے ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا جہاں بظاہر آسان ہے وہاں بہت مشکل بھی ہے اور غالباً مشکل بھی اسی لئے ہے کہ بظاہر بہت آسان ہے۔ انسان کی فطرت میں اسلاف کی عظمت اور بڑائی کی جو طلسم عشق عقیدت موجود ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم عصر مصنف کی شخصیت نظروں میں نہیں جچتی۔ اس کے علاوہ معاصرانہ مدارات اور مراعات، دوستانہ مراسم اور تعلقات، صلہ کی تمنا اور شہرت اور زر کی ترغیبات حقیقتاً بے لاگ ادبی تنقید کے راستے میں سنگ گراں ثابت ہوتی ہیں۔ اور ایک نقاد کے لئے کھرے کھوٹے کا پرکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جدید دور کے مبصر کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ بقول ولیمز[1] سے اکثر ایسے گلفروشوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن کے ہاں کا ہر پھول عمدہ، اعلیٰ اور بے نظیر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسی دعویٰ اور اسی اعلان پر ان کی بکری موقوف ہے۔ بقول شاعر۔

؎ آپ جس پھول کو توڑیں وہی رعنا ہوگا۔

اسی طرح ادبی ادوار کی حد بندی بھی بہت مشکل چیز ہے۔ اثرات کا عمل اور ردعمل وہ مخفی اور خاموش

جنگ کے اثرات کے لئے دیکھو (1) WILLIAMS, MODERN ENG. WRITERS (1890-914) P. 3

اسی طرح انگلستان کے اخبارات کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے۔ اور خصوصاً اردو کے ارباب جرائد کے لئے غور سے سننے کی ہے۔ کہ وہ اپنے کالموں میں ذاتیات کی بحث مطلقاً نہیں چھیڑتے۔ اور معاصرین سے جب اختلاف کرتے ہیں۔ تو اڈیٹر کی ذات کو درمیان نہیں لاتے۔ بلکہ اکثر اپنے معاصر کا نام تک نہیں لیتے۔ محض خیالات کی تردید میں بہ دلائل مضامین شائع کرتے ہیں۔ انگلستان میں اخبارات کے باہمی احترام کا جو جذبہ ہے۔ وہ دوسرے ملکوں میں کم دیکھنے میں آیا ہے۔

اسی طرح اخبارات حکومت کے دردولت پر بھی کاسۂ گدائی لئے نہیں پھرتے۔ اجنبی ممالک میں اخبار ٹائمس کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سرکاری اخبار ہے۔ حالانکہ اسے حکومت سے کچھ دور کا بھی تعلق نہیں البتہ چونکہ اس کے ذرائع وسیع ہیں۔ اور ملک میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے حکومت کی نگاہ میں بھی اس کا اعزاز قائم ہے۔ اس لئے ارباب حکومت میں اس کا داخلہ باسانی ہو جاتا ہے۔ اور سرکاری خبریں اسے جلد مل جاتی ہیں اور حکومت اس کی رایوں کو بھی وقعت دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا کی نگاہوں میں سرکاری اخبار کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے بیشتر مواقع آتے ہیں کہ ٹائمس ارباب حکومت پر نہایت سخت نکتہ چینیاں کرتا ہے۔ اور اس کی پالیسیوں کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔

انگلستان میں پریس کو جو آزادی حاصل ہے۔ اس سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ اخبارات کا تعلق حکومت اور اسکی پارٹیوں سے ہے۔ حالانکہ وہاں بھی پریس کو آزادی کی یہ نعمت انتہائی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔

انگلستان کی تاریخ شاہد ہے کہ ارباب اقتدار نے پریس اور اخبارات کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، اور ابتداءً ان کا گلا دبانے کی انہوں نے سخت کوششیں کیں، سخت قوانین نافذ کئے۔ اکثر اڈیٹروں کو قیدخانہ اور جرمانہ کی سزائیں دی گئیں خصوصاً خاندان اسٹوارٹ اور جیمس اول اور چارلس اول کا عہد اخبارات اور پریس کے لئے نہایت سخت گذرا۔ ایک خاص محکمہ "اسٹار چیمبر" ارباب صحائف و جرائد کے مقدمات سنتا۔ اور انکو سخت ترین سزائیں دیتا تھا۔ یہانتک کہ اس عہد میں اخبارات کے اڈیٹروں کو جرمانہ، قیدخانہ، اور جلاوطنی کی سزائیں بھگتنے کے علاوہ کوڑوں سے پیٹا گیا۔ آگ سے جسموں کو داغا گیا۔ اور سولی پر چڑھایا گیا۔ لیکن انہوں نے بڑی خندہ جبینی سے ان سزاؤں کو قبول کیا۔ مگر رائے کی آزادی کے حق سے دستبردار نہیں ہوئے۔ یہ سب سزائیں صرف اس لئے دی جاتی تھیں کہ وہ حکومت اور فرمانروائے وقت پر کوئی تنقید نہ کرسکیں۔ (دی پریس سر الفریڈ ربنس صفحہ ۸۵)

اخبارات کے لئے اس دور ابتلا کا یہ سلسلہ ملکہ وکٹوریہ کے آغاز عہد تک قائم رہا۔ اس کے بعد جب حکومت اپنی تمام تدبیروں سے تھک گئی تو رائے عامہ کے سامنے اسے جھکنا پڑا۔ پریس کے قوانین میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اور صرف "لائبل ایکٹ" باقی رہ گیا۔ اب یہاں تک کہ صرف عدالت میں دائر مقدمات پر نکتہ چینی ممنوع ہے۔ ورنہ پریس کو ہر قسم کی عام آزادی حاصل ہے۔ اور وہ مقدمہ کے فیصلہ کے بعد نہایت آزادی سے مقدمۂ فیصلہ اور جج پر بھی نکتہ چینی کرسکتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۲۰۳ پر)

کے اڈیٹروں کو بھی دیا گیا۔ اور اصولی طور پر صحافت میں یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اڈیٹر اپنی رایوں میں کامل خود مختار ہے۔ وہ جس روش پر چاہے، اخبار کو چلائے۔ اس کی وجہ سے مالکوں اور مدیروں میں تصادم پیش نہیں آتا۔ چنانچہ یہ بھی دلچسپ واقعہ ہے کہ اخبارنگی ادارت میں یہ روایت چلی آتی ہے کہ ان کی ادارت پر نہ صرف ایک ہی شخص مدت تک فائز رہا ہے۔ بلکہ ایک ہی خاندان کے افراد یکے بعد دیگرے ادارت کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ "ٹائمس" کے مدیروں کو اُس کی طویل عمر کے باوجود انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اس کی ادارت مدت دراز تک والٹر کے خاندان میں رہی، صرف ایک مختصر زمانہ میں لارڈ نارتھ کلف کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ ان کی موت کے بعد پھر اسی خاندان میں منتقل ہوگئی کسی مدیر کے زمانہ ادارت کی درازی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ٹائمس صرف مسٹر ڈیلینی کی ادارت میں سنہ ۱۸۴۱ء سے ۱۸۷۷ء تک کامل ۳۶ برس نکلتا رہا۔

اسی طرح جریدہ "مارننگ پوسٹ" جو ایک تجارتی کمپنی کی ملکیت میں ہے ۱۸۴۷ء سے ۱۸۷۷ء تک صرف ایک شخص بروتھویک کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اسی طرح "مانچسٹر گارجین" کی ادارت صرف ایک خاندان اسکاٹ میں مخصوص رہی۔ طریقہ یہ رہا کہ باپ اپنی زندگی میں اپنے لڑکے کو اپنے زمانہ ادارت میں اسی اخبار میں صحافت کی تعلیم دیتا ہے۔ جو اس کے بعد اپنے باپ کا جانشین ہوجاتا ہے۔ ایک زمانہ دراز سے اب تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ صرف ادھر کچھ دنوں سے موجودہ مسٹر اسکاٹ صحافت کے فرائض سے دستکش ہوگئے ہیں۔ اور ایک دوسرے شخص کے سپرد یہ خدمت کردی گئی ہے

اسی طرح ہفتہ وار جریدہ "ابزرور" مسٹر گارڈن کی ادارت میں ایک مدت دراز سے نکل رہا ہے، اور یہی حال اکثر ممتاز اخبار ورسائل کا ہے۔

انگلستان کے اخبارات کے سلسلے میں یہ امر ذکر کے لائق ہے کہ ان میں وطن کی محبت ضرور ہوتی ہے۔ جب کبھی غیر ممالک سے برطانیہ کا کوئی سوال آتا ہے۔ وہ انگلستان کے حق میں تند مد سے پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ حکومت کی تائید بالکل آنکھیں بند کرکے کرتے ہوں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض جرائد نہایت آزادی سے حکومت انگلستان کے رویہ پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مثلاً انگلستان اور روس کی دشمنی مشہور عالم واقعہ ہے۔ کچھ دن گذرے جب روس میں چند انگریز جاسوسی کے الزام میں گرفتار کئے گئے۔ اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ تو حکومت انگلستان نے روس سے سخت باز پرس کی۔ اور اپنے تجارتی تعلقات کے معاہدہ تک کو جو دونوں حکومتوں کی سخت مجبوریوں کے باعث عمل میں آیا تھا۔ توڑ دینے کی دھمکی دی۔ اور انگلستان کا پورا پریس حکومت کی تائید میں تھا۔ لیکن مانچسٹر گارجین نے حکومت کے رویہ پر سخت نکتہ چینی کی کہ برطانیہ کو روس کے داخلی معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے۔ اور نہ روس کے محکمہ انصاف پر شبہ وبے اعتمادی کا اظہار کرنا چاہئے۔ حالانکہ ان دنوں انگلستان کی رائے عامہ حکومت کی پرزور موید تھی۔ ملک میں جابجا جلسے اور پرجوش تقریریں ہو رہی تھیں۔

لیکن بہرحال وہ غیر ملکی مسائل میں بالعموم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جہاں تک ملکی مسائل اور داخلی مباحث کا تعلق ہے۔ ان میں وہ کسی قسم کی رورعایت نہیں کرتے۔ حکومت پر نہایت صفائی اور سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہاں ہندوستان کے برخلاف پریس کو کامل آزادی حاصل ہے۔

انگلستان کی صحافت کا ماضی اور حال

(۲)

غیر سنجیدہ و پست مذاق اخبار و رسائل کی روز افزوں ترقی سے برطانیہ کے مدبرین کو ایک یہ نیا خوف دامنگیر ہوا کہ کہیں صحیح رائے عامہ پیدا کرنے والے اخبارات کے زوال کے بعد یہ تجارتی کمپنیوں کے اخبارات ملک میں ذاتی پروپگنڈے کرکے ایسے لوگوں کو پارلیمنٹ میں کثیر تعداد میں منتخب نہ کرادیں جو ان اخبارات کو پروپگنڈے کی قیمت ادا کرکے پارلیمنٹ میں آئیں۔ اور ملک کی سچی ضرورتوں، صحیح تدبیر و سیاست اور وطن کی حقیقی خدمت کے بجائے خود غرضانہ قوانین کی تدوین تکمیل کرائیں اور حکومت انگلستان کی حقیقی سیاست کا خاتمہ ہو جائے، اور ملک کے حقیقی مدبرین اور سیاست دانوں کو پارلیمنٹ میں قدم رکھنے کا بھی موقع نہ مل سکے۔

ملک کے سنجیدہ ارباب صحائف نے بھی اس پیش آنے والے عظیم الشان خطرہ کا احساس کیا۔ اور اس کے انسداد کی فکر کی۔ چنانچہ ان میں سے مسٹر جان والٹر اور میجر جان اسٹر نے جو ٹائمس کے بڑے حصہ داروں میں سے تھے۔ ایک ایسی مجلس کی تشکیل کا ارادہ کیا۔ جو مستقبل میں ٹائمس کو اس خطرہ سے محفوظ رکھ سکے۔ اور ایسے افراد کو ٹائمس کے حصہ داروں میں داخل ہونے سے روک سکے۔ چنانچہ یہ مجلس قائم ہوگئی، اسکے مستقل ارکان چیف جسٹس انگلستان، پرنسپل آکسفورڈ کالج پریسیڈنٹ رائل سوسائٹی، صدر جمعیۃ محاسبین INSTI TUTE OF CHARTERAL ACCOUNTANTR اور گورنر بینک آف انگلستان، وغیرہ قرار پائے۔ اور طے پایا کہ اس مجلس کی منظوری کے بغیر اخبار کا کوئی حصہ فروخت نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اس کی تصدیق کے بغیر کوئی نیا خریدار خریدار متصور ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس مجلس کے چند فرائض قرار پائے جن میں خصوصیت سے دو قابل ذکر ہیں۔ (۱) اخبار کی اجتماعی و سیاسی آزادی کے برقرار رہنے کی نگرانی کرنا (۲) ان لوگوں سے اخبار کو بچانا جو اخبار کے حصوں کے ذریعہ کسی مالی منفعت کی توقع رکھیں۔ یا کسی سیاسی جاہ و منزلت کے حصول کی فکر کریں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مجلس ٹائمس کی اندرونی سیاسی پالیسی میں دخیل ہوسکی ہو اخبار کی سیاسی پالیسی کی پوری ذمہ داری اڈیٹر کے سپرد رہی اور اس کا یہ فرض رہا کہ صحیح رائے عامہ کا اتباع کرے۔

پھر اسی طرح صحائف مارننگ پوسٹ اور اکنامسٹ وغیرہ نے بھی اپنی مجلسیں قائم کیں جن میں یہ وصف مشترک رہا کہ اخبار کے مدیر کو کامل سیاسی آزادی حاصل رہی۔ بلکہ اڈیٹر کی رائے کی آزادی کا حق نہ صرف ان امتیازی اخبار و رسائل بلکہ تجارتی جہازات

میرے محترم دوست صاحب میرے لفظ "طوطا چشمی" سے بہت چراغ پا ہوئے ہیں۔ اور نواب سید ہدایت علی مرحوم کی طوطا چشمی پر اس طرح پردہ ڈالتے ہیں۔ کہ کامگار کے تسلط میں نواب ہدایت علی جیسا ذی اقتدار شخص کا بادشاہ کے ساتھ رہنا ہرگز شایان شان نہ تھا۔ جو بادشاہ کا مربی بھی تھا۔ اور اتالیق بھی اس کا کنارہ کر ہی لینا زیادہ مناسب تھا سبحان اللہ آپ نے تو نواب ہدایت علی کا درجہ بادشاہ سے بھی بلند کر دیا۔ اب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ کا یہ مربی کامگار کے تسلط سے پہلے ہی بادشاہ سے علیحدہ ہو چکا تھا[18]۔ بادشاہ عالم نے جب اپنے پہلے حملے کے وقت راہ فرار اختیار کی تو انکا مربی اپنے صاحبزادے کی صلاح پر راستہ ہی سے کترا گئے[19]۔ اسی وقت غلام حسین مرحوم اپنے پدر بزرگوار سے فرماتے ہیں۔ کہ اب آپ شاہ عالم کی رفاقت چھوڑ دیں اس کو اب یہ مقدور نہیں کہ آپ کے اہل و عیال کی خبرگیری کر سکے۔ اب آپ دہلی بھی نہیں جا سکتے۔ بہتر ہے کہ اب آپ محالات جاگیر کو ہاتھ میں لانے کی کوشش کیجئے[20] چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد یہ طے ہوا کہ پہلوان سنگھ کو اس مصیبت میں واسطہ اور حامی بنایا جائے۔ چنانچہ پہلوان سنگھ اور افسران انگلشیہ کی بدولت ان دونوں باپ بیٹوں کا قصور معاف ہوا۔ اور محالات جاگیر اس شرط پر ملے کہ پھر شاہ عالم کی مدد نہ کریں۔ وہ شاہ عالم کی طلب پر حکام انگلشیہ کے خوف سے نہیں جا سکتے تھے نہ کہ کامگار کے تسلط کی وجہ سے دیکھئے۔ خود نواب غلام حسین مرحوم فرماتے ہیں۔ کہ والد مرحوم بادشاہ کے پاس اس اندیشہ سے نہیں گئے[22] کہ حکام عظیم آباد آزردہ نہ ہو جائیں بہر حیلہ ترک رفاقت بادشاہ کرکے خانہ نشین رہا۔ اب آپ بتائیں ایک مربی کی طوطا چشمی اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے۔

کچھ کامگار کے متعلق | جناب نے کامگار کی طوطا چشمی کے ثبوت میں جو تاریخی حوالے پیش کئے ہیں۔ وہ سب کے سب سیر المتاخرین کی خوشہ چینی ہے۔ جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

مورخ سیر المتاخرین نے کامگار کی جو تنقید بلیغ کی ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔

اتنا بڑا شخص جو منصب ہشت ہزاری رکھتا ہو جس کے آبا و اجداد سے مہاراجگی کا خطاب چلا آتا ہو۔ شاید سارے بہار اور بنگال میں سوائے میر محمد قاسم کوئی دوسرا شخص اس منصب ہشت ہزاری کا نہ تھا۔ اس کی شخصیت کو ایک سپاہی پیشہ زمیندار لکھنا کامگار نا بکار کے لفظ سے یاد کرنا اور اس کے منصب اور خطابات چھپانا۔ دن کے وقت خواب میں حریف رہنے کا طعنہ دینا جو کبھی کسی کے ہاتھ سے مغلوب نہیں ہوا[24] اس کو گریز پائیاں کی صفت سے بدنام کرنا کس قدر بے انصافی ہے۔ حالانکہ کامگار خاں کے بھائی نامدار خاں کو انہوں نے راجہ مبین کے خطاب سے یاد کیا ہے۔

وہ معمولی معمولی لوگوں کے منصب اور مراتب کو لکھ جاتے۔ اور ان کی کارگذاریوں کی خوب خوب داد دیتے ہیں۔ مگر جب مہاراجہ کامگار کی باری آتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ کیا ان سب کی تہہ میں ذاتی عناد یا کچھ دوسرے اسباب نہیں ہیں؟

(بقیہ کسی آئندہ صفحہ میں ...)

---

۱۸ — ۳۴۶
۱۹ — ۳۴۴ جلد دوم
۲۰ — ۳۵۲
۲۲ — ۳۶۴ جلد دوم
۲۳ — ۱۷۱ جلد دوم

بلکہ اپنا بہت بڑا دشمن خیال کرنے لگا تھا کیونکہ ایک بار وہ اسکو گرفتار کرا دینے کا بندوبست کر چکے تھے۔

غلام حسین مرحوم میر قاسم کی نظر میں | گو یہ میر قاسم کی معیت میں رہتے تھے۔ مگر میر قاسم ان کو انگریزوں کا فرستادہ جاسوس خیال کرتا تھا۔ مگر پھر بھی بہ مصلحت ان کو اپنے ساتھ لگائے رکھتا تھا۔ جب یہ پہلی بار کچھ انگریزوں کا پیغام لیکر میر قاسم کے سامنے پہنچے تو میر قاسم نے ان کو انگریزوں کا طرفدار سمجھ کر نظر بند کر لیا آخر بہ ہزار خرابی انگریزوں کی کوشش سے نجات ملی

پھر جب مسٹر امیت میر قاسم سے ملنے آ رہا تھا۔ تو ان سے پوچھا گیا یہ تمہارے رفیق کس ارادہ سے آئے ہیں قصد وفا رکھتے ہیں یا دغا۔[13]

پھر ایک بار ان سے سوال کرتا ہے کہ مسٹر ملٹن آپ کے آستانے قدیم نے کیوں ہم سے دغا کی ایک بار جب ان سے بہت تنگ آ گیا تو ان سے کہتا ہے کہ تمہارے باپ اور بھائی انگلشیوں کے ساتھ کتنا خوش و خرم ہیں تم کیوں میری ہمراہی میں تکلیف اٹھاتے ہو۔ کیوں نہیں انہیں کے پاس چلے جاتے۔[14] اس پر جناب غلام حسین مرحوم فرماتے ہیں کہ آپ کا خیال ہے۔ میں انگریزوں کا جاسوس ہوں اور ان سے خفیہ مراسلت رکھتا ہوں۔ حالانکہ یہ میرا شیوہ نہیں۔[15] یہ ہیں وہ خیالات جو ان کے معصر ان کے ساتھ رکھتے تھے۔

شاید آپ یہ فرمائیں کہ ان واقعات سے سیر المتاخرین اور اس کے مورخ کا پایہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کمزوریوں کو بھی بے کم و کاست ظاہر کر دیا ہے۔

ہاں کاش یہ بات حقیقت ہوتی وہ اپنی ان کمزوریوں کو تسلیم بھی کرتے تو واقعی سیر المتاخرین کا پایہ کہیں بلند ہی پہنچ جاتا۔ مگر انہوں نے تو سرے سے اپنے لئے کسی الزام کو تسلیم ہی نہیں کیا۔

بلکہ ہر الزام کی تاویلیں کی ہیں۔ اور الٹا الزام لگانے والے ہی کو مجرم ٹھہرایا ہے۔

سیر المتاخرین کے مطالعہ سے بس صرف اتنا پتا لگتا ہے کہ سوا انگریز افسروں کے کوئی ہندوستانی حکمران ان سے صاف نہ تھا۔ ورنہ الزام کے اعتبار سے کوئی ان کو قصوروار ثابت ہی نہیں کر سکتا مجھکو تو صرف یہی دکھانا منظور تھا۔ کہ یہ کسی ہندوستانی حاکم کی نظر میں معتبر نہیں تھے۔

سب سے بڑا الزام ان پر انگریز پرستی اور قوم سے غداری کا ہے۔ جس کو وہ سراسر تہمت جانتے ہیں چنانچہ ایک جگہ وہ میر قاسم کے حالات میں لکھتے ہیں۔ کہ صاحبان انگلش کی صحبت کی تہمت سے میں عالیجاہ کے حضور میں مجال سخن نہیں رکھتا تھا۔[16] ان واقعات کی موجودگی میں اب آپ ہی جناب غلام حسین مرحوم کی شخصیت کا اندازہ لگائیں۔ اب ان کا لوہا میکالے اور مل جیسے انگریز نہ مانیں تو اور کون مانے اور ان کی تاریخ برٹش میوزیم میں نہ رہے تو اور کہاں رہے۔[17]

[11] جلد ۳ ۳۳۳ ۳۵۱
[12] ۳۸۴
[13] ۴۱۱
[14] ۴۱۲
[15] ۴۳۴
[16] ۴۳۴
[17] ۴۱۲ جلد دوم

مجھ پر جو الزام ہے کہ میں تاریخ مذکور کو غیر مستند سمجھتا ہوں اور پھر بھی اسی سے ثبوت پیش کرتا ہوں۔ میں نے کب کہا ہے کہ تاریخ مذکور بالکل غیر مستند ہے۔ اور سرے سے لائق اعتبار نہیں۔

نواب سید غلام حسین مرحوم کی شخصیت

کاش یہ سوال آپ مجھ سے نہ پوچھتے سیر المتاخرین کے صفحات کو خود ہی ملاحظہ فرما کر ان کی شخصیت کا اندازہ کر لیتے کہ ان کے معاصر ان کو کیسا سمجھتے تھے۔ اب ملاحظہ فرمائیے۔

غلام حسین مرحوم ہیبت جنگ اور سراج الدولہ کی نظر میں

ہیبت جنگ اور مہابت جنگ کی بدولت انکے سارے خاندان والوں نے بڑے بڑے مراتب پائے یہاں تک کہ نواب ہدایت علی مرحوم کو صوبہ بہار کی نیابت کے درجہ تک پہنچا دیا وہی ہیبت جنگ اور مہابت جنگ[2] ان سے اس درجہ برگشتہ ہوئے کہ ان کے مراتب ایک ایک کر کے چھین لیے[3] یہاں تک کہ جاگیریں تک ضبط ہوئیں اور ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ کامل ڈیڑھ سال کے بعد غلام حسین مرحوم اپنے نانا کے وسیلے سے بہار آئے۔ مگر لاکھ کوششوں کے بعد بھی ان دربار[4] میں ملازمت نصیب نہیں ہوئی۔ پھر ان کو لوٹ کر دہلی جانا پڑا اور اس وقت تک دہلی میں رہے جب تک کہ بالآخر عرب نے ان کے کان میں یہ صدا نہیں پہنچائی کہ ہیبت جنگ کو کسی نے قتل کر دیا۔ جب مہابت جنگ کی موت سے ان کو اطمینان ہوا۔ تو انہوں نے صولت جنگ اور شوکت جنگ کو تاکا۔ صولت جنگ کو مہابت جنگ کے بدخواہوں کی ضرورت تھی۔ اس نے ان کی بڑی خاطر کی اور اپنے ندیموں میں جگہ دی۔ جب شوکت جنگ اپنے کیفر کردار کی بدولت سراج الدولہ کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ تو سراج الدولہ نے غلام حسین مرحوم کو ذلت کے ساتھ اپنے لشکر سے نکال دینے کا حکم دیدیا چنانچہ بھرے مجمع میں ان کے سر سے سر پیچ جواہر اتار کر ذلیل کیا گیا۔ اور پھر اخراج کا حکم سنا دیا گیا۔ چنانچہ تا حیات سراج الدولہ ان کو پھر وطن آنا نصیب نہیں ہوا۔[5]

غلام حسین میر جعفر کی نگاہ میں

جب میر جعفر کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ آئی۔ تو غلام حسین اور ان کے خاندان والوں نے بامید رفاقت زیرینہ وطن کو مراجعت کی جیسے ہی یہ لوگ سرحد پر آئے۔ میر جعفر نے حکم امتناع جاری کر دیا۔ آخر بہ ہزار سفارش وضمانت وطن میں قیام کی اجازت ملی مگر پھر بھی ان کو وہ غدار ہی جانتا تھا۔ میر جعفر رام نرائن کو مرشد آباد سے اطلاع بھیجتا ہے۔ کہ تم غلام حسین سے غافل نہ رہنا اس نے اپنے باپ کو شاہ عالم کی مدد پر چھوڑا کیا ہے۔

غلام حسین مرحوم رام نرائن کی نظر میں

غلام حسین رام نرائن کے نمک خواروں میں تھے[9] اسی رام نرائن نے ان کی جاگیر انگریزوں کی سفارش پر واگذاشت کرائی تھی۔ حالانکہ میر جعفر اس کے لئے رضامند نہیں تھا۔ مگر پھر بھی رام نرائن ان سے برابر کبیدہ رہا۔

ترجمہ سیر المتاخرین	۱و۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
صفحہ	۱۵۱ تا ۱۵۶	۱۶۷	۱۹۸	۲۸۶، ۲۲۱	۲۸۶	۳۰۵	۳۳۰	۳۲۱	۳۱۰، ۳۸۳

اس لئے کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد یورپ میں پھر مایوسانہ شک و تردد، اجتماعی مسرت کے مقابلہ میں ذاتی خوشی کی تلاش، عام آزادی رائے کے مقابلہ میں عقائد پرستانہ عصبیت اور روحانیت سے عاری تصوف کو بہت فروغ ہوا۔ جرمنی میں EXPRESSIONIST تحریک عام ہوئی۔ جس نے بعض غیر فطری رجحانات کو نشوونما دیا۔ عورتوں کے بارے میں گوئٹے کا نظریہ محبت غلط ثابت کیا۔ اور ان کے مقابلہ میں مردوں کو موضوع محبت بنانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ ٹامس من اس جماعت کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ روس میں گورکی نے عوام کے ادب کی طرف توجہ کی اور ہیوسن نے ادب کو زندگی سے پیوستہ کیا کارل مارکس کے نظریہ اقتصاد کو اگرچہ روس کے علاوہ کہیں بھی عام مقبولیت نہیں حاصل ہوئی۔ تاہم ۱۹۱۸ء کے بعد سے دنیا میں اسکے متعلق خاص دلچسپی نظر آتی ہے۔

جنگ کا اثر ہندوستان پر افسوس ہے کہ ہندوستان میں جنگ عظیم نے کوئی خاص روحانی اثر پیدا نہیں کیا۔ خلافت کی تحریک میں عارضی طور پر احیائے مذہب کی تحریک کو کچھ سنبھالا نصیب ہوا۔ لیکن اس کے بعد روحانی تصفیہ کی تحریک مر ہو گئی۔ البتہ سیاسی رنگ میں ہندوستان میں جنگ عظیم کا اثر روس کی طرح ایک نئی زندگی اور تازہ بیداری کا پیغام بنکر آیا۔ ۱۹۱۹ء کے بعد جبکہ یورپ میں جنگ کا عملی طور پر خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں اثرات جنگ کے طور پر اقتصادی بےچینی پیدا ہونے کے علاوہ قومی حکومت کے حصول کے لئے تحریک ترک موالات وجود میں آئی۔ جو ٹرکی کی تقسیم اور مسئلہ خلافت کی وجہ سے مسلمانان ہند کے اضطراب و احتجاج کی بناء پر ۱۹۱۹ء میں اس درجہ قوی اور مستحکم ہو گئی۔ کہ اس کی وجہ سے آل انڈیا نیشنل کانگرس ایک حقیقت ثابت بن گئی۔ ادھر ہجرت کی تحریک کی وجہ سے بعض ہندوستانی نوجوانوں کو جدید روس کے اشتراکی خیالات سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا جنہوں نے ہندوستان میں واپس آکر روس کے اشتراکی خیالات کی تبلیغ کی۔ ملک کے اندر کسانوں اور مزدوروں میں ایک خاص احساس ترقی پذیر ہوا جسکی وسعت اور شدت یہانتک پہنچی کہ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے اشتراکی اصولوں کی تبلیغ کی آواز اٹھی۔

مغربیت کی مخالفت تحریک ترک موالات نے خالص ادب پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا۔ لیکن اس ذہنیت کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا۔ جس کی پیداوار ادب ہے۔ ترک موالات کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد جو ہندو مسلمانوں کو کچھ دیر باہم ملائے رکھنے کا باعث ہوئی۔ ہندوستانیوں کے لئے قومی حکومت کا حصول تھا۔ لیکن چونکہ جس جماعت سے قومی حقوق کا مطالبہ تھا۔ وہ ایک مغربی قوم تھی۔ اس لئے ہندوستان میں ترک موالات کی تحریک سے "مغرب" کے خلاف بہت بڑی بغاوت پیدا ہوئی چنانچہ مغربی تہذیب، مغربی وضع، مغربی تراش خراش، مغربی نظریات و تصورات سب کی مخالفت ہوئی مغرب سے

دشمنی یا بالفاظ دیگر مشرقیت کے احیا، کا تحریک کو زیادہ تقویت اس لئے بھی ہوئی۔ کہ ترک موالات کے لیڈروں میں ایک طرف مہاتما گاندھی اور دوسری طرف علماء اسلام (مثلاً مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی) نے سیاسیات کی گاڑی کو مذہبی احساسات کی قوت سے چلایا۔

تحریک عدم تعاون کی بے اثری

تحریک ترک موالات کو ایک سیلاب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس کا چڑھاؤ جتنا تیز اور مہیب تھا۔ اس کا اتار اس سے کہیں زیادہ فوری اور افسوسناک ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ملک میں مصنفین کی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا ہوگئی تھی جن کے نتائج ذہن سے اردو کا ذخیرہ مالامال ہے۔ لیکن موجودہ تحریک نے علم وادب کی نئی دنیا میں بڑے ناموں کا کسی طرح اضافہ نہیں کیا۔ جن کو ہم زبان اردو کے عناصر خمسہ کے مقابلہ پر پیش کرسکیں۔ اقبال اور ابوالکلام۔ ظفر علی اور حسرت چند ایسی شخصیتیں ہیں۔ جن کی ذہنی تربیت "اتحاد اسلام دورہ" میں ہوچکی تھی۔ لہذا انہوں نے جو کچھ اس زمانہ میں لکھا۔ اسے محض اثرات جنگ کی تحریک یا پیداوار نہیں کہا جاسکتا۔

تحریک عدم تعاون کے نتائج

باایں ہمہ تحریک ترک موالات بالکل بیکار نہیں گئی۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کے طفیل ۱۹۲۰ء میں علیگڈھ میں مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ کے نام سے ایک یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کا نظام تعلیم دیسی اور قومی ضروریات کے عین مطابق تھا اور جس کی غایت طلبہ میں قومی حس کی نشوونما اور آزاد ذہن کی پرورش اور تربیت تھی۔ درحقیقت جامعہ ملیہ کی کارکردگی اس کے حسن نیت اور صدق ارادت کا ایک شیریں ترین نتیجہ ہے۔ جامعہ ملیہ میں اسلامی ہندی تمدن کی تبلیغ اور اسلامی ہندی قومیت کے فروغ کے لئے نہایت پرخلوص خدمت ہورہی ہے۔

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ترک موالات کے زمانے میں مغرب اور مغربیت کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ اس سے مشرقیت کی تحریک کو کسی قدر فروغ ہوا۔ لیکن مغربی اثرات کے نفوذ اور شیوع کو بہت جلد ایک دوسرا راستہ مل گیا۔ اگرچہ مذہب اور فلسفۂ مذہبی میں اقبال جیسی بلند پایہ شخصیت نے مغربیت کے خلاف پرزور جہاد کا علم بلند کئے رکھا۔ لیکن ادب شعر، افسانہ، ناول، آرٹ اور فن کی دنیا میں مغرب کا اثر پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوا۔ علی الخصوص ۱۹۲۷ء کے بعد جب کہ ہندوستان میں کارل مارکس کے نظریات کے متعلق عام دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی روسی واقعیت (REALISM) نے نوجوانان وطن کو مسحور کرنا شروع کیا اس دور میں روسی اثرات اس درجہ کارفرما ہیں۔ کہ اگر ہم آیندہ زمانے کو روسی اثرات کا دور کہدیں۔ تو بے جا نہ ہوگا۔

قبل از جنگ یورپ کا اثر ہند پر

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستانی مصنفین یورپ کے جدید ترین اثرات

ی سے متاثر ہیں۔ اور ان اکابر کے علمی اور ذہنی فیضان سے یکسر محروم ہیں۔ جو آج سے تیس چالیس سال پہلے
ورپ کے دل و دماغ پر حاوی تھے۔ بلکہ یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مصنفین پر
۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کے دور میں بعض ایسے مغربی مفکرین کا اثر نظر آتا ہے۔ جن کا مسلک یورپ میں
قابل قبول پا کر مسترد ہو چکا تھا۔ گویا ہندوستان میں دنیا کی عام ادبی اور علمی لہر پندرہ بیس سال بعد پہنچتی
ہے ۱۹۳۵ء سے پہلے نمایاں طور پر آرٹ محض آرٹ کی خاطر کا مذہب فروغ پذیر رہا چیخوف جو روس میں انقلاب
کے بعد بہت کچھ نامقبول ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں بہت پسند ہونے لگا۔ اسی طرح آسکر وائلڈ کا تصور زندگی
نوجوانوں کے لئے اس وقت بہت کچھ کشش کا باعث بن رہا ہے۔ جب خود انگلستان میں اس کے خلاف باقاعدہ
ردِ عمل ظہور میں آ گیا۔

ادب اور زندگی

تاہم اس دور میں ادب اور زندگی کی تحریک پوری قوت کے ساتھ پھیلی۔ جس میں مفکرین مغرب کے تتبع میں اس بات پر خاص زور دیا گیا۔ کہ ادب کا زندگی کے ساتھ گہرا تعلق
ہونا چاہئے۔ وہ ادب جو ہمیں روزمرہ زندگی کے مسائل سے دور لے جاتا ہے۔ بیکار اور بیمار ادب ہے۔ جس سے
قوم کو کچھ فائدہ نہیں۔ اس تحریک کے علمبرداروں کے نزدیک روایات اور قدامت کا احترام ترقی کی راہ میں
رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اور نئی زندگی کے ساتھ نئی روایات اور نئے رسوم اور طریقے ظہور میں آنے چاہئیں۔

ادب میں صوبہ پرستی

اس دور کے لٹریچر میں صوبہ پرستی کے آثار نہایت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ غلامانہ زندگی کے زیر اثر ہندوستان جیسے وسیع برّ اعظم میں وحدت کا پیدا ہونا ایک مشکل
بات ہے۔ لہٰذا اس میں مختلف قوموں اور جماعتوں خطوں، اور صوبوں کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا نہایت
آسان ہے ۱۹۲۳ء کے بعد ہندوستان میں منافرت اور باہمی نزاعات کی صرصر کچھ ایسی چلنے لگی۔ کہ ملک کی
وحدت ایک بسرا ہوا خیال بنکر رہ گئی۔ اس زمانے میں ہر صوبے میں بعض ایسی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ جن سے
ان خاص خطوں کے بعض تاریخی ناموروں کے کارناموں کو اجاگر کرنا مقصود تھا۔ اسی طرح زبان اردو کے اصلی
مولد اور وطن پیدائش ہونے کا دعویٰ مختلف صوبوں کی طرف سے کیا گیا۔ جو ایک آدھ جگہ تو خالص علمی تحقیق
کا ثمرہ ہے۔ لیکن بیشتر اسی صوبہ پرستی کا مظاہرہ!

تحریک عدم تعاون سے اردو بولی کی ترقی

تحریک ترک موالات میں زبان اردو کو عوام میں پھیلنے کا بہت موقعہ ملا۔ خلافت اور کانگرس کے مبلغین نے گاؤں
گاؤں میں پھر کر اپنے مقاصد کی تبلیغ کی۔ جس کے لئے زبان اردو کو ذریعۂ اظہار خیال قرار دیا۔ اس عہد میں تحریر
کے مقابلہ میں تقریر کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ اگرچہ یہ دور بہت سے اچھے اخبار نویسوں کو منصۂ شہود پر لانے کا

باعث ہوا۔ لیکن چونکہ یہ عہد، جذبات کا دور تھا۔ اس لئے مفکرین کی بجائے مقررین کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے اثرات محض نقش بر آب ہوا۔ ہونے کی وجہ سے بہت جلد دلوں سے محو ہوگئے۔ اور خیالات و افکار کی دنیا میں ان کا کوئی پائیدار اثر باقی نہ رہا۔ اردو کے اس قبول عام کے خلاف، ہندوؤں میں بہت زبردست ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ ہندی کے فروغ کے لئے پہلے سے بھی باقاعدہ پرجوش اور منظم کوششیں ظہور میں آئیں۔ اسی دور میں ہماری زبان کے لئے اردو کی بجائے "ہندوستانی کے پرانے لقب کا احیاء ہوا جس سے مقصود یہ ہے کہ ایک آسان مشترکہ "ہندی اردو" زبان وجود میں لائی جائے۔ جو تمام ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے۔

بعض بلند پایہ رسائل اور ادارے بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ مثلاً معارف اعظم گڑھ، جامعہ (دہلی) اردو اورنگ آباد، ہندوستانی (الہ آباد) ہمایوں (لاہور) کارواں (لاہور) اورنٹیل کالج میگزین لاہور۔ اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ کے ترجمے اور جامعہ ملیہ کا سیاسی لٹریچر بھی خاص قابل ذکر ہیں۔

نیا ادب کی تحریک ۱۹۳۶ء میں نیا ادب یا ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائی جائے۔ اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جد وجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھا دے۔ جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔" نیز یہ کہ" ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں[1]۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ابھی نئی ہے۔ اور ہر نئی تحریک کی طرح جوش اور انتہا پسندانہ بے اعتدالی کے اثرات اس میں نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ توقع رکھی جا سکتی ہے۔ کہ جب بہتر لوگ اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لیں گے۔ تو اس ملک کے ادب کو بہت فائدہ ہوگا۔

لاادریت اور لادینی اب تک جو کچھ بیان ہوا۔ اس سے مقصد ادبی تحریک کے متعلق متفرق اظہار رائے تھا مجموعی اعتبار سے یہ دور (سوائے تحریک خلافت کے زمانے کے جو لذتِ یقین کا حامل تھا) روحانی بے اطمینانی، مذہبی کش مکش اور افکار کے ہیجان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ "اتحاد اسلام" دور کے مفکر روحانی سکون کے پیدا کرنے اور ایمان و ایقان کے مضبوط کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہے۔ (مثلاً علامہ اقبال وغیرہ) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غلامانہ زندگی سیاسی ہیجان اور یورپ سے مسلسل و پیہم رابطہ و تعلق کی وجہ سے بیدار اور تعلیم یافتہ جماعت میں تردد اور شک، لاادریت اور مادیت کے عناصر زیادہ سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ اور روحانیت ایک موہوم بہشت کی طرح اب اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ مادہ پرست مخلوق اس کو قابل اعتنا خیال کرے۔

---

[1] اقتباس از اعلان نامہ انجمن ترقی پسند مصنفین (از رسالہ اردو ص ۳۲۳ (۱۹۳۶))

مجلسی مسائل کی بدستور چھان بین ہو رہی ہے۔ اور اگرچہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی تحریک اور جدید علیحدہ قومیت کے تصور نے مسلمانوں کی سیاسی عصبیت کو محکم بنا دیا ہے۔ لیکن مذہب کے روحانی پہلو اور اس کے مجلسی نظام کے متعلق ان تحریکوں سے تنقید اور جرح و قدح میں کمی نہیں آئی۔ درحقیقت علامہ اقبال کے روحانی اور ایمانی پیغام کی بے اثری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ کہ ان کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے ان کے مذہبی فکر سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ادب کے لطیف مظاہر کے بارے میں کوئی زاویۂ نظر متعین نہیں ہوا۔ کیونکہ آرٹ اور زندگی، کا فلسفہ نہایت سختی کے ساتھ، آرٹ محض آرٹ کی خاطر، کے ساتھ برسر پیکار ہے (JAMES JOYAILL) کی حقیقت پسندی اور D.H.LAWRENCE کی عریاں نگاری نوجوان ادیبوں میں بہت فروغ پا رہی ہے۔ اور جنس (SEX) اور اقتصاد کو بہت اہمیت مل رہی ہے۔ اور اگرچہ کسان اور مزدور اور ملکی غلامی کا مسئلہ نیا ادب، کے مقاصد میں بمنزلہ عنوان ہے۔ لیکن محنت کش اور مزدور ابھی تک اس قابل نہیں سمجھا گیا۔ کہ عورت کے مقابلے میں ہمارے نوجوان ادیب ان غریب اور بے کس انسانوں کی اصلاح اور بہتری کی جانب ملتفت ہوسکیں پھر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے۔ کہ اسلاف کی تقلید کے خلاف احتجاج کرنے والے یورپ کی تقلید میں جمود کا وہ راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ جس سے شاکی ہو کر علامۂ اقبال نے جدید ترکوں کے متعلق فرمایا تھا۔

ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست ✣ تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

مذہب علم الکلام اور سیاست

گذشتہ سطور میں اس دور کے ذہنی رجحانات کی طرف جو مجمل اشارات کئے گئے ہیں۔ اب ان کی کسی قدر تشریح کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے مذہب اور متعلقات مذہب پر نظر ڈالتا ہوں۔ جو اس دور میں ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے۔ اور ابھی تک دنیائے اردو کے مفکرین کے لئے مخالفانہ یا ہمدردانہ توجہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ اس دور میں مسلمانان ہند کی ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے بڑی اجتماعی مذہبی تحریک خلافت ظہور میں آئی۔ اس لئے اس سے قطع نظر کرنا ممکن نہیں۔

شبلی کا اثر میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اتحاد اسلام دور کے سب سے بڑے رہنما اور مفکر جنہوں نے سرسید کے علم کلام اور فلسفہ سیاست کی موثر مخالفت کی۔ علامہ شبلی تھے۔ اگرچہ مدرسۂ دیوبند اپنے رنگ میں قال اللہ وقال الرسول کی مشعل کو روشن کئے ہوئے تھا۔ لیکن شبلی نے اپنی مذہبی فکر کو جارحانہ سیاسی نصب العین سے مسلح کیا۔ اور نوجوانوں کے مشوش اور تاریک قلوب کو مغرب کی مخالفت کی تیز روشنی سے منور

کرنے کی کوشش کی۔ شبلی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور کارنامہ یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کو سرسید کے علم الکلام اور ان کی سیاست کے اثرات سے بچایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے باقی کاموں کے علاوہ خود علیگڑھ کالج (جواب یونیورسٹی ہے) کے مقابلہ میں ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ جو "توسیع علم اور ترقی و اصلاح ہی کا مرکز نہ رہا۔ بلکہ علیگڑھ کی مخالفت میں ردّعمل کا مرکز بھی بن گیا"[1]

اس موقع پر ہمیں مولانا شبلی کے فکر کے امتیازات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ مقصد کیلئے صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ کہ شبلی کی عظیم الشان شخصیت کا اثر اتحاد اسلام دور کے اکثر مصنفین مذہب پر بہت گہرا نظر آتا ہے۔ ان اثرات کا رنگ ان کے رفقاء اور شاگردوں کے ذریعہ، ترک موالات کے زمانے میں اور بھی گہرا ہو گیا۔ مغربی تعلیم اور مغربی طرز زندگی کے خلاف جو جہاد مولانا شبلی نے شروع کیا تھا۔ اسکی تکمیل مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان نے اس نئے دور میں بڑی شدّ و مد کے ساتھ کی۔ اگرچہ مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال کو دوبارہ جب زندہ کیا تو اس کی زندگی بہت کم تھی۔ تاہم الہلال کے قدیم دور نے جو ذہنیت مغرب کے خلاف پیدا کر دی تھی۔ وہ بجائے خود جدید خیالات کی تشکیل کے لئے کافی تھی۔

رفقائے شبلی مولانا شبلی کے رفقاء کار اور تلامذہ نے اسلام کے ذہنی اور عملی پہلو کا جس رنگ میں مطالعہ کیا۔ اور ان کو جس دلکش اور موثر انداز میں پیش کیا۔ اس کی سب سے بڑی غایت یہ تھی کہ اسلام کو جدید سائنس اور علم کی دنیا میں کامیاب ترین مذہب ثابت کیا جائے۔ مغرب سے متاثر ہو کر ہمارے نوجوان اسلام کے مستقبل بلکہ اس دور عقل و ترقی میں، اس کی زندگی سے بھی مایوس ہو رہے تھے۔ ان کے دلوں میں پھر سے یقین پیدا کیا اور درخشاں ماضی کی دلکش تصویریں دکھا دکھا کر یہ حقیقت نمایاں کی کہ اسلام کا حال اگرچہ مایوس کن ہے۔ لیکن ماضی کے اصولوں پر عمل کرنے سے مستقبل بہترین بن سکتا ہے۔

اس کام کے لئے شبلی اور رفقائے شبلی نے تاریخ اسلامی[2] سے کام لیا۔ اور تمدن اور علوم سیاسیہ کی روشنی میں اپنی سوسائٹی کا تجزیہ کیا۔ خالص مذہبی عقائد پر بحث و نظر سے اجتناب اس لئے ضروری نظر آیا۔ کہ اب اس کی ضرورت باقی نہ تھی۔ علوم جدیدہ کی روشنی میں اپنے علوم کو دیکھا۔ اور ان سے اسلام کی فوقیت ثابت کی۔ فکری ہیجان کے اس پہلو سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کے لئے معارف اعظم گڑھ کی مجلّدات کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ یہ رسالہ شبلی کے ارشد تلامذہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے ۱۹۱۶ء میں جاری کیا تھا۔ اور درحقیقت اسی رسالہ کو افکار شبلی کا ترجمان خیال کرنا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] موج کوثر (از شیخ محمد اکرم، ص ۱۱۸) ندیم "موج کوثر" کی عبارت مبہم ہے اور غلط فہمی پیدا کر سکنے والی ہو سکتی ہے۔ مقالہ نگار کو جہاں پر علی گڑھ اور ندوہ کی تحریکوں کے فرق پر دوسرے زاویہ نگاہ سے نظر ڈالنی تھی۔ تاکہ غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان نہ رہتا۔

[2] دار المصنفین کی کتب تاریخ اور معارف اعظم گڑھ کی مجلّدات (از ۱۹۱۶ء تا حال) ملاحظہ ہوں۔

افسانہ و محاضرات

ہار کی چوری

جناب رحمت علی صابر نور محلوی

رضیہ اپنے بھونرے سے سیاہ بالوں کو اپنی حنا آلیدہ انگلیوں سے کنگھی کرتی ہوئی آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اپنے دلکش خط و خال، کندن کی طرح دمکتی ہوئی پیشانی پر نظریں پڑتے ہی اس کی چلتی ہوئی انگلیاں رک گئیں۔ اور وہ ایک حیا آگیں تبسم کے ساتھ ادھر اُدھر متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ مبادا کہ کوئی اُسے دیکھ نہ رہا ہو۔ مگر ہر طرف سکوت تھا۔ گھر میں اس وقت اس کے سوائے کوئی نہ تھا۔ اس کی ساس محلے میں کسی کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ اور اُس کا شوہر کھیتوں میں گیا ہوا تھا۔ اُسنے ایک دلربا انداز سے پہلو بدل بدل کر اپنی دلکش قامت کا جائزہ لیا۔ ہر زاویے سے اپنے بوٹے سے قد کو جانچا۔ اور پھر گنگناتے ہوئے ایک مسحور کر دینے والے تبسم کے ساتھ اپنی نشۂ جوانی سے مخمور آنکھوں، گلاب کی پتی کی طرح نرم و نازک لبوں اور جوشِ شباب سے تمتماتے ہوئے گالوں پر یکے بعد دیگرے نظریں ڈالنے لگی۔ دوپٹہ ڈھلک کر اسکے بھرے بدن کی لطافتوں کو عریاں کر رہا تھا۔ اور وہ ایک محویت کے عالم میں اپنے سراپا کی دید میں محو تھی۔ کہ پیچھے سے کسی کی چاپ سنائی دی۔ وہ ایک چوکڑی بھولی ہوئی ہرنی کی طرح چونک کر پیچھے گھومی۔ اس کا شوہر مجید شوق بھری نگاہوں سے دروازے میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس کی۔ اور جلدی سے اپنے دوپٹے کو اوڑھتے ہوئی بولی "یا اللہ! تو آپ ابھی تک یہیں پھر رہے ہیں!!"

اس نے صورتِ اثبات سر ہلا دیا۔

"میں سمجھی تھی کہ اس وقت کھیتوں میں ہوگے۔ کیا ہو آئے؟"

"ہوں" مجید کا جواب تھا۔

"اتنی جلدی۔ کھیت تو یہاں سے" دو میل سے کم نہ ہوں گے"

"اُدھر میں گیا ہی کب ہوں"

"تو یہ دو ڈھائی گھنٹے سے کہاں تھے"

"کہاں تھا!" وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولا" وہاں بیٹھک میں بیٹھا تھا"

"کیا کام تھا بیٹھک میں! جو وہاں دبکے بیٹھے تھے!!"

"کچھ کام ایسا ہی تھا" مجید شرارت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا "وہاں بیٹھا ہوا تمہارے حسن کی مسحور کر دینے والی کرنوں کا مطالعہ کر رہا تھا" وہ کچھ پوچھنے ہی والی تھی۔ کہ اس کی نظر بیٹھک کی کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑ گئی۔ وہاں بیٹھا ہوا آدمی بڑی آسانی سے اندر کے تمام حالات دیکھ سکتا تھا۔

"مجھ سے تو کہتے تھے۔ کہ آج کھیتوں پر جاؤ نگا مگر گئے نہیں۔ کیوں؟"

"نہ جانے کی وجہ تو تم جانتی ہی ہو رضیہ! جاتا کیسے تم جانے بھی دیتیں!"

"رضیہ گھبرا کر بولی "کیوں بھلا میں نے جانے سے کب روکا!"

"اگر اسطرح بنتی سنورتی اور محبت بھرے گیت گایا کرو گی۔ تو میں کوئی کام کر چکا۔ نہ صاحب! اب میں کھیتوں میں نہ جایا کروں گا"

"اور مجھے چار باتیں سنوا کر تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا!"

"وہ کیسے!" مجید نے چونک کر پوچھا۔

"روز ہی تو دیکھتے ہو۔ کہ تمہاری کھیتوں کیطرف سے بے توجہی کی وجہ سے خالہ مجھ ہی پر تمام غصہ اتارتی ہیں کہتی ہیں۔ کہ تم ہی اُسے باہر نہ جانے نہیں دیتیں۔ آج تم بھی وہ کہہ رہے ہو۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے۔ مجھے اس گھر میں رہنے بھی دو گے یا نہیں!"

"تمہیں نکال ہی کون رہا ہے" وہ بولا اور پھر ہنسکر "خدا کی قسم تم غصہ کی حالت میں کتنی حسین معلوم ہوتی ہو"

"رہنے دو یہ چاپلوسی کی باتیں" وہ مصنوعی غصہ کے ساتھ بولی "اگر اسی طرح کھیتوں کی طرف سے لاپرواہ رہو گے۔ تو ایک دن خالہ مجھے گھر سے نکال دیگی۔

"کسی کی کیا مجال ہے۔ جو میری تتلی کو مجھ سے جدا کر دے۔ جان دے دوں گا........

"روز کی بے عزتی گوارا ہے تمہیں؟" رضیہ بولی "کام نہیں کرو گے!"

"میں اب کام نہ کروں گا" "سب کھیت ٹھیکے پر دے دوں گا"

"پھر کیا کرو گے!"

"بیٹھا ہوا تمہارے جمال جہان آرا کا نظارہ کیا کرونگا"

"اس میں پیٹ بھر جائے گا"

"پیٹ نہ بھرے گا۔ تو روح کی تسکین تو ہو گی"

وہ ہنسنے لگا۔ اور رضیہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"کیوں غصہ ہو گئیں! تم نہیں جانتیں رضیہ!!" کہ ایک پل بھی تمہارے بغیر مجھے پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ کہ کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا۔ اب تم ہی بتاؤ۔ کہ میں تمہیں چھوڑ کر کیسے باہر جاؤں۔ جبکہ میرا دل یہاں ہی لگا رہتا ہے۔ پھر باہر کا کام مجھ سے کیا ہو گا۔!"

"میں بھاگی تھوڑے ہی جاتی ہوں۔ ہمیشہ تو یہیں رہونگی"

"مگر یہ دن نہ رہینگے رضیہ! تم مجھے زبردستی اپنے سے جدا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ........" جذبات نے اس کی آواز بند کر دی۔ اور دوسرے لمحے میں رضیہ اُس کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔

مجید کا شمار ان جذباتی نوجوانوں میں ہوتا تھا۔ جو دنیا میں محض محبت ہی کرنے کے لئے آتے ہیں۔ جن کی زندگی کا

مقصد جن کا منتہائے حیات بھی کسی پر مٹنا ہی ہوتا ہے
وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ ہر طرح کا سامان
عیش میسر تھا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ ماں اس پر جان
دیتی تھی۔ محبت کے اس بندۂ بے دام کو خوش قسمتی سے رضیہ
جیسی سلیقہ شعار اور چاہنے والی بیوی مل گئی۔ جو اپنے شوہر
کو خوش رکھنے کے لئے۔ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی۔
پہلے تو میاں مجید کبھی کبھار کھیتوں میں چلے بھی جاتے تھے۔
مگر اب وہ بھی موقوف ہو گیا۔ ماں نے سمجھایا۔ رضیہ نے
باتوں باتوں میں کہا۔ مگر اس جنون پرستار پر کوئی اثر نہ ہوا
جتنا ساس نے کئی دفعہ رضیہ کی [illegible] اور اسی کو مجید
کی بے پرواہی کا باعث قرار دیا۔ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی
آج بڑی مشکل سے رضیہ نے اُسے کھیتوں کی طرف روانہ
کیا تھا۔ مگر جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ وہ گیا نہیں۔ بلکہ بیٹھک
ہی میں دبکا بیٹھا رہا ہے۔ تو اسے بہت دکھ ہوا۔ مگر خود
اسے بھی اس کی لمحہ بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اس لئے خاموش
ہی رہی۔

ابھی دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے کھڑے ہی تھے
بڑی بی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ جو باہر سے
واپس آ رہی تھی۔ رضیہ نے ملتجی نگاہوں سے مجید کی طرف
دیکھا۔ اور آہستگی سے کہا "خدا کے لئے چپکے سے نکل جاؤ
ورنہ میری آج خیر نہیں" مجید اس سے متاثر تو ہوا۔ مگر نظر بچا کے
نکلنے میں دیر کر دی۔ جب وہ بیٹھک کی کھڑکی سے باہر نکل
رہا تھا۔ تو بڑی بی آ پہنچیں۔ رضیہ تھر تھرا اٹھی۔
"ارے! بیٹھک میں کون ہے!" بڑی نے للکار کر
پوچھا۔

مجید کے بڑھے ہوئے قدم رک گئے اور پلٹ کر
بولا "میں ہوں ماں"
"اچھا تو آپ کھیتوں میں نہیں گئے!" ماں بولی"
بھلا تم کیوں جاؤ گے۔ بیگم سے چھٹی ملے۔ جب نہ کھیتی باڑی
کے دھندے میں جی لگے۔
رضیہ دم بخود کھڑی رہی۔ مجید لوٹ آیا۔
بڑی بی پھر بولی۔ رضیہ! تم تو کہتی تھیں۔ کہ کھیتوں
پر گیا ہے۔ اور میں دیکھ رہی ہوں۔ کہ یہاں ہی پھر رہا ہے۔ آخر
تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں کہا!"
"اس نے جھوٹ نہیں کہا ماں" مجید سر کھجلاتے ہوئے
بولا "میں گیا تو تھا۔ مگر ....
"مگر لوٹ آیا۔ کیوں!" ماں فقرہ پورا کرتے ہوئے بولی
"شاید جی نہ لگا ہوگا "کھیتوں پر جانا بھی تو لام پر جانے سے
کم نہیں .... بیگم صاحبہ! اگر تمہیں اس گھر میں رہنا
ہے۔ تو اسے کھیتی باڑی کے دھندے کا شوق بھی دلاؤ..
ورنہ ...."
"ورنہ کیا ہوگا ماں!" مجید گھبرا کر بولا "آپ اسے
میکے بھیجنے کی فکر میں ہوں گی۔ مگر میں آپ کو اس طرح کرنے
دوں گا"
"نکھٹو بن کر گھسے رہنا منظور ہے۔ ہے نا!" ماں نے کہا
"ہاں۔ تین جانوں کی پرورش کے لئے کافی غلہ آ جاتا ہے"
"جیسے ہمیشہ تین ہی تو رہیں گی ......!"
"جب زیادہ کھانے والے ہو جائیں گے۔ تب دیکھا
جائے گا" کہکر مجید باہر چلا گیا۔ اور رضیہ آنسو پونچھتی ہوئی
دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی بی اکیلی بڑی دیر تک

بکتی رہی۔ جب غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ تو نہ جانے کیا سوچ کر رضیہ کے پاس آئی۔ اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "تم رو رہی ہو رضیہ! نہ رو میری بچی مجھے اس سے دکھ ہوتا ہے۔"

"رضیہ نے منہ ادھر اٹھایا۔ اور حیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ بڑی بی کی آنکھوں سے محبت کی بارشیں ہو رہی تھیں۔

مجید اس کے بعد کبھی کبھی کھیتوں کی طرف بھی جانے لگا۔ مگر پھر بھی اپنا بہت سا وقت گھر ہی پر رہ کر گزارتا۔ شاید ہی کوئی عورت ایسی ہوگی۔ جو اپنے حسن کی تعریف کے ساتھ ساتھ ناز برداری کو پسند نہ کرتی ہوگی۔ پھر رضیہ تو حسین تھی اور مجید حسین۔ دیہات میں اس خط و خال کی لڑکیاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ تعلق تو اس کا ایک غریب گھرانے ہی سے تھا۔ مگر تھی بڑی سلیقہ شعار اور سمجھدار میکے میں رہ کر کچھ کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجید اُسے اور بھی چاہتا تھا۔ بقول کسے کہ رضیہ کے تعلیم یافتہ ہونے سے اس کی شراب حسن اور بھی دو آتشہ ہو گئی تھی حسن ناز برداری چاہتا ہے۔ اور رضیہ کو مجید ایسا شوہر مل گیا تھا۔ جو اسے دل سے چاہتا تھا۔ ساس دونوں کی محبت کو تو بہت اچھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ مگر اسے ساتھ ہی ساتھ کھیتی باڑی کی تباہی کا بھی خوف لگا ہوا تھا۔ اس سے وہ رات دن دونوں کو سمجھاتی رہتی تھی۔

ایک دن مجید جو باہر سے گھر آیا۔ تو رضیہ کے گلے میں ایک طلائی ہار دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا نیلے چست جمپر پر اور کشمشی رنگ کے دوپٹے کے پلو سے نیم چھپا ہوا ہار کچھ اس طرح چمک رہا تھا۔ جیسے اندھیری رات میں تارے۔ رضیہ کی چمپئی رنگت۔ تناسب اعضا اور چھریرے بدن میں شباب کی لطافتوں نے کچھ ایسی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ کہ مجید تڑپ اٹھا۔ رضیہ نے اسے دروازے سے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ اس طرح بیخبری کا اظہار کر رہی تھی۔ جیسے کہ اسے خبر ہی نہ ہو۔ مجید کچھ دیر تو للچائی ہوئی نظروں سے اس کے چمکتے مگر تمتماتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا۔ مگر رعب حسن آڑے آ رہا تھا۔ آج رضیہ اس کی نظروں میں دنیا کی حسین ترین نازنین تھی۔ رضیہ نے آہستگی سے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور پھر ایک دلربا انداز سے دوپٹے سے شباب کی دلفریب رعنائیوں کو چھپاتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ مجید مسحور کن لہجے میں رک رک کر بولا "آج کس کی تسخیر کی تیاریاں ہو رہی ہیں.....!"

رضیہ شرما کر اور بھی ٹھٹھری سی ہو کر رہ گئی۔ مجید پھر بولا "اس ہار نے تو تمہارے حسن میں اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اسے روز کیوں نہیں پہنتیں۔"

"میرا تھوڑا ہی ہے۔ جو روز پہنوں" رضیہ بولی۔

"مجید حیران رہ گیا۔ اور گھبرا کر بولا "تمہارا نہیں تو کس کا ہے۔ کہاں سے ملا تمہیں؟"

"عائشہ کا ہے" رضیہ ہار سے کھیلتے ہوئے بولی "صفیہ کی شادی میں جانا ہے نا! میں اُسی سے مانگ لائی۔"

"مانگے تانگے کا زیور پہن کر بھی کوئی شادی میں جاتا ہے؟"

مجید فکرمند ہوکر بولا "خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات
ہوجائے۔ تو دام بھی دینے پڑیں۔ اور بدنامی علیحدہ۔ پھر
خالہ کو تو تم جانتی ہی ہو۔ کس مزاج کی عورت ہیں۔"
"تم سے تو لاکھ دفعہ کہا۔ کہ ایک آدھ سونے
کی چیز بنوا دو۔ جو ایسے موقعوں پر پہننے کے کام آئے
مگر تم نے کوئی خیال ہی نہ کیا۔ اب مانگ کے نہ پہنوں
تو کیا بجویوں میں ہنسی کراؤں!"
"اس میں نہیں کی کون سی بات ہے" مجید
بولا "تم جانتی ہی ہو۔ کہ آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔ اس
سال تو لگان بھی مشکل ہی سے ادا ہوا ہے۔"
"اچھا اب تو جو مانگ لائی۔۔ مانگ لائی۔ پھر نہ لاؤنگی
کل شادی میں جانا ہے۔ آتے ہی واپس کر دوں گی۔"
"جیسی تمہاری خوشی" مجید بولا "ذرا حفاظت
سے رکھنا بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے۔"
"یہی کوئی دس تولے کا ہوگا" رضیہ ہار کو گلے
سے اتارتے ہوئے بولی "آج کی رات ہی تو ہمارے
یہاں رہے گا۔ کل آتے ہی واپس کر دوں گی" یہ کہکر
مجید کے سامنے ہی اس نے ہار صندوق میں رکھ دیا۔

بیاہ کے انتظامات کی وجہ سے مجید کی ماں دو
روز پہلے ہی سے اپنے بھائی کے یہاں چلی گئی تھی۔ گھر میں
مجید اور رضیہ تھے۔ رات کے کوئی دو بجے رضیہ نے
مجید کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی
"دیکھو تو گھر میں کوئی گھسا ہوا ہے۔ کھٹ کھٹ کی آواز
آرہی ہے۔ جانے کوئی تالہ توڑ رہا ہے۔"

مجید گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ مگر کوئی آواز اسے سنائی
نہ دی "کوئی بلی ہوگی۔" مجید دوبارہ چادر اوڑھتے ہوئے
بولا "سو جاؤ"
"نہیں بلی نہیں۔ میں نے صاف سنا ہے جیسے کوئی
تالہ کھول رہا ہو۔ ذرا اٹھ کر دیکھو تو!"
مجید اس کے اصرار کرنے پر لاٹھی لیکر کمرے کیطرف
بڑھا۔ کمرے کا پچھلی طرف کھلنے والا دروازہ کھلا تھا۔ مجید کا
ماتھا ٹھنکا۔ اتنے میں رضیہ بھی ہانپتی کانپتی لالٹین جلا کر لے
آئی۔ اور مجید بڑی ہوشیاری سے دروازے کیطرف بڑھا
اندر جھانک کر دیکھا۔ تو کمرہ خالی تھا۔ مگر۔۔۔۔۔۔ وہ صندوق
جس میں آج دن کے وقت رضیہ نے ہار رکھا تھا۔ زمین
پر کھلا ہوا پڑا تھا۔ اور کپڑے بھی بے ترتیبی کے ساتھ زمین
پر بکھرے ہوئے تھے۔ مجید کے پاؤں تلے سے زمین نکل
گئی۔ اور اسے اپنا خون خشک ہوتا ہوا معلوم ہوا۔
رضیہ چیخ مار کر اس کے گلے سے لپٹ کر رونے لگی۔ مجید
اسے تسلی دینے لگا۔ مگر خود اس کا دل بھی بے قابو ہوا
جا رہا تھا۔ مستقبل کا بھیانک نقشہ اس کی نظروں کے سامنے
پھر رہا تھا۔ تین سو روپے کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی جسے
کوئی آسانی سے ادا کر دے۔ اور پھر وہ تو پہلے ہی سے
تہی دست ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ جی کڑا کر کے بولا "اب رونے
دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ صبر کرو۔"
"ظالم نے مجھے ایک دفعہ پہننے بھی نہ دیا" رضیہ
ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "عائشہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔
اس سے تو ایک دن کے لئے لیا تھا۔"

مجید کو اب رات دن ہار کی فکر ستانے لگی۔ وہ اگر چاہتا۔ تو چوری ہو جانے کا بہانہ کر سکتا تھا۔ اور پھر کوئی اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ مگر اس میں ایک تو بدنامی تھی۔ خاندان کے نام پر بٹہ لگتا تھا۔ دوسرے وہ چیز کسی دوسرے کی نہ تھی۔ اس کی اپنی خالہ زاد بہن کی تھی۔ پھر سب سے بڑی وجہ رضیہ کی دلگیری اور افسردگی تھی۔ وہ دنیا کو ناراض کر سکتا تھا۔ ہر ایک سے بگاڑ کر اس کا گذارا ہو جاتا۔ مگر رضیہ کے شگفتہ چہرے پر افسردگی اور رنج و غم کے تاثرات دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ اور پھر یہ بھی لکھی ہوئی بات تھی۔ کہ وہ ہرگز اس امر پر راضی نہ ہوئی۔ کہ ہار کے چوری ہو جانے کا بہانہ اپنی بہن سے کرے۔ اور اس کے ہار کے بدلے ہار نہ دے۔ یہی فکر رات دن اس کو دامنگیر تھی۔ جس نے اُسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے ایک عملی اور محنتی کسان بنا دیا۔ اب دن رات کھیتی باڑی کے دھندوں میں لگا رہتا۔ مزارع کو جواب دے دیا۔ اور تمام کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے لگا۔

ہار کی گمشدگی کے جرمانے میں اسے لگاتار دو فصلوں تک محنت شاقہ کرنی پڑی۔ اور یہ مجید کے سے آرام طلب اور جذباتی نوجوان کے لئے بہت بڑی بات تھی جس نے اپنے ہاتھ سے تنکا تک نہ توڑا ہو۔ اس کا پسینے میں شرابور کر کے کی سردی اور شدت کی گرمی کا مقابلہ کرتے ہوئے کھیتی باڑی کے تمام کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دینا۔ محبت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اس تگ و دو کی تہہ میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ رضیہ کا جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس کی آرزوؤں پر دیوانہ وار فدا تھا۔ ماں اسکی شب و روز کی مشقت کو دیکھ کر حیران تھی۔ کہ یکایک اسے کس بات نے اس مشقت پر مجبور کر دیا۔ اب وہ شاذ و نادر ہی دن کے وقت گھر میں نظر آتا۔ سارا دن وہ تھا۔ اور اسکے کھیت، ہل اور بیل۔ رات کو جب وہ دن بھر کا تھکا ہارا آتا تو رضیہ سے محض مختصر سی گفتگو ہوتی۔ اور پھر کھانا کھا کر جو سوتا تو صبح کی خبر لاتا۔

رضیہ اس کی مصروفیت اور دیوانہ وار محنت دیکھ کر دل ہی دل میں پچھتاتی تھی۔ اسے پشیمانی تھی۔ کہ بیٹھے بٹھائے ... اسے تن بدن کا کوئی ہوش نہ رہا۔ رضیہ یہ دیکھا کرتی تھی مگر کوئی چارہ نہ تھا۔

مجید تحصیل میں لگان کی رقم داخل کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ شام کو وہ جب گھر واپس آیا۔ تو رضیہ لالٹین جلا کر لے آئی اس نے چھوٹتے ہی پوچھا "ماں کہاں ہے؟"

"محلے میں کسی کے یہاں گئی ہے۔ کیوں!"

"یونہی پوچھا تھا" مجید بولا "ذرا ادھر آؤ تو!" جب وہ آئی تو مجید نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبہ دے دیا۔ اور بولا "آج خدا خدا کر کے اس قرض سے جان چھوٹی۔ جس نے اتنے دنوں سے پریشان کر رکھا تھا۔"

رضیہ حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر جلدی سے وہ چوکور ڈبہ کھولا۔ تو اس میں سونے کا ہار تھا۔ سبز رنگ کے مخمل میں وہ پڑا جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ رضیہ کا دل خوشی سے بانسوں اچھلنے لگا۔ اور وہ ایک دلنشیں انداز میں مجید کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "چیز تو بڑی اچھی ہے۔ کس کاریگر نے اپنی صنعت کاری کا خاتمہ کر دیا ہے؟"

"ہوں"

"اچھا یہ تو کہو۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے اس کے زیور کا خیال کیوں کر آگیا"

"خیال کیوں کر آگیا" مجید فقرہ دہراتے ہوئے بولا "تو میں اسے بھولا ہی کب تھا"

"خیر مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ تمہیں میرے بازوؤں کا اتنا خیال ہے" وہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔ "کتنے روپے لگے اس پر؟"

"دس کم تین سو" مجید بولا "اچھا ذرا جلدی سے جا کر لا دے آؤ۔ بے چاری نے بہت دنوں تک صبر کیا"

"کس کو دے آؤں" رضیہ نے چونک کر پوچھا۔

"عائشہ کو اور کس کو! آخر اس کی چیز تو واپس کرنا ہی ہوگی"

"نہیں میں اسے کسی کو بھی نہیں دوں گی میرے ہی تو لائے ہوئے"

"اچھا جو تمہاری مرضی۔ اگر اسے خود رکھنے کا خیال ہے تو اسے دوسرا لیکر دینا ہوگا.........."

"کیوں! اس کا ہار تو پہلے ہی واپس کیا جا چکا ہے"

مجید چونک پڑا۔ اور گھبرا کر بولا "مگر تم تو کہتی تھیں۔ کہ چوری ہو گیا۔ آخر اس بہانے کی کیا ضرورت تھی"

"خالہ سے بچنے کے لیے" رضیہ ایک دلکش لہجے میں بولی "وہ روز طعنہ دیتی تھیں۔ کہ تم نے ہی آکر میرے بچے کو نکھٹو بنا دیا ہے۔ اور کسی کام کاج کے لائق نہیں چھوڑا۔"

"اور اب جو کیفیت تھی کسی مزارع کے سپرد کر دوں"

"پھر کوئی دوسری قیمتی چیز گم ہو جائے گی"

رضیہ مسکرا کر بولی۔

"اچھا بھئی! میں خود ہی کام کرتا رہوں گا۔ خدا کے لئے کوئی چیز گم مت کرنا" رضیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مجید بھی مسکرانے لگا۔

رہا کی سرخی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر جاں بلب ہو رہی تھی۔ لیوزیان کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ وہ چلانا چاہتا تھا۔ لیکن اسی کرب کی حالت میں وہ اپنے بھیانک خواب سے جاگ اٹھا۔ وہ اسی قمار خانے کی بنچ پر سو رہا تھا اور کلب کے نوکر نے پانچ بجے صبح کو جگایا تھا۔ بیرہ نے اسے ایک برباد منش خیال کر کے تب تک قمار خانے کی بنچ پر پڑا رہنے دیا تھا۔

کھڑکی سے کمرے میں نرم سورج کی شعاعیں اندر آ رہی تھیں۔ لیوزیان باہر نکلا۔ اس نے اپنی گھڑی گرد رکھی غسل کیا ناشتہ کر کے سیدھا فوج کے دفتر میں گیا اور اپنا نام فوج کے سپاہیوں میں لکھا لیا۔

آج لیوزیان فوج کا افسر ہے وہ اپنے کام پر مستعد ہے۔ اب وہ کبھی تاش کے پتوں کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کفایت شعاری سے بھی کام لیتا ہے۔ کیونکہ کچھ ہی دن ہوئے اس کے ایک دوست نے اسے قصبہ کی غریب لڑکی کو خیرات دیتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر تعجب میں تھا کہ غریب لڑکی کے ہاتھ میں بیس فرینک کا سنہرا سکہ تھا۔ جو لیوزیان نے اسے ہدیہ کر دیا تھا۔

سُنہرا سکّہ

فرین کیاس کاڈپلی

ترجمہ ——— جناب محترمہ نسیمہ سندیلوی بی اے (آنرز)

لوتریاں ڈی ہیم نے جب بنک سے اپنی آخری سو فرینک کی پونجی نکالی تو اس کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی تمام عمر کی کمائی بیکار گئی۔ وہ جوئے میں ہارتا ہی گیا۔ اور یہ تمام کمائی جو اس نے اپنی قسمت آزمائی کے لئے جمع کی تھی۔ اس نے بھی وفا نہ کی۔ جوئے کی میز نے کس سے وفا کی ہے۔ لوتریاں کے چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے چہرہ سے اس کے دل کی تیز دھڑکن کا پتہ چلتا تھا۔ اب وہ کیا کرے گا۔؟ اس کا سر چکرانے لگا۔ اسکے پیر کانپنے لگے۔ اس نے لاپرواہی سے اپنے آپ کو قمارخانہ میں پڑی ہوئی ایک کونے کی بنچ پر ڈال دیا۔

کچھ دیر وہ مبہوت قمارخانہ کے چاروں طرف ایک اجنبی کی طرح دیکھتا رہا۔ اس قمارخانہ کے در و دیوار کو حسرت سے تکتا رہا۔ جہاں اس کی جوانی کے بہترین ایام صرف ہوئے تھے لوتریاں دیر تک جواریوں کے تھکے ہوئے پژمردہ چہروں پر ہلکی سی روشنی پڑ رہی تھی۔ بغور دیکھتا رہا۔ میز پر گرتے ہوئے، سنہرے سکوں کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ آواز جس سے وہ اس قدر متنفر ہو چکا تھا۔ کہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے کان ان آوازوں کے لئے بند کرے۔ اس کی نظروں میں اپنے سونے کے کمرہ کی الماری میں رکھا ہوا وہ پستول گھوم رہا تھا جسے اسکے والد نے جب کہ وہ جوان تھا راجا کی لڑائی میں بہادری سے استعمال کیا تھا۔ لوتریان بہت تھک گیا تھا۔ اس پر کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی۔ جیسے کہ نیند آگئی ہو۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے منہ پر کچھ چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیسے کہ رال نکلکر بہی ہو۔ وہ مشکل سے آدھ گھنٹہ سویا ہوگا۔ سامنے لگی ہوئی گھڑی آدھی رات کا گھنٹہ بجانے ہی والی تھی۔ وہ تازہ ہوا کے لئے بے چین تھا۔ لوتریاں کو خیال آیا کہ یہ بڑے دن کی شام ہے۔ اس کا دماغ چکر کھانے لگا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بچہ ہے۔ اور بستر پر جانے سے پہلے اپنے ننھے ننھے جوتے آتشدان کے قریب رکھ رہا ہے جب وہ اس خیال میں غرق تھا۔ ٹھیک اسی وقت اس کا ایک پرانا جوتے کا ساتھی ڈرانسکی اس کے قریب آیا۔ اسکے بدن پر ایک پہنا ہوا کوٹ تھا۔ اور پتلون پر بھی جگہ جگہ تیل کے نمایاں دھبے تھے اس نے لوتریان کے قریب آکر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اتنی دھیمی آواز میں کہ الفاظ ڈرانسکی کی زبان سے نکلکر بمشکل اسکی گندی ڈاڑھی تک پہونچے ہوں گے۔

مجھے صرف پانچ فرینک قرض دیدو۔ دیکھو میں نے دو دن

ے کلب نہیں چھوڑا ہے۔ برابر میں نمبر ے اپر اپنا پیسہ لگا رہا
ں لیکن ان دو دنوں میں نمبر ے نہیں آیا۔ اب میں یہ یقین
ے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ٹھیک آدھی رات کو نمبر ے نہ آئے
ر میرا ہاتھ کاٹ لینا۔

لوثریان نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس کے پاس
تنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ کلب کے بیرے کو بخشش دے سکتا
یاتی فرینک ـــ وہ باہر کمرہ میں گیا۔ جہاں اسکا اوور
ٹ اور ہیٹ تھا۔ اس نے کوٹ پہنا۔ ہیٹ کو ایک طرف
ترچھا کر کے رکھا یا کہ اس کی شکل آسانی سے نہ دکھائی دے
ور وہ بخار کی سی حالت میں زینہ سے اترنے لگا۔

ان چار گھنٹوں میں جب کہ لوثریان قمار خانہ میں بند
تھا۔ برف باری شدت سے ہوئی تھی۔ اور پیرس کی تنگ
یاں۔ جن کے دو رویہ اونچے اونچے مکان تھے۔ برف سے
ید ہو رہی تھیں۔ آسمان پر نیلے دھندلے آسمان پر کہر
ی فضا سے اوپر چھوٹے چھوٹے ستارے چمک رہے تھے
ہارا ہوا جواری اپنے فر کے لبادہ میں سہم سا گیا۔ سناٹے
عالم وہ اس میں تنہا۔ اور اس وقت جبکہ قدرت کے مناظر
ت خوفناک منظر کا پتہ دے رہے تھے۔ اس نے قدم تیزی
سے بڑھائے۔ اس کے دماغ میں خوفناک خیالات رقص کر رہے
ے۔ اُسے بار بار الماری میں رکھے ہوئے پستول کا خیال آ رہا
ا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے پستول کی گولی اس کا
نتظار کر رہی ہے۔ لیکن کچھ ہی دور چلا ہوگا کہ وہ ایک کسی دلسوز
نظر کو دیکھ کر رک گیا۔

ایک پتھر کی پیچ پرانے طریقوں کے مطابق ایک
سے مکان کے دروازہ پر پڑی تھی۔ ایک لڑکی ایک پھٹا ہوا
لباس پہنے برف پر بیٹھی تھی۔ اتنی سردی میں بھی اسکی آنکھ لگ گئی
تھی۔ چہرہ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت پریشان اور تھکی ہوئی ہے
اس کا سر اور اسکے نازک شانے عجب انداز سے دیوار سے
سہارا لئے ہوئے تھے۔ اس کا ایک جوتا لٹکے ہوئے پیر سے
نکل گیا تھا جو زمین پر اس کے سامنے پڑا تھا۔

نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت لوثریان نے اپنی جیب
میں ہاتھ ڈالا لیکن اُسے یاد آ گیا کہ کچھ ہی منٹ پہلے اس کی
جیب میں اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ رخصت ہوتے وقت کلب
کے بیرہ کو انعام دے سکتا۔

پھر بھی وہ ہمدردی اور شفقت سے لڑکی کی طرف بڑھا
وہ چاہتا تھا کہ اُسے گود میں اٹھائے اور اس کے رات کے سونے
کا انتظام گرم بستر پر کرے۔ یکایک اس نے برف پر پڑے
ہوئے جوتے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی دیکھی۔

یہ ایک بیس فرینک کا سنہرا سکہ تھا۔ کسی رحمدل نے
یقیناً کسی عورت نے ترس کھا کر پرانے روایات کو برقرار رکھنے
کے لئے کرسمس کی شام کو حضرت مسیح کو تحفہ بھیجتے ہیں۔ اس
لڑکی کے جوتے میں یہ سنہرا سکہ بھیک سمجھکر ڈالدیا ہوگا۔ تاکہ وہ
اپنی خستہ حالت میں بھی خدا پر بھروسہ رکھے اور ایمان کا دامن
نہ چھوڑے۔

بیس فرینک۔ یہ لڑکی کے لئے بیس دن کے
آرام کے لئے کافی تھے۔ لوثریان اسے جگا کر یہ خوشخبری دینے
ہی والا تھا کہ اس کے وہم نے اس کے کان میں کہا دیکھو
میں نے دو دن سے کلب نہیں چھوڑا، میں شرط لگا سکتا ہوں
کہ آدھی رات کو نمبر ے ضرور آئے گا۔ ورنہ تم میرے ہاتھ کاٹ
لینا۔ اس خیال کے آتے ہی لوثریان جیسے اپنے فوجی نسب پر ناز

تھا۔ جس نے کبھی اپنی آن لوا اپنی ایمانداری کو بٹہ نہ لگنے دیا تھا۔ بے ایمانی کی طرف مائل نہوا! اس کے دماغ میں بھیانک خیالات آرہے تھے۔ اس نے نظر بھر کر گلی کے چاروں طرف دیکھا۔ وہ بالکل تنہا تھا۔ اس نے جھک کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جوتے میں پڑا ہوا سونے کا سکہ چرا لیا۔ اور تیزی سے قمار خانہ کی طرف دوڑا۔ اس نے چھلانگ لگاتے ہوئے زینے طے کئے۔

قمار خانہ کا دروازہ اپنی مٹھی سے کھولا اور ٹھیک ہوتے اندر پہنچا جب کہ گھڑی آدھی رات کا گھنٹہ بجا رہی تھی۔

"ستر ہ پہ"

ستر ہ بیتا۔ جلدی سے لوتزیان نے سونے کے چالیس سکے لال رنگ پر رکھ دیئے۔ لال رنگ آیا۔ اس نے ۸۰ سکے پھر اسی رنگ پر رکھ دیئے۔ لال رنگ پھر آیا۔ اس نے دوگنی رقم دوبارہ ۔ بارہ جیتی ہوئی قیمت سے جوئے میں لگائی اب اس کے سامنے نوٹوں اور سونے کے سکوں کا جوئے کی میز پر پھیلی ہوئی چادر پر ایک انبار تھا۔ اور وہ بیتابی سے جنوں میں اسے ادھر ادھر کر رہا تھا۔ وہ جوئے میں جیتتا ہی گیا۔ اس کے تمام نمبر صحیح پڑ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوئے کا بالا لوتزیان کے اشارے پر چل رہا ہے۔ اس نے اپنی کئی ہزار کی تمام کی ہاری ہوئی رقم پوری کر لی تھی۔ وہ کبھی دو سو کبھی چار سو لگاتا ہی گیا۔ وہ برابر جیتتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ اس کی کوٹ کی جیبیں۔ پتلون کی جیبیں۔ اس کی تمام جیبیں بھر گئی تھیں۔ تب اس نے جیتی ہوئی رقم کو رومال میں باندھا۔ کچھ ٹوپی میں رکھا۔ وہ اسے ہر ممکن طریقہ سے سمیٹ رہا تھا۔ لیکن اس کے جی میں چنگاری سی تھی۔ اسے اس لڑکی کا خیال آرہا تھا جسے وہ گلی میں برف پر چھوڑ آیا تھا۔

"وہ ابھی تک اسی جگہ ہے۔ یقیناً وہ اسی جگہ ہوگی بس جوں ہی ایک بجے گا۔ میں قسم کھاتا ہوں میں ایک بجتے ہی جوا بند کر دوں گا۔ اسے گود میں لے جاؤں گا۔ اسے اپنے بستر پر سلا دوں گا۔ میں اس کی پرورش کروں گا۔ اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے رچاؤں گا۔ اسے قیمتی جہیز دوں گا۔ میں اسے اپنی لڑکی بنا کر رکھوں گا۔"

گھڑی نے ایک بجایا۔ لیکن لوتزیان اسی طرح بیٹھا رہا۔ ڈیڑھ بج گیا۔ پونے دو ہوگئے۔ لیکن لوتزیان جوئے کی میز سے نہ ہٹا۔ یہاں تک کہ مالک نے کہہ دیا کہ اب اس رات کو جوا نہ ہوگا۔ اسکی تمام پونجی ختم ہوگئی ہے۔ اس پر یہ بھوتنی طاری ہوگئی۔ چونک پڑا۔ اس نے جوئے میں جیتی ہوئی رقم کو بے ترتیبی اور لاپرواہی سے سمیٹا۔ وہ دوسرے جواریوں کو دھکا دیتا ہوا تیزی سے زینے سے اترا اور اس پتھر کی بنچ کی طرف دوڑا۔ اس نے دور سے گلی کی دھیمی روشنی میں لڑکی کو دیکھا۔

"اللہ اللہ" لیوتزیان چلا اٹھا "وہ ابھی وہیں ہے۔"

وہ اس کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ اور محبت سے لڑکی کا سر دونوں ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیا۔ "بچے بھی کیسی غفلت کی نیند سوتے ہیں" اس نے لڑکی کو گرمی پہنچانے کے لئے سینے سے لگا لیا۔ اس نے اس کی آنکھوں پر بوسہ دیکر اسکو جگانا چاہا لیکن لیوتزیان یہ دیکھ کر کہ لڑکی کی پلکیں نیم کھلی ہوئی ہیں۔ جس میں سے بے رونق ساکت آنکھیں نظر آرہی ہیں۔ اس نے اپنے منہ کو لڑکی کے منہ کے قریب رکھکر دیکھا لیکن لڑکی کی سانس بھی بند تھی۔

جب کہ وہ چوری کے روپیہ سے جوا کھیل رہا تھا غریب

(بقیہ صفحہ ۲۲۵ پر)

موضوع

از

جناب کاشف ایم، اے

گاؤں سے اسٹیشن چار میل پر تھا ـــ!

فہیم :- "کہئے تو اسٹیشن میں کسی ٹم ٹم والے کو بیعانہ دیتا ہوا اپنے اسکول چلا جاؤں گا۔"

میں :- "چار میل کی مسافت طے کرتے کتنی دیر لگے گی۔ راستے کی کوئی قباحت تو ہے نہیں یہاں سے وہاں تک پختہ سڑک ہے۔ کوئی گھوم پھیر بھی نہیں۔"

فہیم :- "بھیا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ سردیوں کے دن ہیں۔ چار بجے اسکول سے گاؤں کو لوٹتے لوٹتے میدان کی سرد ہوا سے یقین جانئے ہاتھ پاؤں برف ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ کو دس بجے رات کو اسٹیشن پہنچنا ہے۔ بستر بکس (بستر بست) کا بکھیڑا بھی ضرور ہوگا۔ اس وقت خیال کیجئے دل ہلا دینے والی زناٹے کی ہوا ہو گی۔"

میں :- "میاں راستہ چلتے بھی کہیں سردی معلوم ہوتی ہے۔ تیزی سے چلے تو آدمی پسینہ پسینہ ہو جائے باقی رہا سامان، تو گوپال کو خدا سلامت رکھے بکس کیا بہت بھاری ہے۔ البتہ بستر ذرا لحاف وغیرہ کی وجہ سے ایک بوجھ معلوم ہو گا۔"

اس میں شک نہیں کہ ٹم ٹم پر جاؤں تو راستہ بات کی بات میں طے ہو جائے گا۔ اور ٹھنڈی ہوا کے شل کر دینے والے جھونکوں سے بھی جلد نجات ملے گی۔ بوڑھا گوپال بھی جاڑے کی رات میں اپنی گدڑی میں لپٹا لپٹا یا گرم پڑا خراٹے لے گا۔ مگر پورے ایک روپے کی چپت کا سامنا ہے۔ یہی نا؟ کہ گوپال بھی تو آخر مزدوری لے گا۔ تو کتنی؟ وہی دو آنے! احتیارات کی وجہ سے چلو ایک آنہ اور سہی۔ ان حسابوں کو لیجئے ساری بلائیں تین آنے میں ٹل جاتی ہیں۔ تیرہ آنے اپنی جیب کی جیب میں رہے۔ کبھی سفر کا واسطہ ہے، یہاں اترنا وہاں چڑھنا اُدھر گاڑی بدلنا ایک مصیبت ہو تو کہی بھی جائے قلی کے ناز نخرے الگ ہیں۔ دل میں فیصلہ کیا کہ نہیں ٹم ٹم کا بکھیڑا فضول ہے۔ پیدل چلے جائیں گے۔ دنیا جانتی ہے ہم کون سے واجد علی شاہ ہیں۔

گاؤں میں آنا جانا کوئی ایسی بات نہیں کہ صرف آپ کا ذاتی معاملہ ہو۔ گاؤں میں قدم رکھا نہیں کہ بس گھر گھر خبر پہنچ گئی۔ اور جہاں باہر قدم نکالے تو بس سب کو معلوم ہو گیا میرے کلکتہ جانے کی خبر جب پھیل گئی تو کچھ عورتیں آئیں کہ۔

"بھیا خط لکھ دو ہمارے عزیزوں کو وہاں (کلکتہ) دید بنا
سب کے خط لکھ کر پہلے منشی جی کے فرائض ادا کئے پھر
قاصد بننے کے لئے ان کو اپنے بکس میں رکھا۔ یہ قصہ
ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ دوسرا تماشا شروع ہوا۔ اب
دیہاتی سوغات کی گٹھریاں پہنچنے لگیں۔ اور بس یہ کہ
"میرے لال! جاتے ہی چچا کے حوالے کر دینا" کسی کی فرمائش
کہ "اس میں جلد بگڑ جانے والی چیز ہے، خیرو کا انتظار نہ کرنا
خود سے پہنچا دینا، اللہ تم کو بھی تم جیسا دکھنے دار" بیٹا دیکھ
انکار مجھ سے ممکن نہیں۔ گاؤں والے اسی طرح
ایک دوسرے کے کام ہی آتے ہیں۔ کوئی مکان سے
واپس ہوتا ہے تو سب کی آس بندھی ہوتی ہے کہ کچھ سوغات
اپنی بھی آئے گی۔ اور گٹھری کی ہوئی چیزوں کا دیدار ہوگا۔
بہرحال گٹھریاں سٹے چار ہاتھ۔ کسی میں لڈو، کسی میں بتیسے
اور ٹھنو اور کسی میں خورمیاں اور کھجوریں تھیں۔ یہ سب
مل ملا کر ایک اچھا خاصہ سامان ہو گیا تھا۔ گھبرا رہا تھا کہ کہیں
گوپال اٹھانے سے انکار نہ کر دے۔

پہنچ کے خط لکھنے کا وعدہ کیا پھر بھی کئی آنکھیں
نم ہو گئیں کئی دل مرجھا گئے۔ ماں بہن دولائی اوڑھ دور ہر
اوڑھے گلی تک پہنچانے آئیں "جس طرح پیٹھ دکھائی ہے
منہ دکھانے کا دن بھی اللہ نصیب کرے" ان دعاؤں کے
ساتھ سب سے رخصت ہوا۔

آگے آگے میں تھا پیچھے پیچھے گوپال جاڑے
کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر اسٹیشن جوں توں پہنچ ہی گیا۔
چار میل کی مسافت طے کی تھی مگر کچھ دیر دم لینے کے لئے
بیٹھ بھی نہ سکا۔ کیونکہ گاڑی کا وقت قریب ہو چلا تھا۔ ٹکٹ گھر
کی کھڑکی پر مسافروں کی ایک یورش برپا تھی سُستانا کیا
اس ہجوم غفیر میں گھسا اور اس وقت تک گم رہا جب تک ٹکٹ
لے کر واپس نہ پلٹا۔

قلی سامان کے ارد گرد گدھوں کی طرح پہلے ہی سے
چکر لگا رہے تھے۔ اشارہ پاتے ہی سامان سر پر اٹھا لیا۔ بالآخر
میں معہ اسباب کے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ تیسرے درجہ
کے ڈبے جہاں بمعمولاً لگتے ہیں وہیں سامان رکھوایا۔ گاڑی
آئی۔ ڈبوں میں بیٹھنے کی جگہ کیا ہوتی جب یہ سنا کہ پہلے ہی
سے لوگ سارے سارے دن کھڑے کھڑے چلے
آ رہے تھے۔ منت آرزو سے کام نہ چلا تو جبر کر کے
کھڑکی سے داخل ہوا اور قلی کے سر سے سامان اندر
اتارنا شروع کیا۔ اب ہاتھوں میں بستر ہے اور مسافروں
کے سر ہیں۔ اور طرفہ تجزیہ رہا ہوں! دھڑکی ہے کہ ابھی
کہیں گاڑی چھوٹ رہی ہے! پیسے دیجئے!!!" کا شور
برپا کئے ہوئے ہے۔ ذرا سی جگہ دیکھتے ہی بستر کو ٹکا دیا۔
کسی کی ٹانگ نیچے آگئی تو شور مچا کہ پہلے ہی منع کیا تھا کہ
جگہ نہیں جاؤ آگے خالی ہے مگر وہی ہندوستانی بھیڑیا
دھسان"۔ میں نے لبیک "بیٹھی" لی اور ٹکے ہوئے بستر
پر اسکو رکھا۔ بیٹی الگ ڈول رہی ہے۔ اور میرا ہاتھ اب
دوسری سوغات والی گٹھری میں پھنسا ہوا ہے، گاڑی
چھوٹ رہی ہے قلی ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے، بگڑ رہا ہے
ایک ہاتھ سے میں کیونکر پیسے نکالوں اور دوں۔ آخر
ایک شخص کی گود میں گٹھری پٹکی اور پیسے حوالے کئے اب
یہاں جنگ کا سامنا! میں نے مجبوری سمجھائی۔ مشکل سے
سمجھ میں آئی خیر مان گئے جائے تنگ است مرداں بسیار کی

وجہ سے سردی تو سردی پیشانیاں عرق عرق ہو رہی ہیں اس طرح جامد و ساکت کھڑا ہوں جیسے کسی کو خول کے اندر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ مجال نہیں کہ ذرا بھی ہل سکوں جہاں ہاتھ اٹھائے اور کسی کی چندیا سامنے آگئی۔ کھڑے کھڑے ذرا سہارا لینے کو جھکا کہ میری کہنی سے کسی کی ناک ٹکرا گئی جوتھے اسٹیشن پر جنکشن آیا۔ مشکل سے سامان اتارنے کے بعد دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آنے میں دیر تھی قلیوں سے گاڑیوں کی ریل پیل کی حالت پوچھی انہوں نے ایسی وحشتناک خبریں سنائیں کہ دم الٹنے لگا۔ شہادت کے لئے بہت سے چھوٹے ہوئے مسافر ملے کسی نے دو گاڑیوں کو حسرت سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کوئی سوار ہو کر لات مکّے سے گھبرا کر آخر اُتر گیا۔ تھا۔ سُن سُن کے برا حال ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے خیال آرہے تھے ہیضوں کو متلی آرہی تھی۔ سر گھوم رہا تھا۔ کسی کو الٹی ہو رہی تھی پلیٹ فارم پر مریض ہی مریض نظر آرہے تھے۔ مختصر یہ کہ اس رسل و رسائل اور آمد و رفت کی آسایئوں کے زمانے میں بھی سفر نمونۂ سقر ہی تھا۔

مسافر تمام کھڑے ہوگئے۔ اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ دیکھیں یہ گاڑی کیا پیام لاتی ہے۔ گاڑی آگئی۔ ارے معاذاللہ! وہاں تو گاڑی کے اندر ہی چھتریاں اور لاٹھیاں چل رہی ہیں۔ کتنے تو کھڑکیوں سے آدھا دھڑ باہر نکالے رکوع میں تھے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی ریل پیل تھی۔ ذرا سا دروازہ کھلا اور ہجوم ٹوٹ پڑا۔ میلے کچیلے برقعہ اوڑھے پرانی دھرانی دِلی والی جوتیاں پہنے مسلمان مستورات کھسر پھسر کرتی ہوئی زنانہ ڈبوں کے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ کے آدمی ہاتھوں میں آفتابے اور گنبد نما پاندان لئے ساتھ ساتھ چکر لگا رہے تھے۔ بڑی بے حرمتی کے ساتھ شریف عورتیں ڈبوں میں سوار کیا کرائی گئیں۔ چیز بست کی طرح اندر سینت دی گئیں ان کی جوتیاں پاندان پر چھوٹ گئیں مردوں نے اٹھا اٹھا کے ان کو اندر پھینکا۔ پھر خود مردانے ڈبوں میں دستے پکڑ کے باہر کھڑے ہوگئے ان کی پیوندوں سے بھری شیروانیوں، میلی ٹوپیوں، ٹوٹے جوتوں اور انگلیوں میں عقیق اور فیروزے کی انگوٹھیوں کے خیال نے مجھے اسٹیشن کے ماحول سے باہر نکال کر ایک زوال پذیر قوم کی مٹتی ہوئی معاشرت کے تڑپا دینے والے المناک مناظر میں تھوڑی دیر کے لئے گم کر دیا۔ ! میں نے اس پر سوار ہونے کا یارا نہ پایا۔ بہت ہار بیٹھا۔ قلی نے جیسے ہی کہا کہ "اب دوسری گاڑی چار گھنٹے کے بعد آئیگی" شدّتِ انتظار کا اکتا دینے والا تصور سامنے آگیا۔ مگر اسکا علاج ہی کیا تھا۔ بستر سے ٹیک کر بیٹھ گیا۔

خدا خدا کر کے انتظار کی کڑی منزل ختم ہوئی۔ قلیوں نے گاڑی کے آنے کی بشارت دی۔ ایک چہل پہل کی لہر دوڑ گئی۔ مسافر آمادگی، اور مستعدی دکھانے لگے۔ گاڑی آئی بھیڑ بہت کم تھی۔ چھوٹے ہوئے تمام لوگ اس مسافر نواز گاڑی کو دعائیں دیتے ہوئے سوار ہوئے۔ مجھے بھی بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ ہم سفروں سے برادری قائم ہوگئی۔ کسی نے بیڑیاں نکالیں کسی نے دیا سلائی دی۔ دھوئیں کے حلقے ڈبے میں ہر جگہ دکھائی دینے لگے۔ پھر اپنے اپنے چٹکلوں، ملوں اور کارخانوں

کی گذشتہ بندی اور اس کی لائی ہوئی تباہیوں کے قصے شروع ہوگئے۔ مزدوروں کی پھوٹ اور مالکوں کی کامیابی پر رائے زنی ہونے لگی۔ ذرا ہٹ کر فیض آباد کی طرف کی ایک کم سن نوخیز لڑکی ایک اردو خط لیے ہوئے ایک دوسرے سے پڑھوا کر لکھے ہوئے پتہ کی بابت پوچھ رہی تھی۔ یار لوگ چٹکیاں بھی لے رہے تھے۔ وہ اس دل لگی پر بگڑتی اور روتے ہوئے کہتی کہ ”میں اپنے شوہر کے بیمار ہونے کی خبر پاکے تن تنہا چلی آئی ہوں۔ مجھے راستہ معلوم نہیں“ لوگ بسوں اور لاریوں کے الٹ پلٹ نمبر بتا رہے تھے۔ ایک نے ہمدردی یوں ظاہر کی ”گھبرانے کی کونسی بات ہے چلو ہم تمہیں لئے چلتے ہیں“، بڑے بوڑھے پھٹے پرانے کمبلوں سے سر نکال کے اسے تسکین دلاتے، میرے پاس ایک ہی مسافر پرتاب گڈھ کی طرف کا بیٹھا ہوا تھا۔ تہمد باندھے اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ سردی معلوم ہو رہی تھی مگر برداشت کر رہا تھا۔ میں نے اس کی اس بے سر و سامانی کی بابت پوچھا۔ کہنے لگا ”نہ پوچھئے! چوتھے دن اسی وقت گھر گیا تھا ابھی ویسے ہی لوٹ رہا ہوں۔ میرا چچیرا بھائی ٹرام کا ڈرائیور تھا۔ بدقسمتی سے ٹرام ہی سے کٹ کر مر گیا۔ چچا کو خبر کرنے گیا تھا۔ جلدی سے یوں لوٹ رہا ہوں کہ شاید بھائی کی جگہ مل جائے۔ بات تازہ تازہ ہے نا؟۔ کیا بتاؤں! بوڑھے چچا تو زمین پر لوٹنے لگے۔ خیر وہ تو دوسرے بیٹوں کو دیکھ کر ان کو بھول بھی جائیں گے۔ مگر ان کی بیوی کا کیا حشر ہوگا۔ دوسری شادی نہ ہوگی۔ نہ انکے اچھے دن پھریں گے۔ ساری زندگی یوں ہی رو رو کے موت کا آسرا لگائے بیٹھی رہیں گی۔ بچے بھی ہوتے تو اس بندھتی حال ہی تو شادی ہوئی تھی۔ کاش اس کا بھی جنازہ ساتھ ہی اٹھتا“ میں نے کہا ”بھئی تم مسلمان ہو پھر دوسری شادی میں کیا مضائقہ ہے۔؟“ کہنے لگا ”اجی کمبخت رواج نے ہمارے تو ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے ہیں۔ ان زنجیروں اور بیڑیوں سے چھٹکارا کہاں اور بھائی صاحب! سو کی ایک بات تو یہ ہے کہ ان کی قسمت ہی بگڑ گئی اچھے بھاگ ہوتے تو یہ دن ہی کیوں آتا۔ اب مرہم پٹی سے ہوتا بھی کیا ہے زخم اچھا بھی ہوا تو یہ داغ تا عمر نہیں مٹنے کا“ یہ باتیں ختم بھی نہ ہوئی تھیں کہ چند اندھے فقیروں کے گانوں نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بھوجپوری کانسٹبلوں کی فرمائش تھی کہ کوئی بہار دار ٹھمری سناؤ کہ قلب میں گرمی پیدا ہو۔ انہوں نے ...... میرے مولا بلالے مدینہ مجھے .... ایک خاص دھن میں گانا شروع کیا۔ کانسٹبلوں نے ایک ڈانٹ بتائی کہ ”ابے یہ کون سا مدینہ مکہ شروع کردیا۔ جما ہیاں لیتے لیتے جبڑے دکھ گئے۔ کوئی پھڑک دار چیز سناؤ کہ دل ترنگ میں آکے لہریں لینے لگے۔“ پھر آپس میں کہنے لگے کہ ”مدینہ ہی جانا ہے تو چلے جاؤ کون روکتا ہے۔“ میرے عم زن پڑوسی کے کانوں میں یہ بات پڑی اور مذہبی جوش سے مغلوب ہوگیا۔ اور سارا غم بھول کر کاشی اور متھرا کے نام ہی زبان سے نکالے تھے کہ میں نے اسے چپ کیا۔

پہلے اور دوسرے درجوں کے مسافر بتیاں گل کرکے اور تمام کھڑکیوں کو بند کرکے توشکوں اور کمبلوں

سادھو

از

جناب خواجہ عبدالقیوم ایم اے

اُس دھرتی میں پاپ کا میلہ ہوتا ہے۔ بچہ۔ آنند
کاش کے پرے تاروں کی گود میں ملتا ہے۔ جب آدمی
ن دنیا کو تیاگ دیتا ہے۔ اور اپنے اصلی گھر کی طرف رُخ
رتا ہے،، سادھو کی گھنی داڑھی، چمکدار آنکھیں اور چوڑی
یشانی سے میں بہت مرعوب ہو رہا تھا۔ نہ جانے دل
زبجود کیوں سادھو کی طرف کھچا جا رہا تھا۔

"تو آپ کو اس دنیا کے اتنے ہنگاموں میں کہیں
بی آرام نظر نہیں آتا۔ بابا"

"بچہ۔ میں نے جیون کا سکھ دکھ سب دیکھ لیا ہے۔
نگ رنگیلی دنیا کے سارے رنگ میں اپنے آپ کو رنگا ہے۔ مگر
دآنند مجھے ویران جگہوں میں ملتا ہے۔ وہ اور کہیں نہیں ملتا
تنا مزا ہے کھلے کھلے آکاش کی آزاد ہوا میں جو دھرتی کے
اپ سے بہت دور ہے!" سادھو کی باتیں مجھے میٹھی میٹھی
علوم ہو رہی تھیں۔ اور کسی نامعلوم جذبہ کے ماتحت میری یہی
تنا تھی کہ سنیاسی باتیں کئے جائے اور میں سنتا جاؤں۔

اس کی باتوں کا اثر اور لوگوں سے زیادہ خصوصاً مجھ
ر ہا تھا۔ میں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ میرا فطری رجحان دنیا کی
دی چیزوں کے ساتھ نہیں اور کوئی پوشیدہ طاقت میرے
دماغ کو دنیا کی چیزوں سے بہت دور لیجانے کی کوشش
کرتی ہے۔

میرے پتاجی میری اس طبیعت سے بہت متفکر نظر آتے تھے
میں جب کبھی بھی دنیا سے کنارہ کشی یا روحانیت کے متعلق
ذکر کرتا ان کے چہرہ سے ایک شدید اضطراب جھلکتا اور یہ معلوم
ہوتا گویا انہیں بہت ہی زیادہ روحانی تکلیف پہنچ رہی ہے، مگر
میں اپنی فطرت سے مجبور تھا۔

آٹھ ماہ گذر گئے میرے پتاجی بہت سخت بیمار پڑے
ان کا مرض تھا کہ بڑھتا جاتا تھا۔ میں دل و جان سے ان کی تیمار
داری کرتا۔

ایک رات جب میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ اور وہ شدید
بخار کی حالت میں آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ ان کی نحیف آواز
نے مجھے پکارا۔

"رمیش"

"پتاجی"

"بیٹا اب میں شاید زندہ نہ رہ سکوں۔ اسلئے میں چاہتا ہوں
کہ آج رات تمہیں وہ بات کہہ ہی دوں جسے سنانے کے لئے
میں بہت دنوں سے تڑپ رہا ہوں" میں نے پتاجی کی غیر معمولی
باتوں سے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"تم بہت پریشان ہو گئے کہ آج میں تم سے ایک
غیر معمولی انداز سے کیوں مخاطب ہوں مگر میں نہیں چاہتا
کہ تمہیں وہ بات کہے بغیر مر جاؤں"

"جی"

"راجندر میرے اسکول کا ساتھی تھا ہم دونوں میں انتہا درجہ کا ارتباط تھا۔ ہم نے ایک ساتھ انٹرنس پاس کیا۔ اس کے بعد راجن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بمبئی چلا گیا۔ ہم دونوں میں برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ بمبئی کے ماحول نے اچھے راجن کو بُری عادتوں میں گھیر لیا۔ اس کے اطوار بگڑتے گئے۔ وہ جب آئی اے میں فیل ہوا تو اس کے باپ نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ اور اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے ماں باپ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی شادی رچائی۔ کملا نہایت حسین اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ مجھے یہ شادی بہت پسند تھی۔ مگر مجھے اب راجندر کے چال چلن پر اعتبار نہ رہا تھا۔ اور میرا دل اکثر اوقات بیچاری کملا کی آئندہ زندگی کے تصور سے بیٹھا جاتا تھا۔ چار سال گذر گئے۔

اس عرصہ میں مجھے ہیڈ ماسٹری کی جگہ مل گئی۔ اور مجھے مجبوراً راجندر اور کملا سے بہت دور رہنا پڑا۔ بجائے سدھرنے کے راجندر کی حالت اور بدتر ہوتی گئی۔ اس کی سرخ آنکھیں ہر وقت شراب کے نشہ سے مستی اور غصہ کا اظہار کرتیں۔ اس کی نگاہیں فرشتہ خصلت کملا کو چھوڑ کر اوباش عورتوں کی جستجو کرتیں۔ اپنے باپ کے مرجانے کے بعد جو کھلی آزادی اُسے ملی اُسے اس نے ذلیل ترین طریقہ سے گذارا۔ بیچاری کملا اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر آٹھوں پہر روتی رہتی اور اپنے شوہر کو اس کی کم ظرف حرکتوں سے باز رکھنے کی ہزار کوشش کرتی مگر اُسے سوائے دھتکار اور گالیوں کے اور کوئی جواب نہ ملتا۔"

میں اس غم انگیز واقعہ سے بہت متاثر ہو رہا تھا دل ہی دل میں راجندر کو میں بہت بُرا سمجھ رہا تھا۔ اور مجھے خاص کر اس کے ننھے بچے پر بڑا ترس آرہا تھا جس کی زندگی نہ جانے کتنی اجیرن ہوگی۔

"اسطرح دو سال اور گذر گئے۔ راجندر نے اس عرصہ میں مجھے کوئی خط نہیں لکھا۔ فطری طور پر مجھے اپنے دوست کی زندگی اور بیچاری کملا کا بہت افسوس تھا۔ میں نے اُسے کئی خطوط لکھے مگر انکا کوئی جواب نہیں ملا۔ بیچار و ناچار میں خاموش ہو رہا۔ ایک دن علی الصباح ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے حالات کی بالکل کایا ہی پلٹ ڈالی۔ مجھے راجندر کا ایک غیر معمولی خط ملا لکھا تھا!

"شائد تم ابھی تک اپنے راجن کو نہ بھولے ہوگے میں نے کملا کو قتل کر دیا ہے اور اس کے ننھے بچے کی پرورش میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ بچہ تمہیں کسی وقت مل جائے گا۔ میرا بسیرا اب ہمالہ کے غاروں میں ہوگا۔

تمہارا۔ راجن"

اس نے اپنا عزیز بچہ کسی مزدور کے ہاتھ مجھے پہنچا دیا اور میں نے اُسے اپنا بچہ سمجھکر پالنا شروع کیا۔ اس کا نام میں نے رمیش رکھا۔"

مجھے دھکا سا لگا۔ میری آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں اور میں اپنے بیمار باپ کیطرف یوں دیکھنے لگا جیسے کسی سنگ تراش کا بنایا ہوا بت اسے بے جان آنکھوں سے گھورتا ہو۔ میرا دل تڑپ رہا تھا میں بولنا چاہتا تھا مگر زبان کہنی معلوم طاقت نے بند کر رکھی تھی ــــ وہ فقیر جسکا ابھی ابھی چند روز پہلے ایک دھوبی ہمارے گاؤں میں آیا تھا میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ آواز رک رک کر آرہی تھی جنھیں میں اتنے زمانے تک باپ کہکر پکارتا رہا انہوں نے آخری ہچکی لی اور چل بسے۔ میں ساری رات نہ سو سکا۔

یں رات کی نیند کے مزے لے رہے ہوں گے یہاں تیسرے درجہ میں دن کے تمام ہنگامے برپا تھے۔

موکامہ اسٹیشن میں گاڑی پہنچ گئی ...

لدے ہوئے موٹروں اور بگھیوں کی قطاروں سے بچتا ہوا رکشا اسٹینڈ پر پہنچا۔ نیا سمجھ کے رکشے والوں نے زیادہ جھٹنے کی کوشش کی مگر میں نے ... کمبخت ثابت کیا اور دو پیسے زیادہ دیکر چودہ پیسے میں راضی کر لیا۔ بہت سی موٹریں اور بگھیاں نکل چکی تھیں میں اتنی محنت کے بعد اب روانہ ہوا۔

گھر پہنچا ... کا شیشہ پڑا ہوا ملا۔

افسانہ کی فرمائش تھی، سوچ رہا تھا کہ کیا لکھوں مزدور، کسان، رکشہ والا، بھکاری، یا بلوا لفٹ، آخر کوئی موضوع بھی تو سمجھ میں آئے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ سفر کی تکان اور ماندگی تو دور ہوئے۔

بھوک کی مار!

از جناب سید اظہار عالم صاحب شمیم رضوی سید آبادی

جگدیش کرانی تھا۔ تیس روپے ماہوار اسکی تنخواہ تھی۔ پانچ برس کے عرصے میں ایک دن بھی اس نے کام ناغہ نہ کیا تھا۔ وہ دانا اور کفایت شعار ضرور تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی ایک بیوی اور چار بچوں والا مرد اس قلیل رقم سے کچھ زیادہ پس انداز نہیں کرسکتا۔

مکان کا کرایہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ بال بچوں کی شکم پُری ۔۔۔۔۔۔۔ خوراک و پوشاک کے مصارف ۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ ہر ماہ کے اختتام پر اس غریب کے وہ تیس روپے بھی تمت بالخیر ہو جاتے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اوقات بسری ہو ہی رہی تھی۔ یہی حقیر رقم ایک دو نہیں چھ چھ جانوں کی پرورش کا سہارا تھی۔ خورش و پوشش نیز بچوں کی تعلیم و تدریس کے جملہ مصارف کے لئے یہ معمولی رقم کس طرح کافی و وافی ہوتی، یہ ایک محیر العقول طلسم تھا۔ ایک سربستہ راز جس کی نقاب کشائی میں خود اس کرانی کی قوت مدرکہ کو اپنی کوتاہ دامنی و بے مائیگی کا اعتراف تھا۔۔۔۔ اعتراف جائز۔ لیکن اہل نظر کو نگارخانۂ اسرار کے اس آئینے میں اس کرانی کی دور اندیش و منتظم بیوی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

سوئے اتفاق کہ بیچارہ کلرک بیمار پڑ گیا ۔۔۔۔۔ نہ ایک غریب آدمی بیمار پڑنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ اور نہ ایک شادی شدہ مرد کام ناغہ کرنے کی۔ اگر کوئی بیمار ہو گیا ہے تو ہوا کرے لیکن پھر بھی اسے اپنے کام پر جانا ضروری ہے۔ نہ جائے تو تنخواہ کون دے اور گھر والوں کی خوراک کہاں سے آئے۔ اور بیماری سے افاقہ کے بعد اگر وہ اپنے کام پر گیا بھی تو بہت ممکن ہے کہ وہاں اسے کوئی دوسرا ہی نقشہ نظر آئے۔

ایک صبح اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بستر سے اٹھ نہیں سکتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ بستر چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی بیوی نے جب اس کو آواز دی تو وہ خاموش رہا اور وہ غریب پھر دس سکنڈ پر اسے پکارتی رہی ۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ "اٹھئے۔ اٹھئے" گویا یہ الفاظ اس کے جلو میں رقص کر رہے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔ کبھی داہنی طرف اور کبھی بائیں جانب وہ بم کیطرح پھٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے ۔۔۔۔۔ اوپر نیچے اردگرد ہر طرف یہی الفاظ اوراق کیطرح منتشر نظر آ رہے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔ زمین سے چھت کیطرف لپکتے ہوئے ۔۔۔۔۔ چکر کھاتے ہوئے ۔۔۔۔ رقص کرتے ہوئے ۔۔۔۔۔ اور ایک حد سے نکل

...ائی دے رہے تھے۔ آخر یہ ہنگامہ فرو ہوا اور صرف
...ب آخری آواز آئی کہ "آپ نے دیر کر دی" ہوش
...ان الفاظ کو ٹھیک اپنی پلکوں کے نیچے سہر آلود فضا
...منتشر محسوس کیا اور سہر کو بغور دیکھنے لگا حتی کہ اسے
...ند آ گئی۔

مسلسل تین ماہ تک کرانی غریب بستر علالت
...نیم بے ہوشی کی حالت میں دراز رہا۔ اس اثناء میں
...سے لہیب صورتیں متحرک نظر آئیں مہتم بالشان الفاظ
...م ریز نظر آئے۔ شفایاب ہونے پر جب اس نے
...دبارہ گھر کی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو ہر ایک
...بز میں انقلاب کی کارفرمائی کے علامات دکھائی دے
...ند قیمتی میز کرسیاں غائب۔ ہر جگہ کسی نہ کسی
...ز کی کمی نمایاں .... کرسیاں ..... آئینے
...... میز .... غرض جدھر نگاہ پڑتی اک نہ
...ک شئے کم۔ مکان کے نچلے حصے کی حالت تو اس سے
...ی بدتر تھی۔ ڈاکٹروں کی فیس — دوا کی قیمت۔
...مکان کے کرائے۔ اور ... خورد و نوش کے سامان
...فراہمی میں ان چیزوں کو گھر والی نے بیچ ڈالا تھا۔ وہ
...خود بھی انقلاب کی ایک زندہ تصویر تھی ..... چہرے
...دلکشی و جاذبیت کافور ہو چکی تھی ...... بدن سوکھ کر
...کانٹا ہو گیا تھا۔ جسم پر استخواں ہی دکھائی دیتا،
...گوشت کا کہیں نام نہ تھا ہاں پوست البتہ نمایاں تھا .....
لیکن اس امید نے کہ اس کا شوہر اب بہت جلد اپنے
...کام پر جانے لگے گا اسے بالکل مطمئن کر دیا تھا اور وہ ہشاش
بشاش نظر آ رہی تھی۔

آفس جاتے وقت کلرک کے دماغ میں ایک
ہیجان بپا تھا۔ اسے کوئی خبر نہ تھی کہ اسکی غیر حاضری کیمتعلق
آقا کی طرف سے کیا کیا سوالات ہونگے۔ "شائد اس کی
نظر میں میرا جرم یہی ہو کہ میں کیوں بیمار پڑا" ...... غریب
سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آقا ایام غیر حاضری کی
تنخواہ بھی اسے بخشدے، دروازے پر پہنچکر وہ گھبرا گیا
اور مالک کی چشم غیظ و غضب کے تصور نے اسے پریشان
کر دیا .... خاموش، بے رحم، تابناک آنکھیں۔
تاہم دروازہ کھولکر وہ اندر داخل ہوا۔ وہاں اس کا
مالک ایک دوسرے شخص سے ہمکلام تھا ....
کرانی نے اپنی قدرتی اور سنجیدہ آواز میں "آداب عرض
بابو" کہنا چاہا مگر سمجھ گیا کہ ہو نہو یہ غیر معروف شخص اسکی
جگہ پر بحال ہوا ہے۔ یہ احساس اس کی زبان اور جذبۂ
تکلم کے مابین حائل ہو گیا۔ وہ فوراً ہی محسوس کرنے
لگا کہ اس کی زبان میں لکنت ہے .... بدن
میں کپکپی اور تھرتھراہٹ ہے ...... پاؤں لڑکھڑا
رہے ہیں .... جسم جھکا جا رہا ہے ..... اسکا
آقا تیزی سے کچھ بڑبڑا رہا تھا اور وہ اجنبی شخص اس
کرانی پر مترحم، گھبرائی اور اچٹتی ہوئی نظر ڈال رہا تھا
اس کی آنکھیں ملتجیانہ تھیں کیونکہ وہ دوسرے کی جگہ پر
قابض تھا .... کرانی کہا لآخر "آداب عرض"
کہا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا آیا۔
جب وہ باہر آیا تو سوچنے لگا کہ اب کہاں جانا
چاہیئے یک لمحہ بعد شہر کے وسط میں ایک چھوٹے سے
پارک کی طرف چل کھڑا ہوا۔ پارک قریب ہی تھا .....

. . . . وہاں پہنچکر تالاب کے سامنے ایک آہنی
بنچ پر بیٹھ گیا۔ تالاب کے کنارے چھوٹے چھوٹے بچے
کھیل رہے تھے۔ اور بطوں کو روٹی کے ٹکڑے کھلا رہے
تھے۔ کبھی کوئی مزدور یا بیگار تیزی سے گذر جاتا . . . .
. . . کبھی کوئی معمر آدمی میلے چکٹ کپڑے پہنے سر کو جھکائے
بلا قصد پاس سے ہوتا گذرتا . . . . بعض دفعہ
پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اپنے خیال میں غرق کوئی خستہ
حال عورت ڈگمگاتی ہوئی اس کے قریب سے گذر جاتی
جب اس نے ان کثیف و بے کیف انسانوں کو دیکھا
اور غور کیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ لوگ پارک
میں نہ تھے۔ بلکہ دوزخ میں گھسیٹے جا رہے تھے۔ اور
انہیں اپنے ارد گرد سوائے بھوت پریت کے اور کچھ
نظر نہ آتا تھا . . . . وہ پھر تفکر میں
ڈوب گیا . . . . گھر جا کر وہ اپنی رفیقۂ حیات
سے کیا بات بنائے۔ یہ ایک معمہ تھا جو اس کی سمجھ
سے باہر تھا۔ ایک عقدہ تھا . . . . ناخن تدبیر
کے لئے عقدہ لاینحل۔ ملازمت سے علیحدگی کے
واقعات کو اس نے دل ہی دل میں کم از کم سو بار دہرایا
. . . . آقا کی ہیئت کذائی . . . . . اس کے فقرے
. . . . اور پھر خود اس کے جلے کٹے مگر دلچسپ جملے جو مالک
کو کہے گئے تھے . . . . . . وہ دن بھر پارک میں بیٹھا رہا
اور جب شام ہوئی تو اس نے حسب معمول اپنے گھر کی
راہ لی۔ اسکی شریک زندگی نے سوالوں کی موسلا دھار
بارش شروع کر دی جس کا مقصد حصول واقفیت تھا
کہ آخر آفس میں کیونکر باتیں رفت گذشت ہوئیں۔ وہ
یہ جاننے کے لئے بیتاب تھی کہ ناغہ شدہ مہینوں کی تنخواہ
ملنے کی کوئی امید ہے کہ نہیں۔ کرانی نے اس غریب سے
چکنی چپڑی بات بنائی۔ کھانا کھایا اور بستر پر جا لیٹا۔ لیکن یہ
نہ کہا کہ میں برخاست ہو گیا ہوں اور ہفتے کے آخر تک پاس
میں پھوٹی کوڑی بھی نہ رہے گی۔ اس نے سچ بولنے کی
کوشش کی لیکن جب انیس حیات سے آنکھیں جا ملیں
تو اسے محسوس ہوا کہ اسکی قوت گویائی گویا سلب ہو گئی
ہے . . . . بیوی کے چہرہ پر فوری تغیرات کے
نظارہ کی تاب اسے مطلق نہ تھی . . . . مبادا کہیں
حقیقت حال سے وہ آگاہ ہو گئی تو کیا حشر ہو گا؟ . . . .
میز اور کرسی سے خالی کمروں میں دیوانہ وار پریشان
حال ماری ماری پھرتی . . . . ایک خوفناک
تصوّر . . . . !

صبح کے وقت کلرک نے ناشتہ کیا اور پھر
باہر چلا گیا . . . . اس کی شریک غم نے سمجھا کہ کام
پر جا رہے ہیں اس لئے تاکیداً کہا کہ گذشتہ تین
مہینوں کی تنخواہ کے بارے میں مالک سے کچھ دریافت
کیا جائے یا کم از کم ماہ رواں کے پیشگی مشاہرہ کیلئے
کوشش کی جائے ورنہ پھر خورد و نوش کی زحمتوں
سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کرانی نے چپکے سے جواب
دیا کہ میں اپنی کوشش سے باز نہ آؤں گا . . . .
لیکن وہ سیدھے پارک جا پہنچا اور وہاں بیٹھکر کبھی تالاب
کو دیکھتا اور کبھی آنے جانے والوں کو . . . . اور
پھر سر بگریباں ہو کر کسی گہرے سوچ میں پڑ کر دنیا و مافیہا
سے یک لخت بے خبر ہو جاتا۔ دوپہر کے قریب کسی خطرے

کے احساس سے اپنی جگہ سے اٹھا اور شہر میں جا کر افسروں، دکانوں، اسٹاوں غرض ہر ایک جگہ نوکری تلاش کی، .... لیکن کہیں بھی نہ ملی پھر پارک کی طرف لوٹا اور آکر بیٹھ گیا۔ اس کے پیر چلنے میں وزنی معلوم ہو رہے تھے۔

آج کی رات اس نے اپنی رفیقۂ حیات کے سامنے اپنی چیشنگی کی درخواست اور اس کے متعلق اپنے مالک کے فرضی جواب کے سلسلے میں خوب ہی زور بیان دکھایا...... خوب خوب حاشیہ طرازیاں کیں۔ زندگی میں جی بھر کر جھوٹ بول لیا۔ دل کھول کر مبالغہ کے جوہر دکھائے۔ اسوقت اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اس کے بچے اس کے پاس آئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ احساس شرمندگی سے بستر پر دراز ہو گیا۔

اسی طرح ہفتہ گذر گیا۔ اس نے اب ملازمت کی تلاش بھی ترک کر دی۔ پارک میں بیٹھکر سر بہ زانو و گریباں ہو کر صرف خواب دیکھا کرتا ....

کل میرے مشاہرہ ملنے کا دن ہوتا اگر برطرف نہ کیا جاتا ...... کل ....! کیا ہوگا اگر میری بیوی کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نادار ہوں اور میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں؟ وہ میری طرف نگاہ غیظ سے دیکھے گی اور غضبناک لب و لہجہ میں کہے گی:" کیا آپ روز کام پر نہ جاتے تھے؟" میں کس طرح اُسے حقیقت حال سے باخبر کر سکوں گا تاکہ واقفیت کے بعد وہ پھر مجھ سے بازپرس نہ کرے ....

یہ تھے وہ خیالات جو اس کے دل و دماغ میں گشت لگا رہے تھے۔

صبح ہوئی اور کلرک نے چپ چاپ ناشتہ تناول کیا۔ ناشتہ کیا تھا گنتی کی خشک روٹیاں، اللہ اللہ خیر سلا۔ سالن ندارد، شاید اسی لئے بیوی نے معذرت خواہ ہو کر کہا "کل سے انشاء اللہ ہم لوگ کے دن پھر جائیں گے۔" شوہر جب اس کی طرف منہ کر کے غصہ سے بڑبڑایا تو بے چاری سمجھی کہ شاید اس برافروختگی کی محرک وہی سوکھی روٹیاں ہیں۔

وہ پارک گیا اور وہاں گھنٹوں بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی وہاں سے اٹھکر پاس کی گلیوں میں چکر لگاتا لیکن ایک آدھ گھنٹہ بعد پھر واپس لوٹ آتا۔ وہ بالعموم ۶ بجے شام کو گھر واپس آیا کرتا تھا۔ گھڑیال نے ۶ بجائے مگر وہ بیٹھا ہی رہا..... تالاب کے سامنے اپنے سر کو دونوں بازوؤں پر جھکائے ہوئے سات آٹھ بھی بج گئے۔ نو بجے ایک گھنٹہ بجا اور ہر ایک شخص کو پارک چھوڑ دینا پڑا۔ وہ بھی اُٹھا۔ باہر آیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کدھر کا رُخ کرے۔ کوئی ایسی سڑک یا راہ نہ تھی جس سے وہ نا آشنا ہو۔ لیکن آہ اس وقت "ڈیوڑھی کا ڈر" اسکے دل و دماغ پر حاوی و مستولی تھا۔ بیوی کو منہ دکھانا اور اس سے نگاہیں برابر کرنا اس کیلئے کوئی آسان کام نہ تھا۔ بالآخر اس کے دل نے کوئی فیصلہ کیا اور وہ ایک طرف ہو کر کہیں چلا گیا۔ مگر اُس رات اپنے گھر نہ لوٹا اور نہ اس کے بعد وہاں پھر کبھی نظر آیا۔ اس طویل و عریض دنیا میں کہیں اس کا سراغ پھر کبھی نہ ملا۔"

(انگریزی سے)

تلخیصات

موجودہ جنگ کا اہم محاذ ــــ جبرالٹر

اور

اُسکی سرگذشت

از ــــ جناب مظفر گیلانی

تازہ خبر ہے، "جرمنوں نے حکومت اسپین پر دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے کہ وہ محوری دول میں شریک ہوجائے۔ اور جرمن فوج کو اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت دے تاکہ جبرالٹر پر حملہ کیا جائے۔ جرمنوں کو احساس ہوگیا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ بحر متوسط کے اس دروازہ کو بند کر دیا جائے تاکہ برطانیہ کے جنوبی افریقہ وجنوبی امریکہ کے سلسلہ رسل ورسائل پر طیاروں اور آبدوزکشتیوں کے اڈے قائم کئے جائیں۔ برطانوی بیڑے کو مغربی بحر متوسط سے نکال دیا جائے۔ اور لڑائی کے اصلی میدان مصر کو آسانی سے سر کیا جائے۔ دوسری طرف جبرالٹر کے دفاعی انتظامات میں ابھی حال میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ نو فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا ایک بند بنایا گیا ہے۔ جو جبرالٹر کے پورے شمالی علاقہ میں پھیلا ہوا ہے چٹانوں کے نیچے ایسی پناہ گاہیں تیار کی گئی ہیں جو سطح سمندر سے بھی نیچی ہیں توپخانہ اور طیارہ شکن توپوں میں غیر معمولی اضافہ کیا گیا ہے۔ اور کوئی روز ایسا نہیں گذرتا جس روز سامان جنگ اور سامان خوراک کا بڑا ذخیرہ یہاں نہ آتا ہو۔ جبرالٹر بحر متوسط کی کنجی ہے، گمان ہے کہ آیندہ چند دنوں میں یہاں سب سے بڑی لڑائی ہوگی۔ اور عجب کیا کہ اس پر اس جنگ کے فیصلہ کا بہت کچھ دارومدار ہو۔

امید ہے ذیل میں جبرالٹر کے یہ مختصر حالات دلچسپی سے پڑھے جائیں گے ــــــــ (ندیم)

جبرالٹر کی عظیم الشان پہاڑیاں ایک نہایت ہی غیر رومانی انسان کے لئے بھی اپنے اندر ایک خاص کشش

رکھتی ہیں جن کے ہر نظارے میں گذرے ہوئے بہادروں کی ہزاروں داستانیں پنہاں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ صرف یہی نہیں کہ اس کی تاریخ گذشتہ شاہی جنگی کارناموں کے دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ نزدیک ہی خلیج ٹرافلگر بھی ہے جہاں انگریزوں نے اپنی پوری بحری قوت خرچ کر کے فرانسیسیوں کے خلاف عظیم الشان فتح حاصل کی تھی۔

زمانہ قدیم میں جبرالٹر کو موئس کالپ (MONS CALPE) کہتے تھے جو ابھی تک کالپ ہنٹ (CALPE HUNT) کی اصطلاح میں رائج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاص قسم کے شکار کا موجد وہلنگٹن ہے جس نے بہت سے شکاری کتے انگلینڈ سے .... لا کر اس خاص قسم کے شکار کو ایجاد کیا اور چونکہ یہ ایجاد مونس کالپ میں ہوئی تھی اسلئے کالپ ہنٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ان پہاڑیوں پر پہلے پہل مسلمانوں نے ۷۱۱ھ میں طارق ابن سعید کی ماتحتی میں قبضہ کیا اور اسکا نام جبل الطارق رکھا جو اب موجودہ جبرالٹر کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے[1]۔ اس کے بعد اسکا محاصرہ سب سے پہلے اسپین والوں نے ۱۳۰۹ء میں کیا۔ اور مسلمانوں کو شکست دے کر اپنے قبضہ میں کر لیا اس کے بعد سے اس کے گیارہ محاصرے ہوئے یہاں تک کہ ۱۷۰۴ء میں سرجارج روک ( ) نے اس کو انگریزا اور ڈچ سپاہیوں کی متحدہ مدد سے تین روز کے محاصرہ کے بعد اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ۱۷۱۳ء میں جبرالٹر کلیتہً انگریزوں کے قبضہ میں آگیا لیکن اس کے ساٹھ برس کے بعد اس کا آخری اور سب سے بڑا محاصرہ ہوا جسے فرانس اور اسپین کی ایک زبردست متحدہ فوج نے کیا۔ لیکن برطانوی سپاہیوں نے جو اس کی حفاظت کر رہے تھے اور جن کی تعداد حملہ آوروں کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھی۔ بڑی جانفشانی اور بہادری سے مقابلہ کیا اور آخر کار دشمنوں کو شکست دی۔ اس وقت سے جبرالٹر انگریزوں کے لازوال قبضہ میں ہے۔

جبرالٹر کا موجودہ سامان مدافعت بڑی بڑی جنگی بندوقوں اور توپوں سے کیا گیا ہے۔ ان جنگی اسلحوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لیجانا آسان کام نہ تھا۔ سڑکیں جو پہاڑ کی چوٹی تک بڑی مشکل سے بنائی گئی ہیں۔ نہایت تنگ ڈھالواں ہیں۔ ہر ہر قدم پر موڑیں ہیں۔ جنہوں نے راستہ کو اور بھی مخدوش بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس ڈرائیور کو جس نے ان جنگی اسلحوں کو لاری کے ذریعہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچایا۔ O.B.E کے خطاب سے سرفراز کیا۔

جبرالٹر کی دوسری قابل دید چیز وہاں کے "آب رسانی کا محکمہ" ہے۔ پہاڑ کی مشرقی جانب ۸ ۱/۲ ۳۲ ایکڑ میں

---

[1] "ندیم" طارق بن ... نے جبل الطارق کو جنگی قلعہ کی اہمیت اسلامی عہد میں حاصل ہوئی۔ اس دور میں یہاں عظیم الشان مستحکم قلعے تعمیر کئے گئے عبدالمومن نے اپنے دور حکومت میں اسکا نام جبل الفتح رکھا۔ یہاں کل درقلعے تعمیر کرائے اور خود کئی ماہ قیام کیا۔ اور ایک شہر آباد کر دیا جو آج تک موجود ہے۔

کو بوہے اور سیمنٹ کے ذریعہ ایک بہت بڑے پانی کے خزانہ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جہاں ایک انچ بارش ہونے سے (.....) ساٹھ لاکھ گیلن پانی جمع ہو جاتا ہے۔ یہ زمین ایک نہایت ہی ڈھالوان پہاڑ پر واقع ہے اسلئے پانی کے جمع ہونے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔

جبرالٹر کا شہر پہاڑ کی مغربی جانب ہے۔ مکانات عموماً چھت دار اور سمندر کے کنارے بنائے جاتے ہیں۔ اکثر مکانات چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے اوپر بھی واقع ہیں۔ شہر کے بڑے بازار میں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے۔ خاصکر "بازار" کے روز تو اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دیہات کے لوگ سپین سے ترکاریاں، پھل اور پھول وغیرہ فروخت کرنے کثرت سے آتے ہیں۔ اس بازار میں ایک خیالی دنیا میں بسنے والا انسان اپنے کو آسانی سے بمبئی میں تصور کر سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر دکانوں کے نام ہندوستانی ہیں۔ چونکہ تجارت پیشہ ہندوستانی وہاں کثرت سے موجود ہیں۔ جو کار چوبی گلکاری اور چکن وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ مشرق کی جانب یہ "بڑا بازار" "یورپ روڈ" سے جا کر مل جاتا ہے۔ جو کہ "یورپ پوائنٹ" کو چلا گیا ہے۔ جہاں سے بحر روم کا ایک خوشگوار منظر نظر آتا ہے۔ جبرالٹر کی ایک اور قابل دید چیز وہاں کے ( ) خوبصورت باغات ہیں جنہیں مشرق و مغرب سردی اور گرمی کے پھول یکساں طریقہ سے اگتے ہیں۔ انہیں باغات میں جنرل ایلیٹ ( ) کے نام کی ایک یادگار بھی ہے جس نے اس عظیم الشان محاصرہ میں جبرالٹر کو بڑی جانفشانی سے دشمنوں کی دسترس سے بچایا تھا۔ نزدیک ہی ٹرافلگر کا قبرستان ہے جس میں اس مشہور محاصرے کے اکثر بہادر سپاہیوں کی قبریں ہیں ——— جبرالٹر کا عجائب خانہ جس کا افتتاح سنہ ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا ایک بہت ہی قدیم عربی مکان میں قائم ہے۔ یہ عجائب خانہ پرانے زمانہ کے سب سے دلچسپ آثار سے بھرا ہوا ہے اسی عجائب خانہ کے نیچے ایک مشہور عربی حمام ہے جو عربوں کے حماموں کا ایک بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

جبرالٹر سے سپین۔ پرتگال تا بحر مراکش وغیرہ کی سیاحت نہایت ہی آسانی سے موٹر یا ریل کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہر قسم کی دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔ بائیسکوپ شکار گھوڑ دوڑ پولو گالف ٹینس اور کرکٹ وغیرہ کھیلنے کے سامان یورپ کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہوٹل بھی کافی تعداد میں موجود ہیں عموماً اچھے ہوٹل "بحری بندرگاہ" ( ) کے قریب ہیں جو پیرس اور لندن کے ہوٹلوں سے کسی طرح آرائش میں کم نہیں ——— جبرالٹر موسم گرما میں بسر کرنے والوں کے لئے ہر قسم کی دلچسپی کے سامان موجود ہیں، خوشنما مناظر خوشگوار آب و ہوا اعلیٰ سوسائٹی اور دلچسپیوں کا ایک ہجوم۔ غرض تعطیل کا زمانہ دلچسپی سے انسان وہاں بڑے مزے میں گذار سکتا ہے۔ لیکن مئی، جون سنہ ۱۹۴۱ء میں جبرالٹر کا نظارہ کیسا ہوگا۔ یہ آئندہ واقعات ہی بتا سکتے ہیں ———

---

۵ "ندیم" عبدالمومن نے اسی شہر کو آباد کیا تھا۔

ادبیات

"بادۂ عرفاں"

[illegible] ——— حضرت عرفاں اسلام پوری

زخمی ہوا دل یار ! تری تیغ ادا سے — پوری ہوئی صد شکر دعا تھی جو خدا سے

تڑپا دے مجھے پھر نگہِ ہوش ربا سے — پھر دیکھ لے کافر ! اُسی مستانہ ادا سے

کیا روکے کوئی اُس بتِ کافر کو جفا سے — پروا اُسے کس کی ہو جو نہ ڈرتا ہو خدا سے

عاشق کی تو ہے زیست شہادت کی توقع — کچھ اور غرض اس کو فنا سے نہ بقا سے

اے کاش ترے کوچہ کی ہم خاک ہی ہوتے — یوں ملتے تو اڑ کر ترے دامانِ قبا سے

عشاق کے مرنے میں ادا کو ہے تری دخل — ظاہر میں تو سب مرتے ہیں یوں اپنی قضا سے

کیوں کرتے ہیں سب دردِ جگر کی مری تدبیر — بڑھ جائے نہ یہ درد کہیں اور دوا سے

ہے خوب یہ ضدین کا پر لطف تقابل — شوق انکو جفا کا ہے یہاں کام وفا سے

دل کیا کہ جگر تک کی خبر لیتے ہیں ظالم — ہیں دیکھنے میں ناوکِ مژگاں تو ذرا سے

دل اس نگہِ شوخ کا ہوتا ہے مقابل — کمبخت کی ہی موت ہو جو لڑتا ہے قضا سے

عرفاں نظر آنے لگا اس میں تو رخِ دوست
یہ بات تو ہاتھ آئی عجب دل کی صفا سے

نوٹ :- یہ غزل سالانہ مشاعرۂ دار التفریح اسلام پور منعقدہ ۱۵ محرم ۱۳۶۰ھ میں پڑھی گئی -

خودداری شاعر

از

بلبل بہار حضرت سریر کابری گیاوی مینائی

مجھسے اک دوست نے ازراہ عنایت یہ کہا ۔۔۔ کہ تمہیں تجھکو نہ کچھ اپنی ریاضت کا ملا
یہ گراں مائگی خویشش و بہ ناداریٔ ما ۔۔۔ تو ہے وہ جنس نہیں کوئی ہے گاہک جسکا
تیری نظموں میں ہے شائستگیٔ روئے سخن ۔۔۔ تیری جامے سے ہے آرائش گیسوئے سخن
تیری ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی ۔۔۔ سوجھتی رہتی ہی کیا کیا تجھے دن رات نئی
رخ تری نظم سے دنیا کا بدل جائے گا ۔۔۔ انقلاب آج نہ آیا ہے تو کل آئے گا
کسی دربار میں تو پیش کر اپنے یہ گہر ۔۔۔ کہ جواہر کو پرکھ لیتے ہیں ارباب نظر
تو جو نکلے تیرے ہر شعر کا جوہر کھل جائے ۔۔۔ موتیوں میں تری ہر نظم دل آرا تل جائے
میں نے کی عرض کہ بجا بند کہ بجا دیں یہ شوق ۔۔۔ آپکی نظروں سے گذرا ہیں کیا مطلع ذوق

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
انکا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

اتفاق

حضرت تمنا عمادی مجیبی پھلواروی

ہاں وہ دن جب تھے ہم مست نوائے اتفاق
اتفاقاً اب تو سنتے ہیں صدائے اتفاق

خون دل پیتے ہیں اہل دل برائے اتفاق
یونہیں ہو جاتا نہیں بیٹھے بٹھائے اتفاق

بے نمازوں کی جماعت، قافلہ اسلام کا
ہر اذان مسجد کی ہے بانگ درائے اتفاق

ہے غضب تو یہ وہی رہتے ہیں باہم مختلف
رہتی ہے جن کی زبانوں پر ثنائے اتفاق

متفق وہ خود نہیں ہوتے کسی کی رائے پر
دوسروں کو زور دیتے ہیں برائے اتفاق

ہے انہیں کے دم سے پھیلا ہر طرف دنیا میں پھوٹ
جو لئے پھرتے ہیں ہاتھوں میں لوائے اتفاق

گرچہ ترک مدعا دنیا میں اچھی چیز ہے
ترک کرنا تھا نہ ہم کو مدعائے اتفاق

کیجئے ہاں کیجئے خود خانہ جنگی رات دن
دیجئے ہاں دیجئے دنیا کو رائے اتفاق

ہو گئے ہم منتشر چھوٹا جو دامن دین کا
دین ہی تھا جس پہ قائم تھی بنائے اتفاق

دین ہی کا بادباں ہوتا ہے قومی ناؤ پر
کھینچ کر لے چلتی ہے جس کو ہوائے اتفاق

پھوٹ نے عریاں کیا ناموس دیں کو کس طرح
اس کو اوڑھے ہم نے دیکھا تھا ردائے اتفاق

لغزشیں خودغرضیوں کی ہوں نہ جبتک ہم سے دور
جم نہیں سکتے کسی منزل میں پائے اتفاق

بس یہی اک بات ہے بندھتی ہے جس سے کچھ امید
کچھ نہ کچھ ہے ہر جگہ کوشش برائے اتفاق

گرچہ طوفاں خیزیٔ بحر حوادث قہر ہے
غرق ہو سکتا نہیں اک آشنائے اتفاق

آگیا جو عیب ساتھ اپنے اسے بیجا ہے پھوٹ
کھو گیا جو حسن اسکو ڈھونڈھ لائے اتفاق

تفرقہ نزدیک لاکھ آئے رہیں ہم اس سے دور
سر اٹھائے جب کوئی فتنہ دبائے اتفاق

سحر اعدا کا اسی سے کاٹ ہو سکتا ہے کچھ
ہے عصائے موسوی گویا عصائے اتفاق

پوچھیں ہم کس سے تمنا کون بتلائے ہمیں
تفرقہ کیوں آگیا ہم میں بجائے اتفاق

حریم ناز

از ——— جناب لیاقت مہرولی دہلی

تارے کچھ مخمور سے تھے چاند متایا ہوا
اک سرور و کیف سا ہر سمت تھا چھایا ہوا

ڈھانپ رکھا تھا فضاء کو چادر مہتاب نے
گویا افسوں پھونک رکھا تھا نیا اک خواب نے

ہر طرف سناٹا دنیا، بے خبر سوتی ہوئی
روح میری کچھ سرور و کیف میں کھوتی ہوئی

آرہی تھی دور سے کچھ چکوروں کی صدا
جو ادا پہ چاند کی قربان ہوتی تھی صدا

لے گیا مجھ کو تخیل خوابگاہ ناز میں
تھی جہاں ایک ماہوش مدہوش خواب ناز میں

سیمتن نازک بدن اسیر جوانی کا ابھار
چاند سا چہرہ گلابی ہونٹ تھے رشک بہار

روئے روشن اسطرح تھا کالی زلفوں میں عیاں
جیسے ہو جاتا ہے اکثر چاند بادل میں نہاں

نیم بازی چشم میگوں کی ابھی تک یاد ہے
جسکا بسمل آج تک اپنا دل ناشاد ہے

واہ واہ کیا بانکپن کیا خوب خواب ناز ہے
شوخیاں گو سو چکیں پر چشم فتنہ باز ہے

ساعد سیمیں میں اس کی کالی کالی چوڑیاں
وہ حنائی ہاتھ اور وہ پتلی پتلی انگلیاں

سر سے لیکر پاؤں تک گویا مجسم نور تھی
روئے تاباں کی چمک تھی یا کہ برق طور تھی

صبح کی کچی سفیدی نور برسانے لگی
دور سے کچھ کچھ پرندوں کی صدا آنے لگی

اتنے میں اس حور وش نے لو جدار انگڑائی لی
آخر آنکھیں ملتے ملتے آنکھ اس نے کھول دی

———

اعتبارِ ہستی

از جناب رخشاں ابدالی، اسلام پوری

دو چار نفس پہ ہے مدارِ ہستی کمزور ہیں کسقدر، یہ تارِ ہستی
وابستہ خزاں سے ہے بہارِ ہستی پھر دل کو ہو خاک اعتبارِ ہستی!

ہے نقش بر آب جو شمارِ ہستی اک نام خزاں ہے بہارِ ہستی
فطرت کی ستم ظریفی اللہ غنی! جی جان سے انساں ہے نثارِ ہستی

آنکھوں میں بہت کچھ ہے وقارِ ہستی انساں کو بہت سے ہے اعتبارِ ہستی
سچ یہ ہے کہ اسوقت کھلیں گی آنکھیں جب ہوگا خزاں یہ لالہ زارِ ہستی

ہستی اپنی ہے خارزارِ ہستی یہ اپنا وجود ہے غبارِ ہستی
اس ہستیٔ باطل سے گذرنا ہوگا جب ہوگی تجلی نگارِ ہستی

کیفِ ثمر

از جناب ثمر رحمانی دربھنگوی

ہوشیار دلِ ناداں دلچسپ یہ آفت ہے — مجبورِ ستمکش پر پھر چشمِ عنایت ہے
بدلا ہوا عالم ہے ۔ بدلی ہوئی صورت ہے — وہ چشمِ تمنائی آئینۂ حیرت ہے
ہے سجدۂ شکرانہ ۔ کیا حسنِ عقیدت ہے — ممنونِ جفا کتنا ناکامِ محبت ہے
محشر میں بھی دنیا کا ہنگامہ نظر آیا ! — یہ جلوہ گری کیسی اے حسنِ عقیدت ہے

برباد تمنا پر تہمت ہے کہ زندہ ہے — جینا بھی محبت میں کیا وجہِ ندامت ہے؟
ہر بار کا یہ وعدہ ہاں وعدہ وفا ہوگا — اقرار کے پردے میں تجدیدِ محبت ہے
ہو مشقِ جفا اتنی، ہستی نہ رہے ہستی — بربادیٔ ہستی گر تکمیلِ محبت ہے
پابندِ جفا وہ ہے، برباد وفا میں ہوں — انجام ستمکش بھی پیچیدہ عبارت ہے
باایں ہمہ آزادی حاصل نہیں آزادی — یہ وادیٔ ہستی بھی اک قیدِ مصیبت ہے
وابستۂ ہستی ہے خودداریٔ فطرت بھی — پامالِ غمِ پستی کیا اوجِ شرافت ہے
الجھن میں ہی اک الجھن ہوتی ہے چمک پیہم — اس درد کو کیا کہئے اک یاد کی صورت ہے
امواج کا اٹھنا ہی دریا کی روانی ہے — گھبرا نہ دلِ ناداں گردرد کی شدت ہے

کمبخت ثمر تو نے انجامِ گلہ دیکھا
محرومِ جفا ہو کر اب کیسی ندامت ہے

غریب طالبعلم سے خطاب

از

جناب اختر کاکوی

اے غریب خستہ دل، اے طالب علم و ہنر
اے رہینِ غم، اسیرِ گردشِ شام و سحر
قوم کے دل میں ذرا بھی تیری ہمدردی نہیں
صاحبانِ زر میں بھی باقی جوانمردی نہیں
شوق تو دل میں ہے پڑھنے کا مگر ساماں نہیں
جسم پر میلا سا کرتا ہے مگر داماں نہیں
کس کے دل میں پاسِ حرماں کا تری احساس ہے
پاس سب کو زر کا ہے، غربت کا کس کو پاس ہے
کو بکو، صحرا بصحرا، ٹھوکریں کھاتا ہوا!
ہر قدم پر کچھ جھجکتا اور شرماتا ہوا!
مضطرب ہوتا ہے دل تجھکو پریشاں دیکھکر
آنکھیں روتی ہیں تجھے بے ساز و ساماں دیکھکر
مرتے مرتے قسمتوں سے مل گئی جاگیر اگر
یاس و حسرت سے نہیں تو پھر بھی بے خوف و خطر
مضطرب ہو کر چلا اسکول بے کھائے پیئے
زندگی میں مل رہے ہیں موت کے سارے مزے
وقت پر سونا نہیں، کھانا نہیں، پینا نہیں
موت بھی کہتی ہے ہنس کر یہ کوئی جینا نہیں
یوں تو کچھ کھانے کو دیدینا بہت آسان ہے
کام لیکن ہر گھڑی لینا خدا کی شان ہے
خانگی کاموں سے آقا کے تجھے فرصت نہیں
کیا پڑھے، پڑھنے کا موقع بھی کوئی ساعت نہیں
جستجو میں علم کے نکلا وطن کو چھوڑ کر!
باپ، ماں، بھائی، بہن، ہر ایک سے منہ موڑ کر
پھر بھی اس غربت سرا میں سکھ نہیں راحت نہیں
اہلِ عالم کی نظر میں کچھ تری عزت نہیں
اپنا ساماں آپ کرنا ہے جہاں میں الغضب
ہائے یہ ننھی سی عمر اور اس قدر رنج و تعب
دل ہی دل میں گھٹ رہے ہیں دیکھ کر اہلِ نظر
شام ہو رنج و الم کی، بے کسی کی یہ سحر
تو ہی کہہ دے تیری خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں یہ
ہاں ترے غم میں مگر بے موت مر سکتے ہیں یہ
رہبرانِ ملک کو بھی کچھ نہیں تیرا خیال
بے سبب ہرگز نہیں اس قوم و ملت کو زوال
متفق سب ہوں تو نکلے کچھ نہ کچھ تدبیر پھر
رہبری پردوں ہی پردوں میں کرے تقدیر پھر

اہل زر چاہیں تو سب کچھ آج کر سکتے ہیں وہ
موتیوں سے تیرا منہ چاہیں تو بھر سکتے ہیں وہ

ہاں مگر ان کا کرم گویا خیالِ خام ہے
کوئی مر جائے تو مر جائے ہمیں آرام ہے

غم نہ کھا بہر خدا اے نامرادِ زندگی!
گو نہ ہو کچھ آج کل ہوگی مگر پائندگی

ہاں پڑھے جا پڑھ کے اک دن کامراں ہو جائیگا
تیرے آگے سرنگوں سارا جہاں ہو جائے گا

ظاہری اسباب دنیا سے نہ ہو ہرگز ملول!
عقل بول اُٹھیگی آخر ہیں یہ سب ساماں فضول

دیسی کپڑا ستر پوشی کے لئے درکار ہے
ہر جگہ اشجار کا سایہ ترا گھر بار ہے

شب کو سونے کے لئے فرشِ زمیں کچھ کم نہیں
اوڑھنے کو دامنِ صحرا تو ہے اے ہم نشیں

پانی پینے کے لئے آبِ رواں موجود ہے
ہے یہ اُس رب کی عنایت سب کا جو معبود ہے

ذائقے دیتے نہیں ہیں گر ورق اشجار کے
ڈھیر جنگل میں ملیں گے مختلف اثمار کے

جام سے بڑھکر تو ہے چلّو کا کوزہ تیرے پاس
شام سے کیوں رہا ہے اے مری جاں پھر اُداس

علم کی سوگند تو منت کشِ انساں نہ ہو
تیری ہمت ناامیدِ رحمتِ یزداں نہ ہو

اہل دولت سے جہاں میں اک قلم ہو بے نیاز
رازِ دل صرف اس سے کہہ عالم کا ہے جو کارساز

ہستیٔ آزاد کو ہرگز نہ کر خوار و ذلیل!
ہے قسم انسانیت کی آپ ہو اپنا کفیل

آج جو ہنستے ہیں تجھ پر کل ہنسے جائیں گے وہ
تیری عزت دیکھ کر خود دل میں شرمائیں گے وہ

(بقیہ صفحہ ۲۵۳ کا)

جیمس لشرل اسی موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہے۔

"ہماری شان و شوکت پرچھائیں کی مانند ہے۔ یہ کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے...... ہم وقت کے ہاتھوں مجبور محض ہیں......"

اسی سلسلہ میں جارج پیل کے بھی خیالات ملاحظہ ہوں۔

"حسن، قوت اور شباب بے شک خوشنما پھول ہیں۔ ....لیکن پھول مرجھا کر فنا ہو جاتے ہیں۔ فرض، ایمان اور محبت بلاشبہ جڑ ہیں....... لیکن جڑیں ہمیشہ ہری بھری رہتی ہیں۔"

کامس وائٹ محبت پر یوں طنز کرتا ہے:-

"الوداع! اے محبت اور تیری تمام سراب آگیں قوتیں! اب تیری سخت گرفت مجھے زیادہ دیر تک باہوش نہ رکھ سکیگی.........."

غیر زبان کا ادب و شعر

بعض انگریز شعرا کی نازک خیالیاں

از

جناب افسر ماہ پوری

شعر کیا ہے ؟

الفاظ کی ایک دلاویز اور حسین بندش جو دلی تاثرات اور قلبی کیفیات کی حقیقی ترجمان ہونے کے علاوہ موسیقی و ترنم کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ موسیقی میں سحر کاری کی قوتیں مستور رہتی ہیں اور موسیقی الفاظ کی دلکش اور خوبصورت ترتیب کی رہین منت ہے .... اور وہ لوگ جو اپنے جذبات و احساسات کو لفظوں کے دھاگے میں پرونے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں، عرف عام میں شاعر کہلاتے ہیں اور شاعروں کی اس صلاحیت کو فن شاعری .... کہا جاتا ہے۔

آج کی صحبت میں میں صرف چند انگریز شعراء کی نازک خیالیاں ہدیہ ناظرین کروں گا۔ کسی دوسری صحبت میں انشاءاللہ بعض دوسرے ملکوں کے شعراء کے جواہر ریزے بھی قارئین "ندیم" کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

شاعر کا دل بہت نازک اور حساس ہوتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اور انہیں اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ سننے والا وارفتہ اور بیخود ہو جاتا ہے۔ شاعر کا یہ کمال قدرت کا ایک عطیہ ہے۔ وہ چیزیں جو بظاہر ہمارے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں، شاعر کی روح کو بے قرار و مضطرب کر دیتی ہیں۔ اس کا دماغ بیدار اور اس کے دل میں جذبات کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔

ہم روزانہ چڑیوں کی میٹھی میٹھی بولیاں سنتے ہیں مگر ہمارے دل میں کوئی خاص جذبہ بیدار نہیں ہوتا لیکن یہی بولیاں شاعر کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی ہیں...... اس کی روح تڑپ اٹھتی ہے۔ اور وہ تخیلات کی ہری بھری وادی سے گلہائے بوقلموں کا ایک حسین و جمیل گلدستہ ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے جس کی خوشبو سے ہمارے دل و دماغ پر ایک سرمدی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

بعض طیور خوش نوا کی زمزمہ سنجیاں شاعر کے دل پر خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان طیور میں عندلیب کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔

دیکھئے ورڈسورتھ بلبل کے متعلق کیا کہتا ہے

"اے بلبل! تو درحقیقت کسی آتشیں دل کی
تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ تو شراب محبت سے
بدمست ہو کر نغمہ ریزی کرتی ہے، تیرے نغمہ
میں طنز، واستہزا، سکوت نیت اور سکون
محبت کی جھلکیاں عیاں ہیں...... تو ان
محبوبوں کے گیت گاتی ہے جو اس وادی
میں محو استراحت ہیں"

فاختہ کا جذبۂ ایثار و محبت ضرب المثل ہے۔ شاعر
کہتا ہے۔

"وہ محبت کا نغمہ الاپتا ہے۔ اس کی آواز
مدھم ہموار اور مٹھاس سے لبریز ہے، وہ
سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے سُر میں
گاتا ہے...... اس کے گانے
کی کوئی حد نہیں۔ اس کے نغمے سے ایمان
کی تجلی اور روحانی مسرت نمودار ہوتی
ہے...... یہ نغمہ ہے مگر صرف
میرے لئے"

کیٹس ورڈسورتھ کی تقلید کرتا ہے۔

"تو مرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہے
پیاری چڑیا! آنیوالی حور کی نسلیں تجھے
فانی نہیں بنا سکتیں"

شیلی کی نظم............ کو انگریزی
ادبیات میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

"فاختہ کی شیریں تان شاعر کے
تخیل کو ترنم کی بلندی پر پہنچنے میں
اعانت کرتی ہے"

فاختہ اور بلبل کے علاوہ بعض دوسری چڑیوں کی
سحر انگیں چہکاریں بھی شاعر کے دل کی دھڑکیں سنائی دیتی ہیں
کولن برانٹ نے مرغابیوں کے بارے میں یہ دلفریب خیالات
ظاہر کئے ہیں۔ کتنی لطافت و شیرینی ہے ان لفظوں میں۔
ملاحظہ ہو۔

"آسمان کی بے پناہ وسعتوں میں اسے
اس کی قوت پرواز لئے پھرتی ہے۔ ایک
دن میں بھی اسی طرح مارا مارا پھروں گا.......
جدھر میرے قدم رہنمائی کرینگے"

شعراء کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند اور چاندنی
ان کے جذبات کو بری طرح برانگیختہ کرتے ہیں۔ ان کے
دل چاند سے حد درجہ متاثر ہوتے ہیں۔ اڈورڈ ٹامس
چاند کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"چاند آسمان.......... میں یوں
جلوہ افروز ہے جیسے ہاتھی کے دانت کا
بنا ہوا چمکدار کنگن"

شیلی کے تخیلات ملاحظہ ہوں۔

"جب آسمان سنسان اور اداس معلوم ہوتا
ہے، ابر کے ایک ٹکڑے کی اوٹ سے چاند
نمودار ہو کر اپنی نورانی شعاعوں کی بارش
کرنے لگتا ہے اور آسمان کی اندھیری پہنائیاں
نور کے سیلاب میں غرق ہو جاتی ہیں"

اٹیس یوں سحر طرازی کرتا ہے۔

"چاند کی سیمگوں شب ....
سورج کا عکس لطیف ....
ایسے میں موسیقی نہ جانے کیسے کیسے گل کھلائیگی"

یوں تو محبت و رومان شعر و سخن کی روح ہے۔ انگریزی شعراء نے جس خوبصورتی سے اس موضوع قلمبند کیا ہے، وہ حد درجہ قابل ستائش ہے۔

بن جانسن اپنی محبوبہ کو یوں مخاطب کرتا ہے:۔

"تو اپنی خمار انگیز آنکھیں میری ترستی اور
پیاسی آنکھوں میں ڈالدے اور مجھے شعر و
شباب کی دنیا میں گم کر دے۔ جام کی تہہ
میں اپنے گرم بوسے کی حلاوت و لذت کو
نچوڑ دے .... میں پھر کبھی
شراب کی طرف رخ نہ کروں گا"

بلیک کہتا ہے:۔

"او محبت! ہمیں سچائی کی دولت سے
مالامال کردے، کیونکہ یہ دنیا جو ہماری نظروں
کے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ خواب و خیال کی ہے"

ایک عزیز پر عالم نزع طاری ہے، شاعر بستر مرگ کے قریب کھڑا موت و حیات کی کشمکش دیکھ رہا ہے۔ چند ساعت بعد فرشتۂ اجل کے پر چراغ زندگی کو گل کر دیتے ہیں۔ اسٹیفن ہاؤز چلا اٹھتا ہے ....

....

"تمام مسرتیں اور اقبال مندیاں فانی ہیں
.... آخر کار موت ہی کی حکومت ہوگی"

ٹینی سن کے نزدیک موت ایک سربستہ راز ہے:۔

"کیا خدا اور قدرت کے مابین جنگ چھڑ گئی ہے؟
قدرت نے ایسے بھیانک خواب کیوں پھیلائے
ہیں؟"

شاعر آگے یوں تسلی دیتا ہے۔

"دماغ و دل کو اس غم سے پاک کرلو۔ کیونکہ
جنہیں ہم یہاں آج دیکھتے ہیں، وہ کل نگاہوں
سے روپوش ہو جائیں گے"

بن جانسن گریہ و زاری کرتا ہے۔

"ان پتھروں کی سنگین آغوش میں حسن کا
ایک اتنا گرانقدر خزانہ مدفون ہے جسکا ہم تصور
بھی نہیں کر سکتے ...."

آر۔ ہرک ایک بچی کی موت پر یوں ماتم کناں ہے۔

"کیا وہ سوئی ہے .... ایک ناشگفتہ
کلی پھول کی۔ وہ حال ہی میں گوشت و
خون سے بنائی گئی تھی .... وہ ایک
گہری نیند سو گئی لیکن اسکی معصوم
آنکھیں ابتک پپوٹوں کے دریچے سے
جھانک رہی ہیں"

دنیا کی بے ثباتی شعرا کا خاص موضوع سخن رہا ہے۔ رابرٹ ہرک وقت کی ستم کوشیوں کو ان غم انگیز الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"گلاب کی کلیاں چن لو۔ کیونکہ وقت غنیمت ہے
وہ پھول جو آج دلفریب نظر آرہے ہیں۔ کل
باد خزاں کی گود میں دم توڑتے دکھائی دینگے
.........."

(باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

تقریظ و انتقاد

اردو کے نئے رسالے

معاصر پٹنہ اڈیٹر جناب ڈاکٹر سید عظیم الدین صاحب عظیم ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، حجم ۲۷ صفحے تقطیع ۳۰×۲۰/۸ مطابق ندیم، زرچندہ سالانہ للعہ پتہ:۔ دائرہ ادب، باقی پور پٹنہ۔

پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور عظیم آباد کے اہل علم ارباب ذوق کی ذہنی کاوشوں کے نتائج "معاصر" میں ماہانہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے حقیقی روح رواں پروفیسر سید کلیم الدین صاحب ہیں۔ اس کے چند پرچے نظر سے گذرے، مضامین کے اعتبار سے اردو کے بہت سارے پرچوں سے اس کا معیار بلند تر ہے۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں تو شاید بیجا نہ ہو کہ اس کا معیار، ہماری ان توقعات کے مطابق نہیں، جو یونیورسٹی کے اساتذہ کے شایان شان ہم اپنے دلوں میں قائم کئے ہیں۔

اسوقت تک اس رسالہ میں عموماً چار قسم کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ۱۔ تنقید ادب ۲۔ مباحث علمیہ کی تحقیق و تصحیح ۳۔ اوسط درجہ کے معلومات کے حامل علمی مضامین۔ ۴۔ منظومات اور افسانے،

۱۔ معاصر میں تنقید ادب پر مضامین کے جو سلسلے چھپتے رہے ہیں ان پر ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں۔ ملک کے بعض دوسرے رسالوں میں ان پر نقد کیا جا چکا ہے۔ اور وہ کارکنان معاصر کے علم میں بھی آچکا ہے، ہم مغربی ادب میں کارکنان معاصر کی وسعت نظر کے جذبہ احترام کے ساتھ قائل ہیں۔ لیکن مشرقی ادب پر ان کے قلم اٹھانے سے پہلے، اس کے مزید مطالعہ، غور، فکر اور نتائج کے حصول میں عجلت پسندی سے پرہیز کرنیکی مخلصانہ رائے انکی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اگر اردو کے کسی شاعر پر لکھنا ہے تو صرف اسکے دیوان کا مطالعہ کافی نہیں۔ بلکہ اس شاعر کے اگلے اور پچھلے دوروں، ان عہدوں کے تمدن، معاشرت، ثقافت، ماحول، ذہنی جذبات و اثرات پر عبور رکھنے اور نقد کے وقت انہیں ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ ابھی معاصر میں نقد ادب کی خدمت انجام دینے والوں میں اس قوت مدرکہ کے مزید بیدار ہونے کی ضرورت ہے جس سے صحیح ذوق اور ملکہ کی تکوین ہوتی ہے .... ہمارا خیال ہے کہ اردو ادب سے اگر کارکنان معاصر کی یہ دلچسپی قائم رہی تو چند برسوں کے بعد ہی ارباب قلم خود اپنے ان نتائج فکر پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کریں۔ بعض رایوں سے رجوع کریں بعضوں کی ایسی صحیح تشریح و توضیح فرمائیں کہ مسائل صاف ہو جائیں گے اُسوقت وہ انگریزی اور اردو ادب کے فرق کو بھی تسلیم کرینگے اور انہیں اس جواب کی ضرورت پیش نہ آئے گی کہ ادب ادب ہے۔ خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔

۲۔ علمی مباحث کی تحقیق و تصحیح سے متعلق جو مضامین چھپتے ہیں۔ وہ قابل قدر ہیں۔ لیکن مختلف نوعیتوں کی خامیاں ان میں

بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں موضوع سے بے ربط مباحث داخل ہیں اور جن چیزوں کیلئے محض تعلیق میں اشارہ کر دینا کافی تھا ان کی غیر ضروری تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ اور کہیں ضروری مباحث کی تفصیل میں جانے کے بجائے ان سے سرراہ گذر جاتے ہیں۔ پھر مواد و مباحث کو ان کی صحیح ترتیب میں مدون کرنے کی خامیاں بھی رہتی ہیں۔ اگر ان سب کی مثالیں دیجائیں تو یہ نقد نہیں مستقل مضمون بنجائے، دیوان ہمایون پر جو قابل قدر مضمون شائع ہوا ہے۔ اسمیں یہ خامیاں زیادہ محسوس کیجاسکتی ہیں۔ ہمایون بادشاہ کے دیوان کے اس قلمی نسخہ کے موجود ہونے کا پتہ پہلی مرتبہ اہل علم کے حلقہ میں چلا ہے۔ لائق مقالہ نگار اس اکتشاف کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہمایون کی شاعری کے معلومات اکبر نامہ، فرشتہ، ہمایوں نامہ، وغیرہ سے جو ماخوذ ہیں۔ وہ ایک وسیع سلسلہ مضامین (جو شاہان مغلیہ کے علمی ذوق پر معارف میں ۳۶ء میں شائع ہوا ہے) میں سے مضمون "ہمایون کے علمی ذوق" میں..... مندرج ہو چکے ہیں۔ اگر لائق مقالہ نگار کی نظر سے یہ مضامین گذرتے تو بہت سا وقت نئی تحقیقات میں انکا بچ جاتا۔ کہ اسمیں بیشتر معلومات وہی ہیں، جو معارف کے اس مضمون میں آچکے ہیں۔

پروفیسر سید حسن عسکری کے "نسخہ دلکشا" اور "نسخہ مفید الانشا" ستایش کے قابل اور مطالعہ کے لائق مضامین ہیں۔

"بہار میں عربیت کا اثر" دکھانا ایک اچھوتے عنوان پر قابل قدر کوشش ہے۔

۳۔ اوسط درجہ کے علمی مضامین بھی خاصے ہوتے ہیں۔ "اسکندریہ اور اسکے ذہنی کارنامے" پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ پتہ نہیں کہ وہ کسی انگریزی مضمون کا ترجمہ یا تلخیص ہے۔ اور یا وہ مستقل تحقیق و تلاش کا رہین منت ہے۔ یہ کہنا ہے کہ "کتب خانہ اسکندریہ کی کیفیت کمیت" کا حال ابتک اردو میں بیان نہیں کیا گیا۔ حیرت انگیز دعویٰ ہے۔ حالانکہ جو معلومات و مباحث اس مضمون میں درج ہیں وہ معارف اور بعض دوسرے رسالوں میں مدتوں پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ "زبان کی تاریخ" جیسے عنوانوں پر مضامین چھاپنے ہوں تو غیر زبان کی ہر کتاب حوالہ (ریفرنس بک) سے ہر ماہ صفحے کے صفحے تیار ہو سکتے ہیں، اہل علم کا وقت ذاتی تلاش و تحقیق کے نتائج مرتب کرنے میں صرف ہو تو یہ زیادہ سود مند ہوگا۔ ۴۔ افسانوں کے ترجموں میں بھی ایک بات نظر آتی ہے۔ انگریزی زبان کا ہر افسانہ یا کسی یورپی افسانہ نگار کی ہر کتاب اردو کیلئے نئی چیز نہیں۔ ترجمہ کیلئے افسانوں کے انتخاب میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے ادھر چوتھائی صدی میں اردو زبان میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے خواہ وہ علمی مباحث ہوں یا ادبی چٹکلے اور افسانے کارکنان معاصر کو ان پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینی کی خاص ضرورت ہے۔

معاصر کیلئے یہ ہم جو کچھ عرض کر رہے ہیں، وہ اس تخیل کیساتھ کہ ہم اسکو درجہ اول کے مضامین کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے معاصر کیلئے دو راہیں ہیں، انہیں سے کسی ایک کو وہ منتخب کرے، یا تو وہ حقیقی معیار کا علمی رسالہ ہو جیسے اورنیٹل کالج میگزین وغیرہ ہیں۔ اس صورت میں اسکا ماہنامہ کے بجائے سہ ماہی کر دیا جائے تاکہ اسکے ذریعہ سے علم و ادب کی حقیقی خدمت انجام پاسکے۔ ورنہ دوسری راہ یہ ہے کہ اسکو یونیورسٹی یا کالج میگزین کی حیثیت دی جائے، اس کا دائرہ کچھ بڑھایا جائے۔ سطحیات کا بقدر مناسب اضافہ کیا جائے۔ تاکہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے پڑھنے

والوں کے ذوق کی تسکین کا بھی سامان ہو۔ اور کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کو بھی اپنے اساتذہ کی رہبری میں ادبی و علمی نشو و نما کا موقع مل سکے مقصود یہ ہے کہ یا تو اسکے موجودہ معیار کو بلندی کی طرف لیجایا جائے کہ وہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے شایان شان بن سکے پستی کی طرف آیا جائے تاکہ نوجوانوں کو اس سے کچھ سیکھنے کا موقع مل سکے۔

سائینس حیدرآباد۔ مدیر اعلیٰ ڈاکٹر مظفر الدین قریشی، صدر شعبہ کیمیا جامعہ عثمانیہ۔ حجم ۴ صفحے تقطیع $\frac{20 \times 30}{8}$ مطابق ندیم قیمت سالانہ عہ پتہ: دفتر رسالہ سائینس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

انجمن ترقی اردو ہند، کا سہ ماہی رسالہ سائینس، اب ماہنامہ ہو گیا ہے۔ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے اساتذہ کی جد و جہد سے انہی کے اہتمام میں ترتیب پاتا۔ اور شائع ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ مسلم یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے فن کیمیا، ریاضی، حیوانات، طبیعات وغیرہ کے پروفیسر اس کی مجلس ادارت میں ہیں، ہر ماہ علوم جدیدہ پر معلوماتی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ نئے انکشافات سے باخبر کیا جاتا ہے، اور مسائل کے سمجھانے کیلئے ایسی سادہ اور سلیس زبان اختیار کیجاتی ہے کہ فن کی دقتوں کے بغیر مسائل و معلومات پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو سکیں اس رسالہ کے مطالعہ سے قدرت کے بہت سے رموز ذہن انسانی کیلئے کھل جاتے ہیں۔ سوال و جواب کا عنوان مستقل ہے جس میں موجودات کے حقائق کے متعلق جو سوالات کئے جاتے ہیں۔ انکے جواب دئے جاتے ہیں۔ معلومات میں نئے انکشافات درج ہوتے ہیں "سائنس کی دنیا" میں اہل علم کے حالات بیان کئے جاتے ہیں، یہ رسالہ سکولوں اور کالجوں کیلئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔ سکولوں اور کالجوں کے دارالمطالعہ کے کارکنوں کو چاہئے کہ وہ اس کو جاری کرائیں۔ اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کارکنان رسالہ سائنس علم کی حقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس رسالہ سے غیر زبان کے علمی رسالوں کے مطالعہ سے ہم بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے باعث مسرت ہے کہ اردو صحافت میں ایسے سنجیدہ علمی رسالہ کا اضافہ ہوا ہے۔

ہل الہ آباد۔ چیف ایڈیٹر گاؤں سدھار افسر۔ یو۔ پی۔ لکھنؤ۔ ایڈیٹر جناب شری ناتھ سنگھ۔ پبلشر انڈین پریس لیمیٹڈ الہ آباد، حجم ۲۷ صفحے تقطیع $\frac{18 \times 22}{4}$ قیمت سالانہ پانچ روپیہ (۵ر)

صوبہ متحدہ آگرہ، اودھ کے محکمہ، گاؤں سدھار، کی طرف سے اردو ہندی میں ہل کے نام سے ماہانہ رسالہ جاری ہوا ہے، جس میں دیہی آبادیوں کی دلچسپی اور گاؤں سے تعلق رکھنے والے مفید اور زراعت و دیہی صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں پر معلومات، مضامین چھپتے ہیں اور گاؤں سدھار اور محکمہ زراعت کی ترقیوں اور مفید خدمات کی کارگذاریاں شائع کیجاتی ہیں۔ رسالہ مصور ہے، زراعت کے جدید آلات، مختلف قسموں کی زمینوں، پودوں، کاشتوں، مویشیوں، اور لڑائی کے نئے ہتھیاروں وغیرہ کی تصویریں۔ اسکے صفحوں پر اسی طرح چھاپی جاتی ہیں جیسے انگریزی اور ہندی ٹائپ کے صفحات پر چھپتی ہیں۔ مضامین کی افادی حیثیت کیساتھ رسالہ کی ظاہری شان بھی کچھ کم سراہنے کے لائق نہیں۔ چھپائی کے لحاظ سے اس قسم کی خوبیوں کا کوئی دوسرا رسالہ اردو میں موجود نہیں۔ یو۔ پی کی دیہی انجمنوں کیلئے اس کا چندہ صرف ساڑھے تین روپے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہمارے صوبہ کی دیہی انجمنیں بھی اسکو خریدنا چاہیں تو رعایت رسالہ کے کارکن منظور کر لینگے۔ دیہی آبادیوں کو اس رسالہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور ہمارے صوبہ کے محکمہ دیہات سدھار کیلئے بھی مناسب ہوگا کہ وہ اسکی کاپیاں خرید کر اپنے مرکزوں میں تقسیم کرکے دیہی آبادیوں کو فائدہ پہنچائے۔ امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

ندیم

مرتبہ
سید ریاست علی ندوی

جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

ن اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ
کر سکی لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی۔ کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے
جہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایکلائڈ دریافت کیا ہے
میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکشوئیل سائنس انسٹی ٹیوٹ
امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز
سل ہوئی۔

جادو اثر آب حیات کا نام "اوٹون" **Otone** ہے جسے سلور ڈراپ
(SILVER DR میں پیش کیا گیا ہے

ے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن
س کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غائب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور
گی۔ رخسارے گوشت دھون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے چہرہ پر
کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائیگی۔ اور آپ اپنی
بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو
کے معلوم ہوں گے۔

کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا حکمی علاج ہیں۔
ن کی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا
دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا
دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہو جانا یا گرنا۔ کمر کا
سیلان۔ ضعف باہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ۔ ضعف گردہ و مثانہ۔ عورتوں کی پرسوت کی بیماری
دریا) سیلان الرحم۔ اور دیگر رحمی شکایتوں کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔
ی آب حیات کے اثرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو بنوائیں ایک ہفتہ
کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز
ندازہ ہوگا۔

ے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔
کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

Otone An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination
The Elixir of Life
SILVER DROPS

15.00 روپیہ کا نقد انعام

یبرٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کردے
ب حیات تاثیرات کسی حیوانی ہرموں یا وٹامن کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے
ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔
کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے
ئدہ
سکنے کیلئے ... اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے ... روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے
... قیمت ... کردے۔

سول ڈسٹری بیوٹر
میسرز گراند فارمیسی (پوسٹ ...
تمام کاروبار "اوٹون" کلکتہ ...
...ributor
...N
CALCUTTA

عرق اکسیر اعظم رجسٹرڈ
پیٹ کے بیماری کی دوا
مثلاً پیٹ درد کرنا۔ پیٹ پھولنا،
پیٹ میں میٹھا میٹھا درد رہنا۔ پیٹ میں گڑ گڑاہٹ
بے چینی ہونا۔ قبض رہنا، پتلا دست آنا۔ کلیجہ میں درد اٹھنا
معدہ کی کمزوری کی وجہ سے غذا نہ ہضم ہونا۔ بھوک
نہ لگنا۔ سینہ کا جلن معلوم ہونا۔ ورم جگر ہونا۔ تلی کا
بڑھ جانا۔ پیشاب زیادہ آنا۔ بار بار پیشاب آنا۔
(جس کو ذیابیطس کہتے ہیں) دست اور متلی کے ساتھ
قے آنا (جسکو ہیضہ کالرا کہتے ہیں) موسمی بخار
کا آنا۔ یا معدہ کی خرابی سے کوئی دوسری بیماری ہو
جانا۔ مرض نیا ہو، یا پرانا، خدا کے فضل سے عرق اکسیر اعظم استعمال
کرنے سے بالکل اچھا ہو جاتا ہے۔ قیمت۔ فی شیشی ایک روپیہ
تین شیشی کی قیمت دو روپیہ بارہ آنہ۔ علاوہ محصول
جناب ڈاکٹر صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیے
جناب ڈاکٹر ممتاز حسین صاحب پٹنہ سے تحریر فرماتے ہیں۔
جناب کی دوا اکسیر اعظم چند مریضوں کو استعمال کرایا۔ پیٹ کے
مختلف امراض کے مریض اس سے برابر صحتیاب ہو رہے ہیں میں آپکو
مبارکباد دیتا ہوں۔
نسوانی رجسٹرڈ
عورتوں کے پرسوت کے بیماری کی مفید دوا
آجکل ہر گھر میں عورتوں کو سفید رطوبت مثل دھات یا
مٹیالے رنگ گاڑھی پیپ آتے رہنے کی شکایت ہو جاتی
ہے جسکی وجہ سے بدن کمزور رنگ پیلا، ہاتھ پیر میں جلن
دماغ میں چکر، آنکھ تلے اندھیرا آجایا کرتے ہیں۔ کمر میں
درد، بھوک نہ لگنا، طبیعت میں سستی رہتی، حمل گر جانے
مرد سے گھبرانے، کمزور اولاد پیدا ہونے کی شکایت رہتی ہے
نسوانی ایسی مجرب آزمائی ہوئی لاثانی دوا ہے کہ عورتوں
کی جملہ بیماری کی شکایت انشاء اللہ دور ہو جائیگی
قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ تین شیشی کی قیمت دو روپیہ
بارہ آنہ۔ محصول علاوہ۔
نسوانی سے حیرت انگیز فائدہ ہوا
جناب مرتضی حسین صاحب اورنگ آباد (گیا) سے رقمطراز ہیں۔ جناب کی
نسوانی واقعی تیر بہدف دوا ہے۔ میں نے اپنی اہلیہ کو استعمال کرایا جس سے حیرت
انگیز فائدہ ہوا۔ براہ نوازش ۳ شیشی نسوانی ارسال فرمائیے۔ مشکور ہونگا۔
(فرمائش لکھتے وقت "ندیم" کا حوالہ دیجئے۔
ملنے کا پتہ۔ ایس، اے۔ بی بخشی کمپنی۔ ۳۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

صوبہ بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ قیمت ششماہی عہ

یعنی

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

فی پرچہ چھ آنے

مرتبہ :- سید ریاست علی ندوی

جلد (۱۷) ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء نمبر (۶)

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا۔

نظرات

کمال یار جنگ کمیٹی پورے ہندستان کا دورہ کرکے مسلمانوں کی تعلیمی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی، اس تعلیمی کمیٹی کی عارضی رپورٹ کا متن اب شائع ہوا ہے، اسوقت تک صرف اس کا تمہیدی حصہ مطالعہ میں آسکا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ یہ رپورٹ اپنے تمہیدی حصوں میں کسی تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ ہونے کے بجائے اپنے زاویہ نگاہ اور لب و لہجہ کے اعتبار سے کسی سیاسی جماعت کا ترجمان نظر آتی ہے۔ حالانکہ نفس تعلیمی مسائل پر محض تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کرنا تھا۔ ممکن ہے رپورٹ کے آگے کے حصوں میں ہماری تعلیمی ضروریات پر صحیح طور پر غور کیا گیا ہو۔ اس لئے ہم پوری رپورٹ کے متن کے مطالعہ کے بعد ہی صحیح رائے قائم کرسکتے ہیں۔

ہمارے صوبہ کے تعلیمی معاملات، تمام صوبوں سے نرالے ہیں۔ اردو کی کتابیں جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ ادب کی ہوں یا جغرافیہ و تاریخ کی۔ اس قدر مہمل، لغو، بیکار، اور غلطیوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں کہ بچوں کی عمر کے ضائع ہونے کے سوا اور کوئی حاصل نہیں۔ ان کتابوں پر معنوی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو غلطیوں کا انبار نکلے۔ اور زبان ادب اور طریقہ ادا کے اعتبار سے تو ان کا پایہ اس قدر گرا ہوا ہے کہ اگر کسی دوسرے اردو داں صوبہ میں جانے کا اتفاق ہو اور اسکول کی یہ کتابیں سامنے کھول کر رکھ دی جائیں تو شرم سے گردن جھکا لینی پڑے۔

ان کتابوں کے پبلشروں کا حال یہ ہے کہ وہ ہندی کے ادیبوں سے کتابیں لکھواتے ہیں۔ اور تھوڑی بہت اردو، ہندی اور انگریزی جاننے والے نومشقوں کو چند چند آنے فی صفحہ کی اجرت دیکر اردو میں ترجمہ کراتے ہیں۔ یہ پبلشر خود اردو سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ وہ نومشق جو کچھ لکھ کر حوالہ کر دیتے ہیں۔ اس کو وہ سستی سے سستی اجرت پر چھپوانے کیلئے پریس کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اور کتابوں کے پریس کے حوالہ کرنے کے بعد سے ان کے چھپنے تک وہ ان کی کوئی خبر نہیں لیتے۔ بس سمجھیے کہ ان نومشقوں نے جو کچھ ترجمہ کرکے دیدیا۔ وہ کسی سستے پریس میں کتابت کی غلطیوں کے اضافہ کے ساتھ چھپ گیا۔ اور اغلاط کا یہ پلندہ مسلمان بچوں کے پڑھنے کیلئے سارے صوبہ میں پھیلا دیا گیا۔

بال مکند شاستری اور راج راجیشوری پستکالیہ وغیرہ کی شائع کی ہوئی کتابوں پر جو ہائی اور مڈل اور پرائمری اسکولوں کیلئے لکھی گئی ہیں ادبی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو اغلاط کا ایک انبار لگ جائے۔ راقم سطور کا بڑا بچہ امسال انگریزی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل کیا گیا ہے، اس تعلق سے کبھی کبھی اسکی کتابوں کے صفحوں پر نظر پڑ جاتی ہے۔ اور ان کی عبارتیں پڑھ پڑھ کر سخت روحانی اذیت ہوتی ہے۔

چوتھے درجہ میں بال شکشا سمیتی کی شائع کی ہوئی" ابرپرائمری جغرافیہ" اور" اپر تواریخ" (یہ نام قابل داد ہے) داخل ہیں اولاً ان کتابوں کی چھپائی اس قدر خراب ہے کہ یہ بچوں کے پڑھانے کے لائق کسی صورت سے قرار نہیں دیجا سکیتں۔ پھر ان کتابوں کا کوئی صفحہ مشکل سے ایسا ہوگا جس میں ادبی غلطیاں، یا طریقہ ادا کی نمایاں خامیاں نہ ہوں، یہانتک کہ تذکیر و تانیث، واحد و جمع کی بھی غلطیاں ہیں۔ اسی طرح غلط محاوروں، غیر صحیح لفظوں، اور بے جوڑ صلات کے استعمال کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ اگر ان غلطیوں کی فہرست مرتب کیجائے تو وہ خاصی طویل ہو۔

ہمارے خیال میں صوبہ بہار کی ٹکسٹ بک کمیٹی سب سے بڑی تعلیمی مجرم ہے، جو ایسی کتابوں کو منظور کرتی ہے۔ وہ یا تو اپنے فرائض کی ادائی میں قطعی کوتاہ ہے۔ جو وہ ان خامیوں پر نظر نہیں ڈال سکتی۔ یا پھر وہ ناشروں کے ذاتی اثرات سے اسقدر متاثر ہوتی ہے کہ وہ چند ناشروں کی خوشنودی کیلئے صوبہ کے ہزاروں ہزار بچوں کی زندگی برباد کرنے میں تامل نہیں کرتی۔

ہمارا حکومت سے یہ پرزور مطالبہ ہے کہ وہ صوبہ میں تعلیم کی ان بنیادی خامیوں پر جلد سے جلد توجہ کرے۔ کتابوں کی ادبی خامیوں کے دور کرنیکا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اردو کی کتابوں کیلئے صوبہ کے کسی ماہر ادیب کے خدمات " ناظر ادبی " کی حیثیت سے حاصل کرے جس کا یہ کام ہو کہ وہ ٹکسٹ بک کمیٹی کی منظور کی ہوئی کتابوں پر ادبی حیثیت سے نظر ثانی کرے اور تصنیفی خامیوں کو دور کرنے کے بعد ان کتابوں کو اسکولوں میں رائج کیا جائے۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ناشروں کے متعلق یہ پوری تحقیقات کرے کہ وہ اردو اڈیشنوں کو اپنی اور اپنے اسٹاف کی نگرانی میں تیار کرانے کی واقعی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں، تا وقتیکہ یہ اور اسی قسم کی دوسری پابندیاں عائد نہ کیجائینگی اسوقت تک اردو کی اچھی کتابوں کا تیار ہونا ممکن نہ ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت کا شعبہ تعلیم ان امور پر ٹھنڈے دل سے غور کریگا۔ اور موجودہ پست معیار کتابوں کے بجائے مفید تصنیفات کو منظور کرا کر اسکولوں میں رائج کیا جائیگا۔ ہم کسی دوسرے موقع پر اس مسئلہ کے بعض دوسرے پہلوؤں پر تفصیل سے باتیں کرینگے۔

ملک کے علمی و ادبی حلقہ میں یہ خبر دلی مسرت سے سنی جائیگی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اکزکٹو کونسل نے اپنی مشرق نوازی کا ایک قابل قدر نمونہ پیش کیا۔ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۲۴ مئی میں یہ تجویز طے کر کے کورٹ میں بھیجی گئی ہے کہ ملک کے دو لائق علم و ادب کے خدمتگذاروں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولانا عبد الحق صاحب کے خدمات میں ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی اعزازی ڈگریاں پیش کیجائیں یہ دونوں ارباب علم، یونیورسٹی کی طرف سے اس علمی اعزاز کے پانے کے بہت دنوں سے مستحق تھے۔ خوشی ہوئی کہ یونیورسٹی نے اپنے فریضہ کو پہچانا ہم یونیورسٹی کو اس قدر شناسی پر مبارکباد دیتے ہیں، اگرچہ ان اہل علم بزرگوں کیلئے یہ علمی اعزاز کوئی باعث فخر نہیں کہ ان کی شخصیتیں ان اعزازوں سے بلند ہیں، بلکہ انکے اعزاز سے یونیورسٹی کا اعزاز ہے۔ تاہم ہم ان بزرگوں کی خدمتوں میں بھی نیاز مندانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور دست بدعا ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان بزرگوں کو تا دیر ہمارے درمیان قائم رکھے کہ ملک و ملت اور علم و ادب کی خدمات انجام دیتے رہیں۔

ابھی چند دن ہوئے چند گھنٹوں کیلئے پٹنہ گیا ہوا تھا۔ بعض حلقوں میں زبانی گفتگوؤں میں ادن نوخیز صاحبزادے کی حرکت
زاری اور پھر زود پشیمانی کا ذکر آیا۔ جن کے ذکر خیر کو اپنی روش کے خلاف ایک سے زیادہ مرتبہ ان صفحات میں لانا پڑا ہے۔
م سطور سے کہا گیا کہ ان "اعتراضات" کے جوابات کی ضرورت ہے۔ راقم سطور نے پوچھا کہ گویا وہ شطحیات بھی التفات کے لائق
ر پا سکتے ہیں؟ ان سے عرض کیا گیا کہ پوری سنجیدگی سے ان پر نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ عظیم آباد پٹنہ ابھی
ں علم سے خالی نہیں۔ ہمارے مخلص کرمفرماؤں میں جناب قاضی عبدالودود صاحب اور جناب سید حسن عسکری صاحب وغیرہ ایسے اہل
لم موجود ہیں۔ جن پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں۔ اگر وہ بھی ان شطحیات کو سنجیدہ جواب کا مستحق سمجھیں تو تعمیل ارشاد کی جا سکتی ہے۔
دستوں نے کہا ان اہل علم کا حال تو معلوم نہیں۔ مگر بعض ارباب عمائم اپنے حلقہ درس میں بیٹھے اپنے مطیع و منقاد تلامذہ کے
امنے "ابنی و لا غیرہ" کا رجز بلند کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا دینیات کے مقدس درس کے حلقہ میں بیٹھ کر ملحد نیاز کے ملحدانہ افکار کی
اعت کرنیوالے رسالہ کا ذکر بار بار لایا جاتا ہے۔ نیز مولانائے موصوف نے ہمارے بعض ایسے عالم دین دوستوں سے جو ہم
ونوں سے اخلاص و محبت رکھتے ہیں۔ عالمانہ رجز سے فرمایا کہ وہ اعتراضات لاجواب ہیں مجبوراً ہمیں اس مبارزہ طلبی کے
اب میں "دیوجانس بہاری" کی خدمات یاد آئیں۔ جن کے "رشحات قلم" سے ہمارے نمبر کے پڑھنے والے لطف اندوز ہو چکے
ں۔ مگر حضرت دیوجانس بہاری کیلئے بھی یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ تنزل کی اس منزل تک اتریں مجبوراً "دیا غنوس بہاری"
و دعوت دیگئی کہ وہ "زاویہ خمول" سے باہر آئیں۔ اور سردست ان شطحیات کی سطحیات کا پردہ چاک کر دیں۔ چنانچہ آئندہ
ینہ میں حضرت دیا غنوس بہاری کا یہ "مقالہ عالیہ" "شطحیات نگار" کے عنوان سے ناظرین کی خدمت میں پیش ہوگا۔ اور
س الحاد پرور رسالہ کے مدیر اور اس کے مضمون نگار اپنی پوری عریانی کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجائیں گے۔

(✻)

ندیم پریس میں الکٹرک مشین لانے کے بعد کسی موزوں مکان کی تلاش تھی حسن اتفاق کہ کچہری روڈ ہی پر ایک وسیع
شادہ اور موزوں مکان کا انتظام ہو گیا۔ چنانچہ ماہ جون ۱۹۴۱ء سے پریس اور دفتر کو اس نئے مکان میں منتقل کر دیا جائیگا۔ یہ نیا
کان مقامی طور پر "ارشاد منزل" (مملوکہ جناب بابو مشتاق علی خاں صاحب۔ رئیس بھدیا) کے نام سے موسوم ہے۔ اس
وقت تک پریس جس گلی میں تھا۔ اس کے سامنے سڑک پر پچھم طرف، ادھر جانب ذرا ہٹ کر ایک بڑا پھاٹک ہے۔ پریس اور
فتر کا سائن بورڈ اسی پھاٹک پر آویزاں ہوگا۔ سامنے پریس کی عمارت اسی پھاٹک ہی پر سے نظر آئے گی۔

(✻)

تبصرہ کے لئے نئے رسالے، سالنامے اور کتابیں کثرت سے جمع ہو گئی ہیں۔ ناشرین کی خدمت میں معذرت
کے ساتھ اطلاع دیجاتی ہے کہ آئندہ مہینے سے چند صفحے بڑھا دیے جائیں گے اور جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوشی
حاصل ہوگی۔

مقالات

تذکرۂ شورش

از

جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر

میر غلام حسین، شورش عظیم آبادی نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا تھا، جس کا واحد نسخہ جو جون بارڈ وایلیٹ[1] کی ملک رہ چکا
ہے، اور جس سے اشپرنگر[2] نے فہرست شعرائے اردو کی تیاری میں مدد لی ہے۔ فی الحال کتب خانۂ بوڈلین، آکسفورڈ میں موجود
ہے۔ اور اس کتب خانے کے مخطوطات فارسی کی فہرست میں اس کا ذکر ہے۔ مرتب فہرست نے اس کا سال تالیف ١١٩٣ھ[3]
یا ہے۔ لیکن، یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے۔ اس کی تالیف کئی سال میں ہوئی ہوگی۔ اس کی ابتدا ١١٨٦ھ یا اس سے کچھ قبل ہوئی
ی۔ اس لئے کہ اشرف علی خاں، فغاں کو شورش نے زندوں میں شمار کیا ہے۔ اور ان کا سال وفات ١١٨٦ھ ہے۔ اس تذکرے
ں محزوں کا سال وفات بھی درج ہے جو ١١٨٩ھ ہے ١١٩٣ھ کے بعد بھی ممکن ہے کہ کچھ اضافہ کیا ہو۔ لیکن چونکہ
شورش کا انتقال ١١٩٥ھ میں ہوگیا تھا۔ اس کا زیادہ موقع نہ ملا ہوگا۔ اس کی زبان فارسی ہے، جیسا کہ اقتباس ذیل سے ظاہر ہوگا۔

"محمد عابد دل تخلص از خاک عیش بنیاد عظیم آباد است در علم فارسی علی الخصوص در بیت و حساب طبابت صاحب استعداد شاعر
فصیح و بلیغ در ادابندی و معنی یابی یگانۂ عصر، کلامش گہر ریز و ادا آمیز۔ در غزل گوئی و قصیدہ و مثنوی وغیرہ قدرت تمام
دارد۔ الحق کہ سر حلقۂ سخن وراں و مقبول دل ہائے دلاں است۔ دیوانش قریب دو ہزار بیت خواہد بود۔"

علی ابراہیم خلیل نے شورش کے بارے میں گلزار ابراہیم (ص ١٦٤) میں جو کچھ لکھ دیا ہے کہ "تذکرہ در ریختہ تالیف
د" اس سے بعض اصحاب[5] نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تذکرے کی زبان اردو ہے۔ لیکن خلیل کی مراد "در احوال شعرائے ریختہ"
ہے۔ گلزار ابراہیم ہی میں میر حسن کے تذکرے کا ذکر بھی بجنسہ انہی الفاظ میں آیا ہے۔ یعنی در ریختہ[6] لکھا ہے اور مطلب یہ ہے کہ

---

۱ جون بارڈ وایلیٹ کے متعلق بہار اینڈ اڑیسہ ڈسٹرکٹ گیزیٹر پٹنہ ص ١٩١ میں مرقوم ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں پروونشل کورٹ آف
ل پٹنہ کا جج تھا۔ سول سروس سے علیحدہ ہونے کے بعد اس نے بانکی پور میں مکان بنا لیا تھا۔ جو ١٨٦٤ء میں بنک آف بنگال کے قبضے میں آگیا تھا۔
ر کے زمانے میں اس سے اور ولیم ٹیلر سے جھگڑے ہوئے تھے۔ ۲ اشپرنگر نے کتب خانۂ اودھ کی جو فہرست بنائی ہے۔ اسمیں شعرائے اردو
ایک فہرست بھی دی ہے۔ کہنے کو تو یہ فہرست ہے، لیکن اس میں شعرا کے حالات بھی ہیں۔ اور یہ کوشش کی ہے کہ ہر شاعر (باقی حاشیہ صفحہ پر)

تذکرہ شعرائے ریختہ کا ہے۔ میر حسن کا تذکرہ چھپا ہوا ملتا ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے، اور آج تک کسی نے اس کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کی زبان اردو ہے۔ نسخۂ آکسفورڈ کی زبان کے بارے میں تو کچھ گفتگو کی گنجائش نہیں رہی، لیکن اگر کسی حصہ کا خیال ہو کہ شورش نے فارسی کے علاوہ اردو میں بھی تذکرہ لکھا ہے۔ اور خلیل نے اسی کا ذکر کیا ہے تو انہیں امور ذیل پر غور کر لینا

(۱) بارہویں صدی ہجری میں فارسی کا رواج عام تھا۔ اردو کے بارے میں بھی اگر کتابیں لکھی جاتی تھیں تو فارسی میں جہاں جہاں اور دھلے میں جتنے تذکرے تالیف ہوئے ہیں، سب کی زبان فارسی ہے۔ اگر نثر اردو میں کچھ کتابیں لکھی گئیں تو زیادہ تر ان لوگوں کے لئے جو فارسی سے ناواقف تھے۔ اسی لئے قدیم نثر کے جو نمونے ملتے ہیں۔ وہ یا تو کہانیاں ہیں یا مذہبی رسالے، شاعری سے متعلق کوئی کتاب اس صدی میں اردو میں نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ شعر اردو سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اتنی فارسی ضرور جانتے کہ معمولی نثر کو سمجھ لیں۔ خاص صوبہ بہار کو دیکھئے تو یہاں بارہویں صدی کی بھی کوئی کتاب نثر میں نہیں ملتی۔ ایک آدھ مذہبی رسالہ گیارہویں صدی کا جو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے زمانۂ تصنیف کے متعلق اختلاف کی بہت کچھ گنجایش ہے۔ شورش کا اردو شعرا کا تذکرہ لکھنا قیاس کے خلاف ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں لطف نے اردو میں تذکرہ تالیف کیا۔ تو انگریز شائقین اردو کی خاطر کو مد نظر رکھ کر اور اس کے بعد بھی مدتوں لوگ فارسی میں تذکرے لکھتے رہے۔

(۲) ۱۱۹۳ھ کے بعد تذکرہ لکھنا تو خلاف قیاس ہے۔ اس لئے کہ ۱۱۹۵ھ میں شورش کا انتقال ہو گیا۔ اگر اس سے قبل لکھا تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرا تذکرہ فارسی میں لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ اہل ایران کو تو اس کی حاجت نہ تھی۔

(۳) اگر تذکرہ فارسی کے علاوہ اردو میں بھی تذکرہ لکھا ہوتا تو تذکرۂ فارسی میں کہیں نہ کہیں اس کا ذکر ضرور آتا۔ دونوں کتابوں کا موضوع ایک ہے۔ بعد کے تذکرے میں ظاہر ہے کہ بعض امور کو زیادہ صراحت کے ساتھ لکھا ہوتا۔ بعض اغلاط کی تصحیح کی ہوئی۔ لیکن تذکرہ فارسی میں تذکرۂ اردو کی طرف مطلقاً اشارہ نہیں۔

(۴) اگر دو تذکرے شورش نے لکھے ہوتے تو خلیل نے گلزار ابراہیم میں اس کا بہ صراحت ذکر کیا ہوتا۔

(۵) اردو کے تذکرے کا کوئی نسخہ کسی کتب خانے میں جس کی فہرست مطبوعہ موجود ہے نہیں ہے، اور نہ کسی نے دیکھا ہے۔ علی ابراہیم کے قول کی توجیہہ ہو چکی ہے۔ انہوں نے الفاظ کے انتخاب میں احتیاط نہیں کی۔ لیکن ان کے زمانے کے مصنفوں کا یہی حال ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ یہ تذکرہ لکھا گیا تو کب۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ۱۱۶۵ھ میں۔ جہاں تک میری نظر تذ

(حاشیہ باقی صفحہ ۲۶۱) کا حال اصلی ماخذوں سے لکھا جائے۔ ؎۳ زمانۂ قیام یورپ میں میں نے اس تذکرے کو دیکھا ہے۔ لیکن اسوقت اس کے محض چند اجزا پیش نظر ہیں۔ ؎۴ اشپرنگر۔ ؎۵ گلزار ابراہیم۔ ؎۶ لطف نے جو کچھ لکھا ہے وہ خود انہیں کی تصریح کے مطابق خلیل کی عبارت کا ترجمہ ہے، اور جیسا کہ گلزار ابراہیم سے دکھایا ہے۔ ترجمہ بھی صحیح نہیں کیا۔ اس معاملے میں وہ ایک الگ گواہ نہیں۔ ؎۷ صفحہ ۱۱۸

...شن کی کسی کتاب کا خواہ وہ کسی زبان میں ہو، یہ سالِ تصنیف کسی تذکرہ نگار نے نہیں دیا۔ دتاسی نے اپنے
...ر یہ سنہ دیا ہے تو یہ محض سہوِ قلم ہے۔ تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی کے مقدمے میں اس سنے بہ صراحت
...تذکرۂ عشق اور تذکرۂ شورش اس کی نظر سے نہیں گذرے۔ اس کی معلومات کا انحصار اشپرنگر پر ہے۔ غریب
...ہم میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی کہ شورش نے دو تذکرے لکھے ہیں۔ تذکرۂ شورش کے بارے میں دتاسی
کچھ نکلا ہے وہ اسی نسخے کے متعلق ہے جو اشپرنگر نے دیکھا تھا۔ اور جو آج کل آکسفورڈ میں موجود ہے۔ اگر دتاسی
...بنائے دعویٰ کے لئے کافی ہے۔ تو یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ شورش نے تین تذکرے لکھے ہیں۔ ایک
میں جو دتاسی کے خطبات میں ہے۔ ایک ۱۱۹۳ھ میں مرتب فہرست مخطوطات فارسی کے بیان کے مطابق
۱۲...ھ میں یا اس کے بعد، جیسا کہ ندیم فروری ۱۹۳۶ء[9] کے ایک مضمون سے ثابت ہوتا ہے۔ مضمون نگار شاہ
...ال کا سال وفات ۱۲۱۵ھ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "سنہ وفات و تاریخ وفات........ فاضل
.... سے معلوم ہوئے۔ اور انہوں نے تذکرہ شورش (میر غلام حسین شورش) کا حوالہ دیا۔"
جس تذکرے میں ۱۲۱۵ھ کا واقعہ درج ہو ظاہر ہے کہ وہ ۱۱۶۵ھ یا ۱۱۹۳ھ کی تالیف تو ہو نہیں سکتا۔ تذکرۂ
...یا موقوف ہے، میر حسن کے متعلق یہ دعویٰ کرنے سے کون مانع ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے ایک تذکرہ اردو میں
...اور عشقی عظیم آبادی کیوں فراموش کئے جائیں جن کا تذکرہ بہ قول مصنفِ شعر الہند[10] ۱۱۱۵ھ میں لکھا گیا تھا۔
دہلی کیا دکن میں بھی کسی کو شعرائے ریختہ کا تذکرہ لکھنے کا خیال نہ آیا تھا۔

...ص ۴۹ جلد ثالث ص ۱۳۴۔ [9] ص ۱۶ - [10] جلد اول مقدمہ۔

"ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں"

ادب

جناب الف احمد صاحب ارکوی

"ذیل میں میری پکفورڈ — MERY PIGKFORD کی مشہور کتاب (WRYNOTRYGOD) کے مطالب کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے"۔ (مترجم)

اگر کسی بنک میں آپ کے کچھ روپے جمع ہوں لیکن آپ کو چیک لکھنا نہ آتا ہو تو وہ روپے آپ کے لئے بیکار ہونگے یا اگر آپ کی موٹر گراج میں بند رکھی ہو لیکن اس کی چابی گم ہو جائے تو آپ کسی جگہ بہت جلد نہیں پہنچ سکیں گے۔

آج انسانیت خدائے تعالیٰ کے متعلق جس گمراہی میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ انہیں دو مثالوں سے ہو سکتا ہے چند سال ہوئے جبکہ میں غیر معمولی مصیبت اور پریشانیوں میں مبتلا تھی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ ایک طاقت ایسی بھی ہے جس سے مجھے ضرورت کی چیزیں مل سکتی ہیں اور آج میرا وہ احساس ایک راسخ اعتقاد کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ایک طاقت ایسی رحیم و کریم ہے جو ان حالات میں جبکہ میرا قلب افراط اشکار سے مجروح ہو رہا ہوگا مجھے تسلی دے گی۔ اور رنج و تکلیف کے طوفان میں میرے لئے راحت اور خوشی کا سامان مہیا کرے گی۔

اب اس بصیرت کا راز سنئے جو مجھے حاصل ہوئی میں نے "صداقت خیال" کا پتہ لگا لیا۔ اور اس دریافت کے بعد مجھے ناقابل بیان روحانی مسرت اور حقیقی روشنی حاصل ہوئی۔

اس اصول کا تو مجھے اس سے پہلے بھی علم تھا کہ ہم کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیئے تکالیف و مصائب کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرنا چاہیئے اور تکلیف و مصیبت کے وقت بجائے رونے دھونے کے مسکرانا چاہیئے۔ لیکن یہ صرف ایک فلسفیانہ اصول تھا۔ اور بے شک اگر اس پر عمل کیا جائے تو زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے۔ اور میں اس دن کا بےچینی سے انتظار کر رہی تھی جب حقیقت خود بخود ہم پر آشکارا ہو جائے گی اور میں مطمئن اور زندہ دل نظر آؤنگی۔

لیکن مجھے اس کا احساس بعد میں ہوا کہ "صداقت خیال" خدا تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے اور یہی ایک ذریعہ ایسا ہے جس سے ہم اپنے آپ کو اس مبدا اصلی سے قریب تر کر سکتے ہیں۔ اور صرف اسی طاقت کو قدرت ہے کہ وہ نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ حالات کو ہمارے موافق تبدیل کر دے یہ تبدیلی خواہ ہمارے منشا کے

اتفاق نہ ہو لیکن وہ یقیناً ایسی صورت اختیار کرے گی جس کا نتیجہ ہمارے لئے بہتر ہوگا اور "صداقت خیال" ہی وہ طاقت ہے جس سے
ں پریشان کن حالات میں اپنی ہمت کو بحال اور امید افزا تخیل سے اپنے آپ کو مسرور رکھنے کی بصیرت اور قابلیت عطا ہوتی ہے۔

اس واقعہ کے دو روز بعد ایک لڑکی مجھ سے ملنے آئی اور اس نے دوران گفتگو میں کہا۔

"میری۔ میں بہت غمزدہ ہوں! میں سخت مصیبت میں مبتلا ہوں اور اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی ترکیب
ن میں نہیں آتی۔ شاید تمہیں کوئی ایسا عمل معلوم ہے جو تم کو جبکہ تم آلام اور مصائب سے گھری ہوتی ہو۔ خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔
یا اس سے مجھے بھی کچھ مدد ملے گی؟ میں بالکل مایوس اور ناامید ہو گئی ہوں"۔

میں نے اس سے کہا کہ میرا عمل ہر اس شخص کی مدد کرے گا۔ جو اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے!

"لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میں مذہبی خیال کی نہیں ہوں۔ میں تو خدا کی ہستی پر بھی ایمان نہیں رکھتی"۔

میں نے جواب دیا کہ میں خود مذہبی خیال کی نہ تھی۔ اور خدا کے تخیل سے جو اس وقت میرے ذہن میں تھا۔ متنفر تھی۔
میں نے اسے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا۔

"بچپنے میں جبکہ میں بہت ہی چھوٹی تھی، میں ایک لالٹین کے کھمبے کے نیچے رنجیدہ خاطر بیٹھی تھی۔ میری ماں نے
مجھ سے سوال کیا۔ "پیاری! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں خدا سے نفرت کر رہی ہوں" میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

میری خدا پرست عیسائی ماں میرے منہ سے یہ کلمہ کفر سنکر کانپ اٹھیں۔ لیکن وہ بھی خدا کے تخیل کو میرے
دماغ سے نہ بدل سکیں — جابر اور قہار — مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر میں اپنی ماں کو اس سے زیادہ چاہنے لگوں
تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ وہ مجھے بہت ہی معمولی غلطیوں پر سزا دے گا۔ اس کے سوا میرا یہ بھی خیال تھا کہ وہ بہت سے
نیک اور اچھے آدمیوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے"۔

میری بچپن کی ایک سہیلی اچانک مرگئی اور ماں باپ بھائی بہنوں اور قریبی عزیزوں کو اپنے غم میں مبتلا چھوڑ گئی۔
لوگوں نے مجھ سے کہا کہ خدا ہی کا حکم تھا۔ میں ایسے خدا سے باغی ہوگئی اور میں نے طے کرلیا کہ میں ایسے خدا سے محبت نہ کرونگی۔
نہ ایسے خدا سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اس کے طریق کار پسند نہ تھے۔

اس قسم کے خیالات بہت سے لوگوں کے ہیں۔ اور نوجوان طبقہ تو اس میں خصوصیت کے ساتھ مبتلا ہے۔ لیکن جوں
جوں وقت گذرتا گیا میرے تجربات وسیع تر ہوتے گئے۔ میں نے انتہائی مسرت کی گھڑیاں بھی دیکھیں اور انتہائی تکلیف اور مصیبت
کی برداشت کی بہت سی وہ چیزیں جن کا لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ میرے پاس کثرت سے مہیا رہتیں۔ لیکن جب ہم کسی تکلیف
مصیبت یا پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں یا جب فکر اور مایوسی کی تاریک گھٹا سخت کہر کی طرح ہمارے دل پر چھا جاتی ہے تو
کامیابی اور شہرت، دولت اور لاتعداد اچھے اور غمگسار دوست بے کار ثابت ہوتے ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ ہم کو جو راستہ کی منتہا نظر آتی ہے وہ دراصل صرف ایک موڑ ہے۔ وہاں سے ایک دوسری نہایت دلچسپ اور دل آویز منزل سفر شروع ہوتی ہے۔ یہ اسی قسم کا ایک موڑ تھا ـــــ یا زندگی کا ایک غمناک رخ ـــــ جہاں آکر مجھے پتہ چلا کہ میں خدا کا ایک مضحکہ خیز تخیل لئے پھرتی ہوں۔ اس لئے کہ میں نے اسے بالائے طاق رکھ دیا۔ یہ میرا پہلا قدم تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ میں معلوم کروں کہ "آخر خدا ہے کیا" اور اس کا میری ذات کے ساتھ کس طرح سے اور کیسا تعلق ہے اور یہ ایک عظیم الشان کارنامے کی ابتدا تھی۔

یہ "تلاش حق" تھی ـــــ اپنی ذات میں، اپنے کاموں میں، ان لوگوں میں جنکا مجھ سے کوئی تعلق تھا۔ اور اپنے اردگرد ہر چیز میں ـــــ اور اس کے بعد خدا کا تخیل میرے ذہن میں نہایت مہیب خوفناک، طاقتور اور آسمانی دیوتا کے بجائے ایک عقل مکمل، ایک مجسم محبت، ناصح و مددگار اور غمگسار دوست، کا ہو گیا۔ کیونکہ میرے ذہن اور تجسس نے میری راہبری کی۔ وہ مجھے خدا تک لے گیا۔ اور خدا میرے نزدیک آگیا ـــــ اور اس کے بعد میں نے خدا کے وجود کو دوسرے لوگوں اور حالات اور واقعات میں ڈھونڈا۔ اور جتنا غور سے میں نے اسے تلاش کیا اتنی ہی وضاحت سے میں نے اسے پایا۔ اور نتیجہ میں مجھے پہلے سے بہت زیادہ مسرت حاصل ہوئی۔ اور اب خدا صرف میرا آقا ہی نہ تھا بلکہ میرا پوشیدہ دوست، میرا خاموش ساتھی اور مشیر و صلاح کار۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اور یہ حقیقت میرے لئے بالکل صاف اور واضح ہو گئی کہ کائنات کی تخلیق صرف ایک دماغ "عقل کامل" تک میری، آپ کی اور ہر شخص کی رسائی ہو سکتی ہے۔

لیکن فی الوقت اس شخص کے لئے جو آلام و مصائب میں مبتلا ہے۔ اس عقیدے پر قائم ہو جانا سخت دشوار ہے لیکن اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کلیفورنیا کے کسی مدرسہ میں کسی استاد نے کہا "خدا ہر جگہ ہے" ایک بچہ نے پوچھا۔ "کیا جیل خانہ اور قید خانہ میں بھی؟" اور قبل اس کے کہ استاد کوئی جواب دے ایک دوسرا بچہ بول اٹھا "بے شک خدا وہاں بھی ہے۔ لیکن وہ بدبخت اسے پہچانتے ہی نہیں"۔ اور میں بھی بالکل اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔ خدا ہر جگہ ہے لیکن ہم اسے پہچانتے ہی نہیں۔

ہم دنیا کی ہر بھلائی کے مالک ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنے وجود کو خدا کے وجود کے ساتھ ہمساز کر سکیں اور اپنی ہستی کو خدا کی ہستی کے ساتھ ہمساز کرنے کا واحد ذریعہ ہماری خیالی قوت ہے۔ لیکن ٹھیک بجلی کی سوئچ کی طرح اگر ہم اسے نہ دبائیں تو ہم بجلی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح اگر ہم اپنی خیالی قوت سے کام نہ لیں تو ہم انعامات خداوندی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔

اگر ہم کسی چیز کے وجود سے بیخبر ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ سرے سے اس کا وجود ہی نہیں۔ کیونکہ اگر اڈیسن اپنے معمل میں برقی روشنی کے تجربات نہ کرتا تو بھی بجلی کا وجود اپنی جگہ پر رہتا اور اگر مارکونی عالم وجود میں نہ آتا پھر بھی وائرلیس اپنی جگہ پر برقرار رہتا اور اگر الکزنڈر گراہام بل پیدا نہ ہوا ہوتا تو بھی ٹیلیفون اپنی جگہ پر رہتا۔ لیکن ہم ان کے فائدے

محروم رہتے صرف اس لئے کہ ہم ان سے ناواقف تھے۔ اسی طرح میں اس پر ایمان رکھتی ہوں اس کو ثابت بھی کر سکتی ہوں کہ خدائے برتر کا وجود یقیناً ہے۔ جس سے ہم ہر وقت اور ہر جگہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ صداقت خیال سے کام لیں۔ کم از کم کوشش کرنے میں تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ ہم ابتدا میں کامیاب نہ ہوں اور کامیابی عرصہ تک حاصل نہ ہو لیکن ہماری ناکامیابی کی وجہ یہ ہوگی کہ ہم خدا تک پہونچنے کے لئے تیار نہ ہوسکے ہوں گے۔ لیکن اگر ہم کوشش کرتے رہے تو یقیناً کامیاب ہوں گے۔

برقی قوت کے سب سے بڑے ماہر چارلس اسٹین مٹز سے روجر بابسن نے جو کاروباری اعداد و شمار کا ماہر تھا۔ دریافت کیا تھا کہ آیندہ پچاس سال میں سب سے بڑی دریافت کیا ہوگی۔ تو بجائے اس کے کہ وہ برقی قوت میں کسی بڑی دریافت کے متعلق کہتا اس نے کہا کہ سب سے بڑی علمی دریافت روحانی حقیقت سے حقائق کا انکشاف ہوگا۔

"یہاں ایک عظیم الشان طاقت کارفرما ہے" اس نے کہا "اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسانی تاریخ و تمدن کی نشو و نما میں اس سے بڑی مدد ملی ہے۔ لیکن ہم اس سے کھیلتے رہے۔ اور اس کے سمجھنے کی پوری کوشش نہیں کی۔ لیکن کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب انسان اس نتیجے پر پہونچے گا۔ کہ مادی وسائل حقیقی مسرت کو پیدا نہیں کر سکتے۔ اور اس سے انسان میں تخلیق قوت کے اضافہ کا بہت کم امکان ہے۔ اس وقت تمام دنیا کے سائنسداں اپنے معمل کو خدا، عبادت اور روحانی قوتوں کے مطالعہ اور تجسس کے لئے وقف کر دیں گے۔ جس کو انہوں نے ابھی تک چھوا بھی نہیں ہے اور اس وقت انسان کی ایک نسل ترقی کی اتنی منزلیں طے کریگی کہ گذشتہ چار نسلوں نے مجموعی طور پر بھی اتنی ترقی نہ کی ہوگی۔

وہ نسل ہماری ہی کیوں نہ ہو۔ اور وہ آنے والا وقت ہمارا ہی زمانہ کیوں نہ ہو؟

زمانہ قدیم سے ہم دوسرے طریقوں پر کاربند ہیں۔ ہم اب تک زمانۂ جہالت کے تنازع للبقا کے حیوانی اصول پر عمل کرتے رہے —— لڑائی، جنگ، کشت و خون، بے رحمی اور ظلم و ستم —— لیکن اس کا نتیجہ؟ ہم اپنے چاروں طرف ہر شخص کو مایوسی، پریشانی، بے اطمینانی، ناکامی، اقتصادی تباہی اور اسی قسم کے دوسرے مصائب میں گرفتار پاتے ہیں۔

"ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں؟"

ہم لوگوں کی زندگی ایک تخیل مسلسل کہی جا سکتی ہے۔ اور یہی اس کا ماحصل ہے۔ یعنی جب ہم کسی چیز کا خیال کرتے ہیں تو اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس کا خیال ہی نہیں کرتے تو ہمیں اس کا واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ خیال دنیا کی سب سے بڑی طاقتور شے ہے اور دنیا میں تمام خیر و شر ہماری نیک خیالی یا بد خیالی کا نتیجہ ہیں۔ اور ہم میں سے ہر شخص خیر و شر کے مجموعہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے۔

جب ہمارے خیالات میں نیکی اور سچائی ہوتی ہے تو ہمارا خیال اس کی روشنی سے منور ہو کر انوار الٰہی کا ...

بن جاتا ہے۔ اس وقت ہم اچھے نتائج دیکھتے ہیں۔ اور حقیقی مسرت کامیابی اور صحت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہم اپنے دماغ کو اس طرح تیار نہیں کرتے ہیں، تو ہم کو مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کسی عقلمند آدمی کا قول ہے، "ہم اپنے خیالات ہی کو اپنے مشاہدات کی صورت میں پاتے ہیں۔ اور یہی خیالات بیرونی صورت میں اکثر ہماری زندگی کے تجربوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ہمارا ماحول وہی ہے۔ جو ہم اپنے دماغ میں پیدا کر چکے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے خیالات کچھ ہوں اور تجربات کچھ۔"

خیال ایک ایسی طاقت ہے جس کے رستے میں دنیا کی کوئی طاقت، کوئی حکومت، کوئی شخص اور کوئی شے حائل نہیں ہوسکتی۔ ہماری قوت خیال ریڈیو کی طرح ہے۔ اگر چاہیں تو سوئچ گھما کر اس کو نیکی کی طرف کردیں۔ یا اس کا رخ بدی کی طرف پھیر دیں۔ دنیا میں کوئی شے ہمارے دل میں ناکامی اور پریشانی کا احساس پیدا نہیں کرسکتی۔ تاوقتیکہ ہم خود اسکا خیال نہ کریں۔ جو شے ہمارے دل میں موجود ہوتی ہے وہی حقیقت بنکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اور ہماری زندگی کے تجربات میں داخل ہوجاتی ہے!۔

میری ایک واقف کار قابل عزت خاتون کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ ان دونوں میں آپس میں بے حد محبت تھی اور دونوں باہم بہت خوش تھے۔ جب میں نے چند ماہ بعد اس خاتون کو دیکھا تو میں نے اس میں ایک عجیب اطمینان اور اعتماد پایا جو میرے لئے بھی بصیرت افروز تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کیفیت اس کو کیونکر حاصل ہوئی؟

اس نے جواب دیا، "سمندر کا تمام پانی جہاز پر کبھی اثر انداز نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کو اس میں داخل ہونے کی جگہ نہ مل جائے۔ اسی طرح دنیا کے تمام غم والم انسان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ تاوقتیکہ وہ اس کے دماغ میں جگہ نہ حاصل کریں میں نے اپنے دماغ کو دوسرے اچھے خیالات میں اتنا مشغول رکھا ہے کہ اسمیں رنج اور غم کے پہونچنے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔"

اس خاتون کے اس جواب کے بعد میں نے خود اس اصول سے خوشی حاصل کی ہے۔ اور میں نے اس کو کامیاب پایا۔ بہتری عام عورتوں کی طرح مجھے تنہائی میں اپنے مسائل حیات سے کبھی سابقہ نہیں پڑتا۔ میں جو کچھ کرتی ہوں تمام دنیا کے سامنے۔ میرا پیشہ مجھے اس پر مجبور کرتا ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ میری ذاتی، خانگی اور پیشہ کی زندگی کیا ہے اس لئے میں اکثر بے بنیاد افواہوں غلط الزامات عاجلانہ فیصلوں اور رائے زنیوں کا ہدف بنتی رہتی ہوں!۔

لیکن میں نے اس پر قدرت حاصل کرلی ہے کہ یہ چیزیں میرے دماغ میں نہ پہونچنے پائیں۔ اور مرحلہ زندگی جتنا سخت ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ سخت میری کوشش ہوتی ہے۔ کہ میں فیضان الٰہی کے عنصر کو پاؤں۔ میں لوگوں اور متعلقہ اشیاء میں خدائی عنصر یا فیضان الٰہی کے عنصر کو تلاش کرتی ہوں اور میں اس کا اسی طرح خیال کرتی ہوں جس طرح میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ میرا خیال کریں۔

چند سال ہوئے میں اور مسٹر فیر بنک چین میں ایک پروفیسر اور ان کی بیوی کے مہمان تھے۔ ایک دن پروفیسر
... ہیں چین کا ایک مشہور قدیم دروازہ دکھانے کا وعدہ کیا۔" یہ دروازہ چین کی سب سے زیادہ قدیم اور
... عمارتوں میں سے ہے۔" انہوں نے کہا۔
"... ان کو وہاں نہ پہچانا۔ دروازہ تو واقعی بہت خوبصورت ہے لیکن　　وہاں ایسے گندے اور خراب
... رہتا ہے کہ میں تو اسے دیکھ ہی نہ سکی،" ان کی بیوی نے کہا۔
... دونوں کے نکر رسا کے فرق کو دیکھئے۔ شوہر نے دروازہ کی خوبصورتی اور عظمت کو دیکھا اور بیوی نے
... انسانی گندگی اور غلاظت کو۔
اسی طرح ہماری زندگی میں بھی بعض نہایت حسین عناصر ہیں۔ جن کو ہم نہیں دیکھتے ہم خطرات، مشکلات اور ناخوشگوار
... تخیل میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہم خود کو ان میں گم کر دیتے ہیں۔ یہی ہمارے خیالات پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اور پھر
... تجربات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں!
... آدمی جیسا اپنے دل میں سوچتا ہے۔ وہ ویسا ہی ہے" اگر ہم بھی کوشش کریں تو اس اصول کی صداقت
... ئے گا۔ ممکن ہے کہ ہم اس کو محض ایک دلچسپ تخیل سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ کیا ہم یہ سمجھ رہے ہیں ... اسکے
... کہ اس وقت جو کچھ ہم پر گذر رہا ہے وہ نتیجہ ہے اس کا جو اب تک ہم اپنے دماغ میں لئے رہے ہیں ... جسکے
... سوچتے رہے ہیں؟ اور کیا ہم نہ سمجھ سکتے ہیں کہ کل جو ہم پر گذرنے والا ہے وہ نتیجہ ہو گا۔ اس ... جو
... رہے ہیں؟؟ ہم اپنے خیالات کے نتائج سے کبھی نہیں بچ سکتے کیونکہ ہمارا تعلق بیرونی غیر ضروری
... سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ خود اپنے خیالات سے ہے!
آئیے ہم اپنے دماغوں کی تجربہ گاہوں کا جائزہ لیں۔
... پہلی چیز جس کا خیال ہمارے دماغ میں آتا ہے۔ وہ ہمارا وجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس وجود کا ہمیں
... کیونکر ہوا۔؟
اس لئے ہم اس کے متعلق سوچ سکتے ہیں۔ لیکن جس وقت احساس مٹ جائے گا ہمارا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔
... کے لئے سب سے پہلی چیز قوت خیال ہے۔ . . . . انسان سے اس قوت کو علیحدہ کر دو اور پھر
... بھی نہیں رہتا۔
ہمارا دماغ ہمارے وجود کا احساس رکھتا ہے۔ اور وہی ہماری تعمیر کرتا ہے۔ ہماری قوت خیال ہی وہ شے ہے
... غلاظت سے ہم کو ہر چیز میسر ہوتی ہے۔ اور اب ہر شخص نے تسلیم کر لیا ہے کہ خیال انسان کے قبضہ میں سب سے زیادہ
... طاقتوری عنصر ہے۔ اور یہی وہ عنصر ہے جو زندگی جیسی بیش ترین شے سے ہمارا تعلق قائم رکھتا ہے۔ کیا آپ ہی

بنا پر قوت خیال کو تمام چیزوں پر مقدم نہ سمجھیں گے۔ اور کیا اتنی زبردست، اہم اور ضروری قوت کو جسمانی قویٰ، حالات اور بیرونی اسباب کے ماتحت سمجھنا حماقت نہیں۔؟

زندگی کے اکثر معاملات میں ہماری مثال بعینہ وہی ہے کہ گھوڑے کے سامنے گاڑی رکھ دی جائے۔ یقیناً خیال کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے۔

اور آپ جہاں کہیں بھی رہتے ہوں ——— خواہ آپ کی موجودہ حالت کتنی ہی مایوس کن اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو ——— کم از کم قوت خیال کے تو مالک ہیں۔ اور اگر ایک مرتبہ آپ کے خیالات نے آپ کو تکلیف اور پریشانیوں میں مبتلا کیا ہے تو پھر آپ اس کی مدد سے ان مشکلات اور پریشانیوں سے نکل بھی سکتے ہیں۔ اور آپ کو مشکلات میں پھنسانے والا اور اس سے نکلنے میں مدد کرنے والا بھی آپ کا خیال ہی ہے۔ آپ اپنی دنیائے تخیلات کے آمر مطلق ہیں۔ آپ جو کچھ خیال کرتے ہیں وہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہم خود اپنے تخیل اور اپنے تجربات کے حدود معین کر لیتے ہیں۔

ہم اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی دلفریب کائنات کے متعلق کس قدر کم معلومات رکھتے ہیں۔

سر جیمس جینس نے، جو ایک مشہور عالم سائنسداں ہیں۔ اور انہوں نے علم ہیئت کے متعلق عجیب و غریب انکشافات کئے ہیں۔ ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ کائنات ایک بڑی مشین سے زیادہ ایک عظیم تخیل ہے۔ اور جب ان سے دریافت کیا گیا کہ ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ یہ "کائنات ایک خیال کا نتیجہ ہے۔" تو انہوں نے کہا کہ میں اس کو عملی حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ قیاس کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ تمام کائنات اور اس کی تمام مادی اشیا ——— اجزا لا یتجزیٰ، ستارے اور ستاروں کے مجموعے ——— یہ سب ایک تخیل کی تخلیق ہیں ——— میرے اور آپ کے تخیل کی نہیں بلکہ اس ہمہ گیر وسیع دماغ کی جو ہمارے دماغوں کو متوازن اور ایک دوسرے سے متعلق رکھے ہوئے ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس کا علم مشاہدہ بھی اسی طرف جا رہا ہے۔

اس عالم سائنسداں نے ایک دوسرے موقع پر کہا تھا کہ میرے نقطۂ نظر سے ہر انفرادی شعور و احساس ایک وسیع ترین اور ہمہ گیر عقل و دماغ کا جزو ہے!!۔

اب ماہرین سائنس تخلیق مادہ کی تحقیقات کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مادہ کی تحلیل کرنے کے بعد ایک جزو لا یتجزیٰ ایسا باقی رہ جاتا ہے جو ایتھر سے مرکب ہے۔ یہاں سے اکثر علمائے سائنس تھوڑی دیر کیلئے رک جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے وہ کونسی طاقت ہے جو ایتھر کو ہمارے وجود میں داخل کرتی ہے؟ اور اس عظیم الشان مرتب و منظم نظام کائنات کی اسی ایتھر سے تخلیق کرتی ہے جس میں ہم آباد ہیں؟ ——— ستاروں کو کونسی قوت قائم رکھے ہوئے ہے؟ کون ہے جو ایک معمولی بیج سے شاہ بلوط کا عظیم الجثہ درخت پیدا کر دیتا ہے۔؟ اور سورج کو افق پر ہر روز صبح کو کون نمودار کر دیتا ہے؟؟ آپ اسے جو چاہیں سمجھ لیں لیکن یقیناً عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس نتیجہ پر پہونچیں کہ خدا ہی وہ عظیم الشان ——— تخلیقی مرکزی قوت ہے!!

(باقی آئندہ)

پیام نظیر کے چند غیر مطبوعہ بند

از

جناب حمید تاج محل، اکبر آباد آگرہ

ناظرین ندیم کی نظر سے بہار نمبر میں نظیر کا تذکرہ گذرا ہوگا کہ سید ولی محمد جو آیندہ زندگی میں نظیر کے نام سے مشہور ہوئے سنہ ۱۱۴۸ھ میں عظیم آباد میں جو بہار کا مشہور و معروف شہر ہے پیدا ہوئے[1]۔ یہ زمانہ محمد شاہ کا تھا جسنے در و دیوار کو دولت سے مست بنا دیا تھا۔ عیش و عشرت کی امنگ تھی زبان فارسی کے خاک کے زبان اردو میں اتارے جارہے تھے۔ علوم اور فنون تاریخ فلسفہ ریاضی، کو چہ جاسی طرح آج عام ہے اس بے تکے شعروں میں زبان زدعام نہ تھا۔

تذکرہ نگاروں نے یہی سنہ اور رسال قائد اعظم شمس ولی اللہ تخلص ولی کے عروج کا ثابت کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر نام کے لحاظ سے یہی اولیت کا تاج رکھا گیا۔ جس نے مضامین کو رائج الوقت کی دستکاری سے مینا کاری کی اور جب کشور وجود میں پہونچا تو ایوان مشاعرہ میں اسکا تخت سجایا گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ اردو زبان میں متفرق شعر ہوا کرتے تھے لیکن ولی نے وہ زور بخشا کہ آج ہماری شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اردو میں موجود ہیں۔ شعر کو غزل اور غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا۔ ردیف وار دیوان کے ساتھ رباعی۔ قطعہ۔ مخمس اور مثنوی کا بھی راستہ نکالا۔

یہی کیفیت حاکمانہ نظیر کی ہے۔ انہیں ہندوستان کی نظم میں وہی مرتبہ حاصل ہے۔ جو انگریزی میں چاسر کو فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو۔ لطف یہ ہے کہ انہیں سے کوئی ——— کسی کا شاگرد نہیں۔ حالانکہ ساقی کو چمن چھوڑے صدیاں گذر چکی ہیں۔ مگر نیرنگئ فلک کی وہی رفتار ہے۔ سنہری گیند مشرق سے اسی انداز سے اچھلتی ہے اور مغرب میں روپوش ہوجاتی ہے۔ لاجوردی چادر میں ستارے ٹکے ہوئے ہیں ہر شی سے ایک صنعت صانع الٰہی ہویدا ہے۔

---

[1] ندیم نظیر کا عظیم آباد میں پیدا ہونا انکے والد کا اکبر آباد آنا، نظیر کا اکبر آباد میں شادی کرنا، یہ اور اس قسم کی جتنی روایتیں ہیں جیسا کہ تقا ایکا نے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔ وہ سب خود نظیر کی آل اولاد کی ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ ان بیانات کو تاریخی شواہد کا مرتبہ دینے کیلئے ان کو بہ سلسلۂ سند شائع کیا جائے۔ لائق مقالہ نگار سے گذارش ہے کہ وہ اس موضوع پر ایک مستقل مضمون میں روشنی ڈالیں۔

علم کی توسیع کتب خانوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جہاں ہزاروں مصنف ایک وقت میں زندہ ہوں
تدبیر منزل میں ترقی اور رونق یا آبادی کا کوئی مرکز ہے تو یہی مقام ہے۔ جہاں اہل معاملہ یا ارباب شوق کا مجمع ہوتا ہے یعنی
جہاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مفید لوگ محدود جگہ میں جمع ہو کر تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

دنیا میں کوئی شخص سب کتابیں خرید نہیں سکتا یہ کتب خانوں کی ہی برکت ہے کہ وہاں ہر نسخہ آسانی سے حسب
دلخواہ مل جاتا ہے۔ اور شاید کوئی کتب خانہ ایسا نہ ہوگا جہاں بڑے بڑے مصنف کی برکت شامل نہو خواہ یہ مجموعہ خرید اگیا
یا تبرکاً پیش کیا جا چکا ہے۔ اور ہر شخص کے مطالعہ سے گذر رہا ہے مگر بدنصیب نیظر کی ذات وہ ذات ہے کہ سوائے کلیات
نیظر کے مفصل سوانح عنقا ہیں حقیقت یہ ہے کہ لوگ نیظر کا نام بھی بھول گئے۔

واقعات اور ترتیب نظم یا شاعر کی سوانح عمری کے جمع کرنے کا بھی یہی ایک سبب ہے جس کی یادگار اصولاً ہم
نے قائم کردی فی الواقع مدیر ندیم سید ریاست علی صاحب ندوی مبارکباد کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ جن کے انفاس مسیحی نے
بہار کے نام اور لوگوں کو گمشدگی سے بچا لیا۔ آنے والی نسلوں کو یقین دلانے کے لئے وہ ذخیرہ ترتیب دیا کہ جواب نہیں رکھتا
جس سے بندگان سلف کے تمدن اور وقار کا پتہ چلتا ہے اردو زبان کی عظمت کا سکہ ابھر آیا۔ طائر شہرت نے اسطرح پرواز
کہ اس کیفیت کو بیان کی طاقت اور قلم کی زبان ادا نہیں کر سکتی۔ ؎

نازک حباب سے ہے تو پتھر سے سخت ہے کیا چیز دل پرائے مرے پروردگار ہے

ناظرین ندیم نے گذشتہ اوراق میں مطالعہ کیا ہوگا کہ نظیر نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو قدیم دارالسلطنت اکبرآباد میں پایا۔ جہاں نظم کے جھنڈے میدان صحافت میں گڑے ہوئے تھے۔ خوشبو کی مہک دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ اور نصرت یار خاں صوبہ دار حکومت پر متمکن تھا۔ ملا۔ زاہد، شرف الدین مضمون، شیخ احسان اللہ، میر تقی، شاہ مبارک وغیرہ اپنے مقام کو خیرباد کہکر دہلے آباد کر چکے تھے۔

نظیر کے والد بزرگوار سید محمد فاروق چونکہ نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ کے یہاں بیاہے گئے تھے مصاحبت سے علیحدہ ہوکر محلہ نوری دروازے میں مقیم ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شرفاء اکبرآباد سے مشہور رہوئے۔ اور اس زمین کے پیوند خاک ہوئے۔

نظیر کی شادی بھی چغتائی خاندان میں ہوئی جس کا سلسلہ نسب حبیب شاہ واحمد شاہ قوم چغتائی ساکن و رئیس ملک تبت پسر ملک محمد جان سے ملتا ہے۔ جو شاہجہاں بادشاہ کی تحریر اور رقعہ کے ذریعہ صوبہ کشمیر کو بعد جنگ فتح کرکے دربار شاہجہانی میں حاضر ہوکر وزیر صوبہ دارالسلطنت مقرر ہوئے اور قصبہ تاجگنج محلہ گلی ملکہ میں سکونت پذیر رہے۔

میدان مجالس میں کسے انکار ہوسکتا ہے کہ تہذیب شاہ عالم تمدن محمد شاہی اور معاشرت فرنگستانی کے حلقوں میں نظم کے لکھنے اور پڑھنے پڑھانے کا جدید رنگ ڈھل چکا ہے۔ اس سے ایک قسم کی کیفیت ضرور پیدا ہوجاتی ہے۔ طلسم جو باندھا جاتا ہے، رلانے ہنسانے یا حیرت میں ڈالدینے کا منظر پیدا کر دیتا ہے مگر جس کا نام تاریخ اور وسعت معلومات ہے اس سے دور اور بہت دور دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شہادت کلام نظیر میں ملتی ہے۔

جس طرح رنگ، لباس، مذاق، بذات خود مایہ امتیاز ہے۔ میاں نظیر کی زندگی کا ہر پہلو اس سے مالامال ہے ادا میں بیش بیش اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔۔۔۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؂

رخ پری چشم پری زلف پری اس پری — کیوں نہ اب نام خدا ہو تیرے قربان پری
جھمکے جھمکے وہ ثریا کے کرن پھول وہ پھول — بندے بالے پری موتی پری اور کان پری
رشک خورشید جبیں ابر سیہ سی بیٹی — ہر چوٹی کی غضب زلف پریشان پری
حسن گلزار قمر شکل صراحی گردن — مہ جبیں ...... زغن چاہ زنخدان پری
مارِ غمزہ کی بلا تیر نگہ .... — تیغ ابرو کی ستم ترکش مژگان پری
مسکرانے کی ادا جیسے چمک بجلی کی — آن ہنسنے کی قیامت لب و دندان پری
آنکھ مستی بھری شوخ نگاہیں چنچل — قہر کاجل کی گھچاوٹ مستی و دبان پری
جبینی اور نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے — .... گو ہر غلطان پری

چاندسی جگنو بھی ستاروں کی مثال — عطرداں طرفہ وہ توڑے بھی درخشاں پری
چاک سینہ کا غضب صاف بدن موتی سا — انگیا تصویر سی کرتی کا گریباں پری
پشت گلبرگ شکم سیم کمر تار نگاہ — ساق بلور گلاوٹ میں ہر اک آن پری
گھیر اپشواز کا وہ جس کی کناری...... — چال آفت کی نشاں جنبش داماں پری

کیا کہوں اس کے سراپا کی میں تعریف نظیر

قد پری........ اور شاں پری

اس سراپا کو محمد شاہ کی نظروں سے پڑھیئے دلگداز انداز سے جذبات اور فکر ایجاد کی محویت نے ایسا گرویدہ بنا دیا ہے کہ ہر بول نوک قلم سے نکلکر دلوں کو گدگداتا ہے۔ نکتہ چینی کرنے والے اسے بھی اچھوتا نہ چھوڑیں گے۔ یہ ایک ایسا آسان شئے خود نمائیوں کے لئے میدان صفحات میں جمع ہوئی ہے۔ کہ جو چاہا لکھدیا مگر اس عہد کی دلبستگیوں پر نظر ڈالنا مشکل اور بہت مشکل کام ہے۔ اس کا جمع کرنا اور پھر اپنے خیالوں سے زبان روزمرہ کو زینت دینا لڑکوں کا کھیل نہیں۔ لفظوں کو ترتیب دینا آسان نہیں۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ نظیر کی دنیا ایک علیحدہ اور کروفر کی دنیا ہے اس کی تشریح اس کا کلام ہے دنیا کی بے وفائیوں کا گلہ نظیر کی قبر سے دریافت کیجئے۔ جہاں ہم جب کبھی زیارت کو جاتے ہیں تو مدھم سروں میں یہ آواز آتی ہے سہ

اپنی فریاد کا بگڑا ہوا اک تار ہوں میں — قلب مایوس کی بیٹھی ہوئی آواز ہوں میں
مجکو ہستی کے حجابوں نے چھپا رکھا ہے — ورنہ دراصل حقیقت کا بڑا راز ہوں میں

مختصر طور پر اتنا ہے فسانہ میرا
پہلے تو جلوہ تھا اب جلوہ گہہ ناز ہوں میں

زاں بعد پھر سلسلہ مثنوی کا شروع کرتا ہوں تاکہ تنوع مذاق قائم رہے۔ زندگی باقی ہے تو کبھی کچھ اور ہنوز ست پیش ہوگا۔

کشش شوق ہے اس عشق کا نام سے جدا — جدت ہر شئے میں کیا حق نے اسی سے پیدا
آشکارا ہے اسی سے کشش کا ہ ربا! — سو جگہ اسنے دل سنگ کو ہے موم کیا

کل اسی سے کسی — وہ آفت ہے
چھوڑتا عشق کسی کو نہیں وہ آفت ہے

کس مصیبت میں گرفتار ہے جان غمگیں — کسی صورت ہمیں ہوتی نہیں دم بھر تسکیں
حسن اور عشق سے بھی دشمن جاں ہو گئے ہیں — ایک ہے جان دونوں سے بچھڑ گئے ہیں

کر رہے ہیں دل بالا میں یہ آفت برپا
صحبت شعلہ و حسن سے ہے قیامت برپا

حسن خلقت میں اگر نور ہے تو عشق ہے نار — سوز دونوں میں ہے شک اس میں نہیں ہے زنہار
گرم ان دونوں کی گرمی کا بہت ہے بازار — ایسے دونوں نے جگر پھونکے ہیں بیحد و شمار
شعلہ انگیز ہیں یہ شعبدہ پرواز ہیں یہ
خرمن صبر کو برق شرر انداز ہیں یہ

ان کی خلقت میں قیامت کی شرر خیزی ہے — ان کی آتش کی ہر اک دل میں بڑی تیزی ہے
ہر جگہ ان کی نئی اک شرر انگیزی ہے — سامنے ان کے ہر آتش کی بڑی تیزی ہے
کچھ نئے ڈھنگ کی گرمی یہ دکھا دیتے ہیں
جگر و دل بھی یہ بے آگ جلا دیتے ہیں

حسن اور عشق میں یہ دست و گریباں دونوں — ہر جگہ ہیں یہ نئے سلسلہ جنباں دونوں
فتنہ پرداز ہیں غارت گر ایماں دونوں — پھونک دیتے ہیں یہی آتش پنہاں دونوں
ڈھنگ نئے ڈھنگ زمانے میں عجب ہوتے ہیں
ایسے نیرنگ زمانے میں عجب ہوتے ہیں

حسن ہے باغ تو یہ عشق ہیں اس میں گلچیں — گل کی مانند شگفتہ ہیں ہزاروں میں حسین
ہے تماشہ کہ نئی طرح ہے سب کی تزئین — لالہ ہے کوئی خوش آیند کوئی ہے نسرین
رنگ سو طرح کے ہیں وضع ہزار ان کی ہے
چشم بد دور کہ کیا خوب بہار ان کی ہے

جس کو سب کہتے ہیں عالم میں خزاں اور بہار — ہجر اور وصل ہے وہ اس میں نہیں شک زنہار
جس طرح پھولوں کے ہیں ساتھ گلستاں میں خار — یوں ہی گلفاموں کے ہیں گرد ہزاروں اغیار
باغ میں پھولوں سے اقرار صبا صادق ہے
یاں ہوائے نفس سرد دل عاشق ہے

یا الٰہی رہے سرسبز ہمیشہ یہ چمن — حسن کا صرف خزاں ہو نہ کبھی یہ گلشن
ہو کسی طرح سے دل تنگ نہ اک غنچہ دہن — رشک گل وہ ہیں کہ پھولوں سے بھی نازک ہیں بدن

مثلِ گل کوئی گل اندام نہ پژمردہ ہو
یا دغم سے دلِ عشاق نہ افسردہ ہو

تیری قدرت کے تماشے ہیں یہ اے ربِ کریم ۔۔۔ حسن اور عشق کی ہر جا یہ نئی ہے تقسیم
چشم خونبار کہیں ہے تو کہیں ہے دل ۔ ۔ ۔ ۔ ایک یہ عشق ہے سو رنگ ہے ہر دیس مقیم
نئی صورت کے سنے ہمنے فسانے ہر جا
دل بنے تیرِ ملامت کے نشانے ہر جا

سمجھینگے ان کو وہی جن کو کہ ہے فہم و ذکا ۔۔۔ عشق کے واسطے دل سینۂ عاشق میں بنا
چشم اسواسطے ہے حسن کا دیکھے جلوہ ۔۔۔ اس لئے گوش ہیں معشوق کی آتی ہے صدا
دست عاشق ہیں اس زلف کے سلجھانیکو
پاؤں ہیں کوچۂ محبوب تلک جانے کو

عشق کو یہ نہ سمجھتے تھے ستم توڑیگا ۔۔۔ نوجوانی میں یہ جیتا نہ ہمیں چھوڑے گا
کیا خبر تھی صفت آبلہ دل توڑے گا ۔۔۔ جوڑ یہ تفرقہ انداز بہت جوڑے گا
لاکھ جا دل کو نئے دام میں الجھائیگا
چشم عاشق کو نئے پیچ یہ دکھلائیگا

عشق وہ ہے کہ ہر اک دل میں جگہ اسکی ہے ۔۔۔ کیمیا سے بھی سوا قدر اس حسن کی ہے
جان اس ظلم ناوک سے بچے کسکی ہے ۔۔۔ مٹ گیا اس کا نشان تاک لے جسکی ہے
گھاٹ سے موت کے کیا پار اوتارا اسنے
جیتے جی سینکڑوں کو پار اوتارا اسنے

بزم نظر کے خیال میں حسن اور عشق کا سراپا ایک سو بیس برس قبل جو نظر نے کھینچا ہے ایک رومان پیدا کر رہا ہے۔ عشق کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے حسن کے غیر فانی ہونے کا ثبوت لطف سے لبریز ہے۔ خدا قوم سے اس کی ہمیشگی کی درخواست عجیب و غریب نگارش ہے۔

اقتباسات

دنیائے اردو جنگ عظیم کے بعد

از

جناب ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ صاحب ایم، اے، ڈی لٹ

(۲)

سید سلیمان ندوی مولانا سید سلیمان نے سیکڑوں مضامین کے ذریعے اسلام کے تمدنی اور عقلی پہلوؤں کی فوقیت پر بحث کی ہے۔ وہ اپنے استاد شبلی کی طرح مغرب کے سارے نظام علمی و تمدنی کے مخالف ہیں اور بقول شیخ محمد اکرام وہ اس مخالفت کے اظہار کا کوئی موقعہ ضائع نہیں ہونے دیتے تحریک خلافت کے دوران میں مسئلہ خلافت کی مذہبی اہمیت پر بہت عالمانہ تحقیق و تدقیق ہوئی۔ اس لئے کہ مسلمانان ہند اپنی موجودہ سیاسی زندگی میں اس حادثے سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوئے اس علمی اور قلمی کوشش میں مولانا سید سلیمان، مولانا عبد السلام ندوی۔ ابو الحسنات ندوی اور بعض دوسرے حضرات نے بھی شرکت کی۔ اور مولانا ابو الکلام آزاد (جو دار المصنفین کے حلقہ سے الگ ہیں) نے اپنے خطبہ صدارت میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی۔ اس تجزیہ و تحلیل کا ایک غیر محسوس اثر مسلمانوں کے ذہن پر پڑا کہ انہوں نے پہلی دفعہ خلافت کے اصول اور موجودہ جمہوریت کے تقابل کی بحث بنیاد ڈالی چنانچہ جب خود ترکی نے خلافت کو منسوخ کر دیا تو مسلمانان ہند اس تلخ مگر سچی حقیقت سے روشناس ہو گئے کہ اب انہیں ہندوستان کے وطنی مسائل میں دلچسپی لینی چاہیئے۔

مذہب اور عقلیات میں مولانا عبد الماجد اور مولانا عبد الباری کے مضامین خاص طور پہ قابل توجہ ہیں پرسٹہ کا کانسور انہ مسلمانوں کے فکر کے بہت نزدیک ہے۔ اس کے مکالمات کا ترجمہ ہوا۔ مولانا عبد الباری[۲] مذہب اور عقل کی تدید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ریل کی دو گاڑیاں ٹکرا سکتی ہیں۔ اور ٹکراتی ہیں۔ لیکن ریل گاڑی اور جہاز میں تصادم ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ریل سمندر میں چل ہی نہیں سکتی۔ اور نہ جہاز خشکی پر" مولانا شبلی نے شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے فلسفۂ سیاست کی طرف خاص توجہ کی تھی اس کے زیر اثر حجۃ اللہ البالغہ کی جانب خاص توجہ ہونے لگی چنانچہ اب

---

۱ موج کوثر　　۲ رسالہ معارف اعظم گڑھ فروری سنہ ۱۹۲ء

شاہ صاحب کے متعلق رسائل کے خاص نمبر نکل رہے ہیں۔

اس دور میں قرآن مجید کے مطالعہ کی طرف بہت میلان پیدا ہوا چنانچہ ارض القرآن کے نام سے سید سلیمان صاحب نے ایک کتاب لکھی جس میں قرآن مجید کے جغرافیہ سے بحث کی ہے۔[۱] معلومات جدیدہ کی روشنی میں اگر اس کتاب کے بعض واقعات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم کے مطالعہ کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔

مولانا ابوالکلام

مولانا ابوالکلام اگرچہ دار المصنفین سے متعلق نہیں۔ لیکن وہ مولانا شبلی کے سرچشمۂ افکار سے بہت سیراب ہوئے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ شبلی کی طرح سرسید کے اثرات کی مخالفت ہے۔ "سرسید سے ان کے اختلافات صرف مذہب اور سیاسیات تک ہی حاوی نہ تھے۔ بلکہ علی گڑھ تحریک کے قریب قریب ہر پہلو پر حاوی تھے"۔[۲]

مولانا ابوالکلام کی شخصیت، آپ کا تبحر، آپ کی مقناطیسی کشش، آپ کی تحریر و تقریر، آپ کا ذوق، آپ کا اعلیٰ ذوق، غرض آپ کی جامع قابلیت نے بہت جلد آپ کے اثر کو نمایاں کر دیا۔ شبلی ایک مصنف تھے، ان کا وقت بیشتر تدوین و تصنیف میں گذرا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے جریدہ نویسی اور صحافت کی ہمہ گیر اور موثر فن سے اعتصام [illegible] یہی وجہ ہے کہ علیگڈھ پر جو حملہ انہوں نے کیا وہ شبلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہلاکت آفریں تھا۔ اگرچہ علماء اسلام پر مولانا ابوالکلام کا اثر زیادہ نمایاں معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ علما کے نزدیک زہد و تقویٰ کا جو معیار ہے اس پر مولانا ابوالکلام پورے نہیں اترتے۔ تاہم مولانا کی علمیت اور فلسفیانہ شان سے بڑے سے بڑے علما بھی مرعوب ہیں۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک موقعہ پر ان کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "ان سطروں کے لکھتے وقت ہم کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی یا امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔"[۳]

مولانا ابوالکلام احیائے مشرقیت کی تحریک کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ الہلال و البلاغ کے ذریعہ آپ نے اپنا پیغام جدید تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچایا۔ اور اس میں بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ آپ کا انشا آپ کی عظیم الشان شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ علامہ اقبال اور مرزا غالب کی طرح آپ بھی اپنے بلند اور عالی خیالات کو زبان میں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ شاید خیالات بلند سے زیادہ ان کا فراوان خلوص اور بے پایاں جوش عام اور محدود الفاظ کے پیمانہ میں نہیں سما سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس طرز تحریر نے اردو زبان کی سلاست کو بہت نقصان پہنچایا

---

[۱] قرآن مجید پر جو کتابیں ان دنوں اس عہد میں لکھی گئی ہیں۔ یہ ہیں مولانا عبدالحی فاروقی کی کتابیں کشف الہدیٰ از سیٹھ یعقوب حسن، مقا[illegible] از مولانا ممتاز علی، ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد۔ بیان اللسان از مولانا احمد امرتسری۔ [۲] موج کوثر ص ۱۵۴،

[۳] معارف مارچ سنہ ۱۹۱۹ء مضمون "ہمارے موجودہ نظر بندان اسلام"۔ [۴] سکسینہ: تاریخ ادب اردو۔

لانا اس معاملے میں مجبور تھے۔ آپ کے قلب میں جو طوفان امنڈ رہا تھا۔ وہ قیود اور رسوم کی پابندیوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔
آپ کا علمی کارنامۂ حیات کیا ہے؟ آپ نے جدید علم کلام کی تردید و اصلاح کی اور مغربیت کے طلسم کو پاش پاش
ہوئے خود اعتمادی کے جذبات کو بلند کیا[۳] قرآن مجید کا غائر مطالعہ کیا اور لوگوں میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کیا۔ آپ شبلی
پہلے مصنف ہیں۔ جنہوں نے تصانیف مذہبی کا معیار بلند کرتے ہوئے جدید علمی اصولوں سے بلا تکلف اپنے تصورات
ضاحت میں مدد لی۔

ن القرآن | آپ کی سب سے بڑی تصنیف ترجمان القرآن ہے۔ جو کئی بار زندانوں کی چہار دیواری میں جبری تنہائی کی فرصتوں میں لکھی گئی۔ اور خانہ تلاشیوں اور اسیری کے مواقع پر ضائع ہوتی رہی ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

بالآخر لوگوں کے اصرار سے آپ نے دوبارہ اپنی یادداشتوں کو قلمبند کیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں ترجمان کی پہلی جلد شائع ہو کر لوگوں کے سامنے آگئی ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر مے خواست　　آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

ترجمان القرآن دور حاضر کے ایک عظیم الشان مفکر اور مفسر کا کارنامہ ہے۔ اس میں قرآن حکیم کے ان معارف کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ جن کی موجودہ زمانے کو نہایت ضرورت تھی۔ کچھ مدت سے مسلمانوں میں شدت سے عقائد پرستی آچلی تھی۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ قوم کو نیک عملی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ جو قرآن مجید کا اہم موضوع ہے محض نیک عقیدہ اچھے نتائج نہیں پیدا کر سکتا بلکہ اچھے عقیدہ کا نتیجہ حسن عمل ہونا چاہیئے۔ اگر یہ نہ ہو تو قرآن کی رو سے وہ عقیدہ کھوکھلا ہے۔ مولانا ابو الکلام نے جس طرح نیک عملی کی تلقین و ہدایت کی ہے، اسی طرح قرآن حکیم کو عالمگیر انسانیت کا پیغام بردار بھی ثابت کیا ہے۔ "غور کرو۔ مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن کے لئے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھلکر نکلے گا۔ وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ ان دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی، خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی دوسری یہ کہ وہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوت کی اصل روح یہی ہے۔" [۱]

مولانا نے وحدتِ دین اور عالمگیر انسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے اس پر بعض معترضین[۲] نے اعتراضات بھی کئے لیکن دراصل اس وقت "انسانی وحدت" کی جو تحریک دنیا میں چل رہی ہے۔ اس کا پہلا علمبردار قرآن حکیم ہے، لہذا

---

[۱] ترجمان القرآن ص ۱۷۷، [۲] تنقید از غلام احمد پرویز (معارف جنوری ۱۹۳۳ء و مابعد)

اس کی توضیح نہ کرنا بہت بڑی فروگذاشت ہوتی۔ ہندوستان میں نئی قومیت سے اتحاد و تعاون کی خواہش بھی ترجمان کے اوراق میں منعکس ہو رہی ہے۔ جو اس شور و غوغا کی اصل وجہ معلوم ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ترجمان کے مداحوں اور مخالفوں نے ابھی تک ٹھنڈے دل سے اس کے مطالب پر غور نہیں کیا ہے۔ امید ہے کہ جب خاموش اور خالی از جذبات فضا میں اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو یہ تفسیر ایک عظیم الشان تصوّر کی طرح بہت سے نئے اثرات پیدا کرے گی۔

ترجمان القرآن کا اسٹائل[1] الہلال کے مقابلہ میں سلیس ہے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب عمر کے ڈھل جانے سے جوش کے طوفان میں بھی کمی واقع ہوگئی ہے۔ یا پھر اس کے لئے قرآن مجید کا حظیرۂ قدس اس آزادخرامی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

عرفی مشتاب این رہ نعت است نہ صحراست ہشیار کہ رہ بردم تیغ است قدم را (عرفی)

مولانا ابوالکلام کا سٹائل عظمت اور شان و شوکت کے اعتبار سے ابوالفضل سے مشابہ ہے، ان کے جذبات کا سیل رواں جب امنڈتا ہے تو راستے کے نشیب و فراز سے بے پروا ہوکر کوہ و دمن سے گذر جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "ان کی تحریروں میں روشنی تو ہے لیکن حرارت نہیں" مولانا کا بنیادی کام احیائے مذہب تھا۔ اصلاح اخلاق یا تلقین صفائے نفس نہ تھا۔[2] انھوں نے قوم میں بیداری، جرأت اور ہمت کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے لیکن تیقن اور صلحا کا رنگ پیدا نہیں کیا۔ مولانا اس باعمل جرنیل سے مشابہ ہیں۔ جس نے ساری عمر جنگ میں سپاہیوں کے عزم اور جوش کو مشتعل کرنے میں بسر کی ہو۔ اور یہی وہ مجاہدانہ عزیمت ہے جو انہیں حجرہ نشیں علماء سے ممتاز کرتی ہے۔ جن کی زندگی اس جنگ آزما بہادر کے دل کی دھڑکن سے ناآشنا ہے۔ جس کا ہر لمحہ ہنگاموں میں گذرتا اور طوفانوں میں بسر ہوتا ہے۔

---

[1] شیخ محمد اکرم صاحب نے مولانا کے اسٹائل پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن درحقیقت ہر شخص کا اسٹائل اسکی شخصیت اسکے ماحول اور اس کے نصب العین پر موقوف ہوتا ہے۔ سرسید کی زندگی اس لحاظ سے پرسکون تھی کہ وہ مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے اور تعمیر کے لئے ذہن کو تیار کر رہے تھے لیکن مولانا کا کام جوش پیدا کرنا تھا۔ مولانا ظفر علی کے اسٹائل پر آزاد کا اثر ضرور ہے اسکی وجہ بھی یہی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی جو نصب العین اپنے سامنے رکھا اسکی وجہ سے انکی زبان مشکل ہے۔ مزید یہ کہ مولانا اردو میں گہری اسلامیت اور عربیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہ خیال کہ محض اس طرز تحریر سے اردو اسلامی زبان ہوکر رہ گئی صحیح نہیں ایک زمانہ تھا جب ہندو فارسی عربی کے عالم ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب انقلاب حالات نے ان میں سیاسی بیداری پیدا کردی ہے۔ جس کی بناپر وہ ہندی کے حامی ہیں۔ اور اگر آپ اپنی زبان کو خالص ہندی بھی بناکر پیش کریں گے۔ تب بھی ہندو اردو کو اپنی زبان نہیں کہیں گے۔

[2] موج کوثر ص ۱۶۲ تا ۱۶۶،

[3] ندیم، معارف کے مضامین جو کچھ تھا۔ اگر اظہار رائے کرنے کے بجائے ان کی طرف بھی اشارت کرتے تو بہتر ہوتا۔

یہ بات کسی حد تک دکھ کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔ کہ مولانا کی بلند شخصیت اور نادر ہستی سے علم وفضل کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ سیاسیات وطنی کی الجھنوں کی نذر ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نے وطن اور ملت کے مفاد کیلئے اپنی عمر گرانمایہ کو وقف کر دیا ہے۔ اور اپنی بے مثال یکرنگی اور بے نظیر ثابت قدمی سے خلوص اور پختگی کا سکّہ بھی بٹھا دیا ہے۔ لیکن رونا تو یہ ہے کہ وہ شخص جو اس دور کا شاہ ولی اللہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یا جسے ہم ثانی ابن تیمیہ کہہ سکتے تھے۔ علمی لحاظ سے قوم کے لئے اتنا مفید ثابت نہ ہو سکا۔ باقی رہی سیاست سو اس کا رخ بھی مخالف ہواؤں کی طرف ہے۔ اور مولانا تاریک رات میں مہیب طوفانی سمندر کی کسی کشتی کے ایسے ناخدا سے مشابہ ہیں۔ جس نے اہل کشتی کی رائے کے خلاف صرف اپنی بصیرت کے اعتماد پر بادبانوں کو کھول رکھا ہو ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

علامہ اقبال

مولانا ابو الکلام کی طرح اقبال بھی اتحاد اسلام دور کے ماحول میں سوچنے اور لکھنے لگے۔ آپ کے خیالات اور تصورات کا ارتقا یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ آپ عصری تحریکوں سے پورے پورے متاثر ہوتے رہے۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر اتحاد اسلام دور کے آغاز تک آپ نے حُبّ وطن کے گیت گائے۔ ۱۹۱۱ء سے لے کر تحریک خلافت تک اپنے اتحاد اسلام تحریک کی ترجمانی کی۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۳ء تک آپ نے تحریک خلافت کا ساتھ دیا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد آپ نے یورپ کی نیشنلزم کے خلاف ایک زبردست ردّعمل محسوس کیا جس کے بعد آپ نے ایک عالمگیر نظام کے امکانات پر غور کیا۔ سرمایہ اور مزدور کی کشاکش میں آپ نے مزدور کی حمایت کی اور ۱۹۳۱ء میں آپ نے مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں ایک نیا گھر بسانے کا تخیل پیدا کیا اور آخری وقت تک اس خیال پر قائم رہے۔

لیکن ارتقائی تغیرات کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال کا فکر ہمیشہ مغربیت کے خلاف ردّعمل کا ایک زبردست مظہر رہا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں "شمع و شاعر" میں آپ نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی پھر دکاں تیری ہے بھر پر صلائے نا و نوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اس زمانے سے لے کر وفات تک اقبال نے مغرب کے خلاف جنگ کو جاری رکھا۔ شروع شروع میں یہ محض منفیانہ حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جذبۂ پیکار ایک تعمیری تصور میں مبدل ہوگیا۔ انہوں نے دنیا کے لئے ایک پُرامن اور مقدس نظام کا خاکہ تجویز کیا۔ جس میں خالص اسلامی فکر سے تصوراتی رنگ بھرے۔ سب سے پہلے انسان کامل کی نشوونما۔ پھر ایک اعلیٰ اور مثالی سوسائٹی کی تشکیل۔ اقبال کے فکر کے دو اہم اجزا ہیں۔ یہ افلاطون کی جمہوریت سے مختلف، سر ٹامس مور کے جنت الحمقا (　　　) سے زیادہ عملی۔ ابراہیم الجیلی کے خیالی "الانسان الکامل"

سے بلند تر اور نطشے کے مافوق الانسان سے زیادہ روحانی شخصیت کا تصور تھا۔

اقبال کی سب سے بڑی خوبی یا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ مسلمان، رہنے پر مجبور تھا۔ اس کے تصور کی ہی عمارت فکر اسلامی کے اینٹ چونے گارے سے تعمیر ہوئی وہ آئیڈیل سوسائٹی، کے لیے بھی (مسلمانی نہیں) اسلامی اصولوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ کہ دنیا کا کوئی اعلیٰ نظام، اسلامی تصور معاش و معاد کو جذب کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اقبال نے اسلام کے متعلق اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود مسلمانوں کو توحید و رسالت میں پختہ اعتقاد رکھنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد قرآن مجید کے مطالعہ پر اصرار کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک اسی کتاب فطرت میں زندگی اور موت کے سارے اسرار درج ہیں۔

اقبال کا فلسفۂ خودی خود شناسی کا ہدایت نامہ ہے۔ اقبال کی رجائیت مردہ اقوام کے لئے پیام حیات ہے۔ اقبال کی آفلیت دشمنی عشق کا سوز یقین پیدا کرتی ہے۔ اقبال کا عقیدہ، قوت، غلامی کی رگوں کو کاٹنے والا ہے۔

اقبال پر یورپ کا اثر کہاں تک ہوا؟ اس کا جواب دیتے وقت لوگوں نے عجیب عجیب ستم ظریفیاں کی ہیں۔ بعض اقبالسٹ، اس بات پر مصر ہیں کہ اقبال نے یورپ کے افکار سے بالکل اثر قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ چیز عظمت کے منافی ہے۔ لیکن راقم الحروف کو اس خیال سے اتفاق نہیں۔ اقبال یورپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے بعض افکار کو اپنے فلسفہ میں جذب کیا۔ اور بعض سے ردّعمل کے طور پر کوئی سلبی رائے قائم کی البتہ اس حد تک درست ہے کہ اقبال یورپ کے افکار کو اسلامیات کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور مقابلہ و تقابل کے بعد اپنا اجتہاد کرتے ہیں۔ جو سر سید وغیرہ کے اجتہاد سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ ان کا اجتہاد تقلیدی اجتہاد تھا[1] آپ نے برگساں کے Intuition کی بحثوں کا بغور مطالعہ کیا اور کانٹ کے Critique of Pure Reason پر تنقید کی۔ نطشے کے افکار کی مدح کی اور براؤننگ کے پرامید کلام سے حظ اٹھایا اور رچر گوئٹے کے تصوف اور شرق پسندی کی بھی تعریف کی غرض یورپ کے فلسفہ کے گہرے مطالعہ کے بعد اس کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہونا بڑائی اور عظمت کے منافی نہیں اس لئے کہ اس سے اقبال کی مشرقیت کے احساس برتری کو بالکل صدمہ نہیں پہنچا۔ بلکہ درحقیقت ان مغربی فلسفیوں سے اقبال نے صرف وہی تصورات لئے جو ان کی مشرقیت کے لئے قابل قبول تھے۔

اقبال کا فکر جدید و قدیم کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ انہوں نے اسلامی عقاید کے بعض Orthodox پہلوؤں کی زبردست حمایت کی ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے وقت کے ساتھ ان کے تعلقات عموماً خوشگوار رہے۔

---

[1] موج کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۱۸۱ +

دراصل بقول شیخ محمد اکرام[۱] وہ اس بحث میں ہی نہ پڑنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ ایک مومن کو زمان و مکان کی پابندیوں سے بلند ہو جانا چاہیئے ؎

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اقبال شاعر تھے لیکن اب ان کو محض شاعر سمجھنا دیانت اور حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ صرف شاعری ان کے لئے عیب ہے۔ آپ کو احیائے اسلام کی تحریک کا رہنما خیال کرنا چاہیئے۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی تعریف ہے۔[۲]

عنایت اللہ خاں المشرقی

شبلی۔ ابو الکلام، اقبال اور سید سلیمان نے سر سید کی تحریک کے خلاف جو جہاد کیا اس کے بعد یہ خیال میں نہ آسکتا تھا کہ عقل پسندی، مادیت اور مغربی تصور زندگی پر قائم کی ہوئی کوئی مذہبی تحریک پھر سے ظہور میں آسکے گی۔ لیکن ملک میں جدید قسم کی تعلیم و تربیت کا نظام پھیلتا گیا اور کالجوں کے ایوانوں سے یورپ کے تصورات سے لبریز ذہن اس کثرت سے نکلنے لگے کہ یہ قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا تھا کہ جدید انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں کوئی ایسا شخص نہ پیدا ہوگا۔ جو سر سید کی عقلیت اور مادیت کی تحریک کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو از سر نو جوڑ سکے گا۔

۱۹۱۷ء میں نواب وقار الملک کے انتقال پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید سلیمان نے یوں لکھا تھا[۳] "یہ ہستی گرامی جس نے ہماری دنیا کو ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا۔ ہمارے کاروان قافلہ کا آخری مسافر تھا۔ اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ . . . . آئندہ ہماری قسمت کے مالک مغربی مدارس کے تعلیم یافتہ ہوں گے۔ بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ اور جیٹے ہوں گے۔ اب مشرق کی قومیت پر حکومت نہ کرے گا۔ بلکہ مغرب . . . لیڈری اور رہبری جمہور کے لئے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ ایک کامیاب عہدہ اور . . . ایک پیشگوئی تھی۔ بلکہ ایک چیلنج تھا۔ جو مشرقی مشرقیوں کی طرف سے مغربی مشرقیوں کی طرف پھینکا گیا تھا۔ اور . . . اس توقع کے ساتھ کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا) لیکن آخر یہ پیشگوئی پوری ہو کر رہی اور ۱۹۲۴ء میں عنایت اللہ خاں المشرقی نے ایک کتاب "تذکرہ" کے نام سے شائع کی جس میں قرآن حکیم کو مغربی تصورات کی عینک سے دیکھنے کی تازہ کوشش ظہور میں آئی۔ تذکرہ کا نمایاں امتیاز جو سر سید احمد خاں کے فکر سے اس کو جدا کرتا ہے۔ یہ ہے کہ اس میں ایک شدید قسم کی جارحانہ اسلامی سوسائٹی کا نظریہ زندہ کیا گیا ہے۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور سر سید دونوں بزرگ پر امن اور اعتدال پسندانہ اسلامی زندگی کے مبلغ تھے۔ اور جہاد کے تشدد آمیز خیال سے ان کو سخت مخالفت تھی۔ لیکن مشرقی صاحب اس معاملے میں ان دونوں کی پوری پوری ضد ہیں۔

---

[۱] موج کوثر از شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس، ص ۱۰۱، [۲] آگے چل کر ان کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا جائے گا، [۳] معارف۔ فروری ۱۹۱۷ء

۱۹۲۳ء میں تحریک ترک موالات ناکام ہو کر معدوم ہو گئی۔ ملکی سیاسیات میں فرقہ پرستانہ ذہنیت کچھ
ں انداز میں پیدا ہو گئی کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی جداہستی کے بچاؤ اور حفاظت کی تدابیر میں منہمک ہو گئے اور اگرچہ مولانا محمد علی
غیرہ ابھی تک کانگرسی سیاسیات کے زبردست مؤید تھے۔ لیکن قوموں کے دل ایک دوسرے سے اس طرح پھر گئے تھے
ان کو پھر سے پیوند دینا معجزہ سے کم نہ تھا۔

تذکرہ

ان حالات میں تذکرہ عوام الناس کے سامنے پیش ہوا۔ خالص اسلامی حکومت کا تصور اس کا طرۂ امتیاز تھا جس کے
قیام کے لئے عسکری تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ قوت اور کشمکش (تنازع للبقا) کا ڈارونی تخیل قرآن مجید
ے بین السطور سے نکالا گیا۔ اور ایک "قسم کی عسکری جارحانہ اسلامیت" کی نشوونما کے لئے قرآنی احکام سے استدلال کیا گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ تذکرہ میں اس "اسلامیت" کے باوجود (قولاً نہیں بلکہ عملاً") اقبال کی پیدا کی ہوئی مشرقیت
ا بے حد مخالفت موجود ہے۔ جسے درحقیقت سرسید کی تحریک احیائے مغربیت کے مرادف خیال کرنا چاہئے۔ سرسید
یم اسلامی نظام تعلیم کی پیداوار تھے۔ اور ان کے ذہن کا پس منظر ہر حالت میں اسلامی تھا۔ لیکن المشرقی کا ذہن مغربی ماحول
ا پرورش یافتہ ہے۔ جس میں علوم اسلامیہ کی اسپرٹ سے کافی ناواقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان کا مطمح نظر اسلام
ے ماضی کے بارے میں اتنا وسیع نہیں۔ جتنا قرآن مجید پر قلم اٹھانے والے کے لئے ضروری ہونا چاہئے۔

تذکرہ پر علماء کی جانب سے کافی لے دے ہوئی[1]۔ چونکہ قوم پر شبلی اور اقبال کا اثر غالب تھا۔ اس لئے یہ
تاب مدت تک گمنامی کے پردوں میں چھپی رہی تا آنکہ المشرقی نے ایک سیاسی مجلسی تحریک کا آغاز کیا۔ جس کو لوگ
ریک خاکساران کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ علمی لحاظ سے تذکرہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ بلکہ اس میں بہت سی
یاں غلطیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن تحریک خاکساران کے رہنما کی تصنیف ہونے کے لحاظ سے تذکرہ کا اثر بہت دوررس
ہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ عوام کو تحریک خاکساران سے جو دلچسپی ہے۔ وہ اس کے عسکری پہلو کی وجہ سے ہے لیکن
احب تذکرہ کا سارا رجحان عقل پسندی اور مادہ پرستی کی جانب ہے۔ جس سے عوام بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ سرسید نے
ت چند روشن خیال حضرات کو متاثر کیا جس سے کچھ زیادہ خطرہ نہ تھا۔ اس لئے بیدار مغز اور تعلیم یافتہ لوگ بہر حال
شیا کے اقدار سے واقف ہوتے ہیں۔ لیکن عوام میں مذہب کے روحانی پہلو کے متعلق مخالفت کا جذبہ اس کے دینی
اس کے لئے از بس خطرناک ہوگا۔ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ میں دینی اور اسلامی حس کے فقدان کی شکایت پہلے سے ہی
نی رہ چکی تھی۔ لیکن تذکرہ کے اصول ان اثرات کو عوام میں پیدا کرنے اور پھیلانے کا باعث ہوں گے۔

(باقی آئندہ)

[1] معارف ۱۹۲۵ء

افسانہ و محاضرات

خوش انجام

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شکسپیر کے مشہور ڈرامہ TUWELFTHNIGHT کا اردو ترجمہ

مترجمہ .... جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم، اے

افرادِ مجالس

اورسینو	ERSINO	ایلیریا ELLYRIA کا ڈیوک×	DUKE
سیبسٹین	SEBATIAN	وایلا VIALA کا بھائی	
انٹونیو		ایک بحری کپتان سیبسٹین کا دوست	
ایک بحری کپتان		وایلا کا دوست	
ویلنٹائن	VALENTINE	} ڈیوک کے مصاحب	
کیوریو	CURIO		
سر ٹوبی بلش	SIRTOBYBELCH	اولیویا OLIVIA کا چچا	
سر اینڈ روایگو چیک		میلوولیو MALVALIA اولیویا کے گھر کی دیکھ بھال کرنیوالا	
جنیبن	JABIAN	} اولیویا کے نوکر	
فیسٹے	FESTE ایک مسخرہ		
اولیویا	OLI	ایک دولتمند کونٹس××	
وایلا	VIALA	ڈیوک پر عاشق	
میریا	MARIA	اولیویا کی خادمہ	

امراء، پادری، سیاح، افسر، گویے اور دوسرے مصاحب

× ڈیوک چھوٹی قلمرو کا مالک — ×× کونٹس (COUNTESS) کونٹ COUNT کی تانیث ہے —

(باقی حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

ایکٹ اوّل

سین اوّل

ڈیوک کے محل میں ایک کمرہ ۔ ڈیوک، کیوریو اور امرا داخل ہوتے ہیں۔ ساتھ ساتھ گوئیے بھی ہیں۔

ڈیوک۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ موسیقی سے عشق کی نشو ونما ہوتی ہے؟ کیا راگ اور سرگم سے عشق کی پرورش ہوتی ہے۔؟ کیا نغموں سے عشق کی روح تازہ ہوتی ہے؟ اگر یہ واقعہ ہے تو میری روح کی گہرائیوں کو سرود و نغمہ سے بھر دو اور اتنا بھر دو کہ پھر کوئی خواہش باقی بھی نہ رہے، آہا! ذرا وہ راگ پھر سنانا۔ اس کا اُتار کیسا دلپذیر تھا۔ وہ راگ میرے سامعہ پر اس عطر بیز نسیم کی طرح پڑا جو گلہائے بنفشہ کے کسی انبار پر سے گذرتی ہوئی جاتی ہو۔

کیوریو۔ حضور شکار کو نہیں چلیں گے۔

ڈیوک۔ کس چیز کے شکار کو۔

کیوریو۔ وہی ہرن کے شکار کو۔

ڈیوک۔ ہرن کے شکار کی کیا ضرورت ہے۔ جب میں خود اپنے دل کا شکار کر رہا ہوں، جب پہلی پہل میری آنکھیں اولیویا کے حسن عالم افروز پر پڑیں میں اس کے دام عشق میں گرفتار ہو گیا۔ گویا میں ایک ہرن ہوں اور میری خواہشات بے رحم اور خونخوار کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہیں۔

ویلنٹائن داخل ہوتا ہے

کہو کیا خبر لائے ہو۔

ویلنٹائن۔ میرے اچھے آقا۔ مجھے حضوری کا شرف حاصل نہ ہو سکا، بلکہ اُسنے اپنی دایہ سے یہ خبر بھجوا دی کہ سات مکمل سالوں تک عناصر بھی اسکو بالکل بے نقاب نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایک راہبہ کی طرح نقاب پوش رہے گی۔ اور ہر روز ایکدفعہ آنسوؤں سے اپنے کمرہ کی آبپاشی کریگی، اور یہ سب صرف ایک مرحوم بھائی کی یاد میں۔

ڈیوک۔ جب وہ بھائی کی یاد میں اس نرم دلی کا ثبوت دے رہی ہے۔ تو خدا جانے اس کے دل کا کیا حال ہوگا۔ جب اس کے جگر، قلب اور دماغ عشق کے سنہرے تیروں[1] سے گھائل ہونگے چلو پھولوں کے ڈھیر میں چلیں جہاں انکی معنبر خوشبو سے روح کو تازگی ہوگی پھولوں کے نشیمن میں عشقیہ خیالات کی فراوانی ہوتی ہے

(باقی حاشیہ صفحہ کا) اور کونٹ کے معنی ایک متمول رئیس کے ہیں۔ براعظم یورپ میں کونٹ انگلستان کے آرل earl یا جرمنی کے گریف GRAF کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ تاریخی نقطہ نظر سے وِس کونٹ نائٹ تونص کا معاون ہوتا تھا۔ جرمن کونٹ یا گریف ایک ضلع پر حکمرانی کرتا تھا۔

[1] قدیم یونانی عقیدہ کے مطابق کیوپڈ CUPID عشق کا کور چشم دیوتا ہے، وہ سنہرے تیر پھینکتا رہتا ہے۔

دوسرا سین ـــــــــ سمندر کا کنارا

وایلا، کپتان اور بحری سیاح داخل ہوتے ہیں۔

وایلا ۔ دوستو، یہ کونسی بھومی ہے۔
کپتان ۔ شریف خاتون، یہ الیریا ہے۔
وایلا ۔ میں یہاں کیا کروں، میرا بھائی تو بہشت میں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ غرقاب نہ ہوا ہو۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔
کپتان ۔ یہ کیا کم غنیمت ہے کہ تم بچ گئیں
وایلا ۔ خدا کرے میرا غریب بھائی بھی بچ گیا ہو۔
کپتان ۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ جب ہم لوگوں کا جہاز ٹوٹ گیا اور تم لوگ کشتی میں چمٹی ہوئی تھیں تو میں نے دیکھا کہ تمہارے بھائی نے اپنے کو ایک مستول سے باندھ لیا اور ہمت کے سہارے وہ شناوری کر رہا تھا اور پرانے زمانہ کے ایریون[1] کی طرح جس نے ایک سو سمار کی پیٹھ پر بیٹھکر سمندر پار کیا تھا۔ تمہارا بھائی موجوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔
وایلا ۔ خدا کرے آپ کی باتیں سچ ہوں۔ ان سب باتوں سے دل کو تسکین تو ہوجاتی ہے۔ آپ اس ملک سے واقف ہیں۔؟
کپتان ۔ ہاں میں نے اسی سرزمین میں پرورش پائی ہے میری جنم بھومی یہاں سے تین گھنٹہ کی راہ ہے۔
وایلا ۔ یہاں کا حکمراں کون ہے!
کپتان ۔ ایک شریف ڈیوک۔
وایلا ۔ اُس کا نام؟
کپتان ۔ اورسینو۔
وایلا ۔ اورسینو! میرے والد اکثر اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے، اسوقت وہ کنوارا ہی تھا۔
کپتان ۔ اس وقت بھی کنوارا ہی ہے یا کچھ دنوں پہلے وہ کنوارا ہی تھا۔ ایک مہینہ ہوا کہ میں یہاں سے گیا تھا۔ اور اس وقت یہ افواہ گرم تھی (اور تم جانتی ہو کہ بڑے لوگ جو کچھ کرتے ہیں چھوٹے اس کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں) کہ وہ اولیویا کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔
وایلا ۔ یہ کس عورت کا نام ہے؟
کپتان ۔ وہ ایک شریف النفس اور پارسا خاتون ہے، اس کا باپ ایک معمول رئیس تھا۔ اور ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا سے چل بسا اور اپنی

---

[1] ARION۔ ساتویں صدی ق۔م کا ایک یونانی شاعر، وہ لسبوس (LESBUS) کا باشندہ تھا۔ وہ علم موسیقی کا بہت بڑا ماہر تھا ایک دفعہ صقلیہ (SICILA) میں موسیقی کے مقابلہ میں کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھا، واپسی میں سیاحوں نے اسکا مال اسباب لوٹ کر اسکو دریا میں پھینکدیا۔ راویوں اور قصہ نویسوں کا بیان ہے کہ اسکی دلپذیر موسیقی کی کشش سے ایک سو سمار جہاز کے پاس پہنچا ہوا تھا۔ وہ اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اسکو ٹینرس TAENARS تک لے گیا۔

لڑکی کو اپنے لڑکے کی نگرانی میں چھوڑ گیا۔ وہ بیچارا بھی اس عرصہ فانی سے رخصت ہوا۔ اور اب اپنے مرحوم بھائی کی یاد میں اسنے دنیا سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

وایلا ۔ کاش میں اس کی خدمت کے لئے اپنے کو پیش کرتی۔

کپتان ۔ یہ مشکل ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو گئی ہے۔

وایلا ۔ کپتان، اللہ نے آپ کو حسین صورت عطا کی ہے۔ اور اگرچہ اکثر فطرت حسین غلاف کے اندر ایک پلید روح رکھدیتی ہے لیکن میرا اعتقاد ہے کہ فطرت نے آپ کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے مالا مال کیا ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ میری اصلیت کو ایک راز بنا کر رکھئے اور میں آپکو اس کا معاوضہ دونگی۔ میں ڈیوک کی خدمت کے لئے اپنے کو پیش کروں گی۔ آپ مجھکو ڈیوک کے ہاں لے چلیں اور ایک خواجہ سرا کی حیثیت سے مجھکو پیش کریں۔ میں مختلف قسم کے گانے گا سکتی ہوں۔

کپتان ۔ اچھا تو ایسا ہی ہوگا۔ میں اس راز کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھوں گا۔ جس دن یہ راز میری زبان پر چلا آئے اسی دن میں اندھا ہو جاؤں۔

وایلا ۔ میں تمہاری مشکور رہوں۔

تیسرا سین ـــــــ اولیویا کے گھر میں ایک کمرہ

سر ٹوبی بلش اور میریا داخل ہوتے ہیں۔

سر ٹوبی ۔ اپنے بھائی کے سوگ میں میری بھتیجی کیوں گھلی جا رہی ہے۔ تردد انسانی زندگی کے لئے زہر ہلاہل ہے۔

میریا ۔ سر ٹوبی، آپ رات میں سویرے گھر آیا کیجئے، اتنی دیر تک باہر رہنا آخر یہ کونسی حرکت ہے۔ آپ کی بھتیجی یعنی میری مالکہ آپ کی ان حرکتوں سے سخت خفا ہیں۔

سر ٹوبی ۔ خفا ہیں تو رہنے بھی دو۔

میریا ۔ آپ کی یہ رندی اور بدمستی آپ کی تباہی کا باعث ہوگی۔ میری مالکہ کل بول رہی تھیں اور یہ بھی میں نے سنا کہ آپ کسی احمق کو بھی ساتھ لائے تھے۔ جو میری مالکہ سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

سر ٹوبی ۔ سر اینڈرو ایگو چیک کا تذکرہ کر رہی ہو ؟

میریا ۔ ہاں، ہاں، اسی کا۔

سر ٹوبی ۔ الیریا میں اس سے زیادہ کوئی بھی لمبا آدمی نہیں ہے۔

میریا ۔ تو اس سے کیا مطلب ۔

ٹوبی ۔ اس کو تین ہزار ڈکٹ[ف] سالانہ کی آمدنی ہے۔

یریا ۔ وہ سب ایک ہی سال میں خرچ کر دے گا۔
وہ نہایت ہی احمق اور فضول خرچ ہے۔

ٹوبی ۔ توبہ ۔ تم یہ کیا اول فول بک رہی ہو ۔ وہ
ستار بجا سکتا ہے ۔ تین چار زبانوں کے بولنے
پر قدرت رکھتا ہے ۔ اور فطرت نے تمام خوبیاں
اس میں ودیعت کی ہیں ۔

یریا ۔ ہاں وہ احمق بھی ہے ۔ فطرت نے اس کو جس حالت
میں پیدا کیا بجنسہٖ اسی حالت میں ہے اور وہ
جھگڑالو بھی ہے ۔ اور اگر وہ بزدل نہ ہوتا تو
لڑائی جھگڑے میں وہ کب کا مارا گیا ہوتا ۔

ٹوبی ۔ قسم ہے اس ہاتھ کی، جو اس کے بارے میں
یہ سب کہتے ہیں وہ لچے اور حاسد ہیں ۔

یریا ۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر رات وہ تمہاری
صحبت میں مخمور اور بدمست رہتا ہے

ٹوبی ۔ ہاں وہ میری بھتیجی کی صحت کی دعا کی خاطر
شراب پیتا ہے اور میں پیتا رہوں گا ۔ جب تک
میرے حلق میں سوراخ رہے گا ۔ اور جب تک
الیریا میں شراب ملتی رہے گی، وہ بزدل
ہے جو میری بھتیجی کی صحت کی خاطر اتنا نہ پیئے
کہ اس کا دماغ چکر کھانے لگے، وہ دیکھو سر اینڈرو
بھی آ گئے ۔

سر اینڈرو ایگوچیک میں داخل ہوتے ہیں

سر اینڈرو ۔ کہئے سر ٹوبی ۔۔۔ کیسے ہیں ۔ ؟

سر ٹوبی ۔ اچھے سر اینڈرو ! اچھا ہوں

سر اینڈرو ۔ اے حسین چھوکری خدا تم کو سلامت رکھے ۔

میریا ۔ آپ کو بھی خدا محفوظ رکھے ۔

سر اینڈرو ۔ یہ کون ہے ؟ ۔

سر ٹوبی ۔ میری بھتیجی کے کمرہ وغیرہ کی نگہداشت کرتی ہے ۔

میریا ۔ الوداع ۔ اب میں جاتی ہوں ۔

سر ٹوبی ۔ سر اینڈرو ۔ کیا تم اس کو یونہی چلے جانے دو گے
اگر ایسا ہوا تو پھر کبھی تم وار نہ کر سکو گے ۔

سر اینڈرو ۔ میری پیاری بیبی، کیا تم جانتی ہو کہ تمہارے پاس کون ہے ۔

میریا ۔ اپنے ہاتھ کو بھٹی میں لے جائیے اور اس کو خوب پلائیے ۔

سر اینڈرو ۔ کیوں پیاری ۔ یہ کونسا استعارہ ہے ۔

میریا ۔ یہ ایک خشک محاورہ ہے ۔

سر اینڈرو ۔ کیا تمہارے پاس ان استعاروں کی کثرت ہے ۔

میریا ۔ ایسے ایسے محاورے میری چٹکی میں رہتے ہیں
اب میں جاتی ہوں ۔

(چلی جاتی ہے)

سر ٹوبی ۔ کیا تم کو شراب کے ایک پیالہ کی ضرورت ہے ۔
جو تمہاری زبان میں حرکت پیدا کر سکے کیا زبان
گونگی ہو گئی تھی جو جواب نہ چل سکا ۔

سر اینڈرو ۔ بعض دفعہ تو میرے دماغ میں کچھ عقل بھی پیدا
ہوتی ہے ۔ لیکن میں گوشت بہت کھاتا ہوں
اور شاید اسی وجہ سے میری سمجھ میں کمی ہو رہی ہے ۔

[ف] DUCAT سونے کا سکہ جو ۹ شلنگ کے برابر ہوتا تھا ۔

سر ٹوبی ۔ بلا شبہ ۔

سر انڈرو ۔ میں کل گھر روانہ ہو جاؤں گا۔ تمہاری بھتیجی تو نظر ہی نہیں آتی ہے۔ اور اگر نظر بھی آئے تو قرینہ غالب ہے کہ وہ مجھے پسند نہ کریگی۔ خود ڈیوک اس کی محبت کا دم بھرتا ہے۔

سر ٹوبی ۔ وہ ڈیوک کو ہرگز پسند نہ کریگی میں نے اکثر اسکو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "میں ہرگز ایسے شخص سے بیاہ نہ کروں گی جو مجھ سے جاہ و ثروت، سن و سال، اور فہم و ذکا میں بڑھکر ہو"

سر انڈرو ۔ تو تو میں ایک مہینہ اور ٹھہروں گا۔ میں تمام لوگوں سے نرالا مزاج رکھتا ہوں، مجھے رنگ رلیوں میں خاص لطف آتا ہے۔

چوتھا سین ——— ڈیوک کے محل میں ایک کمرہ

ویلنٹائن اور وایلا مردانہ لباس میں داخل ہوتے ہیں

ویلنٹائن ۔ سیزیریو، اگر ڈیوک کے لطف و کرم کا یہی حال رہا تو تم بہت جلد جاہ و عزت سے سرفراز ہو جاؤگے ۔ تمہارے آئے ہوئے صرف تین دن ہوئے اور اسپر بھی ڈیوک تمپر اتنی نوازشیں بیجا اور کر رہا ہے ۔

ڈیوک، کیوریو اور حاشیہ نشیں بردار داخل ہوتے ہیں

ڈیوک ۔ کسی نے سیزیریو کو دیکھا ہے؟ وہ کہاں ہے۔

وایلا ۔ جی۔ میں حاضر ہوں۔

ڈیوک ۔ سیزیریو۔ تم سب باتیں جانتے ہو میں نے تم کو اپنے تمام رازوں سے آگاہ کر دیا ہے اور اپنا ضمیر تمہارے سامنے کھولکر رکھدیا ہے۔ اس لئے تم اس کے پاس جاؤ ۔ اس کے دروازہ پر کھڑے رہو۔ اور حضوری سے محروم نہ رہو۔ اور ہرگز ہرگز وہاں سے نہ ٹلنا جبتک کہ حضوری کی اجازت نہ مل جائے ۔

وایلا ۔ حضور ۔ اگر وہ اپنے غم میں اس درجہ مستغرق ہے جیسا کہ مشہور رہے تو وہ ہرگز مجھکو حضوری کی اجازت نہ دے گی۔

ڈیوک ۔ تب شور وغل کرنا، تہذیب و نفاست کے تمام حدود سے گذر جانا لیکن یونہی واپس نہ آنا ۔

وایلا ۔ اچھا اور اگر حضوری کا شرف حاصل ہوجائے تب ؟

ڈیوک ۔ تو میرے عشق کی داستان اور میرے عشق و وفا کے بیانات اس کو سنانا اگر تم میری نمائندگی کروگے تو چونکہ تم نوجوان اور حسین ہو اسلئے تم ایک بوڑھے قاصد سے زیادہ کامیاب رہوگے ۔

وایلا ۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا ہوں ۔

ڈیوک ۔ پیارے لڑکے، میری بات پر یقین کرو، تم ہرگز مرد نہیں معلوم ہوتے ہو ۔ ڈائنا کے ہونٹ تمہارے لبوں سے زیادہ نازک

اور رعلین نہیں ہوں گے۔ تمہاری بولی آرگن
کی آواز کی طرح پسندیدہ ہے۔ میں جانتا ہوں
کہ تم ہی اس کام کے لئے مناسب ہو،
چار یا پانچ آدمی اسکے ساتھ جائیں مجھے تنہا
چھوڑ دو۔ اسلئے کہ تنہائی مجھے بھلی معلوم
ہوتی ہے۔ تم اپنے مقصد میں کامرانی کی کوشش
کرو، اور تب میری دولت و ثروت میں
تمہارا بھی حصہ ہوگا۔

وایلا ۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ (جی میں) کچھ بھی
ہو میں تمہاری بیوی بنوں گی۔

پانچواں سین ———— اولیویا کے گھر میں ایک کمرہ

میریا اور مسخرہ داخل ہوتے ہیں

میریا ۔ تو اتنی دیر سے کہاں تھا۔؟ بتا نہیں تو میں
تجھ سے نہ بولوں گی، میری مالکہ تجھے اس
غیر حاضری کے لئے پھانسی پر چڑھا دے گی۔

مسخرہ ۔ وہ مجھکو پھانسی پر چڑھا دے، جو پھانسی پر چڑھتا
ہے اسکو کسی بات کا خوف نہیں رہتا ہے۔

میریا ۔ اسکو ثابت کر۔

مسخرہ ۔ جب وہ کسی کو دیکھے گا نہیں تو پھر خوف کس بات کا؟

اولیویا اور میلوولیو داخل ہوتے ہیں

اولیویا ۔ مسخرہ کو لے جاؤ۔

مسخرہ ۔ لوگو، کیا تم نہیں سنتے؟ اس خاتون کو لے جاؤ۔

اولیویا ۔ میں کہتی ہوں کہ مسخرہ کو لے جاؤ۔

مسخرہ ۔ میری مالکہ، میں ثابت کر سکتا ہوں کہ آپ
بیوقوف ہیں۔

اولیویا ۔ تم ثابت کر سکتے ہو؟

مسخرہ ۔ اچھی طرح۔

اولیویا ۔ تو ثابت کرو۔

مسخرہ ۔ آپ کیوں سوگ کرتی ہیں؟

اولیویا ۔ مسخرے، اپنے بھائی کی وفات پر۔

مسخرہ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی روح جہنم میں ہے۔

اولیویا ۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی روح بہشت میں ہے۔

مسخرہ ۔ تو یہ اور بھی حماقت ہے کہ اپنے بھائی کے بہشت
باشی ہونے پر آپ سوگ کر رہی ہیں۔

میلوولیو ۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ اس احمق مسخرے میں
اسقدر دلچسپی کیوں لیتی ہیں۔ ایک دن میں نے
اس مسخرے کو ایک نہایت ہی معمولی مسخرے
سے اسطرح شکست کھاتے ہوئے دیکھا کہ میں
بیان نہیں کر سکتا۔

اولیویا ۔ میلوولیو، خودبینی اور خودستائی تمہاری سرشت
اور خمیر میں ہے۔ مسخرے کی باتوں کی پروا نہیں
کرنی چاہئیے۔

مسخرہ ۔ خدا کرے عقل و فہم کا دیوتا آپ پر مہربان ہو اسلئے
کہ آپ مسخروں کی تعریف کر رہی ہیں۔

میریا داخل ہوتی ہے

میریا ۔ [illegible] پر ایک نوجوان شریف آدمی آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔

اولیویا ۔ کیا وہ کونٹ اورسینو کے دربار سے آیا ہے؟

میریا ۔ مجھے یہ نہیں معلوم، لیکن وہ ایک حسین نوجوان ہے اور اس کے ساتھ کئی خادم بھی ہیں۔

اولیویا ۔ اس کو کون روک رہا ہے۔

میریا ۔ سر ٹوبی۔

اولیویا ۔ میلوولیو۔ تم جاؤ۔ اگر وہ اورسینو کا آدمی ہے تو کہہ دو کہ میں بیمار ہوں یا گھر پر نہیں ہوں کسی طرح سے اسکو یہاں سے رخصت کرو (میلوولیو چلا جاتا ہے)

مسخرہ ۔ آپ نے تو مسخروں کی ایسی تعریف کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا بڑا لڑکا مسخرہ ہی ہوگا۔ اس کے دماغ میں عقل کوٹ کوٹ کر بھر دے۔

سر ٹوبی داخل ہوتا ہے

اولیویا ۔ چچا نشہ میں مخمور ہیں۔ چچا، پھاٹک پر کون شخص ہے

سر ٹوبی ۔ ایک شریف زادہ۔

میلوولیو داخل ہوتا ہے

میلوولیو ۔ وہ نوجوان تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ آپ سے ضرور ملے گا۔ میں نے اس سے آپ کے متعلق یہ کہا کہ آپ بیمار ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ یہ سب جانتا ہے اور اسی لئے آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے پھر یہ کہا کہ آپ سوئی ہوئی ہیں۔ اس کی بھی وہ خبر رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ سے اسی لئے کچھ بات کرنے کو آیا ہے۔ وہ کسی طرح بھی نہیں ٹلتا۔

اولیویا ۔ اس سے کہہ دو کہ وہ مجھ سے بات نہیں کر سکتا ہے۔

میلوولیو ۔ اس سے کہہ دیا گیا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ دروازہ سے تو وہ ہرگز نہ ٹلے گا اور آپ سے ملے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

اولیویا ۔ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔؟

میلوولیو۔ کیوں۔ بنی نوع انسان میں سے ہے۔

اولیویا۔ اس کا سن و سال کیا ہے اور شکل و صورت کیا ہے۔

میلوولیو ۔ نہ تو اتنا سن رسیدہ ہے کہ مرد کہلائے اور نہ اتنا کم سن ہے کہ لڑکا کہلائے۔ وہ بچپن اور شباب کی درمیانی منزل میں ہے۔ وہ حسین قد و قامت کا ہے، اور وہ بہت تیزی سے بولتا ہے۔ بعض لوگ تو یہ کہینگے کہ ابھی اسکے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہیں۔

اولیویا ۔ اسکو آنے دو، میریا کو بلاؤ۔

میلوولیو۔ میریا، مالکہ بلا رہی ہیں۔

میریا داخل ہوتی ہے

اولیویا ۔ میری نقاب مجھ کو دیدو، اور اس کو میرے چہرہ پر ڈال دو۔ ایک بار پھر اورسینو کا پیغام سنا جائے۔

وایلا حاشیہ برداروں کے ساتھ داخل ہوتی ہے

وایلا ۔ اس گھر کی معزز مالکہ کون ہیں۔

اولیویا ۔ مجھ سے بولو، میں جواب دونگی، تمہاری مرضی۔؟

وایلا ۔ دلکش کامل اور لاجواب حسن والی خاتون، لیکن مجھے سچ سچ بتا دیجئے کہ کیا آپ ہی وہ خاتون ہیں، میں نے انکو کبھی نہیں دیکھا ہے، میری یہ تقریر بہت

ہی لاجواب انداز میں لکھی گئی ہے۔ اور میں نے بڑی مشکل سے اسے یاد کیا ہے)

اولیویا ۔جناب! آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔

وایلا ۔اچھی اور شریف خاتون، پہلے مجھے اس بات کا یقین دلائیے کہ آپ ہی اس مکان کی مالکہ ہیں تاکہ میں اپنی تقریر سناتا جاؤں۔

ولیویا ۔کیا آپ کامک (مزاحیہ) پارٹ کر رہے ہیں

وایلا ۔نہیں میں قسم کھاتا ہوں کہ میں جس چیز کا پارٹ کر رہا ہوں میں وہ نہیں ہوں، لیکن کیا آپ ہی اس مکان کی مالکہ ہیں۔

ولیویا ۔بلاخوف تردید میں ہی ہوں۔

وایلا ۔تو میں ایک قاصد ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صلح و آشتی میرا پیغام ہے۔

ولیویا ۔ہم لوگوں کو تنہا چھوڑ دو۔ (میریا اور حاشیہ بردار چلے جاتے ہیں) اب جناب! آپ کا پیغام کیا ہے۔؟

وایلا ۔پیاری حسین خاتون۔

ولیویا ۔آخر آپ کا پیغام کہاں ہے۔؟

وایلا ۔اور سینو کے سینہ میں۔

ولیویا ۔اسکے سینہ میں! کس باب میں ؟

وایلا ۔اسکے دل کے پہلے باب میں۔

ولیویا ۔میں اسکو پڑھ چکی ہوں، یہ سب مکر و فریب ہے۔ اور بھی کچھ کہنا ہے۔

وایلا ۔میں آپ کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

اولیویا ۔میرے چہرے سے آپ کو کیا کام۔ لیکن خیر آپ کو دکھا دوں گی۔ (بے نقاب ہو کر) دیکھیے۔

وایلا ۔کیا ہی پیاری صورت اللہ نے عطا کی ہے۔ مصور قدرت نے سرخ و سفید کو آپ کے چہرہ میں یکجا کر دکھایا ہے۔ اگر آپ اپنا کوئی نمونہ اس دنیا میں نہیں چھوڑینگی، تو آپ سے بڑھکر کوئی بھی ظالم نہ ہوگا۔

اولیویا ۔جناب میں ایسی ظالم نہ بنوں گی۔ دنیا میں میرے حسن کے مختلف اڈیشن ہوں گے۔ لیکن کیا آپ یہاں میری تعریف میں قصیدے پڑھنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

وایلا ۔میں اظہار حقیقت کر رہا ہوں، آپ بہت مغرور ہیں۔ لیکن اگر آپ طاغوت بھی ہوتیں تب بھی میں کہتا کہ آپ حسین ہیں۔ میرا مالک، میرا آقا آپ سے محبت کرتا ہے۔ اگرچہ آپ تاج حسن کا سب سے انمول موتی بھی ہوں تب بھی ایسی محبت کا صلہ دینا چاہیئے۔

اولیویا ۔وہ مجھ سے کیونکر محبت کرتا ہے۔

وایلا ۔وہ آپ کی پوجا کرتا ہے، آنسو بہاتا ہے آہ و زاری کرتا ہے، نالۂ و شیون کرتا ہے۔

اولیویا ۔آپکے آقا یہ خوب جانتے ہیں کہ میں ان کو اپنا دل نہیں دے سکتی ہوں۔ گو میں یہ جانتی ہوں کہ وہ پارسا اور شریف النفس ہیں۔ وہ بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہیں۔ ان کا شباب بالکل بے داغ گذر رہا ہے۔ وہ بہت ہی رنگینیاں

تعلیم یافتہ اور شجاع ہیں۔ قدرت نے انہیں حسن و جمال سے بھی مزین کیا ہے۔ لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود میں ان سے محبت نہیں کر سکتی۔

وایلا ۔ اگر اپنے آقا کی جگہ میں ہوتا اور میرے دل میں انوار عشق کی تجلی ہوتی تو میں آپ کی اس نفی کو بالکل مہمل اور بے معنی سمجھتا۔

اولیویا ۔ تو آپ کیا کرتے۔

وایلا ۔ کیا کرتا! آپ کے پھاٹک پر ایک جھونپڑی بنا لیتا اور اپنی پامال شدہ محبت کے متعلق غزلیں لکھتا اور آدھی رات کی خاموشی میں گاتا پھرتا۔ پہاڑیوں میں جا کر آپ کے نام کی رٹ لگاتا یہاں تک کہ فضا سے بھی "اولیویا، اولیویا" کی آواز آتی پھر میں دیکھتا کہ آپ کو رحم ہے یا نہیں۔

اولیویا ۔ اچھا یہ تو بتلائے کہ آپ کا نسب و حسب کیا ہے۔

وایلا ۔ میں ایک شریف زادہ ہوں۔

اولیویا ۔ اچھا تو اپنے آقا سے کہہ دیجئے کہ وہ میرے عشق سے باز آئیں، اور یہ آہ و شیون بالکل فضول ہے۔ وہ کسی شخص کو میرے پاس نہ بھیجیں، ہاں اگر آپ آنا چاہیں تو یہ کہنے کے لئے آسکتے ہیں کہ میری اس نفی کا آپ کے آقا پر کیا اثر ہوتا ہے۔ لیجئے یہ کچھ ہدیہ ہے۔

وایلا ۔ میں تمہارے پر نہیں آیا ہوں۔ اپنا روپیہ اپنے پاس رکھئے میں معاوضہ نہیں چاہتا ہوں، میرا آقا معاوضہ کا طلبگار ہے۔ خیر خدا حافظ، بیرحم حسینہ اب میں رخصت ہوتا ہوں (چلا جاتا ہے)

اولیویا ۔ کیا کہا۔ "شریف زادہ ہوں"، میں قسم کھا سکتی ہوں کہ تو شریف زادہ ہے۔ تیری گفتگو تیرا چہرہ بشرہ، تیری شکل، تیرے حرکات و سکنات یہ سب تیری شرافت نسب کی شہادت دیتے ہیں۔ کاش ڈیوک کے بجائے تو ہی مجھ سے محبت کرتا۔ یہ کیا ہو گیا۔ مجھ میں یہ کونسا تغیر آگیا۔ عشق کا روگ بھی کتنا جلد آتا ہے۔ اس نوجوان کے حسن و جمال نے میری آنکھوں کو مسحور کر دیا۔ میلوولیو، ادھر آؤ۔

میلوولیو داخل ہوتا ہے

میلوولیو ۔ کیا حکم ہوتا ہے، میں حاضر ہوں۔

اولیویا ۔ اس قاصد کے پاس جو ابھی آیا تھا دوڑتے ہوئے جاؤ۔ وہ اپنی انگوٹھی یہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اسکو یہ جا کر دیدو اور کہو کہ مجھے اسکی ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی کہو کہ وہ اپنے آقا کو جھوٹی امیدیں نہ دلائے میں اسکے آقا کیلئے نہیں ہوں، اگر وہ نوجوان کل یہاں آئیگا تو میں اسکو سب باتیں بتا دونگی، میلوولیو دوڑ کر

میلوولیو ۔ میں ابھی جا رہا ہوں (چلا جاتا ہے)

اولیویا ۔ کمزور انسان! تو قسمت کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے اور وہ جسطرح چاہتی ہے تجھ سے کھیلتی ہے قسمت کا لکھا بھی کہیں ملتا ہے! بھلا یہ کسکی مجال ہے کہ دبیر فلک کے فیصلوں کو ٹالدے

(باقی آئندہ)

تصویرِ زندگی

مرہٹی ادب کا ایک لطیف شاہکار

از
جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب، ایم اے۔

"میں اب پریم نام کی ایک تصویر بنانیوالی ہوں۔"

"ہوں"

"ہوں کیا؟ میں کوئی کہانی کہہ رہی ہوں"

"کہانیاں کہنے کا کام تو دادی کا ہوا کرتا ہے آپ کو دادی کہوں گا۔ کیا میں اتنا گر گیا ہوں" وہ نقلی غصہ سے کہنے لگے۔

"ہمارے دلیپ مہاراج کو سچ بھلا کون کہہ سکتا ہے۔ کیوں جی۔ تم مل (mill) میں کام کرتے ہو۔ یہ مجھے سچ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مل کوئی اچھا باغیچہ ہو گا۔ کھڑ کھڑ بجنے والی مشینوں کا چہچہانا، کوئلوں کی کوکو، دھوئیں کی خوشبو، مزدوروں کے چہروں کی تازگی۔۔۔۔

"سر پکھیا۔ انگلینڈ سے واپس آکر تم وہاں سے مصوری کا فن ساتھ لائے۔ اتنی اچھی چیز لے آئیں مگر ایک چیز لانا بھول گئیں۔"

"وہ کیا؟"

"ایک اچھا سا تالہ"

"کس لئے؟ دو برسوں میں خوب پیسہ اکھٹا کر رکھا ہے؟"

"تالہ چاہیئے اس منہ کے لئے"

"کس کے؟ آپ کے؟"

"میرے منہ میں لگانے کا تالہ تو میرے سامنے ہی کھڑا ہے۔"

"ہوں"

اور ہم دونوں دوسری طرف دیکھنے لگے، ہمارے دلوں کی حالت شام کے ان سنہرے بادلوں کی طرح تھی جو اسوقت آسمان پر اٹھکیلیاں کرتے نظر آرہے تھے، دلیپ کی بات پر ذرا سا غصہ بھی مجھے آگیا تھا۔ مگر فوراً ہی مٹ گیا اور مجھ پر سکون سا چھا گیا۔ اور اگر صحیح معنی میں پوچھا جائے تو اس میں ناراض ہونے کی بات ہی کیا تھی۔ دو سال پہلے ہی ہماری شادی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ فن مصوری میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے میں انگلینڈ گئی وہ دہلی کے ایک کارخانہ میں کام کرنے لگے۔ پورے دو سال بعد ہم دونوں ملے تھے۔ مدت سے بچھڑوں کے ملنے پر اس وقت دونوں کے دلوں میں جذباتی دھارے مد و جزر بن کر کیوں نہ اُبلیں؟۔ دو برس کے بعد بھی دلیپ کے منہ سے،

—— "میرے منہ کے لئے تالہ سامنے ہی تو ہے" اتنا پیار بھرا جذبہ ٹپکا!

دلیپ بولا "ہاں ذرا سناؤ تو اپنی تصویر کا تخیل"

"آپ ہی اندازہ لگائیے کیسے"

"شاعر صاحب سنئے۔ جگہ۔ ایک باغ شہر میں پھولوں کی خوشبو میں لدا ہوا۔ ادھر ادھر سبز سبز قالین بچھی ہوئی۔ وقت —— شام، کیونکہ شاعروں کے نظریہ کے مطابق پریم کرنے کا ٹائم ہی یہی ہے —— ایک جھاڑی کی اوٹ میں ایک نوجوان اور ایک حسین دوشیزہ سوٹ میں شکن پڑ جائیں گے۔ یا سفید ریشمی ساڑھی میں گرد لگ جائے گی۔ ان باتوں کی دونوں نے پرواہ نہیں کی۔ دیکھو پریم اندھا ہوتا ہے اس کا ثبوت اسی سے ملتا ہے۔ اور وہ گونگا بھی ہوتا ہے۔ دیکھو دونوں کے منہ پاس...... "دلیپ"

"گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس پریم بھرے منظر کے پرے اس ڈرامہ کو دیکھ کر لوگ کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں۔ تو بھی انہیں سنائی نہیں دیتا۔ پریم لنگڑا بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ چل نہیں سکتا۔"

"تم تو مشین کے پرزے ہی درست کرنا جانتے ہو۔ اتنے دن دہلی میں رہتے مگر پریم کی تصویر بناتے ہوئے.........."

"پریم صرف خدا ہی ہو سکتا ہے۔ دہلی ہو یا کوئی اور جگہ۔ اس کی شکل ایک ہی ہوتی ہے۔"

"آخر مل کے مزدور ہونا ہے سنو۔ میں پریم کی تصویر کیسے بناؤں گی! جگہ...... تمہارے دہلی کے پڑوس کا تاج محل۔ وقت —— موسم برسات پر شباب چاندنی کی آدھی رات۔ جمنا کے وسط میں ایک حسین کشتی۔ اس میں دو پریمی اتنے میں شب دیجور کے مانند ایک سیاہ انسان دریائے جمنا سے نکل کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں میں سے ایک کو لے جانے کے لئے آیا ہے۔ مگر اس دنیا میں پیچھے رہنے کے لئے دونوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہو کر آنسو بہانے لگتے ہیں۔ ان آنسوؤں سے کشتی بھر جاتی ہے۔ اور وہ دونوں نیچے نیچے ڈوبنے لگتے ہیں.........."

دلیپ ایک نقلی ہنسی کے ساتھ بولا "ان کے آنسوؤں سے کشتی بھر جاتی ہے! ان کی آنکھیں نہ ہوئیں چور اہے پر کے پانی کے نل ہوئے!!"

میں غضبناک ہو کر اسکی طرف مڑی۔

.... اچانک سرلیکھا کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے دیکھا ابھی وہ سکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں تھی یہ خیال کر کے وہ اپنی حماقت پر دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔ ریل گاڑی راستہ ہی میں کہیں ٹھہر گئی تھی۔ اور دھکے سے اس کے خوابوں کی مالا ٹوٹ گئی تھی۔

مگر مالا ٹوٹنے پر پھولوں کے ہوا میں بکھر جانے کے باوجود بھی اس کا دل اسکی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ نیم وا کلی کی طرح وہ خوشبو اسے بہت پیاری معلوم ہوئی۔ سنسار کے تمام پھولوں کا اجتماع ایک مصور نے نہایت جانفشانی کے ساتھ اپنی تصویر میں کیا ہو۔ اسی طرح دل کا دیوتا مکمل زندگی کے تجربات کو گوندھ کر خوابوں کی دنیا تعمیر کرتا ہے دلیپ اور میں پے در پے مذاق کرتے کیا تمام عمر اسی طرح

[illegible]ستے کھیلتے ہنستے چلے جائیں گے۔؟ مگر خوابوں کی دنیا
میں کہاں کے بندھن؟ پرانی تصویروں میں پریوں کے
[illegible] نظر آتے ہیں وہ بغیر مطلب کے نہیں ہوتے خوابوں
کی دنیا کے عنوان سے ہم دونوں بھی ایک تصویر بنائیں
اس میں پرانے تجربات کے پھول کھل رہے ہوں اور ہر ایک
پھول سے اک اک پری باہر نکل رہی ہو!

ریل گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ سر کھجاتے
[illegible] ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اسٹیشن کا نام دیکھ کر اسے
[illegible] امیدی ہوئی۔

"دلی دور است" وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات کے
[illegible] بھی چکر لگا رہے تھے گاڑی آگے جا رہی تھی مگر اسکا دل
گذشتہ واقعات کی طرف دوڑ رہا تھا۔ دلیپ کو دیکھے
[illegible] دو سال ہوئے۔ اب وہ کیا دکھائی دیتا ہوگا۔ انگلینڈ
[illegible] ہونے تک میں کتنا فرق پیدا کر دیا ہے۔ کیا وہ بھی بدل
[illegible] ہوگا؟ - اسکی چٹھیاں کتنی چھوٹی اور کتنی روکھی ہوا
[illegible] تی تھیں! مشینوں کے ساتھ رہتے رہتے کیا آدمی بھی مشینوں
جیسا ہی ہو جاتا ہے۔ مگر پہلے تو دلیپ ایسا نہ تھا۔ منہ، سر،
[illegible] اعضا مشینوں جیسے، سب چلتے ہوئے۔ اسکی مشین
جیسی خصلت کا مذاق اڑاتے ہوئے میں نے ہی تو ایکدن
[illegible] تھا۔ "قدرت نے تمہارے سر میں گراموفون اور پیروں
[illegible] بجا ب میں رکھدیا ہے" یہ سنکر دلیپ کتنی دیر تک
[illegible] ہنستا رہا تھا!

ابھی ابھی کے خواب کی باتیں وہ یاد کرنے لگی۔
[illegible] سے ڈھکا ہوا باہر کا حسین منظر دھندلکے میں جتنا حسین معلوم
ہو رہا تھا۔ اسی طرح اسے خواب کی پیار بھری باتیں یاد کر کے
لطف آ رہا تھا۔ اس نے سوچا "میٹھا خواب ایک قسم کی دلفریب
غزل ہے۔ دو نوں مجموعہ ہیں۔ تجربہ اور امید کا، جنکا تصادم حسن
سے لبریز ہوتا ہے۔ آل انڈیا کلچر کانفرنس کی طرف سے "پریم
پر تصویر بنانے کے سلسلہ میں انعام کا اعلان ہوا ہے۔ اس
تصویر کشی کے لیئے ایکبار تاج محل دیکھنا ضروری ہے۔ اسی لیے
میں دہلی جا رہی ہوں۔ وہیں دلیپ بھی ہے۔ اسکے
ساتھ دو سال قبل میرے بیاہ کی بات چیت بھی پکی ہو چکی
ہے وقت کی تنگی کی وجہ سے وہ دہلی سے بمبئی آکر مجھے
نہ مل سکا۔ میں نے ایک مرتبہ دلیپ کو لکھا تھا "مجھے ایک
ناول بنا سا بھیجدو" اس نے جواب میں پوچھا تھا "کیسے فیصد کی
پریم کا ناول تم کو چاہیئے" یہ تمام باتیں اس خواب میں نفرت
نے گوندھ دی تھیں۔

خواب کے متعلق سوچتے سوچتے اُسے یہ احساس
ہونا شروع ہوا کہ مصور کی تصویر بھی ایک شیریں خواب
ہی تو ہے اور یہ تاج محل جو میں دیکھنے جا رہی ہوں
وہ بھی کیا ہے؟ کسی آرٹسٹ کے خواب کو کسی دیوان
نے اپنے بازوؤں میں باندھکر رکھا ہے۔ آرٹ بھی ایک
خواب ہے اور زندگی ایک خواب 'پریم بھی خواب ——
پھر —— سبھی خواب کہاں اچھے ہوتے ہیں؟ یہ عجیب
سا خیال اس پر چھا رہا تھا۔ کہ ریل گاڑی دہلی اسٹیشن پر
آ پہنچی۔ پٹری بدلتی ہوئی گاڑی کی گڑگڑاہٹ اُسے اس
آخری خیال کے مانند معلوم ہوئی۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی بھیڑ میں اسے
دلیپ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ گاڑی ٹھہری۔ قلی شور کے ساتھ

بوں میں داخل ہوئے۔ سامان اُتارا گیا۔

سرکھیا آخری ڈبے تک دیکھتی رہی مگر دلیپ کہیں پتہ نہ تھا۔ اسٹیشن پر آدمیوں کا ہنگامہ، سامان کی گھڑگھڑاہٹ اور قلیوں کا شور ـــــ یہ تمام اسکے کانوں میں گونج رہے تھے ـــــ دو برس کے بعد میں ولایت سے آئی ہوں تو بمبئی میں آکر ملنے کی فرصت نہیں تھی۔ مان لیا مگر اب اسٹیشن پر آنے کے لئے بھی . . . .

گاڑی کا سگنل اٹھا دیا گیا۔ گاڑی ایک پٹری سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوسری پٹری پر چڑھ گئی یہ دیکھتے دیکھتے سرکھیا نے سوچا۔ دلیپ کا دل بھی کہیں اسی طرح بدل نہ گیا ہو۔ گذشتہ سال ان کی چٹھیاں کتنی روکھی پھیکی ہوا کرتی تھیں۔

اور اب تو انہیں اسٹیشن پر آنے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ اس کا کیا ٹھکانا ؟۔ دو سال اکیلے دھلی میں رہے ہیں۔ یہاں کی کسی لڑکی کے پریم میں تو نہیں پھنس گئے ؟ . . .

"مصور صاحبہ! تاج محل دیکھنے آئی ہیں یا اسٹیشن؟"

سرکھیا کو سنائی دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا مگر متضاد خیالات سے اس کا دل کشمکش میں الجھا ہوا تھا۔ اسلئے وہ ہنس نہ سکی۔ دلیپ فوراً اسے تاڑ گیا ہنستے ہنستے کہنے لگا۔

"صبح کا وقت ہے۔ کلیوں کے کھلنے کا بہترین وقت۔"

"دوسری کلیوں کے لئے ہوگا۔ مگر سورج نازک سی کلی کو . . . . . ."

"اسکو کیا ہوا ؟ اچھا چڑھ گیا ہے سورج ہاتھ بھر اوپر۔ میں کہہ رہا ہوں نہیں تو ساری شاعری خاک میں مل جاتی۔"

"سورج تو اوپر چڑھ آیا ہے، مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے وہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔"

"بادل ہیں تو بھی کچھ حرج نہیں۔ بارش ہونے پر شدت کی گرمی تو کچھ کم ہوگی ؟"

"اسٹیشن سے باہر آکر سرکھیا بہت تیزی سے بولی۔" میرا نام ہے سرکھیا۔"

"مجھے معلوم ہے وہ . . . ."

"اچھا ابھی تو کچھ دیر قبل مصورہ کے نام سے پکار رہے تھے۔"

"ہاں وہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ پورے نام سے پکاروں تو اس میں ارتباط معلوم نہیں ہوتا۔ اور اگر سورہ کہوں تو اسکے معنی ہی بھیانک ہیں۔"

"دو سال قبل تو سورد نام رائج تھا۔"

"مگر اب بات یہ ہے کہ انگلینڈ سے مصوری کی تعلیم حاصل کی ہوئی قابل قدر لڑکی کو اس نام سے کیونکر پکارا جائے۔"

اب سرکھیا ہنسی نہ روک سکی۔ دلیپ کی فطرت پہلے ہی کی طرح شریر اور پر مذاق تھی یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ ہوا سے بادل بکھر جاتے ہیں اسی طرح اس نئے خیال سے اسکی اداسی نہ جانے کیوں کافور ہو گئی مگر جاتے جاتے کسی ایک بادل سے پانی کی دو بوندیں گر پڑتی ہیں اسی طرح دلیپ کے اسٹیشن وقت پر نہ آنے کی شکایت کرنے کا خیال اس میں پیدا ہوا۔ اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے وہ دلیپ سے کہنے لگی۔

"بڑوں کے مقابلہ میں چھوٹوں کی قدر نہیں ہوتی۔ بالکل سچ ہے نا ؟"

اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر دلیپ نے اسکی
طرف پلکیں اٹھا کر دیکھا۔

"گھڑیاں بھی تو مشینوں ہی میں شمار ہوتی ہیں نا
دلیپ؟"

"وہ کیونکر؟"

"وہ گھڑیاں کبھی ملتی جلتی ہیں اور وہ آدمی بھی۔۔۔۔"
اور دل ہی دل میں سرلیکھا کہنے لگی ـــــ کانٹے
گھما کر گھڑی کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے مگر کیا آدمیوں کے دل
اس طرح نہیں بدل سکتے؟

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ گھڑی بھی ایک مشین ہے"
سرلیکھا ابل پڑی۔ "مگر کچھ بھی ہو وہ ایک
چھوٹی مشین ہے۔"

"بہت سی گھڑیاں بڑی بھی ہوتی ہیں۔"

"مل کے مشینوں جتنی بڑی!"

"اتنی بڑی گھڑی تو کہیں بھی آج تک نہیں دیکھی۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں کہ بڑے کارخانے چلانے
والوں کو چھوٹی مشین کہاں یاد رہ سکتی ہیں اور پھر اسٹیشن
پر اپنا کوئی آنے والا ہو اس کا ہوش بھلا کہاں رہ سکتا ہے؟"

دلیپ کی آنکھوں میں سرلیکھا نے کسی روحانی
تکلیف کا عکس دیکھا مگر صرف ایک ساعت کے لئے
کیونکہ فوراً ہی دلیپ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

"اس قدر زور سے ہنسنے کی کونسی ضرورت
پڑ گئی آپ کو؟"

"مصور صاحبہ کی شادی منطق کے ساتھ ہو رہی
تھی وہ شادی اب رک گئی ہے یہی دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔"

"تو گویا شادی رک جانے پر تمہیں خوشی
کرتی ہے۔ کیوں؟"

یہ سوال کرتے ہوئے سرلیکھا کی آواز میں بے
چھلک رہی تھی۔ اپنے مذاق سے اس کے دل کو ٹھیس
دیکھ کر دلیپ کو دکھ ہوا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"یہ بات نہیں۔ سرلیکھا۔ میں تو صرف یہ کہہ
کہ تمہارے دلائل بالکل غلط ہیں۔"

"آپ مل کی مشین چلاتے ہیں۔ یہی غلط؟"

"ہاں۔"

سرلیکھا متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ د
مستحکم انداز سے کہہ رہا تھا۔ "کل ہی میں ملازمت سے
برخاست کر دیا گیا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"میں ہڑتال کرنے والے مزدوروں کی حمایت
میں جھگڑ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔"

"تم کیوں پڑے اس ہڑتال کے عذاب میں؟"

"تم کیوں بناتی ہو تصویر؟"

"وہ ایک حسین آرٹ ہے۔"

"ہڑتال کرنے والے بھی زندہ انسان ہیں۔"

"زندہ اور حسین کا مفہوم ایک ہی ہوتا ہے کیا؟"

"دنیا میں زندگی جیسی حسین شے اور ہے کیا؟"

"موت۔"

"وہ کیونکر؟"

"تاج محل کے حسن کی بنیاد ہے
ممتاز محل کی موت۔"

"مگر ممتاز ملکہ تھی۔ اگر وہ بھی کسی مزدور کی بیوی ہوتی تو ....

اب وہ گھر پہنچ گئے۔ اسلئے دلیپ نے تانگہ والے کو رخصت کرنے کے لیئے اشارہ کیا اور جس طرح تلملانے کے رکنے کا دھکا سرلیکھا کے جسم پر لگا اسی طرح دلیپ کے آخری حملہ کا دھکا سرلیکھا کے دل پر لگے بغیر نہ رہ سکا۔

دلیپ کا کمرہ دیکھ کر سرلیکھا کو بہت تعجب ہوا۔ وہ کافی کشادہ تھا، صاف تھا اور جو کچھ بھی تھا وہ اسکی سادگی میں تھا۔ اسکا اسے کبھی گمان تک نہ تھا۔ میز پر رکھی ہوئی کتابیں وہ الٹ کر دیکھنے لگی۔ اسے توقع تھی کہ اسے ایک دو ہندی یا انگریزی ناول ہاتھ لگیں گے۔ مگر وہاں روسی مصنفوں کی بھرمار اسے دکھائی دی۔ ایک کتاب کا نام تھا "کھیت اور کارخانہ" تو دوسری کا "ایک مزدور کی سوانحعمری" نا امید ہو کر وہ آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ اور ہنس کر کہنے لگی۔

"اتنی کفایت شعاری سے رہ کر کیا پا لیا تم نے ذرا اپنی بینک بک تو دکھانا۔"

"کیوں کرایہ کے باقی ماندہ پیسے میرے نام رکھنے والی ہو کیا۔؟"

"باقی بچے ہی کہاں ہیں؟ میں تو سکنڈ کلاس میں آئی ہوں۔"

"اچھا"

"میں سمجھی تم نے مزاحاً مجھے لکھا تھا۔"

"امیروں کا مذاق اور غریبوں کی آہ"

"مزدوروں کے لیڈروں کی طرح بیٹنگ بولنے لگے ہو۔ سچ کہو دلیپ۔ یہ پاگل پن کہاں سے گھس آیا تمہارے دماغ میں؟"

"سچ کہوں ریکھا؟"

"ہاں"

"جہاں سے تم گھسی تھیں۔"

"یعنی"

"دل میں سے ہو کر"

"واہ۔ یعنی میری محبت بھی پاگل پن ہی ہے کیا؟"

"پریم دنیا کا سب سے بڑا جنون ہے۔"

"ارے ارے۔ مزدوروں کے لیڈر شاعر بن گئے۔"

"شاعر نہیں میں انسان بن رہا ہوں۔"

"یعنی پہلے کیا تھے آپ؟"

"حیوان"

سرلیکھا آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دلیپ نہایت اطمینان دلی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"ریکھا! کتابوں کی تعلیم سے کوئی انسان نہیں بن جاتا۔ بلی اپنے بچوں کو چوہے مارنا نہیں سکھاتی۔ اسطرح یہ ہماری پیٹ بھرنے والی تعلیم ہے۔ مگر پیٹ تو حیوان پرندے بھی بھر لیتے ہیں۔ پیٹ بھر گیا۔ اور دل خالی رہا تو......"

"تمہیں تو کوئی ڈر ہی نہیں لگتا۔ اتنی بڑی جو بیٹھی ہوں میں تمہارے دل میں"

"تم اور میں؟ کیا دنیا سچ مچ اتنی چھوٹی ہے؟"

"پریم کی دنیا درحقیقت ذراسی ہی ہوا کرتی ہے"

"تو پھر وہ گڑیا گڈے کی دنیا ہوگی"

"بالکل راجہ رانی کی دنیا! تاج محل کوئی جوسٹھ منزلہ محل نہیں ہے تاہم کتنی حسین تصویر ہے وہ۔"

دلیپ کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے بات کا رخ بدل کر انگلینڈ کی باتیں چھیڑ دیں۔ سرلیکھا نے انگلینڈ کے خوشنما پھولوں کی تعریف اور دریائے ٹیمس کے حسین ساحل وغیرہ کا تذکرہ کرتے کرتے وہاں مصوری میں اپنے حاصل کردہ انعامات کا بھی ذکر کر دیا۔

دلیپ بولا "تو ہندوستان میں بھی انعام تمہیں ہی ملے گا۔"

"ملیگا یعنی؟ ملنا ہی چاہیئے؟ آخر کون ہوں میں؟"

"قابل قدر مصورہ سرلیکھا۔"

"نہیں بلکہ دلیپ کی ہمنوا۔ تمہارے ساتھ میں تاج محل دیکھوں گی۔ چودھویں کی چاندنی میں گھوموں گی اور پھر ایسی تصویر بناؤں گی کہ......."

"میں تمہیں دو تاج محل دکھاؤنگا۔"

ابھی تاج محل جیسی کوئی عمارت دہلی میں بھی کسی نے بنالی ہوگی یہ سوچ کر سرلیکھا خوشی سے اچھلتے ہوئے بولی۔

"اندھا مانگے ایک آنکھ اور خدا دے دو۔"

"مگر دیکھ کر وہ کہیں آنکھ تو نہیں بند کر لیگا؟"

"باتیں بنانے کی تمہیں عادت ہی پڑ گئی ہے دلیپ۔"

دوپہر کو تاج محل دکھانے دلیپ سرلیکھا کے ساتھ باہر نکلا۔ سرلیکھا سوچ رہی تھی۔ ایک ناول کا ہیرو اپنی نئی دلہن کے ساتھ کیا اسی انداز میں باتیں کرتا ہے؟ اسٹیشن سے لیکر اب تک ہماری ساری گفتگو وکیل اور گواہ کی جرح کے مانند ہوئی ہے۔ دلیپ کو مجھ سے عشق نہیں رہا یا مزدوروں کی ہڑتال نے اس کا دل روکھا کر دیا؟

چلتے چلتے اس نے پلٹ کر دیکھا، ایک آدمی اُنکا پیچھا کرتا ہوا آرہا تھا۔ سرلیکھا نے اُسے صبح کو بھی سڑک پر دلیپ کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ صرف اتفاق سے وہ ہمارے پیچھے آرہا ہے یا........"

"ریکھا دیکھو میرا تاج محل"

اپنے گہرے خیال سے چونک کر سرلیکھا نے دیکھا دلیپ کے مذاق کرنے پر اُسے غصہ سا آگیا۔ سامنے مزدوروں کی ایک گندی گلی تھی۔

"دلیپ" وہ آنکھیں چڑھا کر بولی۔

"چلو اندر پریم کی تصویر دیکھنے۔"

"اس کنگال خانہ میں؟"

"کس نے بنایا اسے کنگال خانہ؟"

"کس نے؟"

"غریبوں کی آہوں سے محل بنانے والوں نے۔"

سرلیکھا درحقیقت ناراض ہوگئی کچھ کہے بغیر وہ دلیپ کے ساتھ اس گلی میں داخل ہوئی۔ راستہ میں ملنے والے مزدور دلیپ کو بہت ادب کے ساتھ سلام کرتے تھے دو منزلیں چڑھنے کے بعد دلیپ ایک تنگ کوٹھری کے سامنے رُکا۔ اس نے باہر ہی سے پوچھا "کیسا ہے اب مہادیو؟"

"آنکھ کھول کر دیکھ رہا ہے" جواب آیا اور کوٹھری کا دروازہ ایک میلی اور پھٹی ساڑھی پہنے ہوئے بیوہ نے کھولا۔ دلیپ اندر گیا اور مہادیو کے بستر کے

پاس جاکھڑا ہوا۔ نہایت ملائم آواز میں اس نے پوچھا۔

"مہادیو"

"ہاں"

"اب حال اچھا ہے نا؟"

"دادا"

"کیا رے؟"

"ماں کہاں گئی!"

"مجھے موٹر چاہیئے نا کھیلنے کے لئے؟ وہی لینے کے لئے بھیجی گئی ہے"

"اور باپ؟"

"تمہاری دوائی لانے گئے ہیں۔ اب چپ چاپ رہو۔ سمجھے؟ جلدی اچھا ہونا ہے نا؟ موٹر آتے ہی کھیلنا ہوگا ...."

اس طرح مہادیو کے ساتھ پیار بھری باتیں کرکے دلیپ باہر آیا۔ زینہ سے اترتے ہوئے سرلکھا نے پوچھا

"ماں کہاں ہے اس بچہ کی؟"

"چار دن پہلے مر گئی"

"اور باپ؟"

"کل کے ہنگامہ میں گولی چلی تھی اس میں مر گیا"

"گولی؟"

"ہڑتال والوں نے مل کے سامنے کافی تعداد میں اجتماع کیا تھا اسے منتشر کرنے کے لئے پولیس نے گولی چلائی ...."

"تم کہاں تھے اس وقت؟"

"اس بچے کے باپ کے پاس ہی"

سرلکھا کے سارے جسم میں گویا بجلی کی ایک تیز لہر سرایت کر گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"آج تمہیں اسٹیشن پر آنے میں دیر ہوئی اسکی وجہ یہی تھی کیا؟"

"اس وقت ہڑتال کرنے والوں کی مجلس تھی اور کل کے گولی چلنے کے واقعہ سے میں اسقدر زیادہ متاثر ہوا تھا کہ جوش و خروش میں تقریر کرتے کرتے اتنا دلیر ہو گیا کہ ...."

"زندگی کے مقابلہ میں ہنر یا دہی نہ رہ سکا"

دلیپ ہنس پڑا۔

"اور اگر میں تھرڈ کلاس میں آئی ہوتی تو میرے باقی ماندہ پیسے؟"

"میری بنک بک میں جمع ہو جاتے!"

"یہی تاج محل تمہارا بنک بک ہے نا؟"

"دیکھا۔ وہ پیسے اس بیمار بچے کے کام آتے اس بیوہ عورت کو دیکھا تھا؟ وہ مہادیو کی کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ مگر پھر بھی رات رات بھر جاگ کر اسکی خدمت کرتی ہے۔ اور جو کچھ مل جاتا ہے کھا لیتی ہے۔

دیکھا یہ میرا تاج محل اور اس میں پریم کی تصویر؟"

(باقی آیندہ)

منکوحہ

از

جناب آشنا دہلوی بی اے

والدین نے بوجھل دل سے ثریا کو وداع
والدہ کی روتے روتے گھگھی بندھ رہی تھی باپ
ںھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ بھائی بہن رو رہے
سہیلیاں ڈھاڑیں مار رہی تھیں۔ در و دیوار تک
زن و ملال ٹپک رہا تھا۔ گویا گھر بھر پر غم کی کیفیت
اتھی۔ جیسے دیکھو چہرہ بشاش، فاخرہ ملبوس زیب
کئے ہوئے مگر آنکھوں سے غم کے آثار نمایاں
ہ سماں ہی کچھ ایسا تھا کہ ثریا کا دل اثر لئے بغیر
سکا۔ جولانیٔ طبع جو جوان اور چنچل لڑکیوں کی
ازی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ تو ہوئی رخصت
سی عزیز شے کے کھو جانے کی سی بے چینی کی
ت محسوس کرنے لگی۔ وہ جہاں عمر کی اٹھارہ
یں بے فکری کے عالم میں بسر ہوئی تھیں آخر کو
ٹ رہا تھا۔ جدائی کے خیال نے میٹھا سا درد پیدا
یا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ایک آہ بھری، آنسوؤں
رم گرم قطروں کی ردا امڈ آئی جو حنائی ہاتھوں
پ ٹپ گرے جن سے جل جانے کی سی حس پیدا
ی۔ ایک بار چیخنے کی بھی کوشش کی مگر کچھ تو حیا
کچھ آنیوالی مسرتوں کا احساس گلوگیر ہوا۔ چلاّ تو نہ
سکی مگر چند قطرے بہا کر رہ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے ڈولی
کے پہلو کو تھاما تاکہ توازن قائم رہے۔ اور کہار اٹھاتے
وقت گرا نہ دیں۔ ڈولی میں سے حجاب تکتے ہوئے
میاں کی صورت پر نظر پڑی تو حیرت سے انگلی کاٹی کہ
کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی کہ سہرہ اتنا سجا اور حسن اتنا
کھلا ہوا تھا کہ سبحان اللہ! راستہ بھر وہ اپنی آیندہ زندگی
کے حالات کے تصور میں کھوئی رہی۔

*

حیا کی مدت ہو چکی۔ سو بار کہنے پر کھانا کھانے
کا زمانہ ختم ہوا۔ خود سمٹنے کے بجائے اب تو گھر بھر کو سمیٹنا
شروع کیا۔ ہاتھوں سے نہیں بلکہ نگاہوں سے جائزہ لیکر
ذہن میں جگہ دینی تھی کہ ہر شے پر نظر رہے اور کوئی چیز
قرینے کے خلاف یا اپنی جگہ سے غائب نہ ہونے پائے
تاکہ صحیح معنوں میں وہ گھر کی مالک ہو سکے۔ میاں کی کمائی
اور آمد و خرچ کے توازن کا خیال بھی رکھنا تھا نیز فضولیات
مثلاً فالتو پارچہ جات، خوشبویات، عطریات وغیرہ کیلئے
موزوں رقم بھی پس انداز کرنی اور بہانے بھی سوچنے
تھے۔ . . . . اس نے ماحول کو بیگانہ سا پایا
تو آنکھیں کھولے کانوں کو بیدار کئے، معجز بیان زبان

اور سحر طراز حسن کے جادو سے ہر شے کو اپنے معیار ثریا پر جان چھڑکنے اور محبت کا دم بھرنے والا تھا۔ جس کو دیکھے بغیر آرام نصیب نہ ہوتا۔ جس کا دفتر میں دیر سے جانا اور جلدی چلا آنا معمول تھا۔ اور دفتر میں بھی تقریباً اداس اور چپ سادھے رہنے کا عادی تھا۔ جس خاوند کو بیوی کی ہر شے میں نفاست کی جھلک معلوم ہوتی تھی جو ہر ادنیٰ سی بات پر مفتون ہوا جاتا تھا۔ وقت گذرنے پر بدلنا شروع ہوا۔ پہلی ملاقات کے باعث جب دو اجنبی دل ملے تھے، انسیت سی پیدا ہوگئی تھی۔ باہمی میل جول سے ایک قسم کی کاروباری مجالست میں بدلنے لگی۔ محبت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ جیسے کہ چاند کی روشنی پو پھٹتے وقت پھیکی سی پڑجاتی ہے یا کنول کے پھول پر سے آخری کرن سمیٹ کر سورج کے افق مغرب کی تاریکی میں چھپنے کے ساتھ فضا میں دھند سی چھا جانے پر دن کی روشنی میں تاریکی سی جھلکنے لگتی ہے۔ وہی حالت اس وقت میاں کے مزاج کی تھی۔ اس کے خیالات میں گونہ تبدیلی رونما ہوئی۔ پہلے پہل زیبائش کی چیزیں بن مانگے لادی جاتی تھیں۔ مگر اب تو فرمائشوں پر بھی لیت و لعل اور بڑی خوبصورتی سے التوا پر التوا ہونا شروع ہوا۔ اور اگر کوئی شے لائی بھی گئی تو گھٹیا مگر اتنی بتائی جاتی کہ شاید کسی اعلیٰ خاندان کے استعمال کے معیار کی قیمت ادا کی گئی ہو۔ جہاں ثریا کو ایک خوبصورت "دیوی" سمجھتا اور "لکھشمی" کہکر پکارتا مگر اب خود کو مالک اور اسے مملوکہ خیال کرنے لگا۔ اپنی مرضی کے خلاف ذراسی بات بھی برداشت کرنے کی سکت نہ رہی بلکہ سامان خورد و نوش میں مرچ مصالحہ کے توازن سے بڑھکر بیوی کے لباس وغیرہ پر

رائے زنی اور نکتہ چینی کرنے لگا۔ درآں حالیکہ وہ نسوانی نفاست کے باب میں جاہل اور محض کورا تھا۔ رنگوں کے توازن اور ان کی مناسبت کے اصول سے بیگانہ تھا۔ مگر تھا تو مرد۔ ثریا کا خاوند۔ اس کا مجازی خدا۔ اور اسے ہر طرح سے حق پہنچتا تھا کہ کوئی نہ برداشت کرسکنے والی حماقت آمیز تجاویز پوشش اور "میک اپ" کے باب میں پیش کرکے ناک میں دم کر دے۔

ایک دن میاں کی طبیعت خراب ہوگئی، علالت تھی کہ میاں پر وحشت سوار ہوئی رات بھر سونے نہ دیا۔ کبھی "پانی دو" کبھی "سر دباؤ" کبھی یہ کر، کبھی وہ کر۔ صبح کو ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ ثریا نے کہا "میں دوائی منگوائے دیتی ہوں" مگر میاں جانے پہ مصر تھے۔ اور مجذوبانہ محویت کے انداز میں بھاگنے پہ آمادہ بیوی کو ناگوار تو گذرا مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ بجز اس کے کہ وہ اسے جانے دے۔ تنخواہ کا آخری روپیہ حوالے کیا اور کہا "یہی باقی دنوں کا خرچ تھا" میاں بخار سے پھنکا ہوا تھا سنکر آگ بگولہ ہوگیا۔

"باقی روپے کیا ہوئے؟" جھنا کر کہا۔

"ہونا کیا تھا" جواب دیا۔

"پھر بھی؟" کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

"پھر بھی کیا؟" نسوانی ادا کی طمطراق سے کہا۔

"پچاس روپے میں ایک ساری۔ ایک بند دن کی چوڑی"..........

"بس......بس" میاں نے منہ چڑاتے

اور کف لاتے کہا "ہر وقت ساری جمپر ......" اور پھر طیش میں مکان کے باہر چلا گیا۔

ایک دن ثریا بغیر میاں سے پوچھے حسب معمول اپنی خالہ کے ہاں چلی گئی۔ خاوند کسی کام کی وجہ سے دفتر کے وقت گھر آیا۔ تالہ پڑا دیکھا تو غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ تالہ توڑ ڈالا گیا۔ جاتے وقت دوسرا تالہ لگا کر دفتر کی راہ لی۔ جب ثریا گھر کو لوٹی تو عجب معاملہ دیکھا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سکت نہ رہی کہ کچھ کہہ سکے۔ خیال کیا کہ کوئی گھر لوٹ کرنے گیا۔ اور ستم ظریفی یہ کی کہ دوسرا تالا لگا دیا۔ چکرا کر گرنے کو تھی کہ پڑوسن کے بچے کو توتلی زبان میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا خیال کیا کہ شاید حقیقت حال کا انکشاف ہو حوصلہ کیا تو اڑوس پڑوس والیوں سے معلوم ہوا کہ یہ خود میاں کا کام تھا۔ اب تو غصہ میں بھری پڑوسن کے ہاں جا بیٹھی وقت انگاروں پر کٹ رہا تھا۔ دفتر کے بعد "بابو جی" کی گھر کو آمد ہوئی۔ تالا کھول رہا تھا کہ بیوی بھی پہنچ گئی اور غرا کر بولی "یہ کیا حرکت ہے؟" "حرکت کیسی؟" کھسیانے ہو کر جواب دیا گیا۔ "تم کہاں تھیں؟" ....

...... "مجھے کیوں پریشان کیا"

"میں بھی تو پریشان ہوا" یہ کہتے کہتے دونوں اندر چلے گئے۔

ثریا کی بھتیجی کی شادی تھی۔ رسمی طور پر بڑے بوڑھوں کے صلاح مشورے کے مطابق سب کچھ بنایا مگر خاص طور پر ایک بار پھر ثریا نے اپنی وہ لیس انداز رقم جس کو اس نے میاں کی بیماری میں بھی چھپایا تھا صرف کر دی۔

جانے کا وقت آیا تو خیال کیا "چلو میاں کو کپڑے ہی دکھا دیں" دکھاتے دکھاتے بے خیالی میں یا دانستہ وہ ہار بھی دکھا ڈالا۔ خاوند دیکھ کر پھولا نہ سمایا کہ بڑی کفایت شعار بیوی ملی کہ چوری چھپے جمع کر کے زیور بنا لیا مگر حقیقت حال سے آگاہی پانے کے بعد وہ چین بے چین ہوا۔ ایک غریب "بابو" کی دو سال کی بچت اسے واہ واہ کی نذر ہوتے معلوم ہوئی اور کسی خاص مقصد سے نہیں صرف یہ کہ "بڑی اچھی لڑکی ہے"

آئے دن کے جھگڑوں نے خطرناک صورت حالات اختیار کر لی۔ میاں محتاط رہنے لگا اور روپے کو کنجوسی سے خرچ کرنے لگا۔ ہاتھ سے روپیہ دینا گویا اپنی جان کو کسی کے سپرد کرنا تھا۔ اکرامنوں اتنی بڑھی کہ میلے کچیلے کپڑوں میں بھی "ماں" "بچے" کو دیکھ کر ترس نہ آتا۔ بیچاری خود دھولیتی اور پہن لیتی۔ وہ حسن جسکو چاند دیکھ کر پاش پاش ہو جاتا اور کلیاں چٹک جاتیں جسے دیکھ کر آنکھیں کبھی سیر نہ ہوتیں اب انحطاط کی طرف ترقی کرنے لگا۔ جھریاں۔ منحوس گڑھے آہستہ آہستہ مملکت حسن پر چھا جانے لگے۔ اور وہ جو آرائش محفل تھی اب صرف ایک عمومی اور روزانہ کی چیز ہو کر رہ گئی۔ انتہا ہو گئی! والدین بھول گئے سہیلیوں نے بھی خبر نہ لی بخت میں واقعی کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

ایک پُرلطف شرارت

از

جناب سرمد جمالی

زندگی میں بعض ایسی ساعتیں بھی آتی ہیں جن کی یاد اپنی رنگینی اور لطافت، شوخی اور ظرافت کی وجہ سے دلوں پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر چند کہ یہ گھڑیاں گذر جاتی ہیں لیکن ان لمحات کا صرف تصور ہی ہمارے لبوں کو آشنائے تبسم بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ اگر دنیا کے واقعات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو نہیں کوئی بات بھی ہنسانے والی نہ ملے گی۔ یا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ مسرت کا راز زندگی کی چلتی پھرتی تصویروں میں مضمر ہے جن کی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ہمارے دلوں میں محشرِ خیال برپا کر دیتی ہے۔ ظرافت دراصل نام ہے زندگی کے بے ڈھنگے پن کا بے جوڑ واقعات کا، اور حقیقت کے نہ سمجھنے کا سچ تو یہ ہے کہ اگر آئے دن ایسی "گدگدیاں" اور "چٹکیاں" نہ رونما ہوتی رہیں تو انسان گھبرا کر اس دنیا سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہو جائے۔

کالج عموماً اور ہوسٹل خصوصاً ان باتوں کیلئے زیادہ بدنام ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا منحوس روز گذرتا ہو جب کسی ہوسٹل میں بہ

ع جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی۔

کا ثبوت نہ ملتا ہو۔ میاں اصغر لا کالج کے طالب العلم اور ہوسٹل ہی میں اقامت گزیں تھے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے آپ کی شادی خانہ آبادی کچھ ہی مہینے ہوئے اپنی چچازاد بہن سے انجام پا چکی تھی۔ اسکی اطلاع ہوسٹل کے لڑکے کو تھی۔ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس سے دلچسپی لینے کی کوشش میں تھا خصوصاً مسٹر علیم اور انوار زیادہ پیش پیش تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ میاں اصغر اپنی اہلیہ محترمہ کی شانِ مبارک میں کسی قسم کا "ناشائستہ" اور "شرافت سے گرا ہوا لفظ" بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کی اس ادائے احتراز نے سمند شوق پر گویا تازیانہ کا کام کیا اور اب کسی نہ کسی عنوان سے ان کی محترمہ کے متعلق ایسی ویسی باتیں تراشی جاتیں جن کو سنکر وہ موئے آتش دیدہ کی طرح پیچ و تاب کھاتے تھے۔ یہ کیفیت ابھی اپنے پورے شباب پر تھی کہ ایک اور ہی گل کھلا۔

۹ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے اور میاں اصغر کا یہ حال تھا کہ اپنے کمرے میں متفکر اور پریشان بار بار دروازے کی طرف دیکھتے اور پھر مایوس ہو کر گردن جھکا لیتے تھے، آپ

سمجھئے یہ انتظار کس کا ہو رہا ہے؟ میں بتاؤں، ڈاک پیئون کا، آپ فرمائیں گے کیونکر؟ میں کہوں گا اس طرح کہ۔

کہیں چھپتی بھی ہیں ظالم، پیار کی باتیں محبت کی آنکھیں۔

جی ہاں تو ان کی آنکھیں محبت کی غمازی کر رہی تھیں اور وہ کسی، کے خط کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ یاروں کو ایک نیا شگوفہ ہاتھ آیا۔ ابھی اسی مسئلہ پر زور استدلال صرف ہو رہا تھا کہ دور سے ڈاک پیئون آتا دکھائی دیا۔ جناب علیم تو اسی تاک میں تھے ہی، پوچھا، مسٹر اصغر کے نام کا کوئی خط ہے؟ اس نے جواب میں ایک رنگین اور معطر لفافہ بڑھا دیا۔ ڈاک پیئون تو خط دیکر آگے بڑھا اور میاں علیم باز کی طرح خط کو اپنے مضبوط پنجوں میں دبو چکر انوار کے کمرے میں پہنچے۔ دونوں نے سر جوڑ کر کچھ مشورے کئے اور اس کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہوسٹل کے خدمتگار نے تقریباً دس بجے اصغر کے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے ایک لفافہ دیا۔

"آپ کے نام یہ خط آیا ہے"

"پہلے کیوں نہیں دیا؟"

"حضور یاد نہیں رہا"

"آیندہ سے ہمارے خطوط فوراً مجھے دیدیا کرنا سمجھے؟"

"بہت اچھا سرکار"

اصغر نے جلدی جلدی لفافہ چاک کر کے خط پڑھنا شروع کیا لیکن ابھی دو چار ہی سطریں پڑھی ہونگی کہ چہرے کا رنگ بدلنا اور دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔

جب خط ختم کیا تو چہرہ زرد زرد تھا اور دل سرد سرد کچھ توقف کے بعد اس نے خط کو دوبارہ پڑھا اور پھر وہی حال ہوا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

مظفر پور۔

۲۱ جنوری ۱۹۴۱ء

جناب اصغر صاحب، السلام علیکم۔

میں آپ کو اس طرح مخاطب کرنیکی معافی چاہتا ہوں میں آپ کے لئے ایک اجنبی سہی لیکن آپ میرے لئے نہیں مجھے خود حیرت ہے کہ میں آپ کو یہ خط کیوں اور کس طرح لکھ رہا ہوں۔ کچھ دنوں پہلے اگر کوئی میرے سامنے آپ کا نام بھی لیتا تو شاید میں سننا گوارا نہ کرتا۔ اس جملے سے آپ کی توہین مراد نہیں بلکہ امر واقعہ کا اظہار مقصود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مستقبل پر کس کا بس چلا ہے ہم آپ، سب واقعات کی چکی پر ایک ذلیل کیڑے کی طرح گردش میں ہیں۔ شاید کچھ عرصہ پہلے میں آپ کے متعلق بہت ہی نازیبا خیالات اپنے دل و دماغ میں پال رہا تھا۔ لیکن اب کہ میری ساری تمنائیں خون ہو چکیں میں نہیں چاہتا کہ آپ کی زندگی بھی ویران اور برباد کر دوں ممکن ہے آپ کو اس حقیقت کا علم نہ ہو کہ آپ جس جنس نازک کے خریدار ہیں کبھی وہ میری آغوش خیال کی زینت بن چکی ہے۔ اور ہم دونوں بھی ایک دوسرے کو فرشتوں کی طرح پیار کر چکے ہیں۔ میں نے ثریا کے والدین پر لاکھ اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہا کہ وہ مجھے اس سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیں لیکن انہوں نے صرف میری غربت اور ناداری کی بنا پر مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے

اس صدمۂ جانکاہ کو جس طرح ہوا برداشت کیا اور ایک حرفِ شکایت بھی اپنی زبان پر نہ لایا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مصیبت کسی طرح ختم نہیں ہو چکی اور آپ کی رفیقۂ حیات اب بھی خط و کتابت کرنے سے باز نہیں آتیں۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ وہ مجھے بھول جائیں اور اس سودائے خام کو اپنے دل سے نکال دیں مگر وہ پھر بھی وہی طفلانہ حرکت کرتی رہتی ہیں۔ آخر مجبور ہو کر آپ کے پاس یہ خط روانہ کر رہا ہوں کہ انہیں کسی طرح سمجھائیے اور اپنی محبت بھری باتوں سے میری یاد ان کے دل سے بھلا دیئے۔"

خیر اندیش

محمد

اس واقعہ کے دو یا تین گھنٹے بعد علیم اور انوار اپنے کمرے میں بند ہو کر ایک خط پڑھ رہے ہیں اور ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں خط یہ ہے۔

پٹنہ

۲۳ جنوری ۱۹۴۱ء

جناب چچا صاحب مدظلہ۔

کچھ عرصہ ہوا آپ کا سرفرازنامہ موصول ہوا جس کا جواب جلد نہ دے سکا۔ سخت نادم ہوں۔ لیکن اس وقت میں آپ سے کچھ دوسری اور اہم باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ توجہ سے سنیں گے اور اس کا کوئی مناسب جواب مرحمت فرمائیں گے۔

جب سے میری شادی ہوئی ہے میں اپنی شریکِ زندگی کو کچھ اداس اداس سا پاتا ہوں میں نے انہیں خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی لیکن مجھے تسلیم ہے کہ میں اسمیں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ مجھ سے کبھی کبھی ہنس کر باتیں بھی کر لیتی ہیں لیکن یہ ہنسی پھیکی پھیکی اور بناوٹی معلوم ہوتی ہے۔ میں انہیں خط لکھتا ہوں تو ہفتوں بعد اس کا جواب ملتا ہے۔ آخر اس بے رخی اور سرد مہری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟۔

میں اس سوال کا حل عرصہ سے تلاش کر رہا تھا مگر اب تک کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں نے شادی سے پہلے کچھ افواہ سنی تھی لیکن میں نے کبھی اس کا یقین نہ کیا تھا۔ لیکن واقعات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ان ساری بدگمانیوں کو صحیح سمجھوں مجھے افسوس ہے کہ آپ نے جانکر بہلوتہی کی اور میرے ضعیف کاندھوں پر ایسا بوجھ ڈالدیا جو میری برداشت سے باہر ہے۔

میں اس وقت نیم مجنون ہو رہا ہوں اور مجھے خبر نہیں کہ میں نے کیا کچھ لکھ مارا ہے۔ لیکن مجھے اب اس کی پرواہ کیوں ہو مجھے اب کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے مجھے معلوم ہے کہ خودکشی حرام ہے لیکن عزت کیلئے ایسی بےحیا زندگی بےکار ہے، لیکن نہیں میں ایسا بزدل نہیں کہ مرکر اس مصیبت سے نجات حاصل کر لوں۔

میں ممکن ہے آج شب تک وہاں پہنچ جاؤں۔

نوٹ:۔ اس خط کے ساتھ ہی ایک اور خط بھی آپ کے ملاحظہ کے لئے منسلک کر رہا ہوں۔

خاکسار

اصغر

اسی روز شام کے وقت ——

— مہندرو گھاٹ پر مظفر پور جانے کے لئے جہاز کھڑا ہے۔ اصغر بھی ٹکٹ کے انتظار میں علیم اور انوار کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہے۔ یاران ستم شعار اس کی بدحواسی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور پوچھ رہے ہیں کہ اس نے یک بیک یہ گھر جانے کی کیا سوجھی، کیا بیوی نے بلایا ہے؟ اصغر شاید اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہونے کی استطاعت کھو بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں جھکی جھکی سی پھر رہی تھیں اور اس کے رخسار پر ایک ابر سا چھایا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کے سیاہ حلقے صاف بتا رہے تھے کہ [illegible] آنکھوں سے ہنس رہا ہے تو کیا اس کا دل [illegible] رہا ہے۔ بالکل تلخی کے آسمان سے بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔ [illegible] ادھ کھلے اور آدھے بند تھے۔ غرض اس کی ہر حرکت سے [illegible] کا اظہار ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مدتوں کا بیمار ہو۔ علیم اور انوار پر بھی اصغر [illegible] حالت کا اثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور دونوں [illegible] اشاروں میں [illegible] کر لیں۔ آخر جب ٹکٹ لینے کا وقت آیا تو اصغر نے علیم کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دے کر کہا کہ وہ انٹر کلاس کا ایک ٹکٹ [illegible] لے آئیں۔ کچھ دیر بعد علیم نے اصغر کے ہاتھ میں ایک خط دیتے ہوئے کہا۔

"ایک شخص ابھی تمہارے نام یہ خط دے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ وہ ابھی آیا"

اصغر نے ایک تھکے ہوئے شخص کی طرح جس کو دنیا میں کوئی کام نہ ہو خط لے لیا اور آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ اس کے چہرے پر خون کی ایک لہر آئی اور گذر گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے علیم کی طرف دیکھا اور پھر خط پڑھنے لگا۔ آخر اس نے خط کو جیب میں رکھتے ہوئے ایک ہلکی سی خفگی بھری مسکراہٹ کے ساتھ علیم اور انوار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ —

"واللہ! تم لوگوں نے آج مجھے بہت ستایا۔ مجھے ایسی امید نہ تھی۔"

علیم اور انوار (یک زبان ہو کر) "تو آپ وعدہ کرتے ہو کہ اپنی بیوی سے مذاق کرنے میں برا نہ مانو گے؟"

اصغر (مسکرا کر) کیا خوب!

؎ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

اور آخر ہنستے ہوئے تینوں اسٹیشن سے واپس لوٹے

(بقیہ منگوحہ صفحہ ۳۰۵ کا)

[illegible] گرتے تو اور ٹھوکر لگائی جاتی ہے۔ مبارک تم دلہن کا [illegible]۔ سہیلیوں کی فراموشی کچھ بھی [illegible] خیال آیا تو دل پر [illegible] رہ جاتی.... وہ [illegible] آنکھ پلکوں سے ڈھلکے [illegible]

متوحش سی ہو کر [illegible] اور [illegible] آنسو پونچھ کے آئینہ میں صورت دیکھی تو ہو بہو مرحوم [illegible] آنکھیں [illegible] زرد تھا اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ رنگ فق [illegible] زرد ہو رہا تھا۔ چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہ سکی سانس [illegible] ہو رہی تھی۔ وہ پھر چارپائی پر گر گئی۔ گذشتہ واقعات اس کے گرد و پیش ناچ رہے تھے۔

سنبھلی تو ثریا کے کانوں میں ابھی تک چوری چھپے سنی ہوئی رشتے کے متعلق باتیں گونج رہی تھیں۔

(از)

جناب سید مرتضیٰ فضل علی صاحب

ایک ضعیف انسان نحیف و نیم مردہ دماغ، ہجوم آرزو میں گم، صدمے کے داغ جھریاں بنکر چہرہ پر منتشر، کمر غم و الم کے بوجھ سے جھکی ہوئی، پہلوؤں حسرتوں کے خون سے سینچا ہوا پژمردہ دل، ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی عصائے امید بوڑھاپے کا آخری سہارا۔ زندگی کے منازل طے کرتے کرتے کسی خاموش پرسکون جنگل میں اپنے آپکو تن و تنہا بے یار و مددگار پاتا ہے، جنگل بھی گویا اُس کی ضعیفی پہ آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا ہے۔ اشجار و طیور بھی اُس کی بیچارگی اور بے بسی کا گیت گا رہے ہیں جیسے اُنکو تو کبھی فنا ہے ہی نہیں، بیچارہ ضعیف دنیا سے گھبرا کر اس کے گرد آلود دامن سے جان بچا کر اس گوشۂ تنہائی میں آیا تھا۔ امیدوں کا نشیمن لیکر یہ سمجھکر کہ شاید قدرت اس کے جذبات کی قدردانی کرے۔ اور اُس کو سہارا دے سکے لیکن یہ بھی اوروں کی طرح بجائے تسلی و تسکین دینے کے طعن و طنز میں مصروف ہوگیا۔ پریشان خیالات کی پرزور آندھی سے ضعیف کا ضعیف دماغ اڑا جا رہا ہے۔ کچھ یادیں آ رہی ہیں اور اس کے رخساروں پر آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ جس طرح ایک تیز رو ندی پرانے چٹانوں کے سینوں کو چیرتی ہوئی بہتی نظر آتی ہے۔ کتنی بے رحم ہے یہ زندگی اور کتنی بے رحم ہے یہ یاد جو ایک ایسے شخص کو جو زندگی سے عاجز ہو چکا ہو۔ اپنی [illegible] کو خوب رو چکا ہو جو موت سے دوچار ہونے کیلئے ہمہ تن تیار ہو چکا ہو، دنیا کو خیرباد کہہ دینے کے لئے بے قرار ہو بار بار ستا رہی ہے اور اس کے دل کی پژمردگی کو اور کمھلا رہی ہے۔ مگر دل جوان کیونکر ہو۔ وہ دل جو حسرتوں کے خون میں رنگا جا چکا ہو، کلیجہ جو [illegible] سے کچلا جا چکا ہو جسے [illegible] کی آگ میں جلایا گیا ہو، جو [illegible] کی سل میں پیسا گیا ہو۔ کیا کبھی پھر اپنی اصلی حالت پر آ سکتا ہے، اگر پھول کی خوشبو جو خزاں کے ظالم پنجوں کا شکار ہو چکی ہے اُسے واپس مل جایا کرتی تو اس دنیا پر دکھ سکھ کی کہانی ایک بدنما حقیقت نہیں رہتی بلکہ ایک منحوس خواب، یہ قدرت کا عجیب مذاق ہے کہ وہ مجروح انسانوں کے جذبات سے کھیلتی ہے خود تو مزا لیتی ہے۔ پر تڑپاتی ہے ان زخمی دلوں کو جو زخم کھاتے کھاتے آہوں کا مسکن بن گئے ہیں۔

یکایک فضا بدلتی ہے شجر و حجر میں نئی جان پڑجاتی

ے، سبزہ ہرانے لگتا ہے، قدرت کا زمردیں فرش جسکو
فتاب کی تباہ کن روشنی نے جلا کر خاک کر دیا تھا چاند
ن پیشانی کو دیکھ کر پھر سے تر و تازہ ہوگیا۔ نغمہ سنجان
ن صحبت ولولہ اور خوشی کے نغمے چھیڑنے لگے ماہ
ن وصحبت کے دیوانوں کی گفتگو اور ملاقات کا
ان کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ ضعیف انسان کے
ں میں ایک نیا خون دوڑ گیا۔ اور وہ بے چین ہوگیا
کے تصور نے اُس کی جوانی کے ایک پرسوز نظارہ
ن کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا۔

ایک پچیس ۲۵ برس کا حسین نوجوان کسی کا بیقراری
نتظار کر رہا ہے۔ خاموش ہے لیکن دل امیدوں کا
ن بنا ہوا ہے۔ اتنے میں ایک حسین دوشیزہ موتی
تی، پھول بکھراتی اس کے قریب آپہونچی، دو ملے
ے دل ملے محبت نے فرض پر غلبہ پایا۔

ساجدہ ایک شوہر دار عورت ہوتے ہوئے بھی
عاشق کو نہ بھول سکی کنج تنہائی میں آئی اور راز و نیاز
توں میں مصروف ہوگئی۔ خوش تھے دونوں خوش نصیب
بدا تھے پھر بھی قریب تھے۔ بجلی کی کرج نے ان دو
نوں کو چونکا دیا۔ ماہ خنداں کسی ہونیوالے خوفناک
تے کو تاڑ کر بادلوں میں جا چھپا۔ کہاں تو اتنی روشنی
فضا روشن تھی۔ اور کہاں یہ تاریکی کہ ایک دوسرے
کھنا محال تھا۔ ایک مہیب شخص کا ہاتھ نازک
ے شانوں پر پڑا جسطرح ظالم شیر کا پنجہ کسی بچے کے
ر پڑ جائے، ساجدہ چونک اُٹھی وہ خواب نہیں دیکھ
ھی۔ اس کا شوہر بغل میں کھڑا غصہ سے تھرا رہا اور

اوسکو گھور رہا تھا۔ محبت کی دنیا میں زلزلہ آگیا۔ لیکن صبر نے
دونوں کی امداد کی۔ ساجدہ خاموش اپنے شوہر کے ساتھ
ہولی۔ بیچارہ ممتاز نفرت اور غصہ کی آگ میں جلتا اپنے
گھر لوٹا۔ دوسرے دن اوسنے وہ خبر سنی جس نے اُسکی
امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے ارمانوں کا خون کر ڈالا
اُس کی محبت کے قلعہ کا قلع قمع کر دیا۔ خبر کیا تھی خزاں تھی
جس نے اس کی خوشی کا چمن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لوٹ
لیا۔ وہ حیران تھا۔ کہ ساجدہ نے خودکشی کیوں کی، دنیا
نے تو یہی سنا لیکن ممتاز کو یقین تھا کہ اس کی محبت کی
دیوی ایک مشکوک ظالم کا شکار ہوئی ہے۔ وہ مورت
جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن اور جوانی گذاری تھی۔ اب
پاش پاش ہوگئی، اور اس کے ساتھ اس کی زندگی بھی برباد
ہوگئی۔ وہ زندہ تھا تو کیا اس کا دل مر چکا تھا! اسکی
آنکھوں سے آنسو جاری تھے جیسے کوئی مسافر مسافت طے
کرتے کرتے اپنے ان سامانوں کو جو اس کے سفر کیلئے نہایت
ضروری ہیں کھو بیٹھے۔ اب یہ مسافر اپنی منزل کسطرح طے
کریگا۔ مگر یہاں عذر کی مجال ہی کس کو ہے ممتاز پاگل
ہوگیا تھا گھر والوں نے اس کو نکال دیا۔ اپنے بھی اس کو
افسوس اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غرض اس کا
کوئی بھی نہ تھا۔ در در کی خاک چھانتا پھرتا۔ آج پچیس
سال کی مدت گذر گئی، وہی جنگل ہے جو کبھی اسکی قسمت کا
گیت گایا کرتا تھا۔ لیکن افسوس آج اس نے بھی مُنہ موڑ لیا
وہ بھی ضعیف کی بے بسی پر ترس کھانے کے بجائے اسکو حقارت کی
نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کاش کہ اس نے اپنے فرض کو پہچانا
ہوتا اور جذبات کی آندھی میں بہ کر اندھی محبت کے ہاتھوں م

تلخیصات

روس کی تعلیمی ترقیاں

از

جناب سید ذوالفقار حیدر صاحب نقوی

لینن کا مقولہ ہے کہ جاہل اندھے ہوتے ہیں۔

یہاں ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ ایک جمہوری سلطنت کے مزدوروں اور ان کے بچوں کے لیے کس
تعلیم کی ضرورت ہے۔ انقلاب سلطنت کے پہلے اٹھارہویں صدی پورے زار روس کی سلطنت میں اور بڑے
صوبوں میں ۹۸ سے ۹۹٫۹ فیصدی جاہل تھے۔ تعلیم صرف اپنا نام ہی لکھنے تک محدود تھی۔ لیکن روسی
کمیونسٹ کام کی زیادتی سے اپنی ہمت نہیں چھوڑ بیٹھے تھے۔ کیونکہ انہیں تعلیم پر کافی بھروسہ تھا۔ انہیں یقین
بغیر تعلیم یافتہ لوگوں کے ہر صوبہ کی الگ حکومت وہ بھی وہاں کے باشندوں کے ہاتھ میں ہونا ناممکن۔
تعلیم کے لیے روسیوں پر زور نہیں دیا گیا۔ بالشیوک تحریک میں مزدوروں اور کسانوں نے
لیا؛ جنگل تعلیم کے سب سے جوشیلے معاون وہی کھیتوں اور کارخانوں میں ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کرنے والے
ہر اسکول میں کارخانہ اور کھیتی کا ایک سرپرست ہوتا ہے۔ مزدور اپنے اسکول پر فخر کرتے ہیں
ہی کسی اسکول کا ڈائرکٹر اپنے سرپرست سے امداد کا طالب ہوتا ہو۔

اسکول کا ڈائرکٹر سال میں دو مرتبہ جمعیت والدین کو اسکول کے کام اور ترقی کی خبر دیتا ہے۔ ڈ
صرف خبر ہی نہیں دیتا بلکہ والدین کی رائے اور مشورہ کو بھی دل و جان سے منظور کرتا ہے۔

انقلاب کے کچھ ہی دنوں بعد تعلیمی تحریک جاری ہوگئی۔ لیکن اس زمانہ میں حکومت اس قابل نہ تھی
اسکول کے لئے سامان اور مزدور مہیا کرسکے تو کسانوں ہی نے اپنے بچوں کے لئے اسکول تیار کیے اکثر وہ لوگ
نے چھوڑے ہوئے مکانوں یا کھنڈروں سے ایک ایک اینٹ نکال کر اسکول کے لیے مکان بناتے، ہر اس جگہ
جہاں اسکول کی ضرورت تھی۔ یہی تدبیر عمل میں لائی گئی۔ اسی قسم سے خود مزدوروں اور کسانوں نے سیکڑوں

تیار کر ڈالے اس کے بعد حکومت اپنے اہتمام میں اسکولوں کی عمارت تعمیر کرنے لگی ۱۹۳۷ء میں تقریباً ۱۵۰۰ اسکول تیار کئے گئے تھے لیکن کسی ایک اسکول کے تیار کرانے میں سال یا دو سال کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ۱۹۳۶ء میں صرف ماسکو میں ۱۷ اسے اسکول تیار کرائے گئے تھے ۔ کچھ تو چھ مہینہ میں اور کچھ تین ہی مہینوں میں گرچہ سب کی تیاری کو مکمل نہیں کہا جا سکتا لیکن اسپر بھی لڑکوں کو اچھے صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل گئے تھے ۔ کچھ ہی برسوں میں یہ اسکول دوبارہ نئے بنا لئے گئے ۔ ایک جمہوری سلطنت میں کوئی بھی حصول علم سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا ۔

سوویٹ تعلیم میں کچھ خاص باتیں ہیں جو اپنی نظیر ہیں ۔ اول بات یہ ہے کہ تعلیم کا بوجھ والدین کی گردن پر نہیں رہتا ۔ تقریباً ۸۰ فی صدی طلبہ کو وظیفہ ملتا ہے جو ان کے تعلیمی اخراجات کو کافی ہوتا ہے ۔

سوویٹ یونین میں ہر طالب علم کا یکساں خیال کیا جاتا ہے ۔ پہلے اعلیٰ طبقہ کے باشندے ایک ہی اسکول میں مزدوروں کے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے سے گریز کرتے تھے ۔ مگر حکومت نے اس امتیاز کو دور کر دیا انہیں سمجھا دیا کہ ہر بچہ اپنے ملک کا مایہ ناز فرزند ہو سکتا ہے ۔ اسلئے سب یکساں دیکھے جاتے ہیں ۔ اور سب کو ایک ہی قسم کے اسکول میں ایک ہی قسم کی تعلیم دیجاتی ہے ۔

ہر اسکول میں لڑکوں کو ہلکا ناشتہ یا کسی کسی اسکول میں کھانا بھی چھ پنس دینے پر ملا کرتا ہے ۔ وہ لڑکے جن کے والدین اس رقم کے دینے کی مقدرت نہیں رکھتے — اگرچہ ایسے بہت کم ہیں — ان کو مفت کھانا ملتا ہے ۔ جتنے نئے اسکول بن رہے ہیں انمیں جدید طریقہ کے مطبخ اور کھانا کھانے کے بڑے بڑے کمرے ہیں ۔

روس میں جماعت بندی یا مذہبی تفریق کوئی چیز نہیں ہے ہر جماعت ۔ ہر قوم اور ہر مذہب کے ماننے والوں کا یکساں خیال ہے ۔ ان کے بچے یکساں تعلیم پاتے ہیں ۔ روس میں تعلیم روسیوں ہی کی زبان میں دیجاتی ۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بچوں کو تعلیم ان کی مادری زبان ہی میں دینا چاہئے ۔ اس طرح غیر ملکی زبان سیکھنے کا ایک بہت اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے ۔ بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے بڑی آسانی ہو جاتی ہے ۔

سوویٹ کے سائنسدانوں نے تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لئے ۴۷ نئے حروف بھی ایجاد کئے ہیں ۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ ہی تعلیم پاتی ہیں ۔ کیونکہ ان کے خیال میں وہ زمانہ بہت جلد آ رہا ہے یا اب آ ہی گیا ہے ۔ کہ مرد اور عورت حصول رزق کے لئے بہت سخت جد و جہد کریں گے ۔ اسلئے انہیں ساتھ ہی تعلیم دیجاتی ہے ۔ تاکہ جس طرح اسکول میں دونوں ساتھ ساتھ رہیں ۔ اسی طرح تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی دونوں اپنی زندگی خوشی اور انبساط کے ساتھ بسر کر سکیں اسکول میں دونوں کو ساتھ پڑھا کر ایک دوسرے کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے ۔ ان کی آئندہ زندگی کو خوشگوار بناتا ہے ۔ لڑکیاں شادی کرنے کے لئے مجبور نہیں ہیں ۔ مرد اور عورت دونوں کو برابر مشاہرہ ملتا ہے ۔ عورتوں کو جب کوئی کام ان کے بچے کے متعلق ہوتا ہے تو حکومت ان کو ۹ ہفتہ کی چھٹی پورے مشاہرہ کیساتھ

یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ روس کی ساری تعلیم سیاسیات سے پر ہے۔ سوویٹ کے باشندوں کے نزدیک کوئی شخص تعلیم یافتہ کہے جانے کے لائق نہیں ہے۔ جبتک کہ ملکی اور غیر ملکی سیاسیات کی پوری واقفیت اور علم نہیں رکھتا ہے

روس میں تعلیم ہر لڑکے کی شخصیت بڑھانے کیلئے اور ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اسکول کے ساتھ ساتھ لڑکوں کے لئے کلب بھی ہوتا ہے جو خاص تربیت یافتہ لوگوں کی نگرانی میں چلتا ہے۔ اس جگہ ہر لڑکے کو اپنی ذاتی صلاحیتوں کے اظہار میں کافی سے زیادہ سہولت ہے مثلاً موسیقی۔ نقاشی۔ رقص، کھیل، ہر قسم کے سائنس کے نمونے، ہوائی اڑنے کی آزمائش کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ایسے کاموں کیلئے ہر قسم کی ضروریات مفت ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ اپنا گھر الگ بھی بناتے ہیں جو اصلاحی محل ( ) اور اصلاحی گھر ( ) کے نام سے موسوم ہیں اس میں اپنا تھیٹر، رقص کے کمرے، موسیقی کے کمرے، سائنس اور ہنر کے کمرے، کھیلنے کے کمرے اور کتب خانے وغیرہ ہیں۔ خارکوو کے اصلاحی محل میں ۶۴ اکرے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں صرف حکومت نے ۸۵ لاکھ اور مقامی حکام نے ۲ کروڑ ۵۴ لاکھ روبل (روسی سکہ) اسکول کے علاوہ دوسرے تعلیمی ضروریات پر خرچ کیا۔ یہ رقم اہل حرفہ نے چندہ کے ذریعہ جمع کی تھی۔ صرف طلبا کے فائدے خوشی اور مسرت کے لئے اعلیٰ درجہ کے تھیٹر اور اصطلاحی اسٹیشن ہیں ۱۹۳۶ء میں طلبا کیلئے ماسکو میں مندرجہ ذیل سامان تھے۔

ایک مرکزی اصلاحی محل۔ ۱۲ ضلع اصلاحی گھر۔ صنعت و حرفت کے لئے دس مکانات۔ ۲۹ پارک۔ ۱۴ اصطلاحی اسٹیشن ۱۸ طبیعات کے اسٹیشن۔ اور ۵ تھیٹر اس کے علاوہ جوانوں کے کلبوں اور پارکوں میں طلبا کا خاص حصہ ہے۔

اکثر جمہوری سلطنتوں میں جہالت کا نام و نشان مٹا دیا گیا ہے۔ کوہستانی علاقوں اور دائرہ شمالی میں بھی جہلا دس فی صدی سے زائد نہیں ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں درحقیقت ۸ برس سے نیچی عمر کے بچے تعلیم گاہوں میں نہیں تھے۔ برخلاف اس کے آجکل ان کی تعداد ۲۰ لاکھ سے زائد ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ طلبہ مع ۱۸ برس تک کے لڑکوں کے تھے امید کیجاتی ہے کہ ۱۹۴۲ء تک اتنے کافی اسکول اور مدرسے ہوجائیں گے کہ تعلیم ۱۸ برس تک کے لڑکوں کے لئے واجبی قرار دیجائے گی۔

آجکل جتنے طالب علم ہیں ان میں ۸۰ فی صدی کسانوں اور مزدوروں کے لڑکے ہیں۔ اسکول کے علاوہ جتنے ر[illegible] بچوں کی خوشی اور مسرت کے لئے ہیں وہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں زبردست معاون ہیں۔ اس سے لڑکوں کی ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں نے یہ ثابت کردکھایا ہے کہ ملک کا ہر بچہ ایک مایہ ناز فرزند ہوسکتا ہے۔ ہر بچہ ملک کا ایک درخشاں ستارہ بن سکتا ہے۔

اے کاش کہ ہندوستان کی قوم بھی اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر جہالت کو دور کرنے کی کوشش کرتی۔ کیا وجہ ہے کہ جہالت کا ہندوستان میں بول بالا ہے؟ اگر ہر قوم ایکدوسرے سے ملجائے، ایکدوسرے کو اپنا بھائی سمجھے۔ ایکدوسرے کی تکلیف کا خیال رکھے تو انہیں بیدار ہونیکا موقع مل جائے۔ اے کاش کہ ہم بھی علم کی روشنی میں سائنس سیکھنے کا موقع حاصل کریں۔

استدراک و بحث و نظر

کچھ مضمون سید غلام حسین کے متعلق

پچھلے مہینہ میں صاحب سیر المتاخرین "سید غلام حسین" پر جناب حکیم محمد نقی صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اتفاق کی بات کہ اس کی آخری سطریں چھپ نہ سکیں اس کے آخر میں "ندیم" کی طرف سے بھی ایک سطر لکھی گئی تھی۔ وہ بھی شائع نہ ہو سکی۔ وہ باقی ماندہ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے

"ندیم"

"میں کب کہتا ہوں کہ کامگار فرشتہ صفت تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے بھی کسی کے ساتھ غداری کی ہو۔ یا طوطا چشمی دکھلائی ہو۔ کیونکہ یہ اکثر حکمرانوں کا شیوہ ہی ہے۔
طوطا چشمی و غداری خاصکر نمک خواروں اور خادموں کی قابل ملامت سمجھی جاتی ہے نہ کہ بادشاہوں کی۔
اگر آپ کے سارے تاریخی حوالوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے کامگار کی ذات پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔
ہاں کامگار کے واقعات کی تلاش میں تاریخ فرشتہ کی ورق گردانی آپ کی واقعی قابل داد سعی ہے۔ اگر تاریخ ابن خلدون کو بھی اس کام کے لئے شامل کر لیتے تو اور زیادہ بہتر تھا۔"

ندیم اس سلسلہ بحث میں ندیم کی ذاتی رائے محفوظ ہے۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہمارے ایک لائق احترام اہل علم دوست کا ایک مکتوب آیا جس میں اس مضمون پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا۔ ہم نے موصوف سے اس نجی خط کے شائع کرنے کی اجازت لے لی تاکہ اس بحث کے بعض گوشے روشنی میں آجائیں، مکتوب کا وہ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ "ندیم"

"......حکیم نقی صاحب نے جواباً جو کچھ تحریر کیا ہے میری نظر سے گذرا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ صاحب سیر المتاخرین نے کامگار کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ صاحب سیر کے ساتھ ناانصافی کی جائے۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا تو کسی طرح بھی روا نہیں ہو سکتا۔

ہدایت علی خاں سے مہابت جنگ اور ہیبت جنگ کی بیزاری اس وجہ سے تھی کہ صفدر جنگ کی آمد بہار کے وقت جو ان کا رویہ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی مرضی کے خلاف تھا۔ سید غلام حسین خاں کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ان کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اسی وجہ سے یہ خود بھی بہار میں رہے اور ان کے اقربا بھی یہیں تھے۔

سید غلام حسین کی شادی جس وقت ہوئی تھی ان کی عمر اٹھارہ انیس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد ہی مصطفےٰ خاں اور ہیبت جنگ کی جو لڑائی ہوئی ہے۔ اس میں یہ شریک رہے ہیں۔ یہ خود تو ملازم نہ تھے۔ لیکن انکے حقیقی بھائی ہیبت جنگ کے نوکر تھے۔ ہیبت جنگ کے قتل سے کچھ ہی قبل یہ اپنے والد سے ملنے چلے ہیں راستے ہی میں تھے کہ قتل کی خبر ملی، لیکن، یہ واپس نہ آئے صاحب مضمون نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہیبت جنگ کی زندگی میں ان کا قیام بہار میں ناممکن تھا۔ ادھر قتل کی خبر ملی ادھر واپس آئے۔ یہ بالکل واقعہ کے خلاف ہے۔

صفدر جنگ کے واقعہ کے بعد سید ہدایت علی بہار سے چلے گئے۔ تو دہلی وغیرہ کی طرف رہے۔ ان سے جو آزردگی تھی وہ مستقل نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انکے بیٹے کی نسبت ہیبت جنگ کی بیٹی سے مقرر ہوئی تھی۔ اگر تعلقات بہت زیادہ خراب ہوتے یہ کیوں کر ممکن تھا۔ یہ شادی قوت میں نہیں آئی لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ سید غلام حسین کے ماموں عبدالعلی خاں اور مہابت جنگ سے سخت جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور سید غلام حسین کی ماں بھی اسمیں شریک تھیں۔ صاحب مضمون نے لکھا ہے کہ سید غلام حسین کی شادی ان کے خالو کی لڑکی سے ہوئی۔ اردو میں یہ لفظ خالہ کے شوہر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بیان صحیح نہیں۔ عبدالعلی سید غلام حسین کے ماموں تھے۔

صاحب مضمون کا یہ لکھنا کہ مجمع عام میں غلام حسین کے سر پیچ جواہر چھینا گیا۔ بالکل غلط ہے۔ جواہر کا سر پیچ جو ان کو شوکت جنگ نے دیا تھا۔ ان سے ضرور واپس لیا گیا تھا۔ لیکن نہ یہ بات مجمع عام میں ہوئی تھی۔ اور نہ سر سے اتار لیا گیا تھا۔ سید غلام حسین کو پورنیہ اور بعد میں بہار چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس میں ان کی تذلیل مقصود نہ تھی۔

واضح رہے کہ صاحب مضمون نے سیر کے سوا کسی اور کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ غلام حسین کے بیان ان کا ماخذ ہیں۔ اگر وہ غلام حسین کو جھوٹا سمجھتے ہیں تو انہیں چاہئے تھا کہ دوسرے مصنفوں کے اقوال پیش کرتے وہ یہ نہیں کر سکتے کہ ایک ٹکڑا تو ان کے بیان کا قبول کریں۔ اور دوسرا ٹکڑا (بغیر اس کے کہ کسی دوسرے مورخ کے قول سے اس کی تردید ہو) رد کر دیں اور اس کی جگہ اپنی جانب سے اضافہ کر دیں۔

یہ دعویٰ کہ سیر کے سوا ایک ہی دو کتابیں آخری عہد پر لکھی گئی ہیں۔ بڑی عجیب ہے صاحب مضمون کم از کم سر جادو ناتھ سرکار کی کتاب ہی دیکھ لیتے تو ایسی بات زبان سے نہ نکالتے۔ مجھے حیرت ہوئی ہے کہ سیر المتاخرین کی سی کتاب سے (جس کے فارسی نسخے چھپے ہوئے ملتے ہیں جس کا انگریزی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے) غلط حوالے دینے کی لوگوں کو کیونکر ہمت پڑتی ہے۔

ادبیات

ننگ ملازمت

از [illegible]

بلبل بہار حضرت سرپرکا بری مینائی

غلامی کے ٹکروں کا ہے جنکو چسکا | مبارک ہے سارے جہاں سے یہ طبقہ
سمجھتی ہے مردارخواران کو دنیا | زغن اور کرگس سے ہے ان کو رشتہ

نہ اہل تجارت نہ اہل ہنر ہیں
نئی شکل و صورت کے دریوزہ گر ہیں

نہ مسجد کا سجدہ نہ مندر کی پوجا | نہ اس گھر کی طاعت نہ اس گھر کی پوجا
نہ کاشی کی تیرتھ نہ پتھر کی پوجا | فقط چاہیئے ان کو افسر کی... پوجا

حریص غنا مال و دولت کے بندے
خدائی کے منکر حکومت کے بندے

وطن سے علالت کا تار آگیا ہے | غم مرگ احباب کا سامنا ہے
اگر گھر کا گھر مہمان قضا ہے | اگر گھر میں بے دفن مردہ پڑا ہے

تو بے اذن صورت نہ دکھلا سکینگے
نہ گھر جاسکینگے نہ کام آسکینگے

فقیری کہیں ایسی دولت سے اچھی | گدائی کہیں اس امارت سے اچھی
کہیں بھیک اس خوان نعمت سے اچھی | ہے موت ایسے جینے کی ذلت سے اچھی

خدا ایسی ساعت پہ عمر خضر ہو
عزیزان و احباب میں جو بسر ہو

ہے پیشی میں افسر کے آگے یہ منظر | گنہگار ہو جیسے نیچا کیے سر
زباں بند مہر خموشی ہے لب پر | کبھی ہو نہیں سکتیں آنکھیں برابر

شاہد معصوم سے خطاب

از
جناب ساغر [illegible]

آؤ کہ سنائینگے محبت کا ترانہ
ساغر کا فسانہ دل ساغر کا فسانہ
جانا تو دل و جان کا ہے ایک بہانہ
اک تیرے لئے چھوٹ گیا سارا زمانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

وہ چاندنی رات اور مری پہلی ملاقات
وہ شعر و سخن گفت و شنید اور مدارات
اور تیرا جھجکتے ہوئے وہ ترک حجابات
پھر شوق سے کہنا کہ کوئی اور ترانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

آنکھوں میں ہیں ابتک وہی پرسوز نظارے
اے جانِ گلستاں، وہ گلستاں کے کنارے
تو اور لب بام محبت کے اشارے
وہ میرا زمانہ تھا، یہ ہے تیرا زمانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

ہم رقص کیا کرتے تھے خاموش گلی کا
مانوس فضاؤں میں نظر آتا تھا جلوہ
اور میرے بغیر آپ کو بھی چین نہیں تھا
اک وہ بھی زمانہ تھا، ہے اک یہ بھی زمانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

تم جب سے گئے جیسے خفا ہو کے گئے ہو
یا اور کسی یاد میں مصروف رہے ہو
مانا مجھے بھولے ہی تم بھول گئے ہو
لیکن یہ کہاں تک مرے بھولنے کا بہانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

اے دوست مئے ہجر مسلسل کا یہ پینا
دشوار کئے دیتا ہے دو روز بھی جینا
اب ڈھونڈھتا پھرتا ہوں تری یاد کا زینا
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

اور تم تو کیا کرتے تھے اقرار محبت
انداز سے ہو جاتا تھا اظہار محبت
یہ کیسی نئی بات کہ انکار محبت
دیکھو تمہیں کیا آج سمجھتا ہے زمانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

مجبور ہوں میں عشق تو مجبور نہیں ہے
تم آؤ چلے آؤ یہ کچھ دور نہیں ہے
یا کہہ دو کہ ملنا تمہیں منظور نہیں ہے
وہ اور زمانہ تھا یہ ہے اور زمانہ
اے شاہد معصوم مجھے بھول نہ جانا

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

ندیم

مرتبہ: سیّد ریاست علی ندوی

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکالا

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

ہرمون اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اُنھوں نے انتہائی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت کو ہیا اینکا ئڈ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اسکے تجربات سکول سائنس اسٹی ٹیوٹ آف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جن میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات

اس یادوار جیون امرت کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن تبدیلی محسوس کرینگے چہرے کی جھریاں غائب ہو جائینگی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور ملائمیت آجائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے۔ چہرہ پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائے گی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے۔

دشمنِ جاں امراض کا خاتمہ

اوٹون کے سلور ڈراپ عمر کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری، سر کا چکرانا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا، چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا۔ کمر کا درد۔ مردانہ و زنانہ جنسی امراض ضعیف اعضائے رئیسہ ضعف گردہ و مثانہ عورتوں کی بر سمت کی بیماری۔ ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم اور دیگر رحمی شکایتوں کو فوراً دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آزمائش کا طریقہ اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات آزمانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں اور ایک فوٹو کھنچوائیں۔ ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

15,000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کر دے کہ اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات کسی حیوانی ہرمون یا وٹامن کی موجودگی سے ہیں تو ہم اُسے مبلغ ۱۵۰۰۰ پندرہ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کیلئے اسکی قیمت کچھ مدت کیلئے تین روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کر دے۔ آپ اسے تمام مشہور انگریزی دوا فروشوں سے خرید سکتے ہیں اگر نہ ملے تو ہمیں لکھئے محصول ڈاک معاف

میسرز گرانڈ فارمیسی پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲۳ کلکتہ

Sole Distributor

GRAND PHARMACY (N. G.)

POST BOX 2323 · CALCUTTA

صوبۂ بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ
فی پرچہ ۔

قیمت ششماہی عہ
۹ آنے

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

مرتبہ ــــــ سید ریاست علی ندوی

جلد (۱۸) ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء نمبر (۱)

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

جناب خان بہادر مولوی سید خیرات احمد صاحب مرحوم نے ۲۴ مئی کو اس دار فانی کو ۷۹ سال کی عمر میں الوداع کہا۔ مرحوم ہمارے صوبہ میں مشرقی تمدن کے عہد رفتہ کی یادگار باقی تھے۔ اور اس کاروان رفتہ عجب سے آخری مسافر تھے۔ اہل بیت سے فدائی اور مذہب شیعی کے پرجوش وارفتہ پیرو تھے۔ مرحوم کا تعلق ہمارے شہر گیا اور راقم سطور کے وطن آبگلہ سے دیرینہ تھا۔ وہ اس شہر کے نامی وکیل تھے۔ ۱۹۰۹ء تک اس پیشہ میں مصروف رہے۔ خان بہادر سید ہادی حسن مرحوم اور جناب سر سلطان احمد بالقابہ مرحوم کے نامور اخلاف ہیں۔ مرحوم کو شعر و ادب سے بھی مناسبت حاصل تھی، محب تخلص کرتے تھے۔ شیعہ سنی مناظرات پر بعض تصانیف بھی ہیں۔ اچھا ہوتا اگر ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو جاتا۔ دعا ہے کہ خداوند تعالی مرحوم کی خطاؤں سے چشم پوشی فرمائے، اور اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے علی گنج باڑی میں دفن ہوئے اللہ ان کی تربت کو ٹھنڈی رکھے

اردو زبان میں انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تدوین کی تحریک آج سے چوتھائی صدی پہلے بڑے زور شور سے اٹھی، مگر تمام تحریکوں کی طرح یہ بھی سرد ہو کر ماضی کی یادگار بن گئی۔ لیکن اسی سرزمین سے جہاں اردو میں ہر بڑے کام کے انجام دینے کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔ عمل کے نئے ولولہ مگر کامل سکون و اعتماد کے ساتھ یہ تحریک بھی زندہ ہوئی۔ اور جب کام کا نہ صرف پورا خاکہ بلکہ عملی قدم بھی اٹھا لیا گیا، اسوقت دلی مسرت کیساتھ اطلاع عام ہوئی کہ "اردو انسائیکلوپیڈیا" کی ترتیب و تدوین کی اہم خدمت حیدرآباد کے ارباب علم کے ہاتھوں انجام پانا شروع ہو گئی ہے۔ مجلس ادارت کی صدارت کی خدمت اردو کے دیرینہ خدمتگذار جناب ڈاکٹر سید محی الدین زور کے سپرد کی گئی ہے۔

مباحث کی فہرست تیار کر لی گئی ہیں۔ جو حسب ذیل ۲۶ ابواب پر مشتمل ہے۔

معاشیات و عمرانیات[1]، تہذیب و ثقافت[2]، تاریخ و سیاسیات[3]، جغرافیہ[4]، اسلامیات[5]، عربی زبان و ادب[6]، دیگر السنہ قدیم و جدید[7]، فلسفہ و نفسیات[8]، تعلیمات[9]، ریاضی[10]، طبعیات[11]، انجنیری[12]، کیمیا[13]، طب[14]، علم الانسان[15]، نباتیات[16]، حیوانیات[17]، اردو زبان و ادب[18]، قانون[19]، آرٹ[20]، کھیل[21]، نسائیات[22]، ہندی[23]، مرہٹی، و دیگر زبانیں، فلکیات[24]، زراعت و جنگلات[25]، مالیات[26]

ان میں سے ہر شعبہ ہر فن کے ماہرین کے ہاتھوں میں دیا گیا ہے۔ اسلامیات کے شعبہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا سید مناظر احسن گیلانی وغیرہ ہیں۔

پوری کتاب کو ۱۲ جلدوں میں تمام کرنے کا قصد کیا گیا ہے۔ نمونہ کے اوراق چھاپ لئے گئے ہیں اور دفتر [illegible] اردو انسائیکلوپیڈیا خیرت آباد، حیدرآباد، دکن کے پتہ سے طلب کئے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر سید محی الدین اور ان کے رفقائے کار کی اس خدمت کی یاد اسوقت تک باقی رہیگی جب تک کہ اردو زبان اس دنیا میں موجود رہیگی۔

اردو زبان، دلی سے سارے ہندوستان میں پھیلی، مگر یہ کیسے ستم کی بات ہے کہ آج سننے میں آیا ہو کہ خود اسی دیس میں کس مپرسی کے حال میں ہے۔ ہر صوبہ میں علم و تعلیم کی نمائندگی یونیورسٹیوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔ ہمیں دلی کے بعض مستند حلقوں سے یہ معلوم کر کے دلی رنج و افسوس ہوا کہ دہلی یونیورسٹی میں اردو زبان کو وہ مرتبہ حاصل نہیں۔ جو دوسری یونیورسٹیوں میں اسکو حاصل ہو چکا ہے۔ ہم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس پر اپنی توجہ مبذول کرینگے اور اردو کے ان خدمتگذاروں سے بھی جن کے پاس یونیورسٹی میں اردو پر ہونیوالی زیادتیوں کے تفصیلی معلومات و اعداد و شمار ہیں، درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے سپرد کریں۔ کہ وہ قدم اٹھا کر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو جائز شکایتوں کے دور کرنے پر توجہ دلا سکے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مسئلہ سے غفلت نہ کی جائیگی ورنہ اس کے دوررس نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

(×)

صاحب نگار نیاز نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میرا عقیدہ وہ ہے، جس پر سب مولوی متفق ہو جائیں" خدا کی شان! مشیت نے نیاز کی تکذیب پر اپنی آخری مہر بھی ثبت کردی۔ یہ مشکل سے باور کیا جاسکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئیگا کہ جماعت اہل قرآن کے ترجمان میں، جماعت اہل حدیث کے پیشوا، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کا کوئی مضمون شائع ہوگا۔ لیکن پچھلے موقع پر نیاز کے قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے سے انکار کرنے سے یہ ناممکن واقعہ بھی عالم وجود میں آگیا کہ نیاز کے اس ملحدانہ عقیدہ کے شائع ہونے کے بعد ان مخالف گروہوں کے پیشواؤں کو اپنا متفقہ جواب دینا پڑا۔ چنانچہ رسالہ البیان امرتسر (جو جماعت اہل قرآن کا ترجمان ہے) کا ایک خاص نمبر **براہین وحی** کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ جو نیاز کے اسی باطل عقیدہ کے بطلان میں جامع، وقیع، سنجیدہ، اور بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہانتک کہ ڈپٹی مقبول احمد صاحب بھی اسی صف اعدا میں آگئے جنہوں نے کبھی مذہبیات میں تھوڑی بہت عقل جولانی دکھانے کی راہ نیاز کو دکھائی تھی۔

(×)

"براہین وحی" میں علامہ اقبال مرحوم، مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ، مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل اسلامیہ کالج امرتسر، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سعید اکبرآبادی، مولانا تمنا عمادی، جناب اسد ملتانی اور جناب ڈپٹی مقبول احمد کے پر زور اور مدلل مقالات نثر و نظم ہیں، جن میں سے بعض دوسرے رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ اور بعض خاص اسی نمبر کیلئے لکھے گئے ہیں۔ آخر میں سلیمانی صاحب کے مختصر مضمون میں ایک طرف آیات قرآنی اور دوسری طرف ہفوات نیاز کو یکجا کیا گیا ہے۔ اور اس طرح آشکارا کیا گیا ہے کہ نیاز کے نزدیک اسلام کی اصل حقیقت کیا ہے۔

(×)

یہ رسالہ ہمارے صوبہ کے ان مولویوں کے لئے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ جو فتح القدیر کے ناقد کو تو بارہ برس تک معاف نہیں کر سکتے مگر قرآن مجید کی اس توہین کرنے والے کو سر آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں۔ جو نہ خدا کا قائل ہے نہ قرآن کو الہامی کتاب تسلیم

کرتا ہے نہ حشر و نشر کو مانتا ہے۔ نہ قصص قرآنی کی صحت کا اقرار کرتا ہے، نہ اسلام کو عہد حاضر کیلئے مفید سمجھتا ہے، نہ روزے کا پابند ہے، نہ نماز کا حامی، اور جو کھلی تلقین کرتا ہے، شراب خوری اور بے حیائی کی[1]ـ

———(×)———

ہم اس رسالہ کی اشاعت پر اپنے محترم دوست حضرت عرشی کو دلی مبارکباد دیتے ہیں، ضرورت ہے کہ کوئی مخیر مسلمان اٹھے اور اس کی جلدیں اس پورے حلقہ میں پھیلا دے، جہاں نگار کا زہر پھیلا ہے۔ کہ دراصل اس زہر کا اس سے بہتر تریاق اسوقت تک تیار نہیں ہوا ہے۔ یہ مجموعہ مضامین ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر پنجاب کے پتہ سے ملسکتا ہے۔

———(×)———

"دیاغنوس بہاری" کا مضمون اس ماہ میں شریک اشاعت ہے۔ ہم ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کردیں تو مناسب ہے، ہم آزادانہ تنقید کے مخالف نہیں، ہم بڑی سے بڑی شخصیتوں پر نقد کرتے آئے ہیں۔ اور اسے کسی توجہ کے لائق بات نہیں سمجھتے، جن لوگوں کی نظروں سے "معارف" کے فائل گذرے ہیں، یا جنہوں نے دار المصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں وہ بآسانی اپنے حافظہ میں یہ بات تازہ کرسکتے ہیں کہ نقد و جرح میں شبلی اور شبلی کے متبعین نے کبھی بھی شخصیت پرستی کو راہ نہیں دیا۔ اگر مثالیں دیجائیں تو خاصہ مضمون بن جائے تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ علمی مسائل و مباحث میں مولانا شبلی مرحوم سے حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے بارہا اختلاف کیا۔ اور ان کی تحریر میں یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے پھر معارف کے پرچوں میں جناب سید صاحب مدظلہٗ کی تصنیفات و مضامین پر آزادانہ تنقیدیں چھاپی گئیں کہیں جواب کی ضرورت ہوئی جواب دیا گیا۔ کہیں تشریح کی ضرورت پڑی تشریح کیگئی۔ کسی جگہ سہو قلم ہوا، اسکو قبول کیا گیا لیکن گستاخی و بدتمیزی ——— ! تو یہ کسی حال میں بھی انگیز کے لائق نہیں۔ اور خصوصاً اسوقت جب کہ اعتراضات سرے سے مہملات کا انبار ہوں! اعتراضات کیا ہیں اور کیسے ان کا نمونہ اب "دیاغنوس بہاری" ہی کی زبان سے سنئے۔

---

[1] یہ تمام اعتقادات نیاز کی تحریروں کے ان اقتباسات میں کھلے لفظوں کے ساتھ ہیں، جو مقالۂ اقبال سلیمانی میں آئے ہیں۔

خریداران ندیم سے

۱ـ اب ندیم ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو دفتر سے روانہ ہو جاتا ہے۔ ۳ یا ۴ تک آپکے ہاتھوں میں ہوتا ہے معلوم ندیم کی ایک بڑی کوتاہی دور ہوئی ——— مگر ابھی ہم یہ تاریخ اشاعت متعین نہیں کرتے جا رہے پوری کوشش [illegible] نہ آئے، اور بغیر اعلان کے عملی طور پر یہی تاریخ اشاعت متعین ہوجائے پرچہ اگر کسی ماہ کی ۱۰ تاریخ تک آپکے ہاتھوں میں نہ پہنچے تو تصور کریں کہ [illegible] ہمیں اطلاع دیدیں۔ ورنہ اس ماہ کا رسالہ دفتر میں عموماً ختم ہوجاتا ہے۔ ۲ـ اپنی مدت خریداری پر نظر رکھئے آپکے چندہ [illegible] اس مدت کے ختم ہونے کے ساتھ یا تو منی آرڈر سے نیا چندہ بھیجئے ورنہ وی، پی وصول کرنے کیلئے تیار رہیئے، دفتر سے کوئی اطلاع [illegible] اگر خریداری بند کرنا چاہیں تو اطلاعاً ہمیں مطلع فرمادیں۔ ۳ـ جواب طلب امور اور رسید کیلئے جوابی خط لکھئے ——— منیجر [illegible]

کات

شطحیات نگار

از

دیاغنوس بہاری

کچھ دن گذرے راقم الحروف نے ایک طویل سفر کے درمیان ملحد و بے دین نیاز کے رسالہ نگار بابت دسمبر ۴۰ء کو دیکھا۔
ید سلیمان ندوی کی شطحیات" پر نظر پڑی، خیال ہوا کہ شعبدہ باز نیاز نے اپنے استفسارات اور خطوط کے فرضی ناموں کی طرح اس
ں بھی کسی مصنوعی نام پر کوئی قلا بازی دکھائی ہوگی یا اپنی ہی طرح کسی علمی جنگی کو ہندوستان کی ایک برگزیدہ اور مغتنم شخصیت
پا لینے کے لئے تیار کر لیا ہو۔ مگر چند دنوں کے بعد کلکتہ کا ایک ماہنامہ نظر سے گذرا۔ اس میں مضمون نگار کے صبر کا پیمانہ لبریز
. وہ "م ا" کے نقاب کو اتار کر بے محابا سامنے آگیا۔ اور اسوقت حقیقت کھلی کہ مقالہ ہذا کے راقم ہمارے بہار ہی کے ایک
بند ہیں۔ پھر تو ایک غیر معمولی قسم کی انشراحی کیفیت محسوس ہوئی اور نگار کے اسی مضمون کو جس کو ہمیشہ کی بکواس سمجھ کر پڑھنے
ی نہ سمجھا تھا۔ وطن کی محبت اور صوبہ کی حمیت میں بڑے جوش و انہماک کے ساتھ ساری دنیا سے غافل ہو کر غور و فکر سے
رع کیا۔ اور بار بار پڑھا، اثنائے مطالعہ میں عالم بیخودی میں یہ حال ہوا کہ سالکان راہ تصوف کی طرح لاہوت، ناسوت
ں کے تین ادوار قائم ہوئے اور یکے بعد دیگرے تینوں دوروں سے گذرتا گیا۔ لاہوتی دور میں ایسا معلوم ہوا کہ مضمون
ی کوئی طفل نو آموز ہے۔ جس نے کسی خاص غرض سے اپنے وطن کی حدود کو طے کر کے ایسے محاذ پر پہنچکر اپنے علم و فن کا کرتب
ہے جہاں کی فسوں گری اور جادوگری کا مقصد کوئی مفید کام کبھی نہیں رہا۔ بلکہ محض معاش کا وسیلہ اور شہرت و نمود کا ذریعہ پیدا کرنا
ا ہے۔ خیال آیا کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ سرزمین بہار کے ایک خدا پرست بندہ نے مدیر نگار کی مذہبی بے غیرتی اور دینی
کے خلاف طوفان نوح اٹھایا تھا۔ اسی خطہ پاک سے کوئی پسر نوح تو نہیں اٹھا؟ سوچتا تھا کہ آخر اس مضمون کے لکھنے کا مقصد
ں قسم کے مضامین لکھکر روٹی کا ذریعہ پیدا کرنا تو غریب مدیر نگار تو خود اب قوت لایموت کا محتاج ہونیوالا ہے۔ پبلک اور
ی انسٹی ٹیوشنوں سے جلا وطن کیے جانے کے بعد حکومت کے اسلامی مطبوعات کی لسٹ میں نگار کا نام داخل کرایا۔ اور مولویوں
ا روٹی کمانے کا طعنہ دیتے دیتے خود اسلام ہی کے نام پر حکومت صوبہ متحدہ کے دروازہ پر کاسہ گدائی لیکر پہنچا اور کچھ
دلی کی گئی۔ ویسی حالت میں وہ دوسروں کی روٹی کا سامان کیا کر سکتا ہے! یا اس قسم کی تحریر سے نام و نمود حاصل کرنا

تو شاید یہ داد ہیچ اصل مقصد کے حصول میں مؤثر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس دور کا علامہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی اسلامی دنیا میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی کتاب سیرۃ النبی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جامعہ ازہر کے اساتذہ عربی میں اور ترکی کے اہل علم ترکی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی سیرۃ عائشہ کی پسندیدگی کی گئی کہ افغانستان اور ترکی نے اپنی اپنی ملکی زبانوں میں اس کے ترجمے کئے۔ ان کی تصنیف "خیام" پر افغانستان میں ان کی قدر دانی یوں کی گئی کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی پر افغانستان نے اپنی طرف سے ایران کو جو قیمتی اور نادر تحایف پیش کئے ان میں ایک "خیام" بھی تھی۔ پھر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی علمی خدمات انشا پردازی اور اسلوب بیان ملک میں اتنا کیوں مقبول ہے اور یہ شہرت پائی ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ان کے علمی تسلیم کرنے کے باوجود انکو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری دی، کاش ان باتوں کے خلاف مضامین لکھنے کے بجائے مضمون نویس مدیر نگار کے مشورے سے مرن برت رکھتا تو پھر اس کی شہرت میں چار چاند لگتے اور بقول علامہ عبد الملک آروی اس کے سکرٹ محمول ہونے سے اس طرح شاہراہ شہرت پر گامزن ہونے پر ہم بہاریوں کے "فخر و ابتہاج" کی کوئی حد نہ رہتی۔

لیکن یہ لاہوتی دور زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ اور ناسوتی دور میں اب محسوس ہوا کہ مقالہ نگار کا خدانخواستہ کوئی اور مقصد نہ تھا بلکہ واقعی اپنے علم و ادب کے حسن و جمال کا مظاہرہ کرنا اور محققانہ ناز و ادا کا جلوہ دکھانا تھا۔ لیکن نفس کی انقباضی کیفیت سے راقم الحروف پھر مغلوب ہوا اور سوچنے لگا کہ اپنے علم و تحقیق کے حسن و جمال کی جلوہ آرائی ہی مقصود تھی تو پھر ایک رسوائے زمانہ اور ننگ ملت[1] رسالہ کے چھلکے پر اور "شہوانیات" کے مصنف کے سامنے اس کا مظاہرہ کیوں کیا گیا۔ نفس نے اور بھی سرکشی کی۔ اور یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ مضمون نویس کی مراد اپنے آرٹ کے حسن کرشمہ سازی کی داد لینی نہ تھی بلکہ محض اپنے "قبلہ حاجات" کو خرافات کا ایک دفتر مہیا کرنا تھا۔ پھر تو دل میں شکوک اور اوہام کی ایک دنیا آباد ہوگئی اور اسی سلسلہ میں علی گڈھ کی اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آگیا۔

۳۴ء میں مولانا شوکت علی مرحوم ایک مدت کے بعد علی گڈھ تشریف لائے، اور اسٹریچی ہال کے ایک جلسہ میں شریک ہوئے۔ وہ ہال میں داخل ہوئے تو طلبہ بے اختیار ہوکر بڑی دیر تک تالیاں بجاتے رہے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی بچھڑا ہوا محبوب ان سے آکر مل گیا ہے۔ مولانا شوکت علی نے اس وقت کوئی تقریر نہیں کی۔ لیکن ان کی آمد پر یونین ہال میں ایک مباحثہ رکھا گیا۔ مباحثہ شروع ہونے سے کچھ پہلے وہ یونین ہال میں تشریف لائے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا ایک بہت پرکیف نقشہ دیکھنے میں آیا۔ چھوٹے اور بڑے لڑکوں کا ایک ہجوم ان کو گھیرے ہوئے تھا۔ کوئی ان کے گلے میں بانہیں ڈالے تھا، کوئی ان کی توند سے لپٹا تھا۔ کوئی ان کے پیر پر بیٹھا تھا۔ اور کوئی ان کے کاندھوں پر سے جست لگا کر ان کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں یونین کے صدر صاحب تشریف لائے، اور مباحثہ علی گڈھ کی روایت کے مطابق شور و غل کے ساتھ شروع ہوا۔ مولانا شوکت علی مرحوم بھی حسب معمول اپنے ظریفانہ رنگ میں بولے۔ زیادہ تر مولانا محمد علی مرحوم کی یاد تازہ کی۔ اثنائے تقریر میں خود بھی روئے اور لڑکوں کی آنکھیں بھی اشکبار ہوئیں۔ اسی مباحثہ میں ایک صاحب (جو فی الحال ملک کے ایک اشتراکی رہنما ہو گئے ہیں) بولنے کھڑے ہوئے۔ اپنی خطابت، ذہانت، اور طباعی کے زور میں مولانا شوکت علی مرحوم کو برا بھلا کہنے لگے۔ اور ان کی شان میں ایسے غیر مہذبانہ اور ناشائستہ کلمات استعمال کئے کہ طلبہ بہت

[1] مدیر نگار کی ایک تصنیف ہے۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ "زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ" ایک خط کا جواب ہے۔ وہ مضامین کے مجموعہ کے بجائے مکاتیب میں رہتا تو زیادہ اچھا تھا۔ "ہم تمام بہاری سید صاحب قبلہ کی خدمت بابرکت میں مودبانہ گذارش کرتے ہیں کہ آیندہ اپنی تصانیف شائع کرتے وقت مدیر نگار سے نہیں تو کم از کم بہار کے اس بالغ النظر نوجوان کی "مولانا البہاری" کے زیر سایہ رائے سے ضرور مستفید ہونے کی کوشش فرمائیں۔ مگر راقم السطور اپنی کم نظری اور بے بصری کے باوجود یہ عرض کرنے کی جرات کرتا ہے کہ سید صاحب قبلہ نے کسی مکتوب کے جواب میں معارف میں ایک مقالہ لکھا اور اس کو اپنے مقالات کے مجموعہ میں شائع کیا تو آخر کیا بے جا بات ہوئی؟ ممکن ہے کہ ہم اپنے علم کی بے بضاعتی اور اپنی شپرہ چشمی سے مکتوب اور مضمون میں فرق کرنے سے قاصر ہوں۔

آگے چل کر مدیر نگار نے یہ لکھوایا ہے کہ "اردو انسائکلوپیڈیا" "ادو" ہوم رول سے پہلے "سطحی سے (مضامین) ہیں، لیکن سب سے زیادہ ناامیدی مقدمات کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ گلستان امجد، ختستان، خیابان وغیرہ پر مقدمے نہایت سرسری طور پر لکھے گئے ہیں۔ اولاً تو ان کتابوں پر لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس مجموعہ میں رسوائے عالم مقدمہ شعلۂ طور بھی ہے"۔ ...... ان جملوں کو پڑھتے ہوئے خوف اور لرزہ طاری ہو رہا تھا۔ کہ کہیں نگار کے ایک دوسرے "پریوش"[1] مقالہ نگار یعنی ارسطوئے وقت، افلاطون زمانہ، ادیب شہیر علامہ اجل جناب عبد الملک آروی مد فیوضہ کی طرح اس مضمون نگار کا توسن قلم بھی یہ جولانی نہ دکھائے کہ سید سلیمان ندوی محقق ضرور ہیں۔ لیکن ان کو تحقیق کرنی نہیں آتی۔ انشاپرداز ہیں لیکن ایک جملہ بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اس لئے ان کی ساری کتابیں تحقیقی غلطیوں سے بھری ہیں۔ اور ان کی زبان اغلاط و اسقام سے پر ہے۔ (ملاحظہ ہو نگار میں "حیات امام مالک" کے عنوان سے "پریوش" کا مضمون) لیکن الحمد اللہ کہ ہمارے موجودہ مضمون نگار نے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ ورنہ کیا عجب تھا کہ اپنے قلم کے گھوڑے کی باگ چھوڑ دیتے تو اس کی ٹاپوں سے سید صاحب قبلہ کی ساری علمی شہرت پامال ہو کر رہ جاتی۔ البتہ نگار کے ذریعہ سے یہ بات معلوم کر کے ضرور خوشی ہوئی کہ بغیر دلائل و شواہد کے صرف لکھ دینے سے کوئی علمی چیز واقعی سطحی، سرسری، ناکامیاب، مایوس کن اور رسوائے زمانہ ہو جاتی ہے تو میں بھی ببانگ دہل کہتا ہوں کہ افلاطون کی "ریاست" بالکل سطحی ہے۔ گیٹے کی "فاؤسٹ" بالکل سرسری طور پر لکھی گئی ہے۔ سب سے زیادہ ناامیدی دانتے کی "جہنم" کو دیکھ کر ہوتی ہے، ملٹن کی "گم کردہ بہشت" تو مجموعی حیثیت سے بہت ہی ناکامیاب اور مایوس کن ہے۔ روسو کی "معاہدۂ عمرانی" تو بالکل خرافات کا مجموعہ ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ محض رسوائے زمانہ ہے۔ اقبال کی بال جبریل تو بے معنی سی چیز ہے۔ ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور نگار کے ایک پرجوش نوجوان اہل قلم کی طرح یہ دعویٰ بھی کرتا ہوں کہ میری مندرجۂ بالا زریں رائے کی تردید کوئی کر دے تو جہانگیر اور شاہجہاں کی طرح اس کا منہ زر و جواہر سے بھر دوں،

آگے چل کر صراط مستقیم پر چلنے والے اڈیٹر کے رسالہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ سید صاحب کی اس کتاب سے بہتوں کے گمراہ

---

[1] مدیر نگار نے عبد الملک آروی کی کتاب اقبال کی شاعری پر ریویو کرتے ہوئے انکو "پریوش" لکھا تھا۔

ہو جانے کا ڈر ہے"۔ اس لئے بطور انتباہ اس کی غلطیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اور خصوصاً ہمارے مومنین پڑھیں در وود، کیونکہ یہ کام انجام نہ پاتا تو ڈر تھا کہ ہم تمام مسلمان گمراہ ہو کر کفر اور اہمال کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے دوہے

اب آئیے ذرا سید صاحب کی فاش اور سطحی غلطیوں پر نظر ڈالیں:۔ سید صاحب کی پہلی فاش اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے والی غلطی یہ ہے کہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے جو اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں ایک جگہ "ٹنگ" کے بجائے "ٹنک" تحریر ہو گیا ہے۔ دوسری ناقابل برداشت غلطی یہ ہے کہ "پھر" کی جگہ "پھر" حیطۂ تحریر میں آگیا ہے۔ تیسری ناقابل برداشت غلطی یہ ہے کہ "متو تھا" کے بجائے "مو تھا"، کتاب میں لکھ دیا گیا ہے، مدیر نگار کی خدمت بابرکت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ کتاب ہذا میں ابھی بہت سی جگہوں پر مرکز اور نقطے چھوٹ گئے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ ان کے رسالہ کا فاضل مضمون نگار اپنی معاش کی فکر میں کسی مکتب کی معلمی کی تلاش میں حیران اور پریشان ہوگا۔ ورنہ اس قسم کی کتابت کی اور غلطیاں نکال کر نگار کے قارئین کا دماغ روشن اور دل منور ضرور کرتا۔

سید صاحب نے جو دوہے شرف الدین احمد منیریؒ کی طرف منسوب کئے ہیں ان کے متعلق نگار کے مضمون نگار کا بیان ہے کہ یہ کسی سند اور ثبوت کے بغیر لکھ دئے گئے ہیں۔ نگار کے مضمون نگار جیسے متبحر عالم ابن عالم اجل کی شان میں ہم جیسے جاہلوں کا کچھ کہنا سوء ادب ضرور ہے۔ لیکن پھر بھی یہ عاجزانہ گذارش ہے کہ ہم روشن آنکھیں رکھنے والے نہ سہی، لیکن پھر بھی سید صاحب قبلہ کی کتاب میں دوہے کے نیچے بطور اسناد یہ لکھا ہوا پاتے ہیں۔ "شفاء الامراض حکیم محمدی"۔ یہ طب کا ایک قلمی نسخہ ہے جو ہمارے ایک مشہور کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ پھر بقول مضمون نگار یہ دوہے "سیرۃ الشرف" میں بھی ہیں جو ہم بہاریوں کی نظروں میں حضرت مخدوم شرف الدین منیریؒ کے حالات میں سب سے مستند تذکرہ ہے۔ اب یہ ہماری بصیرت اور علم کی بضاعت پر منحصر ہے کہ ان اسناد کی موجودگی میں اب حیات کی روایت کو مجہول سمجھیں یا صحیح، مگر اس سلسلہ میں مدیر نگار کے مضمون نگار کے بعض بیانات بہت ہی بصیرت افروز اور سبق آموز ہیں۔ وہ اپنی ایک قدیم بیاض کے مطالعہ کے بعد ان دوہوں کو شیخ شرف الدین منیریؒ کے دوہے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر اپنی اپنی قدیم بیاض ماخذ قرار دی جا سکتی ہے تو ان شاء اللہ ہم نگار کے اس مضمون کی تقلید میں کسی موقع پر یہ دکھانے کا فخر و امتیاز حاصل کریں گے کہ غالب کی غزلیں درحاصل جعفر زٹلی کے رشحات قلم کے نتائج ہیں، مومن کا سارا کلام حقیقتاً سعادت علی خاں رنگین کا ہے جو مومن کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ مدیر نگار نے کن ذہنی خلجان اور قلبی پریشانی میں اپنے مضمون نگار کو یہ گوہر افشانی کرنے دی ہے کہ دوہے کی زبان مخدوم حضرت شرف الدین منیریؒ کے عہد کے بجائے امیر خسرو کے زمانہ کی ہے۔ کیونکہ ہم جیسے جاہل بہاری بھی یہ جانتے ہیں کہ امیر خسرو اور مخدوم صاحبؒ ہم عصر تھے۔ گو مخدوم صاحب کی وفات امیر خسرو کے انتقال کے ایک عرصہ کے بعد ہوئی۔

زیادہ عجیب و غریب بات ہم جیسے علمی گھسیاروں[1] کو یہ معلوم ہوئی کہ نگار کے مضمون نگار کو شیخ مظفر بلخی کا ایک فارسی دیوان ملا۔

[1] یہ اصطلاح پنجاب والوں کی ہے۔ جو انہوں نے علامہ اقبال پر اعتراض کرنے والے ایک بہاری مضمون نگار کیلئے استعمال کیا تھا۔

اور فارسی دیوان کے عمیق مطالعہ کی بنا پر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہندی دوہا جو سیرۃ الاشرف کے مؤلف نے شیخ مودود کی طرف منسوب کیا ہے۔ دراصل ان کا نہیں، اس کی داد ہم مضمون نگار کو نہیں بلکہ مضمون چھاپنے والے کو دیتے ہیں۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

سید انشاء اللہ خاں .... ی؟

مدیر نگار نے ہم لوگوں کو گمراہی سے یہ مشتہر کر کے بال بال بچا لیا ہے کہ سید صاحب انشاء اللہ خاں انشاء کو لکھنوی سمجھتے ہیں۔ سید صاحب کی اصلی عبارت یہ ہے۔

"لکھنو کے شعرا میں سید انشاء (لکھنو آ کر) اور امانت لکھنوی کا جو رنگ ہے، میر صاحب کی ظریفانہ نظموں کا درحقیقت وہ اساس سخن ہے۔"

سید صاحب نگار کے پرجوش مضمون نگاروں کی نفسیات، صلاحیت اور لیاقت سے شاید واقف تھے، اسلئے غایت احتیاط میں سید انشاء کے بعد قوسین میں "لکھنو آ کر" لکھ دیا ہے کہ کہیں مدیر نگار اور ان کے مقلدین "عالمانہ ادبیج" کا مظاہرہ نہ کریں لیکن "تخلیقیت" "ابتہاجیت" اور [illegible] فکر [illegible] کہیں [illegible] سے رک سکتی ہے۔ چنانچہ ہمارے عاشقانِ علوم و فنون مدیر نگار [illegible] کبھی میں اگر انہوں نے [illegible] ذریعہ یہ بتایا ہے کہ سید انشاء اللہ خاں لکھنوی تھے [illegible] کو سمرقندی لکھیں تو زیادہ صحیح ہے کیونکہ ان کے بزرگوں کا کسی زمانہ میں سمرقند سے آنا ہوا تھا۔ (نگار [illegible])

دریائے لطافت کا سالِ تصنیف

ہم حقیقت پرست [illegible] کو نگار کے ہماری مضمون نگار کی ذات [illegible] مگر [illegible] اس [illegible] کہ اس نے ہندوستان کی ایک بڑی شخصیت سے علمی [illegible] لیکر ہمارے صوبہ کا نام روشن کیا۔ مگر یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس نے صوبہ کا نام اجاگر اور دوبالا کرنے کی کوشش میں کذب و افترا سے بھی کام لیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "سید انشاء کی دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ نہیں" مگر راقم الحروف اپنی کم نظری کے باوجود نقوش سلیمانی ص ۱۹۰ پر ۱۲۲۲ھ لکھا ہوا پاتا ہے۔ مضمون نگار سے ہم کو یہ امید نہیں کہ اس نے یہ افترا اختراع کیا ہوگا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مدیر نگار نے اس کو اہل علم کے سامنے ذلیل اور رسوا کرنے کی خاطر قصداً یہ غلطی شامل کر دی ہو۔ پھر سید صاحب نے تو دریائے لطافت کی تصنیف کی ابتدا اور تکمیل کی کہیں بحث نہیں چھیڑی، انہوں نے تو دریائے لطافت کے سامنے صرف یہ تاریخ لکھ دی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تکمیل کا سنہ ہے۔ جن اہل علم کو علمی مباحث سے تعلق ہے وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ایسے موقع پر جہاں سنین قوسین میں یا [illegible] درج کئے جاتے ہیں اس سے مقصود اجمالی طور پر اس شخص یا تصنیف کے متعلق ایک زمانہ کا متعین کر دینا ہوتا ہے۔ سید صاحب کی گفتگو اس موقع پر خاص دریائے لطافت پر نہ تھی کہ وہ کب لکھی گئی، دریائے لطافت کا ضمنی ذکر آیا اور اس سلسلہ میں اس کا ضمنی طور پر زمانہ بھی بتا دیا گیا۔ لیکن مقالہ نگار نے اس تودہ پر طوفان اٹھایا لیکن اگر مقالہ نویس کو اپنے معلومات کا دریا بہانا تھا، تو الحمد اللہ ہم اس سے خوب سیراب ہوئے۔ آگے چل کر گوہر افشانی کی کہ "دریائے لطافت لکھنو ہی میں لکھی گئی یہ محل نظر ہے۔" ہم بدی علوم نا سادہ لوح ہوتے ہیں۔ ہم کو یہ مان لینے میں بھی عذر نہیں کہ دریائے لطافت یا تو تحفۃ الاشرف یا

دیتے ہیں کہ اگر کسی اہل قلم نے ولی کو ولی بمبوی یا ولی بمبئی والا نہیں لکھا تو ہم مدیر نگار کی سرداری میں حسن بن صباح کی طرح علمی فدائیوں اور داعیوں کی ایک جماعت قائم کریں گے۔ اور ولی بمبوی یا ولی بمبئی والا نہ لکھنے والوں کو کیفر کردار تک پہونچائیں گے۔

ولی کا سال وفات

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ سید صاحب نے ولی کا سال وفات ۱۱۵۵ھ لکھ کر لوگوں کو گمراہ کیا ہے سید صاحب نے یہ سنہ کلیات ولی مرتبہ انجمن ترقی اردو کی سند پر لیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کلیات ولی ص ۱۴۲) اب ہم سید صاحب پر غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی ساری خفگی اور برہمی انجمن ترقی اردو والوں پر دکھائیں تو زیادہ بہتر ہے کہ اس ادارہ نے سرسری، سطحی، ناکامیاب اور مایوس کن کتابیں شائع کر کے ہم مسلمانوں کو عموماً اور بہاریوں کو خصوصاً گمراہ کیا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اس ادارہ کے خلاف ہم تمام بہاری مدیر نگار کو اپنا راشٹرپتی بنا کر یا تو ستیہ گرہ کریں یا مرن برت رکھیں۔ اگر مدیر نگار نے خلوص اور ایثار سے کام لیکر یہ علمی فریضہ اور علمی خدمت انجام دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم تمام بہاری اپنا اپنا سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے ان کے اردگرد جمع ہونے میں مطلق دریغ نہ کریں گے۔ مگر یہ بات ابھی سمجھ میں نہ آئی کہ مدیر نگار جیسے حق و صداقت کے علمبردار کے رسالہ میں یہ تحقیق کیونکر شائع ہو گئی کہ ولی تقریباً ۱۰۹۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوا۔ گویا ولی کی مدت حیات صرف چھبیس یا ستائیس سال تک رہی، اس کی جوانمرگی کا ماتم آج تک کسی اہل قلم نے نہیں کیا۔ یہ بھی ہم بہاریوں کیلئے باعث فخر و مباہات ہے کہ بہار کے ایک نئے پیغمبر علم و تحقیق کے وجدان و الہام سے ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کی جوانمرگی کا حال کھلا۔

مضمون ہاشم علی کا مجموعہ مراثی میں کوئی نئی بات نہیں

مدیر نگار نے اپنی غیر معمولی لیاقت اور عدیم المثال وسعت نظری کا ثبوت اپنے مقالہ نگار سے یہ لکھوا کر دیا ہے کہ سید صاحب کے مضمون "ہاشم علی کا مجموعہ مراثی" میں کوئی نئی بات نہیں، انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ "اردو شہ پارے" اور "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں موجود ہے، نگار کے مضمون نویس کی محققانہ دقت پسندی بلکہ بقول عبدالمالک اروی تخلیقیت اور تبعیت پر ہم بہاریوں کو حرف رکھنے کی مطلق گنجائش نہیں، لیکن سید صاحب کو شہرت کے فلک پر سے یکایک دھب سے ایک عمیق غار میں گرتے ہوئے دیکھکر جوان پر رحم اور ترس آیا، اس بنا پر یہ جاہل راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ "یورپ میں دکنی مخطوطات" ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی اور سید صاحب کا مضمون جولائی ۱۹۳۱ء میں شایع ہوا۔ اسلئے ظاہر ہے کہ سید صاحب نے جو چیز لکھی ہے وہ دکنی مخطوطات سے بالکل علیحدہ تھی۔ "اردو شہ پارے" البتہ پہلے لکھی گئی لیکن اس کتاب میں ہاشم علی پر جو مضمون درج ہے۔ اس پر سید صاحب کی نظر اپنے مقالہ کے شائع ہو جانے کے بعد پڑی۔ کیونکہ انہوں نے اپنا مقالہ پونہ میں سفر کی حالت میں لکھا۔ اور اس کا اعتراف ہم جیسے بے فکر بہاری مضمون نگاروں ہی کے لئے اپنی کتاب کے ص ۲۲۷ پر کر دیا ہے۔ مدیر نگار اور ان کے مقالہ نگار کو اپنے تبحر علمی کی وجہ سے مضمون ہذا میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو۔ لیکن ہم جیسے بصیرت اور بصارت سے محروم مضمون نگاروں کو اس سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً سید صاحب کو ہاشم کے مراثی کے ایک ایسے مکمل نسخہ کا پتہ چلا جو اس کی زندگی میں لکھا گیا، انہوں نے ارباب علم

ں کی خبر دی پھر اس مجموعہ سے انہوں نے ایسے صاف اور سلیس اشعار ہدیہ ناظرین کئے ہیں جو نہ صرف اردو شعر پارے میں نئے ہیں بلکہ تاریخ
ب اردو کے طلبہ کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ ایک بات اور سید صاحب قبلہ نے بتائی ہے کہ اس مجموعہ میں اکثر ثقیل ہندی حروف
فیف لکھا گیا ہے۔ جس سے ہم جیسے الھڑ طالبعلموں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک فارسی کی عادی زبانیں، ہندی حروف
ادا کرنے پر پوری قادر نہیں ہوئی تھیں۔

...م علی کا حال کن تذکروں میں ہے؟

معلوم ہوتا ہے مدیر نگار نے مقالہ نگار کے پورے مضمون کو محض خرافات کا مجموعہ بنانے کی خاطر مضمون میں کچھ "خرد برد" ضرور کیا ہے مقالہ نگار کا بیان ہے کہ سید صاحب
ے نہیں فرماتے کہ ہاشم علی کا حال کہیں نہیں ملتا" اس کے بعد کا حصہ مدیر نگار نے حذف کر دیا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ مقالہ نگار نے ان
روں کا نام ضرور لکھا ہوگا جن میں ہاشم علی کے حالات اس کی نظر سے گذر رہے ہیں تاکہ نہ صرف مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بلکہ ڈاکٹر
الدین مولف اردو شہ پارے اور نصیر الدین ہاشمی مرتب یورپ میں دکنی مخطوطات شرم سے پانی پانی ہوں کہ وہ اپنی ہر قسم کی
ہو و تجسس کے باوجود ہاشم کے مفصل حالات کسی تذکرہ میں نہ پا سکے لیکن رسالہ نگار کے ایک محقق کو جس نے تحقیق کی ابجد ابھی
ں سیکھی ہے۔ ہاشم کے مفصل حالات میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں تذکروں کے نام معلوم ہیں۔

مدیر نگار کے اشارے پر ارشاد ہوتا ہے کہ یہ بھی صحیح نہیں کہ ہاشم علی ولی کا معاصر تھا۔ اس کے لئے ہم ہادیوں کو سید صاحب
خلاف کچھ کہنے کے بجائے پہلے تو انجمن ترقی اردو کے خلاف علم و تحقیق کی "صلیبی جنگ" کرنی چاہیئے کہ اس ادارہ نے ولی کا
سنہ وفات غلط لکھکر ملک اور ملت کو گمراہ کیا پھر ایک محاذ ڈاکٹر محی الدین زور کے خلاف بھی قائم کرنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے
ہاشم علی کو ولی کا معاصر قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو اردو شہ پارے میں ہاشم علی پر مضمون)

...شم علی کے مندرج اشعار کی غلطیاں؟

مدیر نگار نے ہمارے بہار کے مقالہ نگار کی تحریر کے روئے تاباں پر پھر توے کی سیاہی لگانے کی کوشش کی ہے۔ یعنی منقول ہے کہ "ہاشم علی کے جو شعر
ج ہیں وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں" اس سطر کے بعد مقالہ نگار نے اشعار کی غلطیوں کے انبار لگائے ہونگے۔ مگر "ترغیبات جنسی"
ے مصنف نے خدا جانے اپنی کس جنسی تدلیہ گی کی بنا پر اشعار کی غلطیوں کو حذف کر دیا۔ اگر کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے صحیح قرار
یا جا سکتا ہے تو ہم بھی یہ عرض کرنے میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ کہ مدیر نگار کی تاریخ الدولتین، سیر الصحابیات، شہاب کی سرگذشت،
ریخ ہند مع توقیت، تو علمی ڈکیتی کے نتائج بہر حال ہیں۔ اس کی "شہوانیات" بھی دراصل چرکین کی تصنیف ہے۔ جس کو اس نے
پنی طرف منسوب کر لیا ہے۔ اس کا ثبوت ایک قلمی بیاض سے ملتا ہے جو حضرۃ العلامۃ البہاری کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔
پھر نگارستان اور جمالستان میں تو صرف و نحو بلکہ تذکیر و تانیث کی کروڑوں بلکہ اربوں غلطیاں ہیں۔ مدیر نگار جیسے ادیب کا
رض تھا کہ ان غلطیوں کی تصحیح کر لیتا۔ ورنہ ایک عامی اہل قلم اور اس میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

سطحیات مصحفی | آگے چل کر کچھ اقتباسات سید صاحب منسوب اسلئے کئے گئے ہیں کہ دونوں نے اثر کا نام غلط یعنی میر محمد کے بجائے

محمد میر لکھا ہے۔ ہم کسی موقع پر انشاء اللہ نگار کے ہماری مقالہ نگار کی تحریروں کے حسن وجمال کا جلوہ "شطحیات مصحفی" کے عنوان سے بھی دکھیں گے۔ اور صرف "شطحیات مصحفی" ہی پر کیا منحصر ہے بلکہ "خرافات دتاسی" "ہفوات میر و قایم اور ہزیانات شاد" پر بھی مقالات پڑھکر اپنی آنکھوں کو منور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ نگار کے ذریعہ سے ہم کو یہ معلوم ہوا ہے کہ دتاسی کے خطبات میں سنین صحت سے دور ہوتے ہیں۔ (نگار ص۱۱) میر و قایم کے تذکروں کی باتیں مشکوک ہیں (ص۱۵) شاد مرحوم ایک شاعر آدمی تھے، اور آخر عمر میں ان کا حافظہ بھی خراب ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے ان کی سند معتبر نہیں (ص۲۱) مدیر نگار اگر ان عنوانات پر اپنے مقالہ نگار سے مضامین لکھوائے تو ہم کو امید ہے کہ پھر پنجاب والوں کو یہ شکایت باقی نہیں رہے گی کہ بہار میں صرف علمی گھسیارے ہی رہتے ہیں بلکہ تحقیق و تدقیق کے گاما اور کنکڑ پہلوان بھی آباد ہیں۔

اردو کا نام

سید صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ بارہویں صدی کے اواخر تک کی تصنیفات میں اردو کا نام لغوی اضافت یعنی زبان اردوے معلی استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً تذکرہ نکات الشعراء میر صفحہ ۱۱ اور ذکر میر ص۱۶۷ اور نو طرز مرصع مرقع رقم تحسین ملاحظہ ہو۔ لیکن تیرہویں صدی کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب سے یہ اضافت جاتی رہتی ہے۔ اور خود زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے۔ اور اس ثبوت میں مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ) سے ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ ان کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ اردو کا نام (بغیر لغوی اضافت کے) پہلی دفعہ مخزن الغرائب ہی میں آیا ہے۔ مگر بہار کے چہیتے مضمون نگار نے اپنی نگارش میں یہ البیلا پن دکھایا ہے کہ سید صاحب کے خیال میں اردو کا لفظ پہلی دفعہ مخزن الغرائب ہی میں استعمال ہوا۔ اور اس کی تردید میں مصحفی کے تذکرہ سے پے در پے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ ہم ان اقتباسات کی فراوانی کو دیکھ کر مدیر نگار کو داد دیتے ہیں کہ اس نے اپنی جوہر شناسی سے بہار کے ایک در ناسفتہ کو اپنے بازار میں لاکر ارباب قدر شناس کا جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مقالہ نگار رقم طراز ہے کہ "اگر ہمارے حافظہ (حافظہ درست نہیں۔ شاید حافظہ صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو نگار ص۱۳) دھوکا نہیں دیتا تو ہم نے یہ لفظ (یعنی اردو) مصحفی کے ابتدائی دواوین میں بھی کہیں دیکھا ہے۔ لیکن ان کے دواوین اتنے ضخیم ہیں کہ اسوقت اس لفظ کو ڈھونڈ کر نکالنا مشکل ہے" مضمون نویس نے جو کچھ لکھا ہے اسپر ہم عقیدت مند بہاری ان کے علم وفضل سے مرعوب ہو کر ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ وہ یہ مضمون لکھتے لکھتے ایسے خستہ حال ہوئے کہ مدیر نگار کی "ترغیبات جنسی" سے طبیعت بہلانے لگے۔ اور پھر وہ اس سے ایسے متاثر یا پریشان ہوئے کہ مصحفی کے دواوین سے اردو کا لفظ ڈھونڈ کر نکالنا ان کے لئے مشکل ہو گیا، حالانکہ ہم کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ان حضرات میں ہیں جو کتب خانہ گئے اور قلمی کتابوں کو پڑھنے کی زحمت اٹھائے بغیر تحقیقی مضامین لکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ (نگار ص۱۶)

قواعد اردو کا پہلے غیر زبان دانوں کی طرف سے لکھا جانا

سید صاحب اپنی کتاب نقوش سلیمانی ص۹ پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح عربی زبان کے قواعد اور لغت کی تالیف سب سے پہلے عجمیوں نے کی اور انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری ایک فرانسیسی نے لکھی اسی طرح اردو کے قواعد

در لغت کو بھی سب سے پہلے یورپینوں نے لکھا یا لکھوایا۔ یہاں پر فالن، فرنسن اور جنرل ولیم کرک پیاٹرک کے ناموں سے بحث نہیں تھی۔ مگر مدیر نگار اپنی صداقت، راستبازی اور حق گوئی کے لئے دوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اسلئے وہ اسکو کفر سمجھے در نقوش سلیمانی میں ایک جگہ صحیح نام کے بجائے غلط نام لکھ دیا جائے، اس لئے نگار کے صفحات پر سچائی کا دریا بہا دینے کا موقع فراہم کر دیا

شیخ فرید گنج شکر کا سال وصال

آگے چل کر مدیر نگار جیسے حق و صداقت کے پیکر نے ہم کو اپنے رسالہ کے ذریعہ سے آگاہ کیا ہے کہ شیخ فرید گنج شکر کا سال وصال سنہ ۶۶۴ھ صحیح نہیں۔ بلکہ خلاصۃ التواریخ میں سنہ ۶۷۶ھ ہے۔ یہاں پر نگار کے مضمون نویس کی خدمت میں ہم بصد عجز و نیاز یہ عرض کرینگے کہ مدیر نگار کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ محمود غزنوی کے حالات لکھے اور استناد کے لئے خافی خاں کی لب التواریخ پیش کرے یا محمد تغلق کے عہد کے واقعات کے سلسلہ میں سیر المتاخرین کا حوالہ دے، لیکن مقالہ نگار جیسے متبحر عالم بن عالم اجل سے کس طرح یہ توقع کی جائے کہ وہ شیخ فرید گنج شکر کی پیدائش کے لئے خلاصۃ التواریخ کا حوالہ دے۔ حضور صاحب یہ مسلم ہے کہ وہ کتب خانہ جانتے ہیں۔ قلمی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ پھر کہیں تحقیقی مضامین لکھتے ہیں۔ مگر شاید تلاش معاش کی الجھنوں میں کتب خانہ جانے اور قلمی کتابوں کے پڑھنے کی فرصت نہ ملی ہو، ورنہ یقین ہے کہ وہ صوفیہ کرام کے تذکروں کو پڑھنے کے بعد ایسی تحریر نہ لکھتے۔ ہم یہاں پہ ارباب بصیرت کے لئے خزینۃ الاصفیا کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں۔

> "وفات آنحضرت (یعنی شیخ فرید شکر گنج) بقول صاحب اخبار الاخیار و سفینۃ الاولیا پنجم محرم روز شنبہ سال شش صد و شصت و چہار و بقول صاحب تاریخ فرشتہ شش صد و شصت است و صاحب مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین۔ و شجر چشتیہ باقوال معتبر شش صد و ہفتاد می فرمایند و صاحب سیر الاقطاب شش صد و نود تحریر کرد (جلد اول ص ۳۰۳ نولکشور)

ولایت ولادت!

نگار کے رخ زیبا کو یہ لکھکر زینت دی گئی ہے کہ سید صاحب کا یہ فرمانا کتنا مضحکہ خیز ہے۔ کہ خواجہ کی "ولایت" مضافات ملتان میں ۵۸۴ھ میں ہوئی۔ مگر نگار کے اڈیٹر جیسے ادیب بے مثل کے لئے یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ اس نے یہ سطور شائع کر کے ادب کے ابجد خوانوں کو بے ساختہ ہنسنے کا موقع دیا ہے۔ کیونکہ سید صاحب کا مطلب "ولایت" سے ہوتا" تو اس لفظ کے ساتھ "حاصل ہوئی" ضرور لکھتے یعنی خواجہ کی ولایت مضافات ملتان میں ۵۸۴ھ میں حاصل ہوئی پھر "کی" کی جگہ "کو" ہوتا۔ لیکن مدیر نگار کی نکتہ چیں فطرت اور معیب جو طبیعت نے ان سطور کا شائع ہونا ہی پسند کیا حالانکہ روشن آنکھوں والے ولایت کی جگہ پر ولادت پڑھنے میں مطلق تامل نہیں کرینگے۔ یعنی خواجہ کی ولادت مضافات ملتان میں ۵۸۴ھ میں ہوئی۔

نصیر الدین حسین صاحب کا کسی تبریزی سے پڑھنا!

ارشاد ہوتا ہے کہ نصیر الدین حسین نے فارسی علی بابا تبریزی سے پڑھی یہ محض گپ ہے ہم بادہ نوح بہاری یہ تسلیم تو نہیں

کرتے کہ نصیر الدین حسین صاحب نے تبریز جا کر فارسی پڑھی، مگر ہم کو اپنی سادہ لوحی سے یہ ماننے میں بھی عذر نہیں کہ ایک رئیس کے لڑکے نے فارسی کی تعلیم کسی ایسے استاد سے حاصل کی ہو جس کا ذاتی یا نسبی تعلق تبریز سے ہو، نصیر الدین حسین صاحب ابھی بقید حیات ہیں وہ خود بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے فارسی علی بابا تبریزی سے پڑھی، یا کسی کے یہاں "طالبعلمی کرکے" یا کسی مدرسہ کا خیراتی کھانا کھا کر تعلیم پائی ہے۔ ایسی ایسی گپیں ہانکنا العلامۃ البہاری جیسے فاضل روزگار ہی کو اپنے مقدس حلقۂ درس میں مبارک ہو۔

"عظیم آبادی سمجھنا ہر درجہ سادہ لوحی ہے"

آگے چل کر مدیر نگار کے محبوب مضمون نویس کی تحریر میں وہی لذت محسوس ہوتی ہے جو ایک باپ کو اپنے بیٹے کی توتلی اور بھولی بھالی باتوں میں یا ایک منچلے شوہر کو اپنی نئی نویلی بیوی کی اٹھلاہٹ اداؤں میں یا ایک مظلوم عاشق کو اپنے معشوق کے معصوم چہرہ کے چڑھے ہوئے تیور میں یا نہیں تو سالکان راہ طریقت کو اپنے مرشد کی مجذوبانہ بڑ میں سید صاحب کلام شاد کے مقدمہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"اس علمی مرکز کے قدیم سخنوروں میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو ولی دکنی، میر و سودا، مرزا مظہر اور خواجہ میر درد کے ہم پہلو تھے۔ ملا محمد علیم تحقیق، عبدالقادر بیدل، اشرف خاں فغاں، سید محمد شاکر ناجی، خواجہ امین الدین امین، جبار علی بسمل، محمد روشن جوشش، ہیبت علی خاں حسرت، شیخ محمد عابد دل، میر غلام حسین شورش، مرزا مظہر علی جذب، شیخ غلام یحییٰ حضور، میر محمد تسلیم، اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ایسے سخنور گذرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے ترقی پائی ہے۔"

پھر کلیات عشق کا مقدمہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"خاص عظیم آباد میں پیدا ہونے والے اور دہلی سے آکر یہاں بسنے والے شعراء کی بڑی تعداد ہے، خواجہ امین الدین امین، سید جبار علی بسمل، عبدالقادر بیدل، ملا محمد علیم تحقیق، شیخ محمد روشن جوشش، میر باقر حزیں، ہیبت علی خاں حسرت، میر غلام حسین شورش، رحمت علی عشقی، شاہ رکن الدین عشق، غلام حسین محرم، آغا حسین قلی خاں عشق، ظریف الملک کوکہ خاں، اشرف علی خاں فغاں، مرزا محمد علی فدوی، محمد شاکر ناجی، شیخ غلام علی راسخ، مرزا مظہر علی جذب، شیخ غلام یحییٰ حضور، میر محمد تسلیم، راجہ پیارے لال الفتی، شیخ محمد عابد دل، شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ، ناموران سخن کے حالات و واقعات اور ان کے شعر و سخن اور فضل و کمال کی تصویریں اگر کاغذ پر کھینچی جائیں تو ادبیات کا ایک نیا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔"

سید صاحب کے مندرجہ بالا اقتباسات میں ذیل کی سطروں کو ارباب بصیرت غور سے پڑھیں اور ان کے مطالب کو اچھی طرح ذہن نشین کریں:

"اس علمی مرکز کے قدیم سخنوروں میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں ....
جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے ترقی پائی ہے۔"

"خاص عظیم آباد میں پیدا ہونے والے اور دہلی سے آکر یہاں بسنے والے شعراء کی بڑی تعداد ہے۔"

لیکن نگار کے مقالہ نگار نے "ایک سرسری مطالعہ کے بعد" "ادھر اُدھر سے" "الٹ پلٹ کر" جو مطالب نکالے
ں ان کی بنا پر ہم کو یہ لکھکر آگاہ کیا ہے کہ اس فہرست کے شعراء کو بہاری یا عظیم آبادی سمجھنا حد درجہ سادہ لوحی ہے۔ کیوں ؟
ں کے بتانے کے لئے مضمون نگار کے پاس "فرصت اور موقع نہیں" (نگار ص۱۵) ورنہ وہ دلائل اور شواہد سے ضرور اس کو
بت کر دیتے (ص۱۵) لیکن پھر بھی مجبوراً "مختصر لفظوں" اور "تین صفحوں میں نگار کے" "ردے گلگوں" کو سیاہ کرنا ہی پڑا، چنانچہ
بعض ناظرین کے تفنن طبع کی خاطر نگار کے مضمون نویس کی تحریر کے عمق کو الٹ پلٹ کر ادھر اُدھر سے دکھانے کا فخر حاصل کرسکتے ہیں،

(۱) سید صاحب کی سب سے بڑی سادہ لوحی یہ ہے کہ وہ بیدل کو عظیم آبادی اور ریختہ گو شاعر بھی کہتے ہیں، مدیر
ار کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بیدل کو عام مستند تذکرہ نویسوں نے عظیم آبادی ہی لکھا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ ہو میر غلام علی آزاد بلگرامی
ہ ماثر الکرام، جس سے زیادہ مستند تذکرہ کوئی اور نہیں) اور مدیر نگار کے چہیتے مضمون نگار کو بھی یہ واقفیت ہے کہ "مصحفی نے
ں بیدل کو عظیم آبادی ہی کہا ہے، مگر ان کا لکھنا وزن نہیں رکھتا" (نگار ص۱۵) میر اور قایم نے بیدل کے اردو اشعار نقل کئے
ں، مگر ان کے ماخذ ہی کیا تھے، جو ان کے کہنے کو قابل قبول سمجھا جائے (نگار ص۲۱) شاد نے بھی بیدل کے اردو اشعار نقل
ئے ہیں، لیکن شاد مرحوم ایک شاعر آدمی تھے، اور آخر عمر میں ان کا حافظہ بھی خراب ہو گیا تھا، اس لحاظ سے انکی سند معتبر نہیں (نگار ص۲)

(۲) فغاں آخر عمر میں عظیم آباد آئے، یہیں انتقال کیا، ان کی قبر کا بھی یہاں پتہ چل گیا ہے (نگار ص۱۷-۱۶) لیکن پٹنہ کے
، خانقاہ عمادیہ کے سامنے پٹنہ سیٹی کے منگل تالاب اور پون پون ندی میں بار بار غوطہ لگانے کے بعد یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ فغاں کا
ق عظیم آباد کے علمی مرکز سے اور دہلی سے آکر یہاں بسنے والے شعراء کی تعداد میں کس طرح دکھایا جا سکتا ہے۔

(۳) شاہ رکن الدین عشق اور عظیم آباد! اجی تو یہ کہئیے! وہ بلاشبہ دہلوی تھے، ان کی شاعری کی ابتداء ہیں ہوئی اور دہیں
دان چڑھی، سید صاحب اپنی کتاب "نقوش سلیمانی" ص۴۰۸ پر مرزا علی لطف کی گلشن ہند اور علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی
گلزار ابراہیم کے حوالہ سے ایک لمبی عبارت نقل کرتے ہیں، جس کے چند سطور یہ ہیں۔

"بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے طور پر مزاج فقر و درویشی کی طرف آیا۔ ...
پر کر کے طور استغنا سے ... آخر بلدۂ **عظیم آباد** میں
مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت با آواز بلند کہی"

سید صاحب نے اس اقتباس میں عظیم آباد کو جلی حروف سے لکھوایا ہے تاکہ کسی پڑھنے والے کی آنکھوں میں موتیا بند
ر تو وہ اپنی انگلیوں سے بھی ٹو ٹو کر پڑھ سکے۔ مگر ایک بات قابل غور ضرور ہے، کیا عجب کہ مرزا علی لطف اور ابراہیم خان خلیل
ں حضرات میں ہوں جو کتب خانے ... اور علمی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت اٹھائے بغیر مضامین لکھنے کے لئے تیار ہو جاتے
یا شاد کی طرح "شاعر آدمی" ہوں یا یہ تحریر اپنی آخر عمر میں لکھی ہو جب ان کا حافظہ خراب ہو گیا ہو۔ (نگار ص۱۶)

(۴) ارشاد ہوتا ہے کہ محمد علی قدوی کا عظیم آباد میں قیام مسلم ہے۔ (نگار ص۱۷) مگر وہ بہت ہی اُداس ... تھے (ص۱۷)

اس لئے ان کو عظیم آباد سے منسوب کرنا صحیح نہیں (ص ۱۷) میر باقر حزیں اور شاکر ناجی عظیم آباد میں آکر رہے۔ جبار علی بسمل کا قیام عظیم آباد میں ضرور تھا، العتی بھی آخر میں عظیم آباد آکر بس گئے تھے۔ (یہ جملے نگار ہی کے ہیں ملاحظہ ہو ص ۱۷) پھر بھی ان کا تعلق عظیم آباد کے علمی مرکز سے کسی طرح کا نہ تھا۔ جل جلالہ و عم نوالہ!

مدیر نگار کے محبوب مقالہ نگار ان لوگوں میں ہیں جو کتب خانہ جاتے ہیں۔ اور قلمی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت گوارا کرکے تحقیقی مضامین لکھتے ہیں۔ شاعر آدمی بھی نہیں ہیں اور یہ مضمون اپنی آخر عمر میں بھی نہیں لکھا ہے۔ جبکہ حافظہ دھوکا دیتا ہے اسلئے مدیر نگار نے جو کچھ ان سے لکھوایا ہے وہ بہت ہی معتبر اور مستند ہے، ان میں ہم کو چون و چرا کرنے کی مطلق گنجائش نہیں۔ چنانچہ ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور اپنی چشم بینا سے دیکھ رہے ہیں کہ یونانی خرافات کی دیبی "پاسیفی" اس تحقیق و تدقیق کے نمونے دیکھکر پہلے تو سرشار اور مخمور ہو جاتی ہے۔ پھر غایت مسرت میں داہنے ہاتھ کی ایک انگلی ناک پر اور بایاں ہاتھ کمر پر رکھ کر رقص کرنے لگتی ہے۔ اور بلند آواز کے ساتھ مضمون نگار کی طرف دیکھ کر ایک خاص جذب و کیف کی حالت میں گاتی ہے

"چھوٹا سا بالم مورا آنگنا میں گلی کھیلے"

اور یہ دیبی تھرک تھرک کر مدیر نگار کے پاس بھی پہونچتی ہے جو مذکورہ بالا تحقیقات کے عجیب و غریب نمونے شائع کرنے کی داد یہ گا کر دے رہی ہے۔

"سیاں توری گودی میں گیندا بن جاؤں گی"

(باقی پھر کبھی)

ندیم دیا غنوس بہاری کا یہ مضمون ابھی نامکمل ہے۔ کیونکہ اتنا لکھ کر وہ گرمی گذارنے کے لئے پہاڑ پر چلے گئے ہیں۔ اور ابھی کچھ دنوں وہاں مقیم رہینگے۔ جیسا کہ پچھلے مہینہ میں کہا جا چکا ہے۔ گو نگار کے "ہفوات" کے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ندیم اس مضمون کو سرے سے لائق جواب نہیں سمجھتا تھا۔ اور اسی لئے اسپر کسی سنجیدہ توجہ کو اب بھی کفر سے کم نہیں جانتا۔ مگر برا ہو مبارزت طلبی کا کہ جواب میں دیا غنوس بہاری کو مدد کے لئے بلانا پڑا۔ یوں تو سنجیدہ اہل علم کے لئے وہ معترضانہ مضمون کبھی بھی التفات کے قابل نہ تھا، مگر دیا غنوس بہاری کے جوابات میں جو اشارات آگئے ہیں، وہ معترض و ناشر دونوں کے علمی مرتبہ کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں، اگر اس پر مزید گفتگو کی ضرورت ہوئی تو آئندہ "پر کو آگ دکھا کر" دیا غنوس بہاری کو پہاڑ سے اتار کر بلایا جا سکتا ہے۔ اس لئے "باقی پھر کبھی" جو ہے۔ اس کو "بشرط ضرورت" کے اضافہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے!

ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں

از
جناب الف احمد صاحب ارکوی

(۲)

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا خدا سے رشتہ کیا ہے؟ ہمارے پاس وہ کونسی قوت ہے جس سے ہم اس طاقت عظمیٰ سے فائدہ اٹھا سکیں؟ ہمارا خیال ہی ہمیں خدا سے منسلک کئے ہوئے ہے اور اس قوت عظمیٰ سے فائدہ اٹھانے کی واحد قوت ہماری "قوت خیال" ہی ہے!!

خدا کی ذات ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔ اگر آپ اس کے فیضان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں تو اپنے خیال کو صداقت اور نیکی کے ساتھ اس کے لئے تیار کیجئے۔ اگر ہمارے خیال میں ہمدردی ہو، راست بازی ہو، بھلائی ہو تو ہم کو اس کے لافانی خزانہ سے محبت، ہمت اور سرگرمی عمل اور مسرت حاصل ہوگی۔ ہم خدا کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہونگے!

مجھے ایک کم عمر لڑکے کا واقعہ یاد ہے جس کی تعلیم و تربیت کسی زیادہ مذہبی ماحول میں نہیں ہوتی تھی۔ تاہم اس کو خدا سے لگاؤ تھا اور خدا پر اس کا مضبوط اعتقاد تھا۔ اس کے کان میں ایک بار کچھ تکلیف پیدا ہوئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کان کی حالت خراب ہوگئی ہے اور اپریشن کی ضرورت ہے۔ خدا پر اعتقاد رکھنے والے لڑکے نے ڈاکٹروں کو تو کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن نہایت آہستہ سے کہدیا کہ اپریشن کی ضرورت نہ پڑے گی۔

اس نے اپنی ماں سے کہا کہ خدا نے میرے کان کو بنایا تھا۔ اور اب کیا اس میں قدرت نہیں کہ اس کان کو معمولی مرض سے اچھا کردے؟ دوسری مرتبہ جب ڈاکٹروں کو دکھایا گیا تو کان میں کوئی شکایت نہ تھی۔

اگر وہی خدا نے قادر و توانا ہے جس نے ہم کو زندگی دی، ہمارے اعضا کو بنایا۔ ہمارے وجود کو مکمل کیا جس کا مقصد ہے کہ ہم اس دنیا میں زندگی بسر کریں، کیا وہی خدا ہماری صحت و سلامتی پر قادر نہیں؟ لیکن ہم کو اس سے روحانی تعلق پیدا کرنا چاہئے اور اس کے لئے اپنے آپ کو ہموار کرنا چاہئے تاکہ اس کے انوار و فیضان کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے!!

ہم کو کسی وقت بھی اس سے اپنی حاجت طلب کرنے میں تامل نہ کرنا چاہئے! یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اس کے تمام افضال و عنایات سے بہرہ اندوز ہوں۔ آج ہی ـــــ اسی لمحہ ـــــ ہم کو اپنی طلب کو ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں، ہم بہشت کا بھی

کیوں انتظار کریں جب وہ ہم کو اسی زندگی میں حاصل ہو جائے! ہم بہشت کا بھی کیوں انتظار کریں۔ جب وہ ہم کو یہیں مل جائے ـــــ اپنے خیال کے حدود ہی میں!!

اگر ہم چڑچڑے مشکوک خوفزدہ غصہ ور اور متفکر ہیں تو ہم شر اور برائی کے متوقع ہیں! ہم نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا ہے۔ اور بالآخر یہ ہم تک پہنچ جائیگی کیونکہ یہ اصول اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل ہے! اس کے برخلاف اگر ہم خوش، ہمت اور، مسرور، فراخ دل اور مخلوقِ خداوندی کے لحاظ سے اپنے حقوق پر متیقن ہوں تو اس کے نتائج بھی خوشگوار ہونگے! ایقان نام ہے خیر اور بہتری کی توقع کا اور خوف مترادف ہے شر اور برائی کی توقع کا! اب توقع کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم! ہم جس چیز کی توقع رکھتے ہیں اس کو اپنے دماغ میں جگہ دیتے ہیں۔ اور جو چیز ہمارے دماغ میں جگہ حاصل کر لیتی ہے وہی ہمارے بیرونی ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور کسی وقت یہی ہمارے تجربات کا جز بن جاتی! تاریخ انہی حقائق سے پر ہے!!

تو پھر آج ہی سے صحت فراوانی اور مسرت کی طلب کیوں نہ شروع کر دیں! لیکن جب ہم اپنے تخیّل کی مشین تیار کر کے اور اپنے خیال میں راستی اور صداقت کی طاقت پیدا کر کے اس مرکز اور منبع فیوض سے ـــــ جسے لوگ خدا کہتے ہیں ـــــ اپنے آپ کو ہماز کرنے کو تیار ہوں گے تو ہمیں چند شیطانوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا! میں نے ایک کو مادام فلٹ میجگر کا خطاب دیا ہے اور دوسرے کا نام پروفیسر پوفنفوس رکھا ہے!!۔

مادام فلٹ میجگر کسی کو خوش و خرم نہیں دیکھ سکتیں! یہ ہمیشہ دوسروں کے معاملات میں دخل در معقولات کرتی رہتی ہیں! جس وقت یہ محسوس کرتی ہیں کہ کوئی شخص کسی اچھے کام کا ارادہ کر رہا ہے یا غیر معمولی طور پر مسرور ہے تو ایک ایسا رنجیدہ خیال اس کے دل میں پیدا کر دیتی ہیں جس سے اس کی خوشی کا مطلع غبار آلود ہو جاتا ہے! وہ آپ سے کہیں گی کہ آج تو آپ کچھ بیمار سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ آپ نے یہ ہیٹ کیوں خرید لی۔ یہ تو بہت بھدی اور بری معلوم ہوتی ہے! بظاہر تو یہ ہماری دوست بنیں گی۔ لیکن پھر بھی مذاق اڑائینگی! یہ نہایت کینہ خصلت اور بد خیال واقع ہوئی ہیں! ان کا کام یہاں پر ختم ہو جاتا ہے کہ وہ ہمیں مغموم اور رنجیدہ بنا دیں! اور اس کے بعد پروفیسر پوفنفوس کا نمبر آتا ہے۔ یہ تمام دنیا کے جھوٹوں کے بادشاہ ہیں! اصل میں یہ ہمارے خیال کی تخلیق ہیں اور میرے خیال میں یہی شیطان کا مجسمہ ہیں۔!!

میں غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ ہم شیطان کے متعلق بھی اب تک غلط فہمی میں مبتلا رہے! ہم نے شیطان کو بھی زیادہ اہمیت دے دی ہے! ہم جس چیز کو شیطان کہتے ہیں وہ ہماری جہالت، ناواقفیت اور خیر و شر میں ہمارا تمیز نہ کر سکنا ہے! میں نے بائیبل میں پڑھا تھا کہ شیطان ایک نہایت مہمل وجود اور جھوٹا ہے اور وہ خاص ان لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے جو اس کی مجلس میں بیٹھتے ہیں! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ نے شیطان کو زیادہ مہیب اور اہم بنا دیا ہے! اگر شیطان میرے قبضہ میں ہوتا تو میں اسے مضحکہ خیز بنا دیتی اور پروفیسر پوفنفوس اسی مضحکہ خیز خیال کی تخلیق ہیں!!

پروفیسر پوفنفوس کی حماقتیں ناقابل اظہار ہیں! تاہم میں آپ کو ان کے متعلق بتاؤں گی! ان کو نیم ظریف کہنا بھی ان کی بجا

حریف کنا ہے۔ ان کا دماغ ایک ایسے نقطہ پر پہونچتا ہے جہاں صرف تین پریں اور کوئی تعقل نہیں! دراصل پروفیسر پونفوس کے
س دماغ نہیں! آپ کی بینی مبارک لمبی اور پیچ دار ہے! یہ خم جو آپ کی ناک میں پیدا ہوگیا ہے۔ وہ دوسروں کے معاملات
بیجا دخل در معقولات کا نتیجہ ہے! آپ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں۔ جو ہمیشہ چیزوں کو برعکس دیکھتی ہیں۔ کینہ پن بھرا ہوا ہے۔ چونکہ
یہ میں کیرکٹر مفقود ہے اس لئے آپ کی ٹھوڑی کی ساخت کچھ عجیب بھیانک سی ہے! آپ کا دہانہ نیچے کو مڑا ہو پورے جھوٹے
کی کا دہانہ معلوم ہوتا ہے! آپ کے کان خاص قسم کے ہیں جو ہر چہار طرف کو گھوم سکتے ہیں اور آپ اپنے چاروں طرف کی
بری بری باتوں کو سن سکتے ہیں! آپ کی ایک سونڈ بھی ہے جو لوگوں کے متعلق ہمیشہ گرم ہوا سے چھولی رہتی ہے۔ آپ کی سارس
کی سی نہایت ہی بھدی ٹانگیں ہیں اور آپ کے پیر نہایت ہی بدشکل ہیں آپ کی دم بھی ہے اور تمام شیطانوں کے دم ہونا لازمی
ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب نہایت غمزدہ، پست حوصلہ اور شکست خوردہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بہت سے ذہن رسا رکھنے والے
لوگوں نے ان کے لئے دروازہ بند کر لیا ہے! پروفیسر صاحب ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح ہمارے دماغوں میں پہونچنے
کے لئے ان کو موقع مل جائے اور وہ کسی شخص کے متعلق ہم سے جھوٹی اطلاع کریں! ان کی خواہش رہتی ہے کہ وہ ہم سے کہیں کہ خدا نے اس عالم
کو نہیں پیدا کیا اور نہ خدا اس کی رہبری کر سکتا ہے اور نہ وہ ہماری دستگیری کر سکتا ہے! اور ساری دنیا میں مصیبت بدقسمتی اور
بدحالی پھیلی ہوئی ہے!!

جس وقت ہم نیند سے بیدار ہوتے ہیں پروفیسر پونفوس ہمارے قریب ہی چھپے ہوتے ہیں اور اس فکر میں لگے ہوئے
رہتے ہیں کہ وہ ہمارے دل میں یہ بات اتار دیں کہ آج کا دن کتنا برا ہے! اگر ہم اس سے پست ہمت ہو جائیں تو وہ ہمارے سر پر
سوار ہو جائیں گے۔ اور برابر آپ کے ذہن نشیں کرتے رہیں گے۔ کہ واقعی آج ہم ویسے چست اور محنتی نہیں ہیں۔ اور ہم ویسے اچھے
اور نیک بھی نہیں ہیں! پھر اگر ہم ان کی بات کو مان لیں اور اپنے حال اور مستقبل کے متعلق مایوس ہو جائیں اور اپنی گذشتہ غلطیوں کو سوچنے
لگیں تو وہ ہمیں واقعی نڈھال کر دینگے! وہ ہمیں اتنا معذور اور مجبور بنا دینگے کہ ہم اپنی ذات کے لئے، اپنے مستقبل کے لئے اور دنیا
کے لئے بیکار ہو جائیں گے!۔

یہ میں کہہ چکی ہوں کہ وہ نہایت ہی جھوٹے، دھوکہ باز اور مفتری ہیں! وہ ہم سے کہیں گے کہ ہم ختم ہو چکے! کیونکہ وہ ہماری
ہی ماندگی کو محسوس کر رہے ہوں گے! وہ کہیں گے کہ ہم بیمار ہیں اور جب بیمار ہیں تو بیمار ہی رہینگے! وہ ہم سے یہ بھی کہیں گے کہ ہم بہت
ہی ضعیف ہوگئے یا ہم ہی بچے ہیں۔ بہت ناتجربہ کار ہیں۔ ہمارے لئے بہت سی دشواریاں ہیں۔ اور ہمارے لئے یہ برائی ہے اور
وہ برائی ہے! اگر اس نے ہمارے دل میں ان خیالات کو راسخ کر دیا تو اس نے ہمیں اپنے جال میں پھانس لیا۔ لیکن ہمیں اس
کے جال میں ہرگز نہیں پھنسنا چاہئے!۔

آئندہ جب کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو بجائے اس کے کہ ہم اس کو اس صورت میں قبول کریں اور اپنی قسمت کا نوحہ
کرنے لگیں ہمیں فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ یہ پروفیسر پونفوس صاحب کی کارستانی ہے۔ یہ ہماری خوشی اور ہمارے بہترین مفاد کے

خلاف ہم پر ایک حملہ ہے! جب ہم یہ خیال کریں گے تو نتیجہ ہم کو معلوم ہوگا اور ہم خود اس سے متعجب ہو جائیں گے! ہم دلائل اس کے خلاف پیش کریں گے اس سے ہم خود ہنس پڑینگے اور جب ہم ہنس پڑیں گے تو ہماری مشکلات خود بخود کم ہونے لگیں گی اور جلد یا بدیر غائب ہو جائیں گی! کیونکہ اس بات کو یاد رکھیئے کہ پروفیسر یونففوس جھوٹوں کے سردار ہیں۔ وہ کبھی سچ نہیں بولتے انہوں نے جو کچھ ہم سے کہا وہ مطلقاً جھوٹ ہے! ہم پچھلی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام بڑے بڑے آدمی اور عورتوں نے جنہوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کیئے ہیں وہ محض اس بنا پر کیئے کہ انہوں نے پروفیسر یونففوس سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔ انہوں نے اس کی بات کبھی نہیں سنی! وہ اپنے خیال اور قول پر اس کا کوئی اثر نہ لیتے تھے! جب پروفیسر صاحب نے کولمبس سے کہا کہ وہ نئی دنیا کو ہرگز نہ پاسکے گا۔ اور یہ کہ وہ مجنوں ہے تو کولمبس نے اس کے جواب میں انگڑائی لی اور انہیں بالکل نظر انداز کر دیا!!

اسی طرح اگر ابراہیم لنکن نے پروفیسر کی باتوں کو سنا ہوتا اور شکست اور ناکامی کی باتوں پر کان دھرا ہوتا تو دنیا اس کا نام بھی نہ جان سکتی! اس قسم کی مثالیں تمام تاریخ میں ملتی ہیں۔ یونففوس کسی کو کامیاب ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ وہ صرف ایک ہی دروازہ سے داخل ہو سکتا ہے اور وہ دروازہ ہماری **مرضی** ہے!!

ہم بادشاہ ہیں اور اپنی زندگی کے حکمران! ہم اپنے خیالات کے ساتھ اپنے تجربات پر بھی حکومت کرتے ہیں یا یوں کہ ہم اپنی دنیائے خیال کو خود تعمیر کرتے ہیں! ہم اپنے شعور و احساس کے مطلق العنان حکمران ہیں! اور ہم اچھی حکومت کرتے ہیں یا بری اس کا فیصلہ ہمارا تخیل کرتا ہے!

ہمارے دماغ کے لیے صرف ایک راستہ ہے وہ ہمارا تخیل ہے! اور دماغ جس نے ہمارے لئے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ ہر چیز کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے اور ہر چیز کو برداشت کرتا ہے وہی ہمارے لئے کام کریگا۔ وہی ہماری مقصد برآری کرے گا اور وہی ہماری دعاؤں کو درِ اجابت تک پہونچائے گا ــــ بشرطیکہ ہم بھی اپنا کام کریں! آج کا دن ہماری زندگی میں نمایاں دن ہے ہم کو اس سے وہی ملیگا جو ہم نے اس کے لئے رکھ چھوڑا ہے!!

بہترطور! اگر ہم نے غلطیاں کی ہیں اور بہت ہی اہم غلطیاں تو بھی ہم کو تلافی کا موقع ہے۔! فرض کیجئے ہم نے کوشش کی مگر ناکام ہوئے تو پھر ہمیں آگے بڑھنے کا اور موقع ملیگا! کیونکہ ناکامی گر جانے کا نہیں بلکہ ٹھہر جانے کا نام ہے! ہم ہمیشہ اس خیال سے قوت حاصل کرتے ہیں کہ ہم خدا کا شکار نہیں بلکہ اس کی تخلیق کردہ کائنات کا ایک جزو ہیں! ہم میں سے اکثر لوگوں کی توقع یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ اس دنیا میں زندگی بسر کریں جس میں بھلائی، دوستی، محبت، خوشی، قناعت، فراوانی، کامیابی، اور تعلقات کی خوشگواری کا دار و مدار ہو! اگر واقعی ہم سب اس کے خواہشمند ہیں۔ تو ہم کو سب سے پہلے اپنے دماغ میں ان چیزوں کی تخم ریزی کرنا چاہیے کیونکہ "ہم جو بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں!!"

خدا کی بادشاہت کہاں ہے؟ بادلوں کے اوپر؟ دیو پیکر پہاڑوں کے اس طرف؟ یا بعد الموت؟ ہرگز نہیں! خدا کی بادشاہت خود ہمارے اندر ہے! کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف حقیقت ہو سکتی ہے؟ ہمارے لئے سب سے

زیادہ پرجوش مسرت کا موقع وہ ہوگا جب ہمیں یہ محسوس ہو کہ کسی کام میں محض ہماری راست خیالی کی وجہ سے کامیابی ہوئی!!

”ایک باخدا شخص ہزاروں پر بھاری ہے“ ہم نے اس قسم کے جملے پڑھے ہیں اور ہم میں سے اکثر ان پر یقین بھی رکھتے ہیں، لیکن کیا ہم نے اپنی روزانہ کی زندگی میں ان پر عملاً تجربہ بھی کیا؟ خدا کیا رہیگا اگر وہ اتنا بھی نہ کرے کہ ہم اس کی مدد سے مکان کا کرایہ ادا کر سکیں اگر ہم کو ملازمت مل جائے تو ہم خوش رہ سکیں اگر وہ زندگی کے ہر لمحہ میں ہمارے ساتھ نہ ہو؟؟

وہ عظیم الشان طاقت جس نے ہم میں احساس ہستی کو پیدا کیا ہے ہر وقت ہمارے لئے حاضر ہے! ہر وقت ہماری حفاظت کر رہی ہے! صرف ضرورت اس کی ہے کہ پروفیسر پوففوس کی پیروی حاصل کرنے کے بجائے ہم خدا سے رہبری حاصل کریں!! اور اس کی مرضی پر چلیں۔ اور اسی کی مرضی کو اپنی مرضی بنائیں۔

اگر میں پروفیسر پوففوس کی باتوں میں آگئی ہوتی اور اگر ان کے ڈرانے یا دھمکانے سے متاثر ہوگئی ہوتی تو میں نہیں جانتی کہ میں آج کہاں ہوتی! میں نے اپنے پیشہ کی زندگی میں کوئی کام ایسا نہیں کیا جس کہ اس نے مداخلت نہ کی ہو یا اس کو تباہ کرنے کی تدبیر نہ کی ہو! وہ ہمیشہ مجھے اپنے مقصد کی تکمیل سے روکتا ہے۔ وہ ہمیشہ میرے کاروباری معاملات میں مداخلت کرینگا! باہر یا گھر میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنیکی کوشش کرتا رہا ہے! وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا! میں مضمحل اور پست ہمت ہوگئی! پھر میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنی زندگی کی خود حفاظت کرونگی اور مادام فلٹ میجگر یا پروفیسر پوففوس کو اپنی زندگی میں کسی دسترس کا موقع نہ دونگی! چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ نکال دیئے گئے! اب میں ہمیشہ چوکنا رہتی ہوں اور احتیاط رکھتی ہوں کہ وہ میرے دماغ میں نہ پہونچنے پائیں اور کوئی ناخوشگوار اثر نہ پیدا کریں! میں اس اصول پر عمل کرتی ہوں کہ ان کو ہمیشہ دروازہ سے باہر ہی رکھا جائے۔ بجائے اس کے کہ وہ اندر آجائیں اور پھر مجھے ان کو نکالنا پڑے!!

اس ظاہری چمک اور آب و تاب سے قطع نظر کرکے جو متحرک تصویروں نے میری ذات کے ساتھ پیدا کر دی ہے مجھے دیکھئے کہ میں ایک معمولی، دعاگو اور پرامید عورت ہوں! مجھے اپنی زندگی میں آلام سے بھی سامنا کرنا پڑا ہے آزمائشوں کے دور بھی گذرے ہیں۔ میں نے ابتدا اسطرح کی جیسے کہ ہم عموماً کرتے ہیں ــــ خوف زدہ، پراز مصائب فکرمند اور ایسے بار اٹھائے ہوئے جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ میں ہر چیز کی ذمہ دار ہوں! لیکن اس کے بعد میں نے یہ سیکھا کہ مجھے نقشے کی طرح تمام دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش نہ کرنا چاہیے اور بجائے خود ناخدائی کرنے کے خدا کو ناخدائی کرنے دینی چاہیئے!!

میں نے جو کچھ کہا ہے کامل عجز و انکسار کے ساتھ کہا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے اس کو ثابت کر دیا ہے! میں نے اپنی زندگی کے تمام مسائل کو ابھی حل نہیں کیا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ میں کرونگی کیونکہ میں نے اپنے خیال کی نگہداشت کرنا سیکھ لیا ہے اور میرا خیال زندگی کی تمام جزئیات میں میری نگہداشت کرتا رہیگا!!

اب بتلائیے کہ کیا یہ چیز ایسی نہیں جس کی آپ کوشش کریں؟؟

افسانہ و محاضرات

قاتل

از

حضرت ام اسلم آف لاہور

بہرام جی! نرگس نے آم کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ملازم کتنا عرصہ رہے،" آم کی قاش پلیٹ میں رکھکر یہ کھائیے بہت میٹھا ہے"۔

او ہو! طاؤس نے ایک قاش اٹھاتے ہوئے کہا مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ آپ ملازمت بھی کر چکے ہیں۔

لیکن! نرگس نے شوہر کے سامنے سے پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ آپ کو اتنا معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ آم صرف بہرام جی کے لئے ہیں۔ رکھ دیجئے یہ قاش بھی۔

ہاتھ آئی ہوئی چیز کون چھوڑتا ہے۔ طاؤس نے آم منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ بہرام جی! کھائیے خوب میٹھا ہے۔

بوڑھا بہرام طاؤس اور نرگس برآمدے میں بیٹھے آم کھا رہے تھے۔ بوڑھا بہرام اُودی اُودی بدلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جن کے کنارے شعاع آفتاب سے اسطرح چمک رہے تھے جیسے کسی کی چنریا پر سنہری گوٹ لگی ہو۔

تو ہاں! طاؤس نے پھر پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کہاں کہاں ملازمت کی آپ نے؟

سنبھالیئے ہاتھ اپنا! نرگس نے شوہر کا ہاتھ جھٹک کے کہا۔

توبہ ہے۔ طاؤس ہنس کر بولا۔ "آم ہی تو ہے نرگس! میں نے کھالیا یا تم نے کھالیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔

میں بہرام جی کے لئے کاٹ رہی ہوں! نرگس نے ذرا شوخ نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور میں بہرام جی ہی کی خاطر سے کھا رہا ہوں" طاؤس نے ہنس کر جواب دیا۔ "خیر! تم ناراض ہو تو ہم خود ہی کاٹ کر کھائینگے" یہ کہہ کر اس نے پلیٹ میں سے ایک آم اٹھا لیا۔

بیٹھو جی ٹھہرے! نرگس نے ایک نگاہ غلط انداز سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پلیٹ بہرام کی طرف بڑھا کر بولی۔ آپ بھی تو کھائیے۔

بہرام نے ایک قاش اٹھالی اور ادھر طاؤس نے بھی ایک قاش کاٹ کر اور بیوی کی طرف بڑھا کر کہا۔ لو نرگس! لیکن نرگس نے جو آم لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو طاؤس نے جھٹ اپنے منہ میں ڈال لیا بوڑھا بہرام مسکرانے لگا

بہرام جی! طاؤس بولا۔ بھلا اس میں ہنسنے کی کونسی بات تھی۔ یہی تو کل جگ ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

پھر بیوی کی طرف دیکھ کر ٹھیک ہے نا نرگس ؟
...گی۔ صبر کیجئے! نرگس نے سر ہلا کر جواب دیا۔ پھر بہرام سے
...گی۔

تو بتلائیے نا کتنا عرصہ ملازمت کی آپ نے ؟
یہی کوئی دس بیس سال! طاؤس بولا۔ ٹھیک ہے نا
...! میں تم سے نہیں پوچھ رہی" نرگس بولی۔
لیکن میری محبت یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی" طاؤس
...ت آمیز نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کہ تم
...اور کوئی جواب نہ دے۔ کیوں
بہرام جی! سچ کہا نا میں نے ؟
بھئی! بوڑھا بہرام مسکرا کر بولا۔ ہے تو سچ ہی۔
کون کہتا ہے نرگس نے کہا
میں تو نہیں کہہ رہا ہوں! طاؤس نے ہنسکر کہا
اور میں تم سے پوچھ بھی تو نہیں رہی ہوں" نرگس
...ب دیا۔ پھر بہرام سے "کیا آپ نے گونگے کا گڑ کھایا ہے
...ہاں تو کیجئے آپ بھی"
نرگس! بوڑھے بہرام نے مسکرا کر کہا۔ "تم دونوں
...ن قسمت ہو۔ اسی کا نام زندگی ہے۔
میں نہ تو قسمت کے متعلق کچھ پوچھ رہی ہوں۔ نرگس
...ہنسکر کہا اور نہ زندگی کے جواز یا عدم جواز کے متعلق بحث
...ہوں۔ آپ یہ فرمائیے کہ آپ نے کتنا عرصہ اور کہاں ملازمت
؟
لیکن یہ تو میں نے پوچھا تھا۔ طاؤس آم کھاتے
...کہنے لگا۔ اب کہو تم نے میری بات میں دخل کیوں دیا ؟
...جواب میں نرگس نے ذرا ترچھی نگاہوں سے شوہر کی طرف

دیکھا اور وہ ایک آہ بھر کر بولا۔
ارے توبہ۔
برچھی لگا جاتی ہے ترچھی سے نگاہ سے!
نرگس کو ہنسی آگئی۔ بہرام بھی مسکرانے لگا۔ اسپر
نرگس ایک ادائے جانانہ سے سر ہلا کر بولی۔
ہنسا کرو۔ مجھے کیا ؟
محض اناڑی ہو تم نرگس! طاؤس بولا۔ آخر چڑ
گئیں نا۔
پھر بہرام سے۔
سنئے جناب آپ میری نرگس کا جواب جلد دیجئے
کیونکہ میں اسے یوں تو ناراض نہیں دیکھ سکتا۔
مجھے تمہاری سفارش کی ضرورت نہیں"۔ نرگس نے
کچھ بے رخی سے کہا "لیکن مجھے تو محبت مجبور کر رہی ہے" طاؤس
نے کچھ اس طرح آہ بھر کر کہا کہ بہرام اور نرگس دونوں ہنسنے لگے
پھر نرگس بولی۔
بہرام جی! آپ میری بات کا جواب دیں گے
یا نہیں ؟
اور طاؤس بولا۔
بہرام جی! بتلا دیجئے جلد ہی ورنہ اعلان جنگ
ہوا چاہتا ہے۔
نرگس! بہرام کہنے لگا۔ میں نے کچھ بہت عرصہ ملازمت
نہیں کی۔ یہی کوئی پانچ ایک سال جیل کا سپرنٹنڈنٹ رہا ہوں۔
جیل سپرنٹنڈنٹ ؟ نرگس نے ذرا تعجب سے
کہا۔ اور پاس سے طاؤس بولا۔
کچھ سمجھے آپ بھی! بس سنا دیجئے نا کوئی قصہ اب جلدی

کیجئے! پھر بیوی سے نرگس! کیسی بوجھی تمہارے دل کی!
نرگس نے ایک دلکش انداز سے سر ہلا دیا۔
وقت تو خوب مزے سے کٹتا ہوگا بہرام جی؟ طاؤس
نے کہا۔
اور نرگس بولی آپ نے کسی کو پھانسی پاتے بھی
دیکھا ہے کبھی!
کئی بار! بہرام نے جواب دیا۔
نرگس بہرام کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھنے لگی
گویا وہ کچھ اور بھی سننے کی منتظر ہے طاؤس بہرام کو خاموش
پاکر بولا۔
دیکھئے جناب! میں یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ میری
نرگس کو زحمت کش انتظار کرنا پڑے۔
ہاں! بہرام نے ہاں کو ذرا لمبا کرکے کہا۔ محبت کا
تقاضہ بھی تو یہی ہے۔
لیکن میں تو مرد کی محبت کی قائل ہی نہیں نرگس
نے ہنس کر کہا۔
میری محبت کی تو ہو؟ طاؤس نے پوچھا
بالکل نہیں نرگس نے شرارت آمیز تبسم سے جواب دیا۔
چلیے چھٹی ہوئی طاؤس نے تولیہ سے ہاتھ صاف
کرتے ہوئے کہا۔
اب بہرام نے نرگس کی طرف دیکھا اور کہا۔
یہ کیا کہا تم نے نرگس؟ محبت سے زندگی بھی بنتی
ہے اور کبھی زندگی سے ہاتھ بھی دھونے پڑتے ہیں۔
ہاں! بہرام نے آہستہ سے کہا۔ کہتی تو تم بھی ٹھیک

طاؤس نے پوچھا کیں میں آپ کو اس کا تجربہ ہوا ہ
کئی بار بہرام نے اپنے روئی کے گالے جیسے ز
اور سپید بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتے ہوئے جواب دیا کو
قصہ ہمیں نہ سنائیے گا طاؤس نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے
سنو گی نا نرگس تم بھی؟
بہرام مسکرانے لگا۔

سائے ڈھل چکے تھے۔ اور اودی اودی بدلیا
جو آسمان کی آغوش میں کھیل رہی تھیں۔ اب ذرا ادھر ادھر
لگی تھیں اور کہیں پاس ہی سے کوئل کی کو کو کسی فراق آشنا روح
طرح ساز عالم کو برہم کر رہی تھی۔
اس پرندے کی آواز میں کسقدر سوز ہے طاؤس بو
یہ آواز نہیں۔ بہرام نے کہا۔ بلکہ سوز محبت ہے۔
اور پاس سے نرگس بولی۔ یہ اظہار خود غرضی ہے۔
طاؤس نے بہرام کی طرف نظر اٹھائی اور کہا سن لیا آپ
ہماری نرگس کا فلسفہ؟
طاؤس! بہرام بولا۔ نرگس بھی کچھ غلط نہیں کہتی مح
انسان کو خود غرض بھی بنا دیتی ہے۔
اور ظالم بھی نرگس نے کہا
یہ بھی ٹھیک ہے بہرام بولا۔
لیکن نرگس کے پاس کوئی دلیل تو ہے نہیں، طاؤ
کہنے لگا آپ ذرا میری محبت ....
تم اپنی محبت رکھو طاق پر نرگس نے بات کاٹ کر
بہرام جی ابھی ثابت کر دیں گے کہ میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔
سن لیا بہرام جی! طاؤس ہنس کر بولا۔ یہ تو وہی بات

یہ مونچھوں والا بکرا چلئے داڑھی والا! چلئے! اب سُنا دیجئے
ورنہ میں نرگس کو ابھی غلط ثابت کئے دیتا ہوں۔

بھئی! بہرام کہنے لگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ محبت
پن تک پہونچ جائے کبھی خطرناک صورت بھی اختیار کر لیتی ہے
مثلاً ؟ طاؤس نے نرگس کو چڑانے کی شرارت
کہا۔

اب تم چپکے بھی رہو گے نرگس بولی۔ اچھا بہرام
پھر۔

بہرام نے ایک دو بار سر ہلایا پھر کہنے لگا۔
نرگس! جن دنوں میں جیل میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔
گورکھا جس کا نام چتر سنگھ تھا قتل کے جرم میں وہاں لایا
عدالت سے اسے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ اور سرکار کی
ن سے عدالت عالیہ میں اس کے لئے رحم کی اپیل کی گئی تھی
سنگھ خاصہ خوبصورت نوجوان تھا۔ مجھے اس کی جوانی پر
ترس آتا۔ میں جب کبھی اسے دیکھنے آتا یا اس کی کوٹھڑی
کے پاس سے گذرنے کا اتفاق ہوتا تو اسے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے
پاتا یا دیوار سے پیٹھ لگائے خاموش بیٹھے ہوئے دیکھتا چونکہ
اس نے اقبال جرم کر لیا تھا اس لئے اس کی اپیل منظور ہونے کی
مجھے کچھ زیادہ امید نہ تھی اور آخر ہوا بھی وہی جس کا مجھے کھٹکا تھا۔
اپیل نامنظور ہوئی اور موت کا دن اور وقت مقرر ہو گیا۔

نرگس! جس روز چتر سنگھ کو یہ افسوسناک اطلاع
دینے گیا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

چتر سنگھ! میں نے دروازے کے پاس کھڑے
ہو کر کہا۔ سوتے ہو؟ نہیں جناب! اس نے سر اٹھا کر جواب دیا
پھر ذرا ہنس کر کہنے لگا میرا خیال ہے کہ آپ میرے لئے نجات
کا پیغام لے کر آئے ہیں؟

نجات کا پیغام! میں نے تعجب سے کہا۔

ہاں! ہاں! وہ کہنے لگا۔ یہ زندگی تو میرے لئے
ایک مسلسل عذاب بن گئی ہے۔ خیال تو فرمائیے کہ جس شخص نے
اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہو اسے قسمت کا آخری فیصلہ سنانے میں
اتنی تاخیر سے کام لینا کتنا ظلم ہے"

چتر سنگھ! میں نے کہا۔ ملک کا قانون جو یہی ٹھہرا!
لیکن بھگوان کا تو یہ حکم نہیں" اس نے جواب دیا۔
کہ بلا وجہ کسی کو اذیت دو۔ مادر چر میں نے رحم کی درخواست ہی کب کی
ہاں! اگر کوئی جرم سے انکار کرے تو اسے مجرم یا بے قصور ثابت
کرنے کے لئے ملک کے قانون کے مطابق جو کچھ کیا جائے ٹھیک ہے۔
خیر! فرمائیے ابھی یہ زندگی کا عذاب مجھے کب تک
بھگتنا ہے۔

چتر سنگھ! میں نے ذرا مغموم لہجے میں کہا۔ اب صرف
تین دن باقی ہیں۔

آج کون دن ہے!

آج ہفتہ ہے! میں نے جواب دیا۔

تو گویا منگل کے روز یہ زندگی عذاب کے دکھ سے
چھوٹ جائے گی۔ اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔ لیکن وقت تو آپ نے
بتلایا ہی نہیں۔

صبح چھ بجے! میں نے جواب دیا۔

یہ سنکر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دونوں
ہاتھ جوڑ کر بولا دیا ہے بھگوان تیری۔

چتر سنگھ! میں نے کہا۔ اگر کچھ کھانے پینے کو دل چاہتا
ہو یا کسی سے ملنا چاہو تو میں انتظام کر دوں گا۔

یہ سنکر اس نے میری طرف دیکھا اور ذرا مسکرا کر کہنے لگا۔

دیا ہے آپ کی۔ لیکن جس سے ملنے کو دل چاہتا ہے اسے تو میں خود مٹا چکا۔

کوئی اور خواہش۔ میں نے پوچھا۔

ہاں! وہ کہنے لگا۔ ایک خواہش تو ہے۔

کیا ؟

شاشتروں میں آتما کے بارے میں کیا لکھا ہے! اس نے پوچھا۔

چتر سنگھ! میں نے کہا۔ یہ دکھ سب جسم کے لئے ہے۔ آتما اس سے آزاد ہے۔ روح کے لئے موت نہیں۔

یہ سنکر اس نے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا تو کیا مرنے کے بعد میں سوہنا سے مل سکوں گا ؟

میرا تو خیال ہے ضرور ملوگے" میں نے جواب دیا۔

اچھا! اس نے سر ہلا کر کہا چل کر دیکھ لیں گے۔

میں کسی پنڈت کو بھیج دوں۔ میں نے پوچھا۔

نہیں جناب! اس نے پھر مسکرا کر کہا۔ اب میں جس خیال میں ہوں آپ مجھے اسی خیال میں رہنے دیں۔

خیر! میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو پہرے والے سے کہدینا۔

◆

بہرام جی! نرگس بولی: اسے موت کا پیغام دیتے ہوئے آپ کو کچھ افسوس تو ہوا ہوگا۔

نرگس! بہرام نے اس حسینہ کی طرف جو ایک گل نودمیدہ کی طرح شگفتہ نظر آ رہی تھی دیکھ کر کہا بہت ہوا! سچ جانو! لفظ میرے منہ سے نکلتے نہ تھے مجھے اسکی جوانی پر ترس آتا تھا۔

کیا عمر تھی! طاؤس نے پوچھا۔

یہی کوئی پچیس چھبیس سال! بہرام نے جواب دیا کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اور بات بھی سلیقے سے کرتا۔ خاصہ خوبرو جوان تھا۔

بہرام جی۔ نرگس نے ذرا تیوری پر بل ڈالکر کہا۔ آپکو اس کی جوانی پر تو ترس آگیا۔ لیکن جس غریب کو اس ظالم نے مارا۔ وہ بھی تو جوان ہوگی۔ جانے کیا کیا عذاب اسے دینے گئے ہوں گے۔ میرے خیال میں تو ایسے سنگدل کے لئے موت تو کوئی ایسی سزا نہیں۔ پھانسی کی رسی کا جھٹکا اور قصہ ختم! دیکھ لی! مرد کی محبت ؟

یہ نرگس نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کوئی دیوانہ ہوگا" طاؤس بولا۔ تو ہاں بہرام جی! آپ پھر بھی تو اس سے ملے ہوں گے۔

اور نرگس بولی" اس نے بھی تو کچھ تبلایا ہوگا۔ کہ اس نے کیوں قتل کیا ؟۔

بہرام کہنے لگا۔ تیسرے دن کوئی چار بجے کے قریب میں اسے دیکھنے گیا۔ وہ کوٹھری میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا مجھے دیکھکر بولا۔ میں نے جانا شاید اب آپ کے درشن نہ ہونگے۔

کل چھٹی تھی۔ میں نے کہا۔ اس لئے نہ آیا۔ کچھ کام تھا؟

نہیں۔ اس نے کہا۔ ایسے ہی درشن کرنے کو دل چاہتا تھا آپ نے مجھ پر بہت کرپا کی۔

چتر سنگھ۔ میں نے کہا مجھے تمہارے حوصلے اور استقلال پر تعجب ہوتا ہے۔ تم سی سزا کے مستحق نہ تھے۔

اجی جناب! اُس نے مسکرا کر کہا۔ موت سے کیا ڈر
ں چیز کی روک تھام اپنے بس میں نہ ہو اس سے خوف ہی کیا۔

بہرکیف! میں نے کہا۔ تم بہت بہادر آدمی ہو۔

ہاں! اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، چار
ل کرنا واقعی بہت بہادری کا کام ہے۔

ارے! تعجب اور خوف سے میرے منہ سے نکلا
ر قتل کئے تم نے۔ کیوں

سونیا کی محبت نے سب کو تباہ کیا! وہ ایک آہ
ر کر بولا۔ اور میری محبت نے سونیا کو! اور آج یہ جوانی اسی
بت کی بھینٹ چڑھ رہی ہے۔

اتنے میں ایک وارڈر جسے میں کہہ آیا تھا دودھ
لے آیا۔

چتر سنگھ! میں نے قیدی سے کہا۔ سنا ہے دو روز
سے تم نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ لو تھوڑا سا دودھ پی لو۔

گھبرائیے نہیں! اس نے مسکرا کر کہا۔ میں تگڑا آدمی
ں۔ پھانسی کے تختہ تک خود ہی چلا جاؤں گا!

لیکن تھوڑا سا دودھ پی لینے میں تو کچھ حرج نہیں
یں نے کہا۔

معاف فرمائیے! اس نے کہا۔ مجھے اب ان چیزوں
کی ضرورت نہیں۔

کیوں میں نے پوچھا۔

میں اب آخری منزل کی تیاری کر رہا ہوں۔ اسنے
واب دیا۔ شاید وہ میرا قصور معاف کر دے!

کون۔ میں نے پوچھا۔

میری سونیا! اس نے جواب دیا۔

چتر سنگھ میں نے کہا جب تمہیں اس سے اتنی
محبت تھی تو پھر اس غریب کو مارا کیوں؟

آپ یہ قصہ سنیں گے؟ اس نے میری طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

تمہاری مرضی۔ میں نے جواب دیا۔

تو سنئے! وہ کہنے لگا۔ آج سے کوئی تین ایک سال
پیشتر میں فوج میں ملازم تھا۔ کپتان صاحب مجھ پر بہت مہربان
تھے میں ان کا اردلی تھا۔ قلعہ میں کچھ مرد اور کچھ عورتیں قلیوں کا
کام کرتے تھے۔ انہی میں سونیا بھی تھی بہت خوبصورت بڑی
من موہنی باتیں کرتی۔ اس کا شوہر گوپی ایک آنکھ کا کانا تھا۔
دوپہر کو جب کوئی گھنٹہ بھر کے لئے قلیوں کو چھٹی ہوتی تو وہ سب
کھانا کھا کر ایک جگہ بیٹھ جاتے وہ گانا ڈفلی بجاتا۔ اور سونیا جھوم
ڈالتی کبھی کبھی! ادھر اُدھر سے سپاہی بھی اکھٹے ہوتے، جدھر
سے کوئی سونیا کو اکنی یا دونی دکھلاتا تو وہ مور کی طرح جھومتی ہوئی
جاتی لیکن جب پیسے لینے کو ہاتھ بڑھاتی تو دینے والا اس کا ہاتھ
پکڑ لیتا۔ خوب ہنسی مذاق ہوا کرتا مجھے بھی اگر فرصت ہوتی تو تماشہ
دیکھنے جا کھڑا ہوتا۔ سونیا کبھی کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا کرتی
میں بھی مسکرا دیتا۔ اور ہمیشہ چونی دیا کرتا۔ لیکن بات چیت
کا کبھی موقع نہ ملتا۔ اور جو کبھی ملتا بھی تو سونیا ٹال جاتی۔

ایک روز میں کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھا صاحب
کی تلوار صاف کر رہا تھا کہ سونیا آئی۔

آج کہاں سے بھول پڑیں۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔
وہ بھی ہنس کر بولی۔ میں نے کہا چلو درشن ہی کر آئیں۔

سونیا میں نے کہا۔ ایک دیا تو تمہارے درشن
کرتی ہے۔

لیکن تم اس دنیا میں نہیں اس نے ذرا اہک کر
اور آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔

سچ ہے! میں نے کہا" میری دنیا تو تم ہو سونیا!۔

جھوٹ کہتے شرم نہیں آتی" وہ ذرا لچک کر بولی۔

"رام جانیں! سچ کہتا ہوں" میں نے کہا۔ وہ کانا کہاں
گیا آج!۔

دیکھو جی! اس نے دونوں ہاتھ اپنی پتلی سی کمر پر رکھکر
اور ایک بانکپن سے سر ہلا کر کہا۔ میرے مالک کو کھول (مخول)
مت کرو۔

غلطی ہوئی! میں نے مسکرا کر کہا۔ معاف کر دو۔

کانا بڑا اچھا آدمی ہے" میں نے ہنس کر کہا؟

میرا پتی جو ہوا! اس نے جواب دیا۔

جب تم اپنے پتی کو کانا کہتی ہو۔ میں نے کہا تو جانے
مجھے کیا سمجھتی ہو گی۔

کچھ سمجھتی ہی ہوں تو آئی بھی ہوں۔ اس نے پھر
اپنی موٹی موٹی سی آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔

تمہاری جورو بھی ہے؟ اس نے پوچھا۔

ہے تو سہی؟ میں نے کہا۔

کہاں ہے؟

میں نے ذرا شرارت آمیز نگاہوں سے اس کی
طرف دیکھا اور کہا یہ پاس ہی تو کھڑی ہے۔

بڑے کھراب (خراب) آدمی ہو! وہ یہ کہتے ہوئے
اس طرح ہنسی جیسے کوئی ہری ہری ٹہنی مستی سے لچکے ہی ہو۔

اتنے میں قلیوں کا داروغہ رام سنگھ آ گیا۔ یہ بہت
بدطینت اور بڑا بدمعاش تھا۔

سونیا!" اس نے آتے ہی کہا۔ کیا کر رہی ہو یہاں؟

"باتیں! سونیا نے ذرا تن کر جواب دیا۔

اور کام کون کرے گا! رام سنگھ نے ذرا غصے سے کہا۔

تم! سونیا نے یہ کہتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔

چلو! رام سنگھ تحکمانہ لہجہ میں بولا۔ کام کرو چل کر۔

تم چلو! سونیا بولی۔ میں آتی ہوں۔

رام سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن سونیا نے ہاتھ
جھٹک دیا اور گودام کی جانب جہاں وہ کام کرتی تھی چل دی۔
لیکن رام سنگھ کھڑا رہا۔

بیٹھ جاؤ ! میں نے کہا۔

لیکن وہ کھڑا ہی رہا۔ پھر کہنے لگا۔

قلیوں کی عورتوں سے ہنسی مجاق (مذاق) اچھا نہیں
یہ کہہ کر وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سونیا کے پیچھے
چلا گیا۔ مال گودام کے دروازے کے پاس پیپل کا ایک درخت
تھا۔ دونوں اس کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ آواز تو سنائی نہ
دی لیکن سونیا کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ جھگڑا ہو رہا ہے

تو جناب! وہ دن بھی گذرا اور رات بھی کٹی، لیکن دن
کیسے گذرا اور رات کیسے کٹی، اس کا کچھ پوچھئے نہیں، بس سینے
کے اندر ایک آگ لگی تھی، اگلے روز دوپہر کے وقت جب
قلیوں کو چھٹی ہوئی میں گودام کی جانب گیا۔ قلی ادھر ادھر بیٹھے
تھے، کانا بھی تھا لیکن سونیا کہیں نظر نہ آئی

تم لوگ آج نہیں اچھے دکھتے ہیں۔ میں نے ایک قلی سے پوچھا۔

وہ ہنس کر کہنے لگا "جانے وہ ناچنے والی قیتری کدھر گئی آج!

اور کا نا پیلا "کس کو پوچھتے ہیں سنتری جی آپ۔

آج تم ڈفلی نہیں بجاتے" میں نے ہنس کر کہا، کیا پھٹ گئی آج؟

گلی ہنسنے لگے اور میں بنگلے پر واپس آگیا۔ کچھ دیر بعد جب کام کا گھڑیال بجنے لگا تو میں نے سونیا کو قلعہ کی برج کی طرف سے آتے دیکھا۔ میں برآمدے میں بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر وہ ادھر ہی لوٹ پڑی۔

اور پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھنے لگا۔

کیا دیکھتے ہو! اس نے مسکرا کر پوچھا۔

تمہیں دیکھتا ہوں سونیا! میں نے کہا۔

کہیں نظر نہ لگا دینا! اس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

سونیا! میں نے کہا۔ کوئی تمہارے تیر نظر سے بچے گا تو نہیں نظر لگے گی۔

دیکھئے وہ مسکرا بولی۔ کہیں تمہارے نہ لگ جائے

ابھی لگنا باقی ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

بڑے عاشق مزاج ہو۔ وہ ہنس کر بولی، عاشقی بڑی مشکل چیز ہے۔

ہاں! میں نے کہا۔ جب معشوق تم ایسا سنگدل ہو۔ اور عاشق تم جیسا گورا ہو۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ اچھا ایک کام تو میرا بھی کردو۔

کیا کام! میں نے پوچھا۔

پہلے وعدہ کرو۔ اس نے اپنے پھر اسی مخصوص انداز سے مسکرا کر اور آنکھیں مٹکا کر کہا۔

تم کہو تو سہی! میں نے کہا۔ میرے بس میں ہوا تو انکار نہ کروں گا۔

ایک پاس چاہیئے۔ صاحب سے! سونیا بولی۔

لیکن کسی کو خبر نہ ہو۔

کیسا پاس؟ میں نے پوچھا۔

یہی قلعے میں آنے جانے کا، اس نے جواب دیا۔

کیا کروگی؟ میں نے پوچھا۔

کچھ کرنا ہی ہے تو کہتی بھی ہوں، وہ بولی دے دوگے۔

کوشش کروں گا" میں نے کہا۔ لیکن قلعے میں تو تم ہر روز آتی جاتی ہو۔

لیکن وقت سے پہلے نہ آسکتی ہوں نہ جاسکتی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

اچھا میں نے کہا۔ اب کہاں سے آئی ہو۔

برج میں بیٹھی تھی۔

کیوں! میں نے پوچھا۔

کسی کو یاد کرتی تھی" وہ مسکرا کر بولی۔

کسے! میں نے پوچھا۔

بوجھ لو! یہ کہکر وہ ہنستی ہو چلی گئی۔

(باقی آئندہ)

افسانہ و محاضرات

خوش انجام

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شکسپیر کے مشہور ڈرامہ TUWELFTHNIGHT کا اردو ترجمہ

مترجمہ .... جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم اے

(۲)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین سمندر کا ساحل

انٹونیو ANTANIO اور سبیسٹین داخل ہوتے ہیں۔

انٹونیو ۔ کیا آپ کچھ دیر اور نہیں ٹھہریں گے؟ کیا مجھے آپ اپنے ساتھ لے نہیں چلینگے۔؟

سبیسٹین۔ میرا ستارۂ قسمت گردش میں ہے۔ ممکن ہے کہ میری سیہ بختی آپ پر بھی کوئی ستم ڈھائے۔ اسلئے میں تنہا جانا پسند کروں گا۔ کیا آپ کی نوازشوں کا یہی صلہ ہے کہ آپ کو میں اپنے مصائب کے دائرہ میں لے آؤں۔

انٹونیو ۔ تو آپ کہاں جارہے ہیں۔

سبیسٹین۔ میں نے آپ کو اپنا نام روڈرگو RODERIGO بتایا تھا۔ مگر میرا اصلی نام سبیسٹین ہے۔ میسلین MESSLINE کے رہنے والے سبیسٹین میرے والد بزرگوار تھے۔ اور آپ نے شاید ان کا نام بھی سنا ہو۔ وہ اپنی وفات پر مجھکو اور میری بہن دونوں کو اس دنیا میں چھوڑ گئے۔ ہم دونوں ایک ہی ساعت میں پیدا ہوئے تھے۔ کاش ہم دونوں ایک ہی ساعت میں مر بھی جاتے! لیکن آپ کی وجہ سے یہ ہو سکا جو آپ نے مجھکو سمندر کی موجوں سے نکالا۔ اس سے چند گھنٹے پہلے میری بہن غرقاب ہو گئی۔

انٹونیو ۔ افسوس!

سبیسٹین۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ میری ہمشکل ہے لیکن اکثر لوگ اس کو حسین سمجھتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ حاسد بھی اس کی روشن خیالی اور روشن ضمیری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ افسوس کہ اسکی قبر آب شور میں ہے۔

انٹونیو ۔ میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کو
معاف کیجئے۔

سبیسٹین ۔ توبہ ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ۔ میری ہی وجہ
سے آپ کو تکلیف ہوئی ۔ آپ مجھے معاف کیجئے۔

انٹونیو ۔ مجھے اپنے ساتھ اپنا خادم بنا کر لے چلیے۔

سبیسٹین ۔ اس کی خواہش نہ کیجئے، اچھا خدا حافظ، میرا
قلب ایسا نازک ہے کہ ذرا سی بات پر آنکھوں
میں آنسو چلے آتے ہیں ۔ میں کونٹ اورسینو
کے دربار میں جانے کا عزم کر رہا ہوں ۔ خدا حافظ
(چلا جاتا ہے)

انٹونیو ۔ تجھ پر دیوتاؤں کی رحمتیں نازل ہوں ۔ اورسینو
کے دربار میں میرے دشمنوں کا جم گھٹا ہے
ورنہ میں بھی بہت جلد تجھے دیکھنے کے لئے وہاں
پہونچتا ۔ کچھ بھی ہو میری طبیعت مجبور کر رہی
ہے کہ میں خوف وخطر کی پروا نہ کروں اور
وہاں جاؤں ۔

دوسرا سین ـــــــ ایک گلی

وایلا داخل ہوتی ہے میلوولیو پیچھے سے آرہا ہے

میلوولیو ۔ ابھی آپ کونٹس اولیویا کے ہاں سے آرہے
ہیں نا ؟

وایلا ۔ ہاں ۔ بات کچھ ایسی ہی ہے ۔

میلوولیو ۔ وہ یہ انگوٹھی واپس کر لی ہیں ! اگر آپ اپنی انگوٹھی
خود لے آتے تو مجھے آپ آنے کی تکلیف سے تو بچا لیتے
وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ آپ اپنے آقا سے کہہ دیجئے کہ وہ
ہرگز مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں، اور یہ بھی کہا ہے
کہ آپ کو اگر آنا ہو تو یہ کہنے کے لئے آیئے کہ اس
نامنظوری کا آپ کے آقا پر کیا اثر ہوتا ہے ۔

وایلا ۔ اس نے خود مجھ سے یہ انگوٹھی لی ہے ۔ میں نہیں
لوں گا۔

میلوولیو ۔ چلئے جناب آپ نے میری مالکہ کو یہ انگوٹھی پھینک
کر دی لیکن ان کی خواہش ہے کہ اسکو واپس
کر دیا جائے ۔ اگر لینا ہے تو لیجئے نہیں تو جو دیکھیگا
اسکو لے لیگا ۔ (چلا جاتا ہے)

وایلا ۔ میں نے تو کوئی انگشتری وہاں چھوڑی نہیں، آخر
اس عورت کا مطلب کیا ہے ۔ کہیں میرے حسن و
جمال نے تو اسکو مسحور نہیں کر لیا ۔ وہ مجھکو بہت غور
سے تاک رہی تھی ۔ اور اکثر وہ بولتے بولتے چونک
جاتی تھی ۔ ضرور وہ گھائل ہو گئی ۔ میرے آقا نے تو
کوئی انگوٹھی میری معرفت نہیں بھیجی تھی ۔ ہو نہ ہو وہ
عشق کے بھنور میں ہے ۔ میرے اس بھیس نے اسکو
کس دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے ۔ لیکن مجھ پر عاشق ہونا
گویا ایک خواب ہے ایک سایہ پر عاشق ہونا ہے عورت
کے کمزور دل کو سطحی چمک بھی کیا مسحور کر لیتی ہے ۔
صنف نازک کی یہی حالت ہے، میرا آقا اس پر عاشق ہے اور میں
اپنے آقا پر آخر اسکا نتیجہ کیا ہوگا ۔ اے وقت ! تو ہی اس
گتھی کو سلجھا سکتا ہے ۔

تیسرا سین ——— اولیویا کے گھر میں ایک کمرہ

سر ٹوبی ۔ مسخرے، لو یہ چھ پنس تمہارے لئے ہیں، ذرا ایک گیت گاؤ۔

سر اینڈ رو ۔ اور میری طرف سے بھی چھ پنس کا یہ ہے۔

مسخرہ ۔ اچھا۔ آپ لوگ کوئی عشقیہ گیت سنیں گے یا کوئی اخلاقی گیت۔

سر ٹوبی ۔ عشقیہ۔

سر اینڈ رو ۔ مجھے اخلاقی گیت پسند نہیں ہوتے۔

مسخرہ ۔ (گیت) میری محبوبہ تم کہاں جا رہی ہو۔

ٹھہرو سنو تمہارا سچا عاشق آ رہا ہے
اور وہ ہر قسم کے گیت گا سکتا ہے
پیاری حسینہ، رک جاؤ
تاکہ عاشق و معشوق دونوں مل جائیں
ہر آدمی جو عقل والا ہے اس بات کو جانتا ہے

سر اینڈ رو ۔ خوب، خوب!

سر ٹوبی ۔ شاباش،

مسخرہ ۔ عشق کیا ہے؟ ہرگز آئندہ کی خوشیوں کی امید پر جینا عشق نہیں ہے۔
موجودہ خوشیوں سے خوب لطف اٹھاؤ۔
مستقبل کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔
تو پھر دیر کرنے سے فائدہ؟
آؤ میری بست سالہ حسینہ، آؤ اور میرا بوسہ لو۔
جوانی کوئی ٹھہرنے والی چیز نہیں ہے ×۱

(میریا داخل ہوتی ہے)

میریا ۔ یہ کیا غل غپاڑہ مچا رکھا ہے۔ یقین جانو کہ میری مالکہ میلو ولیو کو حکم دیگی کہ تم لوگوں کو یہاں سے باہر کر دیا جائے۔

سر ٹوبی ۔ میری بھتیجی ملک چین کی رہنے والی ہے۔ اور ہم لوگ مدبر ہیں اور میلو ولیو احمق ہے۔ کیا میں تمہاری مالکہ کا قریبی رشتہ دار نہیں ہوں (گانے لگتا ہے)

مسخرہ ۔ سر ٹوبی ترنگ میں ہے۔

سر اینڈ رو ۔ خوب ہی ترنگ میں ہیں۔

سر ٹوبی ۔ (گانے لگتا ہے)

میریا ۔ خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔

(میلو ولیو داخل ہوتا ہے)

میلو ولیو ۔ کیا آپ لوگ پاگل اور سڑی ہو گئے ہیں؟ کیا آپ کے دماغ عقل سے خالی ہو گئے ہیں؟ یہ کونسا طور طریقہ ہے۔ کہ رات کی اس گھڑی میں لوہاروں کی طرح شور و غل کر رہے ہیں؟ کیا آپ لوگوں نے اس مکان کو کوئی ٹھٹی سمجھ رکھا ہے۔

سر ٹوبی ۔ ہم لوگ گیت گا رہے تھے جناب

میلو ولیو ۔ سر ٹوبی میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں، میری مالکہ نے آپ سے یہ کہنے کے لئے کہا ہے کہ اگرچہ آپ انکے

×۱ بالکل عمر خیام یا ایپیکورس ALICWRUS کا فلسفہ ہے۔

رشتہ دار ہیں لیکن وہ آپ کے ان اطوار کو پسند نہیں کرتی ہیں۔ اگر آپ مہذب اور شایستہ طور پر رہنا چاہتے ہیں تو سر آنکھوں پر، اور اگر آپ کی حرکت بدستور جاری رہی تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے، کہ آپ کو یہ گھر چھوڑنا پڑیگا۔

سرٹوبی ۔ ابے تو ہے کیا؟ تیری بساط کیا؟ تو ایک نوکر ہے اور بس۔ تو اگر پارسا زاہد اور متورع ہے تو رہا کر — تیری پارسائی کی خاطر دنیا سے کیک[41] اور شراب ناپید ہو جائیں گے۔ ×۲

میلولیو ۔ میریا، اگر تم کو مالک کا کچھ بھی لحاظ ہے تو تم کیوں اس غل غپاڑہ میں شریک رہتی ہو۔ قسم ہے اس ہاتھ کی میں جاکر مالک سے کہدوں گا۔ (چلا جاتا ہے)

میریا ۔ جا بھی، اپنے کان ہلایا کر۔

سرٹوبی ۔ اس کا کچھ تذکرہ کرو۔

میریا ۔ وہ ایک قسم کا پیوریٹن[43] PURITAN (متقشف ہے)

سرانیڈرو ۔ اگر مجھے اس کی خبر ہوتی تو کتے کی طرح اسکو پیٹتا

میریا ۔ وہ ابلیس بڑا ہی ابن الوقت ہے، وہ ایسا متکبر ہے۔ کہ سمجھتا ہے کہ وہ تمام خوبیوں کا مالک ہے اور اس کا یہ ایمان ہے کہ جو اسپر نظر ڈالے اوہ اسپر عاشق ہو جائے۔ میں بغیر انتقام لئے نہ رہونگی۔

سرٹوبی ۔ تم کیا کروگی؟

میریا ۔ کیا کروں گی! میں اس کے راستہ میں کچھ عشقیہ خطوط پھینک دوں گی۔ جن میں اس کی داڑھی کے رنگ اس کے پاؤں کی شکل، اس کی چال، اس کی آنکھوں کی جنبش، اس کی پیشانی اور اس کے چہرہ کا تذکرہ ہوگا۔ میرا حرف آپ کی بھتیجی کے حرف سے بالکل مشابہ ہے۔ یہانتک کہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

سرٹوبی ۔ خوب میں اس چال کو سمجھ رہا ہوں۔

سرانیڈرو ۔ میں بھی سمجھا۔

سرٹوبی ۔ وہ ان خطوط سے یہ اندازہ کریگا کہ میری بھتیجی اسپر عاشق ہے۔

میریا ۔ ہاں، یہی تو میرا مطلب ہے۔

سرانیڈرو ۔ تب تو وہ گدھا خوب ہی احمق بنیگا۔

میریا ۔ بلاشبہ

سرانیڈرو ۔ یہ خوب ہی ہوگا۔

میریا ۔ بڑا لطف ہوگا۔ میں تم دونوں کو ایک جگہ کھڑا کردونگی اور تم لوگ وہاں سے اس احمق کو خط پاتے ہوئے دیکھوگے۔ اب سونے کا وقت آگیا۔ میں جاتی ہوں

(چلی جاتی ہوں)

سرانیڈرو ۔ مزے کی چھوکری ہے۔

سرٹوبی ۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔

سرانیڈرو ۔ ایک دفعہ مجھ سے بھی کسی نے محبت کی ہے۔

سرٹوبی ۔ اب سونا چاہئے، ہاں مگر تم روپیہ اور منگالو۔

سرانیڈرو ۔ اگر تمہاری بھتیجی میرے ہتھے نہیں چڑھی تو میں خوب ہی احمق بنونگا۔

سرٹوبی ۔ روپیہ اور منگوالو، اگر آخر میں وہ تمہارے قبضہ میں

---

[41] کیک CAKE ۔ [42] یہ بھی اپیکیورس کے فلسفہ کی صدائے بازگشت ہے ۔ [43] پیوریٹنزم کا وہ فرقہ جو ان رسومات کو روا نہیں رکھتا۔ جن کا کوئی مذہبی جواز نہیں۔

نہ آئی تو مجھے دغاباز گرہ کٹ کے نام سے پکارنا۔

سر اینڈریو ۔ اچھا میں منگوا لیتا ہوں، مطمئن رہو

سر ٹوبی ۔ رات بہت چڑھ چکی ہے۔ اب سونے کا وقت نہیں ہے۔ اب ذرا جاکر کچھ شراب ڈھالوں گا۔

چوتھا سین ـــــ ڈیوک کے محل میں ایک کمرہ

ڈیوک، وایلا، کیوریو اور دوسرے لوگ داخل ہوتے ہیں

ڈیوک ۔ دوستو! میری روح کو پھر کسی گیت سے تسکین دو۔ سیزاریو! ذرا وہ پرانی غزل گا جو رات میں نے سنی تھی، اس سے میرے قلب کو طمانیت اور سکون حاصل ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ کی غزلوں سے کہیں زیادہ وہ غزل میری تسکین کا باعث ہوئی تھی

کیوریو ۔ حضور وہ یہاں نہیں ہے۔

ڈیوک ۔ تو بھی یہ کون شخص تھا۔

کیوریو ۔ وہ فسٹے Feste تھا جو مسخرہ ہے۔ اولیویا کے والد بزرگوار کی خاص نظرِ عنایت اس مسخرہ پر رہتی تھی۔ وہ گھر ہی کے پاس کہیں ہوگا۔

ڈیوک ۔ اس کو بلا کر لاؤ۔ اور کوئی شخص راگ اور سر کو باجہ پر ترتیب دے۔ (کیوریو چلا جاتا ہے اور راگ شروع ہوتا ہے)
لڑکے ادھر آؤ۔ اگر تم کبھی کسی کی یاد میں تڑپو تو مجھے بھی یاد کر لینا۔ جو حالت سچے عاشقوں کی ہوتی ہے وہی میری ہے۔ وہ بڑے متلون مزاج ہوتے ہیں۔ اور اپنی معشوقہ کی یاد کے سوا اور کسی بات پر ثابت قدم نہیں رہتے۔ تم اس راگ کو پسند کرتے ہو؟

وایلا ۔ یہ بالکل عشق کی صدائے بازگشت ہے۔

ڈیوک ۔ تیرا طرزِ گفتگو بہت اعلیٰ اور بلند پیمانہ پر ہے، میری جان کی قسم، اگرچہ تو نوجوان ہے۔ لیکن تو بھی کسی کا شیدا نظر آتا ہے۔

وایلا ۔ ہاں کچھ کچھ۔

ڈیوک ۔ وہ کس قسم کی عورت ہے جس پر تو وارفتہ ہے۔

وایلا ۔ آپ ہی کی شکل کی۔

ڈیوک ۔ اس کی عمر؟

وایلا ۔ آپ ہی کی عمر۔

ڈیوک ۔ تب وہ بہت بڈھی ہے۔ عورت کو چاہیئے کہ اپنے سے زیادہ سن والے مرد سے بیاہ کرے۔ تب وہ شوہر کی آنکھ میں بھلی معلوم ہوگی۔ اور اپنے شوہر کے دل پر حکمرانی کریگی، ×۱
ہم لوگوں کی محبت آناً فاناً بدل جاتی ہے۔ اسکو قرار، استقلال اور ثابت قدمی نہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کی محبت دیرپا ہوتی ہے۔

وایلا ۔ حضور، میرا خیال بھی یہی ہے۔

ڈیوک ۔ تب اپنے سے کمسن عورت کو دل دے، نہیں تو تیری محبت دیرپا نہیں ہوگی۔ عورتیں گلاب کے پھولوں کی طرح دیکھتے دیکھتے بے رونق ہو جاتی ہیں،

وایلا ۔ بالکل صحیح ہے۔

×۱ شیکسپیئر کی بیوی [illegible] بڑی تھی، ممکن ہے یہ ریمارک کسی تلخ تجربہ کا نتیجہ ہو یا محض اظہارِ حقیقت ہو۔

کیوریو اور مسخرہ داخل ہوتے ہیں

مسخرہ ۔ آپ لوگ تیار ہیں۔

ڈیوک ۔ ہاں، گاؤ۔

(گانا شروع ہوتا ہے)

آ، آ، میری موت! آ

اور سرو کی پتیوں میں مجھکو ڈالدیا جائے

سانس، رخصت، سانس، رخصت ہوجا

میں ایک حسینہ کا کشتۂ ناز ہوں

میرا سفید کفن جس میں* YEW کی پتیاں

ٹکی ہوں۔

تیار کرد

میری طرح کسی نے بھی عشق میں

جان نہیں دی ہوگی۔

ایک پھول بھی، ایک پھول بھی

میری سیاہ نعش پر نہ پھینکا جائے۔

اور نہ کوئی دوست آکر

میری نعش کو دیکھے

اور نہ کوئی آہ کرے

مجھکو ایسی جگہ دفن کرد

جہاں کوئی غمگین عاشق بھی آکر نوحہ نہ کرسکے۔

ڈیوک ۔ لو یہ تمہاری محنت کا صلہ ہے

مسخرہ ۔ نہیں حضور یہ بھی کوئی محنت تھی۔ مجھے گانے سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ڈیوک ۔ تو یہ تمہاری خوشی کا صلہ ہے۔

مسخرہ ۔ خوشی کا صلہ کبھی نہ کبھی مل ہی جائیگا۔

ڈیوک ۔ اب مجھکو جانے کی اجازت دو،

مسخرہ ۔ اب خدا آپ کو فکر و اندیشہ، حزن و غم سے بچائے۔ اور خیاط آپ کا لباس رنگ بدلنے والے تافتہ ریشم کا بنائے، اسلئے کہ آپ کے خیالات CPAL کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ خدا حافظ۔ (چلا جاتا ہے)

ڈیوک ۔ اور لوگ بھی چلے جائیں۔ (کیوریو اور حاشیہ بردار چلے جاتے ہیں)

سیزریو، ایک بار پھر اس بے رحم حسینہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ میں اس کی زمینوں کی مطلق پروا نہیں کرتا ہوں۔ ملکہ حسن کے اس انمول ہیرے کا محض اس کی خوبیوں اور قدرت کی فیاضیوں کی بناپر دلدادہ ہوں۔

وایلا ۔ لیکن اگر اس کا جواب نفی میں ہو تب ؟

ڈیوک ۔ میں سننا نہیں چاہتا۔

وایلا ۔ اگر کوئی عورت آپ کی بھی اسی قدر دلدادہ ہو جسقدر آپ اولیویا کے کشتۂ ناز ہیں۔ تو آپ کیا کرتے؟ نہیں کہتے نا؟ تب اس بیچاری عورت کا آپ کی "نہیں" سنکر کیا حال ہوتا۔

ڈیوک ۔ کسی عورت کا پہلو درد دل سے اتنا بےچین ہو نہیں سکتا جطرح میرا پہلو میرے عشق سے۔ کسی عورت کی محبت سے موازنہ کرنا

---

* یہ درخت قبرستانوں میں بہت پایا جاتا ہے۔

وایلا ۔ لیکن میں جانتا ہوں۔

ڈیوک ۔ کیا ؟

وایلا ۔ عورتیں بھی مردوں کی طرح اس درد کو محسوس کرتی ہیں۔ اور ان کے دل میں بھی قلزم عشق موجیں مارتا ہے۔ میرے والد کی ایک لڑکی تھی اور وہ ایک مرد پر جان دیتی تھی۔ ممکن ہے۔ کہ میں اگر عورت ہوتا تو میں آپ پر اسی طرح شیفتہ ہوتا۔

ڈیوک ۔ اور اس کا قصہ کیا ہے۔

وایلا ۔ آہ اس نے اپنے عشق کے راز کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ اور جس طرح گھن کا کیڑا غنچہ و گل کو کھا جاتا ہے۔ اس طرح اس کی خاموشی نے اسکو گھلا دیا وہ ہمیشہ مغموم رہتی تھی اور اندر ہی اندر گھلی جاتی تھی۔ کیا اس کو آپ عشق نہیں کہیں گے۔ مرد بستے بہت ہیں، وہ قسمیں کھاتے ہیں۔ لیکن یہ سب دکھاوا ہے۔ اسلئے کہ وہ اپنے عہد و پیمان پر قائم نہیں رہتے۔

ڈیوک ۔ تو کیا وہ بہن اس درد دل سے مرگئی ؟

وایلا ۔ میں ہی اپنے باپ کی بیٹی یا بیٹا ہوں۔ اور سب بھی میں نہیں جانتا ہوں۔

کیا میں آپ کی محبوبہ کے پاس جاؤں۔

ڈیوک ۔ ہاں، جلد جاؤ۔ یہ ہیرا میری طرف سے پیش کرو اور یہ کہو کہ وہ اپنی نہیں کو ہاں سے بدل دے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں) (باقی)

"انجام محبت"

از
جناب اوم پرکاش وڈیرہ صاحب

سال کی آخری رات کو ایک بڈھا اپنی جھونپڑی میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے رات کے دس بج چکے ہونگے۔ رات اور پھر برسات کی رات حد سے زیادہ خوفناک اور ڈراؤنی ہے۔ ہر چہار جانب خاموشی پھیلی ہوئی ہے۔ عالم کا ہر فرد و بشر غفلت کی نیند میں مدہوش ہے۔ تاریکی کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے دل کانپتا اور دم گھبراتا ہے۔ آندھی بڑے زور و شور سے چل رہی ہے۔ اس بڈھے کے ہونٹوں پر خوشی و مسرت کی لہر کے بجائے غم و حسرت کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ نہایت غمگین بیٹھا ہوا آسمان کی جانب دیکھ رہا ہے۔ مگر اس کا غم نہ صرف اندھیرے گھر پر ہے۔ نہ اکیلے پن پر بلکہ وہ اپنے پچھلے واقعات کو یاد کرتا ہے۔ اور جسطرح آفتاب کی روشنی صبح کے وقت بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح اس بڈھے کا غم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ گنگا میں موجیں بڑے زور و شور سے اٹھتی ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ آندھی اس بڈھے کے دل میں اٹھ رہی ہے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی مگر رات ابھی ویسی ہی ڈراؤنی تھی۔ تب اسنے اپنے ہاتھوں میں ستار لیا اور گانا شروع کر دیا۔

دو دن کی ہے باد بہار دنیا! اے نادان سمجھ جا
مت کر اس گل سے پیار دو دن کی ہے باد بہار
رہی نہ بچپن کی عمر پیاری مفضول گذری جوانی ساری
بڑھاپے نے آکر ہت جو ماری تو یہ سب گل ہیں خار
دو دن کی ہے باد بہار دنیا! اے نادان سمجھ جا

گانا ختم ہو چکا تھا۔ وہ بڈھا گنگا کی طرف جا رہا تھا شاید وہ دنیا کی مصیبتوں کے ہجوم سے اس دنیا سے منہ موڑنا چاہتا ہے۔

اُس کے گانے میں کتنی دل خراش آواز تھی۔ شاید اس غریب کی زندگی کا راز اسی میں پوشیدہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرا دل گاتا سنکر کانپ اٹھا۔ جس طرح پپیہرہ کی آواز سننے میں میٹھی اور سریلی ہوتی ہے۔ مگر وہ کبھی کبھی عورتوں کے دل ہلا دیتی ہے۔ اسی طرح اس گانے سے میرے دل میں ہل چل مچ گئی پہلے تو خوفناک رات سے ڈرا مگر پھر ہمت کرکے آگے بڑھا۔ وہ بڈھا گنگا کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ میں جلدی جلدی اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اور کچھ دیر بعد اس کے

…کل نزدیک پہنچ گیا۔

میں نے اسکو ٹوکنا اچھا نہ سمجھا اور اس کی حرکت …یکھنے لگا۔ اس بڈھے نے پہلے اپنی جھونپڑی کی طرف …یکھا۔ پھر دنیا کی طرف جس طرح آسمان کے جھلملاتے ہوئے …ارے اس دنیاوی بہار کو واپسیں نگاہ سے دیکھتے ہیں …پھر گنگا میں قدم رکھا۔ میں اب اپنے آپ کو روک نہ سکا …ر اس بڈھے کا بازو پکڑ لیا۔ اس بڈھے کے رونگٹے کھڑے …ہو گئے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر وہ اتنا خوفزدہ …ہو چکا تھا کہ اس کے منہ کی آواز منہ میں ہی رہ گئی۔ کچھ دیر …بعد وہ بولا۔ بیٹا! مجھ کو اب تم مت روکو۔ میں اس دنیا کی …مصیبتوں سے گھبرا چکا ہوں۔ اس ناپائدار دنیا سے کوچ …کرنا چاہتا ہوں۔ اس دنیا میں صرف مکر و فریب ہی باقی رہ …گیا ہے۔

میں نے کہا۔ بابا صبر و استقلال سے کام لو۔ خدا …پر بھروسہ کرو وہ تمام مشکلات کو حل کر دیگا۔ اب وہ بڈھا چپ …نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھیں آگ کے انگارے کی طرح جل …رہی تھیں۔ وہ اس وقت حد سے زیادہ خوفناک معلوم ہو …رہا تھا۔ اس نے کڑک کر کہا۔ صبر اور استقلال سے کام لوں …برس سال صبر اور استقلال سے کام لیتا رہا۔ اور اب نہیں …جانتا ہوں کہ صبر اور استقلال کس کو کہتے ہیں۔ خدا پر بھروسہ …کروں۔ کس لئے؟ خدا کبھی اپنے بندے کے لبوں پر …خوشی و مسرت کی جھلک نہیں دیکھ سکتا اور وہ خدا جس نے …میرا جھولتا ہوا آشیانہ کسی صیاد کے ہاتھ میں بخش دیا ہو۔ …میں اس پر بھروسہ کر سکتا ہوں مگر خدا پر نہیں۔ کچھ دیر دونوں …کے لبوں پر سکوت کی مہر لگی رہی پھر میں نے خاموشی کو دور کرتے ہوئے کہا بابا۔ خدا اپنے بندوں کو مصیبت میں ڈال کر امتحان لیتا ہے۔ جسطرح سونے کو آگ میں ڈال کر پرکھا جاتا ہے۔ تم نے نوح علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت محمد صاحبؐ۔ حضرت ایوب علیہ السلام اور سری رام چندر جی کے بارے میں سنا ہو گا۔

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست کیوں بنایا۔ اس لئے کہ جب نمرود نے ان کو آگ میں ڈال دیا تھا تو انہوں نے اس بڑی مصیبت کا حوصلہ اور مضبوط دل سے مقابلہ کیا۔ اسی وجہ سے وہ خدا کے دوست بن گئے۔ انکی عزت اور شرافت میں قدرت نے چار چاند لگا دئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام پر بیماری کی مصیبت نازل کی۔ ان کا سارا جسم پھوٹ گیا۔ اور اس میں کیڑے پڑ گئے تھے مگر وہ کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ بلکہ صبر و استقلال سے کام لیا۔ چنانچہ ان کو صابر کا لقب ملا۔

سری رام چندر جی پر بھی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ شام کے وقت سارے شہر میں منادی کرا دی گئی کہ صبح سویرے سے سری رام چندر جی تخت نشین ہونگے۔ لیکن صبح کے نمودار ہونے سے پہلے خلاف توقع ان کو چودہ برس کا بن باس ہوا۔ مگر اس مصیبت کا انہوں نے ٹھنڈے دل سے خیر مقدم کیا۔ اور چودہ برس تک جنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ جیسکے صلہ میں قدرت نے ان کا نام ابد الآباد تک زندہ کر دیا۔

اس بڈھے نے کان دھر کر میری باتوں کو سنا مگر ٹس سے مس نہ ہوا اور پاگلوں کی طرح ہنستے ہنستے کہنے لگا بیٹا میں بھی پہلے لوگوں کو اسی طرح کی نصیحتیں کیا کرتا تھا مگر جب سے میری خوشی و مسرت کا آشیانہ میرے ہاتھ سے

...نہ کے واسطے نکل گیا۔ تب سے میں نصیحتیں کرنا ہی بھول
...ہوں۔

کچھ دیر ہم دونوں چپ چاپ کھڑے گنگا کی
...ہوں کو دیکھتے رہے پھر میں نے سوال کیا بابا میں ایک بات
...ہوں۔ اس بڈھے نے کہا شوق سے پوچھ سکتے ہو۔
میں نے کہا۔ بابا تم اس دنیا سے کوچ کرنا کیوں
...ہتے ہو۔
اس نے کہا۔ بیٹا تم میری داستان سنکر کیا کرو گے
...نہیں چاہتا کہ میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کسی کے
...میں زہر کا کام کریں اور جس طرح یہ ابتدا سے میرے
...میں پوشیدہ رہی ہے۔ اسی طرح اسکو ہمیشہ کے لئے
...ہنے دو۔
میں نے کہا۔ نہیں بابا میں آپ کی داستان ضرور
...دوں گا شاید میں اس سے کچھ نصیحت حاصل کر سکوں۔
وہ بڈھا بولا۔ بیٹا تم نے شباب کے پہلے زینہ
...پر رکھا ہے۔ یہ نہ ہو کہ تم بھی دام محبت میں پھنس جاؤ۔
...ہکر اسنے اپنی کہانی شروع کی۔
بیس سال پہلے میں نفس کے بہکانے پر ایک
...پیالہ پی چکا ہوں جو میرے دوست کے واسطے تو امرت
...گر میرے واسطے زہر تیزاب۔
میں نے کہا زہر تیزاب۔
اس نے کہا۔ ہاں ایک عورت کی خوبصورتی
...کے واسطے زہر تیزاب ہی ہوا کرتی ہے۔ جو پہلی دفعہ
...ری آنکھوں کے سامنے آئی وہ تھی میرے دوست کی بہن۔

میرا دوست ہم پر بھروسہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے میں اس
کے یہاں ہر روز جایا کرتا تھا۔ میرے دوست کا نام تھا شوشیل
ایک دن کا واقعہ یہ ہے کہ میں شوشیل کے یہاں گیا مگر وہ
وہاں موجود نہ تھا۔ بلکہ اس کی ہمشیر کرسی پر بیٹھی ہوئی کوئی
ناول پڑھ رہی تھی۔ مجھکو دیکھ کر مسکرانے لگی۔
میں اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اسپر فریفتہ ہو گیا۔
وہ بھی مجھسے محبت کرتی تھی۔ آخر کار نامہ و پیام کی باری
بھی آئی۔
ایک دن شوشیل نے مجھکو اپنے گھر پر کھانے
کی دعوت پر بلایا میں وہاں گیا مگر شوشیل وہاں پر نہ تھا۔
اندھا کیا چاہتا دو آنکھیں۔ ہم دونوں میں بہت دیر تک
آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔ جاتے وقت میں نے پوچھا تمہارا نام
کیا ہے۔
اس نے معشوقانہ انداز سے کہا سروج۔
سروج کا رنگ گورا تھا۔ مگر نہ ایسا جیسا چاندی
کا پھول ہوتا ہے۔ بلکہ ایک قسم کی نرمی اور ملاحت لئے ہوئے۔
قد لمبا، بدن گول، اعضا متناسب اور سڈول، ماتھا چوڑا
اور اُس پر نرم و نازک سیاہ گھونگھر والے بال پڑے ہوئے
آسمان میں چار چاند لگا رہے تھے۔ آنکھیں آہو نما اور منظر
متین اور سنجیدہ، بھویں گھنی اور لمبی تھیں۔ ناک اونچی
اور ہونٹھ پتلے نرم و سرخ، گردن لمبی، مگر نہ ایسی کہ بدنما
معلوم ہو۔ ہاتھوں کا رنگ بہ نسبت چہرے کے زیادہ کھلتا
ہوا تھا۔ میں اس کی خوبصورتی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔
ایک دن ہم دونوں گنگا کے کنارے ملے۔
وہ رات کبھی کبھی میرے دل میں اب بھی چٹکیاں لیا کرتی ہے۔

رات کے تو یا دس بجے ہونگے۔ چاندی کا فرش چاروں طرف بچھا ہوا تھا۔ ماہتاب کی پہلی کرنیں قدان گلشن کے دامنوں سے چھن چھن کر رنگین پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑتی تھیں اور ایک نئی بہار پیدا کر دیتی تھیں۔ اس چاندنی رات میں سروج بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ ماہتاب کا عکس جب گنگا پر پڑتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے چاندی کا دریا موجیں مارتا ہوا ہم لوگوں کی طرف آرہا ہے۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک سروج کانپ گئی اس نے ڈرتے ڈرتے کہا میرے والد نے میری شادی ٹھیک کر دی ہے۔

یہ سنتے ہی میرے ہاتھ پاؤں سن ہوگئے عقل کے طوطے اڑ گئے۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، میں کچھ کہنا چاہتا۔ مگر منہ سے آواز نہیں نکلتی۔ کچھ دیر ہم دونوں پر خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔ سروج چلو ہم دونوں اس شہر سے دور چلیں۔ جہاں ماں۔ باپ، بھائی۔ بہن کسی کا بھی رشتہ نہ ہو۔ جہاں پریم کی ایک دنیا آباد ہو۔ جہاں صرف ہم اور تم ہوں۔

سروج نے کہا۔ نہیں نہیں میں نہ جاؤں گی۔

یہ سنکر مجھ کو غصہ آگیا۔ نفس میری رگ رگ میں سما گیا۔ اور بہکی بہکی دلیلوں سے میرے ضمیر کو دبا دیا میں نے کہا۔ سروج حد سے زیادہ خوبصورت ہونا بھی اچھا نہیں ہے۔ ماہتاب کو تم نے دیکھا ہوگا۔ وہ کتنا حسین و جمیل ہے مگر پھر بھی۔ اس میں ایک کالا داغ ہے۔ یہ کہکر میں نے ایک پتھر اٹھا کر اسکے سر پر دے مارا۔ کچھ دیر بعد میں نے سروج کو مثل ماہی بے آب تڑپتے دیکھا یہ مجھسے نہ دیکھا گیا۔ اور میں نے جلدی سے اپنی قمیض پھاڑ کر اسکے سر پر باندھ دی۔ سروج کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو کے تار بندھ گئے ایسا معلوم ہوا جیسے صدف کا منہ کھل گیا۔ اور اسمیں سے گوہر نایاب گرنے لگے

سروج اب کچھ ڈری اسنے کہا چلو جہاں تمہاری خواہش ہے

ہم دونوں گنگا کے کنارے کنارے دور نکل گئے۔ یہ کہکر وہ چپ ہوگیا۔ میں نے کہا۔ رک کیوں گئے بابا۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ میں نے۔ والدہ جس نے نو مہینے مجھکو اپنی شکم میں رکھا۔ اور جب پیدا ہوا تو خود نہ کھاتی بلکہ مجھکو کھلاتی۔ والد، بھائی، بہن، سماج، سب کو چھوڑا مگر اس ہندو سماج کی زنجیر کو توڑ نہ سکا۔ صبح کو منادی کرا دی گئی کہ سروج کسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔ جو اس کو گھر واپس لائیگا۔ اسکو ۔۔۔۵ روپیہ بطور انعام ملیں گے۔

تو بجتے بجتے ہم دونوں پکڑ لئے گئے اور مجھپر مقدمہ بھی چلایا گیا اس نے عدالت میں کہا کہ میں خود اسکے ساتھ گئی تھی مگر روپیہ کیا نہیں کر سکتا ہے مجھکو چھ مہینے کی سخت قید کی سزا ہوئی اور میں جیل ہی میں تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کر دی گئی۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسنے ہمیشہ کے واسطے اسکو اپنے دربار میں بلا لیا۔

ہم دونوں جھونپڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شمع جل رہی تھی یکایک وہ بجھ گئی۔ اس بڈھے نے ایک سرد آہ بھری اور اس کے ساتھ ہی اسکے دل کی حرکت دفعتہً رک گئی اور اسکی روح بھی پرواز کر گئی۔

مجھ کو اس بڈھے کا بے حس و حرکت لاشہ یہ کہتا سنائی دے رہا تھا کہ بیٹا ہم دونوں کو اب کوئی بھی جدا نہیں کر سکتا ہے یہاں پر نہ تو ہندو سماج ہے نہ اس کی زنجیریں۔ یہاں پر سب آزاد پرندوں کی طرح چہچہاتے پھرتے ہیں۔ یہ سنکر میری آنکھوں سے بھی دو چار بوند گر گئے۔

یہ زندگی بھی ہے اور افسانہ بھی

تصویر زندگی

مرہٹی ادب کا ایک لطیف شاہکار

از
جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب ایم۔ اے۔

(۲)

"آج کا کام کل پر نہیں ڈالنا چاہیئے۔ سمجھی؟ اور اس پر بھی ہم لوگ کسی نفرت انگیز جگہ تو جا نہیں رہے ہیں۔ اچھے تاج محل کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ آج تم مجھے یہاں دیکھ رہی ہو۔۔"

دلیپ کوئی بری بات بولیگا اسی خیال سے سرکھیا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس بہت ہو چکی آپ کی فلاسفی"

جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ وہی آدمی ان کی یہ گفتگو سنکر گویا ہنس رہا ہے۔ جس طرح ایک بھیانک خواب کا اثر بہت دیر تک دماغ پر منڈلاتا رہتا ہے۔ اسی طرح اس آدمی کی شکل وشباہت اس کے دماغ پر چھائی رہی۔ تاج محل دور سے نظر آتے ہی اس کا دل آنند کی چاندنی سے بھر گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس فرادنے آدمی کی یاد بھی بھول گئی۔

تاج محل دیکھتے دیکھتے کتنا وقت گذر گیا۔ اس کا اسے احساس تک نہ ہوا۔

کسی طرح بھی اُسے تسلی نہ مل سکی۔ دن ہی میں یہ تاج محل کتنا بھلا لگتا تھا۔ اور رات کو پرشباب چاندنی میں تو وہ ایک کھلتے ہوئے حسین پھول کی طرح معلوم ہوتا تھا حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کیلئے دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے وہ بچوں کے مانند دلیپ سے کہنے لگی۔

"کتنا حسین ہے یہ تاج!"

"ایک بات کی کمی ہے اس میں"

سرکھیا نے بھویں اٹھا کر سوال کیا۔

"غریبوں کو کم از کم ایک ایک دن تو رہنے کیلئے ملنی چاہیئے۔ یہ عمارت"

سرکھیا ناک سکوڑتے ہوئے بولی "دہلی یا آگرہ میں کیا کوئی سرائے یا دھرم شالہ نہیں؟"

"سرکھیا! یہ تاج کس نے بنایا؟"

"شاہجہاں نے"

"نہیں بلکہ اس کی غریب رعایا نے۔ اس عمارت میں لگی ہوئی دولت۔۔۔۔۔"

"مگر یہ حسین تخیل تو شاہجہاں ہی کا تھا۔"

"شاہجہاں کا تخیل! شاہجہاں کیا تمہاری طرح مصور تھا یا آرٹسٹ؟ دنیا میں نام شاہجہاں کا لیا جاتا ہے۔ مگر اس تاج کو جس نے بنایا وہ غریب........"

"شاہجہاں ممتاز سے پریم کرتا تھا تبھی تو یہ عمارت...."

"مگر اس میں دولت تو رعایا ہی کی خرچ ہوئی ہے۔"

"دلیپ"

"سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ سچائی ہی حسن ہے۔ کیٹس (Keats) نے یہی کہا تھا نا؟"

سریکھا جواب دینے والی تھی مگر کسی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گئی۔ کل والا آدمی اس کو پھر دکھائی دیا۔ فوراً ہی وہ تمام باتیں تاڑ گئی۔ وہ شخص محکمہ سی، آئی، ڈی سے تعلق رکھتا تھا۔ دلیپ دہلی سے بھاگ نکلا ہے۔ یہی سوچ کر وہ اسکا تعاقب کر رہا تھا۔ اپنی تقریر سے امن میں دخل انداز ہونے کا الزام اسپر عائد تھا۔

پولیس کے ہاتھوں میں جاتے ہوئے دلیپ سریکھا سے بولا۔

"ریکھا۔ سچائی بھیانک ہوتی ہے نا؟ کیوں؟"

سریکھا گھبرائی ہوئی نظروں سے تاج محل اور دلیپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حسن، صداقت، ہنر، اور زندگی کی مخالف طاقتیں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

آل انڈیا پکچر کانفرنس کا انعام

"پریم کی تصویر"

شہرہ آفاق مصور، سریکھا کے نام "پریم" پر روشنی ڈالنے والا تاج محل۔"

اخبار میں بڑی بڑی سرخیوں میں یہ خبر پڑھتے ہو[ئے] دلیپ کا خیال جیل کی کال کوٹھری سے کورٹ کے ہال میں جا[پہنچا]۔ میرا مقدمہ سننے کے لئے سریکھا آئی تھی۔ اور میں نے اپنی تقریر کی حمایت کرتے ہوئے دانستہ طور پر تاج محل کا حوالہ دیا تھا۔ "[تاج محل] بنانے کے لئے ہر شخص شاہجہاں کی تعریف کے پل باندھ دیتا [ہے] مگر اسے بناتے وقت کتنے مزدوروں نے اپنا خون پانی کر دیا [تھا] اس کا کوئی خیال نہیں کرتا" اس کے بعد جج نے بڑے چبھتے ہو[ئے] لہجہ میں پوچھا تھا۔ "یعنی آپ فن کی اصلیت کے خلاف ہیں"

"مجھے صرف فن ہی نہیں چاہیئے۔ زندگی کے مطابق [فن] چاہیئے"

"یعنی؟"

"یہ کہنے لگوں گا تو جس تقریر کی بنا پر مجھ پر مقدمہ ہوا ہے۔ اسی قسم کی دوسری تقریر دوبارہ مجھے یہاں کرنی پڑ[ے گی]"

سزا سننے کے بعد سریکھا سے جدا ہوتے وقت میں نے کہا تھا۔

"ریکھا۔ آج سے ہم دونوں کے راستے مختلف ہو[ں گے]"

دبی آواز میں اس نے پوچھا تھا۔ "وہ کیسے؟"

"میرا راستہ جیل کا اور تمہارا تاج کا"

"مگر آگے چل کر یہ دونوں راستے مل بھی تو جائیں گے"

"جیل اور تاج ایک ہونگے؟"

"کیوں نہیں؟" اس کے اس جواب پر میں ہنس پڑا تھا

اس اخبار کے جلی حروف نے دلیپ کے دل پر گہرا [اثر] کیا تھا۔ سریکھا اپنے فن کا استعمال صرف حسن کے دائرہ ہی میں [کرے گی] اور میں انسانی زندگی کو حسین بنانے کے لئے زندہ رہونگا۔ دوا...

ی نظروں میں قطبین کا سا فرق تھا۔ اپنی شادی کا سلسلہ منقطع ہوئے بغیر دونوں کو آرام نہ مل سکے گا۔

اسی خیال پر مستحکم ہو کر دلیپ اپنی نگاہوں سے باہر دیکھنے لگا۔ اسی وقت آفس سے اسے بلا لیا گیا۔ کیونکہ کوئی شخص اس سے ملنے آیا تھا۔ "کون آیا ہوگا۔ مجھ سے ملنے؟" وہ سوچنے لگا۔ "سریکھا تو نہیں؟ نہیں۔ کیونکہ تاج کی تصویر اسی طرح بنا کر وہ مجھ سے ملنے کی ہمت نہ کر سکے گی۔ مگر شادی ہونے کا امکان نہیں شاید یہی بات وہ کہنے آئی ہو۔" یہ خیال آتے ہی دلیپ بہت تشویش میں پڑ گیا۔ "ابھی ابھی تو میں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا" یہ یاد کر کے وہ اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔

اس کے آفس میں قدم رکھتے ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی سریکھا کھڑی ہو گئی۔

"جس طرح کلاس میں ماسٹر کے آنے پر لڑکے کھڑے ہو جاتے ہیں اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی ہوں" سریکھا مسکرا دی

"انعام حاصل کرنے پر مبارکباد"

وہ کچھ بھی نہیں بولتی یہ دیکھ کر دلیپ کہنے لگا۔

"اب تمہاری شادی بھی کسی آرٹسٹ کے ساتھ ہی ہونی چاہیے"

سریکھا نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "فیصلہ تو ہو ہی چکا ہے۔ یہی کہنے تو آئی ہوں"

"کیسی تصویریں بناتا ہے۔ وہ؟"

"پریم کی"

"پھر تو اسے بھی کوئی انعام ضرور ہی ملا ہوگا"

"ہاں میرے پہلے ہی اسے مل چکا ہے"

"اچھا۔ ان کا خوش قسمت نام؟"

ہنسی روکتے ہوئے سریکھا بولی "نام کے متعلق کچھ جھگڑا سا ہو گیا ہے

"یعنی ہم ..."

"وہ تمہارا ہم نام ہے"

سریکھا کی ساری باتیں اب دلیپ کی سمجھ میں صاف صاف آ گئیں۔

"مگر تاج پر مجھے کتنا غصہ ہے۔ یہ تم جانتی ہو نا؟"

سریکھا نے اپنے ساتھ لائی ہوئی تصویر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس تصویر میں جمنا کے پانی پر تاج کا عکس اصلی تاج محل سے بھی زیادہ حسین نظر آ رہا تھا۔ گویا جمنا زندگی کا دھارا ہے۔ زندگی کے مصیبت زدہ دھارے میں ڈھارس دینے والے پریم کا عکس - تاج کی شکل میں پڑ رہا ہے تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"تصویر زندگی"

"کچھ یوں ہی سا نام رکھ دیا ہے تم نے"

"کیا تم یہ مانتے نہیں کہ تاج ایک غیر فانی پریم کا مظہر ہے اور اس کا عکس ایک غیر فانی حسن ہے۔ جمنا کے کنارے کے تاج محل سے زندگی کے اس تاج کی یہ تصویر کتنی حسین معلوم ہو رہی ہے۔

دلیپ نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا اس کی پر خار زندگی کو پریم بھرے تبسم سے کھلکھلانے کے لئے ایک مجسم تصویر اس کے سامنے سریکھا کی شکل میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔

اقتباسات

دُنیائے اُردُو جنگِ عظیم کے بعد

از

جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم، اے، ڈی، لٹ

(۳)

تاریخ

اس دور کے ادب کے متعلق ایک اور قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ "اس زمانے میں تاریخ سے بالخصوص ہندوستان کی تاریخ سے بے اعتنائی برتی گئی"۔ شیخ محمد اکرام صاحب کی یہ رائے "اتحاد اسلام دور" کے بارے میں ہے جس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ اس عام بے اعتنائی کا سبب یہ تھا کہ مولانا شبلی اور ان کے رفقاء نے جو عام جذبا فضا بیرونِ ہند کے اسلامی ممالک کے بارے میں پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی تاریخ سے عام دلچسپی نہ رہی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں اسوقت ہندوستان سے باہر لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے ہند کی تاریخ پر توجہ نہ کی"[1]

"موج کوثر" کے لائق مصنف کی رائے کسی قدر احتیاط کے ساتھ قبول کرنے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ "اتحاد اسلا لیڈروں نے بیرون ہند کے واقعات سے متاثر ہو کر جو احساسات پختہ کئے۔ اس کا علی گڈھ اور ارباب علی گڈھ پر ہرگز کوئی نہیں ہوا۔ اسوقت وطنی سیاسیات یا وطنیت سے دلچسپی ارباب علی گڈھ کے لئے ایک شجر ممنوعہ تھی۔ اس لئے یہ با کرنا کہ ارباب علی گڈھ کے جوش عمل کو اتحاد اسلام تحریک نے ٹھنڈا کر دیا۔ غلط ہے ؏

گرمیں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

اگر ز روئے ورع زاہدان قدح ندہند

چہ مانع است حریفانِ بادہ پیما را (نظیری)

---

[1] موج کوثر۔ ص ۱۷۴-۱۷۵۔

حقیقی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربیت کی تحریک نے مسلمان نوجوانوں کو ان کو شاندار ماضی سے بالکل غافل کر دیا تھا۔ انکی
ں میں نپولین اور ہنی بال، فریڈرک اور پیٹر دی گریٹ، گبن اور برکلے، ڈارون اور شکسپیر سما گئے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں اپنے
، ناموروں اور بزرگوں کے کارناموں میں کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس کی جانب مولانا شبلی نے اپنی نظموں میں
رہ بھی کیا ہے

از ہنی بال واز آئین جہانبانے او واقف و بے خبر از سنتِ نعمان باشی

عام ذہنی غلامی نے قوم کو اپنی روایات سے غافل کر دیا جس سے نہ صرف تاریخ بلکہ تمام علومِ قدیمہ سے بے التفاتی
ہو گئی۔ سر سید مرحوم کی بات اور تھی۔ انہوں نے ہندوستان کیا اسلام کے عام معاملات کی طرف جو توجہ کی۔ اس سے ثابت
ہے کہ انہیں اپنے ہی لگائے ہوئے پودے کے اس تلخ برگ و بار کا علم نہ تھا چنانچہ اکبر الہ آبادی نے فرمایا ؏

نہ تھا یہ مطلب سید کہ اس رخ پر چلے دھارا

ں نے تاریخ ہند کی جو شاندار خدمات انجام دیں۔ ان کے پیرووں نے اس سلسلے کو قائم نہ رکھا۔ بلکہ یہ واقعہ نہایت افسوس کے
دیکھے جانے کے لائق ہے کہ علی گڈھ سے سوائے "سلسلۂ خسرویہ" کے آج تک کوئی علمی کارنامہ ظہور میں نہ آیا۔

ہندوستانی تاریخ کے متعلق ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کئے شبلی اور ان کے رفقا اس کے بے حد ممنون اور معترف
رتھے۔ لیکن بدقسمتی سے۔ ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ہندوستان تو درکنار اسلام کی صداقت اور تاریخ
م کے شاندار ماضی کے متعلق لاعلمی اور جہالت بلکہ تنقیص کے خیالات موجود تھے۔ پس مورخین اسلام کا پہلا فرض یہی تھا کہ
م کی پرانی اور قدیم ادوار کی تاریخ کو اردو میں منتقل کریں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ دور مغربیت کے خلاف ردِ عمل کا دور تھا
سلئے عام مفکرین کا نعرۂ جنگ "BACH TO ARALRIA" "BACH TO MECCA" "باز گو از نجد و از یاران نجد" تھا۔

اسی جذبہ کے ماتحت شبلی نے سیرۃ النبی لکھی اور اسلام کے دوسرے ناموروں کے حالات قلمبند کئے۔ دار المصنفین کا
مدخو دناظم دار المصنفین کی زبان میں یہ تھا۔" ہمارا مقصد صرف زبان اردو کے سرمایہ کی ترقی نہیں ہے۔ بلکہ ملک میں ایک ایسی
ت پیدا کرنا ہے جو قوم کی دماغی قوتوں نشوونما کا سامان کر سکے[1]۔" انہوں نے قوم کی دماغی قوتوں کی نشوونما کے لیئے اور اسلامی
ن تیار کرنے کے لئے اسلام سے ابتدائی اور قرون اولی کی اسلامی تاریخ کو اپنے سامنے رکھا جس کے بغیر صحابہ تابعین اور متقدمین
رذہن نئی نسلوں میں منعکس نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسی غرض سے صحابہ، تابعین، انصار، صحابیات، مہاجرین کی زندگیاں حضرت عمر
بدالعزیز کے حالات اور اسی نوع کی چند اور کتابیں رفقائے شبلی کے قلم سے اردو زبان[2] میں نکلیں۔ جامعہ ملیہ سے نکلی ہوئی کتاب
یخ الامہ کو بھی اسی صف میں شمار کرنا چاہیئے۔

[1] معارف ستمبر ۱۹۱۶ء مضمون (خواب تمنا یا دار المصنفین)۔ [2] مولانا شرر کی کتاب تاریخ اسلام

تحریک خلافت میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد نے اس بات کی ضرورت پیدا کی کہ ان دو اقوام کے قدیم تاریخی تعلقات پر نظر ڈالی جائے۔ اسی ضرورت کا نتیجہ مولانا سلیمان کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" ہے۔

شیخ اکرام صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ "جس دور کا ذکر کر رہے ہیں اس میں شایع شدہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے تاریخی مباحث پر نسبتاً بہت کم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور ہندوستان کے متعلق جو اس زمانے کی تاریخی کتابیں ہیں۔ ان کی تعداد تو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔" (موج کوثر ص ۱۷۷) یہ ایک المناک واقعہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر الہ آباد سے بہت سی کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن زبان اردو ابھی تک ہندوستان کی مستند تاریخوں سے محروم ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی[۱] اور مولوی غلام طیب[۲] وغیرہ نے درسی مقاصد کے لئے کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ان میں وہ محققانہ شان نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے تاریخی ترجمے گو لائق تحسین ہیں۔ لیکن ترجمے آخر ترجمے ہیں۔

صوبائی تاریخیں تحریک ترک موالات کے زوال کے بعد ہندوستان میں پہلے فرقہ بندی اور پھر صوبہ پرستی کا جذبہ فروغ پذیر ہوا۔ مہاراشٹر اور جنوبی ہندوستان میں سیوا جی کو ہیرو بنانے کی تحریک تلک نے پیدا کی تھی چنانچہ انگریزی اور مرہٹی میں بہت سی کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔ مسلمانوں میں اس کا رد عمل ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ زیر بحث دور میں دکن کے بعض ناموروں کے متعلق عمدہ کتابیں لکھنے میں آئیں مثلاً "سلطان شہید" از محمود بنگلوری۔ "چاند بی بی" از احمد قادری "ملک عنبر" از شیخ چاند، "تاریخ سلطنت خداداد" از محمود بنگلوری، "ملیبار" از شمس اللہ قادری، اسلام شمال میں بھی بعض معمولی رسالے شائع ہوئے ہیں۔ جن کو نظر انداز کر دینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ (علی الخصوص تاریخ اسلام) کے بارے میں اگرچہ ذوق کی کمی افسوسناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ تاہم ادھر اُدھر انگریزی زبان میں ہندوستان اور اسلام کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ جن میں تاریخ کے سائنٹیفک اصولوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ پنجاب میں اورنٹیل کالج لاہور کے بزرگوں کی وجہ سے تحقیق علمی اور تاریخ کا نمایاں ذوق پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے توقع رکھی جا سکتی ہے۔ کہ کسی نہ کسی دن اردو زبان کو تحقیق و تدقیق کے نئے طریقوں سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ کسی اچھی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے جو ابتدائی مواد یا ذخیرۂ کتب درکار ہوتا ہے۔ وہ بہت محنت سے مہیا کیا جا رہا ہے۔

سیرۃ فن سیرۃ (بیاگرافی) میں بھی عمدہ تصانیف کی بہت کمی ہے۔ اس دور کی ایک خصوصیت "غالب پسندی" ہے۔ جو بقول شیخ اکرام اس دور کے "جذباتی نقطۂ نظر[۳] کا نتیجہ ہے۔ مرزا غالب کے متعلق اتحاد اسلام دور میں جو والہانہ عقیدت پیدا ہوئی اس کا اثر تحریک ترک موالات کے بعد تک رہا۔ اور اگرچہ اب اس محبت کے خلاف کسی قدر رد عمل محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن مرزا غالب ابھی تک دل و دماغ پر غالب ہیں۔ اس غالب پسندی کے زیر اثر مرزا کی کچھ سوانح عمر

---

[۱] تاریخ ہند، [۲] دیس کہانی، [۳] موج کوثر ص ۱۷۲،

ں، کچھ عمدہ ایڈیشن، (مثل مرقع چغتائی مصور ایڈیشن) شائع ہوئے۔ ڈاکٹر لطیف (حیدرآباد) نے انگریزی میں ایک
ں کتاب لکھی۔ جس کا مقصد غالب کی عظمت کو گرانا تھا۔ محاسن کلام غالب (بجنوری) اور "غالب" (لطیف) کے درمیان
اور معتدل راستے کی ضرورت سے متاثر ہوکر شیخ اکرام صاحب نے "غالب نامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں
نگاری کے اعلیٰ اصول و قواعد پر عمل کرتے ہوئے مرزا غالب کی زندگی پر ارتقائی اور نفسیاتی نظر ڈالی گئی ہے۔ غالب کی
ری میں شاید یہ پہلی کتاب ہے جس میں مرزا کو ان کے حقیقی خط و خال اور ان کی ہو بہو بشریت کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے
ے قریب قریب دور میں مولانا غلام رسول صاحب مہر نے مرزا کی اپنی تحریرات سے ایک لایف تیار کی جس کا نام "غالب" رکھا
نش بھی اپنے رنگ میں ایک کامیاب اور قابل قدر کوشش ہے، مالک رام کی "ذکر غالب" بھی اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن نظر
کرنے کے قابل ہنیں۔

مشرق اور مغرب میں عمر خیام کے سلسلے میں جو دلچسپی لی جا رہی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں
ی شاعری کا ذوق اب روز بروز انحطاط پذیر ہے۔ تاہم ابھی تک علمائے یورپ کی مہربانی سے کلیتہً مفقود نہیں ہوا۔
جیرلڈ کے ترجمۂ رباعیات کے بعد عمر خیام انگریزی ادب کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ جس سے اہل مغرب کافی محظوظ ہوتے ہیں
شتہ بیس پچیس سال میں انگریزی زبان میں اس حکیم نیشاپور کے متعلق اچھا خاصہ کام ہو چکا ہے۔ چنانچہ رباعیات کے بہت
ے عمدہ اڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔ اور پرانے سے پرانے قدیم نسخوں کی تلاش اب بھی ہو رہی ہے۔

افسوس ہے کہ اردو زبان اس دانائے راز کے حالات و کوائف سے بالکل محروم تھی۔ بالآخر اسی دور میں مولانا
ر سلیمان صاحب ندوی نے ایک مفصل اور مبسوط کتاب خیام کے متعلق شائع کی جس میں نہ صرف اس شاعر کے حالات زندگی
ں۔ بلکہ خیامیات کے ہر پہلو پر بحث موجود ہے۔ بعض اہل الرائے کا خیال ہے۔ کہ یہ سید صاحب کی بہترین تصنیف ہے۔ اور
اہر اس رائے سے اختلاف کرنے کی وجہ ہنیں معلوم ہوتی۔

تلخیصات

سنگاپور اور اسکی اہمیت

از

جناب مظفر گیلانی ام، اے

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس (LORDRABERT) نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ دنیا کی سب سے آخری اور فیصلہ کن جنگ سنگاپور ہی میں لڑی جائے گی۔ اور اب موجودہ فضا میں کون کہہ سکتا ہے کہ لارڈ رابرٹس کا خیال غلط تھا۔ انگریزوں کو سنگاپور کی اہمیت آج سے قریب بیس برس قبل ہی معلوم ہو چکی تھی۔ اور اب یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے اس کو جبرالٹر سے زیادہ مستحکم اور بہتر بحری قلعہ بنا دیا ہے جہاں ہر وقت بحری بری اور ہوائی طاقتوں کا ایک زبردست اجتماع رہتا ہے جبرالٹر کے مقابلہ میں سنگاپور میں (———) کے تین بہت بڑے فوائد ہیں جن کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پہلا یہ ہے کہ مالٹا کی طرح اس کے آس پاس کوئی ایسی طاقت نہیں جس سے فوری حملہ کا خوف ہو۔ جاپان یہاں سے تین ہزار (۳۰۰۰) میل دور ہے۔ لیکن سنگاپور کی وجہ کر انگریزوں کو جاپانی تجارتی راستوں پر پورا اقتدار حاصل ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ سنگاپور ایسے ملک میں واقع ہے جہاں کے باشندے نہایت پر امن ہیں سیاسی یا دوسری ہنگامہ خیز تحریکوں میں کبھی حصہ نہیں لیتے۔ ملایا قومی یا بین الاقوامی تحریک سے بالکل پاک ہے۔ ہندوستان عراق اور مصر کی طرح وہاں کبھی بھی کوئی سیاسی ہنگامہ برپا نہیں ہوا۔ تیسرا یہ ہے کہ یہ جگہ ہوائی بیڑوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ ہوائی بیڑے یہاں بڑی آسانی سے اتر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف جبرالٹر میں جنگی ہوائی جہازوں کے اترنے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جبرالٹر کے دوسرے ساحل پر یعنی الجیریا میں جرمنی نے کافی جنگی سامان اور بڑی بڑی توپیں لگا دی ہیں۔

سنگاپور ایک ایسے مرکزی مقام پر واقع ہے جہاں سے بڑی آسانی سے اسٹریلیا، ہانگ کانگ، کلکتہ اور کولمبو کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ یورپ ہندوستان اور مشرق کے تجارتی راستہ کی کنجی بھی سنگاپور ہی میں ہے۔ لیکن سنگاپور کی سب سے بڑی اہمیت اس وجہ کر ہے کہ یہاں سے جاپانی نقل و حرکت اور اس کے جابرانہ اقدام کو روکنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر امریکہ اور جاپان میں جنگ چھڑ گئی جو موجودہ حالات میں نا ممکن نہیں تو جیسا کہ مارچ ۳۸ء میں جورت سکشبر بحری سکریٹری نے کہا تھا سنگاپور کے کل سامان اور آسائیاں امریکہ کے لئے وقف کر دی جائینگی۔ کیونکہ "ہوائی جزیروں کے علاوہ امریکہ کے پاس اس خطہ میں جہازوں کی مرمت اور دیگر

ریات کے لئے کوئی دوسرا ایسی نہیں۔

موجودہ جنگ کا یہ اہم محاذ تقریباً ایک جزیرہ ہے جو ۷ میل لمبا اور ۴ میل چوڑا ہے۔ یہ مانیلا سے ۵۷۸ میل ہانگ کانگ سے ۷۴۷ میل دور ہے۔ لیکن یاکوہوما (جاپان) سے اس کی دوری ۵۴۳۳ میل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جاپانیوں فارموسا میں ایک زبردست ہوائی بیس قائم کر رکھا ہے۔ جو سنگاپور سے تقریباً نزدیک ہے۔ لیکن جنگ میں ہوائی حملے ہی کچھ نہیں کرتے۔ اس کا تجربہ ہم لوگوں کو موجودہ جنگ میں کافی ہو چکا ہے[1]۔ سنگاپور پر اثر پذیر حملے کے لئے جاپانی بحری بیڑے سے کم ...۳ میل طے کرنا ضروری ہوگا۔ جو ایک کافی وقت طلب امر ہے۔ لیکن یہاں پر ایک بات یقینی قابل غور ہے۔ یہ ہے کہ اگر جزیرہ فلپائن امریکہ کے ہاتھ سے نکل کر کسی مخالف طاقت کے قبضہ میں چلا گیا۔ تو ایسی حالت میں سنگاپور کے ی فوائد گھٹ کر آدھے رہ جائیں گے۔ بعض انگریز ماہران جنگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر فلپائن پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا سنگاپور بالکل بیکار ہو جائیگا۔ لیکن ایسا ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سنگاپور کو ایک زبردست بیس بنانے کا خیال انگریزوں میں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا۔ ڈجیلیکو تمام انگریزی مقبوضات کا دورہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے اور انگریزی حکومت نے بھی اس سے تفاق کیا۔ انگریز اسوقت جاپان اور اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے سخت خوفزدہ ہو رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مالٹا جہ ۸۰۰۰ میل دور ہونے کے ضرورت کے وقت بیکار ثابت ہوگا۔ اسلئے ضرورت تھی کہ کوئی دوسرا مالٹا مشرق بعید میں کسی مرکزی مقام پر قائم کیا جائے۔ اور اس کے لئے سنگاپور سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ ابتک اس کی تعمیر میں ۵۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ خرچ ہو چکے ہیں۔ اور اس کی مرمت وغیرہ میں سالانہ پانچ لاکھ پاؤنڈ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ انگلستان کا اسمیں بہت کم خرچ ہوا۔ اس پانچ کروڑ پاؤنڈ میں زیادہ تر ہانگ کانگ، نیوزیلینڈ اور ملایا کے روپے ہیں

[1] ندیم یہ رائے کریٹ پر جرمنوں کے قبضہ سے پہلے کی ہے۔

عکس مکتوب

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ

بنام

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ام، اے، پی، اچ، ڈی، سابق وزیر تعلیم صوبہ بہار

صدیقی العزیز السلام علیکم خط ملا۔ میں آپکے مکان پر نہایت آرام و راحت کے ساتھ رہا اور میں ان تمام عزیزوں کا نہایت شکرگذار ہوں جو آپکی عدم موجودگی میں وہاں موجود تھے اور جنھوں نے میری علالت کی وجہ سے بعضا نہایت ہی زحمتیں برداشت کیں۔ یہ شکایت ایکا ایک سفر میں پیدا ہوئی اور گلہ تکلیف تو اسقدر بڑھ گئی کہ اب پرسوں سے نقل و حرکت کے قابل ہوا ہوں۔

مجھے جیپور نہ جا سکنے کا ضرور افسوس ہے لیکن کیا کروں اسوقت بالکل مجبور ہو گیا تھا۔ اگر آپ موجود ہوتے تو خود آپکا بھی مشورہ وہی ہوتا جو میں نے مجبوراً اختیار کیا۔

تنظیم جماعت کے مسئلہ پر آپنے غور نہیں کیا مقصود وہ جماعت نہیں ہے جسکے لیے آپ قوت تلاش کرتے ہیں بلکہ وہ نظم ہے جسکے بغیر قوت پیدا نہیں ہوسکتی۔ زبانی باتیں ہونگی تو انشاء اللہ آپ متفق ہو جائینگے۔

آپنے پہلے ساتھ قیام جمعیت کیے پہلے بھی کہا تھا

اے مسافر دیکھ آتا ہے نظر وہ راجگیر   پرسکوں جسکے کہستاں جسکا وادی بے نظیر
قدرتِ حق کا یہاں ہر وقت ہوتا ہے نمود   بھول جاتا ہے یہاں انسان آکر ہست و بود
جلوۂ حق کے تجلی کی یہ خلوت گاہ ہے   عرشِ باری کی طرف جانیکی یہ اک راہ ہے
آکے دنیا کو یہاں انساں نہ کیونکر بھول جائے   دولتِ سرمد ملے جسکو نہ وہ کیوں پھول جائے
دیکھ وہ اب سامنے مخدوم کنڈ آیا نظر   ہے فضا میں جس کے اب تک ایک روحانی اثر
جس کے حلقہ میں نظر آتی ہے شانِ ذوالجلال   دین و دنیا کا شرف یحییٰ منیری کا جمال
مدتوں کی جنگ جس نے گردشِ ایام سے   کفر کے جنگل کو جس نے بھر دیا اسلام سے
نعرۂ تکبیر سے جس کے کہستاں ہل گئے   نغمۂ شیریں سے جسکے کفر و ایماں مل گئے
بے وطن ہو کر گذاری جسنے برسوں زندگی   جس کے باعث ذرہ ذرہ میں ہوئی تابندگی
زندگی جس کی مثالِ شمع سوزندہ رہی   روشنی دنیا میں جس کے دم سے پایندہ رہی
ظلمتِ دل ہوگئی کافور جس کے نور سے   شمعِ ایماں ہوگئی روشن شرارِ طور سے
ہے شرف کافی کہ ہوں مخدوم کا ادنیٰ غلام   نام نامی کا وظیفہ وردِ لب ہے صبح و شام

(۲)

نام تیرا ہے ہمارے لب پہ جاری "اے شرف"   تیرا کلمہ ہے زباں پر بس ہماری اے شرف
در پہ حاضر لیکے ہیں سب زندگی کی کائنات   سر جھکائے ہیں تری چوکھٹ پہ انسان و نبات
تیرے در پر مجھکو لائی ہے رفیقِ زندگی   فیض سے تیرے ہو اسکی زیست میں تابندگی
مدتوں سے یہ مریضہ ہے گرفتارِ بلا   دور ہوں اسکے مرض یہ آپ سے ہے التجا
چھوڑ کر گھر بار اور دنیا سے منہ کو موڑ کر   ہے کھڑی در پر ترے ہاتھوں کو اپنے جوڑ کر
اے گلِ گلزارِ حق اے غنچۂ باغِ رسول   ہاتھ پھیلائے ہے تیرے در پہ یہ بنتِ بتول
ماں کے دائیں ہے وہ صدیقہ بھی سر جھکائے ہوئے   رابعہ بائیں طرف گردن کو ہے موڑے ہوئے
ساجدہ بھی آئی ہے معصومیت کے لیکے پھول   غنچہ ہائے نوشگفتہ کی یہ ڈالی ہو قبول
اک طرف بیٹھی نفیسہ کہہ رہی ہے بار بار   ہے کرم کا آپکے احمد بھی اک امیدوار
شمس کو اپنی دعا سے چشمۂ انوار کر   بدر کو اپنی شعاعِ لطف سے ضوبار کر
نجم یہ چھوٹا مسافر ہے ترے در کا گدا   دوڑنا حجرے میں ترے جسکا دن بھر مشغلہ
خاکِ در سے جسکے ملتا بار ہا اپنی جبیں   اس کے ننھے پاؤں ہیں اور تیری حجرے کی زمیں

روشنی کرتا ہے جو حجرے میں با صد اہتمام — جو ڑتا ہی رہتا ہے جو موم بتی صبح و شام
ہے پسندیدہ بہت اسکو جو لنگوروں کی صحبت — بادۂ جوش مسرت سے ہوا جاتا ہے مست
نغمہ سنجی چوٹیوں پر جاکے جو کرتا ہے روز — مست صوفی کی طرح ہوتا ہے جو جلوہ فروز
بڑھ گئی ہیں کیا ترنم ریزیاں آ کر یہاں — نیز سے صحرا کی فضا نے کر دیا ہے شادماں
عمر ہو اس کی فزوں اے حضرۃ عرفاں مآب — اوج اقبال و ہنر کا نجم بھی ہو آفتاب

(۳)

مولوی یونس ہیں عالم صاحب صبر و رضا — قوت بازو مرے ہر فعل جنکا بے ریا
ظلمت شب میں مثال شمع ہو جو راہبر — ہو وہ قندیل جبل روشن ہو جس سے رہ گذر
کر عطا اسکو وہ منصب اے کریم اور اے قدیر — زندگی ہو جس سے وقف خدمت برنا و پیر

۴

واسطہ تجھ کو ولی ذی شرف کا اے خدا — حضرۃ یحییٰ منیری کے شرف کا واسطہ
بادشاہا! شافع روز جزا کا واسطہ — اہلبیت مصطفےٰ اور مرتضےٰ کا واسطہ
دین ابراہیم کی عزت کا تجھ کو واسطہ — اپنی شان رحمت و عظمت کا تجھ کو واسطہ
اپنے اس گم کردہ منزل قافلے کو دیکھ لے — اُن کے دلکو دیکھ ان کے ولولے کو دیکھ لے
اک نظر رحمت کی مولیٰ ان گداؤں پر بھی کر — عفو کی آقا نظر ان کی خطاؤں پر بھی کر
زندگی کو ان گداؤں کے سکون و نور بخش — نونہالان چمن کو ارتقائے طور بخش
رود ہائے خشک کو مولیٰ مرے پر آب کر — میرے اس سوکھے چمن کو اے خدا شاداب کر

از پئے یحییٰ منیری از برائے مصطفےٰ
کر لے اب مقبول یارب یہ دعائے مجتبےٰ

وجدانیاتِ صبر

از

جناب سید بدر الدین احمد صاحب صبرؔ مخدوم پوری

خواب میں ہے محو دیدارِ جمالِ یار آنکھ
سو گئے جب ہم تو گویا ہو گئی بیدار آنکھ

پھر گئی میری طرف سے جب تری اے یار آنکھ
کیا تعجب ہے دکھاتی ہیں اگر اغیار آنکھ

ہے زمانے سے نرالی دو دلوں کی گفتگو
ہو گئیں دو چار باتیں ہو گئی جب چار آنکھ

ہو نہ جیسی در دیترا ہو نہ جیسی ذوقِ دید
ہم سمجھتے ہیں وہ ہے بیکار دل بیکار آنکھ

اک جدائی کے سبب سے سینکڑوں شکوے گلے
وہ ملے۔ دل مل گیا۔ انسے ہوئی جب چار آنکھ

کیا بتائیں صبح تک کیا جانے کیا ہو دیکھئے
شام ہی سے ہر لگی سب کی سوئے بیمار آنکھ

مل رہی ہے وقتِ آخر دل لگانیکی سزا
تک رہی ہے نزع میں سوئے در و دیوار آنکھ

دردِ دل کی ہو ہی جاتی ہے زمانے کو خبر
باندھتی رہتی ہے ہر دم آنسوؤں کا تار آنکھ

کامیابی نے دکھائیں ہائے کتنی ذلتیں
ایک احساں کے عوض نیچی ہوئی سو بار آنکھ

صبر صاحب آجکل کیا آپ بھی پینے لگے
اس سے پہلے تو نہ رہتی تھی کبھی سرشار آنکھ

راجگیر کو دیکھ کر

از

جناب محمد مجتبیٰ، ایم۔ اے، آرگنائزر، رورل ڈیولپمنٹ بہار

"۳۷ء کے دسمبر میں اہلیہ کی صحت نہایت خراب ہوگئی۔ اطباء نے تبدیل آب وہوا کا مشورہ دیا۔ بعض ڈاکٹروں نے بعض امراض تجویز کئے۔ ۳۲ء سے ۳۷ء تک مسلسل تکلیف دہ علالت نے انتہائی اضطراب کو پہنچا دیا تھا۔ میں نے بعض اطباء کے مشورہ سے "راجگیر" کو تبدیل آب وہوا کے لئے پسند کیا۔ سارے کنبے کو لیکر بڑے دن کی چھٹیوں میں راجگیر پہونچا۔ راجگیر کی پہاڑیاں جب سامنے آئیں بچوں نے "راجگیر" کے متعلق سوالات کئے۔ ابتدائی اشعار برجستہ ریل پر کہے گئے۔ اور بچوں کیلئے ابدی مسرت کا سامان ہوگیا۔ یہی نظم کا تاریخی ٹکڑا ہے۔ انتہائی حسرت واضطراب کی حالت میں مریضہ کو لیکر حجرۂ مقدس تک پہونچا۔ یہ غریب کنبہ جس حال میں حاضر ہوا ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے ٹکڑے میں ہے۔ شمس الضحیٰ۔ بدر الدجیٰ۔ نجم الہدیٰ "شمس" "بدر" "نجم" "احمد" یہ معصوم بچوں کے نام ہیں۔ "نجم" کی زبان سے جو باتیں واقعی نکلی تھیں۔ وہ نظم کر دی گئی ہیں۔ "صدیقہ" "نفیسہ" "رابعہ" اور "ساجدہ" بچیاں ہیں۔ "مولوی یونس" میرے ایک عم زاد بھائی شریک سفر تھے۔ اور تین ماہ کے قیام راجگیر میں ایسی خدمت اور رفاقت کی کہ اس کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا ہے۔

یہ نظم بطور یادگار "راجگیر" ہی میں مرتب ہوئی اور بیشتر اشعار دعائیہ حجرے کے سامنے یا اوپر پہاڑ کی دیوار سے جو حصہ متصل "مصلی" خاص کا سمجھا جاتا ہے وہاں پر موزوں ہوئے "شعریت" کا کوئی عنصر بھی اگر اس میں پایا جائے تو یہ حضرت مخدوم کا فیض ہے ورنہ اس حقیر کو کسی قسم کا دعویٰ شاعری نہیں، اور نہ اس مشغلے میں کوئی درک ہے۔

خادم
مجتبیٰ

ندیم افسوس کہ مریضہ موصوفہ ۲۰ جون سنہ ۴۱ء کو اپنی ابدی خوابگاہ میں جا سوئیں۔ اس سانحہ ارتحال پر ہمیں اس کنبہ سے دلی ہمدردی ہے۔ خداوند تعالیٰ مرحومہ کو اپنے سایہ رحمت میں لے اور پسماندوں کو صبر و قرار کی توفیق عطا فرمائے۔

ادبیات

جذبات مبارک

۲

از

حضرت مبارک عظیم آبادی

حسن کا کہتے ہیں تم کو عشق کا بانی مجھے
تم کو زلفوں کی ملی دل کی پریشانی مجھے

کر گیا آئینا کس کا محو حیرانی مجھے
کس کی زلفیں دے گئیں ذوقِ پریشانی مجھے

ہوں وفا مسلک وفا مشرب پرستارِ وفا
یعنی ہر کفر محبت ہے مسلمانی مجھے

بے نیازِ بادہ و پیمانہ کیسے لوگ ہیں
کوثر و تسنیم ہے انگور کا پانی مجھے

کم سے کم اتنا تو ہو احساس تیرے حسن کا
تیرا آئینا بنا دے میری حیرانی مجھے

عاشقوں کا دل تو ناصح دلبروں کا مال ہے
کیا کہی یہ چاہیئے دل کی نگہبانی مجھے

پھر مری رسوائیوں کی ابتدا ہونے لگی
چھیڑتا ہے پھر وفورِ شوقِ پنہانی مجھے

ہے بہارِ گوناگوں اجزائے دل کا انتشار
سیر ہے مجموعۂ دل کی پریشانی مجھے

سر ملا ہے مجھکو سودائے محبت کیلئے
زیب دیتی ہے مبارکؔ چاک دامانی مجھے

طوفان نوح

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی

ایک ہو دو کہ تین چار یہ تو شمار میں نہیں
جلوۂ حسن آپ کا سو میں ہزار میں نہیں

دردِ جگر بڑھے کچھ اور ہے یہی عشق کا مزا
کہتی ہیں بے قراریاں لطف قرار میں نہیں

مرنے کے بعد مجھکو تھی عیش و نشاط کی امید
خاک ہی خاک کے سوا خاک مزار میں نہیں

سیرِ چمن کی آرزو اہلِ نگاہ کیوں کریں
تجھ میں جو ہے بہارِ حسن خود وہ بہار میں نہیں

رہروِ ذوق و شوق اُسے دیکھ رہے ہیں روبرو
منزلِ آرزو نہاں گرد و غبار میں نہیں

انکی نظر کے ساتھ ہی رنگ جہاں بدل گیا
لیل و نہار کا سماں لیل و نہار میں نہیں

میرے جہانِ شوق کو یاس نے کر دیا تباہ
دل ہی دل اب تو ہے فقط کچھ دلِ زار میں نہیں

لطفِ چمن کو بندگی خندۂ گل کو بھی سلام
برقِ جمالِ یار اگر ابرِ بہار میں نہیں

اصل تو پھر بھی اصل ہے نقل تو پھر بھی نقل ہے
لالہ و گل کی تازگی نقش و نگار میں نہیں

ساتھ تمام عمر کا مرنے کے بعد چھٹ گیا
جسم تو ہے مزار میں روح مزار میں نہیں

تم نے یہ کس طرح کہا اہلِ وفا کے ذکر پر
اور ہیں سب شمار میں نوح شمار میں نہیں
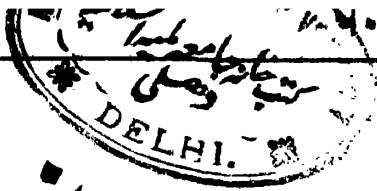
تقریظ و انتقاد

اردو کے چند نئے رسالے اور خاص نمبر

ہندوستانی ادب (حیدرآباد) اڈیٹر جناب غلام محمد خانصاحب ایم، اے، (عثمانیہ) حجم ۴۶ صفحے، تقطیع مطابق ندیم ۲۰×۳۰/۸ کاغذ نفیس، لکھائی چھپائی اچھی، چندہ سالانہ للعہ، پتہ دفتر ہندوستانی ادب چنچل گوڑا حیدرآباد۔ دکن۔

حیدرآباد نے اردو زبان کو ایسی نئی زندگی بخشی کہ وہ آج دنیا کی معیاری زندہ زبانوں کی صف میں کھڑی ہونا چاہتی ہے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اب سے کچھ پہلے تک اردو صحافت میں حیدرآباد کا حصہ کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتا تھا۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے اچھے رسالے بھی جاری ہونا شروع ہو گئے ہیں، اور وہ اردو کی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

"ہندوستانی ادب" اردو زبان کی خدمت ہی کے لئے جاری ہوا ہے۔ اور اس نے حیدرآباد کے ان ادیبوں اور شاعروں کو اپنے حلقہ میں لے لیا ہے۔ جن کے مضامین ملک کے علمی و ادبی رسالوں میں مدت سے پڑھے جا رہے ہیں۔ ان میں سے جناب عبدالقادر سروری، جناب ڈاکٹر حمید اللہ ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، جناب علی اختر صاحب اختر، جناب علی منظور صاحب حیدرآبادی اور جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی، وغیرہ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"ہندوستانی ادب" کے نام جناب محمد عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبۂ عربی الہ آباد اور مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے حوصلہ افزا پیامات بھیجے ہیں: "ہندوستانی" کے عنوان سے جناب سروری صاحب کا ایک قابل قدر مضمون ہے۔ جسمیں دکھایا گیا ہے کہ یورپ کے مصنفین نے "ہندوستانی زبان" سے مراد اردو ہی کو لیا ہے پھر "سلطنت بہمنی کا اخلاقی سرمایہ" ... "مرزا غالب کے خطوط دکھنیوں کے نام" (جناب عمر یافعی) اور "شہاب ثاقب کے چند ٹکڑے" (جناب عبدالرحمن خانصاحب سابق صدر کلیہ) وغیرہ مفید و پر معلومات مضامین ہیں: "بالکل" کو "بلکل" "پل صراط" کو "پل سراط"، "اجراءکو" "اجرائی" اور "دل دیا دل کو لذت غم دیا" کے بجائے "دل دیا دل کو لذت غم دی" کے لکھنے میں اگر قصد و عمد کو دخل ہے تو ہم سردست ابھی زبان کی ایسی "وسعت" اور اسمیں ایسے تغیر و تبدل کے جواز کے ہمنوا نہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ ماہنامہ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کی مساعی سے پروان چڑھیگا۔ اور اسکے ذریعہ سے ملک میں علم، ادب اور زبان کے مفید خدمات انجام پائیں گے۔

فانوس بنگلور، اڈیٹر جناب ابوالضیاء عزیز بنگلوری و جناب فرید الفاری بھوپالی، حجم ۴۲ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۸ مطابق ندیم، زرچندہ سالانہ عہ، پتہ:- منیجر رسالہ "فانوس" ۲۱ اولڈ پور ہوز روڈ۔ بنگلور۔

"فانوس" جنوبی ہند کا غالباً واحد ماہنامہ ہے۔ جو حضرت محوی لکھنوی کی سرپرستی؛ اور بنگلور کے ارباب ذوق کی ہمتوں سے
..مدراس میں اردو کی مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ ماہ اپریل ۱۹۴۱ء کا رسالہ پیش نظر ہے۔ اوسط درجہ کے اچھے خاصے مضامین۔
..جلیل کے تبرکات، مولوی سید یوشع صاحب بی، اے، کا مضمون "ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی" وغیرہ لائق ذکر ہیں
..نے، چند مزاحیہ مضامین اور بنگلور کے کہنہ مشق و نوجوان شعرا کے منظومات ہیں۔ افسانوں میں ترجمے اور طبع زاد دونوں ہیں۔
..ہے جنوبی ہند میں علم و ادب کی روشنی پھیل رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ بات رکھا جائے کہ اس کی شعاعیں دیرپا ہوں اور دور دور پھیل کر علم و ادب کو پھیلائیں۔

حاذق، بجنور، نگراں جناب محمد مجید حسن صاحب اڈیٹر جناب حکیم رفیق احمد صاحب حاذق، حجم ۶۴ صفحے مع اشتہارات
قیمت سالانہ ایک روپیہ (عصر) پتہ: منیجر حاذق مدنی دواخانہ بجنور، یو، پی،

..سہ روزہ "مدینہ" کے دفتر سے ایک ماہانہ طبی رسالہ "حاذق" کے نام سے ماہ جنوری سے جاری ہوا ہے ارباب مدینہ کا
..اعت کیلئے یہ دوسرا تجربہ ہے، اس سے پہلے انہوں نے فاران جاری کیا تھا۔ جو کچھ دنوں چل کر بند ہوگیا۔ اس مرتبہ مدنی دواخانہ کے طبی
..نامہ جاری ہوا ہے، طبی معلومات کے مضامین اوسط درجے کے خاصے ہیں۔ "امراض و المعالجات" (امراض و معالجات چاہیئے) یا الامراض
..ت) "تاریخ الحکما" معلومات و تحقیقات، مجربات" "تنقیدات، تشخیص الامراض" اور "افسانہ" رسالہ کے مستقل ابواب ہیں۔
..ب کی مناسبت سے معمولی اور اوسط درجہ کے مضامین ہیں، رسالہ کے اجرا کا مقصد فن طب قدیم کی خدمت و احیا ہے۔ طبی رسالوں کے
..وانات، پر جو مضامین ہیں انہیں اولیت کا درجہ حاصل ہے "معلومات و تحقیقات" میں زمین گردش کرتی ہے یا آسمان" کے عنوان سے
..شں ارضی مان لینے کی صورت میں کسی قدر تکذیب قرآنی کا شائبہ نظر آتا ہے" اس لئے حرکت ارضی کے خلاف دلائل نقل
..ں۔ لیکن ہم مدیر رسالہ سے گذارش کرتے ہیں کہ یہ موضوع بحث نہ طبی رسالہ کے لئے موزوں ہے۔ نہ مذہب کے لئے مفید،
اس وقت ملک میں جو طبی رسالے جاری ہیں۔ ان میں یہ نیا غنیمت اور ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

داستان، لاہور، ادارہ جناب خلیل احمد صاحب و جناب بشیر ہندی صاحب، حجم ۶۴ صفحے
چندہ سالانہ تین روپے (سعہ) پتہ: دفتر رسالہ داستان ۴۵ ٹمپل روڈ۔ لاہور۔

"داستان" ادبی رسالہ ہے" ہندوستانی نوجوانوں کے احساسات کا واحد ترجمان" اس کا سر نامہ ہے۔ اپریل ۱۹۴۱ء کا نمبر پیش نظر
..بط درجہ کے ادبی مضامین۔ افسانے اور منظومات شائع ہوتے ہیں "احسان دانش سے سوال" جیسے ذاتی مباحث سے رسالوں
..کو بچائے رکھنا چاہیئے۔

مستقل، جونپور، ادارہ جناب ضیاء اللہ محمد شیث، مولوی ثناء اللہ مجدی و مولوی محمد فضیل ندوی۔ چندہ سالانہ
تین روپے (سعہ) پتہ: منیجر اخبار مستقل قصیانہ، جونپور۔

مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کے ذی علم خانوادہ کے چند باہمت نوجوانوں کی مساعی سے دار العلوم جونپور
..کے نام سے ایک ہفتہ وار صحیفہ جاری ہوا ہے جس کا ماہانہ اڈیشن بھی اسی نام سے نکلتا ہے۔ علمی، ادبی و سیاسی مضامین کا یہ ایک مفید مجموعہ ہوتا ہے۔

ہفتہ وار اڈیشن میں ہفتہ بھر کی ضروری خبریں بھی درج کر دی جاتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس صحیفہ سے مشرقی یو پی میں مسلمانوں کی صحیح رہبری کی خدمت انجام پائے گی۔ ہم اس صحیفہ کی ترقی و کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

اضطراب بنارس، نگراں حضرت جگر مرادآبادی، حجم ۴۸ صفحے ماہانہ، تقطیع $\frac{20 \times 30}{8}$ مطابق ندیم چندہ سالانہ (للعہ)

پتہ:- دفتر اضطراب، پانڈے حویلی بنارس۔

"اضطراب" کے چند پرچے لکھنؤ سے نکلے۔ اب اس کا دفتر بنارس میں منتقل ہوگیا ہے۔ اور مستحکم بنیادوں پر کام جاری ہوگیا ہے۔ چند صحیح مذاق کے صاحب ذوق نوجوان اہل قلم اس کے ادارہ میں ہیں۔ اور وہ اردو کی موجودہ دنیا میں خاصے روشناس ہیں، جناب مسعود علی ذوقی، جناب نسیم سندیلوی، جناب مسعود اختر جمال وغیرہ کی متحدہ مساعی سے یہ ماہنامہ جاری ہے۔ اب حضرت جگر مرادآبادی کے نام سے "نگراں" کی حیثیت سے سرورق کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ مضامین سنجیدگی و وقار کے حامل ہیں۔ افسانے بھی شوخی و دلآویزی کیساتھ کسی نہ کسی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ذوقی صاحب نے "شبلی" پر مختصر مگر بڑی قابل قدر کے لائق تنقید کی ہے۔ "اقبال" اور "عنایت اللہ مشرقی" کے موازنہ پر جو مختصر تحریر ہے۔ افسوس کہ وہ صحیح مطالعہ اور مذہبی فہم و ادراک سے محرومی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں پر ڈاکٹر عبداللہ نے ابھی حال میں "دنیائے اردو جنگ عظیم کے بعد" میں اچھی نظر ڈالی ہے۔ اس ماہنامہ کے اداریہ میں ذکر کے لائق اپنے زیر اشاعت نمبر کے مضمون پر آزادانہ رائے زنی جو بعض گروہوں کے خلاف، مشنوں پر حقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ ہم اس ماہنامہ کا اسود صحافت کے حلقہ میں پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ایسے سنجیدہ ادبی رسالوں کی قدر اور اس کے کارکنوں کی ہمت افزائی کیجائے۔

سالنامہ جدید اردو (کلکتہ) مدیر جناب پرویز شاہدی، حجم ۲۰۸ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲؍

پتہ:- منیجر جدید اردو نمبر ۳ مارسڈن اسٹریٹ، کلکتہ۔

"جدید اردو" صوبہ بنگال کا واحد اردو ماہنامہ ہے۔ اس کا سالنامہ ماہ مئی میں شائع ہوا ہے۔ "نسخۂ دلکشا" پر جناب قاضی عبدالودود صاحب کا ایک پرمعلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ غالب کی فارسی مثنوی "چراغ دیر" کی تشریح جو بنارس پر لکھی گئی ہے۔ جناب سید حسن امام صاحب وارثی نے "گنجینۂ سخن" کے عنوان سے بنگال سے شائع ہونیوالے ایک گلدستہ کے ایک نمبر کا تعارف کرایا گیا ہے۔ حالانکہ یاد آتا ہے کہ اس گلدستہ کی جلد پر شاید بنگال کے مشہور صاحب نظر اہل علم جناب حکیم حبیب الرحمن صاحب (ڈھاکہ) کا مفصل مقالہ شائع ہوچکا ہے جسمیں بہت سے بہاری شعراء کا منتخب کلام بھی چھپ چکا ہے۔ مولانا پروفیسر سید مظفر الدین صاحب ندوی نے "اسلام اور کثرت ازدواج" کو سمجھایا ہے۔ "عروج بنگالہ" کے عنوان سے ایک کارآمد تاریخی نقشہ مرتب کیا گیا ہے۔ افسانوں میں "صفیر نفس" (عباس علی حسینی) "عورت کی محبت" (اجتبیٰ رضوی) اور "رنجیدہ کا چوپڑ" وغیرہ ذکر کے قابل ہیں۔ منظومات میں رضا علی وحشت، ثاقب لکھنوی، ناطق لکھنوی، اجتبیٰ رضوی، اور اسحٰق امرتسری (ظفر شاہ کامران) وغیرہ کے کلام یکجا کئے گئے ہیں۔

چند فوٹو اور رنگین تصویریں بھی ہیں۔ پہلی سہ رنگی تصویر وہی ہے جو ندیم کے بہار نمبر ۳۶ء میں پہلی مرتبہ "کشمکش" کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔ دوسری تصویر انتظار بھی مطبوعہ ہے۔

جدید اردو بنگال میں اردو کی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور ہماری توجہ کا ہر حیثیت سے مستحق ہے۔

عالمگیر کا تاریخ نمبر حجم ۱۹۲ صفحے، تقطیع مطابق ندیم، قیمت بارہ آنہ ۱۲؍۔ پتہ:- دفتر عالمگیر لاہور۔

لاہور کا ماہنامہ "عالمگیر" خاص اور سالانہ نمبروں کے شائع کرنے میں اردو کے سب رسالوں پر بازی لے جا چکا ہے۔
ماہ اپریل کا پرچہ "تاریخ نمبر سنہ ۴۱ء" کے نام سے شائع ہوا۔ مضامین مختلف ابواب میں تقسیم کئے گئے ہیں ابواب کے عنوانات حسب ذیل ہیں "حقائق و معارف"، "تاریخی افسانے"، "تحقیقات و تلخیصات"، "تاریخی ڈرامے"، "منظومات"، "سیاسیات" (یعنی تاریخ سیاسیات) "شخصیات" وغیرہ
انہی عنوانوں کی مناسبت سے اچھے اور پڑھنے کے لائق مضامین شائع ہوئے ہیں۔

عالمگیر کا سالانہ نمبر حجم ۲۴۰ صفحے قیمت عمر پتہ :- دفتر عالمگیر لاہور۔

عالمگیر کا یہ سالنامہ ماہ جون میں شائع ہوا ہے، اور اوسط درجہ کے اچھے مضامین اس میں بھی یکجا کئے گئے ہیں۔ مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے "علمی و ادبی مضامین"، "افسانے اور ڈرامے"، اور "منظومات" میں تقسیم ہیں اور وہ زیادہ تر روشناس اہل قلم کے نتائج فکر و تحقیق ہیں۔

الموسی کا یوم کلیہ نمبر، مدیر جناب محمد مصلح الدین صاحب، حجم ۱۱۲ صفحے، چندہ سالانہ چار روپے (للعہ)
پتہ ــــــــــ دفتر الموسیٰ، سٹی کالج، حیدرآباد، دکن۔

الموسیٰ، سٹی کالج حیدرآباد کے طلبہ کا ترجمان ہے۔ کالج کے اساتذہ رسالہ کے نگراں ہیں۔ اس کا "یوم کلیہ نمبر" اہتمام سے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں مختلف موضوعوں پر طلبہ کے حوصلہ افزا مضامین نظم و نثر ہیں۔ جن سے کالج کے طلبہ کے صحیح علمی و ادبی ذوق اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے اس کا یہ نمبر اردو کے معیاری ادبی رسالوں کے سالناموں سے فرو تر نہیں۔

الواعظ کا نجم العلماء نمبر، مرتبہ مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب، حجم ۲۷ صفحے، تقطیع $\frac{18 \times 22}{4}$
قیمت پانچ آنہ (۵؍) پتہ :- دفتر الواعظ لکھنؤ۔

لکھنؤ کی شیعی جماعت کے ہفتہ وار ترجمان "الواعظ" کا "نجم العلماء نمبر" حضرت مولانا نجم الحسن صاحب مجتہد مرحوم کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے۔ مضامین زیادہ تر محرم کی مجالس اور واقعہ کربلا پر ہیں۔ اگر نمبر کی مناسبت سے مولانائے مرحوم کے سوانح و اخلاق و علم و فضل پر بھی ایک دو مضمون ہوتے تو مناسب ہوتا۔

نرالی دنیا کا تقویم نمبر، اڈیٹر جناب روشن لال صاحب حجم ۸۸ صفحے، چندہ سالانہ عہ؍ -
پتہ :- دفتر نرالی دنیا، لال چوک، قلعہ گوجر سنگھ۔ لاہور۔

رسالہ نرالی دنیا کے جنوری کا پرچہ "تقویم نمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ معمولی قسم کی نثر و نظم کے ادبی مضامین ہیں۔ اور آخر میں سال بھر کی جنتری منسلک کی گئی ہے۔ اور اس مناسبت سے ڈاک کے قواعد، فالنامہ، تعبیر خواب، وغیرہ کے صفحے بڑھا دئے گئے ہیں۔

نئی کتابیں

ایک المیہ از جناب پروفیسر اختر اورینوی ناشر مکتبہ اردو، لاہور، حجم ۸۰ صفحے، تقطیع چھوٹی قیمت ۵؍

اٹلی کا حبش پر پچھلا حملہ اور تسلط، اب تاریخ کی ایک کڑی بن چکا ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اس الم انگیز واقعہ کو ڈرامے کی شکل میں دلدوز پیرایہ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہی ڈراما "ایک المیہ" کے نام سے چھاپا گیا ہے۔ اسمیں اٹلی کے حملہ سے مجلس اقوام کے اجلاس میں شہنشاہ کی شرکت تک کے واقعات آگئے ہیں۔

فرشتوں کی آزمائش از جناب بشیر قریشی بی اے، حجم ۱۲۶ صفحے تقطیع چھوٹی۔ قیمت ایک روپیہ (عمر)

ناشر صدیقی بکڈپو انکہ سردار شاہ مرنگ لاہور۔ یہ افسانہ کے رنگ میں سیاسی خیالات کا ایک تبلیغی رسالہ ہے۔ اسمیں قصہ کے پیرایہ میں دکھایا گیا ہے کہ فرشتوں کو فرمان الہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں جائیں اور ایسے شخص کے نام لکھ کر واپس آئیں جو موت کے طلبگار ہوں، وہ فرشتے پہلے یورپ کی سرزمین میں آتے ہیں، وہاں انکے سامنے وہاں کی سیاسی و معاشی زندگی کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے سرمایہ دار و زمیندار کے مظالم اور منفعت کے حصول کی خود غرضانہ کوششوں کا ذکر آتا ہے۔ پھر وہ فرشتے روس کی سرزمین پر اترتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جنت ارضی میں آگئے ہیں۔ خدا سے بغاوت کا ذکر آتا ہے، اور بندوں کی ناروا معاشی تقسیم اس کا سبب قرار پاتا ہے۔ پھر ارض مشرق کا رخ کرتے ہیں۔ اور اس "غلام آباد" کی زبوں حالی ان کے علم میں آتی ہے۔ اور ہندوستان کے فرقہ وارانہ تنازعات اور پھر مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ——————

—————— اور دکھایا ہے —— کہ مسلمان فرقہ بندی چھوڑ کر ایک پلیٹ فارم پر آجائیں، اور نظام ملت کی بنیاد قرآن مجید پر قائم کریں۔ مصنف کے خیالات اگرچہ واضح ہوجاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے طرز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ خیالات پریشان اور گنجلک ہوکر رہ گئے ہیں۔ زبان کی کمزوریاں بھی جابجا ہیں۔

المعیشتہ الباقیہ ترجمہ دیوان ابی العتاہیہ از مولانا محمد ایوب صاحب عثمانی، فاضل اورنگ آباد ضلع گیا حجم ۱۵۲ صفحے قیمت ایک روپیہ (عہ) مصنف سے طلب کریں۔

مشہور عرب شاعر ابو العتاہیہ کے دیوان کے چند اجزا مدرسہ اگزامینیشن بورڈ صوبہ بہار کے نصاب میں داخل ہیں طلبہ کی آسانی کیلئے مولوی محمد ایوب صاحب عثمانی نے الف سے ردیف دال تک کا بامحاورہ اردو ترجمہ کیا ہے اور اسکو المعیشتہ الباقیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ ترجمہ صاف سلیس اور رواں ہے۔

انتخاب شاد از جناب رضی حیدر صاحب وارثی جیبی تقطیع ۳۲ صفحے، لکھائی چھپائی معمولی، قیمت دو آنہ (۲؍)

پتہ۔ جناب نور الحسن مراد پور پٹنہ سٹی —————— "سو شعر" کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۳۷ء سے شروع ہوا، شاد کے سو شعر جناب حمید عظیم آبادی شائع کر چکے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ ان کا حق نہ تھا، انہوں نے تو شاد کا دیوان ہی مرتب کیا ہے اسلئے ہمارے شہر کے نوجوان صاحب ذوق رضی حیدر صاحب نے اپنے انتخاب سے شاد کے سو شعر چنے ہیں۔ اور انہیں تاریخی نام کے ساتھ "انتخاب شاد" سے موسوم کیا ہے شروع میں مختصر لفظوں میں شاعر پر چند سطریں لکھی گئی ہیں، اور اصل انتخاب کا پیش لفظ جناب ابو محمد شفیع صاحب دہلوی نے قلمبند کیا ہے۔ ارباب ذوق اس گلدستہ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

مئی ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) حیدرآباد میں شکر سازی
(۲) تمباکو۔ اس کا استعمال اور نقائص
(۳) پودے میں بالیدگی کے ہارمون
(۴) پودوں کے امراض
(۵) حیوانات کی تربیت

جون ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

(۱) ایک اور ایک سے زائد انجن کے ہوائی جہاز۔
(۲) بجلی اور گرج پر ابن سینا کے خیالات
(۳) حشرات کی تباہ کاریاں اور فائدے۔
(۴) تاریخ زمین کے ماخذوں پر ایک نظر
(۵) مچھلی کا تیل۔
(۶) ہماری غذاؤں کے ماخذ
(۷) آیوڈین۔

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق۔ سوال و جواب سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔ اشتہارات کے نرخ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ سکہ انگریزی (عہ)۔ نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ (۸؍)

المشتہر

معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

ندیم

مرتبہ
سید ریاست علی ندوی

امریکن سائنسدانوں نے آب حیات ڈھونڈ نکالا!!

OTONE The Elixir of Life
SILVER DROPS

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے بوڑھے ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں
لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے

15.000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ ثابت کردے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیوانی ہرمون یا وٹامن کی موجودگی پر ہیں تو ہم اُسے مبلغ ۱۵۰۰۰ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے لیکن ہم نے ہندوستان میں رائج کرنے کیلئے اسکی قیمت کچھ مدت کیلئے صرف تین روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اسکی قیمت میں اضافہ کردے آپ اسے تمام انگریزی دوافروشوں سے خرید سکتے ہیں اگر نہ ملے تو ہمیں لکھئے محصول ڈاک

میسرز گرانڈ فارمیسی پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲۳
تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ ٹیلیفون نمبر - بڑا بازار

Sole Distributor
AND PHARMACY (N. G.)
T BOX 2323 · CALCUTTA

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ
موڈرن سائنس کا معجزہ

ہرمون اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کر سکی لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشیلڈ ایم۔ ڈی کا شکر گذار رہنا چاہئے کہ اُنھوں نے انتہائی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد فرنیچ کے ایک درخت سے ایسا ایکسٹرکٹ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اسکے تجربات سکنڈل سوئٹزرلینڈ انسٹی ٹیوٹ اوف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جن میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

اوٹون کی آب حیات تاثیرات

اس جادو اثر جیون امرت کا نام اوٹون "Otone" ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوش کن تبدیلی محسوس کرینگے چہرے کی جھریاں غائب ہو جائینگی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور ملائمیت آجائیگی۔ رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دمکنے لگیں گے۔ چہرہ پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہو جائے گی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے۔

دشمن جاں امراض کا خاتمہ

اوٹون کے سلور ڈراپ خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری، سر کا چکرانا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا، چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا۔ کمر کا درد۔ مردانہ و زنانہ جنسی امراض ضعیف اعضائے رئیسہ ضعف گردہ و مثانہ عورتوں کی پر سوت کی بیماری۔ ہسٹریا (لیکوریا) سیلان الرحم اور دیگر رحمی شکایتوں کو فوراً دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آزمائش کا طریقہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات آزمانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں اور ایک فوٹو کھنچوائیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپکو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔

خریداران ندیم سے

۱۔ اب ندیم ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو دفتر سے روانہ ہوجاتا ہے۔ ۳، ۴ تک آپ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اس طرح ندیم کی تری کوتاہی دور ہوئی — مگر ابھی ہم تاریخ اشاعت متعین نہیں کرتے ہماری پوری کوشش یہی ہوگی کہ اس میں فرق نہ آنے، اور بغیر اعلان کے عملی طور پر یہی تاریخ اشاعت متعین ہوجائے پرچہ اگر کسی ماہ کی ۸ تاریخ تک آپ کے ہاتھوں میں نہ پہنچے تو تصور کریں کہ وہ ضائع ہوا ۱۵ کے اندر ہمیں اطلاع دیدیں، ورنہ اس ماہ کا رسالہ دفتر میں عموماً ختم ہوجاتا ہے۔ ۲۔ اپنی مدت خریداری پر نظر رکھئے آپ کے پتہ کیساتھ وہ چھپی ہوئی ہے۔ اس مدت کے ختم ہونے کیساتھ یا تو منی آرڈر سے زرچندہ بھیجئے ورنہ وی، پی وصول کرنے کیلئے تیار رہیئے۔ دفتر سے کوئی اطلاعی خط نہ جائیگا۔ اگر خریداری بند کرنا چاہیں تو اطلاعاً ہمیں مطلع فرمادیں۔ ۳۔ جواب طلب امور اور رسید کے لئے جوابی خط لکھئے۔ — منیجر ندیم

بہار نمبر ۱۹۴۰ء

کے بعض فرمے ختم ہو گئے تھے، اب وہ دوبارہ چھاپے جا رہے ہیں۔ ان تمام ارباب ذوق کو جنہوں نے فرمائشیں بھیجی ہیں۔ اطلاع دی جاتی ہے کہ۔ امید ہے کہ بہار نمبر ان کی خدمت میں دو ہفتوں کے بعد پہنچ جائے گا۔

قیمت دو روپے، محصولڈاک پانچ آنے

منیجر

رسالہ ہندستانی

رسالہ ہندستانی، ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہورہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے، جو اکیڈیمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم و جدید علوم و فنون کے اہم موضوعات پر، ماہرین فن اور کہنہ مشق اہل قلم کے مضامین شایع ہوتے ہیں۔ اس استناد کی وجہ سے یہ رسالہ، رسالہ نہیں ہے۔ بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے ہر کتب خانے میں اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے۔ رسالے نے، دس گیارہ سال کے عرصے میں علم و ادب کے جو اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، ان کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہوگیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں شامل ہوکر علم و ادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمائیں گے۔ اسی سلسلے میں اس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں، جو حضرات اسکی خریداری منظور فرمائیں گے۔ یا جو پانچ خریدار بہم پہنچائیں گے، ان کی خدمت میں اکیڈیمی کی بعض مطبوعات رعایتی قیمت پر پیش کیجائینگی ان مطبوعات کی تفصیل دفتر سے معلوم ہوسکے گی۔ رسالے کا سالانہ چندہ چار روپے ہے۔ ترسیل زر اور اس سلسلے کی خط و کتابت کے لئے اوپر کے پتے سے یاد فرمایا جائے۔

جنرل سکریٹری

عورت کا دِل
مت توڑیئے!
شربتِ اکسیر
رجسٹرڈ
فوراً
استعمال کیجئے
جریان
کیسا ہی پُرانا کیوں نہ ہو شربت اکسیر
کے استعمال سے جڑ سے جاتا رہتا ہے۔
جسم میں کمزوری۔ پیشاب کے قبل یا بعد سفید سفید دھات کا
گرنا منی کا پتلا ہو جانا۔ احتلام کا ہوتا نطفہ کا نہ قرار پانا
اور دردِ سر کا برابر رہنا سُستی۔ کاہلی چہرے پر
بالکل بے رونقی۔ خون کا بدن میں نہ پیدا ہونا۔ ان سب
مہلک امراض کے لئے شربتِ اکسیر نہایت ہی مفید
ثابت ہوا ہے۔ مقوی دِل و دماغ تو ایسا ہے کہ شاید ہی
اس کے مقابلہ کی کوئی دوسری دوا ہو۔ ہاضم اسقدر ہے کہ
آپ ایک ہفتہ کے بعد دونی غذا نوش کرنے لگیں گے
قیمت۔ فی شیشی۔ ایک روپیہ
تین شیشی کی قیمت۔ دو روپیہ بارہ آنہ۔ محصول علاوہ
چھ برس کا جریان شربتِ اکسیر سے اچھا ہو گیا
جناب عبدالکریم صاحب۔ دربھنگہ سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرض
جریان کیلئے شربتِ اکسیر نادر تحفہ ہے۔ مجھے چھ برس سے جریان
کی شکایت تھی۔ شربتِ اکسیر کا استعمال کیا۔ خدا نے کامل
تندرستی بخشا۔ احتیاطاً تین شیشی شربتِ اکسیر اور بھی بھیجئے
ماہواری
کم آتا ہو یا بند ہو گیا ہو، یا
درد اور تکلیف کے ساتھ آتا ہو۔ بے قاعدہ
رُک رُک کر آئے۔ یا وقت مقررہ سے آگے۔ یا پیچھے آئے
ایک دو دن آکر رُک جائے۔ مچھلی کے خون کیطرح سیاہی
مائل گاڑھا یا پانی کیطرح پھیکا رنگ کا ہو جس سے کمر
پیڑو میں درد۔ ہاتھ کا تلوہ۔ آنکھ میں سر میں جلن رہتی ہو
اس بے نظیر دوا
شربت مفید النساء
رجسٹرڈ
کے استعمال سے ماہواری
کی تمام شکایتیں دور
ہو جائیں گی
تازہ خون پیدا کرنے والا!
سونے کا کشتہ مِلا ہوا بہترین مصلح و مصفی خون
سارسوتا
رجسٹرڈ
خون کی خرابی۔ بدن میں سفید داغ۔ ابرس کی بیماری چکتے چکتے داغ
یا سیاہ داغ بدن پر سے ہٹا دیتا ہے۔ پارہ کھلا دینے کے اثر کو
خارش اور کھجلی سے خون کو پاک صاف کر دیتا ہے۔
تازہ خون بدن میں بافراط پیدا کر دیتا ہے۔ سارسوتا کا ہر
قطرہ سیروں تازہ خون بدن میں پیدا کرتا رہتا ہے۔ عورت۔ مرد
بچے سبھوں کو یکساں مفید ہے
قیمت۔ فی شیشی۔ دو روپیہ آٹھ آنہ محصول علاوہ
ملنے کا پتہ۔ ایس۔ اے۔ بی بخشی۔ اینڈ کمپنی۔ گھڑی والی کوٹھی۔ ۳۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

صوبہ بہار کے اسکولوں اور کالجوں میں ۱۹۳۲ء سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

قیمت سالانہ للعہ
فی پرچہ
قیمت ششماہی عہ
۶ ر آنے

صوبہ بہار میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا ترجمان

مرتبہ ـــــــ سید ریاست علی ندوی

جلد (۱۸) ماہ رجب المرجب ۱۳٦۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۱ء نمبر (۲)

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم گیا سے شائع کیا

نظرات

جناب خان بہادر مولوی سید محمد ابراہیم صاحب عظیم آباد کے قدیم رؤسا میں تھے۔ افسوس کہ مرحوم نے ۱۰ جولائی ۱۹۴۱ء کو اس دار فانی کو الوداع کہا۔ مرحوم ہمارے صوبہ کی علمی و تعلیمی تحریکات میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ وہ محمڈن اینگلو عربک اسکول، جو صوبہ کی سب سے پہلی اسلامی انگریزی درسگاہ تھا، کے معتمد تھے۔ انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کی کرسی صدارت بھی ابتداءً انہیں کے پاس تھی۔ پھر انجمن ترقی اردو پٹنہ سیٹی کے نام سے عظیم آباد میں ان کے دورِ صدارت میں عمارت تعمیر ہوئی۔ صوبہ بہار مسلم لیگ کے اولین صدر بھی وہی تھے۔ ابھی دو سال پہلے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پچھلے اجلاس کے موقع پر ان کے خدمات کا حصہ نمایاں تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی خدا ترسی و دینداری تھی۔ وہ متین، مہذب، خلیق اور ملنسار تھے۔ ان کی صحبت میں عظیم آباد کی پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ علم و ادب کا بھی پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ "ندیم" کے قدردانوں میں تھے، اور ندیم کے آغاز سے انکی ہمدردی اس کے ساتھ وابستہ رہی۔ جناب سید اکبر حسین صاحب ان کے خلف صدق اور جانشین ہیں۔ ———— اردو ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ بعض صحبتوں میں ان کے کلام کے سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ افسوس کہ شفیق پدر کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ خداوند تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور اس سانحۂ عظیم پر صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت سے نوازے۔

اردو کی موجودہ صحافت کے حلقہ میں ہفتہ وار معاصر "صدق" کو جو بلند مقام حاصل ہے۔ وہ تعارف کا محتاج نہیں۔ اس ہفتہ وار صحیفہ سے مغرب زدگی کے ازالہ، یورپ کے فواحش کی پردہ دری، اور اسلامی مفاد و روایات کے تحفظ کی غیر فانی خدمتیں انجام پا رہی ہیں۔ نیز اسلامی مسائل و مباحث پر بصیرت افروز مدلل اور جامع مضامین کی اشاعت اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ صدق کے محترم فاضل مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی اردو کے مایۂ ناز انشا پردازوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے شذرے ادب کے انمول جواہر قرار پاتے ہیں۔ اگر کسی دوسری زبان کے اس پایہ کے ادیب و انشا پرداز کی ادارت میں کوئی صحیفہ جاری رہتا تو وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ مگر ہمیں مہتمم صدق کے ایک مکتوب سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ صدق کی مالی حالت اطمینان کے لائق نہیں۔ ضرورت ہے کہ خریداروں کے اضافہ سے خسارہ کو پورا کیا جائے۔ "صدق" پہلے "سچ" کے نام سے نکلتا تھا۔ مہتمم صدق کا بیان ہے کہ "سچ" کے پرچے غیر معمولی تعداد میں ہمارے صوبہ میں بھی آتے تھے۔ موصوف نے سچ کے خریداروں کی فہرست بھی بھیجی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بیشتر ندیم کے حلقہ خریداری میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ سطریں قلمبند کی گئیں کہ سچ کے بند ہونے کے بعد "صدق" کے جاری ہونے کی اطلاع یا یاددہانی کر دی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ارباب ذوق اس صحیفہ کی طرف امداد کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ نمونہ کے طور پر ہم آئندہ صدق کے کسی مضمون کو ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

پچھلے مہینہ میں "دیا غنوسس بہاری" کے مضمون کی اشاعت کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے عجیب و غریب انداز کے بہ کثرت خطوط آئے۔ اور ان سے اندازہ ہوا کہ اس مضمون کے ذریعہ ادبی دنیا میں وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی گئی۔ ہم آئندہ بعض مکاتیب کو ناظرین کی خدمت میں پیش کر کے ان کو لطف اندوز ہونے کا موقع دیں گے۔

مقالات

فریادؔ اور ان کے دو شاگرد

از جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر

فریاد کے تلامذہ میں تین نے ان کی زندگی ہی میں نام نکالا تھا۔ محمد بخش، تسلیم صاحب دیوان شاعر تھے، اور ناسخ کی طرز میں کہتے تھے۔ فریاد زندہ ہی تھے کہ تسلیم کا چراغ حیات گل ہو گیا۔ اور اب ان کے جاننے والے بہار میں بھی بہت کم ہیں۔ ابو المعانی محمد عبدالرؤف، وحید کلکتوی بنگالہ کے مشہور فارسی گو تھے، لیکن ان کی شہرت بھی دیر پا ثابت نہ ہوئی، اور حدود بنگالہ سے باہر شاید ہی کوئی اب ان سے واقفیت رکھتا ہو۔ میر علی محمد شاد یوں تو فارسی کہتے تھے، لیکن ان کی شہرت اردو کلام کی وجہ سے ہوئی۔ یہ اپنی وفات کے بعد بھی ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔

وحید (سال ولادت ۱۲۴۳ھ۔ وفات بعد ۱۳۰۷ھ) کا انتخاب دیوان ۱۳۰۸ھ[1] میں جواہر منتخب کے نام سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ سید محمود آزاد نے لکھا تھا، تقریظ نگاروں میں عبدالمنعم ذوقی، میر علی محمد شاد وغیرہ تھے۔ شاد نے اپنی تقریظ میں وحید کو ارشد تلامذۂ فریاد میں تسلیم کیا ہے۔ اور حیات فریاد میں بھی ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ "حضرت کے آفتاب کمال کا پورا پرتو ان پر پڑا ہے۔ ان کا کلام ہمارے حضرت کے انداز سے ملتا جلتا ہے" (ص ۱۸۱) وحید بھی شاد کے حسن کلام کے قائل تھے، چنانچہ شاد کی تقریظ سے پہلے چند سطروں میں وحید نے جو شاد کا تعارف کرایا ہے۔ اس میں ذیل کی بیت ان کی مدح میں ہے: "فصیحٌ بلیغٌ شاعرٌ متکلمٌ خبیرٌ بکلّ الرّجز فی النثر و النظم"

شاد نے تقریظ کی ابتدا پانچ رباعیوں سے کی ہے۔ ان میں سے دو یہ ہیں۔

(۱)
سرخیلِ سخن وراں وحیدست وحید | سر حلقۂ برتراں وحیدست وحید
در راہِ ہنروری کہ پایانش نیست | خوش رہ بُرد براں وحیدست وحید

(۲)
شاگردِ گراں مایۂ فریاد وحید | ہم در فن نظم و نثر استاد وحید
حقا کہ بود اطاعتش واجبِ عین | مخدوم و مطاعِ شادِ ناشاد وحید

٭ اس مضمون میں حسب ذیل مخففات استعمال ہوئے ہیں۔ ج = جواہر منتخب ض = ضمیمہ جواہر منتخب ن = نوائے وطن م = مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ ف = حیات فریاد۔

[1] ج کا سال طبع ۱۳۰۷ھ درج ہے۔ لیکن سال اشاعت ۱۳۰۸ھ ہے۔

شاد نے (ف ص۱۸۱) لکھا ہے کہ "مدتوں خط و کتابت رہی۔ ان کا مصمم قصد تھا کہ جانبین کے خطوط [1] بہ طور انشا کے چھاپ دیں اس زمانے میں راقم کو بھی فارسی انشا پردازی کا شوق تھا، اور بہ طور ارادت خاں کے ہر پنج رقعہ کے سے القاب چار چار [2] ورق میں تمام کرتا تھا، اور ملا طغرا کا نمونہ دکھایا کرتا تھا۔ یہی حالت مولنا وحید کی تھی۔" اس طرز میں شاد کی انشا پردازی کس پائے کی تھی۔ اس کا اندازہ تقریظ کی سطور ذیل سے ہو سکتا ہے۔

"ژولیدہ بیاں، کج مج زبان، فقیر علی محمد شاد، کہ در کشور معنی پر دری بکسوت گدائی کشکول حسن عقیدت اساتذۂ فن بہ دست دریوزہ خیر طلبی و ہوا خواہی باورنگ نشینان ملک سخن بہ لب دارد۔ از بدو ابجد نویسی مکتب انشا و انشاد نظم و نثر کم تر اتفاق نگارش تقریظ بر تصنیف و تالیفے افتادہ، سیما بر صحائف ریختۂ خامۂ فصاحت ختامۂ حضرات معاصرین کہ گاہ باشد کہ محمول بر تصنع و لایہ سرائی بکنند و مستحسن نہ انگارند، و گاہ باشد کہ حق پژوہی و حق گوئی را مہتم بہ سخن پیرائی و ناحق ستائی دارند، و فضائل را رزائل پندارند۔ امّا اگر بریں صحیفۂ دستور العمل فصاحت و بلاغت منصفانہ سطرے چند نوک ریز قلم نہ سازم، و آزادانہ حرفے چند نہ رانم (چوں ہمیں نعمتے از نعماے سرمد خوش ترین میوۂ از بوستان عنایت ایزدی ست) حقا کہ کافر نعمتم شمارند .... بہ خداے نظم و نثر آفرینم سوگند کہ ایں دوں چنیں مہر درخشانے از اوج رخشان سخنے طالع نہ گشتہ، و فی زماننا مثل ایں ماہ تابانے از برج روشن بیانی لامع نہ گردیدہ۔ بر کشایان لواے سخن آفرینی دانند کہ ہندی نژاداں (الّا آناں کہ بہ تائید ایزدی و توفیق سرمدی مؤید و موفق باشند) چوں بہ تسخیر ممالک فارسی زباں رخش ہمت را مہمیز کنند پا از چار دیوار بندہ و کش نہ توانند بیروں نہادن۔ تا بہ ہمہ تیز تگی ہا بہ گرد گرد سمند فارسی چہ رسند۔ ولیکن چوں بر نظام عسا کر گیتی خداے سخن، شاہنشاہ علم و فن، خضر وادی ناپید اکنار اصناف کلام، کوکب دری فلک خزانہ دار انواع یواقیت و گہر، معدن و مخزن اصناف جواہر زواہر مستند اساتذۂ عظام، پیش رو جہابذۂ والا مقام، شیخنا و مولٰنا زبدۃ الاماجد والاعالی، الحالی بالمفاخر والمعالی، ابوالمعانی محمد عبد الرؤف، المتخلص بہ وحید ادام اللہ ظلال کمالہ و صانہ اللہ عن شر العنید والحسد، دم، و قلعہ کشائی آں شاہ باعزّ و جاہ حیرتم بر حیرت افزود، و دل صفا منزلم ہزاراں زبان تحسین و آفریں و دعا و ثنا کشود ....."

ذوقی نے اپنی تقریظ میں وحید کے ذاتی اور خاندانی حالات لکھے ہیں۔ شاد نے اس موضوع پر ف میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ غالباً اس تقریظ ہی سے ماخوذ ہے۔ لیکن نہ معلوم کس مصلحت سے جا بہ جا رد و بدل کر دیا ہے۔ دیوان اور ص سے بھی شاد کے بعض بیانات متعلق وحید کی تردید ہوتی ہے۔

(۱) ف (ص۱۸۰) میں ہے کہ وحید کے اجداد میں سے ایک بزرگ مولنا شیخ محمد رمضان جو "بڑے عالم وقت تھے، شاہ جہاں کے

---

[1] ف میں اس کا ذکر نہیں لیکن شاد کی ایک کتاب سے متعلق دو قطعات تاریخ درج ہیں عنوان کی عبارت یہ ہے۔ "قطعہ تاریخ کتاب تذکرۃ الاسلاف تالیف سخن دان گراں مایہ، معنی سنج والا پایۂ محبی و مکرمی مولوی سید علی محمد شاد رئیس عظیم آباد، گزین تلمیذ استاذی حضرت فریاد مادۂ تاریخ "ذکر اسلاف اولی الالباب" ہے۔ [2] تقریظ میں تو القاب کی چار سطریں بھی ہیں۔

نے میں دہلی سے پٹنہ آ گئے،" وہاں کچھ دنوں قیام کے بعد سوتانوٹی[1] گئے جو اب کلکتہ مشہور ہے" عیدگاہ اور مسجد دو لاکھ کے خرچ سے
یہ کی جو اب تک موجود ہے۔ ذوقی کا بیان ہے کہ قاضی عبد القادر جو وحید کے اجداد میں سے تھے، دہلی سے پٹنہ پہنچے کچھ دنوں وہاں ٹھہرنے
، بعد چاٹرہ گئے۔ اور بالآخر سوتانوٹی میں جو اب کلکتہ کا جز ہے اقامت گزیں ہو گئے۔ وحید کے دادا شیخ رمضان (ان کے عالم دقت ہونے
ذکر نہیں) نے ۱۱۹۹ھ میں لاکھ روپے کے صرف سے ایک مسجد بنوائی جس کے احاطے میں قدیم عیدگاہ، تعمیر کردۂ قاضی عبد القادر کی چند محرابیں
جو اس وقت تک باقی تھیں، داخل کر لی گئیں۔

(۲) شاد کہتے ہیں کہ وحید دادری گاہ صدر کلکتہ کے اعلیٰ مترجم ہوئے تھے، اور اس کے بعد وائسرائے ہند کی مجلس قانون سازی
کے مترجم اعظم، آٹھ نو سو مشاہرہ تھا، ذوقی کا بیان ہے کہ دادری گاہ صدر کی مترجمی کے بعد دو سال تک مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں فارسی کے مدرس
رہے تھے۔ کونسل سے تعلق اس کے بعد ہوا تھا۔ مترجم کے ساتھ لفظ اعظم ج میں نہیں اور نہ اس میں مشاہرے کا ذکر ہے۔

(۳) ف میں ہے کہ انجمن مذاکرۂ علمیہ کلکتہ کے ہر جلسے کی روداد میں وحید کی طویل فارسی تقریر ملے گی۔ ج میں اس کی جگہ یہ ہے
کہ وحید اس انجمن کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، اور ان کے مضامین[2] کا مجموعۂ تحریرات وحیدی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۴) ف میں ناظورۂ جاں افزا اور رباعیات وحیدی دو مختلف کتابیں بتائی گئی ہیں، ج سے معلوم ہوتا ہے کہ ناظورۂ جاں
افزا رباعیات کا تاریخی نام ہے۔ ج میں منشات وحیدی کا نام غلطی سے انشاآت وحیدی لکھا گیا ہے۔ ف میں مرقوم ہے کہ وحید کی بعض
تصانیف عربی میں تھیں۔ ج سے وحید کی عربی دانی کا ثبوت ملتا ہے؛ لیکن اس میں تصانیف کی زبان کے بارے میں کچھ مذکور نہیں۔

(۵) ف ص ۱۱۲ "انجمن اسلام کلکتہ کی بنیاد ۱۸۵۵ء میں حضرت نے بمشورہ رفقا و تلامیذ ڈالی"۔ ج "بہ بستم ماہ مئی ۱۸۵۵ء مسیحیہ
بہ شرکت بسیار رؤسائے اہل اسلام شہر کلکتہ و حوالی آں چہ احباب .... خود ش و چہ از غیر ایشاں ...... بنائے انجمن اسلامی کلکتہ ......

---

[1] سوتانوٹی کی جگہ سوتانوٹی غالباً کتابت کی غلطی ہے [2] یہ وہ مضامین ہیں جو بقول ذوقی مجلس مذاکرۂ علمیہ میں وقتاً فوقتاً پڑھے گئے شاد اپنے خطابیں (م ص ۱۴۲)
دعویٰ کرتے ہیں کہ "مسٹر کار کرن ـ مؤلف تاریخ چین، جان مارشمین، مؤلف تاریخ بنگالہ مسٹر مارن (کذا) ان سب کی کتابیں ہمارے حضرت نے لکھوا دی ہیں، یہ سب
شاگرد تھے..... میر علی خاں کا امیر نامہ، نواب بہادر عبد اللطیف کی مجالس کل فارسی اسپیچیں ہمارے حضرت نے لکھوا دی ہیں"۔ کل فارسی اسپیچوں میں ظاہر ہے کہ
وحید کی تقریریں بھی شامل ہونگی۔ اسی پر بس نہیں شاد نے وحید کی تاریخ بنگالہ کو بھی جو انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہے۔ فریاد سے منسوب کر دیا ہے۔ ف ص ۹۸
"کسی تاریخ بنگالہ کا جو انگریزی میں تھی فارسی میں ترجمہ کر کے اپنے ایک شاگرد کے نام سے چھپوایا" وحید کا نام نہیں لیا۔ لیکن وحید کے سوا فریاد
کے شاگردوں میں کسی اور نے انگریزی سے تاریخ بنگالہ کا ترجمہ نہیں کیا۔ وحید کا انگریزی اور فارسی سے اچھی طرح واقف ہونا مسلمات سے
ہے۔ فریاد کی انگریزی دانی کا شاد کے سوا کسے علم ہے؟ شاد کے غلو کا یہ عالم ہے کہ وہ فریاد کی سنسکرت دانی کا بھی کنایتہً ذکر کر گئے ہیں۔ ف
ص ۹۸ "بالمیک کی رامائن علی الخصوص جب رام بنواس بن باس ہونے چلے ہیں اور عام خلقت جمع ہوئی ہے وہاں پر کے اشعار اس سوز و گداز سے
پڑھتے تھے کہ سننے والے بے اختیار رونے لگتے تھے۔" بالمیک کی رامائن سنسکرت میں ہے۔

انداخت ۔ وتا چندگاہے بہ تحریرات مفید حالِ اہلِ اسلام در جلسات آن انجمن نگاشتۂ قلم...... خود قرأت فرمود"۔ اس انجمن سے فریاد کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

(۶) سلطان الاخبار جاری ہو کر بند ہو گیا تھا۔ وحید نے اسے دوبارہ جاری کیا۔ دوربین اور اردو گائڈ سے بھی وحید کو تعلق تھا۔ ج شاد کہتے ہیں ف ص۱۱۳ کہ سلطان الاخبار اور دوربین فریاد کے مشورے سے نکلے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن ج سے فریاد کا ان اخباروں سے کوئی خاص تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

(۷) ف ص۱۸۰ شاد نے لکھا ہے کہ وحید ۱۸۷۸ء میں فریاد کے شاگرد ہوئے۔ یہ ضمیمے کے بیان کے خلاف ہے۔

(۸) وحید کا ایک شعر ہے جس میں غالب کی طرف اشارہ ہے۔ شاد (ف ص۱۸۱) اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ غالب قتیل کے مخالف تھے اور وحید مرحوم انہیں کی اولاد تھے جو میرزا قتیل[۱] کے دلدادہ شاگرد تھے"۔ اس کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ وحید کے چچا فیض علی عاصی بیر محمد خاں بنارسی شاگرد قتیل کے مستفیدین سے تھے۔ وحید کے دادا اور والد کے شاعر ہونے کا ج میں یک قلم ذکر نہیں۔ وحید نے بعض اشعار میں اگر غالب پر چوٹ کی ہے، تو بعض اشعار میں ان کی تعریف بھی کی ہے۔

گداخت گرچہ دریں بوتۂ سیم خود غالب عیار سکۂ ما نگر کہ تا چند ست ف ص۱۸۳ ج ص۱۷۱

ہاں وحید از نفسِ گرم حزیں غالب دل بہ آتش کدۂ طبع سخن دانم سوخت ج ص۲۵

گفتۂ غالب و صہبائیم از جائے ربود روح در قالب شعر ست ز روح دم شاں ج ص۱۵۱

اے[۲] بہ شیوۂ سخنی ہا بہ جہان اکمل خامۂ چامہ سرائے تو بہ گیتی ست مثل ج ص۲۴

بسراغوش غزلے با مزہ شیریں چو عسل غالبا از درِ دہلی سوئے کلکتہ غزل

گر فرستی بہ حریفاں قدرے بہتر ازیں

افسر اسخت زباں لافِ سخن را نہ سزد دُر دلے دردی تو صافِ سخن را نہ سزد

سخن بے مزہ اوصافِ سخن را نہ سزد شہپر زاغ و زغن قافِ سخن را نہ سزد

رد چو سیمرغ بجو بال و پرے بہتر ازیں

---

[۱] دیوان وحید میں قتیل کے ایک مصرع کی تخمیس ہے۔ اور ایک غزل میں ایک مصرع کی تضمین کی ہے۔ اس سے کسی خاص ارادت کا پتا نہیں چلتا۔ چہ حالاست ایں کہ می گوئی نیلا" قتیل کا فرمانے نہ دارد" ص۶۱۔ [۲] پہلے شعر کی تضمین میں بظاہر افسر کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ لیکن دوسرے شعر کی تضمین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کی تائید اور افسر کو ملامت کی ہے۔ عبدالرزاق افسر اصفہانی بڑے بدزبان اور تندمزاج تھے۔ عبدالرحیم دہری نیتم کلکتہ نے ایک فخریہ شعر کہا تھا۔ وہ شعر اور افسر کا جواب دونوں گلزار خلیل میں موجود ہیں۔ عبدد، عبدالرحیم کا عرف تھا۔

حسودِ من سگِ دیوانہ بگزیدش ازاں نازد کہ بیند سوئے نظم من کہ چوں آب رواں ستے (باقی حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

ج کا ضمیمہ[1] جو فریاد کے حالات و کلام پر مشتمل ہے شاد کے بیان کے مطابق (دیباچہ ف صـ۲) خود وحید کا مؤلفہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وحید پر اس کی اشاعت کی ذمہ داری ضرور عائد ہوتی ہے۔ لیکن، اگر وحید نے کسی مصلحت سے حقیقت کو چھپایا نہیں تو اس کے مؤلف ان کے ایک دوست محمد بن عبدالرحیم صفی پوری ہیں۔ ف میں کلکتہ کے جو واقعات درج ہیں۔ ان کے متعلق شاد کا بیان ہے۔

"زمانہ قیام کلکتہ کے حالات جو راقم تحریر کرے گا وہ تو کچھ خود حضرت کی زبانی سنے تھے، اور زیادہ تر وہ۔ مولنا۔ . . . وحید سے سُنے تھے جب تک مولنا زندہ رہے اور جب جب راقم کلکتہ جاتا رہا۔ تقریباً روزانہ مولنا سے ملاقات ہوتی تھی۔ اور ہر ملاقات میں پہروں ہی حضرت کا تذکرہ رہتا تھا۔ اور ہم دونوں آدمیوں کو اس میں خاص دلچسپی تھی" (ف صـ۱۰۴)

وہ خاص بات جو ان کی زبانی بیان کی ہے۔ یہ ہے کہ کور رکور ن[2] (وحید کا حلقہ درس میں حضرت کے ساتھ ایک عرصے تک ساتھ رہا" ف صـ۱۸۷) کی کتاب تاریخ چین فریاد کے زبانی لکچروں پر مبنی ہے۔ بہ قول شاد وحید کا بیان تھا کہ "میں اکثر اس نایاب صحبت میں حاضر رہا ہوں جس سلسلے اور معلومات کے ساتھ حضرت زبانی بیان فرماتے تھے۔ ممکن نہیں کہ کتاب میں ایسی عمدہ عبارت کے ساتھ کوئی بیان ہو" (ف صـ۹۳)

شاد نے ص سے چند سال پہلے ن میں فریاد کے حالات لکھے تھے، غالبًا وہ مؤلف ضمیمہ کے پیش نظر رہے ہوں گے۔ ف میں شاد نے کسی جگہ ن کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن ٹارسن اور کور رکور ن کی شاگردی کا ذکر ص کے حوالے سے کیا ہے۔ (صـ۱۸۷) اور اسکی عبارت بھی نقل کی ہے۔ کلام کے متعلق جو کچھ ص کے حوالے سے لکھا ہے یا جو کچھ اس سے نقل کیا ہے اس کا ذکر آگے آئیگا۔ ص اور ن سے فریاد کا ترجمہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کا ف سے مقابلہ دلچسپ اور سبق آموز ہو گا۔

---

[1] ص مستقل کتاب کے طور پر ج کے ساتھ ۲۰۸ صفحات پر شائع ہوا ہے ۔ ص میں کور کورن کا ذکر ملے گا۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے ف میں ہے۔

(باقی حاشیہ صـ۲۷ کا)　　" ہلا نا شستہ . . . . رابہ . . بشتش صلا نیک　　دہانِ عیدِ دک پر شعر چوں آب دانستے "

جناب ریاض حسن خاں صاحب خیالؔ نے عبدالواحد سیماب مرحوم سے ان کے حالات سنے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عبدالرزاق ایک ایرانی طبیب تھے، بڑے حاذق تھے اور دست شفا رکھتے تھے، مگر تند مزاج تھے، خود بہ خود بھیر پڑتے تھے، کیسا ہی معزز بیمار آئے اس سے خانگی چھوٹے چھوٹے کام بھی لیتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں و چرا کرے، عمائد کلکتہ اُن کی درشت کلامی سنتے تھے اور بُرا نہیں مانتے تھے، ایک ڈپٹی کلکٹر پیچش میں مبتلا ان کے پاس آئے، حال سننے سے پیشتر حکیم صاحب نے کہا کہ چلم بھر کر لے آؤ۔ ڈپٹی صاحب نے حال کہنا چاہا، حکیم صاحب نے جھڑک کر کہا، ترم ساق قلیاں چاک کن۔ چلم بھر لائی تو حال پوچھا، اور کہا کہ کیا کھاتے کو اس وقت جی چاہتا ہے، ڈپٹی صاحب بولے تربوز، حکیم صاحب نے تربوز خود منگوا کر کھلایا اور ایک سفوف دیا۔ کہا کہ "یہیں بیٹھو، اجابت ہونے تو گھر جانا" وہ دوا اکسیر نکلی۔ اجابت ہوئی اور کرب غائب ہوگیا پھر ایک پارسل دیا کہ ڈاک خانے خود جاکر ڈاک میں دے کر گھر جانا۔ حکیم صاحب ایک دن عشرۂ محرم میں اپنے گھر پر بیٹھے ہوئے، وائے حسین، وائے حسین کہہ رہے تھے، تعزیہ سامنے سے گذرا، بول اٹھے کہ سخت . . . بودی ترا کہ گفتہ بود کہ بہ ہفتاد و دو تن با چنیں بادشاہ بزرگ و چندیں ہزار لشکر جرار جنگ و پیکار کنی و پھر وائے حسین کا نعرہ لگانے لگے۔

مختصر از احوالِ میمنت مآلِ ملک الکلام، زبدۃ الانام سید شاہ الفت حسین مولوی قادری عظیم آبادی متخلص بہ فریاد۔ استادِ مصنف بردَ اللہ مضجعہٗ وطیّب منہجہٗ و مہجعہٗ مع بندے از کلام معجز نظام آں سرحلقۂ کملائے والاتمام۔ فریاد تخلص سید شاہ الفت حسین عظیم آبادی ست، خلف سید شاہ نور الحسن خلف سید شاہ محب اللہ، خلف سید شاہ عطاء اللہ بغدادی، از اولادِ حضرت امام ہمام موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سلسلۂ نسبش بہ حضرت محبوب پاک قطب ربانی شیخ عبد القادر جیلانی رضوان اللہ علیہ نیز پیوندند، وازیں جاست کہ خود را مولوی قادری می نویسد۔ مؤرخ گراں مایہ و سخن در والا پایہ است، باستانی تواریخ عرب و عجم بل سائرِ بلاد عالم را سینہ اش گنجینۂ، جمال جہاں آرائے شاہد سخن را طبعش آئینۂ، تقریرش افصح المقال، و تحریرش سحر حلال، آبائے کرام و اجداد عظامش بعہد سیرے گل زمیں صوبۂ بہار بودند، و بہ جاذبۂ علوم ظاہر و باطن مرجع بزرگان و سترگانِ آں طرف دید۔ بعضے از نیاگانش از پیش گاہ سلاطینِ وقت ملقب بہ خجستہ لقب نظام الملۃ بودہ اند۔ فریاد در بعضے از اشعار خودش اشعارے بدیں معنی کردہ۔ حیث قال۔

مرجع شاہان بدند ملک پناہاں بدند
فیض نگاہاں بدند جملہ نیاگان من

لیک ازیں فخر و ناز کرد مرا بے نیاز
ذرّۂ سوز و گداز گنج فراوان من

فریاد در فن انشا و انشا و دانشا ریگانہ و یکتا ست، چنانچہ در قطعۂ طولانی در آں فکر ادب آموزی ہائے خود کردہ چنیں سرائیدہ است۔

تا مدت سی سال بہ زانوئے ادب ہا
در صحبتِ چندیں ادب آموز نشستم

تا از ہم تحصیل بہ غواصِ فکر ست
افتادہ دُر دانہ نایاب بہ دستم

در شیوۂ انشا و ہم انشا دو ہم اشعار
شیرازۂ مجموعۂ تکمیل بہ بستم

واں کہ مسموع افتادہ کہ حضرت فریاد در فنِ سخن شاگرد راجا پیارے لال۔ الفتی دہلی ست، اصلا سرے باراستی ندارد۔ تحقیق ایں ست کہ استفادۂ سخن از خالِ حقیقی خودش سید شاہ وارث علی مرحوم متخلص بہ اشکی کردہ بود۔ نہ از الفتی، و زباں داناں دانند کہ طرز الفتی دیگر ست و چاشنی و لطافت و پاکیزگی و نفاست و دل نشینی و مقبولیت کلام فریاد دیگر۔ کلام بلاغت نظامش بہ زبان فارسی بیشتر و بہ زبان ریختہ کمتر۔ آوردہ اند کہ حضرت فریاد مدت با منشی کاظم علی مرحوم پیشیں میر منشی دار الانشائے گورنمنٹ ہند کہ ادیب تحریر و سخن بے نظیر بودہ و بہتر با میر مہدی خاں مرحوم نبسۂ دختری نواب سید غلام حسین مغفور، مؤلف سیر المتاخرین کہ در بعض علوم مثل جد خود بود، صحبت و محبت ہا داشتہ، و ہموارہ بہ مذاکرتِ علمیہ شعریہ از فیض مصاحبت ایشاں ایں کملاء دانش منداں تمتع ہا یافتہ، گویند کہ میر مہدی خاں مرحوم از پایان کتاب سیر المتاخرین الیٰ ۱۲۳۰ھ ہجری واقعات تاریخی را بہ طور مسودہ جمع کردہ بود۔ و حضرت فریاد ترتیب و تہذیب آں فرمودہ۔ ولیکن آں اجزا بعد از انتقال میر مہدی خاں تلف شدہ۔ فریاد از غایت استغنا و وارستہ مزاجی ہا۔ ہیچ گاہے بہ جمع و تدوین و نظم و ترتیب و حفظ و نگہداشت گفتہ ہائے خود نپرداختہ۔ وازیں جاست کہ اکثرے از آں دُرر غُرر معانی تلف شدہ۔ مثنوی دبستانِ اخلاق بر طرز بوستانِ سعدی شیرازی و مثنوی روضۃ المعانی و مثنوی گنجینۂ عشق۔

و مثنوی طلسم الفت و مثنوی درد دل و مثنوی طلسم جہاں و دیوان فارسی و دیوان اردو و پنج و شش مثنوی ناتمام و دیگر تصنیفات اوست،
از جملۂ ایں ہا دبستانِ اخلاق بہ توجہ و مصارف نواب والاالقاب الحاج سید ولایت علی خاں ایس، آئی، ای، رئیس اعظم عظیم آباد چاپ شدہ
حضرت فریاد سال ہائے دراز بہ کلکتہ مقیم بودہ، چنانچہ در زمانِ نخستین ورودش بدیں شہر نزہت بہر طرح اجرائے فارسی اخبار نامہ مسمیٰ
بہ آئینۂ گیتی نما انداختہ بود کہ در آں وقائع روزگار و سوانح لیل و نہار را بہ نظم و نثر می نوشت، و ہم در آں ایام بودہ کہ عالی جناب مولوی
عبد الرؤف وحید کہ در نظم و نثر فارسی نام استادی بر آوردہ، در عالم کم سالی و تازہ مشقی با بہ شرفِ تلمذ مشرف گشتہ۔ پس در از آں
حضرت فریاد غالباً در اواخر ۱۲۶۴ھ ہزار و دو صد و شصت و چہار ہجریہ بہ مرشد آباد خرامیدہ تا عرصۂ سہ سال کما بیش بہ شغلِ اتالیقی
مرشد زادگان و دیوانی بعضے از ڈیوڑھی ہائے نظامت مشغولی داشتہ، تا آں کہ در حدود ۱۲۶۶ھ شصت و ششم بر ہزار و دو صد ہجریہ بر منصب
نیابت سفارتِ نواب ناظم بنگالہ بہ حضورِ گورنمنٹ عالیہ مامور شدہ، بہ روز عید سعید بہ عطائے خلعت گراں بہا از پیش گاہ نواب ناظم بہادر
ممتاز گشتہ، باز وارد کلکتہ شد، و سالے چند بداں شغل و بعد از آں بہ اشغال دیگر گذرانید۔ خلاصہ حضرت فریاد تخمیناً بیشتی از سی و
پنج سال از عمرِ گراں مایۂ خود بہ کلکتہ بہ سر بردہ۔ و در اواخر اقامتش بہ کلکتہ وزیر السلطان نواب امیر علی خان بہادر وزیر خاص او و مؤلف
امیر نامہ (کہ در حدود ۱۲۸۷ھ شیرازۂ تالیف بستہ) خودش را در آں کتاب تلمیذ حضرت فریاد نوشتہ، و حضرت وے را بہ
حضرت استاذی یاد کردہ۔

بالجملہ بعد از میرزا عبد القادر بیدل و شیخ غلام علی راسخ، ہم چوں شاہ الفت حسین، فریاد از خاک عظیم آباد برنہ خاستہ
ولادتش پنجم رجب المرجب ۱۲۱۹ھ ہزار و دو صد و نوزدہ ہجریہ است و رحلتِ آں مغفور در شہور ۱۲۹۸ھ ہزار و دو صد و نود و ہشت
مطابق ۱۸۸۱ء ہزار و ہشت صد و ہشتاد و یک مسیحیہ در عظیم آباد واقع شدہ، و ہماں جا بہ مقبرۂ آبائے کرام خود مدفون گشتہ، حضرت
وحید قطعۂ چند در ضبط تاریخ وفاتش گفتہ کہ در دیوانش موجود ست۔ فریاد تلامیذ بسیار دارد، ارشد ایشاں در عظیم آباد شیخ مہدی بخش تسلیم کہ
بہ جوار رحمت الٰہی پیوستہ غفر اللہ لہ۔ و نیز سخن ور والا صفات، صاحب التصنیفات و التالیفات، زبدۂ اہل رشاد سید علی محمد شاد، ابقاہ رب العباد
و در کلکتہ مولانائے وحید کہ جوہر نامۂ آئینۂ کمال استاذ خود می باشد و حضرت فریاد یک پسر والا گہر دارد یعنی سید شاہ ہمایوں میرزا المتخلص بہ عفیر
مصنف نمونۂ عشق و نیرنگ عالم۔ چوں علاوہ السنۂ مروجۂ دیار الہندیہ با زبانِ انگریزی ہم آشناست، حالیا از بہر تکمیل تحصیل علوم در آں زبان
و حصول لیاقت بارسٹری نزیل لندن ست۔

در زمانِ بودن فریاد بہ مرشد آباد مسٹر ہنری ٹارنس، ایجنٹ مرشد آباد کہ شوق مفرط بہ علوم و فنونِ مشرقی داشت، از تلمذ فریاد
استفادہ ہا کردہ بود۔ و در زمان بودنش بہ کلکتہ مسٹر جمیس کارکرن نام فرنگستاں نژادے زانوئے ادب دبستانِ افادتش بر شکستہ
بود کہ بہ آں نامے بلند وارد وہ دانی بر آوردہ، اردو مترجم داوری گاہ صدر کلکتہ و صدر اکبر آباد شد، و رسالہ جوہر اخلاق در نظم و نثر
و کتاب تاریخ چیں در نثر اردو بہ دو جلد ضخیم تصنیف و تالیف کردہ۔"
(ضمیمہ)

سید شاہ الفت حسین فریاد | شاہ صاحب مرحوم ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ موضع اساس دیوہرہ ضلع گیا ان کا مولد، سید شاہ نور الحسن خلف

شاہ محب اللہ ان کے والد ماجد تھے، شاہ کلب علی کے (جن کے بھائی شاہ کمال علی کا کمال مشہور ہے) نواسے تھے، ان کے خاندان میں امارت و فقیری ساتھ ساتھ رہی ہے۔ شاہ صاحب باپ کے مرنے کے بعد سترہ برس کی عمر میں عظیم آباد اپنے نانا کے گھر آ کر رہے۔ ایک تو ذہن و ذکا خداداد تھا، اس پر بزرگوں کا ساتھ ہوا تھوڑے دنوں میں استعداد کے ساتھ ساتھ شاعری کی رونق بڑھنے لگی۔ ان کے خاندان کا ادب و لحاظ ہر شخص کرتا تھا۔ اس پر اُن کی ذاتی تہذیب اور خلق خلق نے روز بہ روز ترقی کی۔ آخر اُس وقت کے امرا بھی شاہ صاحب سے بارادت پیش آنے لگے۔ جن امیروں کی صحبت میں جانے کا نام لینا گناہ تھا، وہاں شاہ صاحب کا پہچوال زینت مجلس سمجھا جاتا۔ کتب بینی کا شوق اس مرتبہ بڑھا ہوا تھا کہ سفر ضروریہ پر بھی کبھی مقدم ہو جاتا تھا۔ صحبتوں میں دو چار باتیں کیں اور کتاب دیکھنے لگے۔ یہ ان کی عادت میں داخل ہو گیا تھا۔ تاریخ کی جس قدر اردو فارسی کتابیں مشہور ہیں۔ سب کے مضامین اُن کو ورد زبان تھے۔ سلطنتوں کے سلسلہ در سلسلہ حالات یوں بیان کرتے تھے۔ گویا ان کی آنکھوں کے سامنے گذرے ہیں۔ ہندوستان کے نامی خاندانوں کے حسب و نسب سے تمام تر واقف تھے۔ غرضکہ مؤرخی کے فن تتبع و توفیق پر اُن کو پورا عبور تھا۔

فارسی زبان سے طبعی موافقت تھی، اس لئے اس زبان میں تھوڑی سی محنت کر کے پوری دست گاہ حاصل کر لی۔ ایک تو زبان کی تکمیل دوسرے برشتہ دلی کی چاشنی، اس لئے ان کے کلام کا ذائقہ فارسی جاننے والوں کو از حد پسند تھا۔ غزل گوئی میں اکثر سعدی اور بابا فغانی کے درد بھرے شعروں کو پسند کرتے تھے۔ اور قصیدے میں خاقانی و انوری کو۔ مثنویوں میں بوستاں کی بہار ایسی آنکھوں میں کھپ گئی تھی کہ اس کی تروتازگی کے آگے کوئی رنگ ان کو مطبوع ہی نہ تھا۔

پڑھنے کے بعد پڑھانے کے شوق نے اکثر امیرزادوں کو شاگرد بنا دیا۔ ۱۸۳۲ء میں پہلے پہل انگریزوں کی ترغیب سے اسکول قائم ہوا۔ شاہ صاحب حسب فرمائش و فہمائش کلفت صاحب کے مدرس فارسی زبان کے مقرر ہوئے۔ اور چندے یوں بسر کی۔ فرخ سیر کے زمانے میں مدد معاش ان کے بزرگوں کو بھی ملی تھی، ان کے زمانے تک سب لوگ خاندان کے اسی سے پرورش پاتے رہے۔ بے خبری سے کچھ تو ضبط سرکار ہو گیا۔ اور باقی حصہ ملکی بلیا[1] میں جوڑہ گیا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنی ماموں زاد بہن کو لکھ دیا۔

ترقی جاہ و دولت کے خیال سے شاہ صاحب نے ہگلی اور کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اثنائے راہ میں مرشد آباد دیکھا۔ وہاں کے دو ایک دن کے قیام نے نواب احمد علی خاں سے ملوا دیا۔ شاہ صاحب کی لیاقت دیکھ کر انہوں نے ٹارن صاحب رزیڈنٹ سے تذکرہ کیا۔ ٹارن صاحب ان کے شاگرد ہو گئے۔ اس وسیلے سے مرشد زادوں کی آتالیقی پر بحال ہوئے۔ تین برس تک اس خدمت کو ایسا انجام دیا کہ نظامت کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتہ پہنچے پھر دنوں اس خدمت کا بھی مزہ چکھا۔ آخر کار نظامت کی بے توجہی اور اپنی نازک مزاجی سے استعفا دے کر کلکتہ ہی میں تیس برس گذار دئے۔ وہاں شاہ صاحب نے ایک رئیس زادی سے عقد کر لیا تھا جب انہوں نے انتقال کیا تو عظیم آباد میں آئے۔ اپنے آنے سے کچھ دنوں پہلے اتنے روپے نواب امیر علی خاں بہادر کے پاس چھوڑ دئے تھے کہ اس کے سود سے اوقات بسر ہو جاتی۔ مگر نواب صاحب کے انتقال کے بعد اُن کی امارت میں ایسا انقلاب ہوا کہ اُن روپوں کو بھی تباہی ہو گئی۔ ستر برس کی عمر میں یہ حادثہ سخت جاں کاہ تھا۔ مگر نواب سید ولایت علی خاں صاحب بہادر سی، آئی، ای، کی بہ دولت باقی ایام زندگی اُسی آرام و عزت سے بسر ہو گئے۔

---

[1] حاشیہ ''ن ہ ایک گاؤں ہے''

شاہ صاحب شروع عمر سے صوفی مذہب تھے۔ کبھی کوئی فعل سنیوں کی طرح کرجاتے تھے۔ کبھی شیعوں کی وضع پر مگر آخر عمر میں
یع کرکے بہ حسب وصیت اسی مذہب کے طریقے پر مدفون بھی ہوئے۔

میانہ قد۔ گندم رنگ، دبلے پتلے آدمی تھے، ترکیب لباس میں سادگی کے ساتھ متانت بھی تھی۔ جاڑوں میں اکثر چھینٹ قبا اور کمرخی
ٹوپی زیب سر رہتی۔ گرمیوں میں رنگین دوپٹا سر میں دوپٹا لپٹا رہتا تھا۔ دائمی امراض کی شکایتیں شروع شباب سے آخر عمر تک زبان
ب رہیں۔ یہاں تک کہ ستتر برس کی عمر پاکر ۱۸۸۱ء میں انتقال کیا۔ اور ذوالفقار باغ میں مدفون ہوئے۔

زاد ہائے طبع اگر جمع کئے جاتے تو شاید ہماری اس کتاب کے پورے ایک ورق میں ان کے ناموں کی فہرست ہوتی مگر افسوس ہے
سے جب کلکتہ گئے تو اپنے کل کلام ناقدر عورتوں کو دے گئے۔ کچھ تو یوں ضایع ہو گئے۔ کچھ چوری گئے۔ کچھ شاگردوں کے نام زد کئے
جو کچھ چھوڑ گئے وہ یہ ہیں۔ مثنوی دبستان اخلاق۔ مثنوی روضۃ المعانی، مثنوی گنجینۂ عشق اور ناتمام چھ سات مثنویاں اور ایک
وں کا دیوان اور دس بارہ فارسی کے قصیدے ایک اردو کی مثنوی طلسم جہاں اور ایک اردو کا قصیدہ۔ ان باقی ماندہ تصنیفوں میں
دو تین قصیدے اور ایک مثنوی دبستان اخلاق چھپ گئی ہے۔ باقی والسلام۔ ایک دفعہ کلکتہ میں آگ لگ کر بہت سے تصانیف
ان میں ایک اردو کا دیوان بھی تھا۔ اس کے اشعار کبھی کبھی حسرت و غم کے وقت پڑھ کر اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رلا دیتے تھے
وس ہے کہ اس ڈھب کی ایک غزل بھی پوری ہمارے ہاتھ نہ آئی۔

بابو مہدی بخش تسلیم کو بخیال خود حضرت مرحوم نے ناسخ کے مقابلے کے لئے تیار کیا تھا۔ اور حق یوں ہے کہ اس انداز میں بابو صاحب
وب بیت آزمائیاں کی تھیں۔ لیکن لکھنؤ جانا نصیب نہ ہوا تھا۔ کہ عدم کا سفر اختیار کیا۔ آخر زمانے میں نواب امیر علی خاں صاحب
لم سخن کی امارت اپنی فیاضانہ مزاجی سے عطا فرما گئے۔ امیر نامہ، وزیر نامہ وغیرہ وغیرہ چھاپ کر نواب صاحب بھی شاعر
ہو گئے۔ شاہ صاحب نے شباب کی مشق میں جو غزلیں فرمائی تھیں ان میں کی دو غزلیں یاد ہیں۔ ان کو لکھ دیتا ہوں:

شادؔ نے اپنے مکتوبات[۱] میں لکھا ہے کہ فریادؔ کا کلام جو ان میں ہے۔ اس میں بہت کچھ خود شادؔ کا تصنیف کیا ہوا
ریہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ کم از کم جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ ان کا بیان صحیح ہے۔ فارسی کے وہ اشعار جو دبستان اخلاق
وذ ہیں۔ یا ان سے نقل ہوئے ہیں۔ وہ قطعی طور پر فریادؔ کے ہیں۔ اس کے علاوہ جو فارسی کے شعر ہیں۔ ان کے بارے میں
پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ سطور ذیل سے یہ پتا چلے گا کہ شادؔ نے ان سے کیا کیا لیا ہے۔ ان کے وہ اشعار جو شادؔ نے
ـہ سے نقل نہیں کئے۔ وہ بھی نقل کر دئے جائیں گے۔ اور نظموں کی شان نزول اور نسخوں کا اختلاف
ـرہ بھی بیان کیا جائے گا۔

ص ۱۹۲، ص ۲۲۸، ص ۲۳۱ و ص ۲۳۲، ص ۲۴۲۔

(۱) فریاد کے کلام کا معتد بہ حصہ ضائع ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں ضمیمے کی عبارت نقل کی ہے (دیباچہ ف ص۲)

(۲) شاد نے لکھا ہے (ف ص۱۸۱) کہ وحید نے حالات اور کلام ان کو جہاں تک دستیاب ہو سکا۔ اس کو اپنے دیوان کا ضمیمہ کر دیا۔ انسان کو ایسا ہی استاد پرست ہونا چاہیئے، لیکن ضمیمہ ص۴۷ میں یہ عبارت ہے :-

"..... دل چنیں می خواہد کہ تمامی مثنوی ہائے کامل و ناقص ..... و اگر ہنوز از ضائع شدن با محفوظ است، و تفصیلے ازاں پیش ازیں برشمردہ ام، بہ دست آوردہ شعرے چند از ہر یکے ..... زیب صفحات ایں صحیفہ کردہ شود، لیکن ..... شمارۂ ایں صحیفہ قلیل ست، و اندازۂ آں اشعار ہر چند کم کم برچیدہ شود کثیر، لاجرم بہ مجبوری عطف عنان ازاں وادی نمودم، ہماناں بعد ازیں صاحب عزیمتے دیگر سیما عالی نہمتے از او شد تلامذۂ حضرت وے ہمت بہ جمع و ترتیب کلیاتش بر گمارد ......"

(۳) شاد نے (ف ص۱۱۸) یہ اعتراف کیا ہے کہ مثنوی دردِ دل کے اشعار ضمیمۂ ج سے لیے گئے ہیں۔

(۴) ف ص۱۸۶ پر فریاد کی وفات کا جو قطعۂ تاریخ ہے وہ وحید کا ہے۔ اور ج میں اس کے علاوہ بھی تین قطعے ہیں۔ ایک مصرع جس سے سنہ عیسوی نکلتا ہے یہ ہے :- "غم استادِ بے اندازہ فریاد" ۱۸۸۱ء۔ شاد نے (ف ص۱۸۹) کسی اور شخص کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ جو دیا ہے اس سے ۱۲۹۶ھ نہیں نکلتا۔

(۵) دو اردو کی غزلیں (ف ص۲۱۶) :- "صبحِ ازل سے دل کو غمِ ہجرِ یار تھا" اور "ہم رہوں کے نقشِ پا ہم اثر پاتے نہیں" ان کے متعلق شاد کا بیان ہے :- ذیل کی دو غزلیں ..... وحید ..... نے حضرت کے خلاصۂ حالات میں چھاپی ہیں" یہ صحیح ہے کہ یہ غزلیں ضمیمے میں موجود ہیں لیکن اس سے قبل شاد انہیں نوائے وطن میں درج کر چکے تھے۔

فریاد کے دیوان اردو سے متعلق سطورِ ذیل ضمیمے میں ملتی ہیں۔ "بسیارے از سخن ریختۂ حضرت فریاد ضائع و تلف شدہ علی الخصوص اردو دیوان ..... با بعض دیگر از تصنیفاتش در کلکتہ بہ آتش زدگی بسوخت، ایں جا دو وار دو غزل کہ از ثمرات مشق عالم شبابش می باشد ..... ثبت نماشود" (صرف وہی دو غزلیں وہی ہیں جن کا ذکر آچکا ہے) نوائے وطن میں شاد نے بھی دیوان اردو کے بارے میں یہی لکھا ہے :-

"ایک دفعہ کلکتہ میں آگ لگ کر بہت سے تصانیف جل گئے۔ ان میں ایک اردو کا دیوان بھی تھا۔ اس کے اشعار کبھی کبھی حسرت و غم کے وقت پڑھ کر اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رلا دیتے تھے"۔ لیکن خواجہ محمد شاہ شہرت سے نہ معلوم کیا عداوت تھی کہ ان کے مرنے کے برسوں بعد جب اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی طرف سے کوئی جواب دینے والا نہیں، ان پر یہ الزام لگا دیا کہ انہوں نے فریاد کا دیوان نقل کرنے کے بہانے سے لیا، اور پھر واپس نہ کیا۔ اور ان کی غزلیں اپنے نام سے پڑھتے رہے۔

"ان کے (یعنی تسلیم کے) بہت سے شاگرد تھے، اور ان کے انتقال کے بعد ان میں سے بہت لوگوں نے ہمارے حضرت سے اصلاح لینی شروع کی۔ من جملہ ان کے خواجہ محمد شاہ شہرت کشمیری بھی تھے، یہ ہمارے حضرت کا اردو دیوان بہانہ سواد جز کا صاف کرنے کو لے گئے، ہضم کر بیٹھے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ حضرت دوبارہ عظیم آباد تشریف لائے تھے اور کلکتہ تشریف لیجا رہے تھے۔

ؔ حاشیہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

کہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر چند دن شہرت روپوش رہے۔ حضرت کو تشریف لیجانا ضرور تھا جب آدمی تقاضے کو جاتا تو گھر پر ملتے نہیں، آخر آغا محمد حسین خاں صاحب کو حضرت فرما گئے تھے کہ شہرت سے دیوان لے کر کلکتہ بھیجدیجئے۔ آغا صاحب مرحوم نے بھی کچھ دنوں تقاضا جاری رکھا شہرت نے لکھ دیا کہ مکان میں آگ لگ گئی۔ میرے کلام کے ساتھ حضرت کا دیوان بھی جل گیا۔ مگر چند دنوں کے بعد مشاعروں میں مقطع بدل کر غیر طرح میں حضرت کی غزلیں پڑھا کرتے تھے، لوگوں کو استعجاب ہوتا تھا کہ طرح کی غزل تو اسقدر پھیکی اور غیر طرحی اسقدر بلند، مگر عام لوگوں کو اصلی بھید کیا معلوم۔ ص۵۱ ۔ ایک جگہ تو اس خیالی جہنم پرشاد کو اسقدر غصہ آیا ہے کہ آپے سے باہر ہوگئے ہیں۔

"ہمارے حضرت کا اردو ضخیم دیوان ...... حضرت کے ایک شاگرد نے اپنے نام زد کر لیا۔ وہ بے حیا عمر بھر فریاد کی جگہ شہرت اٹھا اٹھا کر اپنے نام کو مشہور کرتا رہا اور استاد وقت بن بیٹھا۔ اس کے بعد سے اردو شعر گوئی سے تو حضرت کو ایک طرح کا اکراہ ہی ہوگیا تھا، ص۲۰

"مندرجۂ ذیل اشعار اسی غزل کے ہیں جو دیوان مغصوبہ میں داخل تھی سنگی دالان والے مشاعرے میں جب مطلع پڑھا گیا تو آغا محمد حسین خاں مرحوم نے چند شعر اور بھی پڑھے تھے۔ برسر مشاعرہ ٹوک کر کہا کہ یہ غزل حضرت فریاد کی ہے۔

کعبہ و دیر میں جلوہ ہے نمایاں اُن کا دو گھروں کا ہے چراغ اک رخ تاباں ان کا

وعدۂ وصل بتوں نے تو کیا ہے اکثر آگے ان وعدوں کو وہ جانیں اور ایماں ان کا

تیری منزل کے مسافر کا خدا حافظ ہے صرف عصیان و خطا ہے سر و ساماں ان کا"

شہرت کی بے گناہی تو لئے وطن سے ثابت ہے۔ اگر اردو کا دیوان کلکتہ میں جل گیا تو پھر شہرت نے اسے غصب کیونکر کیا۔ مشاعرے کا واقعہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ۱۸۸۸ء میں فریاد کی وفات کے چند سال بعد سید بادشاہ نواب عشرتی نے مشاعرہ کیا تھا، طرح تھی، ایماں تیرا، پیکاں تیرا، اس مشاعرے کی غزلوں کا مجموعہ گلدستۂ عشرتی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں شہرت کی غزل موجود ہے۔ جس کا مطلع وہی ہے جو اوپر نقل ہوا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ گلدستۂ عشرتی کی غزل کی ردیف "اُن کا کی جگہ تیرا" ہے۔ باور نہیں آتا کہ ایک ہی

(حاشیہ صفحہ ۷۸ کا) [1] اس واقعے کو م (ص۱۸۵ و ص۱۸۶۔ ۹ جنوری ۱۹۲۷ء کا خط) میں یوں بیان کیا ہے ...... "اردو کا پورا دیوان محمد شاہ شہرت مردود ازلی نقل کو لے گیا اور چرا بیٹھا۔ ... سنگی دالان کے مشاعرے میں ... اس نے یہ مطلع پڑھا، کعبہ و دیر الخ، ایک دھوم مچ گئی، آغا صاحب سے نہ رہا گیا، ڈانٹا اور کہا کہ تمہاری مجال ہے کہ یہ مطلع کہو۔ شاہ صاحب کا دیوان چرا کر شاعر بنے ہو اور پھر تین شعر اور بھی پڑھے۔ جب حضرت دوبارہ کلکتہ سے گلزار باغ میں تشریف لائے تو میں نے عرض کیا، آب دیدہ ہوکر کہنے لگے کہ میں نے مرزا امان علی ذبیح اور آغا محمد حسین کو تاکید لکھی تھی کہ اس مردود سے جس طرح ہو میرا کلام لے لو۔ اگر روپے کی ضرورت ہو تو جتنا مانگے میں بھیج دوں مگر ان لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ افسوس" ۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ کہا ہے کہ دیوان اس وقت شہرت نے نقل کے لیے لیا جب فریاد دوسری بار کلکتہ سے آئے تھے۔ م سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ جب فریاد پہلی بار کلکتہ سے آئے تھے۔

مطلع مع ردیف کے فرق کے ساتھ ایک ہی شہر کے دو مشاعروں میں پڑھا جائے، اور پھر چھپوا بھی دیا جائے۔

ف مثنوی ا صـ ۲۸۳: "ایں مثنوی ایست کہ مشتمل بر قصّہ ہائے عدالت گستری پیش سلاطین و آغاز ش ز ہنری ٹارنس ...... کردہ شد" جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی اصلی غرض ہی ٹارنس کی مدح تھی "شعرے چند از مثنو مشر ہنری ٹارنس ...... رقم فرمودہ"

ف مثنوی ۲ صـ ۲۸۳ شاد لکھتے ہیں کہ یہ چند اشعار اس مثنوی کے ہیں جو مولوی احمد کبیر کی فرمائش سے لکھی تھی بعض ان مدح بھی کی تھی، جس سے پتا چلتا ہے کہ مثنوی کی غرض ہی مولوی احمد کبیر کی (جو مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے امین تھے) ثنا گستری تھی۔ فرمائش کا ذکر

ف مثنوی ۳ صـ ۲۸۵ "بیتے چند در تعریف سخن از مثنوی گنجینۂ معانی" یہ امیر نامے کی تقریظ سے ماخوذ ہے۔ مثنوی ہے۔ اور کوئی ثبوت اس کا نہیں کہ یہ کسی بڑی مثنوی کا جزو ہے۔

ف مثنوی ۴ صـ ۲۸۵ شاد لکھتے ہیں کہ اس کے تین سو شعر تھے۔ اس کی کیفیت وہی ہے جو مثنوی ۳ کی ہے۔

ف مثنوی ۵ صـ ۲۸۶ شاد نے حسب دستور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کسی بڑی مثنوی کا جزو ہے۔ یہ بھی ۳ و ۴ کی طرح

ف مثنوی ۶ صـ ۲۸۷ " " " " " " " " "

ف مثنوی ۷ صـ ۲۸۸ و ۲۸۹ "حضرت نے ایک کتاب کی تقریظ میں یہ اشعار شروع کئے تھے، وہ ..... بہت بڑھ گ اس پر کئی سو شعر زیادہ کر کے سات سو شعروں کی مستقل مثنوی کر دی۔ اور چند شعر تقریظ کے لئے دے دئے" اس کی تائید جس سے یہ مثنوی بھی تقریظ امیر نامہ[1] میں شامل ہے۔

ف مثنوی ۸ صـ ۲۸۹ و مثنوی ۹ صـ ۲۹۰ شاد نے اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن، یہ بھی تقریظ کا جزو ہیں۔

ف مثنوی ۱۰ صـ ۲۹۱ یہ مثنوی دیباچۂ تاریخ نادری میں ہے۔ شاد نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

ف مثنوی ۱۱ صـ ۲۹۳ " دریکے مثنوی ہا بہ لغت سرآید" یہ بھی مثل مثنوی ۱۰ ہے۔ شاد نے کمال یہ کیا ہے کہ بغیر اظہار کئے ہوئے کہ کچھ اشعار خارج کئے گئے ہیں، درمیان سے وہ اشعار جو خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں ہیں نکال دیئے سنّی گھرانے میں پیدا ہوئے، اور زمانے تک سنّی رہے۔ مرشد آباد سے تعلق پیدا ہونے کے بعد تشیع اختیار کی عقائد کا ذکر شاد کی مصالح کے خلاف تھا۔ خارج شدہ اشعار یہ ہیں۔

چہ اولاد و چہ اصحابش فلک قدر | سپہر داد و دیں را ہر یکے بدر
ابو بکر آں امام پیشوایاں ! | کہ وصف ذات او زینت پایاں
عمر و رکشور دین پادشاہے | بہ زور معدلت عالم پناہے

---

[1] جس میں یہ دیباچہ اور تقریظ امیر نامہ اسی طرح درج ہے جس طرح کہ تاریخ نادری اور امیر نامہ میں ہے۔ شاد نے ان کے مختلف اجزا کو منتشر کر

دلِ عرفاں زغنچاں تازہ باغے | حریمِ زہد را روشن چراغے
بہ دستِ ہر یکے سر رشتۂ کار | بہ پائے پیروی سرگرمِ رفتار
بہ اورنگِ خلافت تاج داراں | در اقلیمِ ہدایت شہریاراں
کفِ دوست جہاں بخشی کشادند | گدایاں را بہ سر افسر نہادند
چناں دادند دادِ عدل و انصاف | کہ شاہیں کرد با گنجشک دل صاف
بہ نورِ دل رہِ ایماں نمودند[ا] ! | سوادِ کفر از دلہا زدودند !

اس مثنوی کا آخری شعر بھی شاد نے نقل نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ مدح ایک کی نہیں بلکہ کئی کی ہو

بہ جانِ ہر یکے باد از یزداں | درود و رحمت و غفران و رضواں

ف مثنوی ۱۲ ص ۲۹۴ جس میں اس کے بارے میں صرف اسی قدر ہے "اشعار مثنوی در دل"

ف مثنوی ۱۳ ص ۲۹۵ و ۲۹۶ شاد لکھتے ہیں کہ سو شعروں کی مثنوی ہے، کسی دوسرے شاعر کی مثنوی کے جواب میں!

یہ مثنوی بھی دیباچے میں ہے۔

ف مثنوی ۱۴ ص ۲۹۶ شاد کا بیان ہے کہ ایک مثنوی کے چند اشعار لکھتا ہوں۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ تقریظ کا جزء دیباچہ تاریخ نادری کا خاتمہ اشعار ذیل پر ہوتا ہے۔ شاد نے نہ معلوم کیوں خارج کر دئے۔

بہ تحریر ایں نامۂ نام دار | کہ ماند بہ گیتی ز من یادگار
دمے خامہ را در گرفتم بہ دست | کہ بر دوئے دل زنگ ہا می شکست
سر و زانوئے فکر در کار بود | دل و داغِ حسرت بہم یار بود
نہ دانم کہ ایں دہر پیماں بہ باد | بہ فکر دل آزار یم چوں نہاد
گر از دل بروں آہ سرد آورم | دلِ عالمے را بہ درد آورم !
بسنجم اگر نغمۂ زاں سرود | پر از نالہ گردد جہاں ہم چو رود
ز پژمردگی ہا دلم برگ ریز ! | ز افسردگی ہا تنم برگ خیز
نہ آں شوخیِ طبعِ رنگینِ من | نہ آں لذتِ حرفِ شیرینِ من
روانم ز بیدادِ چرخِ دو رنگ | چو باغ خزاں دیدہ بے آب و رنگ

[ا] اس کے بعد یہ شعر ہے۔ علی سر چشمۂ فیضِ الٰہی الخ۔ واضح رہے کہ دیباچہ تاریخ نادری کی شرح میں فریاد نے لیے کہ مولوی قادر لکھا تھا۔ شاد نے قادری کو تشیع کے منافی سمجھ کر خارج کر دیا ہے (ف ص ۳۴۵)

به پایان این نامهٔ تازه کار | چو از عام ہجرت نمودم شمار
فزون بر ہزار و دو صد شصت بود | که این نامه پیرایه بست از وجود

قصائد: ف قصیدہ ۱ ص۲۵۶ اشعار ۱، ۲، ۳، ۷، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۲۲، ص میں بھی ہیں۔ شعر ذیل ص میں ہے، ف میں نہیں۔

از تبِ بتخانه ریزم مرکز آتش تبے | آفتابِ صبح محشر ذرهٔ صحرائے من ۔ ص

ف قصیدہ ۲ ص۲۶۴ شاد لکھتے ہیں کہ یہ ایک قصیدے کے چند اشعار ہیں جو کسی کتاب کے متعلق نظم ہوا تھا، یہ قصیدہ تقریظ میں ہے۔ اور بہ ظاہر مکمل۔

ف قصیدہ ۳ ص۲۶۵ شاد نے نہیں بتایا، لیکن یہ بھی تقریظ میں شامل ہے۔

ف قصیدہ ۴ ص۲۶۶ تا ۲۷۰ شاد کا بیان ہے کہ بہت طویل قصیدہ ہے۔ مختصر سے شعر بلا انتخاب لکھ دئے۔ خیال آتا ہے کہ سلمان ساوجی کے جواب میں ہے۔ یہ قصیدہ حتیٰ کہ اس کے متعلق صفحہ ۲۶۹ کے حاشئے پر جو عبارت ہے وہ بھی ص سے ماخوذ ہے۔ ص میں عنوان کی عبارت یہ ہے۔ "از نتیجهٔ قصیدهٔ دیگر به صنعت سجع اہل عجم در منقبت . . . . . که در صفحات سلطان الاخبار کلکته مورخه ہفتم ذی الحجه الحرام ۱۲۶۷ ہجریهٔ قدسیه چاپ شده" ف میں ترتیب غلط ہے۔ اشعار ۲۶ تا ۴۰ اشعار ۴۱ تا ۵۶ کے بعد ہونے چاہئیں۔ ف ص۲۶۸ شعر ۱ کے مصرعِ اول میں 'بہ گیتی سمر' اور ف ص۲۶۹ شعر ۲ کے مصرع ۲ میں 'حرف دخط' ہونا چاہیئے۔

ف قصیدہ ۵ ص۲۷۱ شاد "ساٹھ ستر شعر ہیں" ص صرف اشعار ۱ تا ۴، ۱۱، ۱۵، ۱۶ درج ہیں۔ اسمیں لکھا ہے کہ پچاس شعر ہیں

ف قصیدہ ۶ ص۲۷۲ کل اشعار ج سے ماخوذ ہیں۔ لیکن ص میں یہ نہیں کہ بر سر دربار پڑھا تھا۔ اور آغا مرزا شیرازی نے وہیں تعریف کی تھی۔ ف س۔ میں لارڈ ہارڈنگ سے ذاتی تعلقات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، ص میں اس کے متعلق کچھ مرقوم نہیں

ف قصیدہ ۷ ص۲۷۳ شاد نے اعتراف کیا ہے کہ امیر نامہ کی تقریظ میں ہے۔

ف قصیدہ ۸ ص۲۷۵ ماخوذ از ص۔

قطعات: ف قطعہ ۱ ص۳۳۵ "ایک علمی مضمون کا سرنامہ" ہے۔ ص۔ یہ کسی علمی مضمون کا سرنامہ نہیں۔ تقریظ کا جز ہے اور اس پر بہ طور عنوان لفظ 'رباعی' لکھا ہے۔

ف قطعہ ۲ ص۱۲۳۶ شاد 'ایضاً' (اس سے کیا مراد ہے؟)۔ ص۔ یہ بھی تقریظ میں ہے۔ ص میں ایک قطعہ دعائیہ ہنری مارنس سے متعلق ہے۔ شاد نے نقل نہیں کیا۔

تا بتابد مہر و مه بر آسماں | نیّرِ اقبالِ او تاباں بود

س ص میں یہ تیسرا شعر ہے۔

تا بخندد غنچہ در باغ جہاں	صبح دولت از دمش خنداں بود
تا بیاراید فلک بزم نشاط	در کف او ساغر دوراں بود
تا کہ باشد عشق را ما وا بہ دل	جائے او اندر دلِ سلطان بود
تا کہ بہرام ست در میدانِ چرخ	تیغ او روشن گرِ میدان بود
تا کہ باشد عرصۂ عالم فراخ	توسنِ چرخش بہ زیرِ راں بود
تا وجودِ عقدہ و ناخن بہ دہر	مشکلِ عالم از و آساں بود
تا کہ محتاج دوا باشد مرض	درد ہا را لطف او درماں بود
مدح گوئے او ز ناسازیِ دہر	گر بہ ساماں نیست باساماں بود

رباعیات:۔ ف ص۳۳۶ "رباعیوں کا مجموعہ طبع معدوم ہوگیا۔۔۔۔۔۔ ایک طویل مضمون کے افتتاح میں فرماتے ہیں:" دو رباعیاں جو شاد نے نقل کی ہیں۔ وہ تقریظ کی ابتدا میں ہیں۔ ص میں مجموعۂ رباعیات کا ذکر نہیں۔ ف ص۳۳۷ 'مداد خامہ' کی جگہ 'مداد و خامہ' ص میں ہے۔

فارسی غزلیں: ف میں ص۲۳۵ سے ص۲۴۴ تک جتنی غزلیں ہیں (بہ استثنائے "باد دست ہر چہ دوست نمود اختیار ماست") ص سے ماخوذ ہیں۔ ص۲۴۲ کی غزل "چراغِ دودمانِ آفرینش" حافظ احمد کبیر کی مدح میں ہے۔ شاد نے اسے بیان نہیں کیا۔ ص میں مقطع کی جگہ یہ شعر ہے:-

بہ ایں خوبی سخن از کس نیاید	از در دشن بیانِ آفرینش

ف میں ص۲۴۴ پر ایک غزل ہے، اس کا ایک شعر جو ص میں ہے ف میں نہیں:-

لب جاں بخشِ جانانم دہد جاں در تنِ بے جاں	مریضم را مسیحائے اگر باشد ہمی باشد

ص اور ف کے اختلافات حسب ذیل ہیں۔ ف ص۲۳۵ بیداد سر گرانی = ص بیداد و سر گرانی۔ ف میں ایک مصرع بہ طور نسخہ دیا ہے۔ یہ ص میں نہیں۔ ف نیا زتست = ص بہ نازِ تست ف ص۲۳۹ خوشیتن = ص آدمی ف ص۲۴۳ ایں جا = ص میں پوری غزل میں ردیف آں جا ہے۔ ف ص۲۴۴ ابر سفید = ص ابرے سپید۔

افسانہ و محاضرات

"وہ گلیاں یاد آتی ہیں"

از جناب سید ظہیر الدین حسن صاحب ایم اے (عثمانیہ)

میں نے پہلی بار اسے گلی کے اس موڑ پر دیکھا جہاں میرے مکان کے بازو سے گلی مڑ کر مسجد کی طرف جاتی ہے، اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت وہ ہلکے آسمانی رنگ کی مہین ساڑی پہنے تھی جس کے آنچل پر سرخ کنارہ کی گوٹ تھی۔ میں اکیلا ہی گھر کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ وہ مڑی اور جب مڑ کر گلی میں جانے لگی اس کی ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر پڑی یہ معلوم نہیں کہ کیوں لیکن اس کی چال کچھ سست ہوگئی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے اپنی ساری کا نچلا حصہ بل کھاتے ہوئے کمر پر کھینچا۔ رخساروں پر ہلکی سی سرخی آئی اور پھر فوراً زود۔ شوخ اور دلربا آنکھیں جو بے انتہا خوبصورت تھیں کئی بار اوپر کو اٹھیں اور اٹھکر گر گئیں۔ اس کی خوبصورتی میں کسے شبہ ہو سکتا تھا۔ راستہ چلنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوتا ہوگا۔ جو چلتے چلتے مڑ کر دوبارہ دیکھنے کے باوجود ایک بار اسے اور دیکھنے کی تمنا دل میں نہ رکھتا ہو۔ وہ حسن اور دل آویزی کا ایک ایسا مرقع تھی جس کی ہر ادا میں دل کی پامالی و بربادی کے لئے سامان محشر تھا۔

میں نے آج اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میری نگاہ اٹھی اور اٹھکر اس کے دلربا چہرے پر جم کر رہ گئی۔ میری آنکھوں نے محسوس کیا کہ حباب کی تہ میں پانی کی لہروں کی طرح ساری کے آنچل کے نیچے اس کے سینے میں کئی بار ہلکی سی رزش ہوئی تنفس کی تیزی کے ساتھ سینہ اوپر کو اٹھا اور پھر آنچل کے نیچے دب کر رہ گیا۔ وہ اٹھلاتی بل کھاتی ہوئی سیدھی گلی میں دور تک چلی جاتی ہے۔ اور پھر بہت دور جاکر آنیوالی دوسری موج میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں اسکے نقش قدم دیکھتا رہ گیا۔

شاعروں نے حسن و عشق کے بیان میں بہت کچھ موشگافیاں کی ہیں، چھوٹے بڑے، اور مشہور گمنام اور پھر ان گمنام شاعروں میں بھی شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے گا جس نے ابتدائے عشق یعنی یہ کہ یہ جذبہ یک بیک دل میں کیونکر جاگزیں اور بیدار ہوتا ہے۔ اس کے متعلق نازک سے نازک خیال کا اظہار نہ کیا ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بالکل صحیح طور پر اپنے مقصد کے بیان میں آج تک کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔ خود محبت کیا ہے اس کی شرح کسی سے نہ ہو سکی۔

لکھی جائینگی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خواب جوانی تری تعبیریں بہت

اس لئے محبت کو سوائے سپردگی خویش کے اور کیا

کہا جا سکتا ہے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ جیسا کہ ایک عربی کے مشہور مصری شاعر نے کہا ہے، یہ کہہ دیجئے کہ یہ ایک ناقابلِ فہم حالت ہے۔

حَبَّبْتُكِ ذَاتَ الْخَالِ وَالْحُبُّ حَالَةٌ
اذا عرضت للمرء لم يدر ما هيا (شوقی)

اور پھر اس عشق کی ابتدا جس طور سے ہوتی ہے وہ انسانی دل کی کیفیت کی ایک ایسی حالت ہے جس کے متعلق جگر مرادآبادی نے بہت ٹھیک کہا ہے۔ ؎

کہاں کا واقعہ بس اتنا یاد ہے اب تک
نگاہ مل کے ہٹی تھی کہ دل نشانہ تھا

شاید محبت کی ابتدا جھکی ہوئی نگاہوں کی ایک لرزش اور دل کی دھڑکن سے ہوتی ہو۔ مہینوں گذر گئے لیکن معلوم نہیں کیوں میں یہی گنگناتا رہا۔

"بالم آ ذ بسو مورے من میں"

(۲)

کالج میں دو ماہ کی چھٹی اور وطن میں آم کا موسم ختم ہو گیا۔ پھر ہم تھے اور وہی کالج کی تعلیم، یونین کے جلسے، ہوٹلوں کی چائے بازی اور راتوں میں سینما کی تفریحیں انہی ہنگامہ آرائیوں میں ایک سال اور گذر گیا۔ لیکن اس تعطیل میں گھر نہ جا سکا پوری تعطیل گنگاپور میں جہاں والد صاحب کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ بڑی بے لطفی سے گذری۔ اس کے بعد میرے بی، اے، کا آخری سال تھا۔ امتحان کی تیاری میں پورا سال بڑی تیزی اور مصروفیت کے ساتھ گذر گیا۔ خوش قسمتی سے اس سال بی، اے، کا آخری امتحان دینے کے بعد دو سال کے بعد ایک بار مجھے پھر گھر جانا نصیب ہوا۔

دیہات میں میرا مکان بہت بوسیدہ اور بالکل ہی پرانی وضع کا تھا۔ والد صاحب نے اس مکان کی ترمیم نہیں بلکہ بڑی حد تک از سرِ نو تعمیر شروع کرا دی تھی۔ اور اس وجہ سے اس تعطیل میں ہم سب کو خالہ اماں کے گھر کچھ دنوں بطور مہمان رہنا پڑا۔ جو میرے مکان سے ذرا فاصلہ پر تھا۔

ادھر کئی سال سے یہ میرا گویا اصول سا ہو گیا ہے کہ میں جب گھر آتا ہوں تو سب کے لئے کچھ نہ کچھ تحفے ضرور لایا کرتا ہوں۔ اس سال بھی جب گھر آیا تو بہت سی تحفوں کی چیزیں ساتھ لایا تھا۔ بچوں کے لئے مٹھائیاں، چاکلیٹ، بڑوں کے لئے کپڑے صابون خوشبودار تیل، چھوٹوں کے لئے کھلونے اور کتابیں ساتھ لایا تھا۔ دوسرے دن ناشتہ کے بعد میں نے اپنا بکس کھولا تاکہ چیزیں تقسیم کر دوں۔ اردگرد سارا کنبہ جمع ہو گیا۔ گویا کوئی تماشہ شروع ہو گیا۔ اور پانچ منٹ کے اندر دیکھتے دیکھتے یہ سب چیزیں یوں تقسیم ہو گئیں جیسے جادو کی تھیں کہ غائب ہو گئیں اور بکس خالی ہو گیا۔ جوتے کا وہ ڈبہ جس میں مٹھائی بھر کر لایا تھا خالی ہو گیا۔ میں نے اس خالی ڈبہ کو دور سے سامنے کے دروازہ پر پھینک دیا۔ جس کے اوپر ٹاٹ کا ایک پرانا بوسیدہ سا پھٹا ہوا پردہ لٹک رہا تھا۔ کیسے معلوم تھا کہ پردہ کے پیچھے بجلی چھپی ہوئی ہے۔ جو یوں دفعتاً آنکھوں کے سامنے کوند جائے گی پھر نہ صبر رہیگا اور نہ قرار۔ وہی حسین و دلربا شکل، ندامت و شرمندگی سے لال، عرقِ انفعال میں نہایا ہوا چہرہ دو سال کے بعد یکبیک پھر میری

۱؎ ماہی - ماہیا -

آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ نہ معلوم وہ کیوں اور کیسے پردہ
کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ میری
خالہ اماں کے گھر رہتی ہے۔ شرماتی ہوئی، نرم رفتار صبا کی
طرح وہ بڑے دالان میں چلی گئی جیسے پچھلے پہر رات میں اکثر آسمان
پر ستارہ ٹوٹتا ہے۔ اور ٹوٹ کر تاروں کی دنیا سے غائب
ہو جاتا ہے۔ لیکن روشنی کی ایک لمبی لکیر اپنے پیچھے چھوڑ جاتا
ہے۔ وہ دالان کے اندر جا چکی تھی لیکن دروازہ سے لیکر
دالان تک میری حیران آنکھوں کے سامنے ایک پھیلتی ہوئی
سی روشنی اب بھی معلوم ہو رہی تھی گھر کے سب لوگ کام
میں مصروف تھے، میں اکیلا کھڑا خالی بکس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں
بکس پر تھیں مگر نگاہ میں وہی ایک شکل تھی جو گھوم رہی تھی نہ
معلوم کتنی دیر گذر گئی کہ کانوں میں آواز آئی۔

"آپ میرے لیئے کیا لائے ؟"

متحیر تھا کہ یہ سوال کس نے کیا ؟ میرے تصور کی
شکل جو میری نگاہوں میں خالی بکس کے اندر گھوم رہی تھی
اس سے آواز آئی۔ یا حقیقت میں کسی نے یہ سوال پوچھا۔ بکس
سے نگاہ اوپر اٹھا کر دیکھا تو وہی مجسمہ شعر و شباب نیچی نگاہیں
کئے ہوئے اپنے پورے انداز دلربائی کے ساتھ کھڑی سامنے
مسکرا رہی تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کچھ بولوں اور بالآخر
اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکا کہ

"تمہارے لیئے دل لایا ہوں!"

سامنے چارپائی پر ایک خالی چائے کی پیالی رکھی ہوئی
تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا اور پیالی لیکر باورچی خانہ چلی گئی۔
ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ بار ہا کوشش کی کہ کچھ باتیں ہو سکیں
جب وہ میرے قریب آتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میری
قوت گویائی سلب ہو گئی۔ دیکھتا ہی رہتا اور منہ سے کچھ نہ
کہا جاتا تھا۔

ایک ماہ کے بعد میرا گھر مرمت ہو گیا ہم لوگ اپنے
ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے۔ میرے اس مکان کے مردانہ
حصہ میں ایک اور چھوٹا سا مستقل مکان تھا جسے خلوت کہیے۔

ایک دن ہوا بڑے زوروں پر چل رہی تھی برسات
کا طرب آگیں، نشہ آور موسم شروع ہو چکا تھا۔ مغرب کے بعد
سرد ہوائیں اور زیادہ تند و تیز چلنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
کوئی شدید طوفان آنیوالا ہے۔ طوفان آیا اور ایسا شدید کہ امید دل
کی کشتی اضطراب کی موجوں سے ایسی ٹکرائی کہ مقصود کے ساحل
سے بہت دور سمندر کی طوفان خیز طغیانی موجوں میں تہ و بالا
ہونے لگی ——— یہ زندگی کا طوفان تھا۔ اور دل کا انقلاب

خالہ اماں کے گھر سے کچھ پھل وہ مجھے دینے آئی
——— جب طوفان آتا ہے تو اس کے ہمرکاب تیز ہوائیں
بارش، آندھی، بجلی کی چمک، اور بادل کی گرج بھی ہوتی ہے
——— میں نے سنگترے لیکر میز پر رکھ دیئے۔ پھر ایسا
خاموش کھڑا تھا جیسے پتھر کا مجسمہ۔ وہ میرے دل کے اندر دو
سال سے تھی۔ جس میں نہ معلوم کیا کیا آرزوئیں پل کر جوان ہو
رہی تھیں۔ لیکن آج جب وہ یوں بے حجاب میری پرتمنا آنکھوں
کے سامنے تھی تو زبان پر خاموشی کی لہر اور لبوں پر میرے سکوت
کا قفل لگ گیا تھا۔ اس نے کسمساتے بدن کو چرائے اور کسی قدر
شرماتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے نہیں پہچانتے ہیں ؟"

میری نگاہیں زمین سے اوپر کو اٹھیں لیکن ابھی اس کی بات

ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
میں آپ کو پہچانتی ہوں میں نے آپ کو پہلی بار
گلی کے موڑ پر کھڑے دیکھا تھا۔
دو سال کی مدت گذر چکی تھی لیکن اب دو سال کی
بات پھر ایک بار میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ ایسا معلوم ہوا
کہ اسے گلی کے موڑ پر میں ایک بار مڑتے اور ہلکے آسمانی رنگ کی
ساری کے آنچل کو کمر سے کھینچتے ہوئے دیکھ رہا ہوں جس کے
کناروں پر سرخ گوٹ تھی۔ ایک لمبی سانس کھینچکر میں نے کہا۔
ہاں پہلے پہل میں نے بھی گلی کے موڑ پر ہی تم کو دیکھا
تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ فضا کے ذرہ ذرہ پر شادمانی و مسرت
برسنے لگی۔ مسکراہٹ میں سفید دانتوں کے عکس کی روشنی
اس کے لال لبوں پر پھیل گئی۔ اس کے لب قوس قزح تھے۔
اور جس میں صرف دو ہی رنگ تھے۔ لال اور اس کی سطح پر
صاف دانتوں کے عکس کی پھیلی ہوئی شفاف روشنی۔ ہوا
جو سر شام سے ہی تیز چل رہی تھی اور تیز ہوگئی۔ آسمان پر
ابر کے گہرے ٹکڑوں کے پھیلنے سے سیاہی چھا گئی۔ اور پھر موسلا
دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہوا کے جھونکوں کے زور سے پانی
کی بوچھار برآمدہ میں آنے لگی۔ برسات کے پروانے اڑ اڑ کر
صحن سے میز پر رکھے ہوئے لیمپ پر گرنے لگے۔ میں نے پوچھا۔

اب جاؤ گی کیسے ؟

جب پانی رُک جائیگا۔

تو پھر یہاں تو بھیگ جائینگے آؤ اندر ہی بیٹھیں۔

اندر کے کمرہ کی بڑی کھڑکیوں کے دروازے ہوا کے
زور سے بند ہوجاتے تھے۔ اور پھر دوسری ہوا کے زور سے کھل
جاتے تھے۔ ہوا ایسی شدید تھی کہ جب دروازے کھلتے تو ہوا
اپنے ساتھ پانی کی بھی ایک بوچھار کمرہ کے اندر لا دیتی۔ دراصل یہ
کمرہ برائے نام کمرہ تھا۔ ورنہ یہ تو ایک قسم کا سائبان تھا جسے
ترمیم کے بعد سہ درہ بنا دیا گیا تھا۔ آدھی رات گذر گئی بارش
لگاتار ہو رہی تھی۔ آسمان سے پانی کی اور عرش سے عشرت وکامرانی
کی۔ دماغ عرش پر تھا۔ اور اپنی آنکھیں اس کے تلوؤں سے مل
رہا تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھا۔

خالہ اماں تم کو وہاں گھر میں تلاش کرتی ہونگی ؟

نہیں۔

نہیں کیوں ؟۔

وہ سمجھینگی کہ میں اپنی بڑی بہن کے گھر چلی گئی ہوں۔

اور بہن تمہاری یہ سمجھیں گی کہ تم خالہ اماں کے گھر میں ہو
یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے جملہ کو تمام کر دیا۔ وہ شرما گئی۔ ایک
لمحہ کے لئے اس کی نگاہیں جھک گئیں اور پھر مجھے دیکھ کر مسکرانے
لگی بارش اور زیادہ زوروں پر ہونے لگی۔ ایک بڑا سا پروانہ
صحن سے اڑا اور میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی نازک چمنی سے
اسقدر زور سے ٹکرایا کہ شیشہ کا حباب سا گلوب گرا اور زمین
پر چور چور ہو کر رہ گیا۔

(۴)

ختم تعطیل کے بعد جب کالج آیا تو قانون کی جماعت
میں داخل ہوا۔ لیکن حالات اور میرے افکار کی دنیا بالکل بدل
چکی تھی۔ اب نہ میرے لئے کالج میں کوئی دلچسپی کا سامان تھا
اور نہ یونین میں۔ نہ جلسوں کی شرکت میں مزا آتا تھا۔ اور نہ
اقامت خانوں کے معاشرتی اجتماعوں میں۔ میں ایک تھکا ماندہ
مسافر تھا جس میں اب بھاری بوجھ کو اٹھا کر آگے چلنے کی ہمت
تھی اور نہ طاقت۔ سفر کے دشوار گذار راستوں کی صعوبتوں سے

تھک کر چور ہو گیا تھا۔ آرام کرنے کی خاطر کسی گھنے درخت کے ٹھنڈے سایہ کے نیچے بیٹھ جانا چاہتا تھا۔

یہ قانون کا کلاس گویا میرے لئے ایک قسم کا "الغلطاگاہ" تھا کہ دیکھئے اب منزل کا نشان کہاں ملتا ہے۔ تعلیم پر میں ملازمت کو خواہ وہ ادنیٰ درجہ کی کلرکی کسی محکمہ کے مہتمم کے دفتر کی ہی کیوں نہ ہو۔ ترجیح دے چکا تھا۔ ان ہی الجھنوں میں سوچتے سوچتے چار پانچ مہینے یوں بھی گذر گئے۔ اور اب تو ملازمت کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ حالات بدلتے جا رہے تھے۔ اور میری زندگی کی کتاب کا ورق جلد جلد الٹتا چلا جا رہا تھا۔ اسی درمیان میں مکان سے میرے دوست خلیل کے کچھ ایسے تردد انگیز خطوط آئے جنہوں نے میرے دماغ کے سکون کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دیا ـــــ وہ بہار کی پروردہ ایک غنچہ تھی اور نوشگفتہ۔ جوانی سے گلے مل رہی تھی اب آدرشباب کی تند و تیز شراب پیمانہ میں دو آتشہ بنکر چھلک رہی تھی ـــــ

ـــــ اس کا نام جمیلہ یا جامو تھا۔ وطن سے خلیل کے جو خطوط آتے تھے ان میں زیادہ تر جامو ہی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اور جامو کے متعلق عجیب و غریب باتیں لکھی ہوئی رہتی تھیں۔ جامو سے کون کون مذاق کرتے ہیں۔ کہاں کہاں وہ جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لوگ اسے کیا کیا کہتے ہیں۔ کن کن گاؤں کے نوجوانوں سے اسکی دوستی ہے۔ یہ خطوط مسافرت میں پڑھتا اور وطن سے سینکڑوں میل دور فرقت کی آگ پر تلملا تلملا کر رہ جاتا۔

ایک دن دو بجے کالج سے واپس ہوا۔ واپسی میں خلیل کا ایک بڑا لفافہ ملا جس پر دو آنے کے ٹکٹ چسپاں تھے۔ یہ پانچ ورق کا خط تھا۔ اور جامو کے متعلق شک و شبہ کی نہیں آنکھوں سے دیکھی ہوئی کئی باتیں لکھی تھیں خلیل نے لکھا تھا کہ اس نے بچشم خود ایک بار سر شام مسجد کے پیچھے میدان میں جامو کو منظر کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے سطریں چھوڑ چھوڑ کر خط جلد ہی ختم کر ڈالا۔ لفافہ جیب میں رکھا۔ اور ہوسٹل کے قریب ہی ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا۔ گرم گرم دو پیالی چائے پی۔ اور نہ معلوم کتنے سگریٹ یہاں تک کہ میرے ہاتھ کی دو انگلیاں پیلی پڑ گئیں۔ ہونٹ سوکھ گئے۔ اور حلق بالکل خشک ہو گیا۔ مگر میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا اور لمبے کش کھینچتا غم غلط کرنے کے لئے پے بہ پے بیحساب سگریٹ پیتا چلا جا رہا تھا۔ شرابی جب بہت زیادہ بادہ نوشی کے بعد شرابخانہ سے اٹھتا ہے تو قدم بھاری اور چال لڑکھڑاتی ہے۔ اسی طرح جب میں ہوٹل سے بہت دیر کے بعد اٹھا تو قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اور شفق پر بادلوں کے بے ترتیب سرخ ٹکڑے پھیل کر سیاہی میں غائب ہو رہے تھے بے انتہا پئے ہوئے شرابی کی طرح میرا سر بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں کے پپوٹے بوجھل معلوم ہو رہے تھے۔ سانس گرم تھی، پیاس تھی اور سر میں درد۔ کمرہ آکر میں نے ایک سگریٹ اور جلایا۔ شرابی نشہ میں آجانے کے بعد بھی اکثر شراب پیہم پیتا چلا جاتا ہے۔ سر چکرانے کے باوجود بھی میں سگریٹ پر سگریٹ پیتا چلا جا رہا تھا۔ سگریٹ جب ختم ہوا تو میں نے دروازہ کے قریب کونے میں اسے جلتا ہوا ہی پھینک دیا۔ سگریٹ کونے میں گر کر بھی برابر جل رہا تھا۔ اور جلتے ہوئے تمباکو کی ناگوار بو تمام کمرہ میں پھیلنے لگی۔ سگریٹ بجھا نہیں تھا۔ ادھر اس کے

تبا کو سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور ادھر میرے کلیجہ میں آگ سلگ رہی تھی۔ دروازہ بند کیا۔ شروانی اتاری جیب سے خلیل کا خط نکالا۔ ایک سگریٹ پھر جلایا اور خط پڑھنے لگا پورے خط میں جامو ہی کے متعلق باتیں لکھی تھیں جو نہایت رسواکن تھیں خلیل کے اس خط کے آخر میں زہر میں بجھا جامو کے لئے ایک نشتر بھی تھا۔

ہر لب ہو جس سے واقف وہ جام ہو نہ جائے
اس کستی میں اتنا بھی عام ہو نہ جائے

(۵)

بہرکیف کسی عنوان سے ایک سال اور ختم ہو گیا۔

تعطیل میں وطن گیا۔ دل ٹوٹ رہا تھا۔ دماغ و دل ہزاروں خیالات وشبہات کا جلتا ہوا آوا ہو رہا تھا۔ جس کی راکھ میں رنج و ملال کی چنگاریاں چھپی ہوئی تھیں جو اندر ہی اندر مجھے جلا کر خاک کر رہی تھیں۔ جامو کے متعلق خلیل کے خط سے مجھے جو کچھ باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں ان کی یاد سے جگر کے لختے اُڑ رہے تھے۔ اور دل میں آگ لگ رہی تھی۔

مجھے وطن پہونچکر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جامو اپنی بہن کے ساتھ عرس میں گئی ہوئی ہے۔ چند دن کے بعد دونوں بہنیں گاؤں واپس آگئیں۔ دو دن اور گذر گئے خلیل سے مجھے جامو کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں جن کو سُن سُن کر شروع میں طبیعت کبیدہ خاطر ہوتی جانے لگی اور آخر میں جامو پر غصہ اور نفرت پیدا ہو گئی۔ لیکن کاش کہ ایک بار ہم پھر ایک دوسرے سے مل سکتے۔ گرچہ مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جامو کی وہ تمام فردوسی مسکراہٹیں اور دلربا ادائیں صرف فریب تھیں اور محض تصنع۔ پھر بھی یہ سب کچھ جان کر بھی میں ایک آخری بار اپنے آپ کو اور فریب دینے کی خواہش کو دل میں پرورش کر رہا تھا۔ اگر زندگی بجائے خود ایک سراب ہے۔ اور مسلسل فریب تو پھر کیوں نہ اسے ہمیشہ دھوکہ میں ہی رکھا جائے۔ اگر یہ ایک خیال و خواب ہے تو پھر کیوں نہ اسے تصورات کے خواب سے رنگین بنا کر خوشنما کیا جائے۔ اور یہ اگر محض ایک نمود و نمائش ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس نمائش کی اور زیادہ نمائش کی جائے۔

میں شام کے وقت اپنے چھوٹے مکان کے ویرانہ میں بیٹھا ہوا سامنے نیم کے درخت کو تاک رہا تھا جس کی بڑی شاخیں دیوان خانہ کی چھت پر لٹک کر جھوم رہی تھیں کہ مردانہ دروازہ سے یک بیک جامو آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں اس بت کی طرح خاموش تھا۔ جیسے ہزاروں سال پہلے کسی پہاڑ کے دامن میں بنا کر غار میں رکھ دیا گیا ہو۔ کوئی مذہب کا وارفتہ خواہ اس کی عبادت کو آئے یا نہ آئے۔ لیکن بت ہمیشہ ایک حالت میں خاموش ہے۔ میں بھی ایسا ہی خاموش بیٹھا تھا۔ بت کی آنکھیں بھی خاموش ہوتی ہیں۔ لیکن میری آنکھیں متحرک تھیں۔ جامو میری طرف آرہی تھی۔

فاصلہ کی قربت کے ساتھ میری نگاہیں تدریجاً اوپر نیم کے درخت سے زمین پر جامو کی طرف جھکتی جا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے نزدیک آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے اس نے اپنے آنچل کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ چاہتا تھا کہ کچھ بولوں، دل دھڑک رہا تھا مگر دماغ ایسا معطل کہ میں کچھ سوچ تک نہ رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد آخر ش میں نے کہا۔

کیا ہے جامو ؟

خیریت !

یہ کیا ہے ؟ میں نے اس کے آنچل میں چھپے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

سنگترے ہیں۔ اس نے سنگتروں کو میرے قریب ہی تخت پر رکھ کر پھر کہا۔

آپ کو سنگترے بہت پسند ہیں نا ؟۔

میں چاہتا تھا کہ کہوں کہ ہاں سنگترے تو مجھے پسند ہیں اور اب جبکہ تمہارے لائے ہوئے ہیں تو ناپسند بھی ہوتے تو بھی مجھے پسند تھے۔ لیکن جامو کی طرف سے میرے دل میں جو ایک جذبہ تنفر پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اتنی جرأت نہ دی اور میں صرف یہ کہہ کر رہ گیا۔

ہاں پسند ہیں۔ تم کہاں سے لائیں ؟

عرس گئی تھی۔ !

خیریت آخر عرس میں جانے کی کیا ضرورت ہو گئی۔

دعا کرنے۔

کس خوش نصیب کے لئے۔

آپ کے لئے۔

میرے لئے ؟

ہاں آپ کے لئے۔

کیا دعا ؟

میں نے آنکھیں اٹھا کر غور سے دیکھا تو جامو نیم کے اسی درخت کو تاک رہی تھی جسے کچھ دیر قبل میں تاک رہا تھا۔ اور نرگسی آنکھوں میں آنسوؤں کی دو بوندیں جھلک رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر نہ کہہ سکی کئی بار اس نے مجھے دیکھا اور پھر نیم کو۔ میں اپنے آپ کو بے پناہ پار رہا تھا۔ اور محسوس کر رہا تھا کہ مجھے شکست ہو رہی ہے۔ دل میں تنفر کا جذبہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن اس وقت اگر مجھے اس کا بالکل قطعی یقین بھی ہوتا کہ یہ بھی جامو کی ایک پر فریب ادا ہے تب بھی شاید اس ادا کی تاب مقاومت نہ لا سکتا تھا۔ میں اس کے سامنے اپنے آپ کو پھر پہلے کی طرح بے بس پا رہا تھا۔ سب کو ہار چکا۔ اور اب جو باقی تھا زندگی کی اس بساط پر اس کو بھی ہار جانا چاہتا تھا جس کے سامنے عشق خاموش اور عاجز تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

جامو !

جی !

اس کے ہاتھ کو میں نے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اسی تخت پر بٹھا دیا جس پر میں خود بیٹھا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

جامو !

جی ! اس نے اندرونی اور گہرے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اور کہو کیا حالات ہیں۔

خیریت ہے۔

ہاں خیریت تو میں بھی جانتا ہوں کچھ اور حال سناؤ۔ میں دراصل ان باتوں کو معلوم کرنا چاہتا تھا جو مجھے خلیل کے خطوں سے جامو کے متعلق معلوم ہوتی رہی تھیں تھوڑی دیر کے بعد تکلف کے حجابات کم ہو کر ہم میں پھر ایک سال پہلے کی طرح بے تکلفی ہو گئی۔ جامو ادھر ادھر کی باتیں سناتی رہی درمیان میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ خلیل جامو کے لئے بڑی اذیتوں کا سبب بنا۔ میرے پیچھے جامو سے خلیل نے اپنی محبت کا اظہار کیا اور ایک انگوٹھی بھی نذر کی جسے جامو نے واپس کر دیا۔ اور اب جامو کی بڑی بہن سے خلیل کے بڑے

ایں جس سے جامو کو ایک نامعلوم قسم کا خوف معلوم
ہے۔ تمام باتیں از خود روشنی میں آتی جارہی تھیں۔ سمجھ گیا
ہی جو خطوط لکھے گئے تھے۔ وہ گویا اس کا ہی انتقام تھا۔
نے یہ تمام باتیں اس سادگی و صفائی سے سنائیں کہ تہ کو میں
پہنچتا چلا جارہا تھا۔ باتوں باتوں میں بہت دیر ہوگئی میں نے
دیکھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ جامو سے میں نے کہا۔

جامو بہت دیر ہوگئی ہے۔ گیارہ بج گئے۔

بجنے دیجئے۔ جامو نے جواب دیا۔

گھر نہیں جاؤگی۔

جاؤنگی۔

یا آج یہاں ہی رہ جاؤ۔

جامو یہ سنکر شرمندہ سی ہوگئی۔ نرم اور تر و تازہ
ں پر سرخی سی دوڑ گئی۔ اور پھر یک بیک کھل کھلا کر
پڑی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے تھوڑی
بعد جامو جانے لگی۔ میں اسے دروازہ تک پہنچانے
ب وہ گلی سے جانے لگی تو میں برابر اسی کو تاکتا رہا۔
ں کہ گلی کے موڑ پر پہونچکر وہ دوسری جانب مڑ گئی۔

(۶)

صبح اٹھا تو میرے دیوانخانہ کے سامنے ایک محشر
ا۔ خالہ اماں، میری بڑی بہن، جامو کی بہن نہ معلوم کیا
رہی تھیں۔ کچھ تو یک بیک سوکر اٹھنے سے اور کچھ راتوں
ں کے خیال سے اس ہنگامۂ قیامت کو دیکھ کر سمجھ میں
رہا تھا کہ آخر بات کیا ہے؟ کانوں میں خالہ اماں کے
جامو کی بہن کی چیخ و پکار کی آواز ضرور آرہی تھی۔ مگر
نگامہ میں بات کسی کی بھی پورے طور پر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

خالہ اماں کہہ رہی تھیں .... نالائق ....
.... خاندان کو بدنام .... آزاد ......
..... جامو کی بڑی بہن اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی دونوں
رانوں کو پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی بڑے لوگ ....
کوئی عزت .... رکھو .... غریب
ہیں .... عزت نہیں .... میں اب
معاملہ کی تہہ کو پہونچ گیا۔ رات کی ملاقات کا راز افشا ہوچکا تھا
خلیل نے جامو کی بہن کو پہلے ہی سے بھر دیا تھا۔ یقیناً خلیل ہی
نے کسی نوع سے ہماری رات کی ملاقات کا راز جامو کی بہن سے
کہا ہوگا۔ اور اس طور سے جامو کے خوف کے خواب کی تعبیر پوری
ہوئی۔

شور و ہنگامہ میں دماغ اب بھی اتنا سوچ رہا تھا کہ پانی
سر سے گذر چکا ہے۔ آوازیں سب کی سن رہا تھا۔ سن رہا تھا اور
سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو خالہ اماں
کے پیچھے جامو کھڑی رو رہی تھی۔ جامو کو روتے دیکھ کر میں جو
سوچ رہا تھا۔ اب وہ بھی نہ سوچ سکا۔ میں بیکسی کے عالم میں
خود بھی رو پڑا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ کیا
کھڑے کھڑے یہاں سے کہیں ایک دم بھاگ جاؤں،
یا ان لوگوں سے میں بھی سوال و جواب شروع کردوں۔ اور
پھر اپنی برئیت کا اظہار۔ یا عاجزی کر کے تھوڑی دیر کے
لئے سب کو خاموش کر دوں۔ آخر کیا کروں۔ جامو خاموش
خالہ اماں کی پشت پر کھڑی رو رہی تھی۔ اس کے سرخ
ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور رات میں جاگی ہوئی آنکھیں
لال۔

یونان کی مشہور شاعرہ سیفو نے شاید کہا ہے کہ

زیور

از۔ جناب کاشف ایم۔اے

"اللہ رے اللہ! آج کدھر چاند نکلا ہے۔ جو بی نذیرن ادھر بھول پڑیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ اور (انگلیوں پر گنتے ہوئے) سنیچر، توار، سموار، منگل ——— آج نگوڑا بدھ ہے۔ گن تو پورے چودہ دن ہوئے۔ جب کی گئی گئی آج اٹھواروں کے بعد صورت پر نظر پڑی ہے۔ خدا کے لئے یوں نہ بھول جایا کر نذیرن! بیٹی کم سے کم دوسرے تیسرے تو جھانکی مار لیا کر۔ خدا کی بندی یہی دو گھڑی کا ہنس بول لینا آج کل کی ہول ہول کی زندگی میں انمول ہے۔"

نذیرن مسکرانے لگی ندامت اور شرمساری کا چہرہ بنا کے کہنے لگی، "سنجلی خالہ کیا کہوں میری بات مانو کام دھندوں سے ذرا چھٹی نہیں ملتی۔ ہائے جی تڑپتا ہے کہ کیسے اڑ کر یہاں ایک گھڑی کے لئے آ پہنچوں مگر دہی آگ لگے رات دن کے بکھیڑوں اور جھمیلوں کو! برتن باسن، جھاڑو بہارو، پکانا اور کھلانا سب میرے ہی اکیلے دم پر ہے۔ اور آج کل تو ایسی جان پر آ بنی ہے کہ دم الٹتا ہے۔ بس کاموں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ جانتی ہی ہوگی کہ بتول کی نسبت ناتہ کی بات اب پکی ہوگئی، سمدھیانوں کا لین دین شروع ہوگیا ہے۔ ہونا بھی چاہیے ادھر ان کی بھی اللہ رکھے آنکھ کان میں ایک بیٹی اور ادھر بھی اللہ کے دئے سے اکلوتا لاڈلا!

"خالہ ابھی تو ایک ضرورت سے آئی ہوں۔ بتول کی اماں نے ایک بونٹ، گیہوں ملا ہوا سیدھے میں دیدیا ہے۔ ذرا اپنا چھلنا دو دن کے لئے مجھے دیدو۔ دونوں اناجوں کو الگ الگ کر کے حفاظت سے رکھ دوں۔ دو دن سے چوہوں، مرغیوں اور گلہریوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ سب ناس ہوا جاتا ہے۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے ادھیا دیا ہے۔ بتول کی اماں کے یہاں چھلنا تو ہے مگر اس کے چھید بڑے بڑے ہیں گیہوں نہیں کھاری کے کام کا ہے۔"

سنجلی بی راضی ہوگئیں مگر بی قریشہ (جو دوسرے کھٹولے پر بیٹھی بونٹ چن رہی تھیں) کے چہرے پر ہاں نہیں کے تیور تھے۔

بی قریشہ ——— "یہاں بھی تو ابھی چھلنے کا کام ہے کل ہی تو کھلیان اٹھا ہے۔ سب اناج بھی گھر پہنچ گیا۔ آخر یہاں کا کام کیسے ہوگا؟"

بی سنجلی ——— "خیر گھر ہی کا تو کام ہے، دو روز بعد اپنا کام شروع کرینگے۔ آج بیچاری کو دیدو۔ آخر نذیرن دل میں کیا کہے گی؟"

بی قریشہ ——— "دینے کو میں منع نہیں کرتی۔

رے نگوڑے پٹین میں کتنی جان ہے ۔ یہی سمجھ لو کہ ایک طرف
حصہ نکل گیا تو اس میں جھٹو بڑھی سے لکڑی لگوائی گئی جب
یں تو وہ کام کے قابل ہوا ہے۔ اب ذرا تو کوئی موکو میں اسکی
ہی جان بھی نکل جائے گی ۔"

بی سنجھلی ۔۔۔" بھلا نذیرن کوئی غیر ہے اپنی چیز کی
رح رکھے گی بنائے گی ۔ ارے ماں باپ کے مرجانے کے بعد اب
ں جل کا کون ہے ۔ بہن ہے بھی تو اُلا کوس بنگال میں بیاہی یہاں
ہم ہی لوگ اس کے اپنے یا پرائے ہیں۔ ایک بڑے بھلے میاں
ں بھی تو وہ بھی ہمارے سنو ارے ، نہ خط خطوط ، نہ خیر خبر ہے۔
یری زبان پر تو سو کی ایک ہی آتی ہے کہ نگوڑے ایسوں کا رہنا
رہنا برابر ۔"

بی قریشہ اُٹھیں اور چھلنا جو چکی پر اوندھا یا ہوا رکھا
ٹھانے آئیں ۔ نذیرن کے حوالے کیا مگر پھر بھی اناج کی ڈھکی ہوئی
بھری دکھا دی کہ ہمیں بھی جلدی ہے ۔ دیکھو جلدی کرنا ۔
ں جُمّنی کو اللہ کی قسم دو مٹھیاں بھر کر مرچیں دی ہیں کہ پھر بھی دیا
ہے کہ آنکھیں کھول کے دیکھ لے لال لال ہیں۔ خاک ! دیدہ دلیر
بی ہے کہ مسور کی دال لے گئی اور آج تک واپس کرنے کا
م نہیں ۔"

نذیرن نے چھلنا تو بات بڑھنے کے خیال سے لے لیا
ر سچ پوچھو تو اس کا دل چھلنی ہو گیا تھا۔ بی قریشہ کے مزاج اور تیور
احال تو گاؤں میں سب کو معلوم تھا۔ اس لئے نذیرن نے کبھی ان
توں کا خیال نہ کیا مگر اُسے جو بات آج تیر کی طرح جا کر لگی تھی وہ
ا سنجھلی کی بات تھی ۔

بلا سے وہ میری خیر خبر نہ لیں۔ نہ چٹھی پاتی نہ بھیجیں
ر میری عزت آبرو آج انہی کے دم سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ہاں وہ
مجھے نہیں پوچھتے مگر برے بھلے وقتوں میں انہی کی یاد آڑے آتی
ہے ۔ میری اندھیری اندر تاریک دنیا میں انہی کے دم سے اجالا
ہے ۔ ہائے ! آج میری محبت میں آکے سنجھلی خالہ نے میرے مالک
کو کیا کیا نہیں کہہ سنایا ۔ آنے کو ساری دنیا آتی ہے اور جاتی ہے مگر
جب وہ کبھی سال دو سال میں پھرتے پھراتے اِدھر آنکلتے ہیں تو اپنا
ٹوٹا پھوٹا گھر دروازہ مجھے محل معلوم ہونے لگتا ہے ۔ اپنی خستہ و خراب
اُجاڑ زندگی لہلہاتی ہوئی کھیتی دکھائی دینے لگتی ہے ۔ اور کیا وہ
میرے سامنے آتے ہی مجل سے نہیں معلوم ہوتے ؟ وہ سر جھکا کے
مسکرا ئے بھی جاتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ ان کی آنکھیں بھی نم
ہوئی جاتی ہیں ۔ میں زندگی کی ایسی کمیاب گھڑیوں کو تلخ و تیز
شکایت و حکایت میں کیوں کھو دوں ، میں بھی درد دکھ بھلا دیتی ہوں
اور یہ زندگی کے ساتھ لگے ہی ہوئے ہیں ۔ مگر سنجھلی خالہ تو میری
ہمدرد تھیں انہیں ایسا کہتے ہوئے کچھ بھی میرے سہاگ کا خیال نہ
آیا ۔ آخر ڈھارس زندگی ہی سے بندھتی ہے ۔ کبھی تو دن پھریں گے
یوں دُکھڑا ہی لکھا ہے اور ایسی ہی بگڑی ہوئی قسمت ہے ۔ تو
وہ آکے بھی میرا کچھ نہیں بنا سکتے ۔

اسی طرح کے خیالات میں ڈوبی ہوئی نذیرن چھلنا
لئے اپنے گھر پہنچی ۔

(۲)

مشقت اور جانفشانی نذیرن کی طبیعت ثانیہ ہو گئی
تھی ۔ اُسے زندگی کا سب سے پہلا درس یہی ملا تھا ۔ وہ جب پیدا
ہوئی تھی تو تین سال کے بعد ہی اس کے تین روپے کے ملازم باپ
نے اسی گاؤں اکبر پور میں نیک نامی ، محبت ، اور مروت کی زندگی
گذار کے اپنے بال بچوں کو خدا کے سپرد کر کے یہاں سے عدم کو
سدھارا تھا ۔ وہ جب سیانی ہوئی تو اپنی بیوہ ماں کے ہر طرح کے کام

اناج میں ہاتھ بٹاتی۔ آدھی آدھی رات گئے اُس کی ماں چکی پیستی رہتی اور اسے بھی ساتھ رکھتی۔ اسے اونگھتے دیکھ کر اس کی ماں اس کا منہ دھلاتی، بہلاتی پھسلاتی اور پھر تازہ دم کر کے اس سے کام لیا کرتی۔ وہ تھکنا جانتی ہی نہ تھی۔ کسی کو نہانا ہوا اور دیکھ لیجئے کہ نذیرن کنویں سے پانی بھر بھر کے سر پر انڈیل رہی ہے۔ وہ جس گھر میں گئی اور کوئی نہ کوئی کام ضرور ہی نکل آتا۔ نذیرن! خدا تیرا بھلا کرے ذرا بیٹی آنگن میں بیلے کے پودوں میں دو ڈول پانی دیدے۔ اسے لو آگئی! نذیرن تو بہت دن جئے گی ابھی تیرا ذکر ہی تھا۔ بیٹی یہ لے ہسن، مرچ، پیاز۔ ہے ذرا سل پر رگڑ دے تو تو جانتی ہی ہے نا تیرے چچا کو آج بیٹھے بیٹھے پھلکیوں کی سوجھی ہے۔" ہاں بیٹی! ایک ڈول پانی وضو کے لئے کھینچ دے۔ ثواب ہوگا ہائے عمر اب آخر آخر ہے۔" غرض وہ لڑکپن ہی سے گاؤں کے ہر گھر کے یہاں اسی طرح کام کر دیا کرتی تھی۔ سب کہا کرتے کہ ایسی ہونہار کماسوت بیٹی جس گھر میں جائے گی وہاں من برسے گا۔ جس کے یہاں اس نیک نہاد کے قدم پہنچیں گے اس کی قسمت چمک اٹھیگی۔ ادبار کا منہ کالا ہوگا اقبال آگے قدم لے گا۔

بڑی بہن کی شادی تو مرنیوالے باپ ہی نے اسی جوار کے ایک گاؤں لودی پور میں کر دی تھی۔ اس کا شوہر کلکتہ میں کام کرتا تھا۔ اور بال بچوں سمیت دال روٹی میں خوش تھا۔ مگر نذیرن کی شادی کے وقت نہ جان چھڑکنے والا باپ تھا نہ اس کے گھر میں کسی طرح کی دوسری آمدنی تھی۔ وہی دوسروں کا کوٹنا پیسنا اور کسی طرح بُرے بھلے دوزخ بھر لینا۔ نذیرن کی پھوٹی قسمت دیکھو کہ ماں کے بھی ہوش بجا نہ تھے۔ نیم جان تھی جب اس کی شادی کی بات ٹھہر گئی۔ اس وقت اس کی ماں چارپائی سے اُٹھ کے پانی نہ پی سکتی تھی۔ اس کی ناتجربہ کار بڑی بیٹی نے دوسروں کے رائے مشورے سے اس کے دل کے ٹکڑے کو ایک ایسے گرے پڑے شخص کے گلے میں باندھ دیا جو بعد میں ایک ہاتھ کا لونج ثابت ہوا۔ اور غربت اور عسرت کا یہ حال تھا کہ اس کی کفالت سے معذور تھا۔ اور ستم یہ تھا کہ وہ یہ حالت بھی دیکھنے کیلئے نہ رہ سکی جیسے وہ اپنی امانت کسی امین کے ہاتھ سونپنے ہی کیلئے زندہ تھی۔ ادھر یہ کام بُرے بھلے ختم ہوا اور اُدھر اس نے جنت سفر باندھا۔

(۳)

آخر بتول کی شادی خوب رچی۔ دھوم دھڑکے ہوئے باجا گاجا چنیں چنیں سب کچھ ہوا۔ میراسیں خوش خوش گئیں۔ مامائیں دعائیں دیتی ہوئی لوٹیں۔ نذیرن نے بھی اپنی تن دہی اور جاں سپاری کے صلے پائے ادھر سے انعام ملے اُدھر سے جوڑے آئے۔

اس طرح کا اژدھام کب تک رہتا آخر ایک دن سارے شور اور ہنگامے ختم ہو گئے۔ مگر جس طرح ایک بے پناہ طوفان کے تھم جانے کے بعد ہی ساری فضا پر کامل خموشی اور سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ یا جس طرح انتہائی سیلاب انگیزیوں اور تلاطم خیزیوں کے بعد دریا کی موجیں سُبک خرام ہو جاتی ہیں اُسی طرح تقریب کے ہنگاموں کے بعد یہاں بھی سکوت اور سکون کا عالم طاری ہو گیا۔ زندگی معمولی رفتار سے بھی زیادہ سست معلوم ہونے لگی۔ جو ایسی چہل پہل اور گہما گہمی کے بعد کا قدرتی نتیجہ ہے۔

دن بیتے، ہفتے گذرے، مہینے آئے اور سال ختم ہوا۔ مگر زندگی کے وہی بندھے ٹکے ہوئے اصول تھے جن سے آدمی اکتا جائے اور تھک جائے، ایسے میں بے رنگی اور بے کیفی کے سوا اور کس بات کا اضافہ ہوگا۔ بے کاری اور بے شغلی کے

زمانے میں انسان کو اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ کچھ سوچے۔ فکر و عمل کا ازل سے یہی رشتہ ہے۔ جب کسی کے لئے دنیائے عمل تنگ ہو جاتی ہے تو وہ عرصۂ خیال کو اپنی جولانگاہ بنا لیتا ہے۔ تھوڑا سا ایسا وقت جسے یک گونہ فرصت کہہ سکتے ہیں۔ نذیرن کو جو ملا تو اس کے پردۂ دماغ میں ایسے ایسے خیالات آنے لگے کہ جن کی بشاشت سے اس کے دل کی کلی کھل جاتی تھی۔ بہت سے ہمیشہ اسٹے والے زخم اُسے بھرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

ایک نہایت ہی خوش آئند اور مسرت افزا خیال اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ وہ خوشی کے مارے اپنے کھٹولے پر سوئے سے اُٹھ بیٹھی اور اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے ایک بڑا ہی کمیاب اور نایاب یا شاید گمشدہ موتی مل گیا ہو۔ تصور نے اپنا دامن بڑھایا اور وہ بےخودی میں شاداں و فرحاں اس کے زیر سایہ آگئی۔ اس نے دیکھا ——— ساری دنیا عیش و مسرت کے ترانے گا رہی ہے۔ ساری فضا پر عالم رقص طاری ہے۔ تمام کائنات نقطۂ نشاط میں سمٹی چلی آتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک ہر چہار طرف عیش و طرب کی لہر دوڑ گئی ہے۔

——— کیف و سرور کی یہ حالت اس پر کچھ دیر تک طاری رہی یہاں تک کہ حقیقت اپنی تلخ کامیوں اور زہر سامانیوں کے ساتھ سامنے آگئی اور اپنے ڈراؤنے اور بھیانک ہاتھوں سے اُسے جھنجھوڑ دیا۔

(۳)

نذیرن کا بہنوئی کلکتہ سے لودی پور بال بچوں سے ملنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ بندھو کی ماں نے ایک دن لودی پور جانے کی ٹھانی۔ اکبر پور سے لودی پور بہت دور تھا۔ ماں راہ کی تکلیفیں اٹھائے جائے گی مگر اپنے بیٹے بندھو کا حال تو اس سے کچھ معلوم ہوگا۔

آج دس مہینوں سے اس کے یہاں سے ایک چٹا پرزہ بھی نہ آیا تھا لوگوں سے، کلکتہ آنے جانے والوں سے سنتی کہ بندھو کلکتہ میں مدک کا بری طرح عادی ہو گیا ہے۔ دنیا سے بےخبر پڑا رہتا ہے۔ گھر دروازے کے نام سے اسے چڑھ ہے۔ ماں کے نام سے غصہ کے مارے کھول اُٹھتا ہے۔ ذرا یہ باتیں پورے وثوق کے ساتھ تو معلوم ہوں۔

نذیرن کو جب معلوم ہوا کہ بندھو کی ماں اس کے بہنوئی کے یہاں لودی پور جانے والی ہے تو اسے رات کی سوچی ہوئی ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین موقع مل گیا۔ وہ جھٹ سے بندھو کی ماں کے گھر جانے کے لئے اٹھی۔ اتفاق دیکھو کہ راستہ ہی میں دونوں میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ بندھو کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا کہ میں تمہارے ہی پاس آ رہی تھی۔ گھر آ کے نذیرن نے اس کو پیڑھا بیٹھنے کو دیا۔ اور بہت رازداری کے ساتھ کہا کہ ایک کام کر دو۔ دیکھو یہ پاؤں کے کڑے چھڑے ہیں اور یہ ایک جوڑی کامدار دلی دال جوتی ہے۔ یہ چیزیں مجھے بتول کے بیاہ میں ملی تھیں۔ تم انہیں لیتی جاؤ اور میری بہن کو میری طرف سے سلام کر کے کہنا کہ تیری بہن نذیرن نے دس روپے مانگے ہیں۔ اور اس کی یہ چیزیں رکھ لے، جوتیاں تو پہن لینے کو کہہ دینا مگر ہاں یہ کڑے چھڑے روپیہ دیکر واپس لے لونگی۔ اور یہ جو کا تلخا ہے۔ دولہا بھائی کے ناشتہ کو دیا ہے۔ ان سے بھی کہنا کہ تم بھی جب ہی آتے جب میری دنیا بنی ہوتی۔ آج اس پورے گاؤں میں دیکھو تو میرا کوئی نہیں ہے میں کبھی کبھی اپنا اپنے بیگانے کی پہچان ہے۔ اس کے بعد اس کے آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اسے ماں بھی یاد آئی باپ بھی یاد آیا بندھو کی ماں نے پوچھا کہ یہ دس روپے کیا ہونگے۔ اور بھلا یہ نئی نئی کامدار جوتیاں تم جوتی ہو کے خود کیوں نہیں پہنتیں۔

ان کے رہتے یہ سادی دلی وال پاؤں میں گھسیٹتی پھرنا مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ نذیرن نے کوئی جواب نہ دیا اور کہا تو یہ کہا کہ سب کام اسی طرح کر لینا احسان مانوں گی۔

(۵)

ٹھنڈے ٹھنڈے جانے کے خیال سے بندھو کی ماں صبح سویرے منہ اندھیرے ہی اٹھی۔ لودی پور کی طرف روانہ ہوئی۔ راہ میں بوچا حلوائی، تلک کہار، بوڑھا گوپال دھما یکے بعد دیگرے ملے۔ بندھو کی ماں سے کسی نے "کہاں چچی بھورے بھورے؟ بھور" کہہ کے مزاج پرسی کی۔ کسی نے "ہائے اپنے سپوت سپاٹے کو ہم سے بھی تو پوچھا ہوتا۔ ہم تو کہیں کے نہ رہے۔!" کہہ کے چٹکیاں لیں۔ بندھو کی ماں بھی مناسب جواب دیتی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ پھر سب کے سب کہنے لگے بیچاری بندھو کی کھوج خبر میں نکلی ہے۔ آخر سنسار میں اس کا وہی ایک دھن دولت ہے۔ بوڑھاپے کا سہارا اور آسرا ہے۔

بندھو کی ماں لودی پور پہنچ گئی اس کے ہاتھ پاؤں بڑی آؤبھگت کے ساتھ دھلائے گئے، سستانے کو کھٹولا ملا۔ نذیرن کا بہنوئی اس کے بیوی بچے سب کے سب اس کو گھیر کے بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد بندھو کی صحیح حالت سے اُسے آگاہ کیا گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، وہ پری جگہ تھی دیکھتے ہی دیکھتے خوب روئی جب جی ہلکا ہو گیا اور سب نے دلاسا دیا، صبر کو سمجھایا۔ تو کہنے لگی کہ "بھیا تم ہمارے یہاں کے داماد ہو بیٹے کے برابر ہو، تم اس کے بھائی ہوئے، جالکے اس کی خبر تو لائے یہاں سے کیا کیا کہہ کے گیا تھا۔ کیسی کیسی لڑکپن کی باتیں تھیں۔ اماں فاقے اور دکھڑے کے دن سمجھ لو کہ اب یہاں سے سدھارے، جاتے ہی دیکھنا روپے جھنا جھن برسیں گے۔ چھپر پھاڑ کے جس طرح دھن آتا ہے۔ اسی طرح گھر میں ڈھیریاں لگادونگا۔ میں نے کلیجہ سے چمٹا لیا تھا۔ کہ بیٹا تیرا جینا ہی مجھے بہت ہے۔ تیرے باپ کے سوگ میں تو جان مٹی میں مل گئی اب تیرے اچھے تماشے دیکھنے کو خدا کی درگاہ میں آسرا لگائے بیٹھی ہوں۔ یہاں تو اس کے ایسے لچھن نہ تھے۔ برے کی سنگت میں پڑ کر میرا بچہ بُرا ہو گیا۔ ڈرتی تھی کہ ابھی بھولا بھالا لڑکپن اسے ہے۔ کہیں اوروں کی آئی میرے بچے کے سر پر نہ آجائے۔ بیٹا تم اسے اپنا آدمی سمجھو سمجھاؤ نہ ماننے اُس بگڑے کے کان پکڑ دو۔ سزائیں دو۔ یہاں ہوتا تو مشکیں کستی۔ جب اس داستان سے فرصت ملی تو نذیرن کا سارا پیام اس کی بڑی بہن کو کہہ سنایا۔ پیام کیا تھا ایک مصیبت کی ماری دکھیاری بہن کی درد بھری بپتا تھی۔ سگی بہنیں تھیں۔ خون جوش میں آگیا پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی کہ کتنی دفعہ کہا کہ ارے نادان! چھوٹی بہن کون اور بیٹی کون۔ ہات ماں سے تو یہیں چل آ مگر مرے گی تو ان پر۔ خیالی دنیا میں پہنچ کے اس نے لڑکپن کی طرف پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو ایک چارپائی پر ماں، سرہانے میں نذیرن اور پائنتی میں خود کو بیٹھا دیکھا۔ اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ دنیا تو کیسی تصویر ہے اس کے کتنے رخ ہیں۔؟ روپے دینے کا چلتے وقت وعدہ کیا اور زیور بھی واپس کئے۔ بندھو کی ماں کی زبردستی سے جوتیاں لیں مگر اسی وقت نذیرن کے دولہے کی بے انسی اور بے مروتی کے خیال نے اُسے رولا دیا۔ بڑی مشکل سے کہتے سنتے بندھو کی ماں دو روز رہی۔

(۶)

شام کا وقت تھا۔ پیلے پیلے زرد لباس میں دنیا ملبوس ہو رہی تھی۔ پرندے اپنے جوڑوں کے ساتھ بسیرے لینے کو گھونسلوں

رف چن چلک کے واپس لوٹ رہے تھے۔ کسانوں کے
ں گھنٹیاں بجانے گرد اڑاتے ہوئے تیزی سے گاؤں کی طرف
ے آ رہے تھے۔ نذیرن بیٹھی بیٹھی ڈلی کتر رہی تھی۔ بتول کی اماں
ے یہاں زنانی مردانی محفل میلاد ہونے والی تھی یہ گویا اسی
تیاریاں تھیں۔ کبھی کبھی سروتہ اس کے ہاتھوں میں چلتے چلتے رک
جاتا اور وہ کسی سوچ میں ڈوب جاتی۔ اتنے میں بچوں نے آ کر خبر دی
نذیرن بو دولہا بھائی آئے ہیں۔

مرغیاں گھر میں پلی ہی تھیں اس سے بڑی دعوت
ؤں میں اور کیا ہو سکتی ہے۔ نذیرن کھاتی کھلاتی، اس کے
ے پر اداسی کے بجائے خوشی کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ رگ رگ
ل رہی تھی۔ کبھی ہنس ہنس کے مسالہ سل پر پیسا جا رہا ہے۔
مسکرا مسکرا کے کنوئیں سے پانی لاتی ہے۔ گھر لیپ پوت کر
دن سا کر دیا ہے۔ اب وہ اکیلی بیٹھی مکھیاں نہیں مارتی۔
ں کے لڑکوں کا ہجوم ہر وقت اس کے گھر میں لگا رہتا۔ یہ مدرسہ
فرصت پاتے اور یہیں جمع ہو جاتے۔ اس کے شوہر کو گاؤں
رشتے کی وجہ سے کوئی "فرزند ارجمند" کوئی "اقبال مند"
کہیں سے "قوت بازوئے من" کی آوازیں آتیں۔ کسی
شہ سے "عزیز از جان" کی صدائیں بلند ہوتیں۔ غرض وہاں
وقت قہقہوں کی گونج رہتی۔ وہ ان باتوں کا کبھی برا بھی مان
کبھی ان شوخ شریر لڑکوں سے کھنچ بھی جاتا۔ مگر نذیرن خوش
تی اور اپنے رویے سے گویا لڑکوں کو اور شہ دیتی۔ ہر صبح
آفتاب کی کرنیں نذیرن کو خوشی کی مبارکباد دیتیں۔ اور رات
وقت تارے جھرمٹ باندھ باندھ کر نذیرن کو ہنستے بولتے
ہنستے ہوئے دکھائی دیتے۔

اب سال میں ایک دفعہ تو کم از کم نذیرن کے
شوہر کا ضرور ہی اکبرپور میں پھیرا ہو جاتا، نذیرن نے جہاں بنئے
کے یہاں زیور رکھے اور ایک آٹھ دس دنوں میں دیکھو کہ اسکا
شوہر گاؤں میں موجود ہے۔ بڑی بوڑھیاں مبارکباد دیتیں کہ نذیرن
خدا کی درگاہ میں شکرانہ ادا کر اب تیرے دن پھرے، تیری
رات دن کی فریاد خدا نے سن لی۔

سال ختم ہونے کو تھا۔ گاؤں میں سب پوچھتے کہ نذیرن
اب کے بہت دن ہو گئے تیرا دولہا نہیں آیا۔ نذیرن مسکرا کے
کہتی کہ بس اب دس پندرہ دنوں میں آئے جاتے ہیں۔

دوپہر کا سناٹا تھا نذیرن کے گھر سے رونے کی آواز
آئی۔ پڑوس سے عورتیں گئیں۔ ہائے سر پیٹ رہی تھی زیور چوری
چلے گئے تھے۔ بین کر کر کے زار و قطار روتی کبھی دو ہتھڑ سر پہ
مار لیتی، کبھی خود کو زمین پر دے مارتی، اٹھتی پچھڑ جاتی عورتیں سہارا
دیتیں، سمجھاتیں، کوئی ترس کھا کے کہتیں کہ "ہائے غریب کے گھر کی جمع
بڑھی تھی جڑاؤ گہنے بھی اس کے چاندی کے زیوروں کے سامنے گرد
تھے۔ بھن مثل ہے کہ اپنی دمڑی کے آگے دوسروں کی اشرفی بھی
مات ہے" بتول کی اماں کہتیں "بیچاری کیسے نہیں تڑپے اس کی جہیتی بتول
کے بیاہ کی نشانی تھی۔ زیور رہ جاتے تو یادگار رہتی" —— نذیرن روتی
ہی چلی جاتی تھی

خوش انجام

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شکسپیر کے مشہور ڈرامہ TU WELFTHNIGHT کا اردو ترجمہ

مترجمہ

جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم اے

(۳)

پانچواں سین —— اولیویا کا باغ

سرٹوبی بلش، سراینڈرو ایگوچیک اور فبیں داخل ہوتے ہیں

سرٹوبی ۔ مسٹر فبین جلد آؤ۔

فبین ۔ میں آرہا ہوں، اس پرلطف تماشہ کو ضرور دیکھونگا۔

سرٹوبی ۔ اگر یہ کمینہ گرہ کٹ ذلیل ہو تو کیا تم اس کو پسند نہیں کروگے ؟

فبین ۔ میں تو خوشی کے مارے اچھلونگا۔ اس کمینہ نے مالک سے میری شکایت کردی۔

سرٹوبی ۔ سراینڈرو، کیا ہی لطف ہوگا۔

اینڈرو ۔ اگر وہ ذلیل ہو تو یہ ہم لوگوں کی ذلت ہے۔

سرٹوبی ۔ وہ دیکھو، شریر چھوکری بھی آہی گئی۔

(میریا داخل ہوتی ہے)

کہو، ہندوستان کی قیمتی دھات کیسی ہو۔

میریا ۔ تم تینوں اس درخت کی آڑ میں ہوجاؤ میلوولیو ادھر آدھ گھنٹہ سے وہ دھوپ میں اپنے سایہ کو دیکھ رہا تھا۔ اب یہ خط تو اس کو بالکل ہی احمق بنا چھوڑیگا۔ خاموش ادہیں بیٹھے رہو۔

(خط پھینک دیتی ہے)

اس چارے سے مچھلی پھنسیگی۔

میلوولیو داخل ہوتا ہے۔

میلوولیو۔ یہ سب میری خوش قسمتی ہے۔ نصیبہ جاگ اٹھا۔ میریا نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھکو چاہتی ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اگر وہ کسی کو چاہیگی تو وہ میری ہی صورت و شباہت کا آدمی ہوگا۔ وہ مجھے اپنے خادموں سے زیادہ معزز سمجھتی ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے ؟

سرٹوبی ۔ یہ دیکھو اس مغرور بدمعاش کو ۔

فبین ۔ خاموش! دیکھو وہ اپنی قلغی کیونکر پھیلاتا ہے چونکہ وہ بالکل شاہ مرغ[1] ہو رہا ہے۔

سرانیڈرو ۔ اللہ رے اللہ کاش میں جاکر اس کو ٹھونکتا ۔

سرٹوبی ۔ خاموش!

میلوولیو ۔ میں کونٹ میلوولیو ہو جاؤنگا!

سرٹوبی ۔ لیجے!

سرانیڈرو ۔ پستول سے اس کو اڑا دو۔

سرٹوبی ۔ خاموش!

میلوولیو ۔ اور اس کی ایک نظیر بھی ہے۔ لیڈی آف دی اسٹریچی[2] نے اپنے خادم سے بیاہ کر لیا تھا۔

سرانیڈرو ۔ شرم ہے تجھ پر۔ ملعون۔

فبین ۔ وہ دیکھو کس طرح خیالی خوشی میں پھول رہا ہے۔

میلوولیو ۔ اس کو بیاہنے کے تین ماہ بعد جب میں بیٹھا رہونگا۔ اور جاہ و جلال میرے جلو میں ہونگے۔

سرٹوبی ۔ کاش میں اس کی آنکھ پھر سے پھوڑ دیتا۔

میلوولیو ۔ اور کمخواب کپڑے پہنے رہونگا ۔ اور اپنے فسروں کو پکارتا رہوں گا۔ میں دن کو سو کر چلا آیا ہونگا۔ اور اولیویا ابتک سوئی ہوگی۔

سرٹوبی ۔ مردود جہنم واصل ہو۔ گندھک اور آگ میں اسکو جھونکا جائے۔

میلوولیو ۔ اور تب اپنے تمام جاہ و حشم کے ساتھ میں اپنے افسروں سے کہونگا کہ میرے رشتہ دار ٹوبی کو بلائیں ۔

سرٹوبی ۔ تجھ پر بجلی گر جائے اور تو زنجیروں میں باندھا جائے۔

فبین ۔ خاموش!

میلوولیو ۔ میں اپنے سات نوکروں کو حکم دونگا کہ ٹوبی کو جاکر ڈھونڈ لائیں۔ اسی عرصہ میں اپنا چہرہ خشم آلود بناؤنگا اور شاید اپنی گھڑی کی کنجی اینٹھتا رہونگا یا اپنے کسی قیمتی ہیرے سے کھیلتا رہونگا۔ ٹوبی پہنچے گا اور جھک کر کورنش بجالائے گا۔

سرٹوبی ۔ کیا یہ مردود اب بھی زندہ رہیگا۔ ؟

فبین ۔ خاموشی سے کام لو، خاموشی سے۔

میلوولیو ۔ تب میں اپنا ہاتھ اسکی طرف بڑھاؤنگا۔ چہرہ پر ایک ہلکی سی رعب آمیز مسکراہٹ لاؤں گا۔

سرٹوبی ۔ تب ٹوبی تمہارے ہونٹ پر مکا نہیں ماریگا؟

میلوولیو ۔ اور میں کہونگا "چچا ٹوبی۔ میرے نصیب نے مجھ کو اس لائق بنایا کہ آپ سے یہ کہہ سکوں

سرٹوبی ۔ کیا کہے گا بچے بدمعاش۔

میلوولیو ۔ آپ رندی و بدمستی سے باز آئیں۔

---

[1] ایک جانور ہے جو عام طور سے پیٹرو کہلاتا ہے۔ اس کا گوشت انگریز بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ او رکرسمس یا بڑے دن کے لئے کثیر تعداد میں یہ جانور پالکر رکھتے ہیں۔

[2] ممکن ہے کہ یہاں اشارہ ہو کی طرف جس نے اپنے نوکر سے بیاہ کر لیا تھا۔ مشہور ڈرامہ نویس نے اس نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔

سرٹوبی ۔ دور ہو، کمینے۔

فیبین ۔صبر سے کام لو، نہیں تو سارا تماشہ بے لطف ہو جائے گا۔

میلو ولیو ۔اور آپ اپنا عزیز وقت ایک احمق کے ساتھ ضایع کرتے ہیں"

سر اینڈرو ۔ اچھا یہ میرا ذکر خیر ہو رہا ہے۔

میلو ولیو "اور اس شخص کا نام سر اینڈ ررو ہے"

سر اینڈرو ۔ میں جانتا تھا کہ یہ میرا ہی تذکرہ ہے۔اس لئے کہ بہت لوگ مجھکو اس لقب سے پکارتے ہیں۔

میلو ولیو ۔(خط دیکھ کر) اس کا مطلب کیا ہے۔

فیبین ۔اب یہ الجھنا۔

سر ٹوبی ۔خاموشی سے کام لو۔ اور اس کو خط پڑھنے دو۔

میلو ولیو ۔(خط اٹھا کر) میری جان کی قسم! یہ میری مالکہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ c، U اور T ٹھیک ایسے ہی ہیں جیسے وہ لکھتی ہے۔ اور وہ P کو بڑا کرکے لکھتی ہے۔ بلا شبہ اسی کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے۔

سر اینڈرو۔ اس کے C، U اور T، یہ کیا بک رہا ہے۔

میلو ولیو ۔(پڑھتا ہے) اپنے نامعلوم محبوب کو میں یہ خط اور اپنا سلام بھیجتی ہوں "یہ محاورے ٹھیک اُسی کے ہیں۔ اور یہ کی تصویر، یہی وہ مہر ہے۔ جو وہ خطوں پر چپکاتی ہے ضرور یہ میری مالکہ کا خط ہے۔ آخر اس خط کا مخاطب کون ہے

فیبین ۔ الجھنا

میلو ولیو۔ "خدا جانتا ہے میں پیار کرتی ہوں لیکن کس کو۔ لبو۔ اس راز کو افشا مت کرو۔ کوئی آدمی اس بھید کو نہ جانے"

"کوئی آدمی اس بھید کو نہ جانے" اس کے بعد وہ کیا کہتی ہے "میلو ولیو، تو ہی تو نہیں ہے۔ جسے وہ پیار کرتی ہے۔

میلو ولیو۔ "میں جس پر عاشق ہوں اس کو میرا ناز بھی اٹھانا پڑیگا۔ لیکن خاموشی[1] کی چھری کی طرح میرے دل کو زخمی کئے ہوئے ہے"

میں اس کی نازبرداری اور تعمیل حکم کے لئے تیار ہوں۔ (اب وہ خط کا نثری حصہ پڑھتا ہے)

"اگر یہ تیرے ہاتھ میں پڑ جائے تو خوشی سے گھوم جا۔ میں قسمت اور نصیبہ کے لحاظ سے تجھ سے بلند و برتر ہوں لیکن اس برتری سے گھبرا نہیں، بعض برتر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض برتری اور عظمت حاصل کرتے ہیں، اور بعضوں پر عظمت چپکا دی جاتی ہے۔ تیری قسمت اب کھل گئی اپنی آنیوالی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی ناچیز کینچل پھینک ڈال اور چہرہ پر تازگی لا۔ رشتہ داروں سے نوک جھونک کر، نوکروں پر خفا ہو۔ تیری زبان

---

[1] رومن قرضی قصے کی ہیروئن، سکسٹس ٹارکوینیس اس کے حسن کا دلدادہ تھا۔ اور جب کسی حیلے سے بھی وہ شہوت رانی میں کامیاب نہ ہوسکا تو ایک رات جبکہ حسن و عصمت کی دیوی سوئی ہوئی تھی، ٹارکوینیس نے اس کی عصمت پر شبخون مارا۔ اس باحیا خاتون نے اپنے ایک چھری سے اپنی جان ہلاک کر ڈالی۔

جاہ و جلال کی باتیں ہوں۔ اور ایک غیر معمولی انسان نظر آنیکی کوشش کر۔ یہ نصیحت اس کی ہر جو تجھ پر دل و جان سے فدا ہے۔ یاد کر کس نے تجھکو زرد موزے پہننے کے لیئے کہا تھا۔ اور صلیب نما موزہ بند لگانے کو کہا تھا۔ یاد کر۔ اگر تو بڑا بننا چاہتا ہے تو بن، اور اگر نہیں چاہتا ہے تو ایک خادم بنکر رہ۔ الوداع۔

" خوش نصیب بد نصیب "

بالکل کھلی ہوئی بات ہے۔ میں مغرور بنجاؤنگا۔ دانشمند مصنفوں کی کتابیں پڑھونگا۔ سر ٹوبی کو زیر کرونگا۔ معمولی لوگوں سے ملنا چھوڑ دونگا۔ میں ایک مہذب اور شایستہ انسان بنجاؤں گا۔ بلا شبہ میری مالکہ مجھپر فدا ہے۔ حال ہی میں اس نے میرے زرد موزوں اور صلیب نما موزہ بندوں کو پسند کیا تھا۔ اور وہ اب مجھکو مجبور کرتی ہے کہ ان کو زیب تن کروں، میرے اقبال کا ستارہ چمک اٹھا ہے، میں زرد موزے پہنونگا۔ اور صلیب نما موزہ بند لگاؤنگا۔ اچھا، خط میں کچھ اور بھی لکھا ہے۔

" بالیقین تو جان گیا ہوگا کہ میں کون ہوں، اگر تو مجھکو چاہتا ہے تو یہ تیرے تبسم سے ظاہر ہو۔ تیرا تبسم تجھکو پھبتا ہے۔ اس لیئے میرے پیارے، میرے سامنے مسکرایا کر "

(چلا جاتا ہے)

فیبین ۔ اس پر لطف تماشہ کے ایک حصہ کے مقابلہ میں شاہ ایران کے ہزاروں روپیہ کا وظیفہ بھی میں قبول نہیں کر سکتا۔

سر ٹوبی ۔ میں اس چھوکری سے صرف اس حیلہ و تدبیر کیلیئے بیاہ کر سکتا ہوں۔

سر اینڈرو ۔ اور میں بھی۔

سر ٹوبی ۔ اور جہیز میں ایک ایسے مذاق کے علاوہ اور کچھ بھی نہ مانگوں۔

سر اینڈرو ۔ میں بھی کچھ اور نہیں مانگوں۔

فیبین ۔ یہ دیکھو الو پھنسانیوالی آرہی ہے۔

(میریا داخل ہوتی ہے)

میریا ۔۔ آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا۔ اب جیسے وہ مالکہ کے سامنے آئیگا۔ تو زرد موزے پہنکر آئیگا۔ اور وہ اس رنگ سے نفرت کرتی ہے۔ اور وہ صلیب نما موزہ بند لگائیگا۔ اور وہ اس طرز کو ناپسند کرتی ہے۔ اور وہ مسکرائیگا۔ اور وہ اپنے غم و اندوہ کی وجہ سے اسکو بھی ناپسند کریگی وہ بہت ذلیل ہوگا۔ دیکھنا ہے تو یہ تماشہ آکر دیکھیئے۔

سر ٹوبی ۔ اگر یہ تماشہ دوزخ میں ہو تو وہاں بھی جاؤنگا۔

سر اینڈرو ۔ میں بھی۔

(سب چلے جاتے ہیں)

ماجھی کینا

از ـــــــــ جناب خواجہ عبدالقیوم، ایم۔ اے

نیلے سمندر کی دھڑکتی چھاتی پر اس کی نگاہیں جمی تھیں۔ پانی کی اٹھتی ہوئی لہریں تڑپتی مچلتی ساحل کی طرف بڑھتیں اور اسے تھپیڑے مار کر واپس چلی جاتیں۔ سمندر کی موجیں ناز و ادا کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ انہیں اس طرح سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اُن کھلاڑی بچوں کی تعداد گن رہی ہو۔ ان موجوں سے اس کی گہری دوستی تھی۔ لہریں دور سے اس کے واسطے ایک پیغام لاتیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی راہ دیکھتی رہتی۔ اس کے باپ نے اسے ایک عجیب داستان سنائی تھی۔

روپا! اُدھر جہاں یہ موجیں کچھ مڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ تیری ماں ڈوبی تھی اسوقت تو ڈیڑھ برس کی تھی۔ تیری نانی بھی تیری ماں کو ڈیڑھ برس کی چھوڑ کر اسی طرح اسی جگہ ڈوبی تھی۔ تیری ماں، تیری نانی اور نانی کی نانی سب اسی طرح مری ہیں۔ میں تجھے باخبر کر دیتا ہوں۔ پانی سے دوستی اچھی نہیں، چھوڑ دے ایسے ساتھی کو!

"پانی سے دوستی اچھی نہیں۔ چھوڑ دے ایسے ساتھی کو" کیسی عجیب بات۔ باپ کے پریم بھرے دل کو دکھ پہنچانا مناسب نہیں مگر ایک ماجھی کینا پانی سے دوستی نہ کریگی تو کس سے کریگی؟ اور وہ جگہ جہاں اس کی ماں ڈوبی تھی اور جہاں نانی کی موت ہوئی تھی۔۔ وہ تو اس کا پیارا بھنور تھا۔ اس جگہ موجوں کے رنگ برنگ کے کھیل اس کی زندگی کے عناصر تھے جن سے منہ موڑ لینا اس کے لئے خودکشی سے کم نہ تھا۔ اس جگہ لہروں کا مچلنا کتنا دلکش تھا اور ساتھ ساتھ کتنا بھیانک! اس نے کتنی بار اس جگہ اپنی چھوٹی کشتی کے رقص سے اپنے دل کو بہلایا ہے...... اور اس بھنور میں اس کی پیاری ماں ابدی نیند سو رہی ہے!۔

وہ بول اٹھی "دادا! ماں اور نانی سب شادی کے بعد ہی ڈوبی تھیں نا؟"

"ہاں" اس کے باپ نے کہا۔

"تو میں شادی ہی نہ کرونگی۔ شادی کرونگی تبھی تو ڈوبونگی نا؟"

"پگلی کہیں کی۔ لڑکیاں بھی کبھی کنواری رہتی ہیں؟"

"نہ میں شادی نہ کرونگی۔ میں اپنی دوستی نہیں چھوڑ سکتی دادا"

روپا کے باپ کو روپا کی ماں یاد آگئی۔ کتنی پیاری تھی، مگر تھی وہ اتنی ہی ضدی۔ وہ جانتا تھا کہ روپا کی طبیعت کو وہ نہیں موڑ سکتا۔

آج سمندر کے ساحل پر بیٹھی ہوئی روپا اس پریم بھرے
ی طرف تعمق کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دماغ ایک
ہ کو حل کرنے میں غلطاں تھا۔ دیوا اور سوما دونوں آنے والے
ں نے دونوں کو تول دیا تھا۔

رُوپا سچ مچ روپا ہی تھی۔ گاؤں کا ہر ایک نوجوان
مر مٹنے کو تیار تھا۔ مگر روپا کے لئے تو دیوا اور سوما ہی سب کچھ
ایک دن وہ موٹی سی ایک مچھلی کندھے پر ڈال کر
پنے سر پر مچھلیوں کی ٹوکری رکھ کر چلی جا رہی تھی۔ کندھے
ں رکھے دیوا بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں رُوپا کو
ے پیر تک پی رہی تھیں۔ موجوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
ں کمر دیوا کے دل کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی یعنی اسی وقت
کھانے کی وجہ سے روپا کا ٹوکرا نیچے گر پڑا۔ دیوا دوڑا اور
پر گری ہوئی مچھلیوں کو چن چن کر ٹوکرے میں رکھنے لگا، اس
عرانہ کام میں وہ شاعری کا امتزاج بھی کرتا جاتا تھا کیونکہ
روپا کے حسن کو اپنے اندر جذب کرتا جا رہا تھا۔ روپا بھی دیوا
نبود جسم کے تناسب کو دیکھ کر پھولے نہ سماتی تھی۔ اسے
ر دل ناچنے کیوں لگتا ہے۔ ایک لہر سی کیوں دوڑنے لگتی
۔ یہ جاننے سے وہ ابھی تک قاصر تھی۔

"روپا! تیرا نام......"

"کیا ؟"

"تیرا نام روپا کس نے رکھا ری ؟"

"کیوں ؟"

"اگر میں اُسے جان جاؤں تو ڈیڑھ من کی مچھلی پکڑ
ں پر بھینٹ چڑھاؤں۔"

"واہ رے۔ یہ کیوں ری؟"

"تو روپا ہی ہے سچ مچ۔ اسی لئے" اور دیوا روپا کی
متوالی آنکھوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ روپا کا منہ لال ہو گیا۔

"پاگل مت بن پاگل۔ میں ایسی ویسی نہیں۔"

مگر دیوا یہ سننے والا ہی کب تھا۔ وہ بولا "روپا! اتنی
سندرتا۔ اتنی سندرتا۔ اتنی سندرتا تو کس کے لئے جمع کر کے
بیٹھی ہے ری ؟"

روپا کے ہونٹ سکڑے مگر ہونٹوں پر تھرتھراتے ہوئے
لفظوں کو مجتمع کر کے بولی "اس...... اس بھنور کے لئے!"

رُوپا اور بھنور کی دوستی گاؤں میں کسی سے چھپی نہ تھی
اس لئے دیوا کو اس بات سے تعجب نہ ہوا۔ مگر جس جواب کا
وہ منتظر تھا وہ اسے نہ ملا۔ اور ایسے اچھے موقعہ کو وہ کیونکر ہاتھ
سے جانے دیتا۔

بات یوں تھی۔ دیوا اور سوما دونوں سچے دوست
تھے، ان دونوں کی بے غرض محبت سگے بھائیوں سے کم نہ تھی۔ دونوں
کی زندگی میں جذباتی لہریں اچھلنے لگیں۔ روپا دونوں کے دلوں
کی منوہر رانی بن گئی تھی۔

آج روپا کو دیکھنے کے بعد دیوا بے صبر ہو گیا۔ آج جا کر
وہ سوما سے اس مسرت بھرے لمحہ کا ذکر کریگا۔ مگر اسے کیا معلوم
تھا کہ اسی دن صبح سوما نے روپا کو جال پھینکنے میں مدد دیتے وقت
پریم کی باتیں کی تھیں۔ مگر روپا صرف مسکرا دی تھی، اس نے جواب
کچھ نہ دیا تھا۔ اور سوما بھی اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتا
تھا۔ وہ بولا۔

"روپا! ایک بات کہوں ؟ ناراض تو نہ ہو گی ؟"

روپا جانتی تھی بات کیا ہو گی مگر پھر بھی وہ ان میٹھے لفظ
کو سننا چاہتی تھی اس لئے اپنے بالوں سے پانی کی ٹپکتی بوندوں کو

آنچل سے پونچھتے ہوئے بولی۔

"کہہ تو سہی کونسی بات ہے جسے سنکر میں ناراض ہو جاؤں گی ؟"

"روپا۔ تو مجھے کتنی اچھی لگتی ہے!" کہ تو گیا مگر ایک ساعت کے لیئے وہ لرز سا گیا۔ کچھ دیر بعد بولا۔

"رُوپا! تیرے باپ سے کہوں ہمارا بیاہ کر دے ؟"

رُوپا نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرہ سے ایک عجیب قسم کا احساس جھلک رہا تھا۔ جیسے وہ کسی روحانی کشمکش میں مبتلا ہو۔

وہ بولی "مگن اور کانجی آ رہے ہیں۔ ٹوکرا اُٹھا تو ! سوموار کو تو اور دیوا دونوں اسی وقت اپنی کشتیاں لیکر آجانا۔ ہیں ؟" اور پھر وہ جلدی !۔

روپا کی نظروں میں ایک گتھی تھی جسے وہ سلجھانا چاہتی تھی۔ کس کا پریم قبول کرے اور کسے ناامید کرے۔ دیوا اور سوما ـــــ دونوں کے پریم اس کی نگاہوں کو اس کے دل کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتے تھے۔ وہ کس طرف راغب ہو ؟ اس امر کا فیصلہ اس کی نظروں میں ایک زبردست مسئلہ تھا، ایک کے انتخاب سے دوسرے کو دکھ پہنچتا تھا۔ سوموار کے دن دونوں کو اس نے بلایا ہے۔ مگر ان کو وہ جواب کیا دیگی ؟ ان پیچیدہ خیالات میں پریشان ہونے کے بجائے وہ اپنے باپ ہی سے کیوں نہ رائے لے لے۔ جس کے ساتھ اس کا باپ شادی کرے اسی کے ساتھ وہ زندگی کو منسلک کر دے۔ مگر پتا جی نہ مانے تو ؟ مگر کیا یہ بہتر ہوگا۔ روپا نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ کسی سے شادی ہی نہ کرے گی۔

آج سوموار کا دن ہے۔ روپا جھونپڑ میں نگاہیں مرکوز کیئے بیٹھی ہے۔

روپا کا ٹوکرا اٹھا کر دیوا سوما سے ملنے چلا۔ سوما دیوا ہی کا منتظر تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ روپا والی بات وہ دیوا کو کہہ سنائے۔ اس کے آتے ہی سوما نے داستانِ دل بیان کر دی۔ سننے کے بعد دیوا بولا۔

"سوما! آج تک تو چپ کیوں رہا ؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو روپا سے پریم کرتا ہے تو میں آگے نہ بڑھتا۔ اپنے آپ کو روک لیتا"

"مگر تو بھی کیوں چپ رہا ؟" سوما نے جواب دیا۔

"ہم دونوں نے بھول کی ہے۔ ایک دوسرے سے کچھ نہ چھپانے والے ہم دونوں نے پاپ کیا ہے۔"

"مگر اب علاج ؟"

"علاج ؟ علاج۔ قسمت، سوما! اگر وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے راضی ہو تو تو برا نہ مان اور تجھ سے شادی کرنے کو راضی ہوئی تو میں بُرا نہ مانونگا۔ ہم دونوں کی محبت ہمیشہ قائم رہنی چاہیئے۔ سوما"

"بیشک! اور اگر وہ ہم دونوں کی محبت میں دخل دینا چاہے تو اس سے کہہ دیا جائے۔ روپا! تجھ سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ مگر دیوا! رُوپا۔ رُوپا ہی ہے۔ اگر وہ تیرے نصیب میں لکھی ہے تو یقین جان میں ناراض نہ ہونگا۔ مگر... مگر... میں شادی تو کسی اور سے نہ کرونگا"

"مگر تجھے ایک وچن دینا ہوگا"

"کیا ؟"

"روپا کا پہلا بچہ مجھے دینا ہوگا"

"کیوں ؟"

"کیوں ۔ کیونکہ اس بچہ میں تم دونوں ہوگے، روپا اور تم ! مجھ سے روپا چھین لی جاسکتی ہے ۔ مگر وہ تو تم دونوں کو ساتھ بکڑ لیگا ۔ اگر میں اسے پاسکوں تو بھی کافی ہوگا"

"واہ ! کیا اچھا خیال ! جیسے میرا ہی خیال تم نے چرا لیا"

سومبوار کا دن آیا ۔ دونوں چل دیئے ۔ راستہ میں دونوں باتیں کرتے جا رہے تھے ۔

"دیوا ۔ ہم نے ایک دوسرے کو وچن تو دے دیا ۔ روپا سے پوچھا ہی نہیں ۔ اگر وہ انکار کر گئی تب ؟"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے ؟ اور اگر انکار کر جائے تو ۔ ۔ ۔ ۔ "دیوا نے اس جملہ کو ادھورا ہی رکھا ۔ اور بولا ۔ "ہم کیوں ان باتوں میں پھنسے ۔ اس سے پوچھ لیں ۔ دیکھیں تو وہ کیا کہتی ہے ؟"

جب دونوں کنارے پہنچے تو روپا اس وقت بیٹھی بھنور کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

سورج کی منوہر کرنیں سمندر کے لہراتے پانی سے ٹکرا کر روپا کے منوہر چہرہ پر منعکس ہو رہی تھیں ۔ دھڑکتی ہوئی لہروں پر تھرتھراتی ہوئی روشنی روپا کے چہرہ پر کانپ کانپ کر ایک عجیب رومان پرور سماں پیدا کر رہی تھی ۔ دیوا اور سوما دونوں یوں محسوس کر رہے تھے جیسے وہ پریوں کے کسی کیف آور ملک میں رستہ بھول گئے ہیں ۔

سوما بولا ۔ "روپا ! آج تجھے ہی کہنا پڑیگا ۔ دیکھ ہم دونوں سگے بھائی کے مانند ہیں ۔ میں مورکھ تھا کہ میں نے دیوا سے اپنے پریم کی بات نہ کہی ۔ خیر ۔ مگر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ روپا کا پہلا بچہ اسے دیا جائے گا جو تجھے نہ پا سکے گا ۔ کہو روپا ؟"

روپا سنتی ہی رہی ۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کی روح کہیں بہتی چلی جا رہی ہے ۔ اور وہ اسے ہنس روک سکتی ۔ شادی نہ کرنے کا خیال اس نے کیا ہی کیوں تھا ؟ ہاں وہ دونوں کو ایک سا پریم کرتی ہے ۔ کسے "ہاں" کہے اور کسے "نہ" ۔ مگر جب دونوں کو انکار کرتی ہے تو دونوں کو دکھ ہوتا ہے ۔ ادھر جب سوما نے بچہ کا ذکر کیا تو اس کی اندرونی جلدوں میں کتنی ہلچل مچ گئی ! اس نے سمندر پر نگاہ ڈالی ۔ اس کی لہروں کو دیکھ کر اسے یہ معلوم ہوا جیسے ننھے ننھے بچے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے پکار رہے ہوں اور اس کی طرف دوڑتے چلے آ رہے ہوں ۔

وہ بولی "میری بھی ایک شرط ہے ۔ میں تم میں کسی ایک سے شادی کرونگی ۔ مگر ساتھ رہینگے ہم تینوں ہی ۔ ایک میرا پتی دوسرا میرا بھائی ۔

"پہلا بچہ بھیا کا ۔ ٹھیک ہے نا ؟ منظور ؟"

دونوں کھل اٹھے "منظور ! منظور !"

قسمت کی دیوی کس کی آشا پوری کرتی ہے ۔ دونوں انتظار کرنے لگے ۔ روپا پھر خیالات کی موجوں میں پھنس گئی ۔ دونوں کے دل تو ہلکے ہوئے مگر روپا کا دل ؟ طوفان ! طوفان ! سمندر کی ان بے چین لہروں کی طرف روپا دیکھتی رہی ، دیکھتی ہی رہی بھنور کا خیال آتے ہی اس نے کچھ فیصلہ کر لیا ۔ وہ بولی ۔

"دیکھو ۔ تم دونوں سے میں ایک سا پریم کرتی ہوں ، جو بھنور کہے گا میں کرنے کو تیار ہوں ۔ کود پڑو ۔ بھنور پر جو پہلے پہنچے گا وہ میرا پتی ۔ دوسرا میرا بھائی ۔"

دونوں پاگل ہو اٹھے ، شرط منظور کی گئی ۔ کپڑے اتار کر دونوں سمندر میں کود پڑے ۔ اور ان اچھلتی موجوں پر ان کے دل دھڑک دھڑک کر جھولنے لگے ۔ روپا دیکھتی رہی ۔ کمان سے جس طرح تیر نکل جاتا ہے اسی طرح وہ دونوں بھی اپنی منزل کی طرف چھپٹے کبھی موجوں پر جھولتا ہوا سوما دکھائی دیتا تھا اور کبھی دیوا ۔ روپا کا دل

دھڑکنے لگا۔ اسے یہ فکر ہوئی کہ کہیں وہ ان دونوں کو نہ کھو بیٹھے آج وہ ایک کو پتی بنا لیگی اور دوسرے کو اس انداز سے کبھی پریم نہ کر سکے گی۔ مگر کیا صرف پتنی ہی بن کر اپنا پریم دکھایا جا سکتا ہے۔ بہن کا پریم کیا کم ہے؟ میرا اگر کوئی بھائی ہوتا تو میں اسے کتنا پریم کرتی۔ تھکا ہوا آتا تو میں اس کے سر میں اپنی انگلیاں نچاتی نچاتی اسے سلا دیتی۔ ہاں! ہاں۔ آج مجھے شانتی مل سکے گی۔ آج میں دونوں کو اپنا بنا لونگی۔

سوما اور دیوا سمندر کی سطح پر دو نقطوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے،

دیوا نے سوما کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سوما۔ اتنے بھیانک بھنور تو کبھی نہیں دیکھے؟"

"ہاں آج ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج رُوپا جو وہاں ہماری طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھی ہے؟"

"ٹھیک ہے مگر آج یہ بھنور ہمیں اتنی تیزی کے ساتھ اپنی طرف کیوں کھینچ رہے ہیں؟"

"دیکھ باتیں مت کر پیچھے رہ جائے گا۔ دیوا چل منزل دکھائی دے رہی ہے۔" ایک موج پر چڑھتے ہوئے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سوما نے کہا۔ اس نے ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔ آج موجیں اسقدر تندی کے ساتھ کیوں ہیں؟ موجیں اسقدر پاگل سی کیوں ہو بیٹھی ہیں؟ دیوا۔ ان ہی خیالات میں تھا کہ سوما اس سے تقریباً دس ہاتھ آگے بڑھ گیا سوما آگے بڑھا جا رہا تھا۔ دیوا اسے پکڑنے ہی والا تھا کہ ایک بھنور میں پھنس گیا جب تک سوما اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ وہ چلایا: "سوما رے! روپا تیری! تیری! تو ادھر دیکھ۔ ادھر آ۔ نہیں تو میں ڈوب جاؤں گا۔"

مگر سوما کو جواب دینے کا بھی ہوش نہ تھا کیونکہ وہ خود بھنور کی گرداب میں گھوم رہا تھا۔ دیوا آہستہ آہستہ سوما کے پاس پہنچا۔ سوما ڈوب ہی رہا تھا کہ دیوا نے اُسے اپنے بائیں ہاتھ پر اٹھا لیا۔

"دیوا۔ روپا تیری!"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ اپنی زندگی پر کھیل کر تو یہاں آیا۔ تو آیا پہلے۔ روپا تیری!"

"اگر تو میری مدد کو نہ دوڑا ہوتا تو مجھے ڈوب ہی جانا پڑتا۔ یہ تو میری دوسری زندگی ہے۔ میں روپا کو تجھے سونپتا ہوں"

"چل چل۔ پاگلوں کی سی باتیں نہ کر۔ روپا راہ دیکھ رہی ہو گی۔"

کچھ ہی دیر بعد دونوں کنارے آ لگے۔

"کون ہے میرا بھائی اور کون پتی؟" روپا نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بول اٹھے "یہ"

روپا ہنسنے لگی۔

دیوا نے کہا "روپا تیری شرط کیا تھی۔ جو بھنور پر پہلے پہنچے وہ تجھے پا لے۔ سوما پہلے پہنچا۔ اس لئے وہ تیرا پتی"

"نہیں روپا۔ دیوا نے ساری بات نہیں کہی میں پہلے پہنچا تو ضرور مگر میں ڈوب گیا دیوا نے مجھے نکالا۔ اسلئے جیتا تو دیوا ہی نا؟"

روپا کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ جس مسئلہ کو وہ حل کرنا چاہ رہی تھی وہ ابھی تک حل نہ ہو سکا تھا۔

آخر اس نے ایک حل سوچ لیا۔ اس نے پاس پڑا ہوا

ـب ڈھیلہ اٹھایا اور بولی "بولو گیلا کہ سوکھا؟"

"بول سوما! گیلا کہ سوکھا؟" دیوا نے پوچھا "تیرا گیلا تو
ـیرا سوکھا"

سوما بولا "اچھا میرا گیلا سہی، روپا اچھال تو ڈھیلا"
روپا نے ڈھیلا خوب اونچا پھینکا۔ نیچے گرتے ہی تینوں
دھردوڑے۔

روپا دیوا کے گال پر ہلکی سی چپت لگا کر بولی "بھیا
ـنے تو اچھا پتی میرے لئے ڈھونڈ نکالا رے۔ چل ہم تینوں بھنور
مبارکباد دینے چلیں۔ بھائی، بہن اور پتی"

روپا اور سوما کی شادی ہوگئی۔ دیوا کے دل میں
ـب بے پایاں طوفان سا امڈ آ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا
ـیسے اس نے ایک نہایت قیمتی چیز کھو دی ہو۔ رات کو بہت
ـر تک اسے نیند نہیں آئی۔ روپا! روپا ہی اسے چاروں طرف
ـھائی دی۔

خوابوں کی ایک مالا گوندھی گئی ——— سوما اور روہ
ـجوں پر تیرتے دونوں بھنور کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔
ـچی اونچی لہریں سر اٹھا اٹھا کر ان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ کہیں
ـے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ سوما بولا۔

"دیوا! ایسا تو کبھی نہیں دیکھا۔ کون گاتا ہوگا رے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کون گاتا ہو گا؟"

"تو مانے یا نہ مانے۔ مجھے تو یقین ہے کہ سمندر کی کوئی
ـی بھنور میں آکر اپنا منوہر گیت سنا رہی ہے۔ کسی سنسار باسی کی
آواز نہیں؟"

اسی وقت بھنور میں سے کسی کی میٹھی آواز سنائی دی۔

"دیوا! ادھر تو دیکھ"

دیوا چونک پڑا۔ لہر پر چڑھ کر اس نے بھنور کی طرف نظر
اٹھائی۔ اس نے دیکھا بھنور کی موجوں پر جھولتی ہوئی روپا اس کی طرف
اشارہ کر کے اسے بلا رہی ہے۔ اس کے کانوں پر دو مچھلیاں اس طرح
لٹک رہی ہیں۔ جیسے دو نیلم جھول رہے ہوں۔ ایسی سندر مچھلیاں
تو اس نے کہیں بھی کبھی بھی نہیں دیکھیں۔ کیسی چھوٹی چھوٹی اور کتنی
سندر! روپا کے چہرہ سے ایک عجیب روشنی چمک رہی تھی۔ بولی۔

"دیوا تو میرا ہی ہے ——— میرا۔ ہاں!"

پاگلوں کی طرح دیوا آگے آگے بڑھتا گیا۔ روپا کے پاس۔
اتنا روپ! اتنا نور! رس بھرے نین!۔

اس وقت دیوا نے سنا۔ اسے بلا رہا ہے ہاں کنارے
کی طرف سے۔ کون؟ سوما! سوما۔ وہ چلا رہا تھا۔

"دیوا۔ دیوا۔ میں ڈوبتا ہوں"

دیوا گھبرا گیا۔ وہ دوڑا۔ اس نے دیکھا۔ سوما آخری سانس
لے رہا ہے۔ پھر روپا کی آواز آئی۔

"دیکھ تو میرا ہی ہے۔ میں تیری راہ دیکھوں گی، جلدی
واپس آنا"

مگر دیوا نے بھنور کی طرف دیکھا۔ مگر روپا کہاں؟ بھنور
میں سے ایک بے پناہ شور سنائی دے رہا تھا۔

ایک بڑی سی مچھلی ان موجوں میں سے اٹھی اور پھر
پانی میں سما گئی۔

"کتنا سوؤ گے۔ بھیا؟" روپا نے اس کے بالوں پر
ہاتھ رکھ کر پکارا۔ سوما پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

دیوا اٹھا مگر تمام دن اسے اس خواب کی یاد آتی رہی۔ اس
خواب کی لکیروں کو وہ مٹا نہ سکا۔

قاتل

از

حضرت اسلم آف لاہور

(۲)

اس روز میں نے صاحب سے ایک پاس لے لیا اور چھٹی ہونے سے پیشتر ہی سونیا کو دے دیا۔ اگلے روز وہ مجھے اسی برج میں ملی۔ اور پھر ہر روز برج میں ملاقات ہونے لگی۔ کبھی کبھی میں اسے قلعے سے باہر بھی جاکر مل آتا۔

ایک روز ہم برج میں بیٹھے تھے، سونیا میرے زانوں پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی میں ہاتھ سے اس کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ کچھ پیار محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ اچانک رام سنگھ آ گیا لیکن سونیا اسی طرح لیٹی رہی۔ وہ کہنے لگا۔

دیکھا بے شرم! پکڑ لیا نا آخر؟

بے شرم تو کوئی تیری لگتی ہوگی" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

تم میرے پیچھے آئے کیوں۔

تمہارے کرتوت دیکھنے، رام سنگھ نے جواب دیا۔

دیکھ لئے! سونیا نے غضب آلود نگاہوں سے اسکی طرف دیکھ کر کہا۔

ہاں! وہ بولا۔ تیرے کرتوت تو دیکھ لئے اور تیرے اس عاشق کے کرتوت (کپتان) صاحب کو معلوم ہو جائیں گے

کیا بکتا ہے؟ میں نے غصے سے کہا۔

اس کے جواب میں رام سنگھ نے گالی دی میں نے اٹھ کر اس زور سے اس کے ایک گھونسہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن گرنے کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور چاقو نکال لیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ مجھ پر حملہ کرے سونیا ہمارے درمیان کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔

کچھ شرم کرو۔ لڑتے کیوں ہو۔

یہ کہتے ہوئے اس نے رام سنگھ سے چاقو چھین لیا

رام سنگھ میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

سمجھ لوں گا تم سے۔ اب تو سونیا نے تمہاری جان بچا دی۔

اچھی آؤ! میں نے کہا۔

لیکن سونیا اسے کھینچتی ہوئی ساتھ لے گئی۔ میرا اس روز تو بیچ بچاؤ ہو گیا۔ لیکن میں نے سمجھ لیا کہ رام سنگھ سے کسی روز مجھے نپٹنا ہی پڑے گا۔ اور اس کے لئے مجھے کچھ زیادہ عرصہ انتظار نہ کرنا پڑا۔

سونیا جس برج میں مجھ سے ملا کرتی تھی وہ قلعے کے

ایک غیر آباد حصے میں فصیل کے کنارے پر تھا۔ چونکہ لوگوں میں عام طور پر مشہور تھا کہ برج میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ اسلئے کبھی کوئی اس طرف نہ آتا۔ ایک روز قلیوں کی چھٹی تھی لیکن سونیا نے پچھلے پہر مجھ سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ میں اس کے آنے سے پیشتر وہاں جا بیٹھا۔ وہاں پہونچے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ رام سنگھ آ گیا۔ آج اس نے کچھ پی رکھی تھی۔

سونیا کہاں ہے؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھکر کہا۔

تمہاری بھی تو آنکھیں ہیں دیکھ لو! میں نے بیٹھے بیٹھے کہا۔

اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے گالی کا جواب گھونسے سے دیا۔ پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ میں نے اس کا ٹینٹوا دبایا۔ تو اسکی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اسکی پیٹھ فصیل سے لگی تھی۔ میں نے ٹانگوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ فصیل کے نیچے پتھر تھے اور ان کی درازوں کے بیچ میں سے سرکنڈا اُگ گیا تھا۔ رام سنگھ کوئی ساٹھ فٹ کی بلندی پر سے جو گرا تو سر پھٹ کر بھیجا نکل آیا۔ اب میں نے اس جگہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ چپکے سے وہاں سے نکلا اور بنگلے میں آ کر کام کاج میں لگ گیا۔ اتنے میں کپتان صاحب آ گئے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا صاحب سیدھے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے آواز دی۔ میں اندر گیا صاحب بولے چتر سنگھ! اُدھر پاس تم نے کیسے دیا۔

میں سمجھ گیا کہ رام سنگھ نے بھانڈا پھوڑ دیا ہے، سونیا اور اس کا شوہر رام سنگھ سے مل کر مال گودام کی چیزیں باہر بیچا کر بیچتے تھے، اور یہ ایک بہت سنگین جرم تھا۔ میں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ صاحب کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر کہنے لگا کہ چتر سنگھ۔ تم نے بڑا جرم کیا ہے۔ میں معاف کرتا ہوں، لیکن اب تم فوج میں نہیں رہ سکتے۔ جاؤ۔ میں سلام کر کے باہر آ گیا۔

اور اسی روز اپنا مختصر سا اسباب اٹھوا کر قلعہ سے چلا آیا۔ اور ایک کوٹھری لیکر رہنے لگا۔ اگلے روز جہاں قلی رہتے تھے، میں سونیا سے ملنے گیا۔ وہ اسوقت اتفاق سے گھر میں اکیلی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

مل گئی چھٹی!

ہاں! میں نے کہا اب تو خوش ہو۔

بہت خوش! اس نے ہنسکر جواب دیا۔

خوب! میں نے کہا: میری ملازمت چھوٹی اور تم خوش ہو۔ کیوں؟

اب ہم کھلے ملا کریں گے، اس نے پھر اپنے دلکش انداز سے سر ہلا کر کہا۔

اور میں نے بھی اسی طرح سر ہلا کر کہا۔

اور بھوکے مریں گے۔

بھوکے کیوں مریں گے، ؟ اس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ تم کماؤ گے ہم کھائیں گے۔

کام پر نہیں گئیں آج! میں نے پوچھا۔

چھٹی مل گئی۔ اس نے ذرا آنکھیں میچ کر کہا۔ نکال دیا قلعہ والوں نے۔

اب کب ملو گی۔

جب تم چاہو اس نے پھر اسی طرح ذرا لپک کر اور ہنک کر کہا۔ گھر ملا کروں گی۔

گھر! میں تعجب سے بولا۔ کیا کوئی اور گھر بھی لے رکھا ہے تم نے۔

کیا تمہارا گھر میرا گھر نہیں؟ اس نے جواب دیا۔

ہے کیوں نہیں میں نے کہا۔ کاکا تو نہ روکے گا۔

دیکھو جی! وہ ہنس کر بولی: میرے سوامی کو کانا مت
[illegible]۔ مجھے گُسّہ (غصہ) آتا ہے۔
کانے کو سبھی کانا ہی کہتے ہیں" میں نے کہا، کہاں ہے وہ؟
رام سنگھ سے ملنے کو کہتا تھا۔
قلعے میں! اس نے پوچھا۔
قلعے میں اب وہ جا نہیں سکتا۔ سونیا نے کہا۔ کہیں
[illegible] نے میں ہو نگے۔
خوب گہری چھنتی ہے دونوں میں! میں نے کہا۔
میں کیا جانوں۔ سونیا نے جواب دیا۔
کچھ دیر اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں اپنے
[illegible] پیس آ گیا۔

اگلے روز سونیا خود ہی مجھ سے ملنے آئی اور آتے ہی بولی۔
کچھ سنا تم نے۔
کیا؟ میں نے پوچھا۔
رام سنگھ مر گیا" وہ کہنے لگی" اس کی لاش فصیل
[illegible] پاس ملی ہے۔
معلوم ہوتا ہے فصیل پر سے گرا ہے۔
وہ کیسے! میں نے پوچھا۔
کہتے ہیں" سونیا بولی۔ کہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔
[illegible] کہیں نسے (نشہ) میں گر گیا بے چارا اچھا آدمی تھا۔
[illegible] نے کہا۔
تمہارا تو دشمن تھا" وہ بولی۔ ایک کانٹا تو گیا
[illegible] ماری راہ سے۔
سونیا کچھ دیر بیٹھی ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی
پھر اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔
رام سنگھ کے متعلق جو میرے دل میں ایک
خلش سی لگی رہتی تھی اب وہ بھی نہ رہی۔

کچھ روز بعد صاحب کے ایک دوست کی سفارش
سے مجھے ایک بنک میں جمعداری کی جگہ مل گئی۔ اور رہنے
کو ایک کوٹھڑی جس کے آگے صحن بھی تھا ملا۔ بنک کے
چپراسیوں میں ایک جوان لڑکا بھی تھا۔ اس کا نام تو منوہر
تھا لیکن کہنے سب مرلی تھے۔ ملتے تو اُسے بھی بارہ ہی روپے
تھے لیکن وہ ذرا بن سنور کر رہا کرتا تھا۔ ویسے بھی ہنس مکھ
اور خوش طبع تھا۔ پہلے ہی روز شام کو جب میں چولہے میں بیٹھا
روٹی پکا رہا تھا تو وہ میرے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا جمعدار
جی آپ تکھلیف (تکلیف) کیوں کرتے ہیں لائیے!
روٹی میں پکا دوں۔ پکا دو بھیا۔ میں نے کہا۔ بس اس
روز سے ہی میری روٹی پکاتا۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن سونیا
اس جگہ مجھ سے کچھ نہ مانگتی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سونیا کو
مجھ سے محبت ہے۔ اور میں اس خیال سے بہت خوش
تھا۔ سونیا تو مجھ سے کچھ نہ مانگتی لیکن وہ کانا دس پانچ روپے
مجھ سے ضرور لے جاتا۔ میں بھی اس کا منہ بند کرنے کے لیے
خوشی خوشی دے دیا کرتا تھا۔
شہر سے کوئی تین چار میل کے فاصلے پر ندی تھی۔ اور
ندی کے کنارے جنگل تھا۔ جس روز بنک بند ہوتا میں ندی
پر مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا کبھی کبھی سونیا بھی آ جاتی۔ خوب ہنسی
سے وقت کٹتا۔ ایک روز میں ندی پر بیٹھا تھا یہی کوئی
نو دس کا وقت ہو گا۔

سونیا نے بھی آنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اتنے میں گوپی آ گیا۔

سونیا نہیں آئی آج۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔ یا کہیں چھپ گئی؟

میں کیا جانوں، میں نے کہا۔

میرا گھر برباد کر کے انجان بنتے ہو۔؟ گوپی کہنے لگا گریب۔ (غریب) میں بھی گیرت (غیرت) ہوتی ہے۔

کیا بک رہے ہو۔ میں نے کہا۔ پی تو نہیں آئے آج

"میں رام سنگھ نہیں"، اس نے ذرا کھانس کر کہا۔

مجھے رام سنگھ سے کیا مطلب؟ میں نے ذرا غصہ سے پوچھا۔

جمعدار جی! وہ ذرا طنزاً بولا۔ مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں۔ سب معلوم ہے مجھے!

کیا معلوم ہے تمہیں، میں نے غصہ سے پوچھا۔

اب سنکر ہی رہو گے؟ گوپی بولا۔ تم رام سنگھ گریب (غریب) کو مار کر یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ میں نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہنے لگا کیا دیکھتے ہو یوں گھور گھور کر۔ اس نے تمہیں گالی دی تم نے اس کے گھونسہ مارا۔ پھر ہاتھا پائی ہوئی اور تم نے اسے اٹھا کر فصیل پر سے گرا دیا۔ ٹھیک ہے نا؟

محض بک رہے ہو تم! میں نے پھر اسی طرح غصے سے کہا۔

یہ زبان کو لگام دو۔ ورنہ......... وہ بولا۔

ورنہ! اس نے جواب دیا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی سمجھ گئے نا؟۔

مجھے بہت غصہ آیا میں بنسی چھوڑ کر جو اٹھا تو وہ ایک چاقو نکال کر مجھ پر جھپٹا۔ لیکن میں نے چاقو اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ ادھر وہ زمین پر گرا ادھر ختم ہو گیا۔ میں نے بنسی پانی سے نکال کر جھاڑیوں میں چھپا دی۔ اور جہاں خون گرا تھا اور اس پر گیلی مٹی ڈال دی۔ اور زمین کو پتھر سے رگڑ رگڑ کر خون کا سب نشان مٹا دیا۔ پھر میں نے اپنے کپڑے اتار کر لنگوٹ باندھا اور لاش کو کندھے پر اٹھا کر جنگل میں گھس گیا۔ جب بہت دور نکل آیا تو جنگل سے نکل کر لاش ندی کے کنارے رکھ دی اور جنگل سے سوکھی لکڑیاں لا کر چتا تیار کی اور دیا سلائی لگا کر آگ لگا دی۔ جب شعلے نکلنے لگے تو میں جنگل سے اور سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر کے لایا اور چتا پر ڈال دیں۔ اسی طرح دو تین بار میں نے چتا پر لکڑیاں ڈالیں۔ جب لاش خوب جل چکی تو بچی کھچی ہڈیاں ندی میں پھینک دی۔ پھر جہاں لاش جلائی تھی وہ جگہ لکڑی سے کھود ڈالی۔ اور مٹی اٹھا کر پانی میں پھینک دی۔

اس طرح کانے کا نشان تک مٹا دینے کے بعد میں نے اشنان کر کے کپڑے پہنے پھر ادھر اُدھر دیکھتا ہوا اس جگہ جہاں بنسی چھپا رکھی تھی آیا اور بنسی نکال کر پھر مچھلیاں پکڑنے لگا۔ سونیا نے دوپہر کے بعد آنے کو کہا تھا۔ لیکن جب وہ دن ڈھلے تک نہ آئی تو دو چار مچھلیاں جو میں نے پکڑی تھیں اٹھا کر اور بنسی کندھے پر رکھ کر شہر کو لوٹا۔ اور سیدھا سونیا کے ہاں پہنچا۔

شام ہونے کو تھی مزدور ادھر اُدھر جھونپڑیوں کے پاس بیٹھے تھے۔

سونیا اپنی جھونپڑی کے پاس بیٹھی آٹا گوندھ
رہی تھی۔ میں پاس جاکر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ اور مچھلیاں زمین
پر رکھ دیں۔

آج خوب شکار مارا! وہ آٹا گوندھتے ہوئے
بولی۔

اور تم نے خوب راہ دکھائی! میں نے کہا۔

بس اتنا ہی نہ ہوا۔ وہ ہنس کر بولی۔

گوپی کہاں ہے؟ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

وہ آج صبح ہی سے کہیں گیب (غائب) ہے۔
سونیا بولی۔

پکی رکھی ہوگی۔ میں نے کہا۔

اسے اور کام ہی کیا ہے، سونیا نے جواب دیا۔

تو میں چلتا ہوں، میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دو ایک مچھلیاں لے لو تم بھی۔

روٹی کھانے جاؤ، سونیا نے محبت سے میری
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تم لیتی آئیو! میں نے کہا۔ مرلی نے بھی تو پکا
لی ہوگی۔

میں جب چلا تو وہ بولی۔

کچھ پیسے دیتے جاؤ۔ تیل نہیں۔

میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسکی
ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگی۔

بڑے مہاجن ہو۔

تمہارے ہی روپے تو ہیں۔ میں نے کہا۔
اب آؤ گی۔

اب اسے روٹی کھلا کر ہی آؤں گی، سونیا نے
جواب دیا۔

میں مکان پر لوٹ آیا۔ مرلی نے روٹی پکا رکھی تھی
میں نے کہا میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔

مرلی کچھ دیر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر وہ چلا
گیا۔ اور میں آج کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ میرا خیال تھا
کہ رام سنگھ کے مرنے کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ اور یہ خبر
نہ تھی کہ ایک مار آستین بھی موجود ہے۔ عینی شاہد، گوپی۔
اور خاموش رہے۔ ایک عجیب بات تھی۔ میری زندگی اسکے
ہاتھ میں تھی۔ اور وہ جس ناچ چاہتا مجھ کو نچا سکتا تھا۔ لیکن آج
گوپی تو رہا ایک طرف گوپی کا نشان بھی میں نے مٹا دیا تھا۔
مجھے یہ سب قسمت کے کھیل نظر آرہے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا
بھگوان کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ اور جو کچھ ہو رہا تھا محض سونیا
کے لئے ہو رہا تھا۔ سونیا کے خیال سے سونیا کی یاد سے
اور سونیا کا نام زبان پر آتے ہی میرا دل تڑپنے لگتا تھا۔
بس ایک تمنا تھی۔ کہ کسی طرح یہ سندر نار میری ہو جائے
اور اب یہ تمنا پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔

میں بہت دیر تک سونیا کا انتظار کرتا رہا۔ نو بھی
بجے اور دس بھی پھر گیارہ بھی بج گئے لیکن سونیا نہ آئی مجھے
نیند آرہی تھی۔ میں کھاٹ پر لیٹ گیا رات میں نے
ایک بہت خوفناک سپنا دیکھا۔

کوئی باغ تھا ہم تینوں گوپی، رام سنگھ اور میں
بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں سونیا بھی آگئی۔ اس کے

ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا ہونٹوں پر مسی کی ریکھا تھی گلے میں چاندی کی چمپا کلی تھی، تلوے گلابی رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ زرد رنگ کا لہنگا تھا اس کے کناروں پر سپید گوٹ لگی تھی، بائیں جانب سرخ رنگ کا ازار بند لٹک رہا تھا۔ زعفرانی رنگ کی نصف آستین کی کرتی تھی اس پر گوٹے کی ٹکلیاں تھیں اور سینے کا ابھار برج سنگ کی طرح اندر سے نمایاں تھا۔ صندلی رنگ کا دوپٹہ تھا، اس کے کناروں پر گوٹا چمک رہی تھی۔ اور کالے کالے سنبل ایسے بالوں میں مانگ کی لکیر جوئے شیر کی طرح چمک رہی تھی اس کی نازک کلائیوں میں کانچ کی آسمانی رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں چاندی کے کان پھول تھے اور پاؤں میں پازیب تھی جس کی جھنکار فتنے پیدا کر رہی تھی اور سپید ورکا قشقہ کسی عاشق کے دل کے داغ کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ آتے ہی ناچنے لگی، رام سنگھ ڈفلی اور گوپی بنسری بجانے لگا۔ لیکن ڈفلی مردے کی کھوپڑی کی تھی اور بنسری ہڈی کی۔

اتنے میں مرلی بھی آگیا مرلی کو دیکھتے ہی وہ ناچنا اچنا سب بھول گئی اور مرلی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتی ہوئی لے گئی۔ گوپی اور رام سنگھ نے خوب قہقہے لگائے۔ اور میرا منہ چڑاتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی اٹھا اور سونیا اور مرلی جدھر گئے تھے اُدھر ہی کو ہو لیا چلتے چلتے میں مرگھٹ کے پاس آنکلا۔ یہاں پیپل کے نیچے مرلی کی لاش چتا پر پڑی تھی اور سونیا پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ میں اسکے پاس بیٹھ کر تسلی دینے لگا۔ وہ میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لئے بس کہ جب میں نے ہاتھ اٹھائے تو وہ سونیا کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

یہ خوفناک سپنا دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔

تو یہ ہے: نرگس بولی۔ کتنا خوفناک خواب تھا

آخر اس نے بھی تو دو بے گناہوں کو قتل کیا

طاؤس نے کہا وہ خیال بھی تو پریشان کرتا ہوگا۔

"خون کبھی چھپا نہیں رہتا" نرگس نے کہا۔

جی ہاں! طاؤس نے ذرا فلسفیانہ انداز سے کہا

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین

یہ شاعری رہنے دیجئے آپ اس وقت نرگس شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بہرام جی پھر کیا ہوا۔

نرگس! بوڑھے بہرام نے اپنی سپید سپید ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ یہ خوفناک خواب سنکر مجھے تعجب ہوا۔

چتر سنگھ مسکرا کر کہنے لگا، جناب! یہ آپ پریشان سے کیوں ہو گئے میں تو محض ایک سپنا سنا رہا تھا آپ

"خیر تو ہے" میں نے پوچھا۔

گوپی رات سے نہیں آیا۔

"کوئی نئی بات ہے" میں نے کہا۔ آج آجائے گا

اداس ہو گئیں کیا ؟۔

اُداس ہی تو ہونا ہوا۔ اس نے ذرا مسکرا کر جواب د

پتی جو ٹھہرا۔

گھبراؤ نہیں! میں نے کہا۔ تم سلامت رہو پتی سینکڑوں۔

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

رات بھوکے ہی رہے یا کچھ کھا لیا تھا۔

واہ! میں نے کہا۔ خوب مچھلی کھلائی تم نے۔

مچھلی تو تلی رکھی ہے۔ سونیا بولی۔ مرلی کو بھیجکر منگوا لو۔

خیر! دیکھا جائے گا۔ میں نے کہا۔

سونیا کچھ دیر بعد چلی گئی۔

دو چار روز اور بھی گذر گئے۔ سونیا کچھ پریشان سی رہتی۔ جہاں جہاں گوپی آتا جاتا تھا سب جگہ اس نے چھان ماری۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا اور چلتا بھی کیسے۔ میں کبھی اس سے مذاقاً کہا کرتا کہ سونیا تمہیں کانے سے بہت محبت ہے اور وہ ہنس کر جواب دیتی کہ اس نے کبھی میری کسی بات میں دخل نہیں دیا۔ ایک دنیا نے میرے خلاف اس کے کان بھرے لیکن اس نے ایک ہی چپ سادھے رکھی۔ تم کیا جانو رام سنگھ نے تمہارے متعلق اس سے کیا کیا نہ کہا لیکن اس بھلے مانس نے مجھ سے اشارۃً بھی کبھی کچھ نہ کہا، جانے کہاں چلا گیا۔ کیا گذری غریب پر، میں نے کہا آخر گوپی بھی تو انسان ہے ممکن ہے کوئی حادثہ ہی پیش آگیا ہو، سونیا کہنے لگی جانے نہیں جمعدار کس نے بنا دیا۔ بھلا ایسی بات بھی کبھی چھپی رہتی ہے۔

پھر تم چاہتی کیا ہو؟ میں نے پوچھا۔

میں تو یہ سوچتی ہوں کہ میرا کیا بنے گا؟ سونیا نے ذرا مغموم آواز سے کہا۔

بھگوان! مالک ہیں۔ میں نے کہا۔ میرے پاس اٹھ چلو۔

تمہارے پاس اٹھ چلوں تو دنیا کیا کہے گی۔ سونیا نے پھر اسی طرح کہا۔

وہ بات کرو۔ میں نے کہا، جو کسی کو شک کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

کیا کروں، اس نے پوچھا۔

میری ہو جاؤ۔ میں نے کہا۔

اب کس کی ہوں، اس نے پھر ذرا آنکھیں مٹکا کر کہا۔

مجھ سے بیاہ کر لو۔ میں نے کہا۔

اور جو گوپی آگیا؟ سونیا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

آچکا اب، میں نے کہا۔

سونیا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی پھر بولی۔

صبر کرو ابھی، میں کہیں بھاگی نہیں جاتی۔

تو جناب اسی طرح دو چار مہینے گذر گئے، گوپی کے گم ہونے کے چرچے مزدوروں میں کچھ دن رہے۔ اور میں نے بھی لوگوں پر اعتبار جمانے کے لئے اسے تلاش کرنے میں بہت دوڑ دھوپ دکھلائی، میں ہر روز سونیا کو شادی کرنے پر مجبور کرتا وہ برابر ٹالتی جاتی ایک روز میرے بہت مجبور کرنے پر کہنے لگی تم مرد ہو۔ تمہارے سر پر جوانی کا بھوت سوار ہے۔ میں عورت ہوں اور زمانے کا رنگ دیکھتی ہوں۔ مان لیا گوپی غریب کی چھ مہینے سے کوئی خبر نہیں ملی لیکن یہ

کس طرح مان لیا جائے کہ وہ مرگیا۔ میں اگر تم سے شادی کرلوں ایک دنیا مجھ پہ تو نہیں لیکن تم پر ضرور رشک کرے گی لوگوں کو ہمارے تعلقات کا علم تو ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ تم نے مجھ سے بیاہ کرنے کی خاطر اُسے کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔

سونیا بات تو ٹھیک کہتی تھی لیکن اس کی محبت نے تو میری عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی روز بعد میں نے اُسے شادی کرنے پر رضامند کر ہی لیا۔ سونیا میری جورو تو بن گئی۔ لیکن اس کی عادات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہی گھوما گھامی جو اس کی سرشت میں تھی ویسے ہی رہی۔ ہر ایک سے بے تکلف ہو جانا۔ جو ملا اسی سے ہنسی مذاق اور مجھے یہ باتیں اب ناگوار معلوم ہوتیں۔ میں روکتا تو وہ جھگڑتی اور جلی کٹی سناتی۔ اور تو اور اب مرلی سے راہ و رسم بڑھانے لگی۔ پہلے تو میں نے اس بات کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن جب مجھے کچھ اور ہی رنگ نظر آیا تو میں نے ایک روز مرلی سے کہہ دیا کہ وہ اپنی روٹی علیحدہ پکایا کرے۔ اور میری اجازت کے بغیر میرے گھر نہ آیا کرے۔ لیکن اس قسم کی روک تھام سونیا کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی۔ اب میں اس قصے کو کہاں تک طول دیئے جاؤں۔ ایک روز میں کوئی چھ بجے بنک سے نکلا۔ آسمان پہ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ طبیعت جو ذرا گدگدائی تو میں بازار چلا گیا۔ ایک دو ادھر اُدھر چکر کاٹے پھر کلال خانے کی راہ لی۔ اتفاق سے مرلی بھی مل گیا۔

کہاں چلے ؟ میں نے پوچھا۔

روٹی کھانے جا رہا ہوں مرلی نے جواب دیا۔

میں نے اسکے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

مرلی ناراض ہو مجھ سے۔

نہیں جمعدار جی! وہ بولا۔ میں کیوں ناراض ہو

کبھی پی بھی ہے۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔

مل گئی تو پی لی۔ اس نے جواب دیا۔

تو جناب! میں اسے بھی کلال خانے میں لے آ

یہاں میں نے ویسی شراب کی آدھی بوتل منگوائی۔ مرلی ایک جام پی کر مخمور ہو گیا۔

لو بھیا! میں نے کہا۔ میں تو اب چلتا ہوں۔

تو ہم بھی چلتے ہیں، اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پاؤں ڈگمگانے لگے میں اُسے سہارا دیتے ہوئے واپس آیا۔ رات ہو چکی تھی اور بنک کے پہرہ دار۔

اب آؤ بلم آؤ

میں آیا نہ گھبراؤ

مل کر گا رہے تھے۔ آواز سن کر مرلی بولا۔

آیا سونیا آیا "تم بلاؤ تو ہم سر کے بل آئیں۔ کوئی معشوق ہیں کہ آنکھیں پھیر لیں۔ آتے ہیں سند وہ کچھ اسی طرح بکتا رہا۔ غصہ تو مجھے بہت آیا۔ لیکن میں ضبط سے کام لیا۔ اور اُسے کوٹھڑی تک جہاں وہ چھوڑ آیا۔ جب مکان پہ آیا تو سونیا کھاٹ پر پڑی تھی

سو گئیں سونیا ؟ میں نے کھاٹ پر جھک کر پو

لیکن اُس نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں کھاٹ پر بیٹھ

سونیا۔ میں نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ تم مجھ

ناراض کیوں رہتی ہو۔

تم مجھے جینے بھی دو گے۔ جھنجھلا کر بولی

فیصلہ ہی نہیں میں۔

بیوی تو ہو۔ میں نے ہنسکر کہا۔ یا اس سے بھی انکار ہے۔

جانے میری بلا بیزار۔ یہ کہکر اسنے دوسری جانب منہ پھیر لیا۔

سونیا! میں نے آہ بھر کر کہا۔ کبھی مجھ سے بھی تمہیں محبت تھی۔

"محبت کرکے میں نے پھل کیا پایا" اس نے پھر تنک کر جواب دیا۔

"اور کھویا کیا" میں نے پوچھا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

اس مرلی غریب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔

کیا کہا میں نے اس سے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

جو تم نے اس سے کہا میں بھی سن چکی ہوں۔ سونیا نے جواب دیا۔

"تمہیں مرلی سے کیا واسطہ" میں نے پوچھا۔

تم کون پوچھنے والے وہ گرج کر بولی یوں نباہ نہ ہوگا۔

تو پھر کیسے ہوگی۔ میں نے کہا۔

جانے میری بیزار اس نے تنک کر جواب دیا۔

سونیا! میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ عورت کو مرد کی عزت کا پاس ہونا چاہیے لیکن اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔

یہ منہ اور مسور کی دال! آج غیرت آنے لگی کل تک غیرت کہاں تھی تو جناب جتنا میں نرمی کا پہلو اختیار کرتا وہ تیز ہوتی جاتی۔ اور ہر بات کا سختی اور بے باکی سے جواب دیتی۔ مجھے اس سے محبت تھی لیکن اس کی بے رخی اور بے وفائی سے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب بگاڑ مرلی کے لئے ہو رہا ہے سونیا کو مرلی سے محبت تھی۔ جب موقع ملتا مل بھی لیتے بغصہ تو مجھے بہت آرہا تھا۔ لیکن میں نے اپنے کو سنبھالا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک دنیا سوتی تھی۔ رات اندھیری تھی۔ جھکڑ چل رہا تھا۔ آسمان پر کالے بادل چھا رہے تھے۔ بجلی بھی کوندتی اور گرج بھی سنائی دیتی طبیعت سخت پریشان تھی۔ ادھر اُدھر گھومنے لگا چلتے چلتے مرلی کے مکان کے پاس جا پہنچا۔ رقیب یہ خیال آتے ہی بدن میں آگ سی لگ گئی خون اُبلنے لگا۔ اور رقابت کا بھوت سر پر سوار ہوگیا میں نے آگے بڑھکر مرلی کی کوٹھری کا دروازہ دیکھا۔ اندر سے کنڈی لگی تھی باہر سے میں نے لگا دی۔ اور دیا سلائی جلا کر چھت کو جو گھاس پھونس کی تھی۔ آگ لگا دی اور جلدی سے گھر آکر لیٹ رہا۔ سونیا دیوار کی طرف منہ کیے پڑی تھی جانے سوتی تھی یا جاگتی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا خوف سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں دو آدمیوں کو قتل کر چکا تھا۔ لیکن ایسی حالت کبھی نہ ہوئی تھی۔ شاید مجھے مرلی پر رحم آرہا تھا لیکن نہیں۔ مرلی تو وہ شخص تھا جس سے مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں سونیا کو مجھ سے چھین نہ لے۔ میں کباب سیخ کی طرح پہلو بدل رہا تھا۔ لیکن کان نہ پڑتی کان باہر کی آواز پر لگے تھے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار آگ دیکھتے ہی پکارے گا۔ کچھ وقت اسی عذاب میں کٹا۔ آخر گھڑیال نے [illegible] کی نوبت بجائی اور کچھ دیر بعد آگ آگ کی آوازنائی دی میں لپک کر باہر نکلا۔ مرلی کا مکان جل رہا تھا۔ شعلے آسمان کی خبر لاتے تھے۔ آگ بجھانے والے انجن کے آتے آتے مکان جل کر راکھ ہوگیا۔ جب پانی پڑنے سے آگ سرد ہوئی تو مرلی کی لاش ہم نے جلی ہوئی لکڑیوں کے نیچے سے نکالی۔ [illegible] غریب۔ ہچکیوں سے عجب حسرت چلا ہوا تھا کہ دیکھنے

سے خوف آتا۔ جسم کا کچھ حصہ تو کوئلہ ہی ہوگیا تھا۔ صبح ہم اس جلی ہوئی لاش کو مرگھٹ پر لے گئے اور تالاب کے پاس پیپل کے نیچے چتا پر لاش رکھ دی۔ یہ وہی جگہ تھی اور وہی پیپل تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

جب تنہا دھوکر مکان پر آیا تو سونیا موجود نہ تھی میں آج بھو کا ہی نوکری پر چلا گیا۔ دوپہر کو میں نے پھر ایک پھیرا ڈالا۔ لیکن سونیا ابھی تک نہ آئی تھی اور اسی طرح رات تک بھی نہ آئی۔

دو روز اور بھی گذر گئے، لیکن اس کا کچھ پتہ نہ لگا۔ جہاں جہاں اس کا آنا جانا تھا سب جگہ ڈھونڈ آیا۔ لیکن سونیا نہ ملی۔ محبت، ندامت اور غصہ ان چیزوں نے مجھے سخت پریشان کر رکھا تھا۔ مرلی کو مرے آج تیسرا دن تھا۔ شام کا وقت تھا میں گھومتا گھومتا مرگھٹ کی طرف جا نکلا اور تالاب کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ تالاب کے پانی پر جالے چھا رہے تھے پانی کا رنگ سبزی مائل ہو رہا تھا اور ہوا سطح آب پر آنکھوں سے اوجھل رہنے والے پاؤں سے رقص کر رہی تھی۔ اچانک سامنے سے سونیا آتی نظر آئی۔ میں تالاب پر سے اٹھ کر پیپل کے ساتھ لگ کے کھڑا ہوگیا۔ وہ سر جھکائے آ رہی تھی جہاں مرلی کی چتا بنی تھی وہ وہاں آکر بیٹھ گئی آج وہ خوب بنی ٹھنی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ ہونٹوں پر مسی کی دھڑی تھی۔ گلے میں چاندی کی چمپا کلی تھی۔ تلوے گلابی رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ زرد رنگ کا لہنگا تھا۔ اس کے کناروں پر سپید گوٹ تھی، بائیں جانب سرخ رنگ کا ازار بند لٹک رہا تھا۔ زعفرانی رنگ کی نصف آستین کی کرتی تھی۔ اس پر گوٹے کی ٹکیاں تھیں۔ اور سینے کا ابھار برج سنگ کی طرح اندر سے نمایاں تھا۔ صندلی رنگ کا دوپٹہ تھا، بالوں میں مانگ کی لکیر جوئے شیر کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کی نازک کلائیوں میں کانچ کی آسمانی رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں چاندی کے کان پھول تھے اور پاؤں میں پازیب تھی جس کی آواز سے فتنے بیدار ہو رہے تھے اور سیندور کا قشقہ کسی عاشق کے دل کے داغ کی طرح چمک رہا تھا۔

سونیا چتا کے پاس بیٹھی بیٹھی بولی۔

منوہر! دیکھ لو۔ یہی لباس تم نے مجھے پہننے کو کہا تو میں آگئی۔ اب تم بھی آؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منوہر۔ مرلی کہاں چلے گئے تم؟ مجھ سے تو رات ملنے کا وعدہ کیا لیکن اپنے تن بدن کی سوجھ ہی نہ رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منوہر! سنا رہو جلد کہیے سونیا تمہاری ہے۔ مرلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں پیپل سے ہٹ کر اس کے پاس آکھڑا ہوا۔ سونیا بھی مجھے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

سونیا۔ میں نے کہا۔ کہاں تھیں تم

تم پوچھنے والے کون! اس نے تنک کر کہا۔

چلو! میں نے کہا۔ میں کوئی ہی سہی لیکن تم گئیں کہاں

جہاں جی چاہا۔ اس نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔

یہ تو ٹھیک نہیں میں نے کہا۔

اب کہتے کیا ہو۔ اس نے پھر اسی طرح کہا۔

سونیا! میں نے کہا۔ یہ شہر کی زندگی ہمیں راس نہیں آئی چلو کسی اور جگہ چل رہیں۔

"جاؤ پھر" وہ بولی۔ کون منع کرتا ہے۔

تم نہ چلو گی میں نے پوچھا۔

ہرگز نہیں۔

نہیں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ نہیں چلنا ہوگا۔

تم ہو کون؟ اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ مجھے لے جانے والے۔

تمہارا پتی۔ میں نے کہا۔

یہ سنکر اس نے میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولی۔

پتی! تم۔ ہوں۔

سونیا! میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔

اور اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر جواب دیا۔

مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے۔

مرلی سے تو محبت تھی۔ میں نے ذرا طنزاً کہا۔

بیشک!

لیکن وہ تو مر چکا۔ میں نے کہا۔

محبت تو نہیں مری! سونیا نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر جو وہ چلی تو میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دو" اس نے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

گھر نہ چلو گی؟ میں نے غصہ سے پوچھا۔

کس کا گھر۔ کیسا گھر۔ اس نے بھی غصے سے پوچھا۔

میرا گھر، تمہارا گھر۔ میں نے جواب دیا۔

آگ لگے تمہارے گھر کو! وہ بولی۔ اور چولھے میں جاؤ تم۔

یہ کہہ کر وہ پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن جب میں نے ہاتھ نہ چھوڑا تو اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے پٹر دے مارا۔ میرا خون اُبلنے لگا۔ میں نے چاقو نکال کر کہا۔

سونیا! میں تمہارے چاہنے والوں کو مار مار کر تھک چکا۔ لیکن.........

رام سنگھ کو تم نے مارا؟ وہ بات کاٹ کر بولی۔

ہاں میں نے جواب دیا۔

اور گوپی کو؟ اس نے پھر پوچھا۔

"گوپی کو بھی" میں نے کہا اور مرلی کے گھر کو بھی میں نے ہی آگ لگائی تھی۔

سونیا! محض!۔

لیکن بیشتر اس کے کہ میں فقرہ پورا کروں اس نے میرے مُنہ پر تھوک دیا اور سینہ ابھار کر بولی۔

تو آج میری باری ہے۔

ہاں! میں نے چاقو اٹھا کر کہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ ڈر جائے گی۔ اور چیخے چلائے گی لیکن کہا تو یہ کہا تو چلو قصہ ختم کرو۔

تو تم گھر نہیں چلو گی؟ میں نے اس کی کلائی مروڑ کر پوچھا۔

ہرگز نہیں۔

ساتھ ہی اس نے مجھے گالی دی اور میں نے چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑی۔ میں کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر اس کے سینے سے چاقو نکالا۔ خون کی ایک پتلی سی دھار زخم سے نکل کر میرے ہاتھوں پر پڑی۔ سونیا نے ایک ہچکی لی اور زبان دید ی یہ تھی اس سپنے کی تعبیر!

سونیا مر چکی تھی اور میں پاس کھڑا تھا۔ پھر میں اس کے پاس جہاں وہ گری تھی بیٹھ گیا۔ اور اس کا سر اٹھا کر زانوں پر رکھ لیا۔ شفق کی لالی آسمان پر پھیلی ہوئی تھی اور زمین پر سونیا کا خون۔

دونوں نے مرگھٹ کے منظر کو بھی خونین بنا دیا تھا۔

نرگس! بوڑھا بہرام بولا یہ داستان سنا کر چترسنگھ نے سر جھکا لیا۔ لیکن اس کے ہونٹ ہلتے نظر آ رہے تھے۔

شاید سونیا کے تصور سے کچھ کہہ رہا تھا۔

تو یہ ہے! نرگس بولی۔ کتنا خوفناک قصہ کتنا ظالم آدمی تھا۔

اور عورت کتنی بے وفا نکلی۔ طاؤس نے کہا۔

یہ بھی تو کہو۔ نرگس! مرد کو عزت کا خیال بھی ہوتا ہے۔ اور غیرت بھی ہوتی ہے۔

تو پھر محبت محبت کیوں پکارتا تھا۔ نرگس نے کہا۔ چولھے میں جائے ایسی محبت۔ بن نہ آئی تھی تو گھر سے نکال دیا ہوتا۔

یہ کہہ کر نرگس اٹھی اور طاؤس نے کہا۔

اب اعتراض کیا ہے تو جواب بھی تو سن لو۔

میں نہیں سنتی! نرگس بولی۔ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔

تیجیے! بہرام جی! ذرا باغ میں گھومیں دیکھیے ابر کیا گھر ا ہوا ہے۔

تینوں باغیچہ میں آکر ٹہلنے لگے۔ لیکن تینوں خاموش۔

ہاں! کالی گھٹاؤں کی جنوں سامانیاں سکان زمین کو پیغام حیات دے رہی تھیں۔

آثار علمیہ ادبیہ

مکتوب مولانا شوکت علی مرحوم

بنام

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ام اے، پی، اچ، ڈی، بیرسٹر ایٹ لا

الجمعیۃ المرکزیۃ الھندیۃ للخلافۃ الاسلامیہ (بمبئی) 20th Sept 1920

The Central Khilafat Committee of India, Bombay.

اللہ اکبر

برادرم محمود۔ اسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

میں کل یہاں پہنچا ہوں اور غالباً ۲/ اکتوبر تک یہاں قیام کروں گا۔

محمد علی ۲۰/ اکتوبر کو معہ مولانا ندوی۔ حیات اور مولانا ابو القاسم کے پہنچیں گے۔ وہ ۲۷/ ستمبر سے پہلے روانہ نہ ہو سکے۔ جیسی امید ہے۔

بھائی ہماری ذمہ داریاں اب بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور ناگپور کے اجلاس سے پہلے ہم کو یہ ہندوستان کو ہی نہیں بلکہ دنیا کو دکھا دینا ہے کہ ہم مسلمان اپنے مقدس مذہب کے لئے ہر چیز قربان کر دینگے۔ اور اس کا عملاً ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ اب آرام کا وقت گیا۔ گھر سے ہو جاؤ مجھے اس کا ڈر ہے کہ ہماری کاہلی ہمارے لئے باعث شرم نہ ہو۔

ترک موالات کو کامیاب بنانے کے لئے علاوہ سخت محنت اور دورہ کیلئے روپیہ کی بھی ضرورت ہے۔ اسکے لئے بھی کوشش کرو۔ ہجرت کے کام کے لئے بھی ایک بڑی رقم کی ضرورت ہو۔

اپنی مایوسی کو چھوڑ دو اور کمر ہمت باندھو بقول شاعر ؎

گر قوم کی خدمت کرتا ہے احسان تو کس پر دھرتا ہے
اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

تو نہ تم احسان کروگے اور نہ میری مراد ہے۔ اور نہ تم ڈرتے ہو تمہارے لئے صرف مصرعہ ثانی لکھا ہے۔ ہندو برادران نے بنگال اور بمبئی میں کونسل کا
کا اعلان بہت بڑی تعداد میں کر دیا مسلمانوں نے جماعت کے ساتھ اعلان نہیں کیا ہے۔ اس کا انتظام بھی بہار میں کر دو تاکہ وہ بھی اپنی رائے کا اظہار جلد تر کر دیں۔
میرا یہ خط خواجہ کو بھی دے دو کہ وہ غور سے پڑھ لیں۔ باقی وہ خود سمجھ لیں گے۔
سعید اور خواجہ کو اسلام علیک۔ سعید احمد کالج کب چھوڑیں گے۔

ادبیات

جذبات مبارک

از حضرت مبارک عظیم آبادی

یوں دیکھتے رہے وہ جدھر دیکھتے رہے ناوک لگا لگا کے جگر دیکھتے رہے
کیا لوگ تھے یہ ان کا کلیجا تو دیکھئے جو لوگ میرا زخم جگر دیکھتے رہے
قید حیات پاؤں کی زنجیر ہوگئی ہم راہیوں کو گرم سفر دیکھتے رہے
ایسے کہاں نصیب کہ ہم کو وہ دیکھتے ہم نامراد اُن کی نظر دیکھتے رہے
ہنگام گریہ سیر رہی لالہ زار کی! کیا رنگ پر تھا دامن تر دیکھتے رہے
جیسے ہو ناامید اثر کو اثر سے یاس ہم یوں دُعا کا اپنی اثر دیکھتے رہے
نیرنگِ حسن یار کی سیریں نہ پوچھئے دیکھا کئے اُدھر کو جدھر دیکھتے رہے
زخم جگر کے دیکھنے والے کہاں نصیب قاتل کا میرے لوگ ہنر دیکھتے رہے

اِس باغ کی بہار مبارک بہار تھی؟
ہم عمر بھر فریبِ نظر دیکھتے رہے

کیف تغزل

از۔ جناب عبدالوکیل خاں بسمل۔ سینیر ڈپٹی مجسٹریٹ۔ دھنباد

حسن کو مجبوری بیداد ہے
کیوں محبت میں کوئی ناشاد ہے

بے اثر گو نالہ و فریاد ہے
بہر تسکینِ دلِ ناشاد ہے

میرے اظہار تمنا پر ترا
مسکرا کر منہ چھپانا یاد ہے

کچھ جفائیں ہوں تو سہہ لے دل مرا
پر ستم ہے وہ ستم ایجاد ہے

ہائے مجبورِ وفا کی زندگی
بیوفائی پر بھی ان کی یاد ہے

پھیر لی تم نے نظر اچھا کیا
مائل عرفاں دلِ ناشاد ہے

درحقیقت زندگی ہے زندگی
جو کسی کے عشق میں برباد ہے

چھیڑتی ہے کیوں نگاہ لطف یار
میری قسمت میں دل ناشاد ہے

اک بت نامہرباں کی دوستی
کیا قیامت بسمل ناشاد ہے

دل اور عقل

از بلبلِ بہار حضرت سر یر مینائی کابری، گیاوی

اک دن دل خود کام نے یہ عقل سے پوچھا
پیچھے میرے ہر وقت پڑی رہتی ہے ناحق
مانا کہ ترے جام میں ہے بادہ انجام
مانا تجھے حاصل ہے تمیزِ حق و باطل
تو لاکھ کرے پردہ میرے رازِ نہاں کا
بندے ترے اللہ کے بندے نہیں رہتے
انجام بصیرت کا تری بے بصری ہے
دیکھے گئے اکثر عقلا مفلس و نادار
کب ساحلِ مقصود پہ کشتی تری پہونچی
آگے تجھے بڑھنے نہیں دیتے ترے اوہام

ہر کام میں سب لیتے ہیں کیوں مشورہ تیرا
آزادیٔ کامل کا کبھی لطف نہ دیکھا
پر راحت امروز نہیں عشرت فردا
آگے میرے پر قابل نفریں ہے یہ جھگڑا
پر کوزہ سے ٹپکیگا وہی اسمیں جو ہوگا
بن جاتی ہے گمراہی کا مرکز تری دنیا
وہ نور ہے تو کرتا ہے جو آنکھ کو اندھا
تو نعمت دنیا ہے نہ ہے دولت عقبےٰ
بیڑا نہ سلامت ترے گرداب سے نکلا
میں کود پڑوں اسمیں جو ہو آگ کا دریا

سنکر دل خود رفتہ کی یہ ہرزہ سرائی
تو ظلمتِ عصیاں ہے میں ہوں شمعِ تجلی
ہر گام پہ تو ٹھوکریں کھاتا ہوا اٹھتا
وہ گتھیاں سلجھائیں جو سلجھائے نہ سلجھیں
ہوتی نہ اگر جلوہ گری میری ممیز
میرے ہی بدولت ہوا معلوم جہاں کو

کہنے لگی عقل اب نہ رہا جائے گا چپکا
ممکن ہی نہیں نور پہ غالب ہو اندھیرا
رستہ نہ دکھاتا جو مرا دیدۂ ...... بینا
حل کر دیا میں نے نہ ہوا حل جو معما
انسان و بہائم میں کوئی فرق نہ ہوتا
یہ حسن ہے یہ قبح یہ دنیا ہے یہ عقبیٰ

حاصل ہے شرف مجھکو تری راہبری کا
گمراہی میں پڑ جائے جو چھوڑوں ترا پیچھا
صدقہ ہے مرا ورنہ تری کور نگاہی
کب دیکھتی حسن رخ فطرت کا تماشا
بازو میں مرے ہے پر جبریل کی پرواز
کہتے ہیں جسے عرش وہ ہے اک مرا زینہ
تصویر اشارے پہ مرے کرتی ہیں باتیں
آگے مرے اک کھیل ہے اعجاز مسیحا
میں نے کہا دونوں ہیں بجا اپنے محل پر
رہرو ہے کوئی۔ کوئی چراغ رہ صحرا

ماجھی کنیا

دیوانا پاگل سا ہو اٹھا۔ چاروں طرف اس نے تلاش کیا۔ سارے بھنور کو اس نے چھان مارا۔ اپنی جان پر کھیل کر اس نے بھنور کی ہر ایک چادر میں ڈھونڈا۔ مگر اس کی روپا اس کا سونا۔ کہاں؟ وہ بے چین ہو اٹھا اس نے سوچا وہ بھی اپنے آپ کو بھنور کی نظر کر دے۔ لیکن اسے میٹھی کی یاد آئی۔ وہ اٹھی ہوگی۔ بھوک سے بیتاب رو رہی ہوگی۔ جھونپڑی میں وہ اکیلی ہے۔

اپنی کشتی اس نے کنارے کی طرف ہانک دی۔

اس کی میٹھی مطمئن اپنے جھولے میں سو رہی تھی۔ دیوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک نظر اس نے دور بھنور کی طرف پھینکی۔ اور پھر میٹھی کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس کے ننھے گالوں کا ایک بوسہ لیا۔

یا ہر دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں کی مانند چاندنی بکھری پڑی تھی اور دور بھنور اپنا ساز بجائے جا رہا تھا۔

(گجراتی ادب)

وہ گلیاں یاد آتی ہیں

عورت کبھی محبت نہیں کرتی ہے۔ لیکن جب محبت کرتی ہے تو پھر سب کچھ فنا کر دیتی ہے،" جامو ذرا آگے بڑھی اور ایک ایسی شان متانت سے جیسے کوئی با وقار ملکہ ہو۔ آگے بڑھکر سب کی آنکھوں کے سامنے پوری سنجیدگی سے چلتے ہوئے میرے بالکل بازو میں آکر کھڑی ہوگئی۔ خالہ اماں دم بخود ہوگئیں۔ آپا جانی میری بڑی بہن زنانہ میں چلی گئیں۔ جامو کی بہن خاموش ہوگئی۔ جامو نے اپنی آنسوؤں سے دھلی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے میرے شانہ پر اپنا سر رکھ دیا۔

امید کی کشتی جو اضطراب میں سمندر کی طوفان موجوں سے ٹکرا رہی تھی مقصود کے ساحل سے آ لگی۔

ندیم

OTONE of Life

SILVER DROPS

15000

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

اوٹون کی آب حیات تاثیرات

"Otone" ہے سلور ڈراپ

(SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے
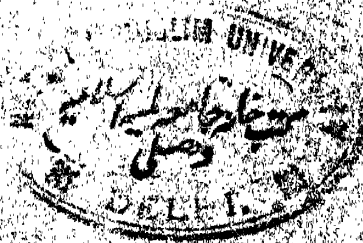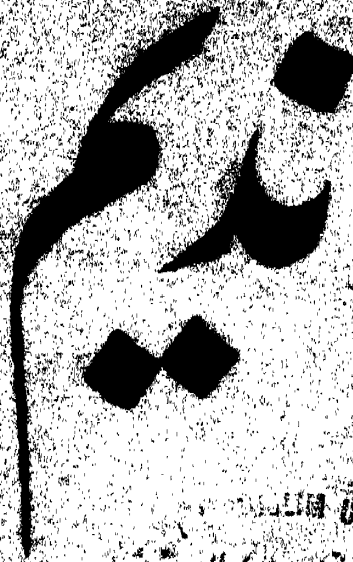
سائنس
انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہنامہ رسالہ
جولائی ۱۹۴۱ء کے چند مضامین
(۱) کاغذسازی۔
(۲) بچہ پر موروثی اثرات
(۳) اصول اور جدید طبیعات
(۴) ہوائی حملہ اور زہریلی گیسیں۔
اگست ۱۹۴۱ء کے چند مضامین
(۱) سائنس۔
(۲) حیوان کی گرمائی اور سرمائی نیند۔
(۳) اوزان اور پیمانوں کی معیار بندی۔
(۴) ہمارے دانت
(۵) دوران خون
یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے۔ جس میں مختلف مضامین کے علاوہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔
امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔ اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہیں۔
چندہ سالانہ پانچ روپیہ سکہ انگریزی (صر)۔ نمونہ کا پرچہ آٹھ آنہ (۸)
المشتہر
معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔
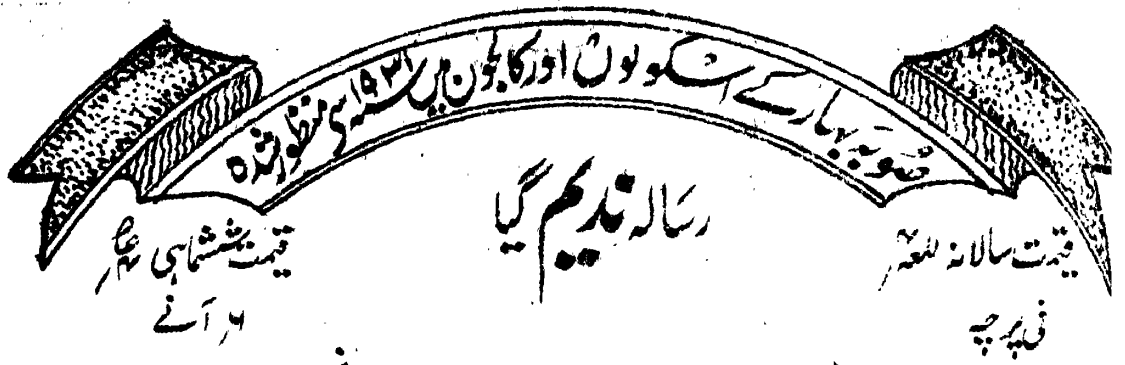
جلد (۱۸) ‖ ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۶۰ ہجری مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ عیسوی ‖ نمبر (۳)

نظرات

ماہ رواں میں چند اندوہناک موتوں کی خبر ملی۔ ۲ اگست کو مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اس دارفانی کو الوداع کہا۔ ۱۱ اگست کو جناب شرف عالم آرزو جلیلی نے آنکھیں بند کیں اور ابھی ۲۹ اگست کو جناب فضل حسین صاحب ڈپٹی کمشنر اکسائز صوبہ بہار کا سانحۂ ارتحال پیش آیا۔ **حضرت چغتائی** ملک کے مستند مزاحیہ نویس افسانہ نگار تھے چند دنوں وہ بعض دینی و مذہبی مباحث میں الجھ گئے تھے، مگر انہیں جلد تنبہہ ہوا اور اس کوچہ کو انہوں نے تائب ہو کر چھوڑ دیا۔ خداوند تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ ندیم سے انہیں غیر معمولی انس تھا۔ چلتے ہوئے بخار میں انہوں نے ندیم کیلئے مضامین لکھے اور بیشتر خطوں میں انہوں نے اپنی حسرت ظاہر کی کہ دق کی جان لیوا بیماری نے انہیں بیکار کر دیا ہے۔ ورنہ ندیم کی بیشتر اشاعتوں میں ان کے مضامین ہوتے۔ اس سلسلہ میں ان کے بعض خطوط دل کو تڑپا دینے والے ہیں۔ ادھر ہندی کی دنیا میں ان کی قدردانی زیادہ تھی، ہندی کے پڑھنے والے اردو کے ادیبوں میں جن سے شاید سب سے زیادہ مانوس ہو چکے ہیں۔ خداوند تعالیٰ انہیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور بیگم چغتائی اور دوسرے اعزہ و اقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جناب **شرف عالم آرزو جلیلی** بی ان کالج میں طبیعات کے پروفیسر تھے۔ وہ ہمارے صوبہ کے روشناس ادیبوں میں سے تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ماہنامہ معیار (بانکی پور پٹنہ) سے ہوا۔ اسی زمانہ میں انکی ایک کتاب بھی جو کسی یورپی زبان سے ترجمہ کی گئی تھی شائع ہوئی۔ ان دنوں وہ کالج کے طلبہ کی علمی و ادبی رہبری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ خداوند تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت سے نوازے۔

جناب **فضل حسین صاحب** مرحوم کی زندگی نئی تعلیم یافتہ جماعت میں اپنی دینداری و تقویٰ کے لحاظ سے شان امتیاز رکھتی تھی۔ مرحوم ندیم کے قدیم قدردانوں میں سے تھے، ندیم سے ان کا رشتہ تا حیات منقطع نہیں ہوا۔ جب ملتے تو اخلاق، انکسار اور تواضع سے پیش آتے۔ خداوند تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کا نزول کرتا رہے۔ اور اہل خاندان کو توفیق صبر عطا فرمائے۔

شہر گیا کو گوتم بودھ کے انتساب سے علم اور گیان کے گہوارہ ہونے کی عزت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ کیسے افسوس کی بات تھی کہ اس وقت تک اس شہر میں کوئی انٹرمیڈیٹ کالج تک قائم نہ ہو سکا اور یہاں کے کم استطاعت رکھنے والے طالب علم میٹرک کے بعد اپنے تعلیمی سلسلہ کو منقطع کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے ——— جناب لال جی بابو صاحب بیرسٹر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ ان کی انتھک جدوجہد سے "بوائز انٹرمیڈیٹ کالج گیا" کے نام سے ۱۵ اگست سے ایک کالج کا افتتاح ہو گیا ہے مستند اور لائق اساتذہ کا انتخاب ہو چکا ہے۔ اس کے ضروری معلومات ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ جنہیں ہم آئندہ مہینہ میں بہ تفصیل پیش کرینگے۔ امید ہے کہ گیا اور اسکے اطراف کے طلبہ اس کی طرف رجوع کرینگے۔ تفصیلی معلومات کیلئے "جناب آر۔ ایل۔ نندکویر بار ایٹ لا، سکریٹری بوائز انٹرمیڈیٹ کالج، گیا" کے پتہ سے خط و کتابت کیجائے۔

ندیم کے بہار نمبر کی پذیرائی ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں جیسی ہوئی، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں کمال کے اعتراف کی یہ آخری نشانی سمجھی جاتی ہے کہ نقد اعتراف کمال کی سرحد کو عبور کر کے تنقیص کی منزل میں پہونچے، اور درجہ نفی پر جاکر تمام ہو جائے۔ مثلاً شکسپیر ایسا تھا اور ویسا۔ اس نے فلاں کے خیالات چرائے۔ فلاں نے فلاں کی فلاں کتاب کے مواد کو شکسپیر کے نام سے پیش کر دیا۔ یہانتک کہ شکسپیر کسی ہستی کا نام ہی نہیں، یہ فرضی وجود ہے ——— خوشی ہوئی کہ بہار نمبر کے کمال کے اعتراف کی یہ منزل قریب آگئی ہے۔ اور زبان قلم سے یہ فقرے ادا ہونے لگے کہ

"مجموعی طور پر یہ نمبر بہت مایوس کن ہے۔ بہت سے مضامین روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں میں تقسیم کر دینے کے لائق ہیں"

ان فقروں کی داد، لکھنے والے سے زیادہ ان کے "ناشر" کی خدمت میں نذر کرنی چاہئے ——— بہار نمبر پر ہمارے کرم فرما جناب قاضی عبدالودود صاحب کے گرانقدر خیالات ندیم میں چھپ چکے ہیں۔ نیز ان کے نزدیک چند "شبہات اور اعتراضات" پیدا ہوتے تھے، ان کی طرف بھی انہوں نے اشارات کئے تھے۔ "تذکرہ شورش کا اردو زبان میں ہونا" "شیر شاہ کا کردار نئی روشنی میں" کی حقیقت اور "سید نظیر اکبر آبادی کا مولد واقعی عظیم آباد تھا" وغیرہ ——— ان میں سے بیشتر اعتراضات ندیم ہی میں چھپ چکے ہیں۔ اور ندیم کی طرف سے ان مضامین کے لکھنے والوں کو توجہ دلائی جا چکی ہے۔ "تذکرہ شورش" کا قضیہ تو چند سوال و جواب کے بعد دفن ہوا۔ شیر شاہ کے متعلق ندیم اور بعض خطوں میں مضمون نگار کو توجہ دلائی گئی۔ جناب قاضی صاحب کا اصرار رہا کہ نظرات کے صفحوں میں اس حقیقت پر گفتگو کیجائے۔ ہم نے موصوف سے واقعات و دلائل کو قلمبند کر کے طلب کیا۔ موصوف نے وعدہ فرمایا، ایک سے زیادہ خطوں میں یاددہانی کیگئی۔ جواب میں خطوط آئے۔ مگر اس مسئلہ پر خاموشی رہی۔ اور وقت گذرتا گیا۔ نظیر کے سلسلہ کے شبہات مضمون نگار کے پاس آگرہ بھیجے گئے۔ نیز ندیم میں توجہ دلائی گئی اور یہ دلچسپ حقیقت آشکارا ہوئی کہ مضمون نگار خود نظیر کے اخلاف میں سے ہیں۔ صاحب البیت ادریٰ بما فیہا۔ انہوں نے جواب میں جو مفصل دلائل و شواہد بھیجے وہ جناب قاضی صاحب کے پاس بھیجے گئے کہ مطالعہ کے بعد واپس فرمائیں۔ بعد میں خط آیا کہ آگرہ کا مکتوب واپس جاتا ہے، مگر اتفاق سے وہ واپس نہ آسکا۔ اور جناب قاضی صاحب کی منزل پر کاغذوں میں کہیں چھپ کر رہ گیا۔ اطلاع دی گئی کہ وہ مکتوب واپس نہ آسکا ہے۔ مگر اس کی پھر کوئی خبر نہیں ملی ——— یہ ہے پس پردہ ان "شبہات اور اعتراضات" کی حقیقت جو نوخیز نوجوان کی طرف سے قلمبند ہو کر شائع ہوئے ہیں ——— شیر شاہ کے کردار پر جناب عبدالباقی کا کردار روشنی ڈال سکتا ہے۔ حضرت حمید تاج محلی کا جوابی مکتوب ہمارے پاس ہوتا تو وہ شائع ہوتا۔ اس مسئلہ پر بولنے کا حق صرف انہی کو ہے۔ باقی رہا "قصیدہ اور ترکیب بند" کا معاملہ (جو دراصل "بیت الغزل" ہے) تو کاش کہ یہ مضمون پہلے کی طرح قاری کے ہی کالمے میں شائع ہوتا۔ تو ہم اس مسئلہ کی حقیقت پر زیادہ لطف اندوزی کے ساتھ گفتگو کر سکتے۔ لیکن "المعاصرۃ و المنافرۃ" سے واسطہ پڑ جائے۔ لہذا اس مسئلہ کو صرف اسی کی مخصوص منزل پر زیادہ موزوں طریقہ پر پیش کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ جو غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ دور ہو جائیگی۔

مقالات

قصیدہ اور ترکیب بند

معاصر بابت ماہ اگست ۱۹۴۱ء میں جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے قصیدہ کو ترکیب بند کہا ہے، یہ کوئی اعتراض نہیں بلکہ خردہ گیری ہے۔ معترض کی عیب جو اور نکتہ چیں طبیعت اور علم کی بے بضاعتی کا اظہار "ندیم" کے صفحوں میں کیا جا چکا ہے۔ اس لئے اس اعتراض کے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہ اعتراض ایک ایسے رسالہ میں شائع ہوا ہے جس کے مدیر جناب ڈاکٹر سید عظیم الدین صاحب ہیں۔ اس لئے اس کو قابل اعتناء سمجھکر ارباب بصیرت کے لئے ذیل کی سطریں سپرد قلم ہیں۔

اعتراض یہ ہے کہ قصیدہ کو ترکیب بند نہیں کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس دعوی کے لئے جو دلائل و براہین پیش کئے گئے ہیں وہ بالکل غیر واضح ہیں۔ قصیدہ کی تعریف میزان الافکار سے پیش کر دی گئی ہے۔ پھر اس کے نیچے علمائے عروضیین کی تعریف ترکیب بند کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں تعریفوں سے مطلق یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ قصیدہ کسی حال میں ترکیب بند نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ بتایا جاتا کہ قصیدہ صرف قصیدہ ہی رہتا ہے۔ اس کی قسمیں نہیں ہوتی ہیں۔ تو اعتراض قابل قبول ہو سکتا تھا۔ علیحدہ علیحدہ تعریف لکھ دینے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قصیدہ ترکیب بند نہیں ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس چیز کو متاخرین نے ترکیب بند کا نام دیا ہے قدماء اس کو ترجیع کہتے تھے۔ ان کے نزدیک دونوں قسمیں ایک تھیں۔ لیکن بعض متاخرین نے رفع اشتباہ کے لئے ترکیب بند اور ترجیع بند دو قسمیں کر دیں۔ ترکیب بند وہ ہے جس میں بند کا ہر شعر ہر بند میں بدلتا رہے۔ (بند کو قدماء خانہ کہتے تھے) اور ترجیع وہ ہے جس میں ایک شعر ہر بند کے نیچے میں دہرایا جایا کرے۔

مفتی سعد اللہ صاحب رامپوری کی کتاب میزان الافکار شرح معیار الاشعار سے ترکیب بند اور ترجیع کی جو تعریف نقل کی گئی ہے وہ متاخرین کی اصطلاح ہے۔ ماہرین فن قدماء اس کی تفریق نہیں کرتے، ان کے ہاں متاخرین کے ترکیب بند کا نام بھی ترجیع تھا۔ اور اس کی دو قسمیں کرتے تھے۔ ایک وہ ترجیع جس میں بند کا ہر شعر بدلتا جائے اور ترجیع کی دوسری قسم وہ جس میں ایک ہی شعر ہر بند میں بار بار آجائے۔

اس تمہید کے بعد اس فن کی سب سے قدیم و مستند کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم مصنفہ شمس الدین محمد بن قیس الرازی معاصر

سعدی شیرازی سے جس کو پروفیسر براؤن نے بڑے اہتمام سے اڈٹ کیا ہے حسب ذیل اقتباس پیش ہے۔

" ترجیع آنست کہ قصیدہ را بر چند قطعہ تقسیم کنند ہمہ در وزن متفق ودر قوافی مختلف وشعرا ہر قطعہ را ازآں خانہ خوانند، آنکہ فاصلہ میاں دو خانہ بیتے مفرد سازد وآں بیت را ترجیع بند خوانند، پس اگر خواہند ہماں بیت را ترجیع بند ہمہ خانہا سازد و در آخر ہر قطعہ وادل ما بعد آں بنویسند، واگر خواہند ہر خانہ را ترجیع بند علی حدہ گویند۔ واگر خواہند ترجیع بندہا ہر یک قافیت بالند تا قطعہ مفرد باشد "

اس تعریف سے یہ بالکل واضح ہے کہ قصیدہ کی منجملہ اقسام میں ترجیع کی وہ قسم بھی ہے جس کو متاخرین ترکیب بند کہتے ہیں، جس میں بند کا ہر شعر علحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا تعریف لکھ کر مؤلف معجم نے جمال الدین محمد عبدالرزاق کا ایک نعتیہ قصیدہ اس عبارت کے ساتھ نقل کیا ہے۔

" جمال الدین محمد عبدالرزاق را در نعت پیغامبر صلواۃ اللہ علیہ را کہ قصیدۂ ترجیع ہست "

اس قصیدہ کے کچھ بند بھی ملاحظہ ہوں، جو بالکل الگ الگ ہیں۔

پہلا بند۔ ایزد کہ رقیب جان خرد کرد + نام تو ردیف نام خود کرد

دوسرا بند کونین نواله ز جود ت + افلاک طفیلی وجودت

تیسرا بند۔ آنجا کہ ز نو نواله بے چند + ہفت وشش دپنج وچار ہیچند

الخ الخ الخ

اس اقتباس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ قصیدہ کی تین قسمیں کردی گئی ہیں۔

(۱) سادہ قصیدہ جس میں صرف متحد الوزن متحد القافیہ اشعار ہوتے ہیں۔ خواہ مطلع پورے قصیدہ میں ایک ہی ہو یا چند ہوں۔ دوسرے کی مثال خاقانی کے یہاں بکثرت ہے۔

(۲) قصیدۂ ترجیع وہ قصیدہ ہے جس میں اتحاد وزن ہو، لیکن مختلف خانوں اور بندوں میں اس کو تقسیم کر دیا جائے اور ہر بند یا خانہ کا قافیہ الگ اختیار کیا جائے، عام اس سے کہ ہر بند میں بند کے ایک ہی شعر کو بار بار دہرایا جائے۔ یا اس کو بھی بدل بدل کر باختلاف قافیہ لایا جائے۔ یا ہر بند کو ایک ہی متحد قافیہ پر لایا جائے،

(۳) متاخرین نے اس قصیدہ کو جس میں مختلف خانوں اور بندوں میں بند کا ایک ہی شعر لایا جائے، ترجیع کہا ہے اور جس قصیدہ میں ہر بند کا شعر الگ الگ ہو اس کو ترکیب بند کا نام دیا ہے۔

اس تحقیق کی بنا پر ترکیب بند ماہرین کے نزدیک دراصل قصیدہ ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لئے ترکیب بند کو قصیدہ کہنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔

(راقم۔ ایک گمنام عظیم آبادی)

مسلمان سلاطین و امراء کے اخلاق پر ایک نظر

(تاریخ اخلاق اسلام کا ایک باب)

از
مولانا عبد السلام ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ

مسلمان سلاطین و امرا کا گروہ اخلاقی محاسن و معائب دونوں کا مجموعہ ہے، ان کے اخلاقی معائب میں ۔

(۱)　سب سے پہلی چیز جو نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ عیش پرستی ہے۔ جس کی ابتداء دور بنو امیہ سے ہوئی، اور عباسی دور میں اوس نے بہت زیادہ ترقی کی اور اس کے بعد وہ سلاطین و امراء کا عام شعار بن گئی، کیونکہ یہ عیش پرستی ایرانی تمدن کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اور یہی تمدن زمانہ مابعد میں بھی قائم رہا۔ چنانچہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں لکھتا ہے کہ "ایرانی تمدن بنو امیہ اور بنو عباس میں منتقل ہوا اور بنو امیہ نے اندلس میں جو تمدن قائم کیا وہ سلاطین مغرب یعنی موحدین اور اوس زمانے کے زناتہ میں منتقل ہوا اور بنو عباس کا تمدن درجہ بدرجہ پہلے دیلمیوں میں۔ پھر ترکوں میں پھر سلجوقیوں میں پھر مصر کے ترک ممالک میں اور عراقین کے تاتاریوں میں منتقل ہوتا رہا"[1] اس لئے خلفائے عباسیہ اور خلفائے بنو امیہ کے بعد جو سلاطین و امراء ہوئے انہوں نے بھی اس معاملے میں اونکی تقلید کی اور عیش پرستی کی تمام صورتیں قائم ہوگئیں۔ چنانچہ مستند تاریخوں اور تذکروں میں اس قسم کے جو دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ ہم اونکو اس موقع پر درج کرتے ہیں۔

معتضد باللہ جو اندلس کا فرمانروا تھا۔ عورتوں کا نہایت شیدائی تھا۔ اور بہت سی عورتوں کے ساتھ جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں نکاح کیا تھا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے۔

اس معاملے میں وہ جس حد تک پہنچ گیا تھا
اوس کا کوئی ہمسر وہاں تک نہ پہنچ سکا

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۴۵　[2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۲۸ ۔

ابو طاہر محمد بن بقیہ عزالدولہ کا وزیر تھا۔ اور اس کے یہاں ہر مہینے میں ہزار من موم بتی صرف ہوتی تھی، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ جب موم بتی کا اسقدر خرچ تھا جس کی ضرورت کم پڑتی ہے، تو اور ضروری چیزوں کا خرچ کس قدر رہا ہوگا[1]

ملک اشرف مظفرالدین نہایت عیش پرست بادشاہ تھا۔ ایک دن بزم طرب میں کسی باجے کی آواز سنکر اسقدر مسرور ہوا کہ باجا بجانے والے سے کہا کہ "مجھ سے کوئی خواہش کرو" اوس نے کہا کہ "مجھے شہر خلاط عنایت فرمائیے" اوس نے وہ شہر اوسکو دیدیا، اور وہ اوس شہر کے گورنر کے پاس آیا اور اوس شہر کے حوالہ کرنے کی درخواست کی، بالآخر اوس نے بہت سا مال دیکر اوس سے مصالحت کر لی۔

دمشق کے باہر اوس نے ایک محل تعمیر کردیا تھا جس میں عیش پرستی کے گوناگون سامان جمع کیے تھے۔ اور اوس میں اسقدر فسق و فجور ہوتا تھا جو بیان میں نہیں آسکتا۔ لوگوں نے اوسکو سمجھایا کہ مسلمانوں کے ملک میں اس قسم کے مکان کا رہنا مناسب نہیں اس لیے اوس نے اس کو گرادیا کر اوس جگہ ایک مسجد تعمیر کرادی جسکا نام لوگوں نے جامع التوبہ رکھا کہ یہ اوسکی توبہ کی ایک یادگار تھی[2]

ابو الفتوح بلکین بن زیری کے محل میں چار سو کنیزیں تھیں۔ یہاں تک کہ ایک دن اوسکو سترہ بچوں کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی گئی[3]۔ شمس الدولہ توران شاہ سلطان صلاح الدین کا بھائی تھا۔ جس نے یمن کو فتح کیا تھا۔ اور وہاں اوس کا بڑا اقتدار قائم ہو گیا تھا لیکن چونکہ اوس نے شام میں نشو و نما پائی تھی۔ جہاں عیش پرستی کے تمام سامان میسر تھے۔ اس لیے وہ یمن جیسے خشک اور بنجر ملک میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس غرض سے اوس نے سلطان صلاح الدین کو ایک خط لکھا اور شام میں واپس آنے کی اجازت طلب کی لیکن سلطان صلاح الدین نے ایک قاصد کے ذریعہ سے اوسکو یہ پیغام دیا۔ کہ یمن نہایت زرخیز اور وسیع ملک ہے، اوس کا چھوڑنا مناسب نہیں۔ اوس نے اس پیغام کو سنا تو خزانچی سے ہزار درہم طلب کیے، اور مہتمم خانہ کو حکم دیا کہ اس سے بازار سے برف کا ایک ٹکڑا منگائے۔ اوس نے کہا "بھلا یمن میں برف کہاں"؟۔ بولا "تو کشمکش کی ایک ٹوکری ہی خرید لی جائے" اوس نے کہا کہ "یہ بھی یہاں نہیں مل سکتی" غرض وہ دمشق کے تمام میوہ جات کا نام لیتا جاتا تھا اور وہ تعجب سے کہتا تھا کہ یہ میوے یہاں کہاں مل سکتے ہیں؟۔ آخر میں اوس نے قاصد سے کہا کہ "آخر میں اس مال و دولت کو لیکر کیا کروں؟ جب میں اوس سے لطف اندوز ہی نہیں۔ مال بذات خود نہیں کھایا جاتا بلکہ اوس کا فائدہ صرف یہ ہے کہ انسان اوسکو اپنے اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے قاصد نے صلاح الدین کو اس کی خبر دی تو اوس نے اوسکو دمشق میں واپس آنے کی اجازت دیدی[4]

وزیر ابو الحسن بن فرات کے گھر میں دو باورچی خانے تھے۔ ایک باورچی خانہ خاص جس میں اسقدر بکریوں اور جانوروں کا گوشت صرف ہوتا تھا کہ اون کا شمار نہیں ہو سکتا۔ دوسرا باورچی خانہ عام جس میں غلاموں اور دربانوں وغیرہ کا کھانا پکتا تھا۔ اور اوس میں روزانہ نوے بکریوں، تین دنبوں، دو سو مرغیوں، دو سو تیتروں اور دو سو چوزوں کا گوشت صرف ہوتا تھا۔ باورچی رات دن میدے کی روٹیاں پکایا کرتے تھے، بہت سے لوگ برابر مٹھائیاں تیار کیا کرتے تھے، برف کا پانی ہر شخص کو پلایا جاتا تھا۔

[1] ابن خلکان جلد [illegible] صفحہ [illegible] [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۴۰ [3] ابن خلکان جلد اول صفحہ [illegible] [4] ابن خلکان جلد اول صفحہ [illegible]

خدام صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہاتھ میں سکنجبین یا گلاب کا پیالہ، پانی کا کوزہ اور صاف ستھرے رومال لئے ہوئے گھوما کرتے تھے اور تمام لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے[1] اسی وزیر کے یہاں روزانہ چند مخصوص لوگ کھانے پر بلائے جاتے تھے۔ اور سب سے پہلے ہر ایک کے سامنے ایک ایک طبق رکھا جاتا تھا جس میں اوس وقت کے تمام بہترین میوے ہوتے تھے۔ پھر بیچ میں اسی قسم کا ایک بڑا طبق رکھا جاتا تھا۔ اور ہر طبق میں ایک چھری اور اوس کے ساتھ شیشے کا ایک طشت ہوتا تھا۔ لوگ چھری سے میوے کاٹ کاٹ کر کھاتے جاتے تھے۔ اور چھلکوں کو شیشے کے طشت میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہوجاتے تھے تو طبق اُٹھائے جاتے تھے۔ اور ہاتھ دھونے کے لئے طشت اور لوٹے لائے جاتے تھے۔ اس کے بعد خوان میں کھانا لایا جاتا تھا۔ جو عمدہ کپڑوں اور سرپوشوں سے ڈھکا رہتا تھا۔ اوسکے نیچے دسترخوان ہوتا تھا اور اوس کے گرد ہاتھ پونچھنے کے لئے رومال رکھے رہتے تھے۔ خوان رکھا جاتا تھا تو سرپوش وغیرہ اٹھائے جاتے تھے اور لوگ کھانا کھانا شروع کرتے تھے۔ اور ابوالحسن بن فرات اون کے ساتھ دلچسپ باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس طرح مختلف قسم کے کھانوں کے رکھنے اور اُٹھانے میں دو گھنٹے سے زائد صرف ہو جاتے تھے[2]

مختلف قسم کے جانوروں، درندوں اور پرندوں کا پالنا بھی اسی عیش پرستی کے سلسلے میں داخل ہے۔ جس کی ابتدا یزید بن معاویہ نے کی۔ اور بعد کو دوسرے سلاطین و امراء نے اس کی تقلید کی۔

ان جانوروں اور پرندوں کے پالنے کا

(۱) ایک مقصد تو شکار ہوتا تھا، اور یزید نے اس غرض سے جو کتے پال رکھے تھے، اون کو سونے کے کنگن پہنایا تھا۔ اور سنہرے کام کی جھولیں اوڑھاتا تھا۔ اور ہر کتے کی خدمت کیلئے ایک ایک خادم مقرر کیا تھا۔

(۲) دوسرا مقصد ان جانوروں کا باہم لڑانا اور اون کا تماشا دیکھنا تھا۔

اس کے علاوہ مختلف قسم کے عجیب و غریب جانوروں کا جمع کرنا اور اُن کے طبائع اور اخلاق و عادات اور حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ اس غرض سے سلاطین و امراء کا یہ دلچسپ مشغلہ ہو گیا۔ اور اس میں یزید بن معاویہ، سلطان مسعود بن محمود، خلیفہ ناصر اموی، خمارویہ ابن طولون، وزیر جعفر بن فضل بن فرات خلیفہ عزیز باللہ۔ اکبر اور جہانگیر نے خاص ناموری حاصل کی۔ اور ان کے جمع کرنے اور پرورش کرنے میں بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ لیکن ان کے متعلق تاریخوں میں جو دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ ہم اونکو بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ ایک اخلاقی مسئلہ تھا جو مختلف اخلاقی نقطۂ نظر قابل اصلاح تھا۔

(۱) ایک تو یہ کہ جانوروں کے ساتھ یہ ایک بیرحمی ہے۔ جو شرعاً جائز نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن التحريش بين البهائم[3]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم جانوروں کے لڑانے کی ممانعت فرمائی۔

[1] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۱۹۵۔ [2] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۲۰۴۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

اور شارح حدیث نے لکھا ہے کہ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے بلا ضرورت جانوروں کو جسمانی تکلیف پہونچتی اور خلیفہ مہدی باللہ نے اسی نقطۂ نظر سے جب دور عباسیہ کی عیاشانہ زندگی کی اصلاح کرنی چاہی تو تمام لڑانے والے جانوروں کو قتل کرا دیا۔

(۲) یہ لہو و لعب کی ایک قسم ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رای رجلا یتبع حمامۃ فقال شیطان یتبع شیطانۃ[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک کبوتر کا پیچھا کر رہا ہے تو فرمایا کہ شیطان چڑیل کا پیچھا کر رہا ہے۔

(۳) جانوروں اور پرندوں کے لڑانے اور لڑانے پر بازی لگائی جاتی جو قماربازی ہے۔ اور صحابہ نے اس قسم کی بازی لگانے سے لوگوں کو روکا ہے[2]۔ ان مقاصد کے علاوہ پرندوں کا پالنا شرعاً جائز ہے۔ اور صحابہ عام طور پر پنجروں میں چڑیوں کو پالتے تھے[3]۔

عیش پرستی کی اور بھی بہت سی صورتیں تھیں جن میں سلاطین و امراکا گروہ مبتلا تھا۔ ہم نے بطور نمونہ و مثال کے صرف چند واقعات درج کئے ہیں۔ وہ نہ ہر دور میں مسلمان سلاطین و امراء کے حالات میں ان کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے سخت زاہدانہ زندگی بسر کی۔ اور مسلمانوں پر نہایت شدہ اخلاقی اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے اسلام کی اخلاقی تاریخ میں حضرت عمر بن عبد العزیز اور خلیفہ مہتدی باللہ کا نام نہایت روشن ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد نام ملتے ہیں۔ مثلاً ابو العباس احمد بن ہارون رشید سبتی کے حال میں ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ نہایت صالح آدمی تھا۔ اپنے باپ ہی کی زندگی میں دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ اور دنیوی امور میں کسی چیز سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ حالانکہ وہ صاحب مقدرت تھا اور اوس کا باپ دنیا کا خلیفہ تھا۔ اوس کو سبتی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سبت یعنی سنیچر کے دن اپنے ہاتھ سے کچھ کما لیا کرتا تھا۔ اور اسی کو ہفتے بھر صرف کرتا تھا[4]۔

ابو یعقوب یوسف بن تاشفین جو ملثمین کا بادشاہ تھا نہایت معتدل اور سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک بار وہ اشبیلیہ میں خلیفہ کا مہمان ہوا۔ جس کے محلات نہایت شاندار تھے، اور اُن میں کھانے، پینے، پہننے اور بچھانے کے گوناگوں سامان مہیا کئے گئے تھے۔ معتمد نے اوس کو اپنی محلوں میں سے ایک محل میں ٹھہرایا اور شاہانہ طریقے سے اوسکی مہمانداری کی۔ ابن تاشفین کے رفقاء نے یہ ساز و سامان دیکھے تو اُس کو بھڑکایا کہ وہ بھی اسی طریقے سے زندگی بسر کرے۔ کیونکہ سلطنت کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ عیش و طرب کے ساتھ زندگی بسر کی جائے۔ جیسا کہ معتمد اور اوس کے رفقاء بسر کر رہے ہیں۔ لیکن اُس نے سختی کے ساتھ ان لوگوں کو سرزنش کی اور کہا کہ معتمد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقبوضہ ملک کو ہاتھ سے کھو دیگا۔ کیونکہ جس مال سے وہ اس قسم کی عیاشانہ و مسرفانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے منصفانہ طریقہ پر نہ لیا گیا ہوگا۔ بلکہ اوس نے ظالمانہ طریقوں پر لیا ہوگا۔ اور ان لغویات میں خرچ کیا ہوگا۔ اور جو شخص صرف پیٹ پالنے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ ملک و رعایا کی حفاظت کیا کرے گا۔ پھر اُس نے دریافت کیا تو علوم

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعب بالحمام۔ [2] ادب المفرد باب قمار الدیک و قمار الحمام [3] ادب المفرد الطیر فی القفص۔ [4] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۵۳۔

ہوا کہ وہ ہمیشہ عیش پرستی میں مشغول رہتا ہے اور کوئی وقت اُس کا اس سے خالی نہیں جاتا۔ اُس کے اعوان و انصار کو اس قسم کے سامان عیش میسر نہیں۔ اوس نے کہا، "تو پھر وہ لوگ اوس سے راضی کیونکر رہتے ہیں؟" لوگوں نے کہا کہ "بالکل راضی نہیں رہتے"۔ یہ سنکر یوسف بن تاشفین نے گردن جھکا لی[1]

فرمانروایان ہندوستان میں سلطان ناصر الدین محمود اور عالمگیر زہد و تقشف میں نہایت شہرت رکھتے ہیں چنانچہ فرشتہ ناصر الدین کے حالات میں لکھتا ہے۔

او بادشاہے بود شجاع و متعبد و کریم اکثر نفقۂ خاصۂ خود از وجہ کتابت مصحف مجید ساختہ روزگار خود می گذرانید و اموال بادشاہی را در نفقۂ خود صلاح صرف نمی نمود۔

ایک بار ایک امیر نے سلطان کے لکھے ہوئے قرآن کو زیادہ قیمت پر خریدا، سلطان کو اطلاع ملی تو اس کو ناپسند کیا اور حکم دیا کہ اسکے بعد میرے لکھے ہوئے قرآن کو مخفی طور پر معمولی قیمت پر فروخت کیا جائے۔

منکوحہ بی بی کے علاوہ سلطان کے گھر میں کوئی لونڈی یا خادمہ نہ تھی۔ اس لئے بی بی ہی کو سلطان کا کھانا پکانا پڑتا تھا۔ جس سے اُس کو تکلیف ہوتی تھی، اُس نے سلطان سے اس کی شکایت کی اور کہا کہ اگر ایک لونڈی خرید لیجئے تو کوئی ہرج نہیں، سلطان نے جواب دیا کہ بیت المال سے روپیہ لیکر لونڈی خریدوں، صبر کرو کہ خدا تم کو آخرت میں جزائے خیر دے۔ ان کے علاوہ اس قسم کے تو بہت سے فرمانروا گذرے ہیں جنہوں نے اگرچہ اسقدر زہد و تقشف نہیں اختیار کیا ہے۔ تاہم نہایت معتدل اور باوقار اخلاقی اور مذہبی زندگی بسر کی ہے۔

(۲) دوسری قابل اعتراض چیز امراء و سلاطین کے مظالم ہیں۔ لیکن ان مظالم کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک تو وہ جو سیاسی اسباب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً جنگ و بغاوت قیام سلطنت میں مزاحمت، سازش وغیرہ لیکن یہ مظالم صرف مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اس سلسلے میں فرمانروایان اسلام نے اگرچہ باپ، بھائی بیٹے، عزیز و اقارب تک کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ تاہم اُن کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ اور سیاسی وجوہ سے اُن کا جواز ثابت کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرے وہ جو عام مجرموں اور عام سزاؤں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً کسی جرم پر کسی کے ہاتھ پاؤں کٹوا لینا۔ ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دینا۔ پہاڑ کی چوٹی سے گرا دینا وغیرہ وغیرہ، اگرچہ ان سزاؤں کا عام رواج نہ تھا تاہم ہمارے سلاطین و امراء نے مختلف موقعوں پر اس قسم کی سزائیں دی ہیں۔ اور اُنہوں نے اسلام کی اخلاقی تاریخ کے صفحات پر قساوت و سنگدلی کا نہایت بدنما داغ لگا دیا ہے۔ ہم اس موقع پر اس قسم کی وحشیانہ سزاؤں کی چند مثالیں درج کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس قسم کی وحشیانہ سزاؤں کی ابتدا ابن الزیات نے کی جو خلیفہ معتصم کا وزیر تھا۔ اُس نے مجرموں کو سزا دینے

[1] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔

کیلئے لوہے کا ایک تنور بنوایا تھا جس کے گرد لوہے کی تیز سلاخیں لگی ہوئی تھیں مجرم اُس میں بند کر دے جاتے تھے، اور جب کوئی مجرم اُس میں سزا کی تکلیف سے بیقرار ہو کر حرکت کرتا تھا تو یہ سلاخیں اُسکے جسم میں چبھ جاتی تھیں اور وہ اس سے اور زیادہ اذیت محسوس کرتا تھا۔ اس حالت میں اگر کوئی مجرم رحم کی درخواست کرتا تو اوسکو یہ جواب ملتا کہ "رحم ایک فطری کمزوری ہے" لیکن اُس کو اس وحشیانہ سزا کی سزا دنیا ہی میں مل گئی۔ چنانچہ خلیفہ متوکل نے جب اُس کو گرفتار کیا تو اسی تنور میں بند کر دیا۔ اُس نے کہا کہ "اے امیرالمومنین مجھپر رحم فرمائیے" لیکن اوس نے طنزاً وہی جواب دیا جو وہ اپنے مجرموں کو دیا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ "رحم ایک فطری کمزوری ہے" اس موقع پر اوسکے غلام نے ایک عجیب اخلاقی نکتہ بیان کیا، یعنی جب وہ تنور میں بند کیا گیا تو اوس کے غلام نے کہا کہ "آپ کا یہ انجام ہوا اور اسوقت آپ کا کوئی مداح نہیں ہے" اوس نے کہا "آخر برامکہ کے احسان نے ادن کو کیا فائدہ پہونچایا؟" بولا یہی کہ اسوقت آپ اُن کا ذکر رہے ہیں اوس نے کہا "سچ کہتے ہو"[1]

نصیر الدولہ ابو الطاہر محمد بن بقیہ عزالدولہ بختیار بن معزالدولہ کا وزیر تھا اور عزالدولہ اور اوس کے چچازاد بھائی عضدالدولہ میں عداوت تھی، اسلئے عزالدولہ کی خوشامد سے محمد بن بقیہ عضدالدولہ کے متعلق ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ جو اوس کو ناگوار گذرتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اوس نے دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ کروادی۔ اور اس جنگ میں عزالدولہ نے شکست کھائی اور اس شکست کا سبب محمد بن بقیہ قرار پایا۔ اس جرم میں عزالدولہ نے اوس کی آنکھوں میں سلائی پھیر واکر عضدالدولہ کے پاس بھجوا دیا۔ عضدالدولہ نے تمام شہر میں پہلے اوس کی تشہیر کرائی۔ پھر اوس کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈالوا دیا۔ اوسکے بعد اوس کو سولی پر چڑھادیا[2]

ابن السکیت ایک ادیب تھا جو متوکل کے بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ وہ تفضیلیہ تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام خلفاء پر ترجیح دیتا تھا۔ ایک دن وہ متوکل کی خدمت میں حاضر تھا کہ اسی حالت میں متوکل کے دونوں لڑکے معتز اور مؤید آئے۔ متوکل نے اوس سے کہا کہ تم کو میرے یہ دونوں بچے محبوب ہیں یا حسن و حسین؟ ابن سکیت نے اوس کے دونوں بچوں کی تنقیص کی اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے فضائل بیان کئے، اسپر متوکل نے ترکوں کو حکم دیا اور وہ سب اوس کے پیٹ پر چڑھ بیٹھے، یہانتک کہ وہ گھر پہونچکر دوسرے دن مرگیا[3] ایک روایت میں ہے کہ اوس نے گدی سے اوس کی زبان نکلوائی[4]

امیر شمس المعالی ابوالحسن قابوس اگرچہ نہایت خوبیوں کا بادشاہ تھا۔ لیکن اسیکے ساتھ نہایت ظالم اور سنگدل بھی تھا ابن خلکان نے اوس کے حال میں لکھا ہے۔

یقابل زلۃ القدم باراقۃ الدم لا تذکر العفو عند الغضب۔ معمولی لغزشوں پر قتل کی سزا دیتا تھا۔ اور غصے کے وقت عفو و درگذر کا نام بھی نہ لیتا تھا۔

---

[1] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۷۵۔ [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۶۳۔ [3] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۰۹۔
[4] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۱۱۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اوس کی ظلم و قساوت سے تمام فوج باغی ہوگئی اور اوس کو ایک قلعہ میں قید کردیا جس میں وہ مرگیا[1]۔

لیکن اسیکے ساتھ بہت سے سلاطین و امراء نے عفو و درگذر اور حلم و بردباری کی بھی نہایت روشن مثالیں قائم کی ہیں چنانچہ مہدی جب خلیفہ ہوا تو تمام قیدیوں کے رہا کرنے کا عام حکم دیدیا[2]۔ مہدی کے دور خلافت سے پہلے خراج کے وصول کرنے میں نہایت سختیاں کی جاتی تھیں۔ مہدی خلیفہ ہوا تو اوس نے محمد بن مسلم سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ اور اوس نے یہ مشورہ دیا کہ اہل خراج مسلمانوں کے قرضدار ہیں، اور ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہیئے جو قرضداروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مہدی نے اس مشورے کو قبول کیا اور تمام عمال کے پاس تحریری حکم بھیجدیا کہ اہل خراج کو جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ نہ دیجائیں[3]۔

یحییٰ بن خالد اسقدر حلیم و بردبار تھا کہ اپنے غلاموں کو تادیباً بھی کسی قسم کی سزا نہیں دیتا تھا۔ اوس سے لوگوں نے کہا کہ "آپ اپنے غلاموں کی تادیب کیوں نہیں کرتے؟" تو جواب دیا کہ ہم نے اون کو اپنی ذات کا امین بنا رکھا ہے۔ اگر ہم اون کو خوفزدہ کرتے رہینگے تو ہم کو اون پر اعتماد نہ رہے گا[4]۔ اوس نے یہ عہد کرلیا تھا کہ برائی کے بدلے میں کسیکے ساتھ برائی نہ کریگا۔ اور اوس نے اس عہد کو پورا کیا[5]۔

نصر الدولہ ابو نصر احمد بن مروان نے اپنے پورے عہد سلطنت میں ایک شخص کے سوا کسی کو سزا نہیں دی[6]۔

ابوالہول حمیری نے فضل بن یحییٰ بن خالد برمکی کی ہجو لکھی تھی، اوس کے بعد اوس کی خدمت میں آیا کہ اوس کی فیاضیوں سے فائدہ اوٹھائے، لیکن فضل نے کہا کہ "تم کس منہ سے میرے پاس آئے ہو"؟ اوس نے کہا کہ "اوسی منہ سے جس سے خدا کے پاس جاؤں گا"، حالانکہ میں تم سے زیادہ خدا کا گنہگار ہوں۔ فضل ہنس پڑا اور اوس کو صلہ دیا[7]۔

نظام الملک اور تاج الملک ابوالغنائم میں باہم دشمنی تھی۔ اس لئے ابوالغنائم نے ابن ہباریہ کو اسپر آمادہ کیا کہ وہ اگر نظام الملک کی ہجو لکھے تو اوس کو انعام ملے گا۔ ابن ہباریہ چونکہ نظام الملک کا ممنون احسان تھا۔ اس لئے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن بالآخر مجبوراً اوسکو ہجو لکھنی پڑی، نظام الملک نے یہ ہجو سنی تو اوس سے نہ صرف درگذر کیا بلکہ اپنے احسانات میں اضافہ کردیا۔ ابن خلکان نے اس واقعے کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

فکانت ھذہ معدودۃ من مکارم اخلاق نظام الملک وسعتہ[8]

یہ واقعہ نظام الملک کے مکارم اخلاق اور اوس کے حلم کی وسعت میں شمار کیا جاتا ہے۔

وزیر ابوالحسن بن فرات نہایت حلیم و بردبار تھا۔ اوس کی عام عادت یہ تھی کہ جب کوئی محرر غلطی کرتا تو اوس کو کسی قسم کی سرزنش نہ کرتا بلکہ خود اوس سے اوس غلطی کی اصلاح کرواتا۔ اگر اوس کا کوئی دوسرا رفیق طعنہ زن ہوتا تو اوس کو سرزنش کرتا اوس غلطی کو معمولی

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۲۶۔ [2] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۱۸۰۔ [3] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۱۶۲-۱۴۳۔
[4] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۴۴۔ [5] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۴۸۔ [6] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۵۷۔
[7] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۰۴۔ [8] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۵۔

چیز سمجھتا اور ... س کا عذر قبول کرتا۔ ایک بار فراش نے جلدی میں شمع کا گل تراشا جس سے ایک چنگاری اوڑ کر وزیر ابوالحسن کے پاس پہونچی خادم نے اوس کو سزا دینی چاہی لیکن وزیر نے اوس کو ڈانٹا اور کہا کہ "تمہارے خیال میں کیا غریب نے مجھکو بالقصد جلانا چاہا؟ یہ جو کچھ ہوا غلطی سے ہوا۔ تم اپنی جگہ واپس آ ؤ"[۱]

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اگرچہ بعض موقعوں پر جتنا کہ سزائیں دی ہیں۔ تاہم جہانگیر نے اسمیں اسقدر اصلاح کردی کہ اس کو صرف بادشاہوں تک محدود رکھا اور دوسرے امرا و عمال کو اس کی ممانعت کردی۔ چنانچہ امرا کے نام چند چیزوں کی ممانعت کے متعلق جو فرمان روانہ کیا اون میں ایک چیز یہ تھی۔

در سیاستہا گوش و بینی نہ برند[۲]

(۳) ایک اور بداخلاقی جو سلاطین و امرا کے درباروں سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ چغلخوری، غمازی، سازش اور جوڑ توڑ ہے، اور اوس کی بدولت ایشیائی سلطنتوں میں سینکڑوں انقلابات ہوتے رہے ہیں۔ سینکڑوں لوگ بڑے بڑے عہدوں سے معزول ہوئے ہیں اور سینکڑوں لوگوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ بداخلاقی بذات خود امرا و سلاطین کی ذات سے تعلق نہیں رکھتی، تاہم اون کی بے پروائیوں اور بے احتیاطیوں سے بہت کچھ اس کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس لئے وہ بھی بالواسطہ اوس کے خطرناک نتائج کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارے سلاطین و امرا میں بہت سے لوگ ایسے بھی گذرے ہیں۔ جنہوں نے اس بداخلاقی کا سد باب کیا ہے۔ اور لوگوں کو اس بداخلاقی کے مرتکب ہونیسے روکا ہے۔ مثلاً عبد العزیز بن مروان جب دمشق کا والی ہوا تو وہ نہایت کمسن تھا۔ اس لئے اہل دمشق نے اوس کی سادہ لوحی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اوٹھانا چاہا اور ایک آدمی نے اوس سے کہا کہ میرا ایک پڑوسی ہے، جو آپ کا نافرمان اور باغی ہے"۔ اس کے علاوہ اوس کے اور بھی بہت سے عیوب بیان کئے، عبد العزیز نے یہ سنکر کہا کہ "نہ تم نے خدا کا ڈر کیا۔ نہ اپنے امیر کی عزت کی، نہ حق ہمسائگی کا لحاظ رکھا، اگر تم چاہو تو ہم اس معاملے میں غور کریں، اگر تم سچے نکلوگے تو اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ پہونچے گا۔ اگر جھوٹے نکلوگے تو ہم تمہیں سزا دیں گے۔ اور اگر درگذر چاہتے ہو تو ہم تم سے درگذر کرینگے۔ اوس نے کہا تو مجھ سے درگذر ہی فرمایئے"[۳]

فضل بن یحیٰی چغلخوروں سے سخت بغض رکھتا تھا۔ اور اوس کے پاس جب کوئی چغلخور آتا تو کہتا کہ "اگر تم نے ہم سے سچی بات کہی ہے تو ہم تم سے بغض رکھیں گے۔ اگر جھوٹ بات کہی ہے تو ہم تم کو سزا دیں گے۔ اور اگر ہم سے درگذر کرنے کی درخواست کروگے تو ہم تم سے درگذر کرینگے"۔ ایک بار اوس کو اطلاع دی گئی کہ ایک افسر بہت سا سرکاری مال خورد برد کرگیا ہے اوس نے اوس کے جواب میں لکھا کہ "چغلخوری کا قبول کرنا چغلخوری سے بدتر ہے۔ کیونکہ چغلخوری صرف بتا دیتی ہے۔ اور اوس کا قبول کرنا اوس کی اجازت دینا ہے۔ اور جو شخص ایسی چیز کو قبول کرتا ہے جس کی خدا نے ممانعت کی ہے۔ وہ اوس سے دور پڑجاتا ہے۔ اور بس قابل ہے کہ اس کی بات نہ مانی جائے"[۴]

(باقی آیندہ)

[۱] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۱۴۵ [۲] ترک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۰۱ [۳] فخری صفحہ ۵۰ [۴] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۹

افسانہ ومحاضرات

ہمارے پروفیسر

از جناب سید ظہیر الدین حسن ام ۔ اے، (عثمانیہ)

ٹھیک ۱۰ بجکر ۳۰ منٹ پر جب یونیورسٹی کالج پہونچا تو جماعت طلبہ سے بھر چکی تھی، سامنے کی نشستوں پر اگرچہ چند کرسیاں خالی تھیں۔ لیکن یہ تمام نشستیں عورتوں کے لئے مخصوص تھیں، اس لئے ان پر تو قبضہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے پیچھے کی آخری نشستوں میں سے ایک پر بیٹھنا پڑا۔

جماعت میں طلبہ کے آپس کی گفتگو، قہقہوں کی آواز، آنے جانے اور بار بار نشستوں کی تبدیلی سے ایسا شور ہو رہا تھا۔ کہ بالکل بازو ہی میں بیٹھنے والے طالب علم کی گفتگو بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، ٹھیک پانچ منٹ کے بعد کلاس میں یک لخت سناٹا چھا گیا۔ اور پھر خاموشی کی اسی حالت میں ہم سب نے یک نظر دروازے سے اپنے ہر دلعزیز، خوبصورت اور نوجوان پروفیسر کو آتے ہوئے دیکھا تمام کمرہ بھینی، مدہوش کن خوشبو سے معطر ہو گیا۔ اور ایسا جیسا کہ خوشبودار پھولوں کی کیاریوں کے پاس سے ہوتا ہوا سہانی رات میں ہوا کا ایک نرم رو جھونکا تھا، جو دروازہ سے آتا ہوا در و دیوار تک پھیل گیا۔ انہوں نے اپنی انگریزی ٹوپی اتار کر اپنی کرسی پر رکھی۔ اور پھر کرسی قریب کھینچکر بایاں پاؤں اس پر رکھتے ہوئے حاضری کا رجسٹر کھولا۔ وہ اسوقت بادامی رنگ کا تنگ ریشمی سوٹ پہنے ہوئے تھے، جس پر کہیں شکن نہ تھی۔ جب وہ جھک کر حاضری لینے لگے تو باریک مانگ سیاہ بالوں کے دوپٹہ کے اندر سے کہکشاں، کی طرح چمک رہی تھی حاضری کے اس وقفے میں ہم سب کی نگاہ ان کی مانگ، گھنی پلکوں اور بے داغ چہرے سے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہٹی۔ یہ "عمرانیات"، کا کلاس تھا۔ اور مالتھس کا نظریہ آبادی زیر سبق تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک طرف تو آبادی کی اس تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار اور دوسری طرف قدرتی ذرائع معاش کی کمی کی وجہ سے شرح اموات کی زیادتی، پیدا ہونے والی؛ نسل کی کمزوری اور وباؤں کی کثرت کی بنا پر ضبط تولید کی فوری ضرورت ہوئی تاکہ اس ناکارہ بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں رکھکر موجودہ عالمگیر کساد بازاری کو روکا جا سکے"

یہاں پر ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر پوچھا کہ ضبط تولید سے کیا مراد ہے؟ تجرد کی زندگی یا۔

پروفیسر صاحب نے اس استفسار پر فوراً بائیں ہاتھ سے جس میں چھوٹی سی خوبصورت، سنہری گھڑی نازک کلائی پر اپٹی بندھی

ہوئی تھی۔ طالب علم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ضبط تولید سے تجرد بھی مراد لیا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ پورے معاشرہ اور سوسائٹی کو تجرد کی زندگی پر کسی قانون یا اخلاقی دباؤ سے رد کا ہیں جا سکتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس سے ہماری مراد ایسے بے ضرر اور عملی ذرائع کا اختیار کرنا ہے۔ جن سے سلسلہ آبادی کو روکا بھی جا سکے اور جو بھی نقطہ نگاہ سے ضرر رساں بھی نہ ہو گا۔"

سامنے کی نشستوں پر بیٹھنے والی خواتین میں سے اکثر کا سر نیچے جھک گیا۔ چہرے شرمندگی کے جذبات سے سرخ ہو گئے، اور میں نے دیکھا کہ میرے پاس بیٹھے ہوئے طالب علم کی نگاہیں بھی میز پر جم کر رہ گئیں۔ اور کاپی پر پنسل سے مہمل لکیریں بنانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد گھنٹی بجی اور گھنٹی کی پرشور گونج میں ہمارے ہر دلعزیز پروفیسر صاحب کے لیکچر کے آخری الفاظ گم ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے کرسی پر سے اپنی انگریزی ٹوپی اٹھائی۔ پھر رجسٹر ہاتھ میں لیا اور اپنے کمرہ کی طرف چلے گئے میرے پاس بیٹھنے والے دوست نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

آؤ ذرا پروفیسر صاحب سے پرودھن[1] کی کتاب کا ایک حوالہ پوچھیں۔ گیلری میں پروفیسر صاحب تیزی سے اپنے کمرہ کی طرف جا رہے تھے، اپنے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر سگریٹ جلانے کے لئے وہ ذرا کھڑے ہوئے تھے ہم دونوں کو آتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔"

کیوں، کیا ہے؟

جی ذرا پرودھن کے متعلق ایک حوالہ پوچھنا ہے۔

مجھے اس وقت ضروری کام ہے۔ کل پوچھ لینا۔ یہ کہہ کر پروفیسر صاحب دروازہ کھولتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ اور ہم دونوں اپنے کلاس کی طرف واپس آ رہے تھے کہ پروفیسر صاحب کے کمرہ کے قریب سے ایک آواز آئی۔

کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔

ہاں ہاں اندر آئیے۔

ہم نے کمرہ کی طرف مڑ کر دیکھا تو دروازہ کے باہر کوئی بھی نہ تھا۔

(۲)

دوسرا گھنٹہ اردو کا تھا۔ اور کلاس میں آج دو دن سے اردو کے دو مکتب لکھنؤ اور دہلی زیر بحث تھے، اور اسی سلسلہ کا یہ آج تیسرا اور آخری لیکچر تھا۔ طلبہ کی بڑی جماعت لکھنؤ کی حامی تھی۔ اور خود پروفیسر صاحب دلی کے مکتب کے ہمخیال تھے، سامنے کی نشست پر صرف دو ہی عورتیں تھیں۔ شرر کی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" سے حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر صاحب نے کہا۔

"لکھنؤ دراصل اس وقت آباد ہوا جب دلی اجڑ گئی۔

"تو یہ دلی مونث کیوں ہے؟ ایک آواز آئی۔

"آخر میں "ی" ہے کسی نے جواب دیا۔

"اور بمبئی؟ ایک طالب علم نے پوچھا۔

"اور اٹارسی؟ دوسرے نے کہا۔

"اور جرمنی؟ بہت پیچھے سے ایک آواز آئی۔ پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے ایک خاموش تھے

---

[1] Joseph Proudhon

شور اور ہنسی زیادہ دیکھتے ہوئے بولے۔

"خیر جانے دیجئے اس تذکیر و تانیث کو۔ تو ہاں
میں کہہ رہا تھا کہ دہلی کے ویران ہو جانے کے بعد جب لکھنؤ
آباد ہوا۔ تو دہلی کے آئین دربار، رسم و راہ، شاعروں کے آداب
لال قلعہ سے نکل کر لکھنؤ میں رواج پانے لگے۔ اور اب اس طرح
تہذیب و معاشرت نے گویا براہ راست لکھنؤ پر اثر ڈالنا
شروع کیا۔ اور جیسا کہ آپ نے شرر کی اس کتاب میں ابھی
دیکھا ہوگا۔ کہ لکھنؤ میں شاہان اودھ کی لطف و عنایات کا نتیجہ
یہ ہوا کہ دہلی کی مخلوق کھچی ہوئی لکھنؤ چلی آ رہی تھی۔ علماء، رؤساء،
شعراء، اور پھر ان کے پیچھے پیچھے گویئے، مسخرے، گانے والیاں
اور طوائفیں، بھی دہلی سے آکر لکھنؤ میں آباد ہونے لگیں"۔

تو لکھنؤ کی تمام طوائفیں دراصل دہلی ہی کی ہیں۔
ایک لڑکے نے پھر شرارت سے پوچھا۔

جی ہاں اور ان کے دلدادہ بھی تو دہلی ہی کے تھے
پروفیسر صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ پوچھنے والا شرما کر اپنی
جگہ پر بیٹھ گیا۔ پوری جماعت بے اختیار ہنس پڑی، ایک لڑکی
اپنی کتاب کے اوراق کو الٹ پلٹ کرنے لگی اور دوسری بالکل
خاموش، نہایت ہی سنجیدہ، بغیر پلک جھپکائے اپنی نگاہوں کے
مقابل سیاہ بورڈ کو تاک رہی تھی، دوسری جماعت کے طلبہ ہمارے
کلاس کے دروازہ کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ لڑکوں کی
آمد و رفت سے برآمدہ میں اتنا شور ہونے لگا کہ اب لکچر کو مزید
جاری رکھنا پروفیسر صاحب کے لئے تکلیف دہ ہو گیا۔ یک
بیک انہوں نے پوچھا۔

گھنٹی بج گئی۔

بج گئی۔

جی نہیں ابھی نہیں۔

پانچ منٹ ہو گئے۔

جی ابھی دس منٹ باقی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتے
ہوئے کہا، بج گئی ہے۔ اور پھر دو کتابیں اور ایک اخبار کو بغل
میں رکھتے ہوئے دوسرے کلاس کی طرف چلے گئے۔

(۳)

یہ "معاشیات" کا کلاس تھا۔ ہم ذرا دیر میں پہونچے۔
یعنی جب حاضری ختم اور لکچر شروع ہو چکا تھا۔ سامنے بورڈ پر
دیکھا تو "ہندوستانی اصل" لکھا ہوا تھا۔ جو آج کا موضوع بحث تھا
پروفیسر صاحب فرما رہے تھے،

"اور اسی وجہ سے ہندوستانی زر کو شرمیلا کہا جاتا
ہے۔ کیونکہ یہاں کا سرمایہ مردہ ہے۔ جسے قدامت پسند
طبقے کاروبار میں مشغول رکھنے کے بجائے خزانہ کی صورت میں
دفن کرکے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہی اصل و سرمایہ کسی بنک میں
محفوظ کر دیا جائے گا تو قطع نظر رقم کی حفاظت کے اصل برابر
بڑھتا جائیگا۔ اور بلا تردد سالانہ رقم کا منافع بھی مل سکیگا"
ایک طالب علم نے پوچھا کہ۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ سود کو اکثر مذاہب نے حرام
بتایا ہے۔

پروفیسر صاحب۔ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دیکھئے اگر اس طرح آپ نے اس مسئلہ کو مذہب کی
روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تو یہ کلاس معاشیات کے بجائے
دینیات کا ہو کر رہ جائیگا۔

پروفیسر صاحب کے اس الزامی جواب پر سارا کلاس

قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ طالب علم شرمندہ ہوگیا۔ اور جب تمام دوسرے لڑکوں نے اسے بھی تیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تو پوچھنے والے طالب علم کو پسینہ سا آگیا۔ پروفیسر صاحب نے اپنا لکچر جاری رکھتے ہوئے سود کے فوائد و منافع بتلاتے ہوئے کہا کہ کس طرح اس کی ابتدا رومیوں میں ہوئی اور پھر کس طرح یہ تدریجاً ڈنمارک، بلجیم، اٹلی، فرانس اور برطانیہ کی حکومتوں میں قانون کی شکل اختیار کر گیا۔ اور اس کے بعد ہندوستان میں بنک کاری کرنے والے طبقوں نے اسے کس طرح فروغ دیا۔ راجپوتانہ اور سرحدی علاقہ کے لوگوں نے کن اسباب کے تحت جنوبی اور مشرقی ہند میں گھوم گھوم کر اپنا اصل مشغول کرنا شروع کیا۔ اور پھر اگر آج اسکو ممنوع قرار دیدیا جائے تو دنیا کی وسیع تجارت کس طرح متاثر ہوگی۔ اور بغیر سود کے کاروبار کی ترقی میں کن کن موانعات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جس کے بغیر تجارت ترقی ہی نہیں کر سکتی ہے۔ ابھی وہ ان چیزوں ہی کی تشریح فرما رہے تھے کہ گھنٹی بج گئی اور طلبہ اٹھنے لگے اور شور ہونے لگا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے لکچر کو جو ابھی بہت باقی تھا فوراً ختم کرتے ہوئے کہا۔

صرف ایک منٹ۔

تمام طلبہ پھر خاموش ہوگئے، تو پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ۔

"یونیورسٹی ڈرامیٹک سوسائٹی کی طرف سے جو ڈرامہ "ڈاکٹر کی لڑکی" آج اسٹیج ہونے والا ہے۔ اسکے ٹکٹ میرے پاس فروخت کے لئے موجود ہیں، آپ میں سے جو خریدنا چاہیں وہ میرے کمرے پر آکر لیجا سکتے ہیں۔"

پروفیسر صاحب یہ کہہ کر رخصت ہوگئے، اور لڑکوں میں پھر چہ میگوئیاں ہونی شروع ہوگئیں اور جب طلبہ کو یہ معلوم ہوا کہ خود پروفیسر صاحب بھی اس تمثیل میں اداکاری کر رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر خود ہمارے بھی پروفیسر صاحب ہی ہیں، تو پورا کلاس رات میں ڈرامہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے خوشی سے اچھل پڑے۔

(۴)

یہ ہمارے شام کا آخری گھنٹہ تھا۔ ہم سب پروفیسر صاحب کے انتظار میں کمرہ کے باہر کھڑے تھے کہ کسی نے آکر کہا۔

آج پروفیسر نہیں آئینگے۔

کیوں۔

آج ہی صبح میں موٹر سے ایک حادثہ ہوگیا ہے جس سے انکے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ہم سب حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے کہ کسی نے پھر کہا۔

نشہ میں موٹر چلا رہے ہونگے۔

دوسرے نے کہا۔ کیا شراب بھی پیتے ہیں۔

تیسرے نے کہا۔ تم کو ابھی نہیں معلوم۔

دوسرے نے پھر کہا تب ہی تو چہرہ لال قندھاری انار کی طرح رہتا ہے۔

تیسرے نے پھر کہا۔ کچھ ہو مگر آدمی ہے قابل۔

پہلے نے کہا۔ اور انگریزی بھی بڑی زوردار ہے۔

دوسرے نے کہا۔ سگریٹ تو دو۔

بس اسی قسم کی باتوں میں کالج اور ہوسٹل کی درمیانی مسافت ختم ہوگئی۔ اور ہم سب کتابیں اور کاپیاں بغل میں دبائے ہوئے ہوسٹل پہونچ گئے۔ اور اس طرح کالج کی عملی زندگی کا ایک دن ختم ہوگیا اور اب رات میں، دن میں جو کچھ پڑھا تھا اُسے سوچتا تھا۔

کان کے مالک

از جناب بساون پرشاد ورما، بھرسری'

جناب بساون پرشاد ورما بھرسری ہندی کے ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ہندی کے بہترین رسالوں میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے "ندیم" میں بھی برابر لکھتے رہنے کا ہم سے وعدہ کیا ہے۔ ندیم

گھن شیام کے معنی ہیں ابر سیاہ، ابر سیاہ بھی کیا ہی بیدرد ہوتا ہے، شب ہجر میں عاشقوں کو تڑپاتا ہے۔ ڈراتا ہے، رلاتا ہے، طاؤس اس کی محبت میں متوالی ہو کر ناچتی ہے اور تڑپتی ہے۔ لیکن اس بیدرد کو ذرا بھی رحم نہیں آتا، ذرا بھی اس کا دل نہیں پسیجتا۔ اگر میرا بس چلے تو اس کے لئے بجو کو وہ سزا دوں کہ ہوش ٹھکانے آجائے۔ بڑی نزاکت اور ادا کے ساتھ بجلی نے کہا۔

"لیکن میں تو سب سے زیادہ سزا دار بجلی کو سمجھتا ہوں وہ کتنے ہی بے گھر بار کے نوجوانوں کو ڈراتی ہے۔ دھمکاتی ہے۔ تھوڑی سی روشنی دکھا کر پھر انہیں اندھیرے میں ٹٹولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور گھن شیام یا ابر سیاہ کے نیچے سے تو ہمیشہ نکل جاگنے کی کوشش کرتی رہتی ہے" مسکراتے ہوئے گھن شیام داس چودھری نے کہا۔

"یہ گھن شیام کی ناسمجھی ہے۔ بجلی تو ہمیشہ گھن شیام کے کلیجے میں چھپی رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ بھول چوک کر ذرا سی دیر کے لئے کبھی گھن شیام سے الگ بھی ہوتی ہے تو پھر فوراً اکر اسی کے سینے میں چھپ جاتی ہے۔" اتنا کہکر بجلی نے اپنا سر گھن شیام کے زانو پر، جو اس کے پاس ہی پارک کی ایک بنچ پر بیٹھا تھا، رکھدیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں موندلیں۔

گھن شیام داس نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بجلی رانی۔ بجلی اور گھن شیام کا وصال کتنی دیر رہ سکتا ہے۔ برسات کے موسم کے گذرتے ہی تو دونوں کو ہجر کا مقابلہ کرنا ضروری ہوگا۔ اب ہم لوگوں کے بی، اے، کے امتحان میں صرف ایک ہی مہینہ باقی ہے۔ امتحان کے بعد میری تو پڑھائی ضرور ہی ختم ہو جائیگی۔ پھر نہ معلوم تم کہاں رہو گی اور یہ بدنصیب گھن شیام کہاں رہے گا۔"

"گھن شیام، چاہے کہیں رہے، لیکن اب تو بجلی کو تمہیں اپنانا ہی ہوگا۔ بجلی بے شک تمہاری ہو کر رہے گی" گھن شیام کی طرف ایک عجیب نگاہ سے دیکھتی ہوئی بجلی نے کہا۔

"بجلی، تم بالکل بھولی بھالی ہو، تمہیں دنیا کا ابھی کچھ بھی تجربہ نہیں، بھلا تم اور ہم ایک کیسے ہو سکتے ہیں تمہارے والد

بابو جادو چندر کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا۔ وہ ہنسا ڈیہہ کان کے مالک ہیں۔ دھن دولت ان کے پیروں پر لوٹتی ہے۔ اور میرے والد ایک غریب مزدور اور دانے دانے کو محتاج، جنہیں اپنی روٹیاں انہیں کے کان میں مزدوری کرکے کمانی پڑتی ہیں۔ پھر بھلا تم ہی سوچو، مالک اور مزدور کا یہ تعلق ممکن ہے؟" ایک سرد آہ بھرتے ہوئے گھن شیام داس نے کہا۔

"گھن شیام، اس معاملے میں میرے من کی بات رہیگی آج دو سالوں سے جس دل میں تمہاری مورت قائم کرکے میں پوجتی آ رہی ہوں اس دل میں اب کسی غیر کو ہرگز نہیں بٹھا سکتی۔ اس کے لئے دنیا مجھے پگلی، بے حیا، خاندان کے نام کو ڈبونے والی۔ چاہے جو کچھ کہے"، بڑے تپاک سے گھن شیام کی گود ہی سے سر اٹھاتے ہوئے بجلی نے کہا۔

(۲)

بی۔ اے۔ کے امتحان کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے۔ بجلی اور گھن شیام دونوں ہی اول درجہ میں پاس ہوئے ہیں۔ گھن شیام بجلی کے پاس مبارکباد کا خط لکھنے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ اسے ہنسا ڈیہہ کا ایک تار ملا۔ لکھا تھا ــــ "تمہارے والد مرنے کے قریب ہیں، جلد آؤ......"

آئیوالی مصیبت کے جذبات و خیال سے گھن شیام کا تمام جسم کانپ اٹھا۔ اس نے اسی دم سر و سامان ٹھیک کر لیا اور جانے کو تیار ہو گیا۔

رات بھر ٹرین کے سفر کے بعد دوسرے دن صبح گھنشیام ہنسا ڈیہہ اسٹیشن پر اترا۔ کانوں کے مزدوروں کی جھونپڑیوں کے پاس جاتے ہی خبر ملی کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ گھن شیام بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ بے ہوشی ہی میں وہ پاگلوں کی طرح رونے لگا

"پتاجی، آپ کا گھن شیام بی۔ اے۔ پاس کر گیا۔ ابھی آپ کو نہیں معلوم ہے نہ! گھن شیام کو بی۔ اے۔ ہی پاس کرانے کے لئے آپ نے زندگی بھر کوئلے کا پہاڑ توڑا ہے۔ اب گھن شیام کو اچھی نوکری کرے گا۔ آپ کو نہال کر دے گا۔ اب آپ کو کوئلہ توڑنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اوہ، آپ کس پر ناراض ہو کر بھاگے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا"

کئی دنوں تک تو وہ بے طرح تڑپتا رہا۔ لیکن یہی تو دنیا ہے۔ تین چار دن کے بعد جب وہ صحیح حالت پر آیا تو وہاں کے مزدوروں نے اسے تمام باتیں کہہ سنائیں۔ کہ اس کے والد کیسے بیمار پڑے اور کس طرح ان کی موت ہوئی۔ بات یہ تھی کہ بابو جادو چند کی کان میں کئی دنوں سے مزدوروں کی ہڑتال چل رہی تھی، ان بیچاروں کو واجب مزدوری نہیں ملتی تھی، دیگر کانوں کے مقابلے میں ان کی کان میں بہت کم مزدوری دی جاتی تھی، مزدوروں کے بیمار پڑنے پر ان کی دوا دارو کا کوئی واجب انتظام نہ تھا۔ اور کان کے افسر ان سے کئی طرح کی ناجائز رقمیں وصول کرتے تھے، ان کے ظلموں کی حد ہو گئی تھی، اسی وجہ سے کان میں ہڑتال چل رہی تھی، ہڑتال میں بینی چودھری (گھن شیام کے والد) خاص تھے، ہڑتال کے شروع ہی میں کان کے افسروں نے بینی چودھری کو بلایا اور دوسرے دوسرے حیلے حوالے لیکر، انہیں بری طرح پیٹا تھا۔ جس کا نتیجہ ہوا ان کی موت۔

اس ظلم کی باتیں سن کر گھن شیام داس کا خون کھول گیا۔ آنکھوں میں چنگاریاں چمک اٹھیں، اس نے باپ کی موت کا بدلہ چکانے اور مزدوروں کی مانگیں پوری کرنے کا عہد کیا۔ اب باپ کی جگہ پر بیٹا مزدوروں کا سردار بنا۔

(۳)

ایک مہینہ سے ہنساڈیہہ کھدان میں ہڑتال چل رہی تھی، افسروں نے ہر طرح کی کوششیں کیں کہ ہڑتال ختم ہو جائے سبھی طرح کی تدبیریں کام میں لائی گئیں، فریب، سازش، مارپیٹ، دھر پکڑ سب کچھ ہوا، لیکن کامیابی نہ ملی، گھن شیام داس جیسے لائق آدمی کے زیر سایہ مزدوروں میں معمولی ملت نہیں تھی، گھن شیام کو کان میں ایک بہت بڑی جگہ دینے کی لالچ دی گئی، لیکن وہ اس سے ٹلنے والا نہ تھا، اپنے مقصد پر پہنچے بغیر اس کے مضبوط ارادے کو توڑنے میں کوئی بھی لالچ کارگر نہیں ہو سکتی تھی، مالک اور افسروں نے ہڑتالی مزدوروں کی جگہ پر نئے مزدوروں کی بحالی کا منصوبہ نکالا،

بہت سے نئے مزدور کان کے پھاٹک پر جمع ہو گئے تین ہزاروں ہڑتالی مزدور پھاٹک روکے کر لیٹے ہوئے تھے۔ نئے مزدور سہم گئے، گھن شیام داس نے ایک پر زور تقریر کی۔ "ہمارے نئے مزدور بھائیو! آج ہم جس حق کے لئے اپنی آن پر مٹے ہیں۔ وہ کوئی انفرادی حق نہیں، بلکہ سب ہی مزدوروں کا ہے۔ جو حال آئے دن ان کا ہے کل۔ یہی نوبت آپ پر آ سکتی ہے۔ آپ کا ہم استقبال کرتے ہیں۔ آپ ہی کے بھوکے مزدور بھائی اپنے حق کے لئے پھاٹک پر تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ اگر ان کی روٹی چھین کر، ان کے بلکتے بھوکے بچوں کا گلا گھونٹ کر آپ کو اپنا پیٹ بھرنا پسند ہو تو آپ خوشی خوشی ان کی چھاتی پر پاؤں رکھ کر کان کے اندر چلے جائیں۔

بس نئے مزدوروں کی روحوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

کان کے مالک اور افسروں کا یہ منصوبہ بھی بے کار ثابت ہوا، ایک ہی مہینے کے اندر کان کو لاکھوں روپیہ گھاٹا لگ گیا۔

آخر بابو جادو چندر بوکھلا گئے، انہوں نے اپنا آخری حربہ کام میں لانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ بس بے یار و مددگار مزدوروں پر انہوں نے گولی چلوا دی۔ کتنے ہی مزدور گولی کے نشانہ بنے، کتنے ہی زخمی ہو گئے۔ اور ان زخمیوں میں ایک گھن شیام داس بھی تھے،

(۴)

کان کے اس گولی چلنے کے حادثے کی خبر بجلی کے کانوں میں پڑی۔ اس نے یہ بھی سنا کہ مزدوروں کا اگوا گھن شیام داس چودھری بھی زخمی ہیں۔ اور موت کے قریب پہونچ چکے ہیں۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ ہنساڈیہہ جانے والی گاڑی کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔

راہ لمبی تھی، جس کے درمیان میں گاڑی بہت سی جگہوں میں ٹھہری، بہت سے ندی نالے، جنگل پہاڑ پار کئے، لیکن بجلی کو کوئی خبر نہیں، سکنڈ کلاس کے ڈبے میں یہ کھوئی اور تھکی سی بیٹھی ہوئی تھی، گاڑی جب ہنساڈیہہ میں رکی تو وہ باؤلی سی اتری اور پوچھ پاچھ کر کے اسپتال پہنچی۔

گھن شیام داس کی حالت نازک تھی، اسپتال میں پڑے پڑے وہ موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ کسی کے ملائم ہاتھوں کے چھوتے ہی وہ چونک اٹھا، آنکھیں کھولیں تو اس نے سامنے بجلی کو کھڑی ہو کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھا۔ اسے تعجب ہوا اور اس نے چاہا کہ اٹھ بیٹھے، لیکن اس میں طاقت بالکل نہیں تھی، بجلی نے بھی اسے اٹھنے سے منع کر دیا۔ مریض کی حالت دیکھ کر بجلی ناامید ہو گئی۔ مگر پھر بھی بھگوان کی مہربانی کے آسرے خود اس نے تیمارداری شروع کر دی۔

گھن شیام کے سرہانے مزدوروں کی ماتموں کی ...

فہرست پڑی تھی، بجلی نے اسے اٹھا کر پڑھا اور جانے کیا سوچ کر اسکو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ گیا، لیکن جوں جوں رات بیتنے لگی مریض کی حالت توں توں خراب ہونے لگی۔ جسم ٹھنڈا پڑنے لگا، ڈاکٹر گھبرائے ہوئے نظر آنے۔ دوا دارو کا جتنا بھی انتظام ہو سکا ہوا لیکن نتیجہ کچھ نہیں ہوا۔ آدھی رات ہوتے ہوتے گھن شیام کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی، بجلی سر تھام کر رہ گئی۔

(۵)

مزدوروں کے لیڈر کے گھائل ہوتے ہی کان کے کارکنوں نے سمجھا تھا کہ اب ہڑتال ختم ہوئی، لیکن ایک دوشیزہ کے زیر تحت ان کی جماعت کو مضبوط پایا تو وہ دنداں بہ انگشت رہ گئے، یہ جان کر کہ وہ دوشیزہ کان کے مالک ہی کی اکلوتی لڑکی ہے۔ مزدور اور افسر دونوں حیرت میں تھے، بابو جادو چند راب تو اور بھی پریشان تھے، ان کی نظروں میں دنیا ہی الٹ گئی تھی، چاند سے چنگاریاں برس رہی تھیں، اور آفتاب سے برف گھل گھل کر ٹپک رہی تھی، ان کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔

آخر مزدوروں کے اس نئے رہبر کے پاس آکر انہوں نے کہا۔ ”بیٹی بجلی، تم یہ کیا کر رہی ہو؟ کیا تمہارے ہوش و حواس جاتے رہے۔ یہ تو تم اپنے پیروں آپ کلہاڑی مار رہی ہو؟“

”پتا جی، میرا دماغ میرے ساتھ ہے اور میں ہوش میں ہوں، مگر آپ نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی لاڈلی کی دنیا اجاڑ دی، گھن شیام میرے مانے ہوئے شوہر تھے، انہیں پر میری عمر بھر کی دنیا آباد تھی، زندگی کی امیدوں کا بہشت قائم تھا، انہوں نے جس کام کو ادھورا چھوڑا ہے میں اسے پورا کر کے ان کی روح کو آرام پہنچانا چاہتی ہوں، یہ میرا فرض ہے، پاگل پن نہیں۔

تمام راز بابو جادو چندر کی سمجھ میں آگیا۔ وہ سر پیٹ کر رہ گئے، پھر انہوں نے تنہائی میں لیجا کر بجلی کو بہت کچھ اونچ نیچ سمجھایا۔ لیکن سب بے کار، آخر کو انہیں کہنا پڑا۔ ”بیٹی، جب ایک دن کان کی مالکن تمہیں ہی ہونا ہے تو میرا کچھ کہنا بیکار ہے۔ آج سے ہی کان کا تمام بار تمہارے اوپر ہے۔ اب تم اس کی مالک بھی ہو۔ اور ہڑتالی بھی، پھر جو چاہو کرو۔ میں زبان تک نہیں ہلا سکتا۔“

گھن شیام داس کی فہرست کے مطابق بجلی نے مزدوروں کی سب ہی مانگیں پوری کر دیں۔ ان کی مزدوری دیگر کانوں سے بہت زیادہ کر دی۔ مزدوروں کی دوا دارو کے لئے کان کی طرف سے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کر دیا۔ ان کے بال بچوں کی تعلیم کے لئے ایک ہائی اسکول کھول دیا، ان کی چھٹیوں اور کام کرنے کے وقت بھی مقرر کر دئے۔ قاعدہ قانون بنا کر افسروں کے ظلموں کو روکنے کے لئے پوری کوشش کی، ان کے لئے کواٹروں کا نہایت ہی عمدہ انتظام کر دیا۔ یہ ہی نہیں اس نے ایک اور بھی عظیم الشان انقلاب کر دیا۔ کان کے نفع میں سے محض تھوڑا سا اپنے لئے رکھ کر باقی رقم میں تنخواہ کے مطابق مزدور کو شیئر دینے کا بھی اس نے انتظام کر دیا۔ اس طرح اب مزدور بھی کان کے مالک بن گئے۔

کیف وخمار

از جناب بہزاد فاطمی بی اے (آنرز)

شام کا وقت تھا، کلب سے ٹینس کھیل کر سیٹی بجاتا راکٹ گھماتا واپس ہوا۔ ایک نئی شاندار موٹر لگی تھی، اپنے خیال میں مگن جھومتا جھامتا برآمدے سے آفس روم پھر ڈرائنگ ہال پھر ڈریسنگ روم طے کرتا ہوا زنانے حصے میں داخل ہونے کے خیال سے میں نے پردہ اٹھایا۔ دفعتاً زمین نے میرے قدم پکڑ لئے اور نظر میں یک بیک لاکھوں بجلیاں تحلیل ہو گئیں۔ بالکل ٹھیک مقابل کے برآمدے میں ایک دوشیزۂ حسن و شباب تنہا کرسی پر بیٹھی کروشیا کے کام میں نیچی نظریں کئے منہمک تھی، اس کا حسنِ جہاں سوز کاسنی ساڑھی کے حلقے میں اور اس کی نیم عریاں باہیں یونان کی اساطیری پریوں کی باہوں سے مشابہ تھیں۔ کانوں کے مرتعش آویزے زلف گرہ گیر کی آڑ میں اس طرح چمک رہے تھے جس طرح تاریکی میں ریڈیم چمکتا ہے۔ اور اس کی چھوٹ صبیح رخساروں پر اس طرح پڑ رہی تھی جس طرح صبح کی ہلکی دھوپ میں چھوٹے چھوٹے آئینوں کا عکس کسی بڑے آئینہ پر پڑتا ہے۔ میں مسمریزم کے معمول کی طرح ایک ہاتھ سے پردہ پکڑے کھڑا رہ گیا۔ اور نگاہیں اس منظر ہوشربا پر جم گئیں۔ جس طرح وہ میرے لئے بالکل نئی تھی اسی طرح میری زندگی کا یہ تجربہ بھی بالکل نیا تھا۔ معاً خیال آیا کہ اگر کسی نے اس حال میں مجھے دیکھ لیا تو کیا ہو؟ آہستہ سے پردہ چھوڑ دیا اور باہر برآمدے میں چلا آیا۔ وہاں کرسی پر بیٹھ کر اپنی اس نئی کیفیت کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ ہوا کیوں؟ دل کے دھڑکنے کی آواز کانوں میں صاف آ رہی تھی، تھوڑی دیر کے بعد وہی دوشیزۂ جمال فیروزہ سے گھومتی ہوئی رخصت ہونے کیلئے برآمدے تک آئی۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہو گیا۔ فیروزہ میری چچیری بہن اور منگیتر تھی، دیکھتے ہی مجھ سے بولی۔ "ارے! آپ کب سے یہاں بیٹھے ہیں؟"

"بس تھوڑی دیر سے!"

"تو پھر اندر ہی کیوں نہ چلے آئے؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں پردہ نہیں ہے؟"

"او، اچھا۔ یہ ہماری سہیلی قمر جہاں اور آپ۔ ۔ ۔ ؟"

"مجھے سلیم کہتے ہیں" میں نے جلدی سے جملہ مکمل کر دیا۔

"خوب! آپ سے مل کر مجھے نہایت مسرت ہوئی" قمر جہان نے کہا۔

"اور اس سے زیادہ مجھے خود۔"

قمر جہاں کار پر بیٹھ کر روانہ ہو گئی اور میں تصویرِ حیرت بنا اس کے ٹائروں کو دیکھتا رہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد فیروزہ نے اور بھی تفصیلی طور پر مجھے اس کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں

وہ شب کروٹوں میں گذر گئی۔

دوسرے دن مجھے کلب کا فائنل میچ کھیلنا تھا۔ وقت سے پہلے ہی اپنے بہترین اسپورٹنگ ڈریس میں پہونچ گیا۔ میری پارٹنر مس اسمتھ اور ہم لوگوں کے فریق مس ایس اور جوزف تھے۔ ہم لوگوں نے اسٹریٹ سٹ میں میچ کا خاتمہ کر دیا۔ تالیوں اور چیرز کے ہنگامے کے ساتھ اپنے فریقین سے ہاتھ ملا کر اور انعام لیتے ہوئے ناشتہ کی میز پر آ ڈٹے،

معاف فرمائیے گا۔ میں آپ کے دولت خانے سے واقفیت حاصل کر سکتا ہوں؟۔ ایک صاحب نے ایک پیسٹری اٹھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

فقیر کدہ تو شہر عظیم آباد ہے لیکن کچھ دنوں سے بغرض تبدیل آب و ہوا اور سیر و سیاحت یہیں مقیم ہوں۔

کس جگہ؟

مسٹر حامد حسین بیرسٹر کے یہاں جو میرے حقیقی چچا ہیں اور پریکٹس کے سلسلہ میں وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے ہیں۔

تب تو آپ سے مل کر اور بھی مسرت ہوئی کیونکہ آپ کے چچا صاحب مدظلہ اور میرے ماموں آل حسن صاحب سب جج سے گہرے ارتباط ہیں۔

خوب،

تھوڑے وقفہ کے بعد انہوں نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ کبھی آپ اپنی تشریف آوری سے مجھے بھی سرفراز کریں گے۔ کیونکہ میں بھی صرف چند روز کے لئے یہاں آیا ہوں، تعطیل ختم ہونے پر یہاں سے روانہ ہونگا، اس سے بڑھکر میرے لئے اور کیا مسرت کا مقام ہو سکتا ہے۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ یہاں کے اچھے اور مہذب حضرات سے مل سکوں۔

اچھا تو میں بھی آپ کو پر خلوص دل سے مدعو کرتا ہوں چند ہی روز میں باضابطہ اطلاع بھیج دی جائیگی۔ وہیں چائے بھی پیجئے اور ٹینس بھی کھیلئے، دیکھئے بھول نہ جائیگا۔ مجھے جعفر کہتے ہیں۔

ضرور حاضر ہونگا اور ہر طرح تعمیل حکم کے لئے تیار ہوں۔

جائے قیام پر پہنچا تو میرے اعزا میری کامیابی کی خبر کے منتظر تھے، تفصیلی طور پر کل روداد سنا ڈالی، بر سبیل تذکرہ میں نے جعفر صاحب کی ملاقات اور ان کے مدعو کرنے کا ماجرا بھی نیر و زہرہ سے دہرا ڈالا۔

جانتے ہیں آپ جعفر صاحب کون ہیں،

میں بس اتنا ہی جانتا ہوں جو ابھی کہہ چکا ہوں۔

یہ قمر جہاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔

ارے! یہ تو عجیب پر لطف واقعہ ہے۔

ہے تو کچھ ایسا ہی۔

صبح کو جعفر کا دعوت نامہ ملا اور میں پر تکلف طریقے پر اور لونڈر سے بسا ہوا اپنا محبوب ترین کوٹ پہن کر ریکٹ لئے ہوئے پہنچا وہ بہت تپاک سے ملے، ان کے اور دوست احباب بھی وہاں موجود تھے، جن سے فرداً فرداً تعارف کرایا گیا۔ چونکہ شام ہو رہی تھی اسلئے ہم لوگ سیدھے کورٹ پر پہنچے جہاں مس قمر جہاں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ گیند سے خوش فعلیاں کر رہی تھیں۔ ہم لوگوں کو دیکھکر وہ دونوں دبی ٹھٹک گئیں چہ

بڑھکر میرا تعارف مس قمر جہاں سے کرایا۔ میں قصداً خاموش رہا اور قمر نے بھی اس لطیف مذاق میں ہلکی سی مسکراہٹ کیساتھ حصہ لیا۔ کیونکہ تعارف تو قبل ہی سے تھا۔ مگر پھر ان کی سہیلی مس ممتاز سے تعارف ہوا جو وہیں کے ایک معروف ڈاکٹر کی صاحبزادی تھیں۔ کھیل شروع ہوا۔ میں نے صرف تین گیم کھیلے۔ دو جعفر کے ساتھ اور ایک ممتاز کے ساتھ، چائے اور ناشتے کے بعد یہ پر لطف صحبت برخاست ہوئی اور میں پر کیف دل و دماغ کیساتھ واپس ہوا،

جعفر اور ان کے خاندان سے میرے روابط بڑھتے گئے اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہوگیا کہ بجائے کلب کے میری حاضری وہیں ہونے لگی۔ مسٹر آل حسن بھی ایک نہایت ہی زندہ دل بزرگ تھے، اور وہ بھی اکثر ہم لوگوں کی دلچسپیوں میں حصّہ لینے لگے قمر جہاں سے بھی میرے روابط باہمی رازداری کے درجے تک پہونچ گئے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ صبح کا گیا ہوا رات کے آٹھ نو بجے تک واپس ہوتا مختصر یہ کہ قمر کی دل کشی اور جعفر کے اخلاق نے ایسا گرویدہ کرلیا کہ بغیر ان سے ملے ایک لمحہ بھی چین نہ ملتا۔ وقت مختلف دلچسپیوں میں گذرتا۔ کبھی تھیئٹر ہے تو کبھی سینما۔ کبھی شکار تو کبھی کشتی رانی زندگی کے اس رومانی سیلاب میں تھوڑی دیر کے لئے اس وقت اٹکاؤ پیدا ہوگیا جب جعفر کی تعطیل ختم ہوگئی اور وہ عازم سفر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنے دنوں اس بے تکلفی اور دوستانہ تعلقات کے ساتھ رہنے کی وجہ سے آپس میں ایک خاص انس پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ اسٹیشن پر میں نے پر آب آنکھوں سے اُسے الوداع کہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد [illegible] دنوں تک ہم لوگوں کی زندگی بے کیف سی رہی لیکن جلد ہی یہ کیفیت کوش و نغمہ ہنگامہ زار فضا میں تبدیل ہوگیا۔ اور ہم لوگوں نے کشتیِ دل کو رومان کے تیز تموج میں بے محابا چھوڑ دیا۔ اکثر راتیں چاندنی کی کہکشاں کی چادر کے نیچے جلوہ زار رنگ و بو میں گذرنے لگیں جہاں کا ذرہ ذرہ نئے عنوانوں سے پریم گیتا سنایا ہوتا اور ہم اتنا محو ہوجاتے کہ ہماری روح تخیّل اس جلوہ گاہ نقش و نگار سے گذر کر ایک ایسے مقام پر پہونچ جاتی جہاں ایک کیف سرمدی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔

صبح کا ناشتہ ختم کرنے کے بعد میں چند ضروری خطوط لکھنے میں مشغول تھا کہ ممتاز کا ایک دستی خط ملا مضمون یہ تھا۔ آج سہ پہر کو ٹینس اور چائے سے یہیں شغل کیجئے، مختصر سے جواب کے ساتھ آنے کا وعدہ کرلیا۔ وہ اتوار کا روز تھا، اس لئے حسب معمول تمام دن گھر ہی پر جناب چچا صاحب سے مختلف مضمونوں پہ باتیں کرتا رہا۔ وقت مقررہ پر ممتاز کے یہاں پہنچا۔

ایک نہایت عالی شان مکان تھا جس کو دلفریب چمن بندی نے دلہن بنا دیا تھا۔ برساتی کے پاس ممتاز میرے استقبال کو قبل سے موجود تھی، اسنے ایک نہایت ہی پرتکلف لباس پہن رکھا تھا جس سے شباب و رعنائی پھوٹ رہی تھی، دلفریب ادا کے ساتھ مزاج پرسی کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی جس کی سجاوٹ اور زینت دیکھکر میں دنگ رہ گیا۔ ساری فضا معطر اور سارا منظر ہوش ربا تھا۔ سوا میرے اور ممتاز کے وہاں کوئی دوسرا نہ تھا چند رسمی گفتگو کے بعد میں نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر صاحب کہیں باہر گئے ہیں؟

جی ہاں۔ وہ ہفتے عشرہ کے لئے ایک تعلقدار کے سرطان کے علاج کے سلسلہ میں باہر ہی رہینگے۔

اور کسی کو آپنے مدعو نہیں کیا؟

میں نے صرف آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ ٹینس کے متعلق چند چیزیں آپ سے سیکھوں جس کی مشاقی آپ کو مخصوص طور پر ہے، مثلاً آپ کا بیک ہینڈ اور ڈراپ ایسا عمدہ اور نرالا ہے کہ میں نے کئی بار کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

خیر یہ تو آپ کا حسن ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

اچھا باتیں تو نہ بنائیے۔ راکیٹ لیجئے اور کورٹ پر چلئے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں گرمی اور ایک ایسا خفیف ارتعاش تھا۔ جس کا احساس بعض وقت مشکل سے ہوتا ہے۔ بہر حال ہم لوگ کورٹ پر پہنچے۔ کھیل میں تو خیر کیا خاک دلچسپی ہوتی، البتہ میں ان کی اداؤں اور چبھتے ہوئے فقروں سے لطف لے رہا تھا۔ اور ان کی فرمائش کے مطابق کچھ اسٹروکس بھی بتاتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔ ملازم نے وہیں چمن میں میز کرسی پر ناشتہ کا سامان لگا دیا تھا، ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور باتوں باتوں میں ساری میز صاف ہو گئی۔

دوران گفتگو میں ممتاز نے پوچھا "آپ کو پھولوں سے بھی دلچسپی ہے؟"

کس حساس طبیعت کو ان سے دلچسپی نہیں!"

تو آئیے۔ میں آپ کو اپنی خاص پسند کے پھول دکھاؤں، چلئے۔

مختلف روشوں اور ٹٹیوں سے ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک خاص تختہ کے پاس آئے جس کے چاروں طرف ایک خوشنما کنج تھا۔ فی الواقع سارے چمن میں یہی حصہ سب سے زیادہ دلچسپ اور کیف آفریں تھا۔ اس پر سے شام کی دلآویز اُداسی نے اور بھی منظر کو رومانی بنا دیا تھا، مختلف رنگوں کی جھاڑیاں اور پھول اس عمدہ اور نرالے انداز سے لگائے گئے تھے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی تھی۔ چلتے چلتے ممتاز نے سویٹ پی توڑ لیا اور میری طرف بڑھا کر کہا۔

دیکھتے ہیں آپ، کس قدر حسین ہیں۔!

کیا کہنا ہے "گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری۔"

ممتاز کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ آگئی اور اس نے کہا۔ میں بو کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ رہی ہوں!

یہ مصرعہ میری زبان سے غیر ارادی طور پر لو کسی خاص تصور کے زیر اثر نکل گیا تھا، ممتاز کے مزاح نے چونکا دیا اور مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا "نہیں، پھر بھی یہ مصرعہ ایسا معروف ہے کہ ایسے موقعوں پر خواہ مخواہ زبان پر آہی جاتا ہے۔"

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ممتاز اس قدر نزدیک تھی کہ اس کی گرم سانسیں میرے رخسار و گردن کو مس اور سینٹ و چیری بلوزم کی خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر اسی مصرعہ "اے گل بتو خرسندم ...... کو موضوع سخن بنایا۔

یہ مصرعہ تو کسی خاص جذبے کی غمازی کر رہا ہے۔

کیا کہنا ہے، شاعر کے انداز بیان میں عجب وارفتگی ہے۔

میں شاعر کے متعلق نہیں کہہ رہی ہوں۔ بلکہ ــــ اسے دہرانے والے ــــ کی طرف ....

یعنی؟ میں نے تبسم آمیز لبوں سے کہا۔

یعنی ــــ یعنی ــــ یہ ــــ یعنی یہ کہ شاعر ــــ کی طرح ــــ آپ کا بھی کوئی ......" وہ جملہ تمام نہ کر سکی

خوب! بہت دور کی سوجھتی ہے آپ کو!

اس جملے کے تمام ہوتے ہی اس نے ایک حجاب آمیز

انداز سے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں مجھے اب اپنے پوزیشن
کا احساس ہوا اور یہ کہتے ہوئے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

کیا کر رہی ہیں آپ! سنئیے......، گرفت اور مضبوط
ہوگئی اور انہوں نے سر اٹھا کر کہنا چاہا۔

میں آپ سے......، جملہ ناتمام رہا۔ ان کی بڑی
بڑی آنکھوں کی ہلکی سرمئی تحریر ابھر آئی۔ اور ان دونوں
ساغروں میں شراب گلگوں چھلنے لگی۔ انہوں نے بڑھکر اپنے
بہائے نازک کی دوشیزگی کو مجھ پر نثار کرنا چاہا جس کے بچاؤ
کے لئے میں نے ان گلاب کی پنکھڑیوں پہ ہاتھ رکھدیا اور دوسرے
ہاتھ سے خود کو ان کی گرفت سے چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کا سارا
جسم کانپ رہا تھا، لب خاموش تھے، اور نیچی نگاہوں سے دو
قطرہ اشک نکل کر سبزہ زار میں جذب ہو گئے۔ میں چند سکنڈ
کھڑا رہنے کے بعد خاموش وہاں سے چلا آیا۔

قمر سے تمام دن ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ خود
ہی شب کو چلی آئی اور میری ہی منتظر تھی، مجھکو دیکھتے ہی قمر اور فیروزہ
دونوں نے بہ یک وقت حملہ کیا، کہئے رہی تو دعوت زور دار!
دماغ میں چونکہ ایک ہل چل مچی تھی اس لئے فوراً منہ
سے نکل گیا۔

دعوت کیا رہے گی۔ طبیعت البتہ خراب ہوگئی۔

قمر نے غور سے مجھے دیکھا۔ چہرہ دل کا آئینہ دار ہے۔
جو کچھ خلفشار اندر چھپا تھا وہ صاف نمایاں تھا،

کیوں خیرت تو ہے؟

جی تو چاہا کہ آج کی کل رپورٹ سنا دوں لیکن مثاکسی
خیال سے رک گیا۔

ہاں خیرت ہی ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔

پھر بھی؟،

بھئی، تم لوگ مجھے پریشان نہ کرو، میں اس وقت کھانا
بھی نہ کھاؤں گا۔ یہ کہتا ہا سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ جوتے اور
کوٹ کو اتار پھینکا اور یوں ہی پتلون پہنے پلنگ پر دراز ہو گیا۔
اس غیر متوقع حالت میں دیکھ کر دونوں کو تعجب ہوا۔ اور میرے
کمرے کی طرف لپک کر آئیں۔

آپ کو بخار ہے؟ قمر نے پوچھا۔

اگر بخار ہے تو کسی ڈاکٹر کو خبر دی جائے! فیروزہ
نے کہا۔

آپ لوگ بس اتنا کرم کریں کہ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیں۔

قمر نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور ذرا تحکمانہ لہجے میں
بولی۔ آخر بات کیا ہے؟ بتائیے تو سہی یہ سب کیا کیفیت ہے!،

کیفیت ویفیت کچھ بھی نہیں، اس وقت مجھے صرف
اختلاج ہو رہا ہے۔ چائے ذرا زیادہ پی گیا ہوں،

فیروزہ کو ہنسی آگئی اور قمر نے بھی اس ہنسی میں ساتھ دیا۔

تو پھر یہی کیوں نہیں کہتے کہ اختلاج ہے۔ گئے تو ایک
ڈاکٹر کے مکان پر اور رہے آئے وہاں سے اختلاج۔

فیروزہ! دیکھو تو بید مشک ہے؟ میں ابھی علاج کئے
دیتی ہوں۔

اگر نہ ہوگا تو بازار سے منگوا لوں گی۔ فیروزہ یہ کہتی ہوئی
جانے کے لئے اٹھی۔ میں نے اسکو جانے سے روکا۔

میں۔ بید مشک وغیرہ کچھ نہ پیوں گا۔ بس اپنے حال
پر چھوڑ دو۔ خود بہ خود طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ ورنہ فضول
بکواس سے اور الجھن پیدا ہو گی۔

تو ہم لوگ چپ چاپ یہیں بیٹھتے ہیں۔ آپ اپنی طبیعت ٹھیک کیجئے۔

جی نہیں۔ یہ مجھے منظور نہیں۔ آپ لوگ چپ بیٹھنا کیا جانیں۔ میں اکیلا ہی اسوقت رہنا چاہتا ہوں۔ بڑا احسان ہو اگر آپ اپنے گھر اور فیروزہ اندر چلی جائیں۔ لیکن کسی سے طبیعت کی خرابی کا حال نہ کہیں ورنہ اور کوفت میں پڑ جاؤں گا۔

اللہ رے ——— چلو فیروزہ چلیں۔ تم کسی کسی وقت آکر دیکھ جانا۔ قمر یہ کہتی ہوئی جانے لگی۔

جی نہیں۔ اس کی بھی ضرورت نہیں، میں نے چڑچڑا کر کہا

جو حکم سرکار کا۔ وہ دونوں روانہ ہو گئیں۔

مجھے اختلاج تو نہ تھا۔ اختلاجی کیفیت البتہ تھی، قریب قریب ایک ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی پیدا ہوئی تھی جب قمر کا وجود پہلی بار صفحۂ دل پر نمودار ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں اپنے ارادے کو دخل نہ تھا۔ اور یہ ایک مرتب شدہ پلاٹ تھا۔ جس کے اندر کونسا جذبہ کارفرما تھا، میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

غرض یہ کہ وہ رات میرے لئے عجب طوفانی رات تھی کبھی ان منصوبوں کا خیال آتا جو میرے خاندان والوں نے میری اور فیروزہ کی آیندہ زندگی کے متعلق باندھا تھا، کبھی قمر کی محبت کا خیال آتا اور پھر معاً ذہن آج کے واقع کی طرف منتقل ہو جاتا۔ حقیقتہً ایک نوجوان کی گھڑیاں اس وقت انتہا سے زیادہ کٹھن ہو جاتی ہیں۔ جب اس کو ایسے مسلسل تجربات ہونے لگتے ہیں جنکا تعلق ان کے دھڑکتے ہوئے دل سے ہوتا ہے۔ اس کی قوت فیصلہ کمزور ہونے لگتی اور زندگی کی تلخیاں مہیب شکلوں میں پردۂ دماغ پر رقص کرنے لگتی ہیں۔ میں اسوقت تک عملی طور پر جنسی تعلقات سے بالکل بے بہرہ تھا، قصہ، کہانیوں اور کتابوں میں ان سب کا بیان ذہنی تعیش کے لئے کافی سامان مہیا کر دیتا ہے۔ اور بے چین طبیعتیں ان کو پڑھ کر حظ حاصل کر لیتی ہیں۔ چنانچہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ تنہائیوں میں میں نے بھی کوہ قاف کی خیالی پریوں اور جنت شداد کی ارضی حوروں کو آغوش تصور میں بارہا جگہ دی ہے۔ لیکن اب تک میرا جسم اس سے محفوظ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ ممتاز کی حرکت مجھے ڈگمگا چکی ہوتی لیکن عملی ناتجربہ کاری نے دست گیری کی۔ مجھ میں ایک خوف سا پیدا ہو گیا۔ اور اس سے باز رہا۔ جو شخص کہ شراب کی لذت کو جانتا ہو لیکن عملی طور پر اس کے سب سے نا آشنا رہے ہوں بہت ممکن ہے کہ کسی کے ترغیب دینے پر بھی دنیا کی بہترین شراب کے ساغر کو ٹھکرا سکے۔ لیکن ایک تجربہ کار شرابی کے لئے ایک قطرہ بھی انکار ہونا قیامت ہے۔

جب ممتاز کے حسن و شباب اور اس کی [illegible] آتا جب کہ اس کا ہر عضو میرے لئے وقف ہو گیا تھا [illegible] اپنی حماقت پر افسوس اور اپنی پست ہمتی پر غصہ آتا کہ [illegible] اس لمس تجربے اور کیف آور نشاط سے محروم رہا۔ جس کے لئے مشکل سے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ خیال ہوتا کہ میرے پائے ثبات نے مجھے اس ناپاک فعل سے باز رکھا تو میرا جذبۂ خودی سراپا ابھرا مسرت نظر آتا کہ میں نفسیات کی اس دشوار ترین منزل پر بھی ثابت قدم رہا۔ اور پھر میری دنیائے تصور میں سوا قمر کے وجود کے اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ جانے کس وقت نیند نے مجھے اس ذہنی انتشار سے نجات دی ——— صبح کو آنکھ کھلی تو ممتاز کے آدمی نے ایک مختصر سے مضمون کا خط دیا ———

.... مجھے امید ہے کہ آپ کل کے واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کریں گے ....

آپ کی ہمیشہ
....

میں نے آدمی کو بغیر جواب کے واپس کر دیا اور خط کو چاک کر ڈالا۔

کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ قمر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اندر ناشتہ کی غرض سے گیا۔ دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

کیسی ہے طبیعت آپ کی ۔؟

اچھا تو ہوں ،

چچی صاحبہ بھی قریب ہی بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں، کیا شب کو تمہاری طبیعت خراب تھی ؟

نہیں تو ۔ کچھ یوں ہی سا کسل رہا ۔

تو پھر یہ قمر کیا کہہ رہی ہیں ! ،

اب ان لوگوں کی باتوں کا کہاں تک خیال کیجئے گا۔

سبھوں کو ہنسی آگئی اور میں ناشتے میں مشغول ہو گیا۔

تمام دن طبیعت اکھڑی اکھڑی سی رہی۔ سہ پہر کو بجائے قمر کے یہاں جانے کے میں کلب چلا گیا۔ کیوں کہ وہاں ہو سکتا ممتاز سے ملاقات ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اب مجھے اس کی صورت سے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ بعد مغرب لوٹتے وقت قمر کے یہاں چلا گیا۔ دیکھتے ہی اس نے کہا۔

میں نے آپ کا انتظار دیکھ کر آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ آپ کلب گئے ہیں۔

وہاں چونکہ عرصے سے نہ گیا تھا اس لئے دل میں آیا کہ آج وہیں چلا جاؤں۔

آج ممتاز بھی نہیں آئی اس لئے شام بالکل بے لطف گذری۔ میں نے خیال کیا کہ شاید خجالت نے اسے آنے سے روکا اور اب غالباً آئے گی بھی نہیں۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں رہیں۔ اس کے بعد گھر چلا آیا۔

میرا اور قمر کا ملنا جلنا بدستور جاری رہا۔ اس درمیان میں نہ تو وہاں ممتاز آئی اور نہ کسی دوسری جگہ اس سے ملاقات ہوئی۔ مجھے بھی ایک گونہ اس ذہنی انتشار سے نجات ملی۔ ایک روز قمر کے یہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ممتاز کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ میں آل حسن صاحب کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی گپوں میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں برساتی کے پاس کار رکی اور قمر ممتاز کو لئے ہوئے اتری، اس کو دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ گلے میں کسی نے پھندا ڈال دیا۔ اور قلب انجن کی طرح دھک دھک کرنے لگا۔ ممتاز نے بھی جن محجوب نگاہوں سے مجھے دیکھا اس کی تصویر کشی کے لئے کسی کامیاب مصور کا قلم چاہئے۔

صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد قمر نے کہا۔

بی ممتاز نے ہم لوگوں کی صحبتوں کو اپنی غیر حاضری سے بالکل ہی بے کیف بنا دیا تھا۔ سمجھئے میں آج انہیں گرفتار کر لائی ہوں۔ کہئے کیسا کام کیا ؟ ۔

کام تو کیا آپ نے خوب ! یہ کہتے ہوئے میں نے ممتاز کے چہرے کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ اس کی نگاہیں ایک حجابانہ انداز سے جھک گئیں۔

ناشتہ کر کے برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ممتاز کے آدمی نے مندرجۂ ذیل مضمون کا ایک خط لا کر دیا ....

آپ نے میرے پہلے خط کا جواب نہ دیا ۔ مجھے اس کا رنج

نہیں۔ لیکن آپ کی شرافت سے قوی امید ہے کہ آپ نے اُس واقعہ کو صیغۂ راز میں رکھا ہوگا۔ مجھے اس کا بیحد خیال تھا کہ آپ مجھ سے رنجیدہ ہیں لیکن قمر کے یہاں کی ملاقات سے یہ اندازہ غلط ثابت ہوا اور مسرت ہوئی کہ آپ نے میری خطا کو غالباً معاف کر دیا۔ آپ سے کچھ نہیں چاہتی۔ صرف اتنی التجا ہے کم از کم میرے خط کا جواب دیدیا کریں۔ . . . . . .

آپ کی ہمیشہ
. . . .

اس خط کا بھی میں نے جواب نہ دیا اور چاک کر ڈالا۔ اس کے بعد اس نے مسلسل لکھنا شروع کیا۔ لیکن میں نے ہمیشہ سکوت اختیار کیا۔ آخر ایک روز عاجز آ کر اس لا متناہی اور پریشان کن سلسلے کو منقطع کرنے کی غرض سے میں وہاں گیا۔ وہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھی ہوئی انگریزی ناول پڑھ رہی تھی، مجھکو دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھتی اُٹھ کھڑی ہوئی "سلے امنت باعث آبادی ما"۔ میں فوراً ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

مس ممتاز! میں آپ کے قیمتی وقت کا کچھ حصہ برباد کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گی۔

سگریٹ تو پی لیجئے، اس نے بلاؤز سے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے میری طرف بڑھایا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال لیا اُس نے دیاسلائی جلا کر سلگا دیا۔

مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔

کوئی ہے!! ایک ملازم اندر آیا۔

چائے لاؤ!،

خیر چائے وغیرہ تو چھوڑئے پہلے میری باتیں سنئے۔

اتنی ضروری باتیں ہیں؟؟ یہ کہتی ہوئی وہ پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔

جی ہاں! بہت ضروری۔ آج تو یہ ممتاز ہی نہیں معلوم ہو رہی تھی، جسے میں نے چند روز پہلے قمر کے یہاں دیکھا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کسی طرح پسندیدہ کہے جانے کا مستحق نہیں اور جس امر کے لئے آپ مجھے مجبور کرنا چاہتی ہیں وہ کسی طرح پورا ہونے کا نہیں، میں اسی لئے یہاں آیا ہوں کہ بلا کسی تمہید کے صاف صاف لفظوں میں اپنے خیالات کو ظاہر کر دوں۔

سلیم صاحب، جو خود ہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو وہ دوسرے کو کیا مجبور کرنے کوشش کرے گا؟،

معقول، دل کی مجبوری کے یہ معنی تو نہیں کہ اپنی متاع عصمت . . . . . ،جملہ پورا بھی ہونے پایا تھا کہ اس نے زور سے خاموش! کہتے ہوئے کتاب کو مجھ پر دے مارا، میں نے کتاب کو ہاتھوں سے روک لیا۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا ـــــــ غالباً آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں اپنی متاع عصمت لٹانا چاہتی تھی؟' میں خاموش رہا۔

میں یہ جانتی تھی کہ آپ یہی سمجھیں گے۔ سلیم صاحب! یہ بھی آپ کی ایک معصومیت ہے۔ آپ کا تو کیا بلکہ کل مرد ہمیشہ عورت کی فطرت کے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ . . . . . .'

وہ آپ جو کچھ بھی کہیں لیکن میری نگاہوں کو آپ دھوکا نہیں دے سکتیں۔ یہ اب تک کام کر رہی ہیں، میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

ہرگز نہیں۔ اگر آپ نے حقیقی نظروں سے میرے دل کو دیکھا ہوتا تو کبھی بھی ایسے جملے زبان مبارک سے نہ نکلتے،

میں کچھ خدا تو ہوں نہیں کہ دل کی باتوں کو جان لوں۔

ں واقعات سے نتیجہ نکال سکتا ہوں۔ اور وہ واقعات بالکل
، کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

بہت خوب! جن واقعات کی طرف آپکا اشارہ ہے
ض اضطراری جذبہ تھا، اور جس شے نے اس جذبے کو بیدار
یادہ آپ کی دلکشی۔ حسنِ سیرت، میری سادہ لوحی اور سب سے
ہ مادۂ ضبط کی کمی ہے۔ میں صرف محبت کی بھوکی ہوں —
ر ئی اتفاقیہ طور پر کسی جنگل میں جہاں سوا کانٹوں کے کچھ نہ ہو
، خوشنما پھول دیکھ پائے تو کیا وہ اسے توڑنا نہ چاہے گا؟
ستان میں اگر دفعتہً ایک چشمۂ شیریں ابل پڑے تو کیا قافلے
شخص کی یہ خواہش نہ ہو گی کہ وہ سب سے پہلے ایک جام بھرے؟
ممکن ہے کہ شدت اشتیاق اور پیش دستی کی فکر میں انگلیوں
کانٹے چبھ جائیں یا پیر پھسل جائے تو کیا وہ جذبہ موردِ الزام
جو اس کوشش کا محرک ہے؟ اگر شدّت وارفتگی اور فراوانی
ت نے مجھ میں یہ اضطراری کیفیت پیدا کر دی تو میں قابلِ
م کیوں؟ نفسیات کا مطالعہ تو آپ نے کیا ہو گا۔ کیا یہ حقیقت
کہ شدّتِ احساس اور وارفتگیِ جذبات کے تموج میں انسان
لذ رتا ہے جو وہ کرنا نہیں چاہتا؟ —— زبان بیکار ہو جاتی
او راظہار خیال کے لئے خود بخود وہ ذریعہ غیر ارادی طور پر
ہو جاتا ہے۔ جس پر خود اپنا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔۔
ن اس غیر شعوری جذبے کی رو میں اپنے مقصد سے کوسوں دور
تا ہے، جو یقیناً اس کے ہوش و خرد کی تذلیل کا باعث ہوتا
—— یہ ہے اس واقعہ کی حقیقت جس کی بنیاد پر آپ کے
ہ نفرت کا اظہار مجھے عصمت فروش کہنا چاہتا ہے۔

میں بغور سر جھکائے یہ تقریر سنتا رہا۔ جب وہ کہہ
ذ میں نے گردن اٹھائی۔ گلابی ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔
اور سرمگیں آنکھوں میں قطرات اشک ٹپک پڑنے کے لئے مضطرب
تھے، یہ وقت وہ ہوتا ہے جب بڑے بڑوں کی ہمت جواب دینے
لگتی ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی مردانہ قوت ملنساری کو اکسایا اور کہا۔
میرے خیال میں آپ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ مجھ سے محبت
کرتی ہیں۔

آنکھوں سے قطرات اشک کی بارش ہونے لگی اور اسنے
اپنے سر کو صوفے کے تکیہ میں چھپا لیا۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔
کچھ کہتے بن نہ آئی اور چپ سر جھکائے سوچنے لگا لیکن ایسا معلوم
ہوا کہ دماغ ماؤف ہو گیا۔ اور سوا چند بے ربط باتوں کے اس میں کسی
قطعی فیصلہ کے اٹھنے کی گنجائش ہی نہیں۔ کچھ وقفہ کے بعد جب
ممتاز کا دل ہلکا ہوا تو اس نے ایک نئے انداز سے تقریر شروع کی،

پیارے سلیم! مجھے معلوم ہے کہ تم میری عزیز سہیلی
قمر سے محبت کرتے ہو۔ اور اس سے زیادہ وہ خود تم سے محبت کرتی
ہے۔ کاش مجھے اس کا علم پہلے ہی ہو گیا ہوتا تو میں بغیر کچھ ظاہر کئے
ہوئے دل ہی دل میں تمہاری پرستش کرتی رہتی —— مگر افسوس
—— خیر مجھے اس کی پروا نہیں ؎
محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد۔ جسطرح تم قمر کے
پیارے ہو اسی طرح تاحیات بلکہ اس کے بعد بھی میں تم سے محبت
کروں گی۔ اور قمر کو بھی اسی نگاہ سے دیکھوں گی۔ میرا وجود اس کی
راہ میں کانٹے نہ بوئے گا۔ بلکہ پھولوں کی سیج بچھائے گا۔

یہ کانٹے بونا نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ اس کی اس چیز
پر ڈاکہ ڈالنا چاہتی ہیں جسے وہ عزیز رکھتی ہے۔ میں نے گفت کی۔

میں ڈاکہ نہیں ڈالتی۔ اس کی عزیز چیز اسی کے پاس
رہیگی میں اس کی قدر اور اس سے صرف پیار کروں گی۔ بس اتنی
التجا ہے کہ تم میری محبت کا زبانی ہی سہی اقرار کر لو۔

اب میں سخت مشکل میں پڑ گیا کہ اس کا کیا جواب دوں لیکن پھر بھی ہمت سے کام لیکر کہا۔ یہ میرے لئے مشکل ہے۔ کیونکہ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ مجھے قمر سے محبت ہے۔ پھر یہ کسطرح ممکن ہے کہ ایک انسان ایک ہی صنف کی دو ہستیوں سے بیک وقت محبت کرے۔

محبت نہ کرو، اقرار ہی کرلو،

میں اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد اور بھی فلسفیانہ طریقے سے میں نے اسکو سمجھایا لیکن اس کی ضد کے سامنے میری ساری منطق ناکام رہی اور مجھے وہاں سے بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

اس کا وجود اب میرے لئے نہایت تکلیف دہ ثابت ہونے لگا۔ اکثر اس سے قمر کے یہاں ملاقات ہوئی تو میں نے بہت اداس پایا۔ یہ دیکھ کر اس لڑکی کی ناعاقبت اندیشی پر بڑا صدمہ ہوتا۔ اس کے خطوط بھی برابر آتے۔ میں حتی الوسع جواب سے گریز کرتا۔ اگر اس کے دس خط آتے تو جواب میں صرف ایک سادہ سا خط نصیحت کا لکھ دیتا جو ہمیشہ بیکار ثابت ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچی کہ میں اس کے سائے سے بھی بھاگنے لگا۔ سینما یا کسی عام تفریح گاہ میں بھی اسے دیکھ پاتا تو کتراکے وہاں سے دبے پاؤں چل دیتا۔ کسی جگہ بھی جاتا نزہی خیال دامنگیر رہتا کہ کہیں ممتاز تو نہیں ہے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ مجھے اپنے سائے پر بھی بعض وقت اسی کا شک ہوتا۔ اب اسکے تصور سے بھی اذیت ہونے لگی اور مجھے اختلاج کے دورے شروع ہوگئے۔

مشکل یہ آن پڑی تھی کہ قمر اور فیروزہ کے سامنے مجھے اندرونی کیفیات کے چھپانے میں بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ یہ اور بھی تکلیف دہ امر تھا۔ ممکن تھا کہ میں گھر روانہ ہو جاتا لیکن جانے کے بعد پھر برسوں ادھر آنا نہ ہوسکتا تھا اور مجھے یہ بھی منظ نہ تھا۔ آخرکار ایک ترکیب ذہن میں آئی اور چچا سے اجازت لے ہفتہ عشرے کیلئے نینی تال روانہ ہوگیا۔

نینی تال سے جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ چچی صاحبہ ک بڑی بہن کے صاحبزادے اختر صاحب معہ اپنی محترمہ کے تین دنوں سے فروکش ہیں اور اس غرض سے آئے ہیں کہ فیروزہ کی نسبت اپنے چھوٹے بھائی سے طے کرالیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ چ صاحب نے یہ کہکر صاف انکار کردیا ہے کہ میرے بھتیجے سے رشتہ طے ہو چکا۔ میں آیا تو اُن سے بھی تعارف ہوا اور انہیں بھی معلوم ہوگیا کہ ان کے بھائی کی راہ کا کانٹا میں ہی ہوں۔ ان کی محترمہ بھی بہت اخلاق سے ملیں۔ بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ محترمہ ان کی بیوی نہ تھیں بلکہ حضرت کہیں سے انہیں اڑا لائے تھے اور اور بزرگوں میں اپنی رفیقۂ حیات ثابت کر رکھا تھا۔

دو ہفتہ کے بعد چچا کے یہاں ایک پارٹی ہونیوالی مجھے حکم ہوا کہ اپنی پسند سے لکھنؤ جاکر دو درجن میز کرسیاں خر لاؤں۔ روپے لیکر دوپہر کی گاڑی سے میں روانہ ہوگیا۔ اخ صاحب کے ایک عزیز صفدر بھی وہیں خاص لکھنؤ رہتوں سے میر ساتھ ہو گئے۔ ان سے پہلے کئی بھی ملاقاتیں ہوچکی تھیں۔ میں نے اس امر پہ مسرت ظاہر کی کہ یہ سفر ایک حد تک دلچسپ ہوگا

قریب شام ٹرین لکھنؤ پہونچی۔ صفدر نے ایک اشتہار کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

اماں آج نیو تھیٹرس کا اشرپٹ سنگر ہو رہا ہے۔

ہوگی تو یہ خوب فلم،

اس میں کیا شک ہے۔ مزا یہ کہ کانن اور سہگل دونوں پہلی دفعہ ایک ہی ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اس کو تو ضرور دیکھنا چاہئے،

دیکھنا تو چاہئے لیکن سب سے ضروری تو وہ کام ہے جس کیلئے آئے ہیں۔

اجی آپ بھی عجیب آدمی ہیں، اماں اسوقت رات کو یہ بوجھ کہاں ڈھوتے پھرینگے، آئے ہیں تو ذرا شہر میں بھی تو گھوم لیں۔

تو پھر کرنا کیا ہے!،

کرنا کیا ہے! اماں آج سینما دیکھ لیں، رات کو کہیں پڑ رہیں، صبح کو چیزیں خرید کے پارسل کر دیں!

بات معقول تھی، میں بھی تیار ہو گیا۔ سینما دیکھ کر نکلے تو پوچھا۔

یار رہیں گے کہاں؟ یہاں تو میرا کوئی ملاقاتی بھی نہیں،

چلو کسی ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹائیں،

بھئی تم بھی عجیب دہقانی معلوم ہوتے ہو۔ چلو میں ابھی سلیمان سکے دیتا ہوں،

ہم لوگوں نے ایک تانگہ کیا۔ اس سرزمین پر پہونچے جہاں حسن سرراہ ایک کامیاب شکاری کی طرح کمند پھیلائے ہر آنے جانے والے کی راہ دیکھتا رہتا ہے۔ ہر طرف سے طبلہ کی تھاپ کے ساتھ دل پگھلا دینے والے سارنگی کی لے زنانے گلوں کی پاٹ دار آواز سے ہم آہنگ ہوکر رہزن تمکین و ہوش اور فردوس گوش کا سماں پیدا کر رہی تھی۔ کہیں کہیں بالاخانے پر جلوہ بارے ہوشربا صورت نظارہ دے رہی تھیں، اور کھلے ہوئے دروازے ہر آنے والے کے لئے آغوش منتظر تھے۔ یہاں پہونچکر صفدر نے تانگے والے کو رخصت کر دیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

ارے یہ تم کہاں لے آئے!،

اماں چلو بھی چپکے ورنہ ساری رات یونہی مارے پھروگے۔

غرض یہ کہ بہت حجت حیلے کے بعد وہ ایک زینے پر چڑھنے لگا۔ میں بھی پالتو جانور کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک بائی صاحبہ ہیجان انگیز انگڑائی کے ساتھ سینہ کے ابھار کو نمایاں کرتے ہوئے مٹک کر اٹھیں اور نہایت ادب کے ساتھ سلام کرکے قالین کے فرش پر بٹھایا۔ صفدر نے بیٹھتے ہی چند لایعنی مذاق کئے، جن کا جواب انہوں نے بھی ویسے ہی چست جملوں سے دیا۔ مجھے اس نظارے سے انتہائی کوفت ہو رہی تھی لیکن مجبوراً اس کم بخت صفدر کا ساتھ دے رہا تھا، بائی جی کے دست حنائی ایک خاص نزاکت کے ساتھ پان کی گلوریاں لگانے میں مشغول ہو گئے۔

یار مجھے پیاس معلوم ہو رہی ہے: میں نے چپکے سے صفدر کے کان میں کہا۔

کیا آپ کسی آدمی سے جنجر منگوا سکتی ہیں؟ اس نے بائی جی سے پوچھا۔ اچھا میں خود ہی جاتا ہوں، رہنے دیجئے۔ فوراً ہی وہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں بھی چلتا ہوں، حقیقتہً میں بہت گھبرا رہا تھا۔

نہیں تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آیا۔ دفعتاً اس کے پاؤں یکے بعد دیگرے سیڑھیوں کو طے کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور کہنے لگا۔ آدمی لیکر ابھی آتا ہے۔

دس منٹ کے بعد کشتی میں تین مصفا شیشے کے گلاس رنگین جنجر کے آئے۔ ایک میں نے، ایک صفدر نے اور ایک بائی جی نے لیا۔

میں نے جو پیا تو غیر معمولی تیزی اور تلخی تھی، ان لوگوں کی باتوں میں پھر کچھ خیال ہوا اور تھوڑا تھوڑا کر کے پورا گلاس صاف کر گیا۔ کچھ دیر کے بعد گھبراہٹ وغیرہ غائب ہو گئی اور میں بھی اس پر تصنع صحبت میں پوری دلچسپی لینے لگا۔ صفدر کے اشارے سے سعزوروں نے سر ملایا اور بائی جی نے ہیجان انگیز اشاروں اور اداؤں کے ساتھ اپنی لوچدار آواز سے ایک گیت چھیڑا۔ گلے میں وہ شیرینی کا رس تو نہ تھا، لیکن پھر بھی صوتِ نسائی کا باقاعدگی سے کسی سریلے ساز کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہی کیا کم کیف آفریں ہے؟ میں خوش ہو گیا اور جھجک کے اس گلاس کو اپنے سامنے رکھ لیا۔ جو صفدر نے دوبارہ اپنے لئے منگایا تھا، وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا جس میں بظاہر ایک لطیف مزاح پوشیدہ تھا، بائی جی نے کئی گانے گائے میرا گلاس تقریباً ختم ہو چکا تھا، سازندے رخصت ہوئے اور ہم لوگ اس سے بھی زیادہ پرتکلف کمرے میں لائے گئے۔ ایک طرف شاندار مسہری لگی تھی، اور دیواروں پر متعدد نیم عریاں تصویریں ضیافت نظر کا سامان اپنی آغوش میں لئے تھیں۔ ادھر تو میری شعاع نظر ان رعنائیوں میں گم ہونے لگی، اُدھر میاں صفدر بائی جی سے کچھ چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ اس منظر ہوشربا سے ہٹ کر جب میری نگاہ مڑی تو وہ اٹھ کر جا رہا تھا، میں نے پوچھا۔

کہاں چلے؟

ابھی آیا، تم یہیں بیٹھو۔

بائی جی نے مجھے اپنے ساتھ مسہری پر بٹھا لیا۔ پومیائی اور پرفیوم کی ملی جلی تیز خوشبو سے دماغ اڑا جا رہا تھا اور ریشمی ساڑی کی ترنم خیز سرسراہٹ رگ احساس کو گدگدا رہی تھی، بغل والے کمرے میں جو گلاس میں چھوڑ آیا تھا، اٹھا کے آیا۔ اور پھر سے منہ کو پی گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اچھی طرح یاد نہیں، بس اتنا ہوش ہے کہ ان کی گداز اور خوبصورت جانگیں عریاں اور دیوار کی نیم عریاں تصویریں مسکرا رہی تھیں۔

صبح کو بیدار ہوا تو بائی جی کی مرمریں بانہیں اب تک میری گردن میں حمائل اور وہ خود ایک شانِ بے نیازی سے محو خواب تھیں۔ میں نے آہستہ سے اپنی گردن کو آزاد کرایا اور اٹھ کر کوٹ پہن لیا۔ اس کمرے کے ذرے ذرے سے نفرت ہو رہی تھی اور گناہ کے بے شمار عفریت فضا میں منڈلاتے ہوئے نظر آ رہے تھے رات کے واقعے سے بند بند لرز رہا تھا اور میں ایک نگاہ حقارت آمیز ڈال کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو پرس غائب، کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اور فوراً ہی پھر بائی جی کے کمرے کی طرف مڑ گئے، وہاں ایک حسن فروش کی زندہ لاش پڑی تھی، جس کے چاروں طرف چشم تصور نے بوالہوسی کے گدھوں کو شور مچاتے ہوئے دیکھا۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر ایک چھوکرے سے دریافت کیا جو وہیں رہتا تھا۔

شب کو جو صاحب میرے ساتھ یہاں آئے تھے وہ کہاں ہیں؟

وہ تو رات ہی کو چلے گئے تھے۔

حقیقت آشکارا ہو گئی اور اب مزید استفسار کی گنجائش باقی نہ تھی، گردن جھکائے نیچے اترا اور سڑک کے کنارے کنارے سوچتا ہوا چلا کہ اب مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ وہ جگہ تو میرے لئے نئی نہ تھی لیکن وہاں میرا کوئی ملاقاتی نہ تھا، یہ بھی پتہ نہ تھا کہ صفدر کہاں گیا اگر پتہ بھی ہوتا تو ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ میں ہرگز اس کا سامنا نہ کرتا۔ رہ رہ کر اپنی حماقت اور اس کے کمینہ پن پر غصہ آ رہا تھا کبھی اپنی اس ذلت کا احساس ہوتا کہ چچا کو کیا جواب دوں گا اتنے پیسے بھی

تھے کہ بار۔ پھر گھر سے روپے منگالیتا، کبھی جی میں آتا کہ بائی جی کے ہاں جاکر اپنی مصیبت بیان کردوں اور بہت ممکن تھا کہ وہ مدد سے دریغ نہ کرتی لیکن میری غیرت اسکو ہرگز گوارا نہ کرسکتی تھی، اسکے سوا وہاں جاتے ہوئے ڈر بھی معلوم ہوتا تھا، یہی سب سوچتا ہوا ں اسٹیشن کے قریب پہونچا۔ سارا بدن چور ہو رہا تھا، اور اب مجھے احساس ہوا کہ شب کو میں کافی مقدار میں شراب پی گیا، بذبہ نفرت حقارت تیز تر ہوتا گیا۔ اور احساس گنہگاری نے دل میں طوفان پا کردیا۔ بھوک بھی معلوم ہو رہی تھی اور خلو کی وجہ سے دماغ بھی منتشر ہو گیا۔ ممکن تھا کہ میں پیدل ہی روانہ ہو جاتا لیکن یسی حالت میں اتنی پچاسی میل کے سفر کا خیال ہی امر محال تھا، مازت آفتاب سے سارے جسم میں جلن پیدا ہونے لگی، پانی ن کے پاس آیا منہ ہاتھ دھونے کے بعد پیٹ بھر کر پانی پی گیا۔ ہاتھ دھوتے وقت میں نے محسوس کیا کہ میری انگلی میں ایک انگوٹھی ہے۔ اس خیال سے ایک گونہ تقویت ہوئی، میں نے زندگی بھر امر نہ کیا تھا، ہمت جواب دینے لگی، اور پھر مایوسی نے انگیز ابھرتا بانہ کرتا بہ ہزار دقت وخرابی اس انگوٹھی کو صرف دو روپے میں ہی ڈالا۔ کچھ ناشتہ کیا اور ٹرین پر بیٹھ رہا۔

گھر پہونچکر میں نے چچا سے کہلوا دیا کہ راستہ میں روپے دری ہو گئے اور میں آپ کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر رہا۔ ام دن اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا۔ حتی کہ شام کو بھی کہیں نہ گیا۔ یب فیروزہ کسی کسی وقت آجاتی اور مختلف باتوں سے ل بہلانے کی کوشش کرتی، رات آئی تو دماغی انتشار اور بھی رہ گیا۔ مجھے قمر کے سامنے بھی جاتے ہوئے حجاب معلوم ہوتا تھا ی وجہ سے وہاں بھی جا نہ سکا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے بستر پر گرم پڑی ہے۔ کسی کروٹ چین نہ آتا۔ گھر کے سب لوگ خواب نوشیں کے مزے لے رہے تھے، لیکن نیند مجھ ہی سے کوسوں دور تھی، شاید اسے بھی مجھ سے نفرت ہو گئی ہو، گھبرا کر بستر سے اٹھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارے لباس میں کیڑے گھس گئے ہیں، کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور ٹہلنے لگا، دماغی کوفت بڑھتی ہی گئی۔ آفس روم میں آیا۔ لیمپ روشن کر اسکاٹس کا مشہور ناول "Kenilworth" پڑھنے لگا۔

ایسا معلوم ہوا کہ دفعتاً کسی نے پیچھے سے آکر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ دیکھا تو اختر صاحب کی محترمہ مسکرا رہی ہیں میں نے ڈانٹ کر کہا، کیا حرکت ہے؟ جواب میں انہوں نے گرفت مضبوط کرکے میرے لب ورخسار کے بوسے لئے، غصہ میں آکر میں نے دھکا دیا تو وہ فرش پر ڈھلک گئیں۔ معاً ایسا معلوم ہوا کہ کوئی تیز شے میرے سر میں پیوست ہو گئی، پلٹ کر دیکھا تو اختر صاحب کے ہاتھ میں ایک چمکدار خنجر تھا، دراز میں ہر وقت بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا، میں نے لپک کر نکال لیا۔ ٹھوکر لگی تو میز الٹ گئی، تاریکی میں لگاتار تین چیمبر خالی ہو گئے، اتنے میں شور وغل کے ساتھ روشنی ہوئی اور فوراً ہی سب لوگ اسی کمرے میں تھے، اختر صاحب کانپ رہے تھے، کتاب کا صفحہ تازہ خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ فائر کے نشانات دیوار پر تھے، جس سے آس پاس کی چند تصویریں بھی مجروح ہو گئی تھیں۔ چچا۔ چچی۔ فیروزہ۔ مسز اختر۔ سب کے دھندے چہرے نظر آئے۔ پھر کچھ پتہ نہیں ——— آنکھ کھلی تو خود کو اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دھوپ کافی پھیل چکی تھی، فیروزہ۔ قمر اور ممتاز آس پاس بیٹھی تھیں میں نے ایک نظر سب کو دیکھا اور کہنا شروع کیا ——— واقعات مجھے مجرم اور گناہ گار ثابت کر رہے ہیں۔ میں اپنی موافقت

میں کوئی شہادت بھی نہیں پیش کر سکتا۔

آپ میں ابھی اتنی قوت نہیں کہ اس معاملے پر غور و فکر کریں۔ اس لئے چپ چاپ لیٹے رہئے۔ قمر نے کہا۔

مجھے فکر کی ضرورت ہی نہیں، آنکھیں پھر نیم بیہوشی کی حالت میں بند ہو گئیں۔

دوسرے دن میں نے فیروزہ کو اپنے کمرے میں بلا بھیجا وہ فوراً چلی آئی۔

فیروزہ! اب میں گھر جانا چاہتا ہوں، میں نے کہا۔

ایں! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ابھی آپ کو۔۔۔،

نہیں مجھے جانا ہی ہوگا، میں نے جملہ تمام نہ ہونے دیا۔

آپ کچھ فکر نہ کیجئے، والدین سے کل باتیں صاف صاف کہہ دیجئے، فیروزہ نے گھبرا کر کہا۔

کیا میں انہیں اپنا منحوس چہرا دکھا سکتا ہوں،

فیروزہ رونے لگی۔

میں نے دیکھا کہ فیروزہ کی ضد مجھے یہاں سے جانے نہ دے گی، تین بجے شب کو ایک گاڑی جاتی تھی، اٹیچی کھول کر دیکھا تو اتفاق سے اس میں اتنے روپے تھے کہ میں بہ آسانی وہاں سے روانہ ہو سکتا تھا، چپکے سے اپنا اسباب ٹھیک کیا اور ایک ملازم کی مدد سے جسے کچھ دیکر ہمراز بنا لیا تھا، دو بجے شب کو میں نے ہمیشہ کے لئے اس مکان کو چھوڑ دیا۔ تین بجے کے بعد میں ٹرین پر تھا اور ہمیشہ کے لئے اس سرزمین سے دور ہو رہا تھا گاڑی کی رفتار کے ساتھ مسلسل یہ آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ قمر، فیروزہ، ممتاز، قمر، فیروزہ، ممتاز، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے پہیئے میری خوشگوار زندگی کے گذشتہ واقعات کے خیالی مجسموں کو چور کرتے جاتے ہیں۔

مجھ میں کافی نقاہت آگئی تھی، گھر پہونچا تو والد صاحب نے سر کے زخم کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ایک اتفاقی حادثے کو اس کا سبب بتایا۔

تیسرے ہی روز فیروزہ، قمر اور ممتاز کے خطوط ساتھ ہی ساتھ ملے، چچا یا چچی نے کوئی خط نہ لکھا، تینوں کے مضامین قریب قریب ایک ہی تھے، یعنی ہر میں چپکے سے بلا کہے سنے چلے آنے پر اظہار رنج تھا، میں نے سبھوں کا جواب اسی روز لکھ دیا جسمیں اپنی مجبوری اور انتشار ذہنی کا مختصر طور پر ذکر تھا، اس کے بعد عرصہ تک مراسلت جاری رہی۔ فیروزہ کے کم۔ قمر کے باضابطہ اور ممتاز کے روزانہ خطوط آتے رہے۔ میں بھی اول الذکر دونوں کے جوابات پابندی سے دیتا۔ ممتاز کو بہت کم لکھتا۔

ایک زمانہ گذرنے کے بعد ممتاز نے دفعۃً خط لکھنا بند کر دیا۔ مجھے تعجب تو ضرور ہوا لیکن کوئی خاص پریشانی اس ترکِ مراسلت سے نہ ہوئی۔ قمر کے خط سے معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہونیوالی ہے۔ اس خبر سے انتہائی مسرت ہوئی کیونکہ میں اسے خوشگوار زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا، ایک خط مبارکباد کا اس کو لکھ دیا جس کا اس نے جواب نہ دیا۔ تو حقیقتہً وہ اس کا جواب ہی کیا دے سکتی تھی،

ایک روز کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ڈاکیہ نے ایک خط لا کر دیا۔ یہ ممتاز کا خط تھا، کھول کر دیکھا تو مندرجۂ ذیل عبارت نظر آئی۔

۔۔۔۔۔۔۔ کل میرا جسم ایک غیر ہستی کے حوالے کر دیا جائیگا۔ قسمت میں یہی ہونا تھا، لیکن تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میرے جھوٹے

[illegible]ے شوہر میری روح کو کسی دام وں خرید نہیں سکتے۔ یہ غیر فانی شے
[illegible]اد سے وابستہ ہو چکی جو حقیقتہً اس کا مستحق ہے ——— میرا
[illegible]ن ہے کہ مرنے کے بعد میری خاک کے ذرے بھی اس کی ملکیت ہونے
[illegible]از کریں گے ——— کاش میری قسمت کا فیصلہ بھی میری
[illegible]مرضی کے مطابق ہوتا۔ لیکن اس اعتباری دنیا میں ایسا ہوتا
[illegible]کب ہے ؟......

تمہاری ہمیشہ

خط کا مضمون میری توقع کے بالکل خلاف تھا، پڑھکر
[illegible]سکتے کے عالم میں پڑ گیا۔ کالج جانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا اور
[illegible]دن ممتاز کی آیندہ زندگی کے متعلق سوچتا رہا ——— اُف
[illegible]ذالله! کتنا تاریک مستقبل!! —

اس نے اپنے پیروں میں ایسی زبردست کلہاڑی ماری
[illegible]ہنے دو اور ذاتوں کو بھی مجروح کر دیا۔ ایک تو مجھکو اور دوسرے
[illegible]ہونے والے شوہر کو۔ مجھکو اس لئے کہ ہر احساس کو ایک تلخ حقیقت
[illegible]رح میری زندگی کے ساتھ ہو جانے کا احتمال تھا اور اپنے شوہر کو
[illegible]لحاظ سے کہ اس کی ازدواجی زندگی کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی،
[illegible]در تک اسی سوچ فکر میں رہا مگر دماغ کسی خاص نتیجے پر پہونچنے
[illegible]قاصر تھا۔

تقریباً دو ہفتے کے بعد اس کا ایک خط ملا جس میں اسکی
[illegible]ی کی مختصر تفصیل۔ شوہر کے مزاج اور مالی حالت کا ذکر۔ اعزا کے
[illegible]ات وغیرہ کا بیان تھا۔ میں پڑھتا جاتا تھا اور دل ہی دل میں خوش
[illegible]۔ اب اس کی زندگی میری خواہش کے مطابق پر مسرت گذرے گی
[illegible]خوشی یہ خوشی رنج و صدمے سے مبدل ہو گئی جب میں نے
[illegible]پڑھا......... پھر بھی میں تمہاری ہی رہوں گی اور
[illegible]ہی وعید پڑھتے ہوئے میری جان جائے گی؛ اس کے جواب

میں نے اپنا سب سے پہلا طویل ترین خط لکھا جس میں ازدواجی
زندگی کے فرائض اور سماج کے قوانین کو نہایت ہی عمدہ فلسفیانہ اور
منطقی دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر مجھے اپنے دلائل کی
بے بسی اور بے چارگی پر سخت افسوس ہوا جب اس نے اسکے جواب
میں کل باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اسی طرح ایک جملہ لکھ مارا
اب میں نے یہ سمجھکر کہ میری ساری نصیحتیں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔
خط ہی لکھنا بند کر دیا۔ وہ برابر لکھتی رہی اور میں خاموشی سے
نتیجے کا منتظر تھا، شادی کے بعد تقریباً چھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری
رہا۔ اس کے بعد دفعتہً اس کا اس مضمون کا خط آیا کہ "میں ڈاکٹروں کے
مشورے کے مطابق اپنے شوہر کے ساتھ بغرض تبدیل آب و ہوا کوہ منصوری
پر جا رہی ہوں، کیونکہ میری صحت بالکل جواب دے چکی، کھانسی اور بخار کسی
طرح پیچھا نہیں چھوڑتا، اگر مناسب سمجھو تو تم بھی وہاں آؤ تاکہ کچھ روز
گذشتہ زندگی کے نہ پلٹنے والے واقعات کی یاد سے دل بہلائیں" خط
پڑھکر میرے منہ سے انا للہ نکلا اور بس۔

والد کی طویل علالت سے میں سخت پریشان تھا، فیروزہ
اور قمر کے خطوط کے جواب لکھنے کی بھی مشکل سے مہلت ملتی تھی، ممتاز بھی
اپنی روزمرہ کی حالت سے برابر مطلع کرتی رہی اور ہر خط میں میری ملاقات
کی تمنا ظاہر کرتی، اسکی حالت دن بدن ابتر ہوتی جاتی تھی، لیکن میں
خود ایسی سخت مصیبت میں پھنسا تھا کہ ایک منٹ بھی کہیں ٹلنا دشوار
تھا، والد اپنی بیماری سے جانبر نہ ہو سکے، ان کے بعد جیسا کہ دنیا کا
قاعدہ ہے ہر جانے والے پریشان کیا کہ خدا کی پناہ ساتھ دن کی پریشانی
اور متعدد مالی [illegible] ایسا الجھا کہ خود مجھے اپنی ہی ہستی کی خبر نہ رہی اور ابھی
سب کر ہی میں مبتلا تھا کہ ممتاز کا ایک خط ملا جس میں حسرت
ملاقات کے ساتھ [illegible] تھا ——

سے نہ جانا کہ جاتا ہے دنیا سے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

اس شعر میں نہ جانے کونسی کیفیت تھی کہ میں اپنے ذاتی معاملات کے نتائج سے قطعی غافل ہوکر پہلی ہی ٹرین سے منصوری کیلئے روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر ممتاز ہی کا تصور بندھا رہا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ اسکی محبت میں کتنی گہرائی، کتنی وارفتگی اور کتنی والہانہ کیفیت تھی، اسکی محبت میں چشمہ کی روانی اور سمندر کا جوش تھا۔ میں منصوری اسوقت پہونچا جب لوگ اسکی لاش کو گھر لیجانے کی تیاری کر رہے تھے، میرے پاس سوا اشکِ حسرت کے چند قطروں کے اور تھا ہی کیا چنانچہ میں نے اُنہیں دریائے بے بہا کو بارگاہِ محبت میں عقیدت کیش دل کے ساتھ بطور خراج پیش کر دیا۔ اور ایک آہ جگر سوز کے ساتھ وہ اقرار کرلیا جس کی تمنا اُسے تا عمر رہی۔

والد کے انتقال کے بعد اعزا کے برتاؤ کی وجہ سے میری مالی حالت نہایت ہی ناقابلِ اطمینان ہوگئی، ممتاز کے واقعہ سے اور بھی شکستہ دل ہوگیا حقیقتہً میری پرمسرت زندگی سراپا یاس و حسرت بن گئی، میری مختصر سی لائبریری میں جتنے متفاول لٹریچر تھے، سب کو نذرِ آتش کر دیا اور انکی جگہ Pessimistic متشایم مصنفوں نے لی۔ اب میں ایک وارفتہ مزاج انسان ہوگیا تھا جس کا مشغلہ سوا درد انگیز اشعار گنگنانے کے اور کچھ نہ رہا۔ کبھی کبھی قمر اور فیروزہ سے بھی مراسلت ہوجاتی لیکن اب اس مشغلہ میں کوئی خاص دلچسپی نہ رہی تھی اسطرح زمانہ رفتہ رفتہ ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے اسی طرح ممتاز کا واقعہ بھی گئی گذری باتوں میں شامل ہوگیا۔ لیکن میں خود اس کو کبھی نہ بھول سکا اور نہ کسی کو میرے اس کے تعلقات کا علم ہی ہو سکا۔

ایک سال گذرنے کے بعد قمر کے ایک عزیز قریب کا خط آیا جسمیں انہوں نے ایک مختصر سی تمہید کے بعد مسٹر آل حسن کی طرف سے یہ تحریک کی تھی کہ میں انکی فرزندی میں آنا قبول کر لوں، ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے لفافے میں ایک خط قمر کا بھی تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ عنقریب ایک خط یہاں سے آپ کے پاس جانے والا ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا ہو آپ فوراً قبول کریں۔ اب یہ سب باتیں میرے لئے بالکل غیر دلچسپ تھیں میں نے ایک مفصل خط میں اپنی مالی پریشانیوں اور حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے قطعی معذوری ظاہر کی۔ تقریباً ایک ہفتہ کے بعد قمر کا ایک طویل خط آیا جس میں انتہائی غم و غصہ کا اظہار تھا، کچھ دنوں کے بعد فیروزہ کے خط سے معلوم ہوا کہ قمر کی شادی ہوگئی۔

ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی زندگی کے نشاط آور کیف اور اذیت کوش خمار پر غور کر رہا تھا، کہ فیروزہ کا ایک طویل خط ملا جس کے بعض حصے درج کرتا ہوں ۔۔۔۔۔ آپنے اپنے متعلق انتہائی جلدی سے کام لیا۔ اگر کچھ روز اور یہاں رہے ہوتے تو سب حقیقت آشکارا ہوجاتی۔ آپ کی جیب سے روپے کتنے نکلے کیسے نکالے گئے اور کیوں نکالے گئے یہ مجھے معلوم ہوچکا۔ قمر بھائی کیساتھ جو شب کو واقعہ گذرا اسکی بھی گتھی سلجھ گئی۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ ایک منظم سازش آپکے بدنام کرنے کیلئے کی گئی تھی، آپ براہِ مہربانی ایک مفصل خط ابا کو اپنی صفائی کا لکھ بھیجئے، بقیہ ثبوت پہونچانا میرا کام ہے۔ لیکن یہ کام ضرور کیجئے میں مکرر سہ کرر اسپر زور دیتی ہوں ۔۔۔۔۔ یہ خط دیکھکر مجھے ہنسی آگئی کیونکہ میں یہ خود ہی سمجھتا تھا اگر فیروزہ کو ثبوت بھی مل گئے تھے تو بعد از وقت تھے، یہی باتیں میں نے اسکو بھی لکھ دیں اس کے بعد بھی وہ مجھے برابر لکھتی رہی لیکن مجھے اپنی بے کیف زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی پیدا کرنا منظور نہ تھا تھوڑے دنوں کے بعد قمر لودھ

خوش انجام

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شکسپیر کے مشہور ڈرامہ TUWELFTHNIGHT کا اردو ترجمہ

مترجمہ

جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم۔ اے

(۴)

تیسرا ایکٹ

سین اول ——— اولیوا کا باغ

رٹوبی ۔ خدا آپ کو سلامت رکھے اے شریف زادے۔

یلا ۔ اور آپ کو بھی۔

رٹوبی ۔ کیا آپ گھر کے اندر داخل ہونگے۔ میری بھتیجی کی خواہش ہے کہ آپ جائیں۔

یلا ۔ وہی میری منزل مقصود ہے۔

رٹوبی ۔ تو قدم آگے بڑھائیے۔

یلا ۔ میرے قدم اپنے مقصد کو بہتر جانتے ہیں۔

رٹوبی ۔ میرا مطلب تھا کہ چلئیے۔ گھر میں داخل ہو جائیے۔

یلا ۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔

(وایلا اور میریا داخل ہوتی ہیں)

حسن و خوبی سے مزین خاتون! آپ پر آسمان کی خوشبوئیں نازل ہوں

سر اینڈرو۔ وہ نوجوان یکتا درباری ہے "آسمان کی خوشبوئیں نازل ہوں"۔ کیا ہی اچھا فقرہ ہے۔

وایلا ۔ میرا پیغام صرف آپ کے کانوں کے لئے ہے۔

اولیویا ۔ باغ کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اور بقیہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔

(سر ٹوبی، میریا اور سر اینڈرو چلے جاتے ہیں)

جناب، ہاتھ بڑھائیے۔

وایلا ۔ بندہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

اولیویا ۔ آپ کا نام؟

وایلا ۔ حسین شہزادی آپ کے خادم کا نام سیزیریو ہے۔

اولیویا ۔ میرے خادم! نہیں یہ آپ کیا بول رہے ہیں۔ آپ تو کونٹ اور سینو کے خادم ہیں۔

وایلا ۔ کیوں! وہ آپ کے ہیں۔ اور ان کی تمام چیزیں آپ کی ہیں۔ آپ کے خادم کا خادم بھی آپ کا خادم ہی ہوا۔

اولیویا ۔ میں رتی برابر بھی آپ کے ڈیوک کا خیال نہیں کرتی ہوں، وہ مجھسے کوئی امید نہ رکھیں۔

وایلا ۔ میں انہی کی خاطر تو آپ کے پاس آیا ہوں۔

اولیویا ۔ میری یہ التجا ہے کہ آپ ان کا کوئی تذکرہ نہ کریں، ہاں، اگر آپ کسی دوسرے کا پیغام عشق سنائیں تو آپ کی شیریں آواز کو ایشری نغموں پر ترجیح دوں گی۔

وایلا ۔ پیاری خاتون۔

اولیویا ۔ گذشتہ موقع پر جب آپ مجھکو مسحور کر کے چلے گئے تو میں نے آپ کو ایک انگوٹھی بھجوادی تھی۔ آپ میرے بارے میں کیا کیا سوچتے ہونگے۔ کاش کوئی میرے دل کو چیر کر دیکھتا۔

وایلا ۔ میں آپ پر رحم کرتا ہوں۔

اولیویا ۔ یہ جذبہ عشق سے قریب تر ہے۔

وایلا ۔ نہیں جب لوگ کسی کو حقیر سمجھتے ہیں تو اسکو رحم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اولیویا ۔ اس کا غصہ بھی پیارا معلوم ہوتا ہے۔ قتل چھپ سکتا ہے۔ لیکن عشق ہرگز پردۂ خاموشی میں نہیں رہ سکتا سینرریو۔ قسم ہے گلہائے بہار کی، قسم ہے نسائیت عفت اور صداقت کی، میں تجھپر عاشق ہوں اور تیرے غرور کے باوجود میں اپنے جذبۂ عشق کو چھپا نہیں سکتی ہوں۔

وایلا ۔ میں اپنی معصومیت اور اپنے شباب کی قسم کھاتا ہوں کہ کوئی عورت بھی میرے دل کی مالک نہیں ہوسکتی، الوداع، اب میں جاتا ہوں اور پھر کبھی اپنے آقا کی داستان اشک سنانے نہیں آؤں گا۔

اولیویا ۔ نہیں ایسا نہ کیجئے۔ آپ اکثر آیا کیجئے، ممکن ہے آپ کی پیغامبری سے میں آپ کے آقا کو ان کے عشق کا صلہ دیدوں۔

دوسرا سین ـــــــــ اولیویا کے گھر میں ایک کمرہ

سرٹوبی بلش، سر اینڈر وایگوچیک اور فیبین داخل ہوتے ہیں

سر اینڈرو ۔ قسم ہے اپنے ایمان کی، اب ایک لحظہ نہیں ٹھہروں گا۔

سر ٹوبی ۔ آخر اس کی وجہ؟

فیبین ۔ آپ کو وجہ بتانی پڑیگی۔

سر اینڈرو ۔ تمہاری بھتیجی تو مجھپر نگاہ بھی نہیں ڈالتی ہے۔ میں نے باغ میں دیکھا کہ وہ کونٹ کے خادم پر بیحد مہربان ہے۔ کیا میں اس خادم سے بھی گیا گذرا ہوں۔

سر ٹوبی ۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے خود کیا دیکھا ہے۔

نظرات

عید مبارک

رمضان کے روزے، خداوند تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت پر عاجز انسانوں کی طرف سے احسان شناسی و شکرگذاری کے طور پر رکھے جاتے ہیں کہ اسی روز پیام ربانی دیا جس نے انسانوں کو پستی سے نکال کر کمال کی بلندی پر پہنچایا، ان کی نادانی کو علم و معرفت سے، جہل و تاریکی کو دانائی و بصیرت سے اور وحشت و بربریت کو تہذیب و اخلاق سے بدل دیا، اسی لئے اس مہینہ کی مبارک راتوں میں ہم پورے آسمانی صحیفہ کو تراویح کی نمازوں میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور ایک ماہ کا وظیفہ ادا کرکے ارشاد خداوندی ولتکبروا اللہ علیٰ ما ہداکم لعلکم تشکرون (تاکہ تم اللہ کی بڑائی کا نعرہ لگاؤ جیسے کہ تم کو ہدایت بخشی اور تم اس کا شکریہ ادا کرو) کے مطابق دوگانہ عید کے ذریعہ اس شکریہ کو پیش کرتے ہیں اور خوشی و مسرت سے تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہیں، مبارک ہیں وہ جنہوں نے رمضان کے روزے پورے کئے اور اپنے دوگانہ شکر میں تکبیر کے ترانے بلند کئے۔

۲۷ اگست کو اردو شاعری کا ایک باکمال استاد اٹھ گیا، یعنی فانی نے اس دار فانی کو الوداع کہا۔ فانی نے اپنے کلام میں سب سے زیادہ موت کو یاد کیا، موت اور مختلف کیفیتوں کی سچی مصوری کی ہے، اب وہ موت سے ہم آغوش ہو چکے ہیں، سیماب نے صحیح کہا ہے کہ "غالب وقت و میر ثانی مرد" — جدید اردو شاعری میں غزل گوئی کے طرز کی خشت اول حسرت نے رکھی، فانی نے اس پر نئی عمارت بنائی، اصغر، جگر، سیماب، اور آرزو وغیرہ نے اس کے عالیشان کنگرے تیار کئے، اردو شاعری جب تک باقی ہے فانی کا نام بھی باقی رہے گا، خداوند تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

ان سطروں کے لکھتے وقت روس کی ملحد سلطنت عالم نزع میں دم توڑ رہی ہے، جابر و قہار اسٹالین سر چھپا کر ماسکو سے فرار ہو کر قازان کے برفانی علاقہ میں ڈھونڈ رہا ہے، روس کے گرجاؤں اور مسجدوں سے خدا کو رخصت کر دیا گیا تھا، مگر اس نے روز ہی سے اپنی قدرتوں کے جلوے اس نئی دنیا کے سامنے بھی دکھلا دیئے، پر وہ روس اب فنا کی آغوش میں سسکیاں لے رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ خدا سے یہ باغی قوم جس طاغی کے ہاتھوں برباد کی گئی، اس کی تباہی کسی دوسرے کے ہاتھوں کرتا ہو، مگر اس وقت تک کے واقعات نے چشم عبرت کو دکھا دیا کہ کتاب الٰہی میں سرکش قوموں کی تباہی و بربادی کے جو قصے عبرت و موعظت کے لئے بیان ہوئے ہیں، وہ کیسے سچے ہیں، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا — آخری وقت میں روس کے دوستوں نے یاد کرانا چاہا کہ وہ خدا کا دشمن نہیں، مگر یہ وقت طغیان و سرکشی کی سزا کا ہے، در توبہ کے وا رہنے کا نہیں۔

ہندوستان کے الحاد پسند نوجوانوں کے لئے تجدید ایمان کی دعوت ہے، ان کا قبلہ ایک طاغی کے ٹینکوں کی زد میں آکر مسمار ہو چکا ہے، وہ وقت دور جب کارل مارکس کا نظریہ جو عمل کے جامہ میں آچکا تھا، اب پھر محض ایک نظری فلسفہ کی شکل میں منتقل ہو جائے، مزدوروں سے ہمدردی کیجئے، کسانوں کو ظلم سے بچا ہر انسان کو اس کے واجبی حقوق ضرور دلوائیے، مگر ان حقوق کی خاطر حقوق اللہ کو نہ بھول جائیے، پہلے اللہ کے حقوق ادا کیجئے، پھر بندوں کی فکر کیجئے، خدا سے بغاوت کرنے والی قوم کا حال آپ نے دیکھ لیا، اس کو خوب یاد رکھئے، خدا سے باغی ہو کر، خدا کی زمین پر آپ حکومت نہیں کر سکتے۔

تعلیم بالغاں کی تحریک ہمارے صوبہ میں پچھلے دور حکومت میں جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم نے شروع کی تھی، ہمارے صوبہ میں اس سلسلہ میں ایک حد تک کیا کام انجام پائے، ان کی تفصیلی اطلاع ہمارے پاس موجود نہیں، جامعہ ملیہ دہلی نے اس تحریک کو قبول کر کے اسی زمانہ میں ایک مستقل کی بنیاد ڈال دی تھی، وہ ادارہ تعلیم و ترقی کے نام سے اس وقت تعلیم کی اشاعت کی خدمت میں معروف ہے، دہلی کے بعض حلقوں میں علمی مرکز قا

کے ناخواندوں یا کم پڑھے لکھوں کی تعلیم کا انتظام کر رہے ہیں، دوسری اہم خدمت اس سلسلہ میں لٹریچر کی اشاعت ہے، انہوں نے بستیوں میں گشتی کتب خانے بھیجنے کے لئے کتابوں کے چند سٹ تیار کئے ہیں تاکہ بالغ مبتدیوں کو حرف شناس کر کے ان میں تعلیمی دلچسپی اور ذوق پیدا کریں، یہ کتابیں تقریباً دو سو کی تعداد میں ہیں، ہماری نظر سے گذرے ہیں، وہ سب کے سب دلچسپ کارآمد اور شوق بڑھانے والے ہیں۔ دوسرا سٹ تعلیمی کتابیات کا ہے جن میں عبارتی و تصویری دو نوں قسم کے سٹ ہیں، یہ بھی بہت مفید اور کارآمد ہیں، جو لوگ دیہاتوں میں اصلاح و ترقی کے کام کر رہے ہیں وہ خاص طور پر ان کو منگا کر اپنی برادری، بستی اور گھر والوں کو باتوں باتوں میں لکھنے پڑھنے کی عادت دلائیں، ان کتابوں اور کتیبوں کی قیمت لاگت کے اعتبار سے بہت کم رکھی گئی ہے، ناظم صاحب ادارہ تعلیم و ترقی، قرول باغ، دہلی کے پتہ سے خط و کتابت کیجائے۔

انجمن حمایت اسلام مدراس، کے تحت میں ایک مسلم یتیم خانہ تقریباً پچاس برس سے قائم ہے، ہز ہائینس پرنس آف ارکاٹ اس کے مربی اور خان بہادر عبد العزیز بادشاہ اس کے صدر ہیں، سکریٹری کے ایک مکتوب میں ہمیں یہ دیکھکر افسوس ہوا کہ دوسرے اسلامی اداروں کی طرح یہ بھی ان دنوں مالی مشکلات میں مبتلا ہے، مدراس نے تو بڑے بڑے اسلامی اداروں کی ذمہ داری اپنے تنہا کندھوں پر لے لی ہے، ضرورت ہے کہ ارباب خیر اس کی امداد کے لئے ہاتھ بڑھائیں، جناب شفاء الملک حکیم حاجی سید محمد مخدوم اشرف معتمد یتیم خانہ اسلام ۵۳ والاجاہ روڈ، ماونٹ روڈ پوسٹ، مدراس کے پتہ سے امداد بھیجی جا سکتی ہے۔

ہمارے ضلع کے ایک گاؤں چپکی میں وہاں کے اہل خیر مسلمانوں کی کوششوں سے ۱۹۳۸ء سے ایک یتیم خانہ قائم ہے، اس کے تحت ایک پرائمری اسکول جاری ہے، اور بورڈنگ میں ۲۰ یتیموں کی پرورش کیجاتی ہے، وہ ہماری دستگیری کے منتظر ہیں، امید ہے کہ خاص طور پر مسلمانان گیا اس کی امداد کی طرف توجہ کرینگے، اور کم سے کم فطرہ، زکوٰۃ اور چرم قربانی کی رقموں سے ایک مفید خدمت کے بآسانی جاری رہنے میں معاون ہونگے۔

یوں تو ہمارے صوبہ میں بڑے بڑے مذہبی اوقاف ہیں، جن پر توجہ اس وقت ہوئی جب صوبہ کی کونسل میں وقف بل آیا تھا، اور اوقاف کے متولیوں کے درمیان کام سرگرمی پھیلی تھی، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اوقاف کی آمدنی کس طریقہ پر اب تک صرف ہوتی رہی اور ہو رہی ہے، —— لیکن خداوند تعالیٰ جنت نصیب فرمائے مسماۃ بی بی صغرا کو اور اجر عطا ہو ان کی خوش نیتی پر، کہ آج یہ عظیم الشان وقف اپنے صحیح معنوں میں دینی مصارف کے ساتھ چلایا جا رہا ہے، یہ وقف اسٹیٹ ایک وقف کمیٹی کی نگرانی میں ہے، جو پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج کی طرف سے نامزد ہوتی ہے، جناب خان بہادر نواب سید شاہ واجد حسین صاحب خسرو پور، اس کے صدر، جناب مولوی عبد اللطیف صاحب متولی، اور جناب حافظ سید شرف الدین صاحب ایم، اے، بی، ایل، نائب اول کے عہدوں پر مامور ہیں اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، جناب مولوی عبد اللطیف صاحب کی مرتب کی ہوئی سالانہ روداد برائے ۱۳۴۶ ف تبصرہ کے لئے ہمارے پاس آئی ہے، اس زمانہ میں زمینداری کی آمدنی پر بڑا نازک وقت گذر رہا ہے، لیکن متولی و نائب اول کی مشترک کوششوں سے آمدنی کے کم ہونے کے اسباب کی نگرانی کی گئی، ان کا ازالہ کیا گیا، اور آمدنی بڑھانے کے ذرائع پیدا کئے گئے، اور خدا کے فضل و کرم سے اس وقت اس کی آمدنی سے ایک عظیم الشان عربی درسگاہ "مدرسہ صغریہ" اور ایک انگریزی اسکول "صغرا وقف اسٹیٹ گرلز ہائی اسکول" دونوں چلائے جا رہے ہیں، بیار شریف اور صوبہ کے باہر کی مسجدوں، مدرسوں اور اسلامی اداروں کو امدادیں دی جاتی ہیں، آنے جانے والے مسافروں کے مصارف پورے کئے جاتے ہیں، اور وقف نامہ کے مطابق ایک خطیر رقم سالانہ حجاز بھیجی جاتی ہے، اور ہندوستان میں گشت کرنے والے عربوں کی امداد کیجاتی ہے، اس طریقہ سے وقف کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، ہم ان کارکنوں کو ان کے اخلاص و دیانت پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں اس وقف کے ذریعہ مفید دینی و ملی خدمات انجام پاتے رہیں۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں حکومت کے مصارف سے فنون لطیفہ کی تعلیم کے لئے درسگاہیں قائم ہیں، ہمارے صوبہ میں حکومت کی غفلت سے اس وقت تک ایسی کوئی درسگاہ نہ تھی، اور ہمارے صوبہ کے طلبہ مدراس، کلکتہ، بمبئی اور لکھنؤ کے آرٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جایا کرتے تھے، لیکن گذشتہ

ماہر فن جناب رادھا موہن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایل کی کوششوں سے پٹنہ میں "پٹنہ اسکول آف آرٹس" قائم ہو چکا ہے اور چند برسوں سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے حکومت نے اب اس کو سند الحاق بھی دیدی ہے، لیکن اصل ضرورت اس کو مالی امداد پہنچانے کی ہے امید ہے کہ حکومت بہار اس اسکول کے لئے کوئی ایسی بڑی رقم سالانہ منظور کریگی جو اس اسکول کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرسکے، اور کارکنان درسگاہ اطمینان کے ساتھ اپنے فرایض منصبی ادا کرسکیں۔

ہندی کے مشہور رسالہ "وشال بھارت" کے مدیر جناب سری رام شرما اور مولانا عبدالحق صاحب کے درمیان "اردو ہندی کے تنازع" کے سلسلہ میں کچھ بحثیں بھی حال میں ہوئی ہیں، اس ضمن میں ... یہ ذکر بھی آگیا تھا، جناب شرما صاحب کے خیال میں، "بہار میں اردو کی کوئی اہمیت نہیں" بہار میں اگر اردو کو نہیں تو کس زبان کو اہمیت حاصل ہے؟ جناب شاہ مقبول احمد صاحب نے اس پر اپنے مختصر مگر جامع مضمون میں نظر ڈالی ہے جو ندیم کے اسی نمبر میں کسی دوسری جگہ آپ کی نگاہوں سے گذریگا، جناب شاہ صاحب موصوف ... کی زبان پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں، "صوبہ بہار میں اردو زبان کے محاورے" کے عنوان سے موصوف کا ایک قابل قدر مضمون ہلال اردو میں چھپ کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے، ندیم کا یہ مضمون بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔

پچھلے مہینے کے نظرات کے صفحوں میں بہار نمبر پر ایک معاندانہ تبصرہ کا تذکرہ آیا تھا، اس ماہ اس تبصرہ کی بعض غلطیوں کو ایجاب کرکے اس کی تصحیح اسی بہار میں چھاپی گئی ہے۔ ع غلطیہائے مضامیں مت پوچھ ــــ پچھلے مہینے کی اُن سطروں میں ہمارے محترم دوست قاضی عبدالودود صاحب کا نام بھی آیا تھا، بعض دوستوں کو شبہ ہوا کہ اس کا مدعا یہ ہے کہ گویا وہ مضمون جناب قاضی صاحب کا ہے، یا انہوں نے لکھوایا ہے، حالانکہ مدعا یہ تھا کہ ان میں کے چند بیانات شبہات قاضی صاحب کے نزدیک پیدا ہوئے تھے، ندیم میں ان میں سے بعض پر بحثیں ہوئیں اور بعض پر خط و کتابت جاری رہی لیکن جناب قاضی صاحب سے انہی سنی سنائی باتوں پر تحقیقات عالیہ و انکشافات نادرہ کی عمارت کھڑی کرلی گئی، نہ یہ کہ خود قاضی صاحب نے اس مضمون کو لکھا یا لکھوایا، امید ہے کہ دوستوں کی غلط فہمی ان سطروں سے دور ہوگی۔

اگر کسی کام کے انجام پاتے رہنے کا انحصار کسی شخص واحد پر ہو تو اس شخص کی چھوٹی چھوٹی ذاتی مجبوریاں اس کام کی انجام دہی میں رخنے پیدا کرتی ہیں، ندیم خاص طریقے پر شائع ہونے لگا تھا، پہلے ہفتہ میں لازمی طور پر قدر دانوں کے ہاتھوں میں ہوتا تھا، لیکن راقم سطور کی وقتی علالت کے باعث اس کی ترتیب و طباعت کے سارے کام اچانک رک گئے، آج رمضان کی ۲۷ اور اکتوبر کی ۱۹ تاریخ ہے، اس کے بعد ہی عید کی چھٹیاں ہیں یعنی نومبر کا پرچہ بھی گویا آگے بڑھتا ہو، اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ کچھ صفحے بڑھا کر اکتوبر و نومبر کے پرچے ایک ہی ساتھ شائع کردئے جائیں، تاکہ دسمبر کا پرچہ اپنے وقت پر پہلے ہفتہ میں شائع ہوسکے۔
علالت کے زمانہ میں آئے ہوئے بہت سے خطوط کے جوابات ابھی تک نہ جاسکے، دوستوں کو غیر معمولی شکایتیں ہونگی، لیکن عید اور دیوالی کے تہواروں کو ہنسی خوشی منا لینے کے بعد شکوہ و شکایات کے دفتر کو کھلا رکھنا زیب نہ دیگا، پچھلی باتوں کو بھول جائیے، آیندہ سے وقت پر جوابات جائیں گے۔

مقالات

ڈاکٹر ٹیگور اور اقبال

از پروفیسر مولانا سید ابو ظفر ندوی

یہ تقریر بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیگئی، اور اس کی اجازت سے خطیب نے ندیم میں اشاعت کیلئے بھیجا۔

(۱)

اس دور جدید میں حضرت اقبال دنیا کے ایک بڑے شاعر تھے، ان کے بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر تھا، اور سپرو خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لحاظ سے ڈاکٹر سپرو (الٰہ آباد) اور اقبال ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ۱۸۷۶ء میں اقبال بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے ابتدائی، مڈل، میٹرک، اور ایف اے کی تعلیم اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں حاصل کی، مولانا سید میر حسن جیسے لائق استاد کے زیر نگرانی تعلیم کے ساتھ شاعری کا بھی سبق لیتے رہے، لاہور پہنچکر بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں فلسفے کے مشہور استاد آرنلڈ تھے جنہوں نے علی گڈھ میں علامہ شبلی نعمانی سے عربی کی تعلیم حاصل کی تھی حضرت اقبال نے ان سے کافی فائدہ اٹھایا۔ اقبال اردو، فارسی، عربی، انگریزی میں اعلےٰ قابلیت رکھتے تھے، فرنچ اور جرمنی سے بھی آشنا تھے،

اختتام تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن اس عرصہ میں بھی شاعری کا مشغلہ برابر جاری رہا، اور اب وہ استاد داغ کے باقاعدہ شاگرد تھے، اس زمانہ میں جسقدر مشاعرے ہوتے، اقبال اس میں برابر شریک ہوتے رہتے، اسی زمانہ کا ایک شعر ہے جس پر ارشد گورگانی نے بڑی داد دی۔ شعر

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

ڈاکٹر اقبال کچھ دنوں کے بعد لندن گئے، پہلے کیمبرج سے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی پھر جرمنی جاکر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لی فلسفہ ایران پر بہترین کتاب اسی زمانہ میں لکھی۔ لندن کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں بھی آپ نے تعلیم حاصل کی۔ اور بار ایٹ لا بھی ہوگئے۔ اپنی غیر معمولی شہرت کے باعث لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ تک عربی کے پروفیسر بھی رہے، آخر ۱۹۰۸ء میں یورپ سے ہندستان واپس آئے اس زمانہ میں بھی شاعری کا سلسلہ برابر جاری رہا، بلکہ وطنیت پر بہترین نظمیں زیادہ تر اسی عہد کی ہیں جس سے ان کی قومی شاعری کا شہرہ سارے ہندوستان میں پھیل گیا ہر زمانہ میں ایک قومی شاعر پیدا ہوتا ہے جو قوم اور ملک کو اپنے نغموں سے

بیدار کر دیتا ہے۔ جس سے سوئی ہوئی قومیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اور بیدار قومیں دوڑ پڑتی ہیں۔ اقبال بھی اسی قسم کا قومی شاعر تھا،
دوسرے شاعروں کی طرح اقبال پر بھی چند دور گذرے ہیں۔ ابتدا میں عام رجحان کے مطابق محض تغزل کے طرف طبیعت
مائل رہی، پھر کشمیری ہونے کے سبب اصل وطن کو ابھارنے میں زور طبیعت کو صرف کرتے رہے۔ اسی عہد کا ایک شعر ہے۔

دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں　　مل کے دنیا میں رہو مثل حروف کشمیر

لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، خیالات میں وسعت ہوتی گئی۔ اور اب کشمیر کے بدلے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ اس دور میں تخیل
کی بلندی گو کم ہے مگر جذبات کا ایسا بے پناہ سیلاب امڈ آتا ہے جو ردکے نہیں رکتا۔ اور بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص ایک دفعہ
انکو پڑھے یا سن لے۔ اور اس کے قلب میں تلاطم نہ پیدا ہو۔ اسی عہد کا یہ شعر ہے۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں!　　زیب دیتا ہے اگر کہیں تجھے سارا جہاں

پھر اس سے بھی بڑھکر کہتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

وطن کی محبت اور مذہب کا جوش یہ دو بڑی طاقتیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جس سے ٹکرا جائے اسکو پاش پاش کر دے۔ غور
کرو کہ اگر یہ دونوں ملجائیں تو اسکی طاقت کا کیا عالم ہوگا۔ اور دل کی گہرائیوں میں کتنی دور تک موثر ہو۔ اقبال کا وسطی طور اسی قسم کا تھا
چنانچہ اسی زمانہ کے نظم کا ایک شعر ہے۔

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے　　میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اس کے بعد اقبال پر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، وہ یورپ جاتے ہیں اور وہاں کے تمدن اور وطن پرستی کا بغور مطالعہ کرتے
ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کو انتہائی حیرت ہوتی ہے، کہ ایک گورا باوجود اتحاد مذہب کے ایک افریقی سے صرف اس لئے نفرت کرتا ہے
کہ وہ کالا ہے، چینی، جاپانی، ترک، صرف اس لئے قابل عزت نہیں ہیں کہ وہ زرد رو ہیں۔ پھر ایک جرمنی فرانسیسی سے اور فرانسیسی
اٹالین سے، اور اٹالین انگریز سے اور انگریز روس سے اس بنا پر اتحاد حقیقی سے محروم ہے، کہ ان سب کا وطن الگ الگ ہے۔ برعکس
اس کے چین و تاتار کے رہنے والے مسلمانوں کی ہندوستانی مسلمان برابر عزت کرتے ہیں۔ اور ایک ہندی مسلمان سے ایک عرب یا
ایرانی اس سبب سے کبھی نفرت نہیں کرتا کہ وہ اسکا ہم وطن نہیں ہے۔ چنانچہ اقبال کے اس شعر سے اسکی توضیح خوب ہوتی ہے۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

پس اقبال ایک ایرانی مسلمان سے محبت کرنے اور اسکو تمام معاشرتی حقوق مساویانہ طور پر دینے کو تیار ہے اس لئے کہ وہ ہم مذہب
ہے۔ اسی خیال کو ادا کرتا ہوا وہ کہتا ہے:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لیکن اسکو وطن سے بھی محبت ہے اس بنا پر وہ کبھی نہیں چاہتا کہ ایک ایرانی ہندوستان کا حاکم ہو جائے اور ہم اس کے غلام۔ البتہ

اسکو ایسی خالص وطنیت سے قطعی نفرت ہے جو یورپ کی پیداوار ہے۔ اور جس میں بنگالی گجراتیوں سے اور مدراسی پنجابیوں سے باوجود اتحاد مذہب کے نفرت کرے، اسی خیال کو اس نے اس طرح ادا کیا ہے جو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اقبال کی پاک روح جس طرح درجہ بدرجہ ترقی کر رہی تھی، اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو تھوڑے عرصہ کے بعد خیالات میں اور وسعت ہو جاتی، اور پھر بلا امتیاز ملک و ملت وہ تمام دنیا کی مخلوق کو ایک ہی نظر سے دیکھکر زیادہ خوش ہوتی، جیسا کہ خواص صوفیوں کا معاشرتی معاملہ میں عملاً منتہائے خیال رہا ہے۔

اقبال کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں اور قابل قدر پیغام عمل ہے۔ اس کی شاعری یاس اور شک سے پاک ہے وہ اپنی طرح دوسروں کو بھی بلند تخیل اور باہمت دیکھنا چاہتا ہے، چنانچہ کہتا ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است
تیرے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہدے مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہدے

وہ عمل اور حرکت کو زندگی، اور سکون کو موت سے تعبیر کرتا ہے، اسی لئے وہ زندہ تمنا کی دعا کرتا ہے، تاکہ ہمیشہ سرگرم عمل رہے وہ کہتا ہے۔ شعر

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے

اقبال کے کلام میں دوسری ممتاز چیز "مسئلہ خودی" ہے۔ اسرار خودی، رموز بے خودی، زبور عجم وغیرہ کا آپ مطالعہ کریں، ہر ایک میں آپ کو ایک ہی صورت چلتی پھرتی نظر آئیگی۔ خودداری کی یہ بے نظیر تعلیم زندہ قوموں کی کتاب زندگی کا روشن صفحہ ہے جس سے دنیا میں قوموں کی عزت بلند تر ہو جاتی ہے۔

اقبال گو جمہوریت کا حامی ہے مگر یورپ کی موجودہ جمہوریت کو فریب محض سمجھتا ہے، اس لحاظ سے اس کا شدید ترین مخالف ہے، اسی لئے اس کے بارہ میں کہتا ہے۔

ہے وہ ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبال یورپ کے انٹرنیشنلزم کا بھی بدترین مخالف ہے، کیونکہ اس کی بنا محض خود غرضی پر موقوف ہے، جس سے دنیا میں بدامنی کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ جیسا کہ زمانے نے آج ہم پر ظاہر کر دیا ہے، اسی لئے ان کو اقبال کفن دزد کہتا ہے۔ چنانچہ شعر ملاحظہ ہو۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند !

ہاں! سوشیلزم کا اقبال بیحد دل سے مؤید ہے۔ اور اسی لئے اسکی زور و شور سے تائید کرتا ہے۔

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے، یہ پیامِ کائنات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

غرض اقبال موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا شاعر ہے، جو خودداری کا قائل ہے، دوسروں کی مدد سے چلنا پسند نہیں کرتا، بلکہ جہد کی تعلیم دیتا ہے اور زندگی کے لئے علم لازمی قرار دیتا ہے۔

(۲)

دنیا کا دوسرا بڑا شاعر اس زمانہ میں "رابندر ناتھ ٹیگور (ٹھاکر) ہے۔ ان کے بزرگ مشرقی بنگال کے ایک دولتمند ٹھاکر تھے، لیکن نیک کاموں میں تمام دولت صرف کر ڈالی، ان کے والد ایک سادھو کی حیثیت سے بول پور ضلع بیر بھوم (بنگال) کے بنجر زمین پر وارد ہوئے۔ اور ایک آشرم شانتی نکیتن کے نام سے قائم کیا، جو بہت معمولی درجہ کا تھا، شاعر ٹیگور نے بڑے ایثار سے اپنی ساری عمر کی کمائی اسکو ترقی دینے میں صرف کر ڈالی، اور وہ آج سارے ہندوستان میں بین الاقوامی علوم و فنون کا ایک بڑا انسٹی ٹیوشن ہے، لوگ ٹیگور سے زیادہ واقف ہیں، اس لئے حالات سے قطع نظر کرکے ان کی شاعری کی طرف توجہ کرتا ہوں۔

ان کی شاعری تخیل کے اعتبار سے بہت ہی بلند ہے، اور ان کی زبان بے حد شیریں اور صاف ہے، جیسا کہ "محبت اور زندگی" کی نظم پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ بنگالی زبان پر بہت بڑا احسان یہ کیا کہ اسکو صاف اور شستہ بنایا۔ ثقیل الفاظ اس میں سے نکالے، ہلکے اور عام فہم الفاظ کا اضافہ کیا۔ ٹیگور کی شاعری فطرت کا آئینہ ہے اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کا علمبردار، اعتقاد کے اعتبار سے ٹیگور موحد ہیں۔ وہ مورتی پوجا کے سخت مخالف ہیں۔ اسی لئے آشرم میں مورتی پوجا ممنوع قرار دیا ہے ان کا بلند ترین نظریہ امن کا پیغام ہے، ٹیگور جنگ کا بدترین مخالف ہے۔ محبت کے ساتھ تمام دنیا میں امن کا خواہاں ہے، وہ سکون ابدی کا داعی اور وحدانیت کا گیت گانے والا ہے، جس کا ترنم دکھ بھری زندگی والوں کو نیند کے لئے لوری دیتا ہے۔ وہ ویدانت کا پرستار ہے، وہ غیر محدود کو محدود میں، اور سمندر کو قطرہ میں تلاش کرتا ہے، اس کا پیغام تہذیب ہند کی قدیم یادگار، خود غرضی میں ڈوبی ہوئی جنگجو قوموں کو صلح و امن کا پیغام دینے والا، تھکی ہوئی قوموں کو پرسکون اور میٹھے نغموں سے آشنا کرنے والا ہے،

ٹیگور ایک بڑا شاعر ہے، اور فطرت کے رموز سے آگاہ ہے، وہ کائنات کے عمیق ترین مسائل سے بحث کرتا ہے، وہ ظاہری نہیں، بلکہ باطنی، جسمانی نہیں بلکہ روحانی مقاصد پیش نظر رکھتا ہے، جیسا کہ "ڈاک گھر" کے پڑھنے سے آپ پر روشن ہو جائیگا۔ وہ قوم پرست ہے لیکن مغربی طرز کا نہیں۔ وہ اپنے ملک سے ضرورت محبت کرتا ہے، مگر دوسرے ملکوں سے اسکو قطعی نفرت نہیں بلکہ یہ قومی عالمگیر محبت کا ہم معنی ہے، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

سواراج کیا ہے؟ مایا ہے، یہ ایک غبار ہے، جو ابدی تجلیات کا کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہو جائیگا۔ ہم کتنا ہی مغرب کے سکھائے ہوئے فقرہ کو رٹا کریں مگر ہمارا نصب العین سواراج نہیں۔ ہماری جنگ روحانی جنگ ہے [illegible]

میں انسانوں کو ان بندھنوں سے آزاد کرانا ہے جو اس نے اپنے اطراف بن لئے ہیں۔ اور یہ بندھن قومیت کے منظم ادارے ہیں۔
جب روحانیت نے طاقت، دولت اور اس کو مغلوب کر لیا تو یہی انسان کا سوراج ہے، روحانی آزادی اصلی آزادی ہے۔

دوسرے شاعروں کی طرح ٹیگور پر بھی مختلف دور گذرے ہیں۔ لیکن ہر دور میں [illegible] دیکھنے میں معروف
ہو جاتی ہیں۔ "چترا" کو پڑھئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] کے علاوہ کسی اور چیز کے طرف شاعر کی آنکھیں لگی ہیں۔ "راجہ رانی"
کا بغور مطالعہ کیجئے تو آپ جان لیں گے کہ شاعر کمینہ خصائل سے دنیا کو کس طرح بلند تر دیکھنا چاہتا ہے۔ "قربانی" کے مضامین سے
واقف ہونے کے بعد ابدی صداقت کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے، اور "مالنی" دیکھنے ہی سے انسان مذہب کی حقیقت، خدا کی محبت
اور اسکی عبادت کا صحیح راستہ معلوم کر لیتا ہے۔

مادر گیتی ہر زمانہ میں ایک شاعر پیدا کرتی ہے جو ملک کو اسکی ضرورتوں کے مطابق صحیح راستہ پر چلنے کا پیغام دیتا ہے۔ مجھے
یہ کہہ کر بے حد خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ بہ یک وقت اس نے دو شاعر اعظم پیدا کئے، ان میں سے ایک
ایشیا کو جد و جہد کا پیغام دیتا ہے اور دوسرا یورپ کو صلح و امن اور شانتی کا، یہ اقبال اور ٹیگور ہیں۔

تخیلِ نو کا پیغمبر

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کی نظر میں

ترجمہ جناب خواجہ عبدالقیوم ایم، اے

ڈاکٹر ٹیگور کے انتقال کے فوراً بعد مسز سروجنی نیڈو نے آل انڈیا ریڈیو کے بمبئی اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

دنیا کے ہر سو آج کروڑوں انسان اس شخص کا ماتم کر رہے ہونگے جس کی جیکتی ہوئی ہستی ان کے لئے زندگی کا پیغام لیکر آئی تھی، جس کے وجود میں ان کے افکار کا مرہم، ان کی لغزشوں کی تسلی، اُن کے مایوس لمحوں کی امیدیں، ان کی تاریک گھڑیوں کی روشنی مضمر تھی، آج کلکتہ میں ہزاروں مرد اور عورتیں اُس حسین شکل کے آخری دیدار کے لئے مضطرب ہونگے جو تین پشتوں تک ان پر چمکتا رہا۔ کروڑوں انسان پھولوں اور آنسوؤں کا تحفہ اس اکمل انسان پر چڑھانے کے لئے بیتاب ہونگے جس کی میعادِ حیات اسی سال تک محدود تھی مگر جس کی غیر فانی زندگی کی میعاد لامحدود ہے۔

گذشتہ شب مجھے خدشہ تھا کہ رابندر ناتھ ٹیگور اپنے خوابوں کی دنیا میں منتقل نہ ہو جائے، تمام رات میں جاگتی رہی اور اس وقت کی منتظر رہی جب حسین جسم اپنی حسین روح کو خیر باد کر دیگا۔ علی الصباح دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس نحیف جسم میں زندگی کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ اس کے بعد میں نے پھر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ٹیگور گذر چکا ہے۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کیا اہمیت تھی؟ دنیا شعراء، موسیقی اور حسن سے لبریز ہے، تو پھر ٹیگور میں وہ کونسی خوبی تھی، جس کی بنا پر وہ دنیا کے ہزاروں انسانوں کا محبوب تھا؟ وہ بنگال میں پیدا ہوا، اس کے دماغ اور جسم کے تمام تاثرات بنگال کے ممنون ہیں، اس کی تمام شاعری بنگال کے دریاؤں کے مناظر، پھولوں، دیہاتی زندگی اور ساون کے گہرے بادلوں سے بھری پڑی ہے، اس کی شاعری کے تمام عناصر اس کے اپنے ملک کے محتاج ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ تمام دنیا کا شاعر تھا، اس کی شاعری کی زبان سے بہت کم لوگ واقف تھے، مگر یہ رفتہ رفتہ لاکھوں انسانوں کے دلوں کی زبان بن گئی، آخر اس کا راز کیا تھا؟ اس کا پیغام کیا تھا؟ بنی نوع انسان کی محبت اور انسانوں کے جذبہ خدمت سے گہرا عشق ہی اس کی زندگی کا راز تھا۔

کبھی اپنے دیہاتی گھر، کبھی بہار میں، کبھی ایک کشتی پر ملاحوں کے گیت سنتے وقت، شانتی نکیتن میں اپنے ساتھیوں کے درمیان ایک پیغمبر کی طرح بیٹھ کر وہ "انسانیت کی مغموم آواز" کو سنتا رہا، اور اپنی متصرف آنکھوں سے مردوں اور عورتوں کے دلوں کی گہرائیوں کو پڑھتا رہا۔ وہ ان کے آنسوؤں اور تبسم کے راز کو سمجھتا رہا، محدود منظر میں بیٹھ کر وہ دنیا کے تمام مختلف مناظر کی اپنے بسیط تخیل کی مدد سے تصویر کشی کرتا رہا، وہ دلوں کے راز کو سمجھنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا، اس نے اپنی مترنم آواز بلند کی اس کے اس تغزل میں تمام دنیا کی شاعروں کا تبسم تھا، اس نے جب بلکے سروں میں گایا تو انسانی تاریخ کا تمام درد اس میں پنہاں تھا، اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور چھوٹے بچوں کو کھیلتے دیکھا تو اس کا نغمہ چہک اٹھا، اس کے نغمہ میں عالم طفولیت کی تمام خوشیاں کھلکھلا اٹھیں: اس نے روحوں کی ان عبادتوں کو سنا جو بچپن کی خوشی سے امتزاج حاصل کرنے کے لئے کر رہی تھیں، ان کی وہ دھیمی سنجیدہ آواز سے اس کا نغمہ پر تھا۔ اس نے زندگی کی کشمکش کا مطالعہ کیا اور اس کا دل دنیائے غم سے چھلنی چھلنی ہو گیا۔ اس نے اپنے پیروں تلے شبنم محسوس کی اور اسے اپنے سر پہ تاروں کا احساس ہوا۔ اس نے دریاؤں کا نغمہ سنا، اس نے بڑے بڑے پہاڑوں پر غروب آفتاب کے منظر کو دیکھا۔ اور یہ تمام کے تمام رنگین نظارے اس کے جادو بھرے الفاظ میں منعکس ہوتے رہے۔

وہ تمام دنیا میں گھومتا رہا، اور اپنے تخیل اور غور و فکر سے اس نے تجربہ کا ایک عظیم الشان احاطہ تعمیر کیا۔ اس نے مکتوبات قدیمی کو پڑھا۔ اس نے اپنے ملک کے قدیم فلسفہ کو پرکھا۔ اس نے تمام ملکوں کے ادب اور فن کو پڑھا۔ اور اپنے وسیع مطالعہ تصور، سیاحت، اور تجربہ سے اس نے انسانی وحدت کی تشکیل کی۔

جوانی کے عالم میں اس کی ہستی رومان سے بریز تھی، اس کی شاعری میں اس کی جوانی کے جذباتی دھاروں کا تموج تھا، اس کی زندگی کے وسطی ایام میں اس کے تغزل میں سنجیدگی آنے لگی، مگر اس کے بعد وہ پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں واپس آ گیا۔ کیونکہ وہ جوانوں کے درمیان رہنے لگا اور جوانی کے تبسم سے وہ ایک کیف محسوس کرنے لگا۔

مجھے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس کی زندگی کے مختلف پہلو یاد ہیں، جب حیدر آباد میں میں ایک چھوٹی سی لڑکی تھی تو مجھے یاد ہے میری ماں کیف اور گیت گایا کرتی تھی جس سے میں جھوم جایا کرتی مگر جس کی زبان میری سمجھ سے باہر تھی، وہ مجھ سے کہا کرتی "یہ رابندر ناتھ ٹیگور کا گیت ہے، اور یہ بابو بنگال کا محبوب شاعر ہے" وہ مجھ سے کہا کرتی کہ عورتیں، ملاح، کسان، طلباء، مزدور، تمام کے تمام لوگ رابندر ناتھ ٹیگور ہی کے گیت گاتے ہیں، خوشی کے لمحات میں غیر ارادی طور پر اس کے نغمے ان کے لبوں پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ اور غم کے موقعہ پر اس کے نغمے ٹوٹے ہوئے دلوں کی آس بندھاتے ہیں۔

۱۹۱۳ء میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب گیتان جلی کو لیکر یورپ گئے میرے دوست آئرلینڈ کے مشہور شاعر ییٹس نے ٹیگور کی روحانیت سے متاثر ہو کر اس کی زبردست شخصیت کا اعتراف کیا جس تعجب کی نگاہ سے یورپ نے ٹیگور کی روحانیت کی ترجمانی کی قوت کو محسوس کیا وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے "گیتان جلی امن و صلح کا ایک پیغام تھا جس کی بے چین دنیا منتظر تھی، یورپ کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ٹیگور ایک مشعل ہدایت سمجھا جائے گا، نئی زندگی، نئی ہمت اور نئی امید کے لئے

لوگ اس کی طرف راغب ہوئے۔ گیتان جلی کی اشاعت کے ایک سال بعد یورپ میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ٹیگور نے محسوس کیا تھا کہ یہ ایک المیہ تمثیل دیکھنے کے قبل کچھ تسلین کی ضرورت ہے۔ ٹیگور اپنے تین لہراتے ہوئے کپڑوں کے سمیت، اپنے حسین لہراتے ہوئے بالوں اور حسین لہراتی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ ایک رومان آمیز ہستی بن گیا۔ جس کے اندر جاذبیت کے وہ تمام عناصر موجود تھے جن کی خواہش جوانوں اور بوڑھوں دونوں کے دلوں میں ہوا کرتی تھی۔ انگلینڈ جو چند باتی شاعری سے کچھ گریز کرتا ہے اور جو عموماً غیر ملکی شعرا کا زیادہ مداح نہیں ہوتا، ٹیگور کی شاعری پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑا اور بہت سی ایسی دلچسپ مثالیں ملنے لگیں جب مرد اور عورتیں اس کی شاعری پر شیفتہ ہوگئے۔ ایک دفعہ ایک نوجوان نے پانچ بوڑھی عورتوں کو موٹر بس میں ایک قطار میں بیٹھے گیتان جلی پڑھتے دیکھا، وہ ڈرا ہوا میرے پاس آیا۔

جب وہ سکنڈے نیویا، یوگوسلاویہ، زکوسلواکیہ، ہنگری، فرانس، جرمنی، امریکہ، کینیڈا، جنوبی امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں گیا وہ ایک نئے تخیل کا پیغمبر بن کر گیا۔ وہ مشرق کی ایک عقلمند ہستی تھا، جو ایک نئے پیغام اور زندگی کے ایک نئے تخیل کا حامل تھا، وہ اپنے ملک کا ایلچی بن کر گیا۔ اور اس نے ان کے سامنے اپنے ملک کی تمام روحانی دولتیں کھول کر رکھ دیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک صوفی تھا، شاید وہ صوفی ہو، تمام شاعر صوفی ہوتے ہیں۔ اور تمام ہندوستانی بھی۔ مگر اکثر اوقات لوگ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سنجیدہ اور حسین تصوف کے باوجود وہ درحقیقت مزاح اور انسانیت سے پر تھا، بچوں کے ساتھ وہ اسطرح کھیلتا جیسے وہ خود ایک بچہ ہو۔ وہ حسن کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا کیونکہ فطری طور پر تمام شعرا حسن پرست ہوتے ہیں۔ وہ بزرگوں کے ساتھ بیٹھتا اور گھنٹے گھنٹے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا زندگی اور موت کے اصلی اصولوں پر تبصرہ کرتا، اور جہاں کہیں بھی وہ جاتا لوگ یہ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اس کا تعاقب کرتے، حسن کا یہ کونسا تخیل ہے؟ مادی دنیا کی گہری تاریکی میں یہ کونسی شعاع پرور ہستی ہے؟ سادھو، پیغمبر، یا ملہم، آخر ہے کون؟

اس سوال کا جواب یہ تھا کہ اسکے اندر تینوں طاقتوں کا نچوڑ تھا، کیونکہ وہ ایک مُغنی تھا، ٹیگور کی شاعری کے مقابلہ میں اور کونسی چیز افضل ہوسکتی ہے؟ فلاسفر پیدا ہوئے اور مر گئے، انکے فلسفہ کا تخیل ابھرا اور ڈوب گیا، بادشاہوں نے حکومت کی اور چل بسے ان کے بعد ان کے نام اور خاندان کو کون یاد رکھتا ہے؟ جلیل القدر افسروں نے شان و شوکت حاصل کی اور اب قعر گمنامی میں پڑے ہیں، مگر شاعر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ رہتا ہے، اسکی حیات کا مسکن آئندہ پیدا ہونیوالے دل ہے۔ ٹیگور جیسا شاعر جیسے اپنا ملک عزیز تھا، دوسرے ممالک کو بھی عزیز رکھتا تھا، اس کی ہستی کے ہر ایک تار، سر کے ہر ایک نقرئی بال اور خون کے ہر ایک سرخ قطرے میں ہندوستان ہی ہندوستان تھا، وہ ہندوستانی خوبیوں کا مرقع تھا، مگر اس میں ہمیشہ ایک ایسی خوبی تھی جو دنیا کے تمام باشندوں کو بھا سکے۔ ہندوستان کی خصوصیت تمام علوم کی قدر دانی میں ہے ہندوستان اس تخیل کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے کہ کسی ادب کی پیدائش کس سرزمین میں ہوئی وہ اس ادب کے ذوق کو قبول کر لیتا ہے، اور اسکی روح کی لطافتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے ایسے ہندوستان نے آخر کار اپنا حسین ترین ترجمان اپنے خیالات کا حسین ترین پیکر اور اپنا محبوب پیغمبر رابندر ناتھ ٹیگور کی ہستی میں پایا جس نے اپنی موت کے قبل یہ کہا تھا کہ "میں نے کنول کے پوشیدہ شہد کو چکھ لیا ہے" کنول کا پوشیدہ شہد اس ملہم کا تخیل تھا، اپنے ذاتی کمالات ہی سے اس نے وہ چھپا ہوا شہد نکالا جس کی مٹھاس بکھر وہ دنیا کے غیر فانی شعرا کی معیت حاصل کرنے کیلئے چلا گیا، اس کی ہم نوا دنیائے ترنم کی کیف آگیں ہستیاں تھیں۔

مسلمان سلاطین و امرا کے اخلاق پر ایک نظر

تاریخ اخلاق اسلام کا ایک باب

از

مولانا عبدالسلام ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ

(۳)

خلیفہ مقتدر باللہ کا وزیر علی بن محمد بن الفرات ﷺ چغلخوروں سے سخت بغض رکھتا تھا۔ اور جب اُس کے پاس اس قسم کی کوئی عرضی آتی تھی تو اُس کا دربان دروازے پر کھڑا ہو کر پکارتا تھا۔ کہ فلاں چغلخور کہاں ہے؟ اس طرح وہ سب کے سامنے ذلیل ہوجاتا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے زمانے میں چغلخوری کا بالکل سد باب ہوگیا، ابن خلکان نے اس واقع کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

ومن فضائلہ التی لم یسبق الیھا انہ کان اذا رفعت الیھا قصۃ فیھا سعایۃ خرج من عندہ غلام فنادی ابن فلان بن فلان الساعی فلما عرف الناس ذلک من عادتہ امتنعوا عن السعایۃ باحد[۱]۔

اور اس کے اُن فضائل میں سے جس کی نظیر اُس سے پہلے قائم نہیں ہوئی۔ ایک یہ ہے کہ جب اُس کی خدمت میں کوئی ایسی عرضی پیش ہوتی جس میں کسی کی شکایت ہوتی تو اُس کے پاس سے ایک غلام نکل کر کہتا کہ فلاں ابن فلاں چغلخور کہاں ہے؟ لوگوں کو جب اُس کی اس عادت کا علم ہوا تو کسی کی چغلخوری کرنے سے باز رہنے لگے۔

بہاء الدولہ کے وزیر فخر الملک کی خدمت میں ایک بڈھے شخص نے یہ درخواست دی کہ فلاں شخص قتل کا مستحق ہے فخر الملک نے اس درخواست کو پڑھکر اُس کی پشت پر لکھ دیا کہ چغلخوری گو صحیح ہو لیکن وہ بُری چیز ہے۔ اگر تم نے یہ درخواست خیرخواہی کی نیت سے دی ہے۔ تو اس میں فائدہ سے زیادہ تمہارا نقصان ہے۔ اگر تم بڈھے نہ ہوتے تو ہم تمکو وہی سزا دیتے جسکا تم نے مشورہ دیا ہے[۲]۔

ان معائب کے مقابل میں ہمارے امرا و سلاطین میں جو محاسن اخلاق پائے جاتے تھے اُن میں سب سے نمایاں چیز اُن کی فیاضیاں ہیں۔

---

[۱] فخری صفحہ ۵۸ و ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۷۲ [۲] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۶۵۔

جن کا ایک حصہ علم کی ترقی [illegible] اور علماء و فضلا کی قدردانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس قسم کی فیاضیوں کی ابتدا خلفائے بنوامیہ ہی کے زمانے سے ہوئی اور اسلامی حکومت کے اخیر دور تک قائم رہی چنانچہ ابن خلکان نے حماد راویہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ایام عرب، اشعار، اخبار عرب، انساب اور لغات عرب کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اور خلفائے بنوامیہ اس کی بڑی عزت کرتے تھے [illegible] اس کی ملاقات کو جاتے تھے، اس لیئے وہ ان کے یہاں آتا تھا۔ اور مالی فائدہ اوٹھاتا تھا۔ اور وہ لوگ ایام عرب اور علوم عرب کے متعلق اس سے سوالات کرتے تھے، ایکبار ولید بن یزید اموی نے اس سے پوچھا کہ تم کو راویہ کیوں کہتے ہیں؟ اس نے کہا "اسلیئے کہ آپ جس شاعر کو جانتے ہیں یا اس کا نام سنا ہے میں اس کے اشعار کی روایت کرتا ہوں، پھر ان سے زیادہ اُن شعراء کے اشعار کی کرتا ہوں جن کو نہ آپ جانتے، نہ اُن کا نام سنا ہے، اس کے علاوہ قدیم و جدید اشعار میں سے جو شعر پڑھا جائے، میں قدیم و جدید امتیاز کر لونگا۔ ولید نے کہا کہ تم کو کسقدر اشعار یاد ہیں؟ اس نے کہا بکثرت، میں حروف تہجی میں سے ہر حرف پر سو بڑے بڑے قصیدے پڑھ سکتا ہوں، جاہلیت کے قطعات اور دور اسلام کے اشعار اس سے الگ ہیں۔ ولید نے اس سے امتحاناً قصیدے پڑھوائے تو اس نے اسقدر قصیدے سنائے کہ ولید گھبرا گیا۔ اور ایک متدین شخص کو قصائد سننے کیلئے مقرر کر دیا۔ اس نے دو ہزار نو سو قصیدے جاہلیت کے سنائے۔ تو اس نے ولید کو اس کی خبر دی اور اس نے اس کو ایک لاکھ درہم کا صلہ دیا۔ ایک ہشام بن عبدالملک نے بھی اس کو بڑے اہتمام سے بلوا کر پوچھا کہ یہ شعر ؎

ودعوا بالصبوح یوماً فجاءت

کس کا ہے؟ حماد نے شاعر کا نام بتایا اور اس قصیدے کے متعدد اشعار سنا دئے۔ ہشام نے بہت دنوں تک اس کو نہایت اعزاز کے ساتھ مہمان رکھا اور ایک لاکھ درہم کا صلہ دیا[1]۔

لیکن اس قسم کی فیاضیاں بھی اخلاقی آمیزش سے بالکل خالی نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ امرائے بنوامیہ میں خالد بن عبداللہ قسری نہایت فصیح و بلیغ اور فیاض طبع امیر تھا، ایک دن وہ شعراء کے مدحیہ قصائد سننے کے لئے بیٹھا تو اُن شعراء میں ایک شاعر ایسا تھا جس نے اس کی مدح میں صرف دو شعر لکھے تھے، لیکن جب اس نے اور شعراء کے لمبے چوڑے قصائد سنے تو اس کو اپنے دو شعر نہایت حقیر معلوم ہوئے اور وہ خاموش رہا جب تمام شعراء چلے گئے تو خالد نے کہا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اس نے کہا کہ "میں نے آپ کی مدح لکھی تھی لیکن جب اور شعراء کا کلام سنا تو مجھکو اپنے اشعار حقیر [illegible] خالد نے وہ شعر سنے پوچھا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے اوپر قرض کا بار ہے، اس نے اسکے قرض کے ادا کرنے کا حکم دیا، اور خود اسیقدر رقم اس کو بھی دی[2]۔

اس قسم کی فیاضیاں بعض موقعوں پر نہایت مناسب طریقہ سے نکتہ سنجی کے ساتھ کی جاتی تھیں، مثلاً ایک بار فضل یا ہارون رشید نے اصمعی سے کہا کہ "تم نے گھوڑوں کے متعلق جو کتاب لکھی ہے اس کی کتنی جلدیں ہیں؟ اصمعی نے کہا کہ "صرف جلد" ابوعبیدہ سے بھی یہی سوال کیا تو اس نے کہا کہ "پچاس جلد" اب حکم دیا کہ اس گھوڑے کے ایک ایک عضو کو پکڑ کر بتا دکھ

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵ [2] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۶۹

یا اُس کا نام کیا ہے؟ ابوعبیدہ نے کہا کہ میں تو نیشیوں کا ڈاکٹر نہیں ہوں، میں نے اہل عرب سے جو کچھ سنا ہے، اُس کو لکھ لیا ہے۔ لیکن اصمعی
سے جب کہا گیا تو اُس نے گھوڑے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کے ایک ایک عضو کا نام لیکر اس پر ہاتھ رکھتا گیا، اور اہل عرب نے ہر عضو کے
متعلق جو اشعار کہے تھے، اُن کو سناتا گیا، جب فارغ ہوا تو وہ گھوڑا اُس کو صلے میں ملا۔ اصمعی کا بیان ہے کہ جب میں ابوعبیدہ کو جلانا چاہتا
تو اُسی گھوڑے پر سوار ہوکر اُس کے یہاں جاتا تھا۔

خلفائے بنوامیہ میں سلیمان بن عبدالملک کھانے پینے کا اسقدر دلدادہ تھا کہ جب اُس کے سامنے بکریوں کے بھنے ہوئے بچے
تنور سے نکالکر گرم گرم رکھے جاتے تھے تو وہ ان کی کلیجی کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ نہایت گرم ہوتے تھے، اس لئے ہاتھ کے جلنے کے
خوف سے اُس میں آستین لپیٹ لیتا تھا۔ اور ان کے پیٹ کے اندر سے اُن کی کلیجیاں نکال کر کھا جاتا تھا۔ ایک بار اصمعی نے ہارون رشید
کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو اُس نے کہا کہ "تم بنوامیہ کے حالات سے کسقدر واقف ہو۔ ایک بار میرے سامنے بنوامیہ کے ساز و سامان
پیش کئے گئے تو مجھے چند یمنی زریں کپڑے نظر آئے۔ جن کی آستینوں میں چکنئی لگی ہوئی تھی، اب تمہارے بتانے سے مجھ پر اس حقیقت
کا انکشاف ہوا۔ اس کے بعد اس نے سلیمان بن عبدالملک کے کپڑے منگوائے تو اُن میں اس قسم کے داغ دھبے نمایاں نظر آئے
اُن میں سے ایک جوڑا اصمعی کو دیا جس کو اصمعی کبھی کبھی پہنکر نکلتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ سلیمان بن عبدالملک کا جبہ ہے جس کو ہارون رشید
نے مجھے پہنایا ہے[1]۔

سب سے زیادہ ان فیاضیوں کے مستحق طلبہ تھے اور ہمارے امراء و سلاطین ہر ممکن طریقہ سے ان کی اعانت کرتے تھے، وزیر
حسن بن الفرات متفرق صلوں کے علاوہ شعراء کو سالانہ ۲۰ ہزار درہم دیا کرتا تھا۔ اُس کی وزارت کے آخر زمانے میں اُس کی توجہ طلبائے
حدیث کی طرف مبذول ہوئی اور اُس نے کہا کہ یہ لوگ اپنے اوپر تنگی کرکے ایک حقیر رقم بچاتے ہیں اور اُس سے کاغذ اور روشنائی خریدتے
ہیں۔ لیکن مجھکو اُن کی اعانت کا زیادہ حق ہے۔ چنانچہ اُن کے لئے بھی ۲۰ ہزار درہم خزانے سے مقرر کردئے[2]۔ وہ پانچ ہزار اہل علم، اہل
دین، خاندانی لوگوں اور محتاجوں کو وظیفہ دیتا تھا جس کی تعداد زیادہ تر سو دینار ماہوار اور کم از کم پانچ درہم ماہوار ہوتی تھی[3]۔

ابن جبیر نے اپنی سیاحت کے زمانے میں اس قسم کی فیاضیوں کے بکثرت مظاہر دیکھے تھے، اور اُن سے بہت متاثر ہوا
سلطان نورالدین نے دمشق میں طلبہ کی اعانت و امداد کا جو سامان کیا تھا اُن کے متعلق اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "قرآن مجید پڑھنے
والے طلبہ جو اس شہر میں رہتے تھے سلطان نے ان کے لئے بہت سے مکانات وقف کئے تھے، اس شہر میں مسافروں کے آرام و آسایش
کا سامان اسقدر ہے کہ اُن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص حفاظ قرآن اور طلبہ کے لئے جن کی حالت اس شہر میں عجیب ہے۔ اگرچہ
تمام مشرقی شہروں کی یہی حالت ہے۔ لیکن اس شہر میں اس کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور سامان بہت زیادہ میسر آتے ہیں۔ ہمارے
مغرب کی جو جماعت کامیابی کی خواستگار ہے۔ اُس کو چاہئے کہ ان شہروں میں طلب علم کیلئے سفر کرے، اُس کو اعانت کے بکثرت

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۸۸ - ۲۸۹ [2] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲ [3] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۷۲،

سامان ملیں گے، جن میں سب سے پہلی چیز معاش کی طرف سے بے فکری ہے، اور یہی چیز سب سے زیادہ ممد و معاون ہے[1]

اسکندریہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ "اس شہر کے اُن مناقب و مفاخر میں جو درحقیقت اُس کے بادشاہ کی طرف منسوب ہیں وہ مدارس اور معابد ہیں جو طلبہ اور عبادت گزاروں کے لئے بنائے گئے ہیں، یہ لوگ دور دور مقامات سے یہاں آتے ہیں، اور ہر ایک کو رہنے کے لئے ایک مکان جس فن کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، اُس کے لئے مدرس، اور ضروریات کے لئے وظیفہ مل جاتا ہے، سلطان کی توجہ ان پردیسیوں کی طرف اسقدر ہے کہ اُن کے لئے بہت سے حمام متعین کرتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اُن میں جاکر غسل کریں اُن میں جو لوگ بیمار پڑیں، اُن کے لئے ایک شفاخانہ قائم کر دیا ہے، اور اُن کی خبرگیری کے لئے بہت سے اطبا مقرر کر دئے ہیں، اور اُن کی ماتحتی میں بہت سے ملازم ہیں جو اُن کی تجویز کے مطابق اُن کی علاج اور غذا کا سامان کرتے ہیں، جو مریض اس شفاخانے میں جانا پسند نہیں کرتے اُن کے لئے کچھ لوگ مقرر ہیں، جو گھر پر جاکر اُن کو دیکھتے ہیں، اور اطبا سے آکر اُن کی حالت بیان کرتے ہیں تاکہ وہ اُن کا علاج کر سکیں[2]

اسلامی ممالک میں تعلیم و تعلم کا دار و مدار انہی شاہانہ فیاضیوں پر تھا اور وہ اسلامی حکومت کے اخیر دور تک قائم رہیں چنانچہ مولوی غلام علی آزاد مآثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

> "اگرچہ جمیع صوبجات ہند بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند اما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نبود یافتہ نہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کردہ نہ بیست کردہ تخمیناً آبادی شرفا و نجبا است کہ از سلاطین و حکام در تاریخ وظائف و زمین مدد معاش داشتند مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نمودہ مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہان کشادہ و صلائے اطلبوا العلم در دادہ و طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے میروند و ہر جا موافقت وقت بہم رسانند بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ طالب علم را نگاہ میدارند و خدمت این جماعہ را سعادت عظمیٰ می دانند۔"

اسلامی ممالک میں تعلیم و تعلم کی تمام تر ترقیاں انہی فیاضیوں کی رہین منت ہیں، اور انہی کی بدولت اسلامی ممالک میں اس کثرت سے مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے کہ اگر اُن کی تفصیل کی جائے، تو ایک مستقل کتاب لکھنی ہوگی اور ہم اپنے موضوع سے دور پڑ جائیں گے، اس لئے ان مدرسوں اور کتب خانوں کے ضمن میں جو لوگ ہمارے سلاطین و امرا کی فیاضیوں کی داستانیں سننا چاہتے ہیں اُن کو حضرۃ الاستاد علامہ شبلی مرحوم کے مضمون اسلامی مدارس اور اسلامی کتب خانے کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ان علمی فیاضیوں کے ساتھ ہمارے سلاطین و امرا کی فیاضیاں زیادہ تر اخلاقی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن کا تعلق صرف اُن لوگوں سے ہوتا تھا۔ جو درحقیقت اعانت و امداد کے مستحق ہوتے تھے، اس قسم کی فیاضیوں کا سلسلہ خلافت بنوامیہ ہی کے زمانے سے قائم ہوا اور اسلامی سلطنت کے دور آخیر تک قائم رہا، چنانچہ اسلام میں سب سے پہلے ولید بن عبد الملک نے شفاخانہ قائم کیا۔

---

[1] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۲۸۵ ۔ [2] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۴۲ ۔

اور اُس میں تنخواہ دار اطبا مقرر کئے، اُسی نے ایک مہمان خانہ قائم کیا اور اندھوں جذامیوں اور ضعفا و فقرا کے وظائف جاری کئے اور یتیموں کی تعلیم کے لئے معلم اور اپاہجوں کی خدمت کے لئے خدام مقرر کئے[۱]۔ ولید بن یزید بن عبد الملک نے بھی شام کے اپاہجوں اور اندھوں کے وظائف مقرر کئے اور اُن کو کپڑے دئے[۲]۔

عباسی دور میں خلیفہ ابو جعفر منصور نے اندھوں، یتیموں اور بیوہ عورتوں کی پرورش اور کفالت کا خاص انتظام کیا۔ اور اس کے لئے ایک خاص عامل مقرر کیا جو ان کے ناموں کو درج رجسٹر کرتا تھا[۳]۔ ہارون رشید کے زمانے میں یحییٰ بن خالد نے بھی یتیموں کی تعلیم کے لئے بہت سے مکاتب قائم کئے[۴]، اس کے بعد یہ ایک عام روش قائم ہوگئی، اور اکثر سلاطین و امرا اس قسم کے کار خیر میں حصہ لینے لگے، ابو منصور قاسم بن عبد اللہ الزینی نے صدقہ کی روٹیوں کے لئے بہت سی جائدادیں وقف کر رکھی تھیں، اور یتیموں کی تعلیم کیلئے ایک مکتب قائم کیا تھا، اور ان کی تمام ضروریات کی کفالت کرتا تھا[۵]۔ شاہان سلجوقیہ میں محمد بن ملک شاہ اس قسم کی فیاضی میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتا ہے کہ وہ نہایت پاکیزہ خصلت تھا، اور فقرا و یتامیٰ کے ساتھ خاص طور پر سلوک کرتا تھا[۶]۔

اس سلسلے میں مظفر الدین شاہ اربل کا نام خاص طور پر روشن نظر آتا ہے۔ ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتا ہے کہ "اُس کی فیاضیوں کے واقعات اسقدر عجیب و غریب ہیں کہ کسی کی نسبت اس قسم کے واقعات سننے میں نہیں آئے۔ صدقہ سے زیادہ دنیا میں اُس کو کوئی چیز محبوب نہ تھی، وہ روزانہ محتاجوں کو شہر کے مختلف مقامات پر بہ کثرت روٹیاں تقسیم کرتا تھا، جہاں ان لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا، اور دن کے ابتدائی حصے میں وہ اُن پر تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ جب سواری سے اترتا تھا تو اُس کے محل کے پاس بہت سے لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور وہ اُن کو بلا کر ہر ایک کو موسم کے مطابق جاڑے اور گرمی کے کپڑے اور ان کپڑوں کے ساتھ کم و بیش دو[۲] تین اشرفیاں دیتا تھا، اُس نے اپاہجوں اور اندھوں کے لئے چار خانقاہیں تعمیر کروائی تھیں، اور اُن کو ان لوگوں سے بھر دیا تھا۔ اور ان کی روزانہ ضروریات کے تمام سامان مہیا کر دئے تھے، وہ ہر دوشنبہ اور جمعرات کی شام کو خود ان کے پاس آتا تھا، اور ہر ایک کے حجرے میں جا کر اُس کو کچھ دیتا تھا، اور اُس کے حالات پوچھتا تھا، اسطرح اول سے اخیر تک تمام حجروں کا چکر لگاتا تھا، اور ان سے ہنسی مذاق کرتا تھا اور ہر ایک کے دل کو تسکین دیتا تھا، اُس نے ایک بیوہ خانہ، ایک یتیم خانہ اور ایک مکان اُن حرامی بچوں کیلئے تعمیر کیا تھا، جو راستوں میں پڑے ہوئے ملتے تھے، اور ان کیلئے بہت سی دودھ پلانے والی عورتیں مقرر کی تھیں، اور جب اس قسم کے بچے اُن کے پاس لائے جاتے تھے تو وہ اُن کو دودھ پلاتی تھیں۔ اُس نے ان سب کی روزانہ ضروریات کے لئے وظائف مقرر کر دئے تھے، ہر وقت اُن کے پاس جاتا تھا، اُن کے حالات دریافت کرتا تھا، اور وظائف مقررہ کے علاوہ اُن کو بہت کچھ دیتا تھا،

---

[۱] مقریزی جلد ۴ صفحہ ۲۵۸ و تاریخ الخلفاء مطبوعہ مصر صفحہ ۲۲۴، [۲] مختصر الاول صفحہ ۲۰۳، [۳] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۹۵، [۴] کتاب الوزراء للجشیاری صفحہ ۲۱۲، [۵] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۷۴، [۶] ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۴۷۔

اسی طرح وہ شفاخانے میں بھی جاتا تھا، اور ہر مریض کے پاس ٹھہر کر دریافت کرتا تھا کہ اُس نے رات کیونکر بسر کی؟ اُس کی حالت کیا ہے؟ اور اُس کو کس چیز کی خواہش ہے؟ اُس نے ایک مہمان خانہ عام بھی بنوایا تھا جس میں ہر قسم کے مسافر آ آکر ٹھہرتے تھے، اور ان کو صبح و شام کا کھانا ملتا تھا اور جب ان میں کوئی شخص جانا چاہتا تھا، تو اُس کو حسب حیثیت زاد راہ ملتا تھا، .... وہ سال میں دو بار اپنے امینوں کی ایک جماعت کو بہت سامان دیکر بلاد ساحل کی طرف بھیجتا تھا کہ اُس کے ذریعہ سے مسلمان قیدیوں کو کفار کے ہاتھ سے رہائی دلائیں، یہ قیدی جب رہا ہوکر اُس کے پاس آتے تھے تو ہر ایک کو کچھ مال اور دیتا تھا، اور اگر وہ اُس تک نہیں آسکتے تھے تو خود یہ امین اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کو دیدیتے تھے، وہ ہر سال حاجیوں کیلئے ایک سبیل قائم کرتا تھا، اور اُس کے ساتھ وہ تمام سامان کردیتا تھا جسکی مسافروں کو راستے میں ضرورت پڑتی ہے، اس کے ساتھ ایک امین ہمیشہ رہتا تھا، جو اپنے ساتھ پانچ چھ ہزار اشرفیاں رکھتا تھا، اور مکہ و مدینہ میں اہل حاجت اور ارباب روایت پہ تقسیم کرتا تھا، مکہ میں اُس کی بہت سی عمدہ یادگاریں ہیں جن میں بعض ابتک باقی ہیں[1]۔

وزیر جمال الدین اصفہانی اسقدر فیاض تھا کہ جواد کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا، اُس کی فیاضیاں نہایت ہمہ گیر تھیں، ہر سال مکہ اور مدینہ کے محتاجوں اور مجاوروں کی اعانت کے لئے مال اور کپڑے بھیجتا تھا، ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا جو صرف اُن لوگوں سے متعلق تھا جن کو وظائف دئے جاتے تھے، یا طالب اعانت کے لئے آتے تھے، ایک بار موصل میں قحط پڑا تو اُس نے لوگوں کی اعانت و ہمدردی میں اپنا کل مال صرف کردیا اور اُس کے پاس کچھ نہیں رہا[2]۔

ہمارے سلاطین و امراء کی یہ فیاضیاں مختلف صورتوں میں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھیں اور ہمارے سیاحوں نے جابجا اُن کے موثر مناظر دیکھے ہیں، چنانچہ ابن جبیر جس نے چھٹی صدی ہجری میں سفر کیا تھا، اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ "یہ خواتین جس سال خود حج کو نہیں جاتیں معتبر اشخاص کے ساتھ پانی لے جانے والے اونٹ بھیجتی ہیں کہ مسافروں کو مشہور مقامات اور عرفات اور مسجد حرام میں رات دن پانی پلائیں، .... ان اونٹوں پر بیٹھ کر ایک منادی بلند آواز سے کہتا ہے کہ "سبیل کا پانی" اس آواز کو سنکر تہدست لوگ اپنے مشکیزوں اور لوٹوں کو لیکر دوڑتے ہیں۔ اور اُن میں پانی بھر لیتے ہیں، اسی سلسلے میں منادی رکھتا ہے کہ خدا اس خاتون کو جو ایک ایسے بادشاہ کی بیٹی ہے جس کے یہ اوصاف ہیں۔ زندہ رکھے تاکہ اُس کے نام اور اُس کے نیک کام کا اعلان ہوجائے اور لوگ اُسکے لئے دعا کریں[3]" زبیدہ خاتون نے اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر اس کا انتظام کیا تھا، اور بغداد سے مکہ تک راستہ میں نہایت کثرت سے کنوئیں، اور حوض تیار کرلئے تھے، ابن جبیر لکھتا ہے کہ "یہ حوض، یہ تالاب، یہ کنوئیں اور یہ منزلیں جنکا سلسلہ بغداد سے مکہ تک پھیلا ہوا ہے، ابوجعفر منصور کی بیٹی، اور ہارون رشید کی بی بی زبیدہ کی یادگاریں ہیں، جو عمر بھر ان میں مصروف رہی اور اس راستے میں رفاہ عام کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جنکا فائدہ اُس کے مرنے کے دن سے آج تک ہر سال خدا کے وفد (حجاج) کو پہونچتا رہتا ہے۔ اور اگر اُس کی یہ نیک یادگاریں نہ ہوتیں تو یہ راستے بند ہوجاتے[4]"۔

---

[1] ابن خلکان جلد اول ص ۲۶۳، ۳۶۴ [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۷ [3] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶ [4] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۔۔۔

سب سے زیادہ قابل رحم حالت اُن مسلمان قیدیوں کی تھی جو کفار کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتے تھے، اس لئے ہمارے سلاطین و امراء اُن کی رہائی میں اپنی دولت بیدریغ صرف کرتے تھے، چنانچہ ہم سلطان مظفرالدین صاحب اربل کے متعلق ابھی لکھ آئے ہیں کہ وہ سالانہ اپنی دولت کا ایک حصہ اس کارِ خیر میں صرف کیا کرتا تھا، اُس کے علاوہ اور بھی بہت سے سلاطین و امراء بلکہ عام مسلمان بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیتے تھے، چنانچہ جنگ صلیبی کے بعد جب ابن جبیر شام کے شہروں سے گذرا ہے تو وہاں مسلمان قیدیوں کی دردناک حالت دیکھی ہے۔ اور اس سلسلے میں ان فیاضیوں کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ "اُن مصائب میں جنکو ان شہروں میں ایک مسافر دیکھتا ہے مسلمان قیدی ہیں، جو بیڑیاں پہنے ہوئے چلتے ہیں، اور غلاموں کی طرح سخت کاموں میں لگائے جاتے ہیں مسلمان قیدی عورتوں کی بھی یہی حالت ہے، کہ اُن کے پاؤں میں لوہے کے کڑے ہوتے ہیں، اور ان سب کی حالت کو دیکھکر سینہ پھٹا جاتا ہے، شام کے ان فرنگستانی شہروں میں مغربی قیدیوں پر خدا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ان شامی اطراف میں اور اُن کے علاوہ بھی جو مسلمان مالی وصیت کرتا ہے، اس کو خاص طور پر مغربی قیدیوں کی رہائی کیلئے مخصوص کر دیتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ملک سے دور پڑے ہوئے ہیں، اور خدا کے سوا اس کے علاوہ ان کی رہائی کی کوئی صورت نہیں، اس بنا پر ان اطراف کے مسلمان، خواتین اسلام اور دولتمند لوگ اس کارِ خیر میں اپنا مال صرف کرتے ہیں، سلطان نورالدین ایک مرض میں مبتلا ہوا تو یہ نذر مانی کہ مغربی قیدیوں کی رہائی میں بارہ ہزار دینار صرف کریگا، چنانچہ صحتیاب ہونے کے بعد اُس نے یہ رقم ان کے فدیہ میں روانہ کی .... دمشق میں غلطے اُن کی رہائی کے لئے وہاں کے دو دولت مند تاجروں کو کھڑا کر دیا جن میں ایک کا نام نصر بن قوام اور دوسرے کا ابوالدر یاقوت تھا یہ دونوں خود اپنے مال سے مغربی قیدیوں کو رہائی دلواتے تھے، اور چونکہ یہ نہایت متدین تھے اور اس کارِ خیر میں شہرت رکھتے تھے، اس لئے جو لوگ اس غرض سے وصیت کرتے تھے، وہ بھی اپنے مال ان کے سپرد کر دیتے تھے، اس لئے جو مغربی قیدی رہائی پاتا تھا انہی دونوں کے ہاتھوں سے پاتا تھا[۱]۔

اس کے بعد ابن بطوطہ نے دنیائے اسلام کا سفر کیا ہے اور ہر مسلمان سلاطین و امراء کی فیاضیوں کے بہت سے چشم دید حالات لکھے ہیں، ایک موقع پر بہت سے امرائے مصر کے نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ نیک کاموں میں اور مسجدوں اور زاویوں کی تعمیر میں باہم مقابلہ کرتے ہیں، ایک امیر کے حال میں لکھا ہے کہ یتیموں پر اُس نے بہت سے صدقات جاری کر رکھے ہیں، یعنی وہ اُن کو خوراک و پوشاک اور جو لوگ اُن کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں اُن کی تنخواہ بھی دیتا ہے، ایک اور فیاض امیر کی نسبت لکھا ہے کہ اُس کی یہ عادت ہے کہ شام کے وقت دریائے نیل کے کنارے اپنے محل کے سائبان میں ایک مجلس میں بیٹھتا ہے، اسی محل سے ملی ہوئی ایک مسجد ہے جب مغرب کا وقت آتا ہے تو اُس میں نماز پڑھتا ہے، اور نماز پڑھکر پھر اسی مجلس میں واپس آتا ہے، اور اب کھانا لایا جاتا ہے، اور اسوقت اس کے پاس کسی شخص کے آنے کی ممانعت نہیں ہوتی۔ ان میں جو شخص حاجت مند ہوتا ہے وہ اپنی حاجت کو بیان کرتا ہے

[۱] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۳۰۷ - ۳۰۸ -

س کو پورا کر دیتا ہے، جو شخص صدقہ کا خواستگار ہوتا ہے، اُس کے لئے وہ اپنے ایک غلام کو حکم دیتا ہے کہ اسکو محل کے باہر لے جاؤ،
س کا خزانچی دہموں کی تھیلیاں لئے ہوئے موجود رہتا ہے، اور جو رقم اُس کے لئے مقرر کر دی جاتی ہے اسکو دیدیتا ہے[1]۔

سفرِ حج کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ "اس قافلہ میں مسافروں کے پانی پلانے کے لئے بہت سے اونٹ ہیں۔ اور بہت سے
، صدقہ کا سامان اور ان لوگوں کے لئے جو بیمار ہوجاتے ہیں۔ دوائیں، شربت اور شکر لیکر چلتے ہیں، اور جب قافلہ اترتا ہے تو
ی بڑی بڑی دیگچیوں میں جن کو دسوت کہتے ہیں کھانا پکایا جاتا ہے، اور مسافروں کو اور ان لوگوں کو جن کے پاس زاد راہ نہیں
لایا جاتا ہے۔ اس قافلے میں بہت سے اونٹ اُن لوگوں کی سواری کے لئے ہیں جو چلنے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ سب سلطان
ر کے صدقات و مکارم کا فیض ہے[2]۔

ہمارے سلاطین و امرا کی یہ فیاضیاں اسلامی سلطنت کے دور آخر تک قائم رہیں، اور فرمانروایان ہندوستان اس قسم کے
ے خیر میں نمایاں حصہ لیا چنانچہ ابن بطوطہ ایک قحط کے ذکر میں لکھتا ہے کہ جب قحط کی سختیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں تو سلطان (محمد تغلق)
یا کہ تمام اہل دہلی کو ۶ مہینے کا خرچ دیدیا جائے، اس حکم کے بعد قاضی، منشی اور امرا گلیوں اور محلوں میں گھوم گھوم کر لوگوں
م لکھتے تھے۔ اور ہر ایک کو ۶ مہینے کا خرچ دیدیتے تھے[3]

فرمانروایان ہندوستان کی فیاضیوں کی مستقل یادگاریں تو شفاخانوں، سرایوں، مسافرخانوں، لنگرخانوں اور خانقاہوں
رت میں قائم ہوئیں، لیکن ان کے علاوہ انہوں نے محتاجوں کی اعانت و امداد کے سینکڑوں طریقے اختیار کر رکھے تھے، مثلاً
لامراء فخر الدین کوتوال ہر سال ایک ہزار نادار لڑکیوں کی شادی کا سامان کرتے تھے[4]، فیروز شاہ تغلق نے نادار لڑکیوں کے
کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا، چنانچہ اس محکمہ کے قائم ہوجانے کے بعد ہزاروں محتاج مسلمانوں اور بیوہ عورتوں نے اپنی اپنی
ں کے نام درج رجسٹر کرائے اور مالی امداد حاصل کی[5] وہ بوڑھوں، یتیموں، اندھوں، اپاہجوں، بیوہ عورتوں اور جسمانی
ر رکھنے والوں کی بھی اعانت کرتا تھا[6]۔

شاہ جہاں نادار لڑکیوں کے ساتھ غریب بیوہ عورتوں کے نکاح کا بھی سامان کرتا تھا، اور اُن کو زیور اور کپڑے دیتا تھا[7]۔
سلطان محمد شاہ بہمنی نے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں یتیموں کی تعلیم کا خاص انتظام کیا تھا اور اندھوں کے مشاہرے
لئے تھے[8]۔ سکندر لودی نے فقرا و مستحقین کی اعانت کا ایک خاص نظام قائم کیا تھا یعنی سال میں دو بار اُسکے سامنے تمام ملک کے فقرا و مستحقین کی فہرست پیش کیجاتی تھی اور وہ
عیال و حیثیت کے مطابق اُسکو ششماہی امداد دیتا تھا، جاڑوں میں شال اور کپڑوں سے بھی اُنکی امداد کرتا تھا، اور روزانہ مختلف مقامات پر خام غلہ اور پکا ہوا کھانا تقسیم کرتا تھا[9]۔

---

[1] نامہ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۸، ۲۹ [2] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۱۳۶ [3] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ۸۹ [4] تاریخ فیروز شاہی جلد اول
ا [5] تاریخ فیروز شاہی حصہ دوم صفحہ ۳۴۹ [6] تاریخ فیروز شاہی جلد اول صفحہ ۵۶۱ [7] عمل صالح جلد اول صفحہ ۲۴۹،
رشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۲ [9] فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۶۔

افسانہ و محاضرات

خونِ تمنّا

میری پرورش ننہال میں ہوئی، اماجان کو اپنے میکے سے کچھ ایسی محبت تھی کہ ابا جان کے گھر میں رہنے کے بجائے نانی اماں ہی کے یہاں زیادہ تر رہیں، میں اپنے والدین کی نہ صرف تنہا اولاد بلکہ نانی اماں کی بھی اکلوتی نواسی تھی اسلئے ننہال کے پورے کنبہ والوں نے مجھکو سر آنکھوں پر رکھا میری انگلی دکھتی تو نانی اماں، خالہ اماں اور ممانی اماں بے چین ہوجاتیں میں کبھی بیمار پڑتی تو بڑے منجھلے اور چھوٹے ماموں جان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہتی۔ ان میں سے جب کوئی بازار جاتے تو میرے لئے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے، چنانچہ میری الماری میں ٹامی، چاکلیٹ لیمن چوس، جاپانی گڑیوں اور کھلونوں کا ایک انبار لگا رہتا تھا بڑے ماموں جان کے لئے دسترخوان بچھتا تو جب تک میں انکے پاس آکر بیٹھ نہ لیتی، وہ کھانا شروع نہ کرتے، چھوٹے ماموں جان مجھکو اپنی سائیکل پر آگے بٹھا کر معلوم نہیں کہاں کہاں کی سیر کراتے پھرتے تھے۔

اسی لاڈ پیار میں پل کر میرا سن آٹھ نو برس کا ہوا تو اماں جان نے مجھکو باہر آنے جانے سے روکنا شروع کیا، مجھ پر پابندیاں [illegible] رفتہ رفتہ ہمسن ماموں زاد بہنوں اور محلہ کی سہیلیوں کے ساتھ گھر کی چہار دیواریوں کے اندر کے کھیلوں میں کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ باہر کی ساری دلچسپیاں دماغ سے جاتی رہیں، پڑھنے لکھنے کے بعد جو بھی وقت ملتا کھیل کود میں خرچ ہوتا، کبھی گڈے اور گڑیا کا بیاہ ہوتا، کبھی گھروندے بنتے، کبھی کھانا پکتا، کبھی آنکھ مچولی ہوتی، کبھی جھولے ڈالے جاتے، کبھی میلاد کی تقریب انجام دی جاتی اور زور زور سے سلام پڑھا جاتا صرف سلام پڑھنے کی خاطر معلوم نہیں میلاد کی تقریب کتنی بار ادا ہوئی ہوگی،

ہم لوگوں کے کھیلوں میں کبھی کبھی چھوٹی خالہ اماں اور چھوٹی ممانی بھی شریک ہو جاتیں، مگر بڑے ماموں کے منجھلے لڑکے محمود بھائی کو نہ جانے ہم لوگوں کے کھیلوں سے کیا ضد تھی کہ وہ گھر کے اندر داخل ہوتے اور ہم لوگوں پر ایک آفت آتی وہ چپکے سے ہم لوگوں کی گڑیوں کے کمرہ میں داخل ہوجاتے، اور کسی گڈے کے گلے میں رسی ڈالکر چھت سے لٹکا دیتے، کسی گڑیا کو الٹی کوارڑ پر بٹھا دیتے، اور گڑیوں کے گہنوں اور کپڑوں کو چھت کی کارنس پر رکھدیتے، ملیحہ، نسیمہ، اور سعیدہ (محمود بھائی کی حقیقی بہنیں) کمرے میں داخل ہوتیں تو گڈے اور گڑیوں کی درگت دیکھکر رو پڑجاتیں، اور فریاد لیکر ممانی اماں کے پاس پہونچتیں، مگر محمود بھائی کے مقابلہ میں ہم لوگوں کی فریاد شاید ہی سنی جاتی تھی، ایک روز بڑی محنت سے ہم لوگوں نے کوٹھے کی چھت پر مٹی کے گھروندے بنائے اور دوسرے دن انہی گھروندے میں گڈے اور گڑیا کے بیاہ رچانے

کی مٹھائی اور ہر طرح سے اسکو چھپا کر رکھا گیا کہ محمود بھائی اسکو خراب نہ کرنے پائیں۔ مگر خدا جانے ان کو کیسے اس کی خبر مل گئی کہ یکایک آئے اور ہم لوگوں کے گھروندوں کو توڑ پھوڑ کر ستیاناس کر دیا۔ مینہ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ نسیمہ کی آنکھوں میں تو آنسو آگیا۔ سعیدہ بھی منہ بسورنے لگیں، میں بھی جھنجھلائی لیکن پھر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور میری ہنسی کی وجہ سے محمود بھائی سے زیادہ جھگڑا ہونے نہ پایا، ایک روز پائیں باغ میں امرود کی ڈالیوں میں ہم لوگوں نے جھولا ڈالا اور جھولے پر گیت گانا شروع کیا، اچانک محمود بھائی آگئے، ان کی شرارتوں کے ڈر سے ہم لوگوں کی ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں، مگر محمود بھائی نے بڑی شفقت سے کہا کہ آج وہ کسی قسم کی شرارت نہ کرینگے اور یہ کہہ کر امرود کے درخت پر امرود کھانے کو چڑھ گئے، ہم لوگوں کو واقعی اطمینان ہو گیا۔ اور ہم لوگوں نے پھر جھولنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد محمود بھائی نے اوپر شاخوں پر خدا جانے کیا کیا کہ یکایک مینہ جھولے کے تختہ پر سے لڑھک کر نیچے چلی گئیں، ان کے اوپر نسیمہ گریں، نسیمہ کے اوپر سعیدہ اور پھر میں تھی، مینہ کو سخت چوٹ آئی، وہ تو چیخنے چلانے لگیں نسیمہ نے جھلا کر محمود بھائی کو کوسنا شروع کیا سعیدہ بھی رو رہی تھیں، میری بھی، دونوں کہنیاں زخمی ہوئیں لیکن میں محمود بھائی کو کچھ برا بھلا کہنے کے بجائے قہقہہ لگا رہی تھی، محمود بھائی جلدی سے درخت سے اتر کر فرار ہو گئے۔

کچھ دنوں کے بعد محمود بھائی کی شرارتیں مجھکو مزہ دینے لگیں اور مینہ، نسیمہ اور سعیدہ کو پریشان کرنے میں کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتی، ایک روز سب کے صلاح سے میلاد کی تقریب ٹھہرائی گئی، چھ چھ پیسے چندے ہوئے اور ہم چار بہنوں نے چھ آنے پیسے جمع کئے، چھ آنے کی جلیبیاں آئیں مینہ محمود بھائی کے ڈر سے جلیبیوں کو چھوٹی ممانی اماں کے کمرہ کے ایک صندوق کے پیچھے چھپا کر بحفاظت رکھ آئیں، محمود بھائی گھر آئے تو میں چپکے سے ان کے پاس گئی اور مٹھائی کی جگہ بتا آئی، وہ موقع پا کر کمرہ کے اندر گھسے، جی بھر کر جلیبیاں کھائیں اور جو باقی رہ گئیں ان کو لیکر باہر چلے گئے، مینہ، نسیمہ اور سعیدہ کو مطلق خبر نہ ہوئی، سہ پہر کو میلاد شروع ہوا محلہ کی سہیلیاں آئیں، سلام ختم ہوا تو نسیمہ مٹھائی لانے گئیں مگر مٹھائی کی پلیٹوں کو خالی پا کر ان کے اوسان خطا ہوئے، وہ دوڑی ہوئی مینہ کے پاس پہونچیں پھر سعیدہ کی پکار ہوئی، اور آخر میں میں طلب کی گئی، پھر تو واویلا مچ گیا کہ محلہ کی لڑکیوں کو مٹھائی نہ دیجائیگی تو کیسی ذلت ہوگی مینہ، نسیمہ، اور سعیدہ کو شک پھر یقین ہوا کہ ساری شرارت محمود بھائی کی ہے، وہ مل کر ان کو کوسنے لگیں، مینہ، نسیمہ اور سعیدہ کی پریشانی اور خفت دیکھکر مجھ کو بے اختیار ہنسی آرہی تھی جسے بمشکل سے ضبط کیا، مگر پھر ہنسی کو روک نہ سکی۔ میری ہنسی سے نسیمہ اور سعیدہ بے حد خفا ہوئیں، اور محمود بھائی کے ساتھ مجھکو بھی برا بھلا کہنے لگیں، اور آخر میں مجھکو ہی اصلی قصور وار اور ملزمہ قرار دیا گیا اور وہ صرف اس لئے اس لئے میں ان لوگوں کی طرح پریشان اور سہیلیوں سے شرمندہ ہونے کے بجائے برابر ہنستی رہی،

ایک روز گھر میں بہت سی مشورہ کے بعد مینہ کی رائے ہوئی کہ پھلولی پکائی جائے نسیمہ اور سعیدہ نے بھی تائید کی، اور میں بھی شریک ہوئی، کوٹھے کی چھت پر سارا سامان جمع کیا گیا مینہ نسیمہ اور سعیدہ کسی کام سے کوٹھے سے نیچے گئی ہوئی تھیں اور میں اکیلی تھی، کہ محمود بھائی آگئے، پھلولی چولہے پر چڑھی تھی، اور پک کر قریب قریب تیار تھی، محمود بھائی کو شرارت سوجھی انہوں نے

بہت سا نمک قبولی میں ڈالدیا، اور مجھکو کسی سے کچھ نہ کہنے کی
ہدایت اور دھمکی دیکر چپ چاپ روانہ ہوگئے، قبولی پک چکی
تو منجھلی ممانی اماں اور میری اماں جان کے لئے حصے لگائے گئے
اور حصوں کو تقسیم کرنے کے لئے ہمارا قافلہ روانہ ہوا، مگر حصہ لیکر
جس کسی نے کھایا تھو تھو کیا، مینہ، نسیمہ اور سعیدہ بہت پریشان ہوئیں
"نمک کس نے ڈالا تھا" مینہ نے جھنجھلا کر پوچھا،
"میں نے تو آپ سب کے سامنے ہی ڈالا تھا، نمک تو
اندازہی سے دیا گیا تھا، نسیمہ نے پوری صفائی سے کہا۔
"تو پھر قبولی میں اتنا نمک کہاں سے آیا؟" مینہ نے بڑی
سختی سے سب کو مخاطب کرکے پوچھا۔
"بانو باجی نے دیدیا ہوگا، سعیدہ بولیں۔
میں نے قسمیں کھائیں کہ میں نے نمک کو چھوا تک نہیں،
"تو پھر محمود بھیا کی شرارت ہوگی" نسیمہ بولیں۔
میں مشکل سے ہنسی کو روک سکی مجھ کو ہنستے دیکھکر
مینہ کو یقین ہوگیا اور بولیں۔
"خدا سمجھے محمود بھیا سے"
"مگوڑے، متا ہے، موذی کاٹے محمود بھیا" سعیدہ
نے تتلاتی ہوئی زبان سے کہا۔
سعیدہ کی گالیوں کو سنکر اماں جان، منجھلی ممانی
اور چھوٹی ممانی ہنس پڑیں، پھر جس کے جی میں جو آیا، محمود بھیا کو برا
بھلا کہا، اور ہم لوگوں کا گویا لوٹا ہوا قافلہ پھر کوٹھے پر آیا، مینہ سب سے
زیادہ برہم تھیں، ان کی برہمی ختم ہوتی نظر نہیں آتی تھی، مجھ سے
بڑے سخت لہجہ میں پوچھا۔
"تم نے محمود بھیا کو نمک دیتے دیکھا، تو پھر ہم لوگوں
سے کہا کیوں نہیں؟"
میں جواب دینے کے بجائے ہنس پڑی، میری ہنسی
سے نسیمہ کا غصہ بھی تیز ہوگیا، اور چڑ کر بولیں۔
"کہیں کیسے، پھر محمود بھیا کا عشق ان سے کیسے باقی رہتا"
نسیمہ کے اس جملے پر میں جھوجھکی رہ گئی۔ میرے دل میں
ایک حرکت سی پیدا ہوگئی اور قبل اسکے کہ میں کچھ جواب دوں مینہ بولیں"
"معلوم ہوتا ہے کہ تم ان پر فریفتہ ہو، اسی لئے ہم لوگوں
کے خلاف ہوگئی ہو"
میرا دل زیادہ زور سے دھڑکنے لگا پھر فوراً ہی نسیمہ نے کہا۔
"دل ہی تو ہے، عاشق ہوگئی ہوگی"
میرا دل اور بھی تیزی سے حرکت کرنے لگا، اور میں بڑی
مشکل سے کہہ سکی۔
"تم لوگ دیوانی ہوگئی ہو جو ایسی باتیں کر رہی ہو"
"دیوانی تو نہیں ہیں، سچی باتیں کہی جا رہی ہیں، اتنے
میں سعیدہ بولیں۔
"خدا کرے محمود بھائی ان سے بیاہ کرکے ان کو خوب ماریں
چوٹی پکڑ پکڑ کر ماریں"
سب ہنس پڑیں مجھکو بھی ہنسی آگئی۔
جب میں تنہا رہ گئی تو سوچنے لگی کہ ان کم بختوں کو آج آخر
کیا ہوا تھا کہ انھوں نے مجھکو ایسی جلی کٹی باتیں سنائیں، "محمود بھیا سے
مجھکو عشق ہوگیا ہے" "میں ان پر فریفتہ ہوگئی ہوں" "میرا دل ان پر
آگیا ہے" میرا بیاہ ان سے .... چپکے چپکے میں یہ الفاظ
اپنی زبان سے دہرانے لگی، یکایک مجھکو گدگدی سی محسوس ہوئی۔
اور میرے دل کی حرکت تیز ہوگئی یہاں تک کہ دل کی دھڑکن میرے
کانوں میں آرہی تھی، میرے دل کی کیفیت ناقابل بیان ہوگئی میں
پریشان ہوکر چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنا منھ دیوار سے ٹیک دیا

اور یکایک بولے۔

"تم بڑی سلیقہ مند لڑکی ہو"

یہ تعریف سنکر میری باچھیں کھل گئیں، جیسے مجھے کوئی بڑی دولت مل گئی ہو۔ یا کسی سلطنت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا ہو۔

محمود بھائی کھانا کھا کر جانے لگے، تو بولے "اگر ہو سکے تو شام کے ناشتہ کے لئے تم مٹر تل دینا"

محمود بھائی جا چکے تو مبینہ، نسیمہ اور سعیدہ کے یہاں کوٹھے پر واپس جانے کی ہمت نہ پڑی، میں نیچے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں گھومتی رہی، آخر میری طبیعت نہ مانی تو میں کوٹھے پر چلی، نسیمہ نے مجھکو دیکھتے ہی کہا۔

"اپنے عاشق کو کھانا دے آئیں"

میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔

"عاشق، معشوق کہو، عاشق تو یہی ہو گئی ہیں" مبینہ نے نسیمہ کی آواز کو دبلتے ہوئے کہا، میں ہکا بکا رہ گئی، اور قبل اسکے کہ کوئی جواب دوں، مبینہ نے کہا۔

"اس عشق و عاشقی کا قصہ ذرا اچھوا اماں کو بھی بتایا جائیگا"

"اور محمود بھائی کو بھی، وہ سن کر خوش ہونگے کہ میری بیٹی بڑی روشن خیال ہے" نسیمہ نے مبینہ کے منہ سے بات چھینتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی تھیں، مجھکو کچھ معلوم نہ تھا میں نے جرات کی، اور ان کو ڈانٹ کر کہا۔

"تم محمود بھائی صاحب کو جیسی بھولی ہو تو ایسی لڑکیوں سے خدا ہی بچائے... ... سے واسطہ... لیکن ... ... کر دینے لگیں..."

اور خدا جانے وہ کیا کیا کہتی رہیں۔ میری ساری جھڑکی، دھمکی، اور ڈانٹ ڈپٹ بے سود رہی۔

شام کو محمود بھائی کے لئے مجھکو مٹر کی گھگھنیاں بنانی تھیں مبینہ وغیرہ کو اس کی خبر نہ تھی، اس لئے موقع پا کر میں چپکے سے باورچی خانہ میں چلی گئی، اور گولمرچ، ہری مرچ، پیاز، اور کاغذی لیموں کا عرق دیکر میں نے گھنگھنی بنائی، محمود بھائی آئے، تو چٹخارے لے لیکر گھگنیاں کھائیں اور بولے۔

"تم بڑی سوگھڑ لڑکی ہو، شادی کر کے جس گھر میں جاؤگی وہ گھر بڑا ہی خوش قسمت ہوگا"

یہ سنکر میں شرما گئی، میں محمود بھائی کو مشکل سے دیکھ سکی میری آنکھیں اوپر نہ اٹھ سکیں، اور مجھکو پسینہ آنے لگا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اور میں لجاتی ہوئی محمود بھیا کے سامنے سے ہٹ گئی،

رات کو میں بستر پر لیٹی تو میرے ذہن میں بات آئی کہ کل بھی محمود بھیا مجھکو کھانا نکالنے کہینگے، لیکن مبینہ وغیرہ کے طعن و تشنیع کے مقابلہ میں کھانا کیسے نکال سکوں گی، یہ سوچکر مجھکو بے حد تردد ہوا، اور میں پریشانی میں کروٹیں لینے لگی، آخر میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن میں یہ خدمت ضرور انجام دونگی، اس فیصلہ کے ساتھ مجھ پر تردد، مبینہ کے طنز کا خوف اور محمود بھیا کی خدمت کی مسرت کی ملی جلی کیفیتیں طاری ہو گئیں، اور مجھکو ایسا معلوم ہوا کہ کل مجھکو کوئی بہت بڑی مہم سر کرنا ہے۔ صبح کو آنکھ سویرے کھلی مگر میں بستر پر قصداً پڑی رہی اور سوچنے لگی کہ یہ مہم کیسے سر ہوگی، مبینہ وغیرہ کوٹھے پر چلی گئیں تو میں اٹھ کر اٹھی، ہاتھ منہ دھو کر صبح کی نماز پڑھی، پھر کلام پاک لیکر بیٹھ گئی اور بڑی دیر تک تلاوت کرتی رہی یہاں تک کہ محمود بھیا کے اسکول کا وقت آ گیا ... ... اور بادرچی خانہ پہنچی، اور کل سے بھی زیادہ اہتمام سے ...

کھانا سجا کر دسترخوان پر لیگئی، محمود بھیا کھانا دیکھ کر بے حد خوش ہوئے، اور ان کو خوش دیکھ کر مسرت کی لہریں میرے رگ رگ میں دوڑ گئیں، وہ دسترخوان پر بیٹھے تو مکھیاں بھنک رہی تھیں، میرا جی چاہا کہ پنکھا لیکر جھلنا شروع کر دوں، مگر خیال آیا کہ کہیں مینہ نہ دیکھ لیں، اس لئے ہمت نہ پڑی، مگر میں ابھی سوچ میں تھی کہ محمود بھائی مسکرا کر خود بولے۔

"تکلیف نہ ہو تو ذرا پنکھا بھی جھل دو"

محمود بھائی نے یہ مذاق سے کہا، ان کا کوئی حکم نہ تھا، مگر وہ مسکرا کر نہ کہتے تو شاید میں ان کے حکم کی تعمیل نہ کرتی، میرا ہاتھ خود بخود پنکھے کی طرف بڑھ گیا، اور میں پنکھے کو حرکت دینے لگی، لیکن یہ خیال آیا کہ مینہ نے مجھکو پنکھا جھلتے دیکھ لیا تو گویا مجھ پر آسمان ہی ٹوٹ پڑے گا، میرا چہرہ زرد ہو گیا، جیسے میں بہت دنوں سے بیمار ہوں، میں نے جلدی سے اپنے چہرے کو دوسری طرف کر لیا، کہ محمود بھائی نہ دیکھ سکیں، پریشانی میں میری آنکھیں مینہ کو دیکھنے کے لئے زینہ کی طرف لگی ہوئی تھیں، اور میں گھبرا کر دل ہی دل میں پڑھ پڑھ کر دعا کر رہی تھی کہ مینہ، نسیمہ اور سعیدہ ابھی نہ آئیں۔ خدا نے میری دعا قبول کی، اور محمود بھائی کھانا کھا چکے تو میں نے پنکھا رکھ دیا، اور میں اندرونی طور پر بے حد خوش تھی کہ مہم سر ہو گئی۔

محمود بھائی ہاتھ دھو کر باہر چلے تو پھر مسکرا کر بولے،

"اگر مجھکو اس اہتمام کے ساتھ برابر کھانا اور ناشتہ ملے تو سارے امتحانات پاس ہو کر بہت جلد بڑا آدمی ہو جاؤں۔۔۔"

اس کے جواب میں میری زبان کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر کچھ پھر میں نے ہمت کی اور کانپتی ہوئی آواز میں اپنی آنکھیں نیچی کر کے بولی،

"اگر یہ بات ہے تو میری خدمت برابر حاضر ہے"

کہنے کو تو کہہ گئی، مگر میں بہت شرمائی ایسا معلوم ہوا کہ میں نے محمود بھائی سے کوئی مقدس عہد اور نہ ٹوٹنے والا وعدہ کیا ہے۔

محمود بھائی جا چکے تو میں نے کوٹھے پر جانا چاہا، مگر مجھکو ایسا محسوس ہوا کہ میں کوٹھے پر گئی، اور میرا سارا راز فاش ہو جائیگا۔ یہ سوچکر میں اپنے بستر جا کر لیٹ رہی، مگر فوراً ہی مینہ کے آنے کی آواز سنائی دی، میں گھبرا گئی، کہ خدا جانے وہ آکر کیا غضب ڈھائیگی، مینہ میرے پاس پہونچکر بولیں،

کیوں بھابی جان! آج ہم لوگوں سے روٹھ گئی ہیں!

بھابی جان! معلوم ہوا کہ کسی نے بم گرا دیا، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، مجھکو یقین ہو گیا کہ مینہ نے مجھکو محمود بھائی کو پنکھا جھلتے دیکھ لیا ہے، اور میں نے ان سے جو وعدہ کیا ہے وہ بھی سن لیا ہے، میری گھبراہٹ کی کوئی حد نہ تھی، مگر میں نے ہمت کی اور ڈانٹ کر مینہ سے کہا۔

"کم بخت چڑیل، تجھکو تو ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے، مجھکو چھوڑ دو، آج میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے، میرے سر میں درد بھی ہے"

"یہ نخرے محمود بھائی ہی کو دکھانا"

اس جملہ نے مجھکو گھائل کر کے بالکل نیم جان کر دیا لیکن میں نے مینہ کو پھر ڈانٹا۔

"دور ہو یہاں سے مردار، مجھکو اکیلی مرنے کے لئے چھوڑ دو"

یہ کہکر میں نے اپنی پریشانی چھپانے کے لئے منہ پر چادر لپیٹ لی اور سر کو ہاتھ سے پکڑ کر زور زور سے کراہنے لگی، مینہ کو میری طبیعت کی ناسازی کا یقین آگیا، اور میرے پاس [illegible]

ں، میں خوش تھی کہ میرا راز فاش نہ ہو سکا، اور آج میں نے
ذ کو گویا شکست دی۔

اس کے دوسرے روز عورتیں تقریب سے واپس
ں، مجھکو بڑی فکر ہوئی کہ اب تو پہلے کی طرح محمود بھائی کو ممانی اماں
کھانا نکال کر دینگی، پھر محمود بھائی سے میرا وعدہ کیسے پورا ہوگا۔
سوچ میں پڑگئی آخر ایک بات ذہن میں آئی۔ میں نے اماں جان
ے کہا کہ وہ مجھکو سوہن حلوا بنانا سکھا دیں، انہوں نے ٹالنے کی
شش کی، مگر میں نے زیادہ ضد کی تو وہ تیار ہوگئیں، سوہن حلوا
نے کے لئے مختلف چیزوں کی تیاری میں کئی دن لگ گئے، میں نے
ہر چیز تیار کرنے میں بڑی محنت کی، اسطرح مجھکو باورچی خانہ میں
ہنے کا موقع مل گیا، اور میں روز محمود بھیا کو کھانا نکال کر دیتی رہی
کی زبان بند کرنے کے لئے میں نے بڑے بھائی (یعنی مبینہ کے بڑے
ئی) بڑے ماموں، وغیرہ کا بھی کھانا نکالنا شروع کر دیا، پھر گھر کی
توں کے ملنے میں ہی کھانا نکالنے لگی، رفتہ رفتہ باورچی خانہ کا
انتظام میرے سر پر آگیا، نانی اماں اور ممانی اماں خوش تھیں کہ
رح ان کا بوجھ ہلکا ہوگیا، اماں جان بھی مسرور تھیں کہ میں گھر کے ایسے
ں میں مشغول رہتی ہوں جو ایک لڑکی کو سوگھڑ اور سلیقہ مند بنانے
لئے ضروری ہے۔ میں بھی پھولی نہیں سماتی تھی کہ اس طرح مجھے محمود
ی کی خدمت کرنے کا برابر موقع مل رہا تھا، میں نے اسی سلسلہ میں
ت قسم کے کھانے پکانا سیکھا، کبھی قبولی، کبھی بریانی، کبھی
ں کباب، کبھی بالائی کی مٹھائی، کبھی حلوے اور کبھی مجھو یہاں
ں اور یہ تھی اسلئے کہ کس طرح محمود بھائی کو کھانا اور ناشتہ میں
ے بہتر چیزیں مل سکیں۔

زمانہ تیزی سے گذرتا گیا محمود بھائی کی خدمت کا میرا
بھی [illegible] مبینہ [illegible] محمود بھائی کی [illegible] بھی

پہلے کی طرح قائم رہیں، مبینہ، نسیمہ اور سعیدہ محمود بھائی کے جلبلا پن
سے عاجز آ کر مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش کرتیں، اور ان کی
غیر موجودگی میں مجھکو بھابی جان بھابی جان کہہ کر چڑھاتیں، میں
صرف کھسیانی ہو کر رہ جاتی،

اسی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ محمود بھائی میٹرک کے درجہ میں
پہونچے، جب ان کا آخری امتحان قریب آیا تو ایک روز ہم لوگوں
کے پاس آئے اور مبینہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"امتحان میں میری کامیابی کے لئے دعا کرو"
مگر مبینہ نے جل کر کہا۔

"میں تو آپ کے لئے ہرگز دعا نہ کروں گی"
"میں بھی آپ کے لئے دعا نہ کروں گی" نسیمہ نے کہا۔
"خدا کرے آپ فیل ہو جائیں" سعیدہ نے چلا کر کہا۔
سعیدہ کا جملہ سنکر میں تلملا گئی، اور مجھکو اسقدر غصہ آیا
کہ بس چلتا تو میں اس کی زبان پکڑ کر کھینچ لیتی، میں غصہ کی حالت ہی
میں تھی کہ مبینہ نے محمود بھائی سے کہا۔
"کوئی آپ کے لئے دعا کرے یا نہ کرے، مگر آپ کی
.... یعنی .... میری بھابی جان تو ضرور دعا
کریں گی"

مجھکو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے یکایک زور سے طمانچہ
مار دیا ہے، جس سے میرا سر پھر گیا ہے، مبینہ نے محمود بھائی کے سامنے
مجھکو بھابی جان پہلی دفعہ کہا تھا، مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی
میرا جسم کانپنے لگا، محمود بھائی بھی جز بز ہو گئے، ان سے کچھ
جواب نہ بن سکا تو جھینپتے ہوئے مبینہ کی چوٹی پکڑ کر پیٹھ کی طرف
گردن جھکا دی، مبینہ پریشان ہو کر "اماں جی! اماں جی!" پکارنے اور
سے چیخنے لگیں تو محمود بھائی ڈر کر بھاگے۔

ایک ہفتہ کے بعد محمود بھائی بہار شریف سے پٹنہ
ن دینے کے لئے گئے، ان کا امتحان آٹھ روز تک تھا میں نے
ر لیا تھا کہ ان آٹھ دنوں میں محمود بھائی کے لئے ہر قسم کی دعائیں
گی، مگر مینہ وغیرہ کے طعن و تشنیع اور گھر کی عورتوں کی
ینوں کے ڈر سے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دعا کس طرح کس وقت
ںاں کروں، آخر میں نے سوچا کہ سب لوگوں کے سو جانے
بعد رات کی تنہائی میں کہیں چھپ کر کردوں، اور یہی کیا آٹھ
مسلسل میں برابر جاگتی رہی، اور اس چلہ میں ایک ایک لاکھ
نامہ اور دعائے جمیلہ، ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ بار درود ماثورہ
اعظم اور درود تاج پڑھا، اور محمود بھائی کی کامیابی کے لئے
ںاری کی۔

دو مہینے کے بعد محمود بھائی کے امتحان کا نتیجہ نکلا
اللہ وہ کامیاب ہو گئے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی،
کالج کی تعلیم پانے کے لئے محمود بھائی پٹنہ چلے گئے
کے چلے جانے کے بعد سارا گھر مجھکو سونا نظر آنے لگا، میری
ن پر اداسی چھا گئی، کسی کام میں جی نہیں لگتا، باورچی
انے میں مجھکو کوئی دلچسپی نہ رہی، رفتہ رفتہ مختلف بہانے
میں نے باورچی خانہ جانا ہی چھوڑ دیا، ہاں اگر کسی چیز سے
ی تھی تو ان خطوں سے جن میں محمود بھائی اپنی خیریت مانی
لکھتے تھے، میں کسی نہ کسی طرح ان خطوں کو حاصل کر لیتی
کو بار بار پڑھتی جس دن محمود بھائی کے خط کے آنے کی
ی، اس روز میں ڈاکیہ کا انتظار بے چینی سے کرتی، اور
تھا یا تو دن بھر خوشی رہتی کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ میں
بھائی سے خط و کتابت کروں، مگر بہت سی باتیں سوچ کر
ہمت کے خلاف سمجھا۔

دن اسی طرح گذرتے گئے، تین مہینے کے بعد محمود بھائی
چھٹی میں گھر آئے، جس روز وہ آنے کو تھے، اس کے ایک رات پہلے
میں بستر پر لیٹی تو ذہن میں یہ بات آئی کہ کل میں کوئی قیمتی لباس
پہنوں تو بہتر ہے، ابا جان نے مجھکو جو فاسئی رنگ کی جامدانی ساری
لا کر دی ہے، وہی پہن لوں مگر خیال آیا کہ اتنی قیمتی ساری پہنوں گی
تو مضحکہ خیز معلوم ہوگی، تو پھر پیازی جارجیٹ ہی پہن لوں مگر
مینہ سے ڈری تو مجبوراً شکر پارے چھاپ کی ارواں ساری ہی
پہن لوں، صبح کو اٹھی تو غسل خانہ چلی گئی، نہا دھو کر چوٹی گوندھنے
بیٹھ گئی، شکر پارے چھاپ کی ساری پہنی، اور پھر سرخی رنگ کا
ایک جمپر پہنا، سنگاردان میں مسی کی ڈبیا پر نظر پڑی، جی چاہا کہ مسی
لگا لوں، مگر مینہ کے ڈر سے ہمت نہ پڑی، خیال آیا کہ چھوٹی خالہ اماں
کے پاس پاوڈر ہے، ان سے مانگ کر ذرا چہرہ پر پاوڈر مل لوں
مگر پھر مجھکو خود ہنسی آنے لگی، لیکن مینہ اور نسیمہ کی تیکھی باتوں
کے ڈر کے باوجود سنگاردان سے افشاں نکال کر مانگ پر چھڑک
لی، پھر پان کی ایک گلوری کھانے کو بے اختیار جی چاہا، اور ہمت کر کے
کھا ہی لیا، اتنے میں مینہ پہونچ گئیں میں سہم گئی، یکایک بولیں۔

"دولہا کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی ہیں"

یہ سنکر میرا خون خشک ہو گیا، میں کچھ جواب دینا چاہتی
تھی کہ مینہ نے پے در پے اتنے حملے کئے کہ میرے لئے سوائے
ہنسنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہا، مینہ کے جملوں اور فقروں سے
میں شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی کہ محمود بھائی کے آنے کا شور
ہوا، یہ سنکر میرا دل باغ باغ ہو گیا،

محمود بھائی تین ہفتے رہے اب سے میری آنکھوں سے
گھر کی ساری اداسی دور ہو گئی تھی ہر طرف خوشی ہی خوشی
نظر آتی تھی، باورچی خانہ سے بھی میری دلچسپی پھر عود کر آئی

تھی، مگر میری خوشی چند روزہ تھی، تین ہفتے کی مدت تین روز سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی، محمود بھائی کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ چلے گئے، میری طبیعت پھر کھوئی کھوئی رہنے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد گھر کی عورتیں ایک رات صحن میں بیٹھی خوش گپیاں کر رہی تھیں، میں بھی مینہ کے ساتھ ایک پلنگ پر ایک گوشہ میں لیٹی تھی، رات برسات کی تھی اور بہت ہی خوشگوار تھی، چودھویں رات کی صاف اور شفاف چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، آسمان پر تارے موتیوں کی طرح بکھرے تھے، جھینگروں کی آواز سے فضا میں شور و غل پیدا ہو رہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خوشی میں شادیانے بجا رہے ہیں، میں چاندنی رات کے مناظر اور جھینگر کی گیتوں سے محظوظ ہو رہی تھی کہ ممانی اماں کو بولتے سنا،

"ادھر محمود کی منسوب کئی جگہ سے ان کے ابا کے پاس آئی ہے"

"مبارک ہو، کہاں کہاں سے آئی ہیں" میری اماں جان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

اس گفتگو سے میرا دل کانپ اٹھا، اور میں غور سے سننے لگی، ممانی اماں نے جگہ اور منسوب کی تفصیل بتائی اور آخر میں کہا، مجھکو ان میں کوئی جگہ پسند نہیں، یہ سنکر میری جان میں جان آئی، اتنے میں چھوٹی خالہ اماں بولیں۔

"میری تو خواہش ہے کہ محمود گھر ہی میں رہتے"

میرے بدن میں جھر جھری سی محسوس ہوئی، مینہ نے سنکر میرے کان میں کہا۔

"کہو تو تمہاری طرف سے پیام دوں"

[illegible]

خفت میں کروٹ بدل لی اور میں نے ممانی اماں کو بولتے سنا،

"کیا ہرج ہے"

چھوٹی خالہ اماں پھر بولیں۔

"بانو بھی گھر ہی میں رہتی تو بہت اچھا تھا"

یہ سنکر مجھکو گدگدی معلوم ہونے لگی، اور میرا جی چاہا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں مگر مینہ نے پھر میرے شانے میں چٹکی لی اور کہا۔

"لو مراد پوری ہو رہی ہے مٹھائی کھلاؤ"

میں بے حد شرمندہ ہوئی لیکن ممانی اماں کا جواب سننے کے لئے میرے کان کھڑے ہو گئے، وہ بولیں۔

"مجھکو تو بانو بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے وہ میری بہو بن جائے، تو گویا میری قسمت جاگ اٹھے، ایسی سوگھڑ سلیقہ مند اور نیک لڑکی اور کہاں ملے گی"

یہ سنکر مجھ پر ایک ناقابل بیان کیفیت طاری ہو گئی مگر ایسی حالت میں مینہ نے مجھکو چھیڑتے ہوئے کہا۔

مٹھائی کا وعدہ کرو بھابی جان! ورنہ تمہارے لئے الٹی دعائیں کروں گی"

مینہ کا آخری جملہ مجھکو پسند نہ آیا۔

ممانی اماں چھوٹی خالہ اماں اور اماں جان سے باتیں ہوتی رہیں۔ اور جس طرح کی گفتگو ہوئی اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچی کہ محمود بھائی کے ساتھ میری قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا، یہ معلوم کر کے جذبات کا ایک سیلاب اور خیالات کا ایک طوفان میرے دل اور دماغ میں امنڈ آیا، رات کو مشکل سے نیند آسکی اسلئے تڑکے تڑکے اٹھی اور تنہائی کی خاطر کوٹھے پر چلی آئی۔

"ہاں بہت ہی [illegible]

کی باتوں کو ذہن میں لئے چھت پر ٹہلنے لگی، صبح کی ہوائیں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ اور ان کے ہر جھونکے میں میں نے اپنی زندگی کے لئے ایک نیا پیام پایا۔ مُعطّر ہوا میں مجھکو بھینی بھینی خوشبو معلوم ہوئی جیسے سہاگ کی خوشبو ہو، میں زور زور سے سونگھنے لگی، لیکن مجھے ہنسی آگئی اور شرما گئی تھوڑی دیر میں سورج کی سنہری کرنیں نمودار ہوئیں، اور سیدھی میری مانگ پر پڑ رہی تھیں جیسے وہ میری مانگ میں افشاں بھر رہی ہوں، مجھکو گدگدی سی محسوس ہوئی، اور شرم سے میری آنکھیں نیچی ہو گئیں، اور جب یہ اٹھیں تو گوریوں کے ایک بڑے جھنڈ کو چھت کی منڈیر پر دیکھا وہ چہچہا رہی تھیں۔ اور مجھکو دیکھ کر اور زور سے چہچہانے لگیں شاید میری خوشی کا جشن منا رہی تھیں، پھر یکایک میرا ذہن شادی کے بعد کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے اُتار چڑھاؤ کی طرف دوڑ گیا، میں خیالات کے دریا میں ڈوب گئی لیکن آخر میں مجھکو شادی کے بعد کی زندگی میں خوشی زیادہ اور تکلیف کم نظر آئی۔

دو مہینے کے بعد وہ چھٹیوں میں پھر گھر آئے، اس مرتبہ میرے جذبات کی کیفیت بالکل مختلف تھی، رسم و رواج کے مطابق اب میں ان سے پردہ کرنے لگی، گو مجھ پر یہ گراں گذرا وہ گھر میں آتے تو میں بے تحاشا بھاگتی، کبھی زینہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی، مگر میں گرتی پڑتی زخمی ہوتی کسی طرح بھاگ کر چھپ جاتی، کبھی مجھکو بری طرح چوٹ آتی، لیکن اس چوٹ میں جو مجھکو لذت محسوس ہوتی، وہ دیر تک نہ بھولتی،

دو سال اور گذرے، میرے جذبات و خیالات کے رنگ و بو میں تیزی آتی گئی، ان کا آئی، ایس، سی کا امتحان بھی آ پہونچا۔ مگر عجیب اتفاق کہ جس زمانہ میں ان کا امتحان تھا، انہی دنوں میں میری ایک چچا زاد بہن کی شادی تھی، اس میں اماں کی شرکت ضروری تھی، وہ مجھکو بھی لے جانا چاہتی تھیں، میں نے بہت سے بہانے کئے، مگر وہ نہ مانیں، آخر میں گئی، اور شادی کے ہنگاموں میں ان کے امتحان کے دنوں میں مطلق دعا نہ کر سکی اور مجھکو ایسا معلوم ہوا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے، جس کی سزا مجھکو فوراً ہی ملیگی۔

دو مہینے کے بعد ان کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو وہ فیل ہو گئے مجھکو بڑا ہی دکھ ہوا، اور میں نے اپنے کو طرح طرح سے لعنت ملامت کی، اماں جان کو بھی جی میں برا بھلا کہا، مگر اب پچھتانے اور رنج کرنے سے کیا ہو سکتا تھا، وہ بد دل ہو کر پٹنہ چھوڑ کر علیگڈھ چلے گئے، اور میں نے اپنے گناہ کے کفارہ میں ان کے علیگڈھ جانے کے روز ہی سے دعائیں مانگنے لگی، اور ان کے امتحان تک خدا جانے کتنے چلّے باندھکر دعائیں کیں، خدا کی درگاہ میں روئی اور گڑگڑائی الحمد للہ میری دعا قبول ہوئی، اور اس مرتبہ وہ اول درجہ میں پاس تھے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی،

یہ امتحان پاس ہونے کے بعد وہ پٹنہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں جب ان کا دوسرا سال شروع ہوا تو یکایک مجھ پر بجلی گر پڑی، ان کی منسوبی ایک بڑے رئیس کے یہاں سے آئی، جہاں سے نہ صرف ایک معقول جائداد بلکہ شادی کے موقع پر یکمشت چار ہزار کی رقم کا وعدہ کیا گیا۔ یہ صورت ابا جان کے یہاں ممکن نہ تھی، اس لئے منسوبی طے پا کر شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

یہ تمام باتیں اتنی عجلت میں طے پائیں کہ اماں جان اور ممانی اماں کو آپس میں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ رہی میرے لئے تو آسمان ہی ٹوٹ پڑا میری آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا گیا۔

میں نے اپنی تمناؤں کی جو دنیا بسائی تھی وہ یکایک اجڑ گئی، مجھکو گویا ذبح کرکے نیم جاں بسمل کی طرح تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ میں کر ہی کیا سکتی تھی، تڑپ تڑپ کر جان دیدینا بھی میرے بس میں نہ تھا، ہاں رو رو کر جان کھلانا میرے اختیار میں ضرور تھا میری آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب جاری رہتا۔ کبھی جی چاہتا کہ آہ و بکا کے ساتھ چیخ چیخ کرکے روؤں۔ کہ آہ! ماموں جان تم مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے، مگر روپوں میں کیا جادو تھا کہ ساری محبت پانی کے بلبلوں کی طرح ایک آن میں مٹ گئی ابا جان، اماں جان کے پاس چند ہزار روپے نہ سہی، مگر میرے دل کی گہرائیوں میں نہ مٹنے والی محبت تو تھی، اس محبت کی سچائی اور پاکیزگی کی بیش بہا دولت تو تھی، مگر یہ دولت روپوں کے آگے کس کام کی۔

میرا جی چاہا کہ محمود بھائی کو ایک خط لکھوں کہ ایک اجنبی لڑکی کو اپنی شریک حیات بناکر میرے ارمانوں کو شہید نہ کریں مگر ڈری کہ خط لکھنے سے کوئی مفید نتیجہ تو نہ نکلے گا، لیکن اس خط کا ذرا بھی پتہ کسی کو لگ گیا تو مجھ پر آفت ہی آجائے گی، ننگ خاندان، رسوائے زمانہ اور خدا جانے کن کن القاب سے پکاری جاؤں گی، پھر تو اماں جان اور ابا جان کا سر رسوائی، ذلت اور خجالت سے نہ اٹھیگا جی میں آیا کہ بہنہ کے ذریعہ سے ماموں جان کی خدمت میں اپنے جذبات کا اظہار کراؤں، مگر ایک کنواری لڑکی کے جذبات ہی کیا، اسکے لئے تو کسی قسم کے جذبات کی پرورش کرنا ہی ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔ اور جذبات کے اظہار پر تو وہ سنگسار کردی جائے تو بھی سخت والوں کی پیاس نہ بجھے۔ ایک کنواری لڑکی کی حیثیت ہی کیا۔ وہ زبان رکھتی ہے لیکن اس کو بولنے کا کوئی حق نہیں، وہ دماغ بھی رکھتی ہے لیکن اس سے وہ کوئی بات سوچ نہیں سکتی ہے۔ وہ دل بھی رکھتی ہے۔ لیکن اس دل میں جذبات کو قریب آنے دینا اس کے لئے جرم ہے۔ تو ماں باپ اور عزیزوں کے سر کا ایک بوجھ ہے جس کو وہ جب، جہاں اور جس طرح چاہیں پٹک کر ڈال دیں۔ اور اس کی ساری خوبیاں اسی میں ہیں وہ بے زبان، خالی الذہن اور جذبات سے پاک رہ کر ہر حال میں خوش اور قانع رہے، اپنی اس بے بسی کو محسوس کرکے میں خوب روئی،

محمود بھائی کی برات سے چھ روز پہلے گھر کی عورتوں نے گیت گانا شروع کیا، گیت کی پہلی آواز جیسے ہی میرے کان میں پہونچی مجھ پر ایک جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور میں چاہتی تھی کہ ایک قہقہہ لگاکر سارے گھر میں دوڑ جاؤں یا روروکر گھر کو سر پر اٹھالوں، مگر اماں جان کی پریشانی کا خیال آیا، اسلئے خاموش رہی لیکن اس خاموشی سے مجھ میں نفرت، غصہ اور ملامت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر گیا۔ میری آنکھیں سرخ ہو گئیں میرا چہرا تمتما اٹھا، کتابوں اور قصوں میں پڑھا تھا، کہ عورت جب اپنی محبت میں ناکام ہوتی ہے تو وہ زخمی کالی ناگن کی طرح بپھر جاتی ہے، جو غصہ اور انتقام میں بار بار کاٹ کھاتی ہے۔ میں اپنی محبت میں ناکام ہو رہی تھی، میرا دل بھی زخمی تھا اور میں غصہ سے بھی بھری تھی، مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انتقام لوں تو کس سے اور کس طرح۔

چار روز کے بعد گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا، میراثنیں بھی پہونچ گئیں اور انہوں نے گیت گاگا کر گھر میں ایک ہنگامہ برپا کردیا میرے کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا۔ میرا جی چاہا کہ گھر چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں، یا خودکشی کرلوں یا آسمان ٹوٹ پڑے کہ میں پس جاؤں یا زمین پھٹ پڑے کہ میں دھنس جاؤں، مگر قدرت کی طرف سے میرے لئے یہ انتظام کیوں ہوتا۔

برات کے روز محمود بھائی کو مہندی لگانے کے لئے اندر بلایا گیا۔ ممانی اماں کا حکم ہوا کہ بہنیں مہندی لگائیں۔ بینہ، نسیمہ اور سعیدہ مہندی لگانے بیٹھ گئیں۔ بینہ نے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے مجھکو قصداً نہیں بلایا۔ مگر اماں جان نے اپنی بلندی اسی میں سمجھا کہ مجھ سے بھی محمود بھائی کو مہندی لگائیں، اس لئے مجھ کو بھی اس رسم میں شریک ہونے کے لئے حکم دیا۔
مگر میرے لئے کیسا جانکاہ حکم تھا، اماں جان کا اصرار بڑھا تو میں بینہ وغیرہ کے پاس جانے کے لئے تیار ہوئی، مگر میں نے جیسے ہی قدم بڑھایا تو معلوم ہوا کہ میں سولی پر چڑھنے جا رہی ہوں۔ میرا پاؤں تھرتھرانے لگا، اور قریب تھا کہ میں زار و قطار رونے لگوں مگر میں سنبھلی، اور دل کو تسلی دی کہ میں حرمان نصیب سہی لیکن میری وجہ سے کنوار پنے کی خودداری کی شان، اس کے عدیم المثال ضبط و تحمل کی بلندی پر حرف کیوں آئے، اس لئے سنبھل کر ہنستی مسکراتی بینہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی، لیکن مہندی لیکر محمود بھائی کے پاؤں میں لگانے کے لئے جیسے ہی میرا ہاتھ بڑھا تھا کہ میرا دل بھر آیا، اور میری آنکھیں نم ہو گئیں میں ڈری کہ کنوار پنے کی ساری لاج آج میرے ہاتھوں سے ملیا میٹ ہو جائیگی۔
میں نے اپنی طبیعت میں سکون پیدا کرنے کی کوشش کی، اور بینہ کے ساتھ مل کر گیت گانے لگی، بینہ اور محمود بھائی میں چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی، میں نے بھی اپنی افسردگی مٹانے کے لئے اس چھیڑ چھاڑ میں حصہ لیا مگر جب یہ رسم ختم ہو چکی اور میں اپنے کمرہ میں واپس آئی تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔
برات دھوم دھام سے روانہ ہوئی، اور دو روز کے بعد ۔۔۔۔۔۔۔۔ بھابی جان ۔۔۔۔۔۔۔ کی سواری آ گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔ گیت راگ کے ساتھ عورتیں ان کو اتارنے کے لئے دوڑیں۔ میں بھی جانا چاہتی تھی، لیکن میرا قدم نہ اٹھ سکا۔ عورتوں نے بھابی جان کو لا کر صحن میں بیٹھا دیا۔ اور ساری عورتیں منہ دیکھنے کے لئے ایک دوسرے کے اوپر گری پڑتی تھیں، میں بھی اشتیاق میں بھابی جان کو دیکھنا چاہتی تھی کہ یکایک میرے کانوں میں آواز آئی۔
"دولتمند باپ کی بیٹی سہی، مگر صورت میں بانو سے اچھی نہیں"
یہ سنکر میرے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ اور کچھ عورتوں کے سامنے ہی میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، میں وہاں سے فوراً ہٹ گئی اور کمرہ میں آکر ڈھاریں مار مار کر رونے لگی۔
دو مہینے کے بعد ابا جان نے اماں جان کو کسی ضرورت سے اپنے یہاں بلایا، میں بھی ان کے ساتھ گئی، اور وہاں کاموں کا سلسلہ ایسا رہا کہ اماں جان دو سال تک واپس نہ ہو سکیں اسی اثنا میں میں اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کو بھول چکی تھی، اور ساری باتیں ایک خواب پریشاں ہو گئی تھیں۔ دو سال کے بعد لوٹی تو بینہ کی گود میں محمود بھیا کا چھ مہینہ کا بچہ دیکھا، بچہ بہت ہی پیارا چاند جیسا تھا، اس نے مجھکو جیسے ہی دیکھا ہنستا ہوا ہمک کر میری گود میں چلا آیا۔ میں اسکو لیکر بینہ کے ساتھ کوٹھے پر چلی آئی، یہاں آکر میرے مردہ جذبات پھر زندہ ہو گئے تمام گذری باتیں یاد آ گئیں، اسی چھت پر پہلی دفعہ میری تمنائیں [illegible] میں چھا گئیں یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو کے قطرے چھلکنے لگے [illegible] بچہ کو دیکھا تو وہ مجھکو دیکھکر مسکرا رہا تھا اسکی پیاری پیاری ہنسی کو دیکھکر میرے سینہ پر بجلی سی ہنسی آ گئی [illegible] اسکو چھاتی سے لگا لیا، مگر وہ میرے سینہ سے چمٹ گیا۔ میں اسی طرح [illegible]

ایک ہزار کا نوٹ

از

جناب نثار احمد صاحب ناروی

سالانہ کل ہند نمایش کا زمانہ جس کو میں اپنی زندگی کا بہترین خواب سمجھا کرتا ہوں آپہونچا۔ اس مرتبہ میں نے قصد کیا کہ تنازع للبقاء کی ہر سعی سے بے نیاز ہوکر تا قیام نمائش اسکی مخمور فضا میں اپنے کو اپنے سے بے خبر رہنے کے لئے وقف کر دوں۔ اس لئے ایک دوکان خصوصی طور پر ریشمی زرکار زنانے کپڑوں کی نمایش گاہ میں قائم کی

اکتوبر اور نومبر کا زمانہ تھا موسم گرما نے اپنے اختتام کی ٹھنڈی سانسیں لینی شروع کر دی تھیں۔ صبح و شام کی ہلکی اور نہایت خوشگوار خنکی نے الہ آباد کے بسنے والوں کے جسموں میں نئی روح پھونک کر از سر نو زندگی بخشنا شروع کر دی تھی، ہوا پھولوں کی خوشبو سے معنبر مشام میں ایک سکر کی سی کیفیت پیدا کر رہی تھی، اول شفق کی رنگینی نے ہر شئے پر ایک سنہرا ملمع کر دیا تھا، دوسرے قمقموں کی رنگین قطاروں نے اور سونے میں سہاگا ملا کر نمایش بینوں کے چہروں کو معلوم نہیں کیا بنا دیا تھا ہر روش اپنی دورویہ رنگین روشنی کی آرایش کیوجہ سے ایک قوس قزح نظر آتی تھی، جہاں ماہ پارے اس طرح محو خراماں تھے جیسے نظام شمسی اپنے طواف میں ہو۔ الغرض یہ موسم یہ وقت، یہ عالم رنگ و بو میں ایک سکر کی سی حالت میں اپنی دوکان پر بیٹھا تھا کہ ناگہاں ایک عورت جس کو واقعی عورت کہنا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی گناہ کا مرتکب ہونا۔ میری دوکان پر آئی، ہیئت کذائی بینائی کے لئے کچھ اسقدر مجروح کن تھی کہ میں بلا ارادہ پیچھے ہٹ گیا۔ میری حالت سکر اس طرح دور ہوئی جیسے نشہ کو ترشی اتار دے، وہ اپنی خاص خلط قسم کی اردو زبان اور مغربی لباس کی وجہ سے مسیحی معلوم ہوتی تھی، اگرچہ اس کا رنگ روپ اس بات کا مظہر تھا کہ وہ ہندستان اور خالص ہندستان کی پیداوار ہے۔

ملازم سے میں نے کہا کہ دیکھو میم صاحب کیا چاہتی ہیں، میم صاحب کو ایک کرسی پیش کی گئی مگر ان کی فربہی کیوجہ سے ان کی کمر کے قطر کی وسعت کچھ اسقدر رکھتی کہ کرسی کی آغوش ان کے لئے تنگ تھی، لہذا مجبوراً ایک تپائی کی طرف متوجہ ہونا پڑا، بیٹھتے وقت یہ احتیاط مد نظر تھی کہ آیا تپائی اسقدر مضبوط ہے کہ ان کے کم و بیش چار من کے بار کی متحمل ہو سکے! لہذا آزمائش کے لئے۔ اپنا بوجھ پہلے ایک من ڈالکر اس کے سلامتی

جائزہ لیا پھر بقدر دو منٹ، اسی طرح بتدریج اپنا وزن ذرا ذرا
سی پر ڈال کر اسکی حیات کا اندازہ کرتی رہی۔ یہ حفظ ماتقدم میری
پائی کی تباہی کے خیال سے نہ تھا بلکہ اپنے گر جانے کے اندیشہ
سے، اس کے جسم کا طول چھ فٹ اور عرض چار فٹ سے کم نہ تھا،
اس بےحساب موٹاپے نے اس کے بلند قامت کو پست قد میں
تبدیل کر دیا تھا، جس وقت وہ تپائی پر بیٹھی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ
ایک تناور برگد کے درخت کا بالائی حصہ قطع کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔
رنگ کی سیاہی کا یہ عالم تھا کہ گرد و پیش کی فضا میں ایک دھندلا
پن آگیا تھا، چہرہ ملاحظہ ہو تو ناک ایک بڑی کاجر کی سی منہ پر
نمایاں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کے سیاہ چہرہ پر اسطرح
چمک رہی تھیں، جیسے ایک بڑے تمباکو کے پنڈے میں دو چھوٹی
ڈلیاں کھونس دی گئی ہوں رخسار کی فربہی 'ناک کا ٹیلا'
پیشانی کے تنگ سطح، لبوں کی لمبائی چوڑائی، گردن کی نفی اور
جسم کے دوسرے کھلے ہوئے حصے، چیچک کے سیاہ تر نشانات
سے خوب مزین تھے، بہرحال وہ کچھ بھی ہو میری خریدار تھی،
زیادہ تفصیل میرے لئے زیبا نہیں۔

اول تو اس نے چاہا کہ کچھ تیار شدہ کپڑے خرید ے
گر اس کے جسم کی پیمائش کے لحاظ سے سب ناکافی تھے، اس لئے
اس نے دوسرے مختلف النوع کے بے سلے کپڑے قریب چھ
سو روپے کے خریدے، ایک ہزار کا نوٹ قیمت کی ادائی
کے لئے دیا بقیہ روپیہ واپس لیا۔ اور بخیر و عافیت ہانپتی ہوئی
واپس گئی۔

اس کے چند منٹ کے بعد تصویر کا دوسرا رخ نظر
آیا یعنی ایک حسینہ اپنی جنس میں سب سے زیادہ ممتاز رنگین
و تریں سادہ تن کے آنچلوں کو فضا میں لہراتے ہوئے سارے ماحول
کو معطر کرتے ہوئے خراماں خراماں نسیم کی طرح آئی اور میری
دوکان کی جانب رخ کرتی نظر آئی۔

شعاع فطرت سادہ کو چمکاتے ہوئے آنا
ابھی تک یاد ہے ان کا وہ شرماتے ہوئے آنا

میں اپنی خوش قسمتی سمجھکر ہمہ تن خیر مقدم بنا ہوا آگے بڑھا
وہ آئی اور ایک کرسی پر بیٹھکر ملازم سے متوجہ ہو کر ساریوں کی
دیکھ بھال اور ان کی پسند میں مصروف ہوگئی، میں خوش تھا کہ
مجھے قدرت کی صناعی کے مطالعہ کے لئے چھوڑ دیا۔ وہ کیا تھی ؟
بس یوں سمجھئے کہ اس کی ہنسی ایک مجسمہ شعر و شباب تھی ایک
ایک تصویر حسن و جمال تھی اور ایک مجموعۂ نور و نشاط جس نے
اس نمایش گاہ کے طرب انگیز ماحول کو اپنے نوری جلووں کی
ضیا پاشیوں سے اور خیرہ کر دیا تھا، گلاب کے سفید پھول کے
مانند شگفتہ چہرہ، پرکیف خمار آگیں چشمہائے نرگس، ماہتاب
کی طرح درخشاں پیشانی اور وہ قیامت انگیز شباب کی مخمور
منزلوں میں عشرت بداماں وادیاں!

خوش چشم خوبصورت خوش وضع ماہ پیکر
نازک بدن شکر لب شیریں ادا فسوں گر

بس معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس نمایش گاہ کے خطۂ جنت نظیر
میں ایک فردوس بریں کی حور اتر آئی ہے۔

قریب نصف گھنٹے کے وہ مختلف اقسام کے کپڑوں
کی پسند میں مصروف رہی، اسی درمیان میں ایک زرکار کنارے
کی ساری جس کی قیمت ملازم نہ بتا سکا تھا، اپنی عریاں ہاتھوں
پر رکھے ہوئے، اس کے رنگ اور اپنی جلد کی رنگت سے مطابقت
کا اندازہ کرتے ہوئے۔ میری طرف دیکھتی ہے، یعنی قیمت
دریافت کرنا چاہتی ہے، میں آگے بڑھکر گویا یہ دیکھنے کے لئے

کہ کس قیمت کی ساری ہے، اس کے کنارے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا کہ ایک حالت سرشاری میں اس کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لے لیا۔ وہ چونک سی پڑی میں بھی ہوش میں آگیا کہ یہ کیا غلطی ہوگئی۔ اور معذرت کے انداز میں کہنے لگا، دیوی معاف فرمائیگا۔ میں نے تو آپ کے ہاتھ کو ساری کا زرکار کنارہ سمجھا تھا، وہ یہ سنکر منفعلانہ زیر لب مسکرائی، سچ پوچھئے تو بجائے ساری کے میرے دل کا سودا ہو گیا۔ قیمت بتانے کے بعد میں نے اس کے پسند شدہ کپڑوں کو اکٹھا کرکے یکجائی قیمت کا تخمینہ لگا تو چار سو سترہ روپے ہوئے۔ کپڑوں کو اپنے طرف کرکے کہنے لگی "نوٹ کے بقیہ روپے جلد واپس کیجئے، وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "دیوی جی! آپ کے پاس کتنے کا نوٹ ہے؟" اس نے بانداز تعجب کہا۔ "آپ کے پاس۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں نے ایک ہزار کا نوٹ آپ کو ابھی دیا ہے"۔ یہ سنکر میں پریشان ہوا، گرد وپیش پر نظر ڈالکر کہا۔ "نہیں ابھی آپ نے نوٹ نہیں دیا ہے" میرا یہ کہنا تھا کہ وہ ذرا ترش لہجہ میں مگر نہایت سکون کے ساتھ "شاید آپ کہیں اور ہیں آپ کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرتی ہوں"۔ یہ کہتی ہوئی وہ دوکان سے اترکر تنتنی بل کھاتی تیزی کے ساتھ نمائش گاہ کے تھانے کی طرف چلی گئی، میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ کیا مصیبت آئی۔ چند منٹ کے بعد ایک پولیس کے داروغہ صاحب جو سرکاری طور پر نمائش گاہ کے انچارج تھے، اس دیوی کے ہمراہ چھپے ہوئے آئے اور بغیر مجھ سے کچھ دریافت کئے ہوئے، میرے بکس کو جسمیں دوکان کی کل آمدنی تھی فوراً مجھ سے لے لیا اور اس پر قفل لگاکر سربمہر کر دیا۔ پھر اسکو اپنے ساتھ تھانہ لے گئے دیوی جی نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے کل پسند کردہ کپڑے اٹھائے اور لیکر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں متحیر تھا اور منہ تک رہا تھا، میں ابھی اس خوشنما زہر کو حلق کے نیچے اتارنے کی کوشش کرہی رہا تھا کہ ایک کانسٹبل وارد ہوا اور کہنے لگا کہ ڈپٹی صاحب نے سلام دیا ہے۔ اچھا صاحب۔ تھانہ پہونچا، وہاں ڈپٹی صاحب ایک طویل رپورٹ جو دیوی جی نے میرے خلاف تحریر فرمائی تھی مجھے دیکھا کر کہنے لگے۔ بہتر یہی ہے کہ بقیہ روپے دیدیجئے، ورنہ خیانت مجرمانہ کے دفعہ چار سو چھ تعزیرات ہند کے چنگل میں آجائے گا، ثبوت کے طور پر کہنے لگے کہ وہ نوٹ جو آپ کو دیا گیا ہے، اس کا نمبر اسی رپورٹ میں درج ہے جو غالباً آپ کے کیش بکس میں ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے تین نوٹ کے نمبر اور مندرج کئے ہیں جو اس نوٹ کے نمبر کے ساتھ سلسلہ وار ہیں اور رپورٹ میں یہ بھی تحریر ہے کہ آج تین بجے شاہی خزانہ سے ایک چک کے عوض میں چار نوٹ پائے ہیں۔ لہذا ان کے نمبر دیوی جی کے نام کے ساتھ خزانچی کے رجسٹر میں ضرور درج ہوں گے۔ میں یہ ساری داستان سن رہا تھا اور خاموش تھا، پھر ڈپٹی صاحب نے فرمایا کہ آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ اس نے نوٹ نہیں دیا ہے؟ کہا "میرے پاس اسکا کوئی کاغذی ثبوت تو نہیں، البتہ میرا ملازم اسکا شاہد ہے۔

ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ بقیہ روپے دے دیجئے، ورنہ یہ رپورٹ آپ کے لئے زیادہ زحمت کا باعث بنے گی۔ اس پریشانی میں یہ بھول گیا تھا کہ آیا میرے بکس میں کوئی ایک ہزار کا نوٹ ہے بھی یا نہیں۔ (اگرچہ اس موقع عورت کا دیا ہوا ایک ہزار کا نوٹ بکس میں موجود تھا، جسے یہ بستی عورت اپنا نوٹ کہنا چاہتی تھی، اور یہ ایک جعل تھا، جو کالی اور گوری [illegible] عورتوں نے میرے ساتھ کیا تھا) میں نے کہا اچھا دیکھا جائے

کہ میرے بکس میں کوئی ایک ہزار کا نوٹ ہے بھی، ڈپٹی صاحب
نے کہا یہ دیکھنے کے لئے تو قفل کی مہر توڑنی پڑے گی، اگر آپ وعدہ
کیجئے کہ نوٹ نکل آنے کے بعد آپ روپیہ ادا کر دیجئے گا تو میں
بکس کھولوں ورنہ یہ بکس صرف ایک مجسٹریٹ کی اجلاس میں
کھولا جائے گا، میں نے وعدہ کیا کہ اگر اس میں ایک ہزار کا نوٹ
ہوگا تو مطلوبہ روپے ادا کر دونگا۔ بکس کھولا گیا۔ ایک ہزار کا نوٹ
اس میں موجود تھا، اب میں کیا کہتا۔ چپ تھا، اور سوچ رہا تھا کہ
کیا کہوں۔

ڈپٹی صاحب بولے "اب"

میں دم بخود تھا۔ ڈپٹی صاحب نے ذرا ترش لہجہ میں
کہا۔ "اس خاموشی کا کیا مطلب ہے"

میں نے کہا۔ "نوٹ کا نمبر اس نمبر سے ملایا جاوے
جو رپورٹ میں تحریر ہے" نمبر ملایا گیا عدد بعدد صحیح تھا، میں پھر
خاموش ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر کیا کہوں، ڈپٹی صاحب
نے پھر اسی ترش انداز میں کہا۔ "اگر آپ کی خاموشی کا مطلب
روپیہ ادا کرنے کے علاوہ کچھ اور ہو تو جلد مطلع کیجئے، تاکہ قانونی
کارروائی شروع کی جائے .... (طنزیہ انداز میں)
محترم میرے پاس اسقدر وقت نہیں جتنا کہ آپ کو درکار ہے"

میں نے کہا۔ "اچھا اتنی مہلت میں اور چاہتا ہوں کہ
کل صبح شاہی خزانہ کے مہتمم سے یہ دریافت کر لیا جاوے کہ آیا
یہ چار نوٹ جن کے سلسلہ وار نمبر رپورٹ میں درج ہیں یہ
نوٹ دیوی جی کو آج دیئے گئے تھے، اگر وہاں سے بھی اثبات
میں جواب موصول ہوگا، تو کل روپیہ ضرور ادا کر دونگا"

ڈپٹی صاحب نے بات معقول سمجھکر مان لی، دوسرے
دن قریب دو بجے ڈپٹی صاحب نے ایک کانسٹبل سے مجھے اپنے
بنگلے پر بلوا بھیجا۔ وہاں پہونچا تو مہتمم خزانہ کا خط موجود تھا جس میں
ان نوٹوں کے نمبروں کی تصدیق تھی، اب میرے پاس کوئی
صورت نہ تھی، سوا اس کے کہ روپیہ چپکے سے ادا کر دوں۔
لہذا تھانہ پر سے روپیہ کا بکس منگوایا گیا۔ اس میں سے قریب
چھ سو روپے ڈپٹی صاحب کو پیش کیا۔ انہوں نے میرے سامنے
کل روپیہ اور ایک خط لکھکر ایک سپاہی کو حوالہ کیا کہ وہ
دیوی جی کی کوٹھی پر ان کو دے آوے۔ غرض اس طرح یہ
معاملہ رفع دفع کیا گیا۔

اگرچہ میری دوکان کا ایک حصہ اس کی نذر ہوگیا، لیکن
میں آج بھی اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ اس نے میری تباہیاں
بہت ارزاں قیمت پر حاصل کیں۔ اور اس شوق نظر کے جرمانہ
کے باوجود۔" دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو"

خوش انجام

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شکسپیر کے مشہور ڈرامہ tuwelfthnight کا اردو ترجمہ

(مترجمہ)

جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم۔ اے

(۵)

(سر اینڈر وایگو چیک داخل ہوتے ہیں)

سر اینڈرو۔ یہ میرا چیلنج ہے، پڑھو، کیا ہی مصالحہ دار ہے ×

سر ٹوبی۔ مجھکو دو، "نوجوان، تو کوئی بھی ہو، لیکن تو ایک بدتمیز شخص ہے"

فیبین۔ خوب شاباش،

سر ٹوبی۔ "تعجب مت کر کہ میں تجھکو کیوں اس نام سے پکار رہا ہوں، میں وجہ نہیں بتاؤنگا۔

فیبین۔ واللہ یہ قانون کی زد سے بھی محفوظ ہے۔

سر ٹوبی۔ تو لیڈی اولیویا کے ہاں آتا ہے۔ اور وہ میرے سامنے تجھ پر نوازشیں نچھاور کرتی ہے"

فیبین۔ بہت مختصر لیکن بہت معقول ہے۔

سر ٹوبی۔ "تو جب گھر جائیگا۔ تو میں تجھپر وار کروں گا، اور اگر تو مجھے ماریگا"

فیبین۔ خوب!

سر ٹوبی۔ "تو ایک لچے بدمعاش کی طرح ماریگا"

فیبین۔ قانون کی گرفت میں بھی یہ نہیں آسکتا۔

سر ٹوبی۔ "خدا تجھ پر رحم کرے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی روح پر اللہ رحم کرے۔ وہ مجھ پر رحم کرسکتا ہے اور مجھے زیادہ امید ہے، اس لئے اپنی فکر کر۔ تیرا دوست اور تیرا جانی دشمن۔ اینڈر و ایگو چیک"

بس یہ خط جنبش میں لانے کے لئے کافی ہے۔ میں ہی یہ خط اسکو دونگا۔

میریا - موقع بھی اچھا ہے، وہ ابھی میری مالکہ سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور جلد روانہ ہوگا۔

سرٹوبی - سرانیڈرو جاؤ اور باغ کے گوشہ پر اس کا انتظار کرو دیکھتے ہی تلوار نکالو۔ اور تلوار نکالتے ہی قسم کھانے لگو اس لئے کہ خوفناک قسم بعض دفعہ شجاعت کا ثبوت دیتی ہے بجاؤ۔

سرانیڈرو - یہ سب کام میں اکیلا کر لونگا۔

(چلا جاتا ہے)

سرٹوبی - میں یہ خط نہیں دونگا۔ اس نوجوان کی شکل وصورت سے شائستگی اور تربیت کے آثار ظاہر ہیں۔ وہ ڈیوک کا پیغام لیکر میری بھتیجی کے پاس آتا ہے۔ یہ بھی اسکی شرافت نسب کا ثبوت ہے۔ یہ خط حماقتوں سے مملو ہے۔ وہ خوفزدہ نہ ہوگا بلکہ یہ سمجھے گا کہ کسی احمق کا لکھا ہوا ہے۔ میں اس کا چیلنج زبانی سنا دوں گا۔ ایگوچیک کی شجاعت سے آگاہ کر دونگا اور اس کے غصہ اور اسکی ہوشیاری کا ڈنکا بجا دونگا۔ دونوں ایک دوسرے سے اتنا خوف کھائینگے کہ اژدہا کی طرح دونوں ایک دوسرے کو اپنی نگاہ سے مار ڈالیں گے۔

فیبین - وہ دیکھو۔ وہ تمہاری بھتیجی کے ساتھ آرہا ہے۔

(سرٹوبی، فیبین اور میریا چلے جاتے ہیں)

اولیویا۔ وایلا کے ساتھ داخل ہوتی ہے

اولیویا - اے سنگدل شخص، میں نے اپنا دل کھول کر رکھدیا ہے۔

وایلا - میرا مالک بھی تمہاری ہی طرح درد دل میں مبتلا ہے۔

اولیویا - میری خاطر اس ہیرے کو زیب گلو کیجئے، یہ میری تصویر ہے۔ اس سے انکار نہ کیجئے، یہ بے زبان ہے آپ کو تنگ نہیں کرے گی۔ کل پھر آئیے۔ آپ مجھ سے کچھ بھی مانگئے میں ہرگز انکار نہ کروں گی۔

وایلا - میں صرف ایک چیز کا طلبگار ہوں۔ میرے آقا کو دل دیجئے۔

اولیویا - جو چیز میں آپ کو دے چکی ہوں وہ آپ کے آقا کو کیونکر دے سکتی ہوں۔

وایلا - میں تمہیں معاف کر دونگا۔

اولیویا - اچھا کل پھر آنا۔

(چلی جاتی ہے)

سرٹوبی بلش اور فیبین داخل ہوتے ہیں۔

سرٹوبی - خدا آپ کو سلامت رکھے۔

وایلا - اور آپ کو بھی۔

سرٹوبی - معلوم آپ نے اس کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ خونخوار شخص باغ کے گوشہ میں کھڑا ہوا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ تیار ہو جائیے اس لئے کہ آپ کا حریف بہت تیز، چالاک اور خونخوار ہے۔

وایلا - آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی آدمی مجھ سے خفا نہیں ہے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔

سرٹوبی - میری باتوں پر یقین کیجئے اور اپنی جان بچائیے آپ کا مخالف جوانی، طاقت، چالاکی اور غصہ ان تمام حربوں سے مسلح ہے۔

وایلا - جناب وہ کون ہے۔

سرٹوبی - لڑائی جھگڑے میں تو وہ ابلیس ہی ہے۔ اس نے تین روحوں کو جسم سے علحدہ کیا ہے۔ اور اسوقت

اس کی خفگی کا یہ عالم ہے کہ بغیر جان لئے اس کو تسکین ہو نہیں سکتی۔

وایلا ۔ تو میں لیڈی اولیویا سے التجا کروں گا۔ کہ کسی محافظ کے ساتھ مجھے گھر بخیریت تمام پہونچا دیا جائے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ لڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں تاکہ دوسروں کی شجاعت کا امتحان لیں، یہ اسی قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

سر ٹوبی ۔ اس کی خفگی کسی معقول وجہ سے ہے۔ آپ کو اس سے ملے بغیر جانا نہیں ہوگا۔ میں اپنے ساتھ آپ کو لے جاؤں گا۔ اور آپ اس کے الزامات کا جواب دیجئے گا۔

وایلا ۔ یہ تو عجیب واقعہ ہے۔ از راہ کرم اس شخص سے میرا قصور دریافت کیجئے، اگر مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے تو بالقصد نہیں بلکہ میری غفلت سے۔

سر ٹوبی ۔ اچھا میں دریافت کرتا ہوں۔ مسٹر فبین جب تک میں واپس نہ آؤں انکے ساتھ رہو۔

(چلا جاتا ہے)

وایلا ۔ آپ اس کی کچھ خبر رکھتے ہیں؟

فبین ۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ بیحد خفا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مجھکو خبر نہیں۔

وایلا ۔ آخر یہ کس قسم کا آدمی ہے،

فبین ۔ دیکھنے میں تو کوئی بہت شجاع نہیں معلوم ہوتا ہے، مگر الیریا کے طول و عرض میں اس کے ایسا چالاک اور خونخوار انسان ملنا مشکل ہے۔ چلئے اس کے پاس اگر ممکن ہو تو میں مصالحت کرا دونگا۔

وایلا ۔ میں آپ کا بیحد ممنون ہونگا۔ میرا لڑائی جھگڑے میں جی نہیں لگتا ہے۔ (دونوں چلے جاتے ہیں)

سر ٹوبی اور سر اینڈرو داخل ہوتے ہیں

سر ٹوبی ۔ ارے بھئی۔ وہ بڑا ہی ابلیس ہے، ایسا شخص تو میں نے دیکھا نہیں، میں نے اس سے مقابلہ کیا تو اس نے شمشیر ایسا خوفناک وار کیا کہ بیان سے باہر ہے، لوگ کہتے ہیں کہ وہ فن سپہ گری میں شاہ ایران کا معلم رہ چکا ہے۔

سر اینڈرو ۔ وہ جہنم میں جائے۔ میں اس سے مقابلہ نہیں کروں گا۔

سر ٹوبی ۔ لیکن اب اس کو روکنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ فبین بھی اسکو نہیں روک سکے گا۔

سر اینڈرو ۔ اگر مجھے اس کی شجاعت کی خبر پہلے ہوتی تو ہرگز اسکو چیلنج نہیں دیتا۔ اگر وہ رک جائے تو میں اپنا گھوڑا اس کو دے دوں۔

سر ٹوبی ۔ میں سب بات ٹھیک کر دیتا ہوں، تم یہیں کھڑے رہو (جی میں) تمہارے گھوڑے پر اور تم پر دونوں پر سوار ہونگا۔

(فبین وایلا کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

اس جھگڑے کو چکانے میں میں اس کا گھوڑا لوں گا۔ میں نے اس سے کہدیا ہے کہ نوجوان بالکل ابلیس ہے،

فبین ۔ وہ بھی اس سے بہت ڈرا ہوا ہے خوف سے زرد ہو رہا ہے، اور ایسا زرد ہو رہا ہے جیسے کہ کوئی ریچھ اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

سر ٹوبی ۔ جناب کوئی چارہ نہیں ہے اس نے قسم کھائی ہے کہ آپ سے لڑنگا آپ سے باز نہیں آئیگا تلوار نکال لیجئے وہ کہتا ہے کہ یکطرفہ نہیں لڑیگی

انٹونیو ۔ ذرا مجھکو بولنے دیجئے، جس نوجوان کو آپ دیکھ رہے ہیں اسکو میں نے موت کے پنجہ سے رہا کیا اور اس کے ساتھ میرا سلوک بہت نرمی اور تلطف کا رہا۔

پہلا افسر ۔ تو اس سے ہم لوگوں کو کیا، وقت گذر رہا ہے چلو،

انٹونیو ۔ یہ شخص کیسا احسان فراموش ہے! سیبیسٹین تجھکو شرم نہیں آتی، تجھ سے ہرگز ایسی امید نہ تھی!

۔ یہ شخص پاگل ہو رہا ہے، اسکو لے چلو۔

۔ مجھکو لے چلیئے۔ (افسر اور انٹونیو جاتے ہیں۔)

وایلا ۔ اس شخص کی باتوں میں صداقت کا جز معلوم ہوتا ہے، کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ رہا ہے کہ میں سیبیسٹین ہوں، خدا کرے میرا بھائی بچ گیا ہو۔

سرٹوبی ۔ سر اینڈرو، ادھر آؤ۔ اور فیبین تم بھی آؤ، ہم لوگ پند و نصیحت کے ایک دو شعروں پر بحث کریں۔

وایلا ۔ اس نے سیبیسٹین کا نام لیا، میرا بھائی بالکل میرا ہمشکل ہے اور اس کا لباس وغیرہ بھی بالکل میرے ہی ایسا تھا، اگر یہ بات سچ ہو تو سمندر طوفان لو آپ نے مجھ پر رحم کیا (چلی جاتی ہے)

چوتھا ایکٹ

پہلا سین ۔ اولیویا کے مکان کے پاس والی سڑک

سیبیسٹین اور مسخرہ داخل ہوتے ہیں

مسخرہ ۔ میں آپ کو بلانے کے لئے آیا ہوں۔

سیبیسٹین ۔ جا بھی احمق۔

مسخرہ ۔ اچھا تو یہ سمجھئے کہ میں آپ کو نہیں جانتا ہوں، میری مالکہ نے مجھکو آپ کے پاس اس لئے نہیں بھیجا ہے۔ کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ وہ آپ کو کچھ بات کرنے کے لئے بلا رہی ہیں۔ اور آپ کا نام سینر سیریو نہیں ہے اور یہ میری ناک نہیں ہے؛

سیبیسٹین ۔ جا اور اپنی حماقت کہیں اور دکھا۔ تو مجھکو نہیں جانتا ہے،

مسخرہ ۔ حماقت! یہ لفظ کسی بڑے آدمی سے سن لیا ہے، اور مجھپر اس لفظ کو چپکایا جا رہا ہے۔ اپنی مالکہ سے جا کر یہ کہدوں کہ آپ آ رہے ہیں۔؟

سیبیسٹین ۔ میرے سامنے سے چلا جا، یہ کچھ روپیہ تیرے لئے ہے، اور اگر تو ٹھہرا تو تیری خیریت نہیں۔

مسخرہ ۔ قسم ہے کہ آپ سخی آدمی ہیں۔ جو مسخروں کو روپیہ دیتے ہیں۔ ان کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے۔

سر اینڈرو داخل ہوتے ہیں۔

سر اینڈرو ۔ پھر ملاقات ہو ہی گئی۔ تو یہ لے (سیبیسٹین کو مارتا ہے) تو تو بھی لے یہ لے، یہ لے، یہ لے (سر اینڈرو کو مارتا ہے)

سرٹوبی اور فیبین داخل ہوتے ہیں۔

سرٹوبی ۔ ٹھہر جائیے ٹھہر جائیے جناب! نہیں تو آپ کا خنجر مکان کے اوپر پھینک دوں گا۔

مسخرہ ۔ تو میں جا کر مالکہ سے کہدونگا۔ (چلا جاتا ہے)

سرٹوبی ۔ (سیبیسٹین کو پکڑ کے) آئیے، رک جائیے۔

سر اینڈریو۔ اسکو چھوڑ دیجیئے میں دوسری ترکیب کروں گا۔ اگر الیریا
میں آئین یا قانون کا راج اب تک ہے تو میں اسپر
مار پیٹ کا مقدمہ لاؤں گا۔ اگرچہ پہلا وار میں نے
کیا مگر اس سے کیا؟

سیبیسٹین۔ ہاتھ چھوڑ،

سر ٹوبی۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گا میرے نوجوان سپاہی
سیدھے ہو جاؤ، بدن پر گوشت بھی خوب چڑھا ہوا ہے۔

سیبیسٹین چھوڑ بھی (چھڑا کر) تو کیا چاہتا ہے۔ ہمت ہے تو تلوار نکال،

سر ٹوبی۔ کیا بھلا، میں ابھی تیرا خون بہا کر تجھے گستاخی کا مزہ چکھاتا
ہوں (تلوار نکال نکال لیتا ہے)

اولیویا داخل ہوتی ہے۔

اولیویا۔ ٹھہر ٹھہر ٹوبی، میں تجھے تیری جان کی قسم دیتی ہوں
کہ رک جا۔

سر ٹوبی۔ کیا ارشاد ہوتا ہے،

اولیویا۔ کیا ہمیشہ تیرا یہی رنگ رہیگا۔ اطوار نا آشنا وحشی
میری نظر سے دور ہو، پیارے سیزیریو، آپ ناراض
نہ ہوں، گستاخ بیان سے دور ہو جاؤ،
(سر ٹوبی سر اینڈریو اور فیبین چلے جاتے ہیں)
میرے پیارے دوست آپ عقل سے کام لیں اور ا
لوگوں کی بدسلوکی کا خیال نکریں، آئیے میرے ساتھ میرے
آئیے اور دیکھئے کہ اس کمینے نے اپنی شرارتوں سے کتنی
کو ملیا میٹ کر دیا ہے، تب آپ اس کی حماقت پر مسکرائینگے
چلنا ہی ہوگا، انکار نہ کیجئے۔

سیبیسٹین۔ یہ کیا واقعہ ہے؟ میں پاگل ہو گیا ہوں یا کوئی خواب
رہا ہوں۔

اولیویا۔ میری التجا کو رد نہ کریں کاش آپ میری کہنے کے مطابق

سیبیسٹین۔ اچھا میں آتا ہوں،

اولیویا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

دوسرا سین۔ اولیویا کے گھر میں ایک کمرہ

میریا اور مسخرہ داخل ہوتے ہیں۔ میلوولیو ایک اندھیری کوٹھری میں،

میریا۔ یہ چوغہ پہن لے اور ڈاڑھی لگا لے، اسکو یقین دلا کر
تو سر ٹوپس نامی پادری ہے، جبتک میں سر ٹوبی کو
بلاتی ہوں (چلی جاتی ہے)

مسخرہ۔ اچھا، میں پہن لونگا اور بھیس بدل لونگا، اگرچہ اس
کام کے لئے میں کافی لمبا نہیں ہوں اور نہ اتنا دبلا ہوں
کہ لوگ مجھے ایک ہونہار طالب علم سمجھیں۔
سر ٹوبی بیلچ اور میریا داخل ہوتے ہیں

سر ٹوبی۔ پادری صاحب، آپ پر خدا کی رحمت ہو،

مسخرہ۔ پراگ کے بوڑھے سادھو نے شاہ گور بوڈک کی
سے خوب ہی کہا تھا، کہ جو چیز ہے وہ ہے، اور میں
پادری ہوں، اسلئے پادری ہوں، اور That سوا
That کے اور Is سوائے Is کے اور کیا ہو
سکتا ہے

سر ٹوبی۔ سر ٹوپس اس کے پاس جاؤ۔

مسخرہ۔ رحمت ہو تجھپر اس قید میں۔

سر ٹوبی۔ غریب خوب نقل کرتا ہے۔

میلوولیو۔ (اندر سے) کون پکارتا ہے۔

مسخرہ۔ سر ٹوپٹس نامی پادری پاگل میلوولیو کو دیکھنے کو آیا ہے۔

میلوولیو۔ سر ٹوپس، اچھے سر ٹوپس، میری مالکہ کے پاس جائیے،

مسخرہ۔ مردود بھوت پلیت! تو کیوں اس آدمی کو تنگ کرتا ہے سوائے عورتوں کے اور کسی چیز کا تذکرہ ہی نہیں کرتا ہے۔

میلوولیو۔ (اندر) سر ٹوپس۔ میرے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے، میں پاگل نہیں ہوں، اور لوگوں نے مجھکو ایسی خوفناک تاریکی میں ڈال دیا ہے۔

مسخرہ۔ مردود شیطان! میں تیرے ساتھ نرمی کا سلوک کر رہا ہوں، تو کہتا ہے کہ مکان تاریک ہے؟

میلوولیو۔ مثل دوزخ کے،

مسخرہ۔ یہ کیا بول رہا ہے؟ یہ ہرگز تاریک نہیں ہے۔

میلوولیو۔ سر ٹوپس، میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ مکان درحقیقت تاریک ہے۔

مسخرہ۔ پاگل! تو غلطی میں ہے، سوائے جہالت کے دنیا میں کوئی تاریکی نہیں ہے، اور تو اس تاریکی میں ملوث ہے۔

میلوولیو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ مکان تاریک ہے، اور میرے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے، اگر آپ پاگل نہیں ہیں تو میں بھی نہیں ہوں، کوئی سوال پوچھکر اس کا امتحان کر لیجئے۔

مسخرہ۔ جنگلی مرغوں کے متعلق فیثاغورث کا کیا خیال ہے۔

میلوولیو۔ وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی دادیوں کی روح ایک چڑیا کے اندر حلول کر سکتی ہے۔

مسخرہ۔ اس کے اس عقیدے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

میلوولیو۔ روح کو میں ایک لطیف چیز سمجھتا ہوں، اس لئے اس کی رائے کو پسند نہیں کرتا ہوں۔

تو تاریکی میں پڑا رہ قبل اس کے کہ میں تجھکو عقلاً چنگا کردوں تجھ کو فیثاغورث کے عقیدہ کو ماننا پڑے گا اور تو ایک جنگلی مرغ کو بھی مارنے سے ڈریگا کہ شاید اس کے اندر تیری دادی کی روح ہو۔

میلوولیو۔ سر ٹوپس! سر ٹوپس،

سر ٹوبی۔ واہ جی سر ٹوپس،

میریا۔ اس ڈاڑھی اور اس چوغہ کی بھی ضرورت نہ تھی، اس لئے کہ تو اسکو نظر آتا ہے؟

سر ٹوبی۔ اس سے اپنی اصلی آواز میں بولو اور مجھکو آکر اس کا حال کہو۔ اب اس شرارت کا خاتمہ ہونا چاہئے ہم لوگوں کی خیریت اسی میں ہے کہ اس تماشا کا خاتمہ بالخیر ہو جائے۔

سر ٹوبی اور میریا چلے جاتے ہیں

مسخرہ (اپنی آواز میں ایک بیت پڑھتا ہے)

کہو کہو، خوش مزاج آدمی
تمہاری لیڈی (معشوقہ) کیسی ہے؟

میلوولیو۔ مسخرے!

مسخرہ۔ میری لیڈی (معشوقہ) بے رحم ہے۔

میلوولیو۔ ارے مسخرے!

مسخرہ۔ افسوس! وہ ایسی کیوں ہے۔

میلوولیو۔ مسخرے! میری بات تو سن۔

مسخرہ۔ وہ دوسرے سے محبت کرتی ہے یہ کون پکار رہا ہے؟

میلوولیو۔ اچھے مسخرے، میں تمکو صلہ دونگا۔ مجھے ایک شمع، قلم دوات اور کاغذ لا دے میں ایک شریف زادہ ہوں، اور تیرا ممنون رہوں گا۔ (باقی آیندہ)

ادبیات

جذباتِ مبارک

از

حضرت مبارک عظیم آبادی

قصورِ اپنا ہے باندھا شاخِ گل پر آشیاں ہم نے
گرائی اپنے گھر پر آپ بجلی آسماں ہم نے

سنایا ہائے کس کو قصۂ دردِ نہاں ہم نے
بنایا اور بھی اُس بدگماں کو بدگماں ہم نے

شبِ غم کا سحر ہونا نہ ہونے کے برابر ہے
بہت دیکھے ہیں نیرنگِ فریبِ آسماں ہم نے

فروغِ مشربِ رندانہ دیکھیں دیکھنے والے
بہت آباد دیکھی مے فروشوں کی دکاں ہم نے

ہمیں تم نے بہت پرکھا تمہیں ہم نے بہت جانچا
لئے ہیں امتحاں تم نے دئے ہیں امتحاں ہم نے

جب آتی ہے کوئی آفت خدا کا نام لیتے ہیں
لگا رکھی ہے کیا رد بلائے آسماں ہم نے

مبارکؔ ان کو لکھ لو تم یہ لکھ لینے کی باتیں ہیں
نہ دیکھی اس گلستاں میں بہارِ بے خزاں ہم نے

"موجِ تخیل"

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب بی ۔ اے ڈپٹی مجسٹریٹ گیا

مری ہستی نہ جبتک ہوش سے بیگانہ ہو جائے
کہاں ممکن کہ دیدارِ رخِ جانانہ ہو جائے

جہاں ہم تم ملیں فردوس وہ ویرانہ ہو جائے
پئیں مے جس جگہ وہ رشکِ صد میخانہ ہو جائے

مری ہستی جو نذرِ نرگسِ مستانہ ہو جائے
بنے جو ظرف میری خاک سے پیمانہ ہو جائے

مری چشمِ تصور کاش اتنی مشق پیدا کر
کہ دل پر مرتسم نقشِ رخِ جانانہ ہو جائے

میں بیتابِ تمنا ہوں وہ مجبورِ تماشا ہیں
کہیں رازِ محبت بزم میں رسوا نہ ہو جائے

نقابِ رخ سرکتی ہی کہ بجلی سی چمکتی ہے
نظر ہو کیوں نہ خیرہ کیوں نہ دل دیوانہ ہو جائے

نگاہِ تند پھر پڑ جائے کاش ایجاں مرے دل پر
شرابِ تلخ سے بھر نے پھر پیمانہ ہو جائے

فدا وہ شمع پر ہو میں نثار روئے تاباں ہوں
مری ہمت جواب ہمتِ پروانہ ہو جائے

اسی حسرت میں شب بھر رہتی ہی بیچین بینائی
کہ وہ جانِ تمنا زینتِ کاشانہ ہو جائے

خلش افزائے غم ہے چھیڑ انکے تیرِ مژگاں کی
الٰہی جاوداں یہ عشوۂ ترکانہ ہو جائے

پہونچ جاتے مرا دست تمنا اس کے دامن تک
اگر تیرا کرم اے جرأت رندانہ ہو جائے

ہے میری داستانِ دل بھی کوئی داستاں لیکن
سنو گر شوق سے افسانہ در افسانہ ہو جائے

ولی اک اور بھی پڑھ دے غزل جوشِ محبت میں
کہ ہر ہر شعر جس کا نعرۂ مستانہ ہو جائے

اگر دل بے نیاز کعبہ و بت خانہ ہو جائے
تجلی ریز ہر سو صورتِ جانانہ ہو جائے

ادھر بھی اک نظر اے نرگسِ مستانہ ہو جائے
پلا وہ مے کہ دل مستغنیِ میخانہ ہو جائے

گروں مستی میں سو سو بار خم سے ٹھوکریں کھا کر
نمازِ عاشقی ہر لغزشِ مستانہ ہو جائے

تمہیں ہو حاصلِ دنیا تمہیں سرمایۂ عقبےٰ
تمہیں پا کر یہ دل کونین سے بیگانہ ہو جائے

تجلی کی یہ بارش اور مری حیرت کا یہ عالم
کہیں جلوہ نقابِ جلوۂ زیبا نہ ہو جائے

شرابِ خام کو جامِ محبت پختہ کرتا ہے
مرے دل میں غمِ دنیا غمِ جانانہ ہو جائے

نہ بتخانہ کے لائق ہے نہ کعبہ ہی کے قابل ہے
نہ دل جبتک خرابِ نرگسِ مستانہ ہو جائے

مری ہستی حجابِ یار ہے راہِ محبت میں
یہ پردہ گر اٹھے نظارۂ جانانہ ہو جائے

ولی گر ابر تقابر دوشِ اشک دیدۂ تر ہے
یقیں ہے قطرہ قطرہ اک دلِ دیوانہ ہو جائے

تبرکات امداد

از حضرت امداد عظیم آبادی یادگار شاد عظیم آبادی

بھرا کچھ رنگ ایسا اس مری تصویر فانی میں　　کہ سو سو پڑ گئے رخنے حیاتِ جاودانی میں

جو رکھا تھی عدم سے آ کے پھر معدوم ہوتا ہے　　فنا مضمر ہے ای ہستی تری اس میہمانی میں

اسی نے ہم کو بلوا کر جگہ دی خاص خلوت میں　　تمہیں الجھا کے موسیٰ جس نے رکھا لن ترانی میں

حبابوں نے بتایا آ کے اندازے کو قصے کے　　کہ دیر اتنی لگی بحر جہاں کی میہمانی میں

خدا کے واسطے ای روح اتنا بھی تو بتلا دے　　ہوئی صحبت نشیں تو جا کے کس کے حرم نہانی میں

ذرا تھمتا نہیں بیڑا ہماری عمر فانی کا　　بلا کی ہے کشش بحر عدم تیری روانی میں

قبائے عاریت پہنے ہوئے ہر گل چمن میں تھا　　اُتروا لی خزاں نے آ کے بزم میہمانی میں

بچشم غور دیکھے کوئی ترتیب عناصر کو　　تماشہ ہے کہ پانی آگ میں ہے آگ پانی میں

بہار جاودانی کو بری رکھا تغیر سے　　لگاتے داغ وہ کیوں کر کمالِ باغبانی میں

صدائے گفتگوئے دوست ہی لہجہ میں قاصد کے　　نرالا لطف یہ پاتا ہوں پیغام زبانی میں

لی شمشیر ابرو سے نظر اور لگ گئے چرکے　　کماں یہ کاٹ یہ جوہر ہی تیغ اصفہانی میں

فدا امداد کی ہو جان ہر ہر تار پر اس کے

قناعت کا تھا خیمہ جس قبائے ارغوانی میں

جمالیاتِ صبر

از ۔ جناب سید بدرالدین احمد صاحب صبر سریری مخدوم آبادی

مستی نگاہِ ناز کی کیف شباب میں
جیسے کوئی شراب ملادے شراب میں

ہم سے غریق بحرِ تحیر کو کیا ..... خبر
دریا میں ہے حباب کہ دریا حباب میں

بخوت ہماری نشۂ غفلت کی ہے دلیل
پوشیدہ بے خودی ہے خودی کی نقاب میں

ایک ایک داغ دل کا ہے ایک ایک داستاں
ہے سرگذشتِ عمر لکھی اس کتاب میں

کب سے پڑی ہے عشق کی بنیاد کیا کہیں
حسنِ ازل تھا پردۂ شرم و حجاب میں

ایک ایک ذرہ برقِ سرِ کوہِ طور ہے
کس کا ہے عکس آئینۂ آفتاب میں

ہم ایسی زندگی کو بھلا لیکے کیا کریں
ایک ایک لمحہ جس کا کٹے اضطراب میں

دنیا میں رہ کے لذتِ دنیا سے احتراز
واعظ تو جیتے جی ہے پڑا اک عذاب میں

کیجئے گناہ کھل کے فرشتے لکھیں گے کیا
باقی کہیں جگہ بھی ہے فردِ حساب میں

اے تشنگی شوق یہ تیرا قصور ہے
آتی نہ کیوں نگاہ فریبِ سراب میں

کیا رازِ زندگی کا کھلے زندگی میں صبر
تعبیر خواب کی کہیں ملتی ہے خواب میں

مقالات

بہار کی عام زبان

از: جناب شاہ مقبول احمد صاحب ایم اے

تین بولیاں صوبہ بہار میں تین بولیاں رائج ہیں۔ مغربی بہار میں بھوجپوری، شمالی بہار میں میتھلی اور جنوبی بہار میں مگہی عام طور پر مستعمل ہے۔ لسانی حدود کی وجہ سے ان بولیوں کے الگ الگ احاطے قائم ہو گئے ہیں۔ یہ تینوں بولیاں مگدھی پراکرت کی بیٹیاں ہیں اس لئے آپس میں بہت کچھ مشابہت رکھتی ہیں۔ لب و لہجہ اور تلفظ کے علاوہ ایسے عناصر کافی ہیں جو یکساں طور پر تینوں بولیوں میں مشترک ہیں۔ ادبی سرمایہ کے اعتبار سے بھوجپوری میں دو ایک نظمیں بتائی جاتی ہیں۔ مگہی میں بائیبل کے ترجمہ کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ میتھلی میں شعر و ادب کا ذخیرہ موجود ہے۔ مشہور شاعر ودیاپتی کے علاوہ اور بھی نامور شعراء کے کلام اس میں پائے جاتے ہیں[۱]۔

باوجودیکہ یہ تینوں بولیاں (بھوجپوری، مگہی اور میتھلی) سگی بہنیں ہیں اور آپس میں اسقدر مشابہت رکھتی ہیں کہ ایمیں سے کوئی ایک بولی (اگر کسی زمانہ میں ایسا خیال عام ہوتا) صوبہ کی عام بولی بن سکتی تھی، مگر ایسی تحریک کے لئے حالات کبھی موافق نہ تھے اس لئے دائرۂ اثر کے لحاظ سے یہ بولیاں محض چند ضلعوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئیں۔ زمانۂ قدیم میں جبکہ وسیع المشربی کے بجائے عام اہل ہند کا رجحان تنگ نظری، کم آمیزی اور چھوت چھات کی طرف تھا یہ ممکن نہ تھا کہ ایک پورے علاقہ کو اپنا ہم زبان بنانے کے لئے ایک جماعت کشادہ دلی سے کام لیکر اپنا دائرہ وسیع کرتی اور دوسری جماعتیں اپنی مخصوص بولیوں کی موجودگی میں ایک نئی بولی کو اضافہ کے طور پر قبول کر کے دور اندیشی اور بلند نظری کا نمونہ پیش کرتیں۔ آج جبکہ یہ قدیم خیالات کسی قدر ماغوں سے محو ہو گئے ہیں اور کم آمیزی کے بجائے وسیع المشربی کی صدائیں کانوں میں کبھی کبھی آتی رہتی ہیں اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس خیال کی تخم ریزی کے لئے مناسب زمین اور موافق آب و ہوا تیار ہو رہی ہے۔ مگر اس وسیع المشربی کے پیچھے پیچھے جدید نظریۂ قومیت اپنی مخصوص تنگ ذہنی اور حدود پسندی کے تمام حربے لئے ہوئے ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے جو اس راہ میں سدِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں بھوجپوری کو مرتب جائزہ زبان ہند گیریرسن ( ) نے کافی سراہا ہے۔ اور خود بھوجپوری بولنے والے بھی اس امر کے مدعی ہیں کہ مغربی بہار کے علاوہ اس بولی (بھوجپوری) کی حدیں بنارس، اور گورکھپور کمشنریوں کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں وہیں یہ منظر

بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے کہ میتھلی بولنے والے اپنی جماعتی برتری و فوقیت کو حسب روایات زیادہ سے زیادہ زندہ اور نمایاں کرنے میں منہمک ہیں اور اپنی مخصوص زبان اور تہذیب کے وجود کے لئے اپنی بعض قومی مصلحتوں کے خلاف ہندی ساہتیہ سمیلن والوں کی ناراضی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ۔

چوتھی بولی ان حالات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صوبہ کی تینوں بولیاں محض مقامی ہیں ان کا رواج چند ضلعوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے ۔ ان بولیوں میں سے کوئی بولی ایسی نہیں جو صوبہ کے سامنے طول و ارض میں بولی جاتی ہو ۔ اب یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ آخر مختلف لسانی علاقوں کے باشندے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو پھر کونسی زبان استعمال کرتے ہیں ؟ عام زبان کا فرض ادا کرنے کے لئے کونسی زبان ہمارے صوبہ میں کام آتی ہے ؟ اس فرض کی انجام دہی کے لئے ایک چوتھی بولی موجود ہے جس کا وجود اس صوبہ میں (مدعیان ہندی) ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد اور ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے عالم وجود میں آنے سے بھی بہت پہلے سے پایا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو مدت دراز سے عام طور پر اردو کہتے ہیں ۔ چونکہ بہار کی تینوں بولیوں (بھوجپوری، مگہی اور میتھلی) میں سے کسی ایک کو بھی صوبہ کی عام زبان ہونے کا دعوے نہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اردو کو ان سے ٹکرانے کی نہ پہلے ضرورت تھی اور نہ آج ہے ۔

پچھمی بولی یا اردو اردو مغربی ہند یعنی اطراف دہلی کی رہنے والی ہے اور صوبہ بہار مشرقی ہند میں واقع ہے ۔ اس لئے ہم اپنے پوربی علاقہ (صوبہ بہار) میں اس بولی کو پچھمی بولی کہہ سکتے ہیں ۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ یہ پچھمی بولی (اردو) پورب کے علاقہ میں سینکڑوں میل طے کر کے کب اور کیونکر آئی ۔ کس بھیس میں آئی اور آج کس شکل میں رائج ہے ؟ یعنی اردو کی شکل میں یا ہندی کے روپ میں ؟

سب جانتے ہیں کہ اس پچھمی بولی کو سارے ہندوستان میں روشناس کرنے والے مسلمان (فوج، لشکر، صوفی اور فقیر) ہیں ۔ اگر مسلمان اس بولی کو منہ نہ لگاتے اور اطراف ہند میں جس سمت بڑھتے وہیں کی مقامی بولیاں اختیار کر لیتے تو یہ پچھمی بولی آج پنجاب، دکن اور گجرات، مدراس، متوسط ہند، اودھ، بہار اور بنگال میں کبھی نہ پہنچ سکتی بلکہ اپنے حدود وطن تک مثل دیگر بولیوں کے محدود رہتی اور اسے اگر بڑی سے بڑی وسعت بھی حاصل ہوتی تو شاید انبالہ سے پچھم اور کانپور سے پورب اسے جاننے والا کوئی نہ ہوتا ۔

مسلمان اسے اپنے مرکزوں میں لے گئے وہاں سے اس کا پیام شہروں، قصبوں اور قریوں تک پہنچایا اور اس طرح اس کا جال سارے ہندوستان میں پھیلا دیا ۔ حکمرانوں کی ہر بات عام قاعدہ کے مطابق قابل تقلید سمجھی جاتی ہے ۔ اس لئے ملک کے ان گوشوں میں یہاں کے باشندوں کے لئے یہ (پچھمی بولی) اجنبی اور غیر ملکی بولی تھی وہاں ہندوؤں کے اندر ایک تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ (مخصوصاً کائستھ حضرات) ایسا پیدا ہو گیا جس نے اپنی مقامی بولیوں کو پس پشت ڈالکر پچھمی بولی کو بآسانی اختیار کر لیا ہوقت کی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ (جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے) کی یہ زبان ہو گئی جس کی تقلید بالکل قدرتی طور پر متوسط طبقہ اور عوام نے کی ۔ اس طرح اسے (پچھمی بولی) قوت ملی اور اس کی جڑیں تمام ملک میں پھیل گئیں، مقامی بولیوں نے اسکے

(پچھمی بولی) لئے اپنے مرکز، شہر اور قصبے خالی کردئے اور خود دیہاتی اور دہقانی رتیوں میں پناہ گزیں ہو گئیں۔ اودھی، باگیلی، بھوجپوری، مگھی اور میتھلی وغیرہ سب کا یہی حشر ہوا، ان بولیوں کے خاص خاص علاقوں میں جایئے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں اردو سے آپ دوچار ہونگے اور نامہذب وغیر شائستہ قریوں میں یہ مقامی بولیاں نظر آئینگی۔ مثلاً (ہمارے صوبہ میں) بھوجپوری شہروں میں آرہ، سہسرام، چھپرہ اور سیوان۔ میتھلی علاقہ کے شہروں میں مظفر پور، حاجی پور اور دربھنگہ۔ اور مگھی شہروں میں پٹنہ، گیا، بہار شریف اور شیخپورہ وغیرہ میں ہر جگہ اردو ہی نظر آئیگی۔ اور اس زبان کا اثر صرف بولنے اور سمجھنے ہی تک محدود نہیں بلکہ اردو کے نامی گرامی شعرا و ادبا کا گروہ ان مقامات میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے عظیم آباد پٹنہ (جو دلّی اور لکھنؤ کے بعد اردو کا تیسرا مرکز تھا) کے علاوہ گیا، آرہ، مظفر پور، سہسرام اور بہار شریف وغیرہ اپنے اپنے علاقوں میں صوبہ بہار میں اردو زبان و ادب کے قدیم مرکز ہیں۔

زبان میں تغیرات

جب یہ امر مسلم ہے کہ نواح دہلی کی جس بولی کو عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ مسلمانوں نے قبول کیا اُسے بالآخر اردو کہا جانے لگا، اسلئے ظاہر ہے کہ یہ اختیار کی ہوئی زبان ان کی فتوحات کے ساتھ ہندوستان میں جس خطہ میں بھی جائے گی اسے اردو ہی کہا جائیگا۔ دیگر اطراف ہند کی طرح (جیساکہ اوپر ظاہر کیا جاچکا ہے) صوبہ بہار میں یہ آئی اور اردو ہی کے شکل میں آئی، مگر یہاں کی مستقل بود و باش اس کے پیش نظر تھی اس لئے یہاں کے فطری تقاضوں کے مطابق اسنے اپنے اندر تبدیلیاں کیں، اپنی بہت سی خصوصیات سے دست بردار ہوئی اور اس خوبصورتی کے ساتھ کتر بیونت اور قطع و برید سے کام لیا کہ اہل صوبہ اسے ایک باہر کی زبان کی حیثیت سے کبھی نہ غور کر سکے۔

پوربی اردو ہندی نہیں

صوبۂ بہار میں اردو کی (بول چال کی زبان) شکل و صورت میں تبدیلیاں ہوئیں، تلفظ اور لب و لہجہ بدلا۔ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے اصولوں میں اردو قواعد کی پابندیاں اس سے نبھ نہ سکیں مقامی الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کا اس میں اضافہ ہوا مشرقی بولیوں کے قواعد کے بعض مفید اصولوں سے یہ مستفید ہوئی غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے اجزا نے مل ملاکر اس کی (پوربی اردو) ایک ایسی شکل بنادی کہ آج اسے ہم دہلوی اردو سے کچھ مختلف پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس متغیر اور بدلی ہوئی زبان کو اردو کی ایک قسم یا پوربی اردو یا صاف لفظوں میں بگڑی ہوئی اردو کہہ سکتے ہیں مگر کسی طرح ہندی نہیں۔ کیونکہ ایسی انوکھی تعریف ہندی کی نہیں ہوسکتی کہ ایسی اردو جو تذکیر و تانیث کے بکھیڑوں سے واحد و جمع کی پابندیوں سے آزاد ہو۔ پورب کے مقامی الفاظ و محاورات کا جس میں ذخیرہ ہو اور عربی و فارسی کے تناسب میں عام اردو قاعدہ کے مطابق جس میں کوئی کمی نہ ہو* ہندی ہے۔

---

* بعض شیٹھ ہندوستانی الفاظ کی واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے پوربی اردو میں فارسی و عربی الفاظ کا تناسب دہلوی اردو کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی ہے۔

"کیفی بہاری"

از جناب عبدالوکیل صاحب عزیزی

حاجی شیخ احمد علی نام کیفی تخلص، آپ بہار شریف کاغذی محلہ کے رہنے والے تھے، اردو فارسی کے فاضل تھے اور انگریزی میں بھی اپنی حاجت روائی بخوبی کرلیا کرتے تھے۔ سہ روزہ اخبار "اتحاد" جو اب بانکی پور پٹنہ سے نکل رہا ہے ۱۹۱۲ء میں اسی محلہ سے نکلنا شروع ہوا تھا، اس کے بانی آپ کے خلف الرشید جناب شیخ نور محمد صاحب تھے، مرحوم غالب کے شاگرد تھے، رنگ تغزل ملاحظہ ہو۔

آفت تھا سامنا مژۂ اشکبار کا　　پانی ہوا لہو رگ ابر بہار کا
رتبہ بلند ہے یہ تیرے خاکسار کا　　رہتا ہے پاؤں دوش ہوا پر غبار کا
پھر شام ہی سے زلف بنانے میں ہو چلے　　بگڑا نصیب پھر کسی امیدوار کا
یہ رنج، یہ الم، یہ مصیبت، یہ سانحے　　صدمے پہ صدمے، شکر ہے پروردگار کا
دم بھر ہے یہ نفس تن خاکی سے آشنا　　کب تک نبھے گا ربط ہوا سے غبار کا
لب یار کے مسیح ہیں جاں بخش ہیں تو ہوں　　مرنا مجھے پسند نہیں بار بار کا!
جو کچھ دیا ہے اس نے بہت ہے مرے لئے　　کیفی ہزار شکر ہے پروردگار کا

تم نقاب الٹو بھی اپنے عارض پر نور سے　　لن ترانی کی صدا کیا دے رہے ہو دور سے
دیکھ لینگے جلوۂ حق ان بتوں کے نور سے　　چھپ کے جائیگی کہاں آخر تجلی طور سے
خوف کرتا ہوں خدا کے سامنے جاتے ہوئے　　مجھ کو پالا پڑ چکا ہے اک بت مغرور سے
ہائے مرغ نیم بسمل کا تڑپنا دیکھئے　　حرکتیں بیساختہ ہوتی ہیں یوں مجبور سے

نشہ کے عالم میں کیفی بھی انا الحق بول اٹھا
حق تو یہ ہے مست وحدت تھا پئے منصور سے

مجھے آپ کی صرف دو غزلیں دستیاب ہو سکیں، آپ کے اخلاف کے پاس آپ کا کلام یقیناً محفوظ ہوگا۔ اس سلسلہ میں جناب منظور احمد صاحب برق نبیرہ حضرت کیفی کی توجہ میں اس طرف مبذول کراتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ موصوف حضرت کیفی کا کلام ملک کے بلند معیار رسائل میں بھیجکر اشاعت پذیری کا موقع دینگے۔

غزلوں کے علاوہ مرحوم کی تصانیف میں ایک "قومی مثنوی" بھی ہے جو سنہ ۱۹۱۲ء میں دلگداز پریس لکھنؤ میں چھپی تھی، اور دو ہزار اسّی اشعار پر مشتمل ہے، آپ نے عمر طبعی کو پہونچکر سنہ ۱۹۲۰ء میں انتقال فرمایا۔

کیفی مرحوم غالباً پہلے شاعر تھے، جنھوں نے اپنی زیر بحث مثنوی میں قومی ترقی و تنزل اخلاق و معاشرت کی پستی کا عبرت انگیز منظر مثنوی کے ذریعہ پیش کیا[1]۔ ان کی مثنوی کا ہر ہر شعر اپنی جگہ حکمت و بصیرت اور بلند خیالی و علو ہمتی کا درس دیتا نظر آتا ہے۔ اور اس کے ہر مضمون سے ہمارے اخلاق و معاشرت کی اصلاح ہوتی ہے .... ان کی مثنوی میں بلند اخلاقی و بلند تہذیبی کا سبق ملتا ہے ....

وہ ہماری معاشرت کی تہذیب کرنی چاہتی ہیں اور یہ ہماری معاشرت کے بیہودہ رسم و رواج کی اصلاحی تعمیر کرتی نظر آتی ہے۔ غرض کیفی مرحوم نے صحیح معنی میں روشنی کے فرشتے سے روشنی کے فرشتے کا کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

مصنفین اسلام کے عام دستور کے مطابق کیفی بھی اپنی مثنوی کی ابتدا حمد و نعت کے ساتھ کرتے ہیں۔

یہ جو ہر شئی ہے لن ترانی گو!　　کہتی ہے لا الٰہ الا ہو!

مشرکوں سے بھی گوشِ راز آگاہ　　سنتے ہیں لا الٰہ الا اللہ!

حیرت افزا و فور قدرت ہے　　حد سے افزوں ظہور قدرت ہے

فطرتاً تھے نبی رسول کریم!　　دین فطرت کی دی ہیں تعلیم

بھیجیں ہم اُن پہ سو درود و سلام　　آل و اصحاب پر بھی اُن کے مدام

ملکہ وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم، جارج پنجم اور لارڈ ہارڈنگ کی تعریف و توصیف میں چند اشعار لکھنے کے بعد آپ ساون جیسے بدمست مہینہ کے ساتھ راہگیر کا حال بیان فرماتے ہیں اور کس خوبی داستان کے ساتھ خارجی مضمون کو منظوم فرماتے ہیں ملاحظہ ہو:-

مینہ برستا ہے ابر چھایا ہے　　میکشو مژدہ، ساون آیا ہے

قدر ساون کی بادہ خوار کریں!　　یا زمیندار و کاشتکار کریں

دو مہینے یہ ساون اور بھادوں　　ہیں عجب اک بہار کے دونوں

فصل باراں کی نوجوانی ہے　　آگ گویا عجوزہ فانی ... ہے

جلد بجھنے کا آگ کے ہے یہ حال　　ایک بڑھیا سے دیگئی ہے مثال

جو کبھی چلتی ہے ہوا ... اکثر　　رخ بدلتی ہوئی ادھر سے اُدھر

[1] ندیم: یہ بیان محل نظر ہے

اثرِ خنکیِ ہوا . . . . نہ رہا   خاک پانی میں اب مزا نہ رہا!
بعد بارش ہے چاندنی کا یہ حال   دُھل کے گویا ہوئی ہے صاف وکمال
چاندنی کیا سفید وصاف ہے واہ   خوب دھوئی گئی ہے چادرِ ماہ!
ہے یہ ہندوستاں کی فصلِ بہار   ساقیا بن بھی بنگیا . . . . . گلزار
بن اُدھر اور بلندی وپستی !   گاؤں کے کھیت اُدھر ہی اور بستی
حیرتِ انساں کو یاں بناتی ہے بت   ایسا منظر پھر اُس پہ برکھا رُت
بھری برسات کا . . . زمانہ ہے   پاس جنگل کے بادہ . . . خانہ ہے
پاس جب میکدے کے جنگل ہو   کیوں نہ جنگل میں روز منگل ہو
منظرِ خوشنما دکھاتے ہیں کھیت   کیا یہ عجاد وں کے لہلہاتے ہیں کھیت
دھان کے کھیت سبز اور شاداب   تختہ تختہ ہرا ہرا سیراب
کونسا ہے یہ جنگل اور یہ مقام   دوستو اس کا راجگیر ہے نام
سلسلہ ہے پہاڑیوں کا طویل   ارتفاع اُن کا ہے بہت نہ قلیل
وہ جو بستی سے ایک میل کی راہ   دامنِ کوہ میں ہے اک درگاہ
دیکھو تاریخِ ہند عہد قدیم!   گزرے اس جا ہیں واقعات عظیم
صُوبے تھے مگدھ دیس کے جو تمام   تھا بہاران کا صدر یا یہ مقام
بدھ مہاراج چھوڑ کے اپنا تخت   نکلے کرنے عبادتیں جب سخت
یہی جنگل انہیں پسند آیا !   منتخب اس جگہ کو فرمایا
ہے ہمارا (بہار) اس پسند یہ صاد   دیتے ہیں ہم اس انتخاب کی داد
پاک ایسی ہے مگدھ دیس کی خاک   بدھ کا جس خاک سے بنا تن پاک
تھا یہ ہندی پیمبر مرسل   ہند کے سب پیمبروں میں اجل
کرتے ہیں اس عقیدہ کا اقرار   چین و جاپان و تبت و تاتار
اہل اسلام کا جب آیا دور!   اک شرف پایا اس مقام نے اور
پیر مخدوم ملک شرف الدین   مدتوں یاں رہے ہیں چلہ نشیں!
یادِ حق میں وہ یاں رہے مشغول   یہ مقام ان کے بھی ہوا مقبول !
یاں ریاضت کے عمر بھر کئے کام   کرتے ہیں اب بہار میں آرام

رکھتے ہیں کوہ راجگیر ضرور !
اپنے دامن کی تہہ میں آتش طور

رات دن رہتے ہیں یہاں جاری
چشمۂ آب گرم کہساری ۷ !

ہے رواں گرم گرم آب زلال !
خوب شیریں بھی اور صفا بھی کمال

گرم چشموں کے قدرتی حمام !
یاں ہیں سات آٹھ جن کا کنڈ ہے نام

صحت افزا یہ کنڈ سارے ہیں
جاری آب شفا کے دھارے ہیں

ہاں مگر حوض وہ گہہ مخدوم !
ہے جو مخدوم کنڈ سے موسوم

اس کے آب زلال کی گرمی ! !
ہے عجب اعتدال کی گرمی

واہ رے راجگیر کا پانی
واقعی یاں یہ شے ہے لاثانی

حوض مخدوم میں جو ہیل دہار
گرتی ہے آب صاف چشمہ کی دھار

واہ دیتا ہے کیا صدا پانی !
رات کو اس صدا کی یکسانی !

کیا ہی خوش آیند ہے سر بستر
لوریوں کی طرح ہے خواب آور !

بن ہے آب رواں ہے اور لب کشت
ساقیا اور کیا ہے عیش بہشت !

مئے گلگوں سے ہو شگفتہ دماغ
بن میں دیکھیں بکاؤلی کا باغ !

پی کے ساغر مئے سمن بو کے !
چند نعرے لگائیں "یاہو" کے !

ہستیٔ بشر کے اطوار کے متعلق چند اشعار سنئے۔

اولاً ہستیٔ بشر کا ..... طور !
کیا ہے دنیا میں دیکھیں اسکو بغور !

دم آدم سے لے کے تا ایدم !
بلکہ تا حشر ہستیٔ ..... آدم

منحصر جن پر اس جہاں میں ہو !
نظر آتی ہیں ایسی اشیاء دو

پہلی شئے کا بقائے نفس ہے نام
ہے بہت کم جسے ثبات و قیام

اپنی شخصی جو زندگانی ہے !
چند روزہ ہے جلد فانی ہے

دوسری شئے کو ہے ثبات و قیام
اور اس کا بقائے نوع ہے نام

یاں ہیں فانی نقوش انسانی
نوع انساں مگر نہیں فانی !

رہتے ہیں یوں ہی باقی و فانی
نوع انساں اور نقش انسانی

لفظ قومی سے ہونگے یاں مذکور
جو ہیں منسوب نوع سے مرد اور

اب یہ دیکھو بقائے نفس کا حال
زندگی ہے بغیر رزق محال

یادِ رفتگاں

محمد شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم

از جناب مظفر حسن صاحب، دربھنگہ

ستمبر کے ندیم میں آپ نے شرف عالم صاحب مرحوم آرزو جلیلی کے متعلق جو چند تعزیتی سطور قلم بند فرمائے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری واقفیت جناب کو ان کے بارے میں نہیں ہے۔ اس لئے میں نے مختصر سوانح لکھ دیا ہے، آیندہ ماہ کے "ندیم" میں جگہ دیکر ممنون فرمائیں مشکور ہوں گا۔ میں ان کا بھانجہ ہوں اس لئے جو حالات لکھے گئے ہیں، وہ ذاتی واقفیت کی بنا پر۔ آرزو مرحوم کے مضامین جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے انشاء اللہ جلد ہی ندیم کے لئے روانہ کرنے کی کوشش کروں گا (خاکسار مظفر حسن)

۷ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کی شام کو محمد جلیل وکیل مرحوم کے دیہاتی مکان واقع محمد پور رغازی جالہ، ضلع دربھنگہ میں ایک لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شرف عالم رکھا گیا، یہ لڑکا آگے چلکر واقعی شرفِ عالم ہی ثابت ہوا۔ محمد جلیل اپنے وقت کے مشہور وکیل تھے آرزو میں جلیلی کا اضافہ اسی جلیل کی وجہ سے ہے۔ عام طور پر یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ حضرت جلیل کے شاگرد تھے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے مگر ارادہ ارادہ ہی رہا۔

ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے سے شروع ہوئی، بعد میں دربھنگہ اسکول میں داخلہ ہوا مگر اس درمیان میں تحریک ترک موالات شروع ہو گئی، ان کے والد محمد جلیل صاحب خلافت تحریک کے بڑے حامیوں میں تھے، چنانچہ ان کے حکم کے مطابق شرف عالم صاحب نے اسکول کو خیرباد کہا اور نیشنل اسکول میں داخل ہو گئے۔ لیکن دوسرے سال دربھنگہ ضلع اسکول سے پرائیوٹ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اس کے بعد آئی، اے، سی، بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ بی، ایس، سی، میں آنرس لے کر سکنڈ کلاس فرسٹ لائے۔ پھر ایم، ایس، سی، میں سکنڈ کلاس لائے۔ بی، ایل، میں بھی سکنڈ کلاس لائے، غرضکہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے بعد سائنس کالج میں آنریری ریسرچ اسکالر رہے، اس کے بعد جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں ہادی ہاشمی اسکول گیا میں ہڈ ماسٹر رہے، لیکن اسی سال جولائی میں گورنمنٹ ریسرچ اسکالر ہوکر، روینشا کالج کٹک چلے گئے یہاں سنہ ۱۹۳۳ء تک کام کرتے رہے۔ چونکہ وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی اس لئے استعفیٰ دیکر چلے آئے، سنہ ۱۹۳۵ء میں بہار نیشنل کالج پٹنہ میں فزکس کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور آخر وقت تک وہیں رہے۔

لج لائف کالج میں PHYSICAL اور CHEM ICAL سوسائٹی کے سرگرم ممبر رہے۔ مختلف مواقع پر سوسائٹی میں بہترین مضامین پڑھنے پر کثیر تعداد میں مڈل اور سرٹیفکیٹ حاصل کیں، دوران تعلیم ہی میں ایک دن لکھا جس کی سرخی تھی۔

ELECTRICAL RESISTENCE ON NICKLE AND COBEALT I AMAGNATIC FIELDS PUBLISHAD IN THE ZEITS-F-PHYSI BERLIN

سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء کے کالج سیشن میں ایک ٹرپ گئی جس میں ان کا بھی انتخاب ہوا، واپسی پر اپنی رپورٹ TRAMWAY Co CALCUTTA سے کمپنی کلکتہ پر ستائی اس رپورٹ پر بی، ان، ملک مڈل ملا۔

بی دنیا میں اردو ادب کو آرزو جیلی سے جس قدر فائدہ پہنچا ہے اس سے پوری ادبی دنیا واقف ہے۔ اردو کا ہر ہمدرد آج آرزو کی جوانمرگی پر آنسو بہاتا ہے۔

آرزو صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ امانت کی اندر سبھا کو واجد علی شاہ سے کوئی تعلق نہیں تھا،

اردو میں پہلی دفعہ انہوں نے "قدیم چینی شاعری" کے عنوان سے سالنامہ ساقی ۳۵ء میں ایک طویل عالمانہ مضمون لکھا۔

کا مفکر اعظم اور اس کی ذہنی مخلوق" کے نام سے متر لنک پر ایک زبردست تنقید لکھی جو ادب لطیف کے سالنامے ۱۹۳۶ء میں شایع ہو چکی ہے۔ یہ تنقید جناب تمنائی کی مترجمہ کتاب پلیاس میلاساندے کے دیباچے کی حیثیت سے شامل ہے جس کو لاہور بک ڈپو نے شایع کیا ہے۔

جولائی ۳۶ء رسالہ اردو حیدرآباد میں "پو چوئی" کے نام سے چینی شاعری و دیگر شعراء کے متعلق ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ یہ مضمون "قدیم چینی شاعری" سے زیادہ طویل ہے۔

"حسن رائگاں" کے نام سے موپساں کے ایک افسانے کا ترجمہ معیار جولائی ۳۶ء میں جس کے مدیر معاون بھی تھے شایع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ مختلف رسالوں نے تھوڑے سے الٹ پلٹ کے بعد دوبارہ شایع کیا۔ غرض اس طرح مختلف کے مضامین رسالوں میں شایع ہوتے رہے جن کی مکمل فہرست اس مختصر مضمون میں دینی مشکل ہے۔ ان کے تراجم زیادہ ہیں۔ کر موپساں کا ترجمہ زیادہ کیا ہے تحقیق۔ اور طبع زاد افسانوں و مضامین کی تعداد کم ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق لوگوں کو کم غیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا اس کا بہت ہی کم حصہ شایع ہوا۔

"کل رات کو" ادبی دنیا میں شایع ہو چکی ہے۔ یہ ان کی ابتدائی نظموں میں سے ایک نظم ہے اور جوش کے جواب میں لکھی گئی تھی، "ت فردا" اعلیٰ پایہ کی نظم ہے جو ابتک غیر مطبوعہ ہے۔ تنویر مئی ۳۹ء میں میرے اصرار پر "پاس و فتح" دیا تھا۔

غرضکہ آرزو مرحوم کے ادبی کارناموں کو اس مضمون میں واضح کرنا مشکل ہے۔

زبانوں کی واقفیت میں انگریزی اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی، بنگالی، جرمن اور فرنچ سے کافی واقف تھے چنانچہ وہاں کے افسانوں کا ترجمہ براہ راست فرنچ سے کیا ہے۔

موسیقی موسیقی کا ذوق بہت زیادہ تھا ستار بہت عمدہ بجاتے تھے، ایک کتاب RECONSTRUCTION OF INDIAN MUSIC کے نام سے لکھی ہے، کتاب کی زبان انگریزی ہے مگر ترتیب شدہ نہیں ہے، میں ہندوستانی موسیقی پر اعلیٰ قسم کی فنی بحث کی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی قیود ری میں جو غلطیاں ہیں ان کو بیان کیا ہے۔ ان کے نقائص کو دور کیا ہے اور قاعدے مرتب کئے ہیں، خود بھی کئی راگ اور دُھن ایجاد کئے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس کتاب کو وہ شانتی نیکتن جا کر ٹیگور کو تحفہ کی حیثیت سے پیش کریں گے، اس کی وجہ دریافت کرنے پر کہا تھا کہ اس کتاب کی قدر صرف وہی کر سکتا ہے۔ جس وقت الموڑا میں اُدے شنکر اور علاء الدین خاں کو ستار سنایا ساتھ ہی اپنی ایجاد کردہ راگ راگنیاں بھی تو بے ساختہ علاء الدین خاں کے منہ سے کلمات تحسین نکل پڑے اور انہوں نے بڑی خوشی سے سر و د بجایا۔

پوری زندگی انہی ادبی کاوشوں اور دوسرے کمال کی تحصیل میں گذاری، ۱۹۳۹ء میں مرہٹی زبان کی ادبی کانفرنس احمد نگر میں ہوئی، دعوت نامہ آیا وہاں تشریف لے گئے اور "ہندوستانی اسٹیج اور پردہ کا استعمال" پر تقریر کی۔ اسی طرح انڈین سائنس کانگریس منعقدہ کلکتہ ۱۹۳۸ء میں شرکت کی۔ اس کانگریس میں نفسیات کے شعبے میں ایک پیپر پڑھا غرض اس طرح بہت زیادہ ادبی جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

افسانہ و محاضرات

موت!

از جناب اوم پرکاش وڈیرہ انت

(ذیل کا افسانہ بنگال کے شہرۂ آفاق ناول نویس سیلجانند مکرجی کی کہانی "مرتو بھئے" سے ماخوذ ہے۔)

میاں اور بیوی دونوں بچہ کے واسطے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ جو خدا نے ان کی گود ہری کی اور آخر عمر میں سروجی کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ ہری چرن کہتا اس کا نام رکھو کندپ۔ سروجی ہنستے ہنستے کہتی چل ہٹ تم کو نام رکھنا بھی نہیں آتا لوگ اُسے کندہ کہہ کر پکاریں گے، اچھی کیا نام رکھا جائے، بولو تو! ہری چرن بھی سوچنے لگتا اور سروجی بھی سوچتی، کسی کو کوئی نام ہی پسند نہیں آتا، آخر دونوں کی رائے یہی ٹھہری کہ بچے کا نام سندر رکھا جائے۔ نام ہوا سندر، یہ خراب نام نہیں ہوا، اس بچے کو سندر کہنا میرے خیال میں برا نہ ہوگا۔ اس کے پھول سے لال ہونٹھ کھلے ہوئے کنول سی آنکھیں، بھویں گھنی اور اونچی ناک، چوڑی پیشانی اور اس پر نازک سیاہ گھونگھر والے بال آسمان میں چار چاند لگاتے تھے۔

ہری چرن، سروجی اور سندر انہیں تینوں کی چھوٹی سی آباد بستی، رستے کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان اس میں تین یا چار کوٹھریاں، مگر نیچے کی کوٹھریاں کرایے پر دے دی تھیں۔ جب لڑکا پیدا نہیں ہوا تھا تب سروجی نے ایک طوطا خرید لیا تھا، اور ابھی بھی وہ، پلنگ میں لٹکا ہوا جھول رہا تھا، اب وہ سندر کے کھیل کود کا ساتھی ہے۔ سندر کو آغوش میں سروجی لیکر برآمدے میں آتی اور طوطے سے اسکی دوستی کراتی۔ طوطا بولتا للا اور للا بولتا طوطا۔ سروجی ہاتھ اٹھا کر طوطے کو دھمکاتی ہوئی بولتی اب تو للا ہے گا تو مار دونگی، بول سندر۔ طوطا کان لگا کر اس کی باتیں غور سے سنتا مگر وہ سندر کہہ نہ سکتا۔ سندر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو بلند کرتا ہوا بولتا "ماؤنگا" اس ماؤنگا کو سنکر سروجی کا دل باغ باغ ہو جاتا اس کی باچھیں کھل جاتیں اور شوہر کو پکارتی جلدی آئیے ہری چرن دوڑ کر اس کے بغل میں کھڑا ہو جاتا۔ سروجی کہتی ہائے چڑیا کو دھمکایا ہوا، مگر سندر خاموش رہتا۔ مٹی ہوئی سروجی اپنے خاوند سے کہتی جائیے جائیے اتنی دیر تک آئے نہیں اور سُن نہ پائے۔ اس نے چڑیا کو دھمکایا تھا، ہری چرن ہنستے ہنستے کہتا یہ لڑکا بڑا ہو کر ہمیں لوگوں کو دھمکائیگا۔

سروجی کہتی ہاں! بچہ ہنستا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو باپ کی طرف بڑھاتا اور اس کی گود میں چلا جاتا۔ ہری چرن محبت کے ساتھ سندر کا بوسہ لے لیتے اور اپنی آنکھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہتے کہ تو بڑا شریر ہے۔ سروجی بل کھائی ہوئی شیرنی کی طرح ہری چرن کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی اور

خفا ہو کر بولتی، اس کو شریر مت کہو اور اس کی گود سے بچے کو چھین لیتی۔ اسطرح ان تینوں کے دن عیش و عشرت سے گذرنے لگے، اور سندر ماہتاب کی طرح دن بہ دن بڑھنے لگا۔

سروجی کہتی ہے کہ میں کسی طرح بھی سندر کو اسکول میں نہیں بھیجوں گی، سمجھ رہے ہو نہ بابو صاحب۔

ہری چرن ہنستا ہوا جواب دیتا گھر پر بیٹھا کر اسے جاہل بنا دو گی۔ آج کل لوگ جاہل کو پڑھاتے ہیں اور ایک تم ہو، پڑھے لکھے گھر کے لڑکے کو جاہل بنانا چاہتی ہو۔

نہیں نہیں میں ایک پل کے واسطے بھی لڑکے کو اپنی آنکھوں سے جدا نہیں ہونے دونگی، سنا ہے اسکول میں استاد بچے کو مارتے بھی ہیں، ہری چرن سروجی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے کہتا اچھا گھر پر ہی استاد رکھ دونگا، سروجی کہتی وہی ٹھیک ہوگا۔ دیکھئے، ببوا کی بیوی اس سے خوب محبت کرے گی۔ انسان امیدوں کا قلعہ بناتا ہے مگر قدرت اس کو برباد کر دیتی ہے۔ جس طرح بچے سب ندیوں کے کنارے بالو کے گھر بناتے ہیں، مگر دریا کا ایک ہی مدوجزر اس کو برباد کر دیتا ہے ہری چرن منہ بنا کر کہتا تو ابھی سے اس کے واسطے بیوی کھوجنا شروع کر دوں۔ سروجی کہتی اس میں حرج ہی کیا ہے بہت سے لوگ تو لڑکا ہونے کے پہلے ہی بات پکی کر دیتے ہیں۔ ہری چرن کچھ دیر خاموش رہ کر کہتا اگر ساس بہو میں ان بن ہو گی تب سروجی کہتی، ہوں،! میں کیا ایسی ساس ہونگی جو بہو سے جھگڑا کرونگی اور پھر سندر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہتی ہاں رے، ببوا تمہاری بیوی مجھ سے لڑے گی، ان سب باتوں کے سمجھنے کی عقل سندر میں نہیں تھی، پھر بھی وہ ہنستے ہوئے کہتا ہاں لڑے گی، ہری چرن ہنستے ہوئے کہتا سنا؟ ارے پاپی! اٹھ کر وہ چھاتی سے چپکا لیتی اور کہتی ابھی سے اتنی عقل، کہہ نہیں لڑے گی، سندر جب ہنستا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے منہ سے پھول برس رہے ہیں اور جب روتا تو موتی، لڑکے کی طبیعت خراب ہو جاتی، ماں کی نیند حرام ہو جاتی، کام کاج کو چھوڑ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتی اور کتنی راتیں تارے گن گن کر کاٹ دیتی۔

جب سندر بیمار پڑتا تب ہری چرن ایک ساتھ ڈاکٹر مصر اور بید کو بلا لاتا اور کبھی ہومیوپیتھک علاج کرتا تو کبھی ایلوپیتھک لڑکے کی کوئی بھی امید ناامیدی کی شکل میں دکھائی نہیں پڑتی ایک دوپہر کے وقت برتن بیچنے والا، چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پکار پکار کر بیچ رہا تھا۔..................

.....سروجی کو سندر کے دودھ پینے کے واسطے گلاس، پوری کھانے کے واسطے چھوٹی چھوٹی رکابیاں خریدنی پڑی، ہری چرن نے سندر کے واسطے ایک لوہے کی ریل گاڑی اور موٹر خریدا ہے۔ جو اکثر کبھی برآمدے اور کبھی کمرے کے اندر کھٹ کھٹ کرتی پھرتی۔ سندر کی عمر ابھی پانچ سال سے زیادہ نہ ہوگی، مگر اس کی فرمائشوں نے ہری چرن کے ناک میں دم کر دیا تھا

سرسوتی پوجا کا دن ہے، باجوں کی آواز سے تمام فضا گونج اٹھی، سب لوگ سرسوتی کی مورت کو دھوم دھام سے لے جا رہے تھے، سندر نے ضد کی کہ وہ بھی ویسی ہی مورت لے گا اور بیچارے ہری چرن کو اس چلچلاتی ہوئی دھوپ میں گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ ہری چرن سب سے پہلے مورتی بنانے والوں کی گلی میں گیا، لاچار اپنا سا منہ لے کر لوٹنا پڑا، مگر راستہ میں لوگ سرسوتی کی دوسری مورت کو بڑی دھوم دھام سے لیجا رہے تھے، ہری چرن کو امید کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھائی پڑی اور اس نے پکاری سے

ابتدا سے انتہا تک کہہ سنایا۔ پجاری کچھ دیر خاموش رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا کہ آپ میرے ہمراہ چلئے، میں آپ کو سرسوتی کی گردن گنگا میں پھینکنے کے وقت دے دوں گا، ہری چرن کا دل یک بیک دھک سے ہو گیا، مگر کچھ نہ ملنے سے تو اچھا ہے دونوں ہاتھوں میں ہری چرن سرسوتی کی گردن لئے ہوئے گھر واپس آئے۔ لڑکے کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ مگر سرسوتی کا منہ اتر گیا۔ اس کا تمام چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں، وہ بولی جی جی یہ آپنے کیا کر دیا۔ پوجا کی ہوئی دیوی کا سر لایا جاتا ہے۔

جانے دو ان باتوں کو ان پرانے خیالوں سے کیا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ دوش نہیں ہے۔ دو دن بعد دوپہر کے وقت سندر مٹی کی گردن سے کھیل رہا تھا۔ سرسوتی پان لگانے میں مصروف تھی، ہری چرن میٹھی نیند سو رہا تھا، اچانک چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا، پورب سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی۔ بارش کے آثار دکھائی پڑنے لگے، برآمدے میں کپڑے سوکھ رہے تھے۔ سرسوتی کا ہاتھ پھنسا ہوا تھا۔ سرسوتی نے سندر سے کہا کہ بیٹا جا کر کپڑے اتار لاؤ۔ سندر نے گردن ہلا کر کہا نہیں۔ سرسوتی نے سندر کے کان پکڑ کر کہا، بڑا آرام طلب ہے، جو کہتی ہوں نا کہہ دیتا ہے، جاؤ کپڑا اتار لاؤ۔ لڑکا ٹس سے مس نہ ہوا، اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سرسوتی کے نزدیک سندر بیٹھا ہوا تھا، غصہ میں آکر اس نے سندر کو تماچے مارتے ہوئے کہا کہ جب کہتی ہوں تب تو نا کہہ دیتا ہے، میں تم کو کہتی ہوں کہ کپڑا اتار لاؤ۔ سندر کپڑا اٹھانے گیا، لیکن اس نے کپڑا اٹھایا نہیں بلکہ کھڑا کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ شہر میں ایک سرکس آیا تھا، گھوڑا گاڑی کے اوپر باجا بجاتے ہوئے لوگ اشتہار بانٹ رہے تھے، اسے دیکھنے کے لئے وہ ریلنگ کے کنارے چپ چاپ کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگا، بادلوں نے آفتاب کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، ہوا بھی بند ہو گئی تھی، بینڈ باجا ابھی بھی بج رہا تھا، رفتہ رفتہ وہ ہری چرن کے دروازہ کے نزدیک آنے لگا، سندر لڑکا ہے اس بیچارے کو کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے، وہ کپڑا اٹھانا بھول کر ریلنگ کے لوہے پر پیر رکھ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا، اور نیچے کی طرف جھک کر اور ٹکٹکی باندھ کر اس گاڑی کی طرف دیکھنے لگا،

نیچے کے راستے میں یک بیک خوفناک آواز سرسوتی کے کانوں میں سنائی دی، اور باجا رک گیا، ماں نے لڑکے کو پکارا لڑکے کا جواب اس شور و غل میں نہ سن کر وہ برآمدے میں آ کھڑی ہوئی،

ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا تو بچہ نیچے گر گیا ہے، اور اس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے، سرسوتی کا جسم برف ہو گیا تھا، ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے، جسم کو کاٹو تو خون کا نام و نشان نہیں، رونے کی وجہ سے ہری چرن بھی خواب سے بیدار ہو گیا، سرسوتی تھر تھر کانپتی ہوئی سیڑھی سے نیچے اترنے لگی، مگر وہ آخری سیڑھی تک نہ اتر سکی بھیڑ میں سے ایک شخص نے بچے کو خون سے لت پت سرسوتی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اس کی روح اس دنیا کو چھوڑ چکی۔ سرسوتی نے ایک سرد آہ بھری اور سیڑھیوں سے پلٹتے ہی صحن میں آکر بیہوش گر پڑی۔ ہری چرن بھی اپنی آنکھوں سے گنگا جمنا بہاتا ہوا بھیڑ کو چیرتے ہوئے بچہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور پاگلوں کی طرح صحن میں دیوانہ وار گھومنے لگا، اس وقت پتھر سے پتھر دل بھی ہری چرن کی آہ و زاری نالہ و فریاد سنکر

خواب اور پوڈر

از

سید ابو سہیل

دن بھر کی حکمرانی کے بعد سورج کی شہنشاہیت ختم ہو رہی تھی، مارے برہمی کے اس کے رخسار ایسے سرخ ہو گئے تھے، جیسے کسی گورے بچے کے ہاتھ سے کھلونا چھین لیا گیا ہو، ماہتاب اپنے رخ انور سے عروس نو کی طرح شرماتے ہوئے گھونگھٹ اٹھا رہا تھا، رات کی رانی کی تیز بو ہار سنگھار سے مل کر عجیب پرکیف خوشبو پیدا کر رہی تھی، دور کہیں موسم سرما کی کوئی چڑیا خوشی کے گیت الاپ رہی تھی کہ اتنے میں فیروزہ جو طبیب جی کی اکلوتی لڑکی تھی ڈاکٹر شیام کے کمرے میں آندھی اور طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ فیروزہ کا بوٹا سا قد، لمبے بال، مقناطیسی آنکھیں اور کلوپٹرائی حسن ڈاکٹر صاحب کو بھی پسند تھا، اس کے علاوہ چونکہ وہ اس کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے اُسے ایسے بیوقت اپنے یہاں دیکھ کر گھبرا گئے، اور پوچھنے لگے۔

"فیروزہ خیر تو ہے......؟"

"ڈاکٹر بہت جلدی ہے.... میں بہت پریشان!!"

ڈاکٹر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی، اسنے پھر پوچھا۔

"آخر کچھ کہو بھی تو کیا ہوا ہے؟"

"مجھے مارفیا اور دوسری خواب آور دواؤں کا پوڈر تیار کر دو......"

"لیکن کر....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں فوراً بڑا احسان ہوگا....." ڈاکٹر نے تیار کرکے دیدیا، وہ تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی، ڈاکٹر دیکھتا ہی رہ گیا۔

"ابا جان آپ مجھے ہرمز سے شادی پر مجبور نہ کیجئے یہ منیر صاحب سے........." آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"لیکن وہ تو مسلمان ہیں" —— طبیب جی نے پدرانہ نظر سے اپنی لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہیں ابا جان وہ ان سے زیادہ تعلیم یافتہ حسین اور بہادر ہیں" فیروزہ بولی۔

"ہوں! — ہرمز سے بھی زیادہ —"

"یقیناً!!"

"کیا وہ دسمبر کی سخت سردی میں ہمارے بنگلے کے دو چکر بنیان اور نیکر پہن کر دے سکتے ہیں؟"

"جی!!!"

"اچھا تو آج کی رات دونوں کو مدعو کر دو آدھی رات کو میں دونوں کو چکر لگانے کو کہونگا۔ جو پہلے لگا لیگا۔ اس سے تمہیں شادی کرنی پڑے گی، بولو منظور ہے!!"

"ہوں!!!"

طبیب جی کا ڈرائینگ ہال رنگ برنگ کے قمقموں

سے جگمگا رہا تھا۔ ہال کے نقش و نگار اور قیمتی تصویروں پر ان کی روشنی پڑ کر عجیب بہار دے رہی تھی۔ نیرو زہ اپنی حسین ترین ساری اور فر کا کوٹ پہنے ہوئے، دنیائے حسن کا بہترین نقشہ پیش کر رہی تھی۔ پیانو پر ہلکے سروں میں انگریزی ناچ رہا تھا، وقت مقررہ پر ریشمی پردہ کو حرکت ہوئی، اور فیروزہ کی جلترنگ جیسی آواز گونجی۔

"آئیے تشریف لائیے۔ . . . " نیر اور ہرمز بہترین ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے، فیروزہ کا حسین چہرہ خوشی اور شرم سے تمتما اٹھا۔ دل ہی دل میں وہ اسکی کامیابی کیلئے دعا کر رہی تھی۔ اتنے میں طیب جی اور مسز طیب جی آگئیں۔ فیروزہ نے وہ پوڈر بیٹھے کی پلیٹ میں ڈال دیا تھا اور نوکر کو خوب سمجھا دیا کہ وہ پلیٹ ہرمز کے سامنے لگا دے گا۔ جس کے عوض وہ اسے پانچ روپیہ دیگی۔ کھانے کے بعد طیب جی نے فیروزہ کو کسی بہانے سے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ پردہ کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔

طیب جی نے کہا۔ "آپ دونوں صاحب فیروزہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے آپ کو ایک سخت امتحان دینا پڑے گا۔ معاف کیجئے گا میری صاف گوئی کو، آپ اس کے لئے تیار ہیں؟"

دونوں بول اٹھے۔ "سرٹینلی۔ سرٹینلی، سرٹنلی (یقینی یقینی)"

طیب جی بولے "ساڑھے گیارہ بجے آپ دونوں کو ایک نیکر اور بنیان دی جائیگی اور آپ دونوں کو ایک ساتھ کوٹھی کے دو چکر دینے ہونگے۔ تیار ہیں . . . . ."

"جی ہاں کیوں نہیں! . . . ہم بخوشی تیار ہیں۔" . . .

فیروزہ کا دل کنول کی طرح کھل گیا۔ وہ مور کی طرح ناچتی، ابر باراں کی طرح جھومتی اور کوئل کی طرح الاپتی اپنے ہاتھوں کو فضا میں اٹھائے جگہ جگہ سے بل دیتی ہر ہر قدم پر ہزاروں قیامت اٹھاتی ہوئی پیانو پر جا بیٹھی۔ کچھ گانے والی ہی تھی کہ آتی ماں کی پہلے ملنے والیاں آگئیں۔ تھوڑی دیر میں اسکی ماں بھی آگئیں سبھوں نے ملکر فیروزہ کو سنوارا اور اسے نوشہ سے مستعار کپڑے پہنا کر اسکے کمرے میں لیجا کر بٹھا دیا۔ اس کا کمرہ خود دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ نہ جانے کون جیتے۔ کہیں ہرمز کمبخت نہ جیت جائے۔ ہائے اللہ تو میں پھر کیا کروں گی۔ پھر تو قول کے مطابق مجھے اس سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ یہ تھے وہ پریشان کن خیالات جس نے فیروزہ کے ننھے سے دل کو پریشان کر رکھا تھا۔

جیسے ہی ساڑھے گیارہ بجے اس کا دل کانپ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مقتل پر لے جائی جا رہی ہو۔ دل کی تہائی گہرائیوں سے وہ نیر کے لئے دعا کر رہی تھی، اسے پورا یقین تھا کہ ڈاکٹر کا خواب اور پوڈر اپنا پورا رنگ دکھلائے گا۔ اور اسے (ہرمز) نیند کی ماتا اپنی گود میں لے اڑیگی، پھر وہ ہوگی نیر ہوگا اور حسین چاندنی راتوں میں تاج کی سیر ایک رومانی دنیا تھی جس میں وہ پرواز کئے جا رہی تھی، گھڑی نے بارہ بجائے۔ فیروزہ کے کمرے میں اس کی ماں، اس کا باپ اور دوسری عورتیں انتظار کر رہی تھیں کہ دیکھئے کون جیتتا ہے۔ اتنے میں چاپ سنائی دی سبھوں نے گھبرا کر در و دیوار کی طرف دیکھا۔ ہرمز اکڑتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا، فیروزہ کا باپ چلایا "اللہ اللہ کا شکر ہے" . . . . . اس کی ماں کا بال بال خوشی سے جھومنے لگا فیروزہ زخمی ہرنی کی طرح تڑپ اٹھی وہ پر بریدہ چڑیے کی طرح قفس میں پھڑپھڑا کے رہ گئی۔ اس کے منہ سے صرف ایک آہ

پگھل رہا تھا۔

سروجی نے روتے روتے ایک دن کہا کہ سرتی کی گردن نے ستم ڈھائی ہے پھینک دو اسے یہ کہکر سروجی مٹی کی گردن کو پھینکنے جا رہی تھی کہ ہری چرن نے منع کر دیا، زندگی کی انہیں اب چاہ نہیں اب وہ موت سے ہم آغوش ہونا چاہتے ہیں۔ ہری چرن سوچتا کہ یہی زندگی ہے، کہ آج خوشی اور کل غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہ دنیا فانی ہے اس پر کیا بھروسہ کیا امید۔ جب کبھی دونوں بیٹھتے تو موت کو سوچنے لگتے، ہری چرن نے آہستہ سے کہا آؤ ہم دونوں زہر کھا کر اس دنیا سے نجات پائیں۔ سروجی سر ہلا کر رضامند ہو گئی۔

ہری چرن نے کہا زہر چھپے چھپے لانا ہوگا، جس سے آسانی سے ہم دونوں کو نجات مل جائے،

سندر کی موت کے بعد وہ گھر اس کو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا، سروجی اپنے دل کی گہرائیوں میں دکھ محسوس کرنے لگی، زندگی کی خوشی، ہنسی، امید اور حلاوت تمام تر سندر کے ساتھ ہی، زمین میں دفن ہو گئے اور خیال کرنے لگے کہ اب ان کی زندگی میں کبھی بھی بہار نہ آئے گی، امید کی جھلک بھی دکھائی نہ پڑتی، ان کا جینا دوبھر ہو گیا تھا، ان کی آنکھوں سے مایا کا گہرا پردہ اٹھ گیا۔ اور ان کو تمام دنیا تاریک نظر آنے لگی، انسان کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے، مگر خدا نہیں تھکتا، وہ نہیں جانتا کہ اس کے کام سے کسی غریب پر کتنا دکھ ہوا خواہ اس کے اوپر آسمان پھٹ گیا، یا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ گیا، سروجی جب کبھی برآمدے میں کھڑی ہوتی، لوہے کے ریلنگ پر بھار دیکر نیچے دیکھتی تو یک بیک وہ کانپ اٹھتی وہ دل میں سوچتی کہ اس نے سندر کو خود اجل کے منہ میں ڈال دیا تھا، وہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اس نے زبردستی بھیجا تھا، وہ خود بھی مرنا چاہتی مگر ہمت ساتھ نہ دیتی۔

ہری چرن کے محلے میں چیچک کی بیماری آگئی ہے

آج جب وہ کام کر کے گھر واپس لوٹا تو اس کا جسم جل رہا تھا آنکھیں لال ہو گئی تھیں ہو سکتا ہے کہ سردی لگ گئی ہو، گھر میں پیر رکھتے ہی اس نے پکارا۔ سروجی کچھ گرم تیل لے آؤ، کیوں تیل کیا ہوگا"۔ "کام ہے" سروجی نے نکتہ چینی کرنا مناسب نہ سمجھا اور تیل لانے چلی گئی، لوٹ کر چھوٹے کمرے کے کھو جنے سے اس کی نگاہ جو طاق پر پڑی تو مٹی کی گردن غائب تھی، سروجی چلا اٹھی کہ وہ کہاں گئی، بہت دیر بعد ہری چرن گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ میں نے پھینک دی ہے سروجی نے بغیر کچھ کہے ہری چرن کے بدن میں تیل لگانا شروع کر دیا۔

اور ہری چرن نے اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپ لیا کہ شاید اس کو بھی چیچک ہو گئی ہے، میرا خیال ہے شاید اس نے موت کے خوف سے ہی منہ چھپا لیا تھا،

انسان امید کے چمن میں طرح طرح کے پودے لگاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر اس میں موسم بہار آیا تو ضرور خوشنما پھول لگیں گے مگر خزاں کے آجانے سے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے اور موت کو سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر نہیں سروجی اور ہری چرن کا لخت جگر اس دنیا سے راہی عدم ہوا تھا، اور وہ لوگ موت سے ہم آغوش ہونا چاہتے مگر آہ رے انسانی فطرت ایک ریلنگ سے نیچے جھانکتے اس موت سے ڈر گئی کہ کہیں وہ نیچے نہ گر پڑے اور دوسرے نے چیچک کی بیماری کا خیال آتے ہی سرسوتی کی بوجھائی ہوئی کٹی ہوئی گردن کو خاموشی سے گھر سے نکال کر پھینک دیا۔

یہ ہے انسان کے عقیدے کے مظاہرے کا نمونہ کہ وہ ... [illegible]

آثار علمیہ ادبیہ

مولانا عبدالباری فرنگی محلی (مرحوم) کا مکتوب

بنام

بسم اللہ الرحمن الرحیم
حامداً ومصلیاً ومسلماً

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب پی، ایچ، ڈی بار ایٹ لا

مکرمی جناب ڈاکٹر صاحب   تسلیم عرصہ سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی،

امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے، اس عرصہ میں میرا ایک مضمون اخبار ہمدم میں شائع ہوا تھا مجھے خیال ہے کہ آپ کو شاید اُس سے غلط فہمی ہوئی اُسمیں آپ پر کوئی حملہ ہے اسلئے ضروری ہے کہ اصل واقعہ کا اظہار کر دوں۔۔۔۔ ایک تحریر میں نے اسی مضمون کے قریب بمبئی میں لکھی تھی، اور وہاں بعض حضرات کا مشورہ تھا کہ اس کو شائع کرا دوں مگر بھائی معظم علی صاحب اور الطاف کی رائے اشاعت کی نہ تھی، اسلئے اس کی اشاعت کو ملتوی کر دیا میں یہاں آیا تو متعدد خطوط میرے پاس آئے اور اُن میں مجھے بہت سخت سست لکھا آخر میں ایک خط آیا جس پر مہر بمبئی کی تھی، اور بھیجنے والے کا نام محمد احمد انصاری تھا اُس میں مجھے مغلظ گالیاں تھیں اور لکھا تھا کہ اگر تم نے کوئی تحریر لکھی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں تم کو مار ڈالوں گا، اس خط کو دیکھنے کے بعد مجھے ایسا اشتعال ہوا کہ بلا کسی سے مشورہ کئے ہوئے میں نے وہ تحریر لکھکر اخبار میں بھیجدی حقیقۃً اُس میں کسی پر حملہ مقصود نہیں تھا، بلکہ اپنے متعلق اظہار خیال تھا، اُس میں قریب قریب وہی الفاظ تھے جو میں نے آپ کو خط میں لکھے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ اسلئے مجھے ضروری معلوم ہوا کہ آپ سے صفائی کروں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو، میرے مزاج سے آپ غالباً واقف ہونگے مجھے منافقت نہیں آتی جس سے مجھے صفائی ہوتی ہے وہ بھی میں ظاہر کر دیتا ہوں اور جس سے مجھے رنج ہوتا ہے اُس کو میں چھپا نہیں سکتا۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب میں بہت صفائی سے کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے جو خلوص اور محبت ہے اُس کو میں چھپا نہیں سکتا اور اگر خدانخواستہ مکدر ہوتا تو اُسکو بھی چھپانا میرے لئے دشوار تھا۔ مجھے کسی سے کدورت نہیں اور نہایت صفائی سے ملتا ہوں مگر مجھے افسوس ہے کہ اکثر احباب کو اگر مجھسے کوئی شکایت ہوتی ہے تو بجائے اس کے کہ اُسکو صفائی سے مجھسے کہدیں، دوسروں سے شکایت کرتے اور غلط واقعات بیان کرتے ہیں یہ جو اُن کا فعل ہے مجھے اللہ کے فضل سے کسی سے کدورت نہیں، البتہ خلیق الزماں صاحب سے مجھے ضروری تکدر ہے، اُنھوں نے بلا وجہ اور بلا کسی سبب خواہ مخواہ میری مخالفت کی اور مجھپر اتہامات لگائے جن کا مجھسے کوئی سروکار نہیں، اون کے اس فعل سے مجھے ضرور رنج ہوا اور اس رنج کو میں چھپا نہیں سکتا یہی بالاعلان ظاہر کیا کہ مجھے ان سے تکدر ہے، ایک جماعت ایسی ہے کہ جو مجھے لائق سمجھتی ہے اور نہایت غلط اتہامات لگاتی ہے اُس کی اگر میں تردید کروں تو کوئی شک نہیں کہ جو حضرات اس سے بری ہوں وہ اپنے کو اُسکا مخاطب سمجھیں، مجھے امید ہے کہ جس صفائی سے میں نے اظہار خیالات کیا ہے آپ بھی ایسی صفائی سے جواب دینگے اگر واقعی آپ کو مجھسے کوئی شکایت ہو تو اس کو تحریر کریں گے، میں آپ سے کسی قسم کا تکدر پیدا کرنا نہیں چاہتا اور اگر خدانخواستہ آپ کو مجھسے تکدر ہو گیا ہے تو اس کے دفع کرنے کی ہر طرح سے فکر کروں گا مجھے آپ کے خدمات مذہبی اور قابلیت ذاتی اور محبت و اخلاص کی بیحد قدر ہے فقط

فقیر محمد عبدالباری عفی عنہ
فرنگی محل

ادبیات

سینما اور پردہ نشیں

از بلبل بہار حضرت سریر کابری مینائی گیاوی

کل سینما دیکھتی تھی چھپ کے اک پردہ نشیں
سر جھکائے آڑ میں گھونگھٹ کی شرمائی ہوئی

پردۂ تصویر میں وہ ایکٹریسوں کا ہجوم
شعلہ ساماں جن کی فرضی جلوہ آرائی ہوئی

گورے گورے گال خوشبو پوڈروں سے تابناک
کالی کالی کاکلیں شانوں پہ بل کھائی ہوئی

وہ تکلف بانکپن کا وہ حسنِ بے حجاب
ہر ادا غارت گرِ صبر و شکیبائی ہوئی

والا باجے ساز کی وہ نغمۂ سحر آفریں
جن کو سن سن کر طبیعت سب کی گرمائی ہوئی

وہ نظر افروز حسن و عشق کی اک چھیڑ چھاڑ
جس کے نظارے سے مستی ہر طرف چھائی ہوئی

اک طرف تو تھا یہ عالم ایک طرف تھا یہ سماں
ساری دنیا تھی سمٹ کر ہال میں آئی ہوئی

چپکے چپکے تک رہی تھی ہر تماشائی کا منہ
دیکھتا کوئی تو رہ جاتی تھی شرمائی ہوئی

وضعداروں پر کبھی پڑتی تھی حسرت کی نگاہ
نوجوانوں پر کبھی نظریں تھیں للچائی ہوئی

سینکڑوں آزاد جذبے لیکے اٹھی جب اٹھی
دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کتنی پچھتائی ہوئی

موت سے بدتر ہے پردے کی مقید زندگی
آہ ساری عمر وقفِ قیدِ تنہائی ہوئی

چار دن کی زندگی کاٹی اگر ہنس بول کر
کونسی ذلت ہوئی کیا اسمیں رسوائی ہوئی

بھاڑ میں جائیں شرافت کے طلسم دل فریب
جیتے جی ہو جن سے منہ پر مردنی چھائی ہوئی

تم نہ بدلوگے تو پھر بدلیگی دنیا اور بھی
یہ سینما کچھ دکھائے گا تماشا اور بھی

صوبہ بہار کے اسکولوں و کالجوں میں ۱۹۳۱ء سے منظور شدہ

لسان الہند گیا

یعنی

صوبہ میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا واحد ترجمان

مرتبہ سید ریاست علی ندوی

نمبر ۶	ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء	جلد ۱۸

کلام عنایت

از جناب عنایت الرحمن صاحب عنایت مصنفہ اپنی

نگاہوں میں سما کر دل نشیں معلوم ہوتے ہیں
یہیں تو ہے جگہ ان کی یہیں معلوم ہوتے ہیں

تماشے دیکھنے والے جو کرتے ہیں اشاروں پر
اشارے کہنے والوں کو نہیں معلوم ہوتے ہیں

کچھ ایسا جم گیا ہے دل پہ نقشہ ان کی محفل کا
کہیں بیٹھے ہوں ہم لیکن وہیں معلوم ہوتے ہیں

زرافت الغیب کا معجزہ تو دیکھنا زاہد
یہ ساتوں آسماں ہم کو زمیں معلوم ہوتے ہیں

جسے میں دیکھتا ہوں وہ وہی صورت دکھاتا ہے
جہاں میں دیکھتا ہوں وہ وہیں معلوم ہوتے ہیں

زمانہ ان کو قائم فتنہ گر جلاد کہتا ہے
یہ صورت سے تو کچھ ایسے نہیں معلوم ہوتے ہیں

عنایت کس طرح طے ہو گی منزل عشق و الفت کی
جہاں سے کچھ چلے تھے ہم وہیں معلوم ہوتے ہیں

ادبیات

سینما اور پردہ نشین

از بلبل بہار حضرت سریر کابری بینائی گیاوی

کل سینما دیکھتی تھی چھپ کے اک پردہ نشین — سر جھکائے آڑ میں گھونگھٹ کی شرمائی ہوئی

پردۂ تصویر میں وہ ایکٹریسوں کا ہجوم — شعلہ ساماں جن کی فرضی جلوہ آرائی ہوئی

گورے گورے گال خوشبو پوڈروں سے تابناک — کالی کالی کاکلیں شانوں پہ بل کھائی ہوئی

وہ تکلف بانکپن کا وہ حسنِ بے حجاب — ہر ادا غارت گرِ صبر و شکیبائی ہوئی

والا ہیں ساز کی وہ نغمہ سحر آفریں — جن کو سُن سُن کر طبیعت سب کی گرمائی ہوئی

وہ نظر افروز حسیں [illegible]

پھولوں کی جنت از جناب خان بہادر خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب انسپکٹر آف اسکولس یو۔پی۔ ناشر صدیق بک ڈپو لکھنؤ

حضرت مجذوب یو۔پی کے خوش مذاق شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں موصوف نے محکمہ تعلیم صوبہ متحدہ کی ہدایت کے مطابق بچوں کی یہ ڈالی بچوں اور نو آموز اردو خواں جماعت کیلئے

کی ہے، کتاب چند بابوں — حمد باری، مناجات، نعت، اخلاق، درس عبرت، نصائح، درس عمل، حب وطن، محبت، مناظر قدرت، ظرافت، متفرقات" میں تقسیم ہے اور

کے تحت قدیم وجدید ہندو مسلمان شعراء کے کلام کے انتخابات خوش مذاقی کے ساتھ جمع کئے ہیں، اور مجموعی حیثیت سے منظومات کا یہ قابل قدر گلدستہ تیار ہو گیا ہے، امید ہے کہ بار

ذوق میں مقبول ہوا، اس کتاب کے بعض معلومات ندیم کے زیر اشاعت نمبر میں ٹائٹل کے صفحہ ۴ پر بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

دنیا کے دس بڑے آدمی از جناب رئیس الرحمن صاحب ناشر پستک بھنڈار بہریا سرائے دربھنگہ ۸۰ صفحہ قیمت ۸ر

پستک بھنڈار ہمارے صوبہ میں اسکول کے نصاب تعلیم کی کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے، اب اس نے ایک قدم دوسرا اٹھایا ہے اور اردو میں بچوں

عام مطالعہ کیلئے کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا ہے، اس سلسلہ میں اس کی بہت سی مطبوعات ہمارے پاس آئی ہیں، "دنیا کے دس بڑے آدمی" اسی سلسلہ کی

کڑی ہے، دس بڑے آدمیوں میں حسب ذیل اکابر منتخب کئے گئے ہیں، گوتم بدھ، ارسطو، جولیس سیزر، حضرت عیسیٰ مسیح، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شیکسپیر، واشنگٹن

نپولین، ڈارون، کارل مارکس، کتاب بچوں کی فہم واستعداد کا لحاظ کرکے تیار کی گئی ہے، اور مجموعی حیثیت سے سبق آموز کتاب ہے۔

آئینہ رمضان مرتبہ جناب قمر الہدیٰ صاحب فردوسی حجم ۴۸ صفحے ناشر دفتر دار الہدایت جامع مسجد شکوہ آباد یو۔پی۔

دار الہدایت جامع مسجد شکوہ آباد کی بعض مطبوعات کا ذکر ان صفحوں میں آچکا ہے، آئینہ رمضان بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں رمضان کے فضائل اور روزہ کے مسائل وغیرہ

[illegible] سلسلہ میں ضروری مسائل بھی درج کر دئے جاتے تو بہتر ہوتا [illegible] کے ٹکٹ بھیج کر یہ رسالہ منگوایا جا سکتا ہے۔

صوبہ بہار کی سرکار اور لوکل بورڈ کا گزٹ نمبر ۲۱ سنہ ۱۹ سے منظور شدہ

رسالہ ندیم گیا

یعنی

صوبہ میں علم، ادب، تعلیم اور زبان کا واحد ترجمان

مرتبہ سید ریاست علی ندوی

جلد ۱۸ | ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۶

سید ریاست علی ندوی اڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ندیم پریس گیا میں چھپوا کر دفتر ندیم سے شائع کیا

ندیم اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں

رسالہ ندیم گیا ۔ اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے ۔ ندیم سے میرا تعلق ماہ جولائی ۱۹۳۷ء سے وابستہ ہوا، اب میں اس کو الوداع کہہ رہا ہوں، اور نئے ذمہ دار ہاتھوں میں اس کو سونپ رہا ہوں۔ اگست ۱۹۳۷ء کا پہلا رسالہ میرے ہاتھوں سے ترتیب پایا تھا۔ میں نے کن جذبات کے ساتھ اس کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس کا سرسری اندازہ اگست ۱۹۳۷ء کے نظرات کی چند سطروں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے:۔

" اب مجھے چند سطریں ندیم کے مستقبل کے متعلق بھی لکھ دینی ہیں۔ اصل مدعا کسی رسالہ کا جاری رہنا یا بند ہونا نہیں، اگر کوئی رسالہ بغیر کسی مطمح نظر اور نصب العین کے جاری رہے تو اس کی زندگی و موت دونوں یکساں ہیں اور حقیقت میں کسی رسالہ کا نفس مطمح اور نصب العین بھی کوئی بالذات شئے نہیں۔

زمانہ اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان کے مختلف خطوں میں علوم وفنون کی ترقی و خدمت کے لئے مختلف وسائل مہیا ہیں، اور ہر خطۂ ملک کے مختلف تمدنی، معاشرتی، تاریخی اور لسانی خصوصیات ہوتے ہیں اور ان کی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی خدمتیں دنیاوی عیش وعشرت اور نام ونمود سے بے پروا ہو کر انجام دیجا سکتی ہیں اور ہم دماغی نشو ونما اور تعلیم و تربیت ہی کے ذریعہ وہ حقیقی بیداری پیدا کر سکتے ہیں۔ جو ہمیں ترقی کی راہ پر لگا سکتی ہے، ہم سر دست اسی دور و دراز کی منزل کو طے کرنے کے لئے بطور پیش خیمہ روانہ ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ راستہ نہایت دشوار گذار، آلام ومصائب سے گھرا ہوا، اور بیحد حوصلہ شکن ہے، لیکن ہمارا کام خداوند تعالیٰ کی ذات پر توکل کرکے اپنی جد وجہد کو اس کے آخری نقطہ تک پہونچانا ہے۔ اب یہ اس قادر مطلق کے ہاتھوں میں ہے کہ وہ یا تو ہمیں مقام صبر پر ٹھہرا دے۔ یا فائز المرام فرما کر ہمارے جذبات شکر کو قبول فرمائے "!

اس کے ساتھ میں نے اپنے متعلق یہ چند سطریں لکھی تھیں۔

دوسری طرف اُدھر میرے نئے وطن میں قیام کرنے کی بعض ناگزیر ضرورتیں سامنے تھیں، اسی سلسلہ میں وطن گیا تھا کہ ندیم کے وہ حالات علم میں آئے اور بالآخر گفتگو اپنے مختلف منازل طے کرتی اس نتیجہ پر ختم ہوئی کہ ندیم کی تمام وکمال ذمہ داریاں میرے سر عائد ہوگئیں جولائی کا پرچہ چھپ چکا تھا اسے شائع کیا۔ اور اگست کے پرچہ کی کچھ کاپیاں لیکر اعظم گڑھ چلا آیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ دو کشتیوں میں پاؤں نہیں رہ سکتے اور نہ پورا وقت دیئے بغیر رسالہ کے اجرا کے ابتدائی انتظامات مکمل ہوسکتے ہیں اور نہ وہ تخیلات بروئے کار آسکتے ہیں۔ جو ندیم اور اس سے بعض متعلقات کے متعلق پیش نظر ہیں۔ اس لئے سردست دارالمصنفین سے ایک سال کی رخصت لے لی ہے۔ اور اسی ماہ میں وطن جاکر استقلال کے ساتھ ان نئے مشاغل میں مصروف ہوجاؤنگا

جب میں اس زندگی کو شروع کرنے کے لئے دارالمصنفین سے گیا آرہا تھا، ارباب دارالمصنفین میرے اس راہ کے اختیار کرنے کے ہمنوا نہ تھے۔ لیکن بالآخر جیسا کہ اوپر کی سطروں میں ہے میں نے ایک سال کی رخصت لی، اور گیا چلا آیا۔ سال کے خاتمہ پر دوسرے سال کی رخصت بھی لی، میرا خیال تھا کہ یہاں پریس کے کاروبار کو پھیلا کر اس کو کسی معقول آدمی کے سپرد کرکے خود اپنا بیشتر وقت علم وادب کی خدمت گذاری میں صرف کرونگا۔ خدا کے فضل وکرم سے ندیم، اور ندیم پریس، دونوں نے ترقی کی معقول ذرائع پیدا ہوتے گئے۔ لیکن عملاً یہ صورت ہوتی گئی کہ میرا بیشتر وقت پریس کی نگرانی میں صرف ہوتا گیا۔ اور میرے لئے روحانی طور پر سب سے زیادہ تکلیف وہ تھا اس لئے خیال پیدا ہوا کہ میں پریس اور رسالہ کی ذمہ داریوں کو اپنی نگرانی میں رکھ کر کسی اور کے سپرد کردوں، اور خود اپنا وقت دوسرے مفید کاموں میں صرف کرسکوں، اس سلسلہ میں بعض صورتیں سامنے آئیں اور میرے اس ارادہ کی اطلاع دارالمصنفین بھی پہونچی، اور اس حلقہ میں یہ رائے نئے سرے سے تازہ ہوئی کہ ندیم کا کوئی معقول انتظام کرکے دارالمصنفین میں واپس جانا زیادہ مناسب ہے۔ اور آخری طور پر میرے ضمیر نے بھی اسی فیصلہ کو قبول کیا۔ چنانچہ اس کی اطلاع میں نے دارالمصنفین بھیج دی، وہاں سے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے تحریر فرمایا کہ "آپ کے فیصلہ سے خوش ہوا۔ برادر محترم مولانا مسعود علی ندوی کا مکتوب گرامی آیا کہ "واپسی کا فیصلہ خدا مبارک کرے"

خدا کے فضل وکرم سے ندیم اس وقت کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باوجود اپنے آپ سہارے پر قائم ہے۔

ناظرین کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بحمد اللہ ندیم کی آیندہ زندگی کا بھی معقول انتظام عمل میں آیا ہے۔ ہمارے صوبہ کے ممتاز صاحب ذوق اہل علم اور نامور رئیس جناب مخدومی سید ابو محمد حسن امام صاحب وارثی زاد مجدہٗ نے رسالہ کی تمام و کمال ذمہ داری قبول فرمائی ہے۔ جناب موصوف رسالہ ندیم کے قدیم بہی خواہوں میں ہیں اور علم و ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ میں شریک ادارت بھی رہ چکے ہیں۔ اب ماہ جنوری سے ندیم جناب موصوف ہی کی ادارت و اہتمام میں مستقل طور پر گیا سے شائع ہوتا رہے گا۔ توقع ہے کہ جناب موصوف کی نگرانی اور ان کے اثرات سے رسالہ ندیم پابندی کے ساتھ جاری رہے گا۔ اور صوبہ میں علم و ادب اور زبان کی خدمت انجام دیتا رہے گا۔

خریداران ندیم سے بھی دو باتیں کہہ دینی ہیں۔ ندیم کے موجودہ اور آیندہ پروپرائٹر کے درمیان جس معاہدہ نامہ پر دستخط ہوئے ہیں اس میں "رائلٹی" (اگر اس کو اس نام سے موسوم کیا جا سکے) کے طور پر صرف دو باتیں رکھی گئی ہیں۔

۱۔ ندیم کے موجودہ ارکان دوامی (جن کا زر کیفیت تمام و کمال موجودہ دفتر میں وصول ہو چکا ہے) کو حسب شرائط رکنیت دوامی ان کی تاحیات رسالہ ندیم بلا معاوضہ نذر ہوتا رہے گا۔ ۲۔ اس وقت تک جتنے خریداروں کے نام درج رجسٹر ہیں ان میں سے جن خریداروں کی مدت خریداری جتنے مہینے باقی رہ گئی ہے اس وقت تک ان کے پچھلے موصولہ زرچندہ کے معاوضہ میں رسالہ ندیم ان کے نام جاری رہے گا۔

دسمبر کے پرچہ کی اشاعت کے بعد رجسٹر خریداری اور ندیم کے غیر مطبوعہ مضامین کے فائل وغیرہ نئے دفتر میں منتقل ہو جائیں گے۔ اب میرا ذاتی پتہ "دار المصنفین اعظم گڈھ" ہوگا۔

ندیم ساڑھے چار سال تک میرے ہاتھوں میں رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں نے اس ذمہ داری کو بخیر و خوبی انجام دینے میں میری مدد فرمائی ہے میں ان کے اشتراک عمل پر تہ دل سے ان کا شکرگذار ہوں۔ ان کی معاونت سے مجھ سے جو کچھ بھی خدمتیں ہو سکیں وہ انجام پا گئیں۔ ان کے لیئے کسی اجر کا طالب نہیں۔ جو مشکلات پیش آئیں ان کا بوجھ بھی یقین کہ راستہ نہایت دشوار گذار الّا ما شاء اللہ مضائقہ سے گھبرا ہوا اور بجد حوصلہ شکن ہے۔ لیکن جو کوتاہیاں سرزد ہوئیں ان پر شرمسار ہوں اور دانستہ یا نادانستہ کسی کو کسی تحریر یا کسی طرز عمل سے تکلیف پہنچی ہو تو اس پر معذرت خواہ ہوں۔ آیندہ ندیم کی جو خدمتیں بھی مجھ سے ممکن ہوں گی ان سے کبھی پہلوتہی نہ ہوگی۔ میرے دل کا لگاؤ اس کے ساتھ جیسا ہے وہ آیندہ بھی قائم رہے گا دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ندیم کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اس کے ذریعہ صوبہ کی مفید خدمات لے اور میری لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگذر فرمائے۔ اور ندیم کے نئے ذمہ داروں کی ہمتیں استوار فرمائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار رکھ کر صوبہ میں علم و ادب کی روشنی پھیلاتے رہیں۔

والسلام

سید ریاست علی ندوی، آنجلا گیا

۱۰ دسمبر ۱۹۳۱ء

مقالات

مسلمان سلاطین و امراء کے اخلاق پر ایک نظر

تاریخ اخلاق اسلام کا ایک باب

از
مولانا عبد السلام ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ

(۳)

سلطان محمود شاہ بہمنی نے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں یتیموں کی تعلیم کا خاص انتظام کیا تھا، اور اندھوں کے مشاہرے مقرر کئے تھے[۱]، سکندر لودی نے فقراء و مستحقین کی اعانت کا ایک خاص نظام قائم کیا تھا، یعنی سال میں دو بار اس کے سامنے تمام ملک کے فقراء و مستحقین کی فہرست پیش کیجاتی تھی، اور وہ ہر شخص کی حالت وحیثیت کے مطابق اسکو ششماہی امداد دیتا تھا، جاڑوں میں شال اور کپڑوں سے بھی ان کی امداد کرتا تھا، اور روزانہ مختلف مقامات پر خام غلہ اور پکا ہوا کھانا تقسیم کراتا تھا[۲]۔

گجرات میں سلطان محمود خاں ثانی نے فقیروں اور محتاجوں کے لئے بہت سے مکانات بنوائے تھے، اور ان میں اس غرض سے ملازم مقرر کئے تھے کہ فقیروں اور محتاجوں کے رنج و راحت سے باخبر رہیں اور ان کی ضروریات کے سامان مہیا رکھیں جاڑوں کی راتوں میں تمام گلیوں اور بازاروں میں بہت سی لکڑیاں جلواتا تھا، تاکہ بے سروساماں لوگ آگ تاپ سکیں، معمول تھا کہ تمام موسمی میوے پہلے فقیروں کے پاس بھیجے جاتے تھے، اس کے بعد شاہی محل میں آتے تھے[۳]،

جہانگیر نے بھی موسم سرما میں فقراء کشمیر کو کپڑے دینے اور مسجدوں میں پانی گرم کرنے کا خاص انتظام کیا تھا[۴]، عالمگیر بھی جاڑوں کے زمانے میں صوبہ احمد آباد کے فقراء و مساکین پر ڈیڑھ ہزار قبا اور ڈیڑھ ہزار کمبل تقسیم کرتا تھا[۵]۔

ان فیاضیوں کی داستان نہایت طویل ہے، اور ہم نے اس موقع پر اس کا ایک حصہ صرف اس غرض سے نقل کیا ہے کہ

---

[۱] فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۷ [۲] فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۶ [۳] مرأت احمدی جلد اول صفحہ ۹۱ [۴] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳۵۲ [۵] مرأت احمدی جلد اول صفحہ ۳۵۶ -

اخلاقی اور اقتصادی حیثیت سے اس پر تنقید کریں، اور بتائیں کہ اخلاقی اور اقتصادی اصول کے مطابق وہ جائز اور صحیح تھیں یا نہیں؟
مسٹر ... نے اخلاقی حیثیت سے اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ انسان کی کوئی خصلت سخاوت سے بہتر نہیں، لیکن شرائط ذیل کے ساتھ۔

(۱) جس شخص کو ہم اپنی فیاضی کا مورد بنا رہے ہیں وہ واقعتہً اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

(۲) ہم اپنی چادر سے باہر تو پاؤں نہیں پھیلا رہے ہیں۔

(۳) وہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کردہ ہے۔

(۴) اس کا مقصد رفاہ وبہبود خلق ہو اپنی نمود و نمائش نہ ہو۔

(۵) اور خیرات پانے والے کی ضروریات وحیثیت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو[۱]۔

اب ہم کو سلاطین امراء کی فیاضیوں پر بترتیب نگاہ ڈالنی چاہئے کہ وہ ان شرائط کے مطابق تھیں یا نہیں۔

(۱) ہمارے سلاطین وامراء کی فیاضیوں کا ایک حصہ تو شخصی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی طریقہ سے جن لوگوں کی امداد کی جاتی تھی وہ یقینی طور پر اس سے مستفید ہوتے تھے، اور بڑی بڑی مصیبتوں سے نجات پا جاتے تھے مثلاً

دعلج بن احمد ایک دولت مند، فیاض اور مجبر شخص تھا۔ ایک شخص کا بیان ہو کہ ایک بار میں نے جامع مسجد میں ایک باوقار اور صاحب خشوع آدمی کو دیکھا جو برابر نماز پڑھتا جاتا تھا۔ اور جب سے مسجد میں داخل ہوا تھا۔ سرک سرک کر امام کے پاس جانے کی کوشش کرتا تھا یہاں تک کہ وہ امام کے قریب پہونچ کر بیٹھ گیا اور نماز شروع ہوئی۔ لیکن اس نے لوگوں کے ساتھ جمعہ کی نماز نہیں پڑھی۔ مجھے اس پر تعجب ہوا اور اس کی یہ حرکت بری معلوم ہوئی اسلئے میں نماز پڑھ چکا تو میں نے اس سے کہا کہ جو کچھ تم نے کیا میں نے اس سے زیادہ عجیب بات کوئی نہیں دیکھی تم نے نفلیں تو خوب پڑھیں، لیکن فرض کو چھوڑ دیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک عذر کی وجہ سے نماز جمعہ نہ پڑھ سکا مجھ پر قرض ہے جس کی وجہ سے میں روپوش ہوگیا ہوں، آج جامع مسجد میں آیا تو قبل اس کے کہ نماز جمعہ شروع ہو میں نے مڑکر دیکھا تو میرا قرضخواہ مجھکو نظر آیا۔ اور اس کے خوف سے میرے کپڑے آلودۂ نجاست ہوگئے، میں تمہیں خدا کا واسطہ دلاتا ہوں کہ میری پردہ پوشی کرنا اور کسی سے میرا حال نہ بیان کرنا، میں نے پوچھا کہ تم پر کس کا قرض ہے؟ اس نے دعلج بن احمد کا نام بتایا، سو اتفاق سے دعلج کا خزانچی اس کے پہلو میں تھا، میں نے یہ باتیں سنیں تو اسپوقت دعلج سے بیان کردیں، دعلج نے حکم دیا کہ اس کے پاس جاؤ اور اسکو حمام میں غسل کراؤ و اسکو میرے کپڑوں میں ایک خلعت پہناؤ، اس کے بعد اس کا حساب دیکھا تو اس پر پانچ ہزار درہم قرض نکلے اس نے اس رقم پر خط کھینچ دیا اور اس کے آخر میں ادائی کی علامت بنادی۔ پھر پانچ ہزار درہم اور منگوائے اور کہا کہ ہم نے اپنا قرض معاف کردیا اور ہماری درخواست ہو کہ تم اس پانچ ہزار درہم کو قبول کرو اور ہمکو اس خوف سے معاف کرو جو تمہاری نماز میں خلل انداز ہوتا ہے[۲]۔

---

[۱] تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم صفحہ ۵۵۔ [۲] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۵۷۔

محی الدین ابو حامد محمد بن قاضی نہایت فیاض تھے دہ ہزار دینار یا اس سے کم کے قرض پر کسی مقروض کو قید نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی طرف سے ادا کر کے اس کو چھوڑ دیتے تھے[1] بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشخاص نے نہ صرف مصیبت سے نجات پائی ہے بلکہ ان کی دولت و ثروت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک بار کرخ کا ایک دیندار عطار چھ سو دینار کا مقروض ہو گیا۔ اور دوکان کو چھوڑ کر خانہ نشینی اختیار کر لی اور دعا و عبادت میں مشغول رہنے لگا، ایک دن وہ نماز کے بعد دعا کر کے سویا تو خواب میں رسول اللہ صلعم دیکھا کر فرما رہے ہیں کہ وزیر علی بن عیسیٰ کے یہاں جاؤ میں نے اسکو حکم دیا ہے کہ تم کو چار سو دینار دیدے جس سے تمہاری حالت سدھر جائے، وہ اس کے یہاں گیا تو بہت انتظار کے بعد ایک دوست سے ملاقات ہوئی جس سے اس نے یہ واقعہ بیان کیا اس نے کہا خود وزیر کو صبح سے تمہاری تلاش تھی اور وہ ابتک تمہاری تلاش میں ہے، ہر ایک سے تم کو پوچھتا ہے اور تمہاری تلاش میں قاصد روانہ کئے گئے ہیں، تم یہیں ٹھہرے رہو، وہ وزیر کے پاس گیا اور فوراً میری طلبی ہوئی، میں اس کے پاس گیا اور اس نے میرا نام پوچھا، میں نے نام بتایا تو اس نے کہا کہ کرخ کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں، بولا خدا تم کو جزائے خیر دے کہ تم میرے پاس آئے، میں صبح سے بیقرار تھا کیونکہ رسول اللہ صلعم نے مجھ سے خواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ کرخ کے فلاں عطار کو چار سو دینار دیدو کہ وہ اس سے اپنی حالت سدھارے اس لئے میں صبح سے ابتک لوگوں سے تمہارا حال پوچھتا رہا۔ اور کوئی مجھکو تمہارا حال نہیں بتاتا تھا، اس کے بعد غلام سے ہزار دینار منگوائے، اور رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے مطابق چار سو دینار لے لو، اور باقی چھ سو دینار میری طرف سے ہدیہ ہیں۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے مجھ کو جو کچھ دلوایا ہے، میں اس سے زیادہ ایک حبہ بھی نہیں لینا چاہتا۔ مجھکو اسی میں برکت کی توقع ہے، وہ رو پڑا اور کہا کہ تمہارا اعتقاد کس قدر پختہ ہے جو تمہاری مرضی ہو وہی لے لو، میں چار سو دینار لے کر واپس آیا اور اپنے ایک دوست سے اس واقعہ کو بیان کیا اور اسکو اشرفیاں دکھلا دیں اور اس سے یہ خواہش کی کہ میرے قرضخواہوں کو اس کی اطلاع دیدے اور میرے اور ان کے بیچ میں پڑے، اس کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ انہوں نے قرض کے ادا کرنے کے لئے مجھکو تین سال کی مہلت دی، لیکن میں نے ان کو قرض کا ثلث حصہ یعنی دو سو اسی وقت دیدیئے اور بقیہ کے لئے مہلت لے لی، باقی دو سو دینار سے دوکان کو چلایا اور سال ہی بھر میں ہزار اشرفیاں کمائیں اور قرضخواہوں کا بقیہ قرض ادا کر دیا اور اس کے بعد میری حالت برابر ترقی کرتی رہی[2]

اشخاص کے علاوہ جو اشرفیاں ایک جماعت کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں ان میں بھی اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ یہ لوگ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں، ہم مظفر الدین شاہ اربل کے حالات میں لکھ آئے ہیں۔ کہ اس نے اپاہجوں اور اندھوں کے لئے جو خانقاہیں قائم کی تھیں ان میں ہر دو شنبہ اور جمعرات کی شام کو خود جاتا تھا۔ اور ہر ایک کے حجرے میں جا کر ہر ایک شخص کو کچھ دیتا تھا، اور ان کے حالات دریافت کرتا تھا، اسی طرح جو بیوہ خانہ، یتیم خانہ، اور شفا خانہ قائم کیا تھا، ان میں بھی جا جا کر ہر ایک کی حالت دریافت کرتا تھا۔ اور ہر ایک کی خبرگیری کرتا تھا، احمد بن طولون نے مصر میں جو شفاخانہ قائم کیا تھا اس کے ملاحظہ کیلئے خود ہر جمعہ کو آتا تھا، اور دواخانہ وغیرہ کی جانچ کرتا تھا۔

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۷۴۔ [2] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۳۳۴ - ۳۳۵

اور ہر مریض کو جاکر دیکھتا تھا۔[1]

سلطان نورالدین نے مغربی قیدیوں کی رہائی کے لئے ۱۲ ہزار دینار کی نذر مانی تھی، لیکن اس رقم سے جو قیدی رہا کرائے گئے، اُن میں کچھ لوگ مغرب کے رہنے والے نہ تھے، اس لئے سلطان نے اُن کو واپس کر دیا، اور حکم دیا کہ اُن کے عوض مغربی قیدی رہا کرائے جائیں، ان لوگوں کو تو ان کے خاندان اور پڑوس والے رہا ہی کرا لیں گے، لیکن مغربی قیدی بالکل پردیسی ہیں، اور ان کے خاندان کے لوگ نہیں ہیں۔[2]

سلطان محمود خاں ثانی کا معمول تھا کہ جو نیک لوگ مسجدوں اور مدرسوں میں قیام رکھتے تھے، ان کو جاڑوں میں نہایت عمدہ قبائیں اور لحاف دیتا تھا، لیکن چونکہ بعض قلاش لوگ ان کو فروخت کر ڈالتے تھے، اس لئے حکم دیا کہ ایسے لحاف تیار کرائے جائیں جن کو ایک جماعت اوڑھ سکے اور سب کے سب اُس کے فروخت کرنے پر متفق نہ ہوں۔[3] اس سلسلے میں سب سے مقدم بات یہ ہے کہ مستحق اور غیر مستحق لوگوں میں امتیاز کی جائے تاکہ غیر مستحق لوگ ان فیاضیوں سے بے جا طور پر فائدہ نہ اُٹھانے پائیں۔ دنیا میں مسیحی راہبوں نے سخاوت اور فیاضی کا نہایت بلند معیار قائم کیا تھا، لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ خیرات اپنے مصرف صحیح میں نہیں صرف کی جاتی تھیں، مسیحیت نے خیرات کے مفہوم کو حقوق العباد میں نہیں بلکہ حقوق اللہ میں رکھا، اُس نے اس کی غایت رفاہ خلق نہیں رکھی بلکہ حصول ثواب رکھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس طرف سے بالکل غافل ہو گئے کہ کون مستحق اعانت ہے، اور کون غیر مستحق، ان کے لئے صرف اتنا جاننا کافی تھا کہ ہمیں نیت کا ثواب بہر حال ملے گا، اس لئے مستحق کی تلاش ایک محنت بے سود ہے۔[4] لیکن مسلمان سلاطین و امرا کی فیاضیوں کی جو مثالیں اوپر گذری ہیں اُن میں کوئی شخص اور کوئی گروہ ایسا نہیں ہے، جو اعانت کا مستحق نہ ہو، اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ اندھا دھند طریقہ پر برامکہ نے فیاضیاں کی ہیں لیکن وہ بھی اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ غیر مستحق لوگ ان فیاضیوں سے بیجا فائدہ نہ اُٹھانے پائیں۔

یحییٰ بن خالد برمکی کے دروازے پر ایک چبوترہ تھا جس پر نہایت کثرت سے اہل حاجت بیٹھے رہتے تھے، اور یحییٰ ان کو دیکھتا تھا تو اُن کے پاس ٹھہر جاتا تھا اور اُن کے ساتھ خوش خلقی کا اظہار کرتا تھا، ایک روز اُس کے دل میں خیال آیا کہ درحقیقت یہ لوگ اہل حاجت ہیں یا نہیں؟ اس بنا پر ایک دن صبح تڑکے گھر سے نکلا، اور ان میں کسی شخص کو نہیں پایا تو اس وقت یہ شعر پڑھا۔

ولیس اخو الحاجات من بات نائما ولکن اخوها من یبیت علی رحل[5]

حاجتمند وہ نہیں ہے جو سو کر رات گذارے بلکہ حاجتمند وہ ہے جو اونٹ کے کجاوے پر رات بسر کرے۔

اگرچہ بعض موقعوں پر ہمارے سلاطین و امرا اندھا دھند فیاضی بھی کرتے تھے، لیکن اُن میں بھی ایک اخلاقی شان پائی جاتی تھی، ایک بار جعفر برمکی نے مروان بن ابی حفصہ سے فرمائش کی کہ تم نے معن بن زائدہ کا جو مرثیہ لکھا ہے اُس کو سناؤ، اُس نے کہا، نہیں آپ کی مدح میں قصیدہ سناتا ہوں، بولا، نہیں، معن ہی کا مرثیہ سناؤ، وہ مرثیہ سناتا جاتا تھا اور جعفر کے رخساروں پر آنسو بہتے جاتے تھے جب وہ مرثیہ سنا کر

---

[1] مقریزی جلد ۴ صفحہ ۲۵۹۔ [2] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۳۰۸۔ [3] مرآت احمدی جلد اول صفحہ ۹۱۔ [4] تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم صفحہ ۶۴ - ۶۶۔ [5] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۱۳۔

فارغ ہوا تو جعفر نے کہا کہ "اس مرثیہ پر معن کی اولاد میں سے تم کو کسی نے کچھ صلہ دیا ؟" اُس نے کہا۔ "نہیں" بولا "اگر معن زندہ ہوتا تو اس مرثیہ کو سنکر تم کو کیا صلہ دیتا ؟" اُس نے کہا کہ "چار سو دینار" بولا "ہمارے خیال میں وہ اس قدر نہ دیتا، ہم معن کی طرف سے تم کو اس کا دو گنا دلوا دیتے ہیں، اور اسی قدر اپنی طرف سے دلواتے ہیں، خزانچی سے سولہ سو دینار لیلو" ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس مرثیے کے بعد مروان نے اپنی شاعری سے کوئی مالی فائدہ نہیں اٹھایا، کیونکہ اس مرثیے کا ایک شعر یہ تھا،

وقلنا این ترحل بعد معن   وقد ذھب النوال فلا نوال

اور ہم نے کہا کہ اب معن کے بعد کہاں جائیں   کیونکہ فیاضی چلی گئی اور اب فیاضی باقی نہیں رہی

اسلئے وہ جب کسی خلیفہ یا امیر کے سامنے مدحیہ قصیدہ سناتا تھا، تو وہ کوئی صلہ نہیں دیتا تھا، اور کہتا تھا کہ تم خود کہہ چکے ہو کہ معن کے بعد فیاضی کا خاتمہ ہو چکا[۱]۔

سلاطین سلجوقیہ میں سنجر بن ملک شاہ بے دریغ فیاضیاں کرتا تھا، ایک بار متصل پانچ دن تک اُس کی فیاضیوں کا بادل برستا رہا اور اس مدت میں گھوڑوں خلعتوں، اور دوسرے سامانوں کو چھوڑ کر سات لاکھ اشرفیاں لٹادیں۔ ایک دن اُس کے خزانچی نے کہا کہ "آپ کے خزانے میں ایک ہزار دیبائے اطلس کے تھان موجود ہیں۔ میری خواہش ہے کہ حضور ان کو ملاحظہ فرمائیں" وہ خاموش رہا جس سے خزانچی سمجھا کہ وہ اس پر راضی ہے، اس لئے اس نے وہ تمام تھان کھول دئے اور کہا کہ "حضور اپنے مال کو ملاحظہ نہیں فرماتے، اس پر خدا کا شکر نہیں کرتے" اُس نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ مجھ جیسے شخص کے لئے یہ بدنما بات ہے کہ اُس کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ مال کی طرف مائل ہوا، چنانچہ امراء کو طلب کیا اور یہ تمام تھان ان کو تقسیم کر دئے[۲]۔

۲) مسلمان سلاطین و امراء نے اگرچہ بڑی بڑی فیاضیاں کیں، لیکن ان میں بہت کم لوگوں نے اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلایا ہے خلافت بنو امیہ میں معن بن زائدہ سے زیادہ فیاض کوئی شخص نہیں گذرا ہے، لیکن اُس نے بھی فیاضیوں میں اپنی دولت کے دسویں حصے سے زیادہ صرف نہیں کیا[۳]۔ سنجر بن ملک شاہ سے زیادہ فیاض کون ہوگا۔ لیکن باوجود اسکے اُس کا خزانہ زر و جواہر سے مالامال رہتا تھا، خود اُسکے خزانچی کا بیان ہے کہ اُس کے خزانے میں جس قدر مال جمع ہوا قیصر و کسریٰ کے خزانے میں بھی جمع نہیں ہوا تھا، اُس کے خزانے میں ایک ہزار یعنی رطل جواہرات تھے، اور کسی بادشاہ کی نسبت سننے میں نہیں آیا کہ اُس کے پاس اس قدر یا اس کے قریب قریب جواہرات جمع ہوئے ہوں گے[۴]

بلکہ بعض مثالوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان فیاضیوں سے سلاطین و امراء کی دولت میں اضافہ ہوتا تھا، ایک بار وزیر ابوالحسن بن فرات نے محلہ کے ایک کاشتکار کے ساتھ سو درہم کی رعایت کی اور اس سے اُس کی آمدنی میں دس ہزار دینار کا اضافہ ہوا، کیونکہ وہ کاشتکار ایک شہر میں گیا اور اس رعایت کا تذکرہ کیا، اس تذکرے کو سنکر اُس شہر کے لوگ محلہ کے پہلوؤں میں منتقل ہو گئے اور اُن کو آباد کرنا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس سال دس ہزار دینار کی وصولی بڑھ گئی[۵]۔ صرف چند سلاطین و امراء کی مثالیں ہیں جنہوں نے یا تو اپنی کل دولت فیاضیوں

---

[۱] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۱۱ [۲] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۱۷ [۳] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۰۹ [۴] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۱۸ [۵] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۲۰۹

میں صرف کر دی ہے، یا ان فیاضیوں کی وجہ سے مقروض ہو گئے ہیں، برامکہ کی دولت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن انہوں نے اپنی کل دولت فیاضیوں میں صرف کر دی۔ اور جب وہ تباہ و برباد ہوئے تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی تباہی کے بعد جب ہارون رشید نے مسرور خادم سے دریافت کیا کہ تم نے برامکہ کے پاس کسقدر مال و جواہر پائے؟ تو اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ ہارون رشید نے اس پر تعجب سے کہا کہ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ انہوں نے تو میرا خزانہ لوٹ لیا تھا"، مسرور نے جواب دیا کہ "سب داد و دہش میں صرف کر دیا"[1]

جمال الدین اصفہانی جو سیف الدین غازی شاہ اربل کا وزیر تھا نہایت فیاض تھا اور اسی فیاضی کی وجہ سے جواد کے لقب سے مشہور تھا، ایک بار موصل میں سخت قحط پڑا تو اس نے اپنی کل دولت لوگوں کی اعانت و امداد میں صرف کر دی اور اس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا[2]

امرائے خلافت عباسیہ میں ابو دلف ایک نہایت فیاض امیر تھا اور اسی فیاضی کی وجہ سے نہایت مقروض رہتا تھا، اور اس کی عام طور پر شہرت تھی لیکن باوجود اس کے اپنی فیاضی میں کمی نہیں کرتا تھا، ایک بار ایک شخص نے اس کے سامنے یہ اشعار پڑھے۔

ایارب المنائح والعطایا ویا طلق المحیا والیدین

اے فیاضی کے دیوتا

اقد خبرت ان علیک دینا فزد فی رقم دینک واقض دینی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ تجھپر قرض ہے تو اپنے قرض کی رقم کو بڑھا کر میرا قرض ادا کر دے

تو اس نے اس کا قرض ادا کر دیا[3]

شاہ مظفر الدین نہایت فیاض بادشاہ تھا، اور اس وجہ سے اس کا خزانہ باوجود سلطنت کی وسعت کے ہمیشہ خالی رہتا تھا، بلکہ تاجروں وغیرہ کے قرض سے بھی زیر بار رہا کرتا تھا[4]

لیکن اس قسم کی مثالیں بہت کم ہیں۔ ورنہ عام طور پر ہمارے سلاطین و امراء کی فیاضیوں کا کوئی اثر ان کی مالی حالت پر نہیں پڑتا تھا،

(۳) مسلمان سلاطین و امراء نے جو فیاضیاں کیں ان کی نسبت یہ پتہ لگانا سخت مشکل ہے کہ وہ جائز آمدنی سے کی جاتی تھیں یا نہیں؟

ہمارے صوفیہ نے چونکہ اخلاق کو نہایت بلند معیار قائم کیا ہے، اس لئے وہ ان فیاضیوں کو جائز نہیں سمجھتے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ جو مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں، اور پل وغیرہ تعمیر کرواتے ہیں۔ ان کی تعمیر ایسے مال سے ہوتی ہے جس کو وہ ظلم، لوٹ، رشوت اور ناجائز طریقوں سے حاصل کرتے ہیں[5] لیکن صوفیہ نے ہر قسم کے اعمال خیر کے جواز و عدم جواز کے متعلق جو سخت شرائط لگائے ہیں، ان کے لحاظ سے دنیا کا ہر کام ناجائز یا کم از کم مشتبہ ضرور ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود تصوف بھی اسی زد میں آ جاتا ہے۔

(۴) اسی طرح یہ پتہ لگانا بھی دشوار ہے کہ یہ فیاضیاں صرف بہبودی خلائق کے لئے کی جاتی تھیں یا ان کا مقصد صرف نام و نمود تھا، بعض مثالیں

---

[1] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۰۳۔ [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۷۔ [3] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۴۴۔
[4] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۴۷۔ [5] احیاء العلوم جلد ۳ صفحہ ۲۷۹

ایسی مثالیں موجود ہیں، جن سے ہمارے امراء و سلاطین کی خلوص نیت کا پتہ چلتا ہے، مثلاً قرطبہ میں ایک پرانا پل تھا جس کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک عامل نے بنوایا تھا، ہشام نے دوبارہ اس کی تجدید کرائی اور اس کو نہایت مضبوط طریقہ پر بنوایا، اور ایک دن اپنے ایک ندیم سے پوچھا کہ "اس پل کے متعلق اہل قرطبہ کیا کہتے ہیں"؟ اس نے کہا کہ "وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے اس کو صرف اس لئے بنوایا ہے کہ شکار کو جائے تو اس پل سے گذرے"، اس کے بعد ہشام نے قسم کھائی کہ "اس پل سے کبھی نہ گذرے گا"، چنانچہ اس نے یہ قسم پوری کی اور اس پل سے کبھی نہیں گذرا[1] لیکن عام طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان فیاضیوں سے بہبودی خلائق کے سوا ہمارے سلاطین و امراء کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا، صوفیانہ نقطۂ نظر سے تو وہ تمام تر نام و نمود کا ذریعہ تھیں۔ چنانچہ امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ "یہ لوگ مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں، پلوں اور ان چیزوں کی تعمیر کے زیادہ حریص ہوتے ہیں جو عام طور پر نمایاں ہوں، اور اینٹوں پر ان کے اوپر اپنے نام لکھواتے ہیں تاکہ ان کی شہرت ہمیشہ قائم رہے، اور مرنے کے بعد ان کی یادگار باقی رہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ان عمارتوں پر صرف نیکی اور اخلاص سے روپیہ صرف کرتے ہیں، حالانکہ اگر ان میں کسی سے صرف ایک بنا صرف کرنے کو کہا جائے اور جو عمارت اس نے بنوائی ہے اس پر اس کا نام نہ لکھا جائے تو یہ اس پر سخت گراں ہوگا اور اس کا دل اس فیاضی پر راضی نہ ہوگا[2]۔

تاریخی تصریحات سے بھی اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے سلاطین و امراء کی فیاضیاں بالکل صوفیانہ شرائط کے مطابق نہیں ہوتی تھیں بلکہ ثواب آخرت کے ساتھ، ان کا مقصد ذکر خیر اور حسن قبول بھی ہوتا تھا۔ امراء خلافت امویہ میں مہلب کا خاندان سب سے زیادہ فیاض تھا جس کی نسبت ابن خلکان نے لکھا ہے کہ جس طرح دولت عباسیہ میں برامکہ سے زیادہ کوئی فیاض نہ تھا اسی طرح دولت امویہ میں بھی مہلب کے خاندان سے زیادہ کوئی فیاض نہیں گذرا لیکن یہ دونوں فیاض خاندان صرف شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے فیاضیاں کرتے تھے، چنانچہ یزید بن مہلب یا خود مہلب کا قول تھا کہ "زندگی موت سے زیادہ محبوب ہے۔ لیکن عمدہ تعریف مجھکو زندگی سے بھی زیادہ محبوب ہے، اور اگر میں ایسی چیزوں بھی کو کسی نے نہ دیا ہو، تو میں یہ چاہوں گا کہ مجھے ایک کان ہے جس کے ذریعہ سے میں کل یہ سنو کہ میرے مرنے کے بعد میری نسبت کیا کہا جاتا ہے"[3]۔

ایک بار یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنے بیٹے ابراہیم کے معلم اور ان لوگوں کو جو اس کی تربیت و نگرانی کرتے تھے جمع کر کے پوچھا کہ "ابراہیم کا کیا حال ہے"؟ سب نے کہا کہ "اس نے ادب میں اسقدر ترقی کی ہے، فلاں فلاں علوم کو پڑھا ہے، ہم نے اس کے لئے جائداد خرید دی ہے، اور اس سے اسقدر پیداوار ہوتی ہے"۔ یحییٰ نے کہا کہ "میں یہ نہیں پوچھتا، بلکہ یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے لوگوں کی گردنوں میں اس کے احسان کا بار ڈالا؟ اور اسکو محبوب خلائق بنایا؟" سب نے کہا کہ "نہیں" بولا، "تو تم لوگ بدترین رفیق تھے، حالانکہ اس کو اسکی ضرورت تھی"[4]۔ ابن بطوطہ نے امرائے مصر کے متعلق لکھا ہے کہ یہ سب مسجدوں اور زاویوں کی تعمیر اور نیک کاموں میں باہم مقابلہ کرتے ہیں[5]۔ لیکن با اینہمہ نیکنامی

---

[1] نفح الطیب جلد اول صفحہ ۱۵۸، [2] احیاء العلوم جلد ۳ صفحہ ۲۴۹۔ [3] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۲۶۶۔
[4] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۱۵، [5] ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۰۔

اور محبوبیت و مقبولیت کی خواہش کوئی ناجائز خواہش نہیں ہے، اور اس میں اور نمود و نمائش میں بڑا فرق ہے، بہت سی فیاضیاں
صرف نام و نمود کے لئے کی جاتی ہیں، اور اُن سے نہ تو بہبودی خلائق کا مقصد حاصل ہوتا، نہ کسی پر احسان ہوتا، نہ نیکنامی اور محبوبیت
حاصل ہوتی، صرف چند دنوں کے لئے ایک شور و غل ہو جاتا ہے، عیش و عشرت، لہو و لعب، سیر و تفریح، اور شادی بیاہ میں جو
فیاضیاں کی جاتی ہیں وہ اسی قسم کی ہوتی ہیں، اور غالباً مسٹر وہی اسی قسم کی فیاضیوں کو نمائشی فیاضی قرار دیتا ہے۔ لیکن ہم نے سلاطین و امرا
کی فیاضیوں کی جو مثالیں جمع کی ہیں، وہ ان سے مختلف ہیں۔ اور تمام تر بہبودی خلائق سے تعلق رکھتی ہیں اور ان سے لازمی طور پر نیکنامی اور
محبوبیت حاصل ہوتی ہے، اور ہمارے سلاطین و امرا اسی نیکنامی اور محبوبیت کی خواہش رکھتے تھے، اگر وہ یہ خواہش نہ رکھتے تو صوفیانہ
یا مذہبی نقطۂ نگاہ سے یقیناً بہتر ہوتا، لیکن صوفیہ اور سلاطین و امرا کی اخلاقی حالت قدرتی طور پر مختلف تھی، اور نظری اور عملی زندگی میں
بڑا فرق تھا، صوفیہ نے جو اخلاقی نظرئے قائم کئے ہیں وہ مشکل سے عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں،

(۵) سب سے آخری بحث یہ ہے کہ ہمارے سلاطین و امرا جن لوگوں پر فیاضیاں کرتے تھے، اُن کی ضرورت اور حیثیت کا
لحاظ رکھتے تھے یا نہیں؟ نوعیت کے لحاظ سے ہمارے امرا و سلاطین کی فیاضیوں کو چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قرضداروں کی امداد، اور ہم نے اس قسم کے جسقدر واقعات نقل کئے ہیں، اُن سب سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے سلاطین و
امرا جن لوگوں کا قرض ادا یا معاف کرتے تھے، پورا پورا ادا یا معاف کر دیتے تھے، بلکہ کبھی کبھی خود اپنی طرف سے مزید عطیہ دیدیتے تھے،

(۲) طلبہ و علما کی امداد، اس سلسلے میں بھی ہمارے سلاطین و امرا کی فیاضیاں ان لوگوں کو معاش کی طرف سے بالکل مطمئن کر دیتی
تھیں، اور وہ اطمینان کے ساتھ تعلیم و تعلم میں مصروف رہتے تھے، صرف معاش ہی نہیں بلکہ ان کی ضرورت کے اور سامان مثلاً مکان، حمام
اور شفاخانہ وغیرہ کا بھی انتظام کیا جاتا تھا،

(۳) خاص خاص قابل اعانت لوگوں، مثلاً جذامیوں، اندھوں، اپاہجوں، بیواؤں، مسافروں، یتیموں اور بیماروں کی امداد اور
ان کے متعلق ہم نے جو واقعات نقل کئے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی ضروریات کا پورا سامان کیا جاتا تھا، یتیموں کی تعلیم کیلئے
معلم مقرر کئے جاتے تھے، مکاتب قائم کئے جاتے تھے، اندھوں اور اپاہجوں کی رہنمائی اور خدمت کے لئے خدام مقرر کئے جاتے تھے، جذامی
بچوں کے دودھ پلانے کا انتظام کیا جاتا تھا، مسافروں کو دو وقت کھانے کے علاوہ زاد راہ ملتا تھا، اور شفاخانوں میں مریضوں کے لئے
مناسب غذا اور دوا کا انتظام کیا جاتا تھا، اور بعض شفاخانوں میں مریضوں کو صحتیاب ہونے کے بعد جوڑے کا شوربا ملتا تھا،

(۴) عام فقرا و مساکین کی امداد اور ان کے متعلق بھی جو واقعات اوپر گذرے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی تمام ضرورتوں
کا لحاظ رکھا جاتا تھا، معاش کے علاوہ جاڑوں میں اُن کے تاپنے کے لئے آگ جلوائی جاتی تھی، ان کو گرم کپڑے دئے جاتے تھے، اور اُن
کے وضو کرنے کے لئے مسجدوں میں پانی گرم کروایا جاتا تھا،

افسانہ و محاضرات

ندامت

میری عمر کا چوبیسواں سال تھا لیکن میری منسوب
کہیں طے نہ پاسکی۔ آخر خدا خدا کر کے ایک جگہ اس شرط پر قرار پائی کہ
ابا جان شادی میں لین دین کرنے کے علاوہ چار ہزار روپے نقد
پیش کریں، ابا جان کی حیثیت اوسط درجے کی تھی، کہنے کو تو وہ سرکاری
ملازم اور گھر کے زمیندار بھی تھے، مگر ملازمت سے صرف نوے ۹۰
روپے ملتے تھے، اور گھر کی زمینداری سے سال بھر کے خرچ کے
لئے صرف غلہ مل جاتا تھا، ابا جان کی ملازمت اور جائداد کی ملی جلی
آمدنی سے گھر والوں کی سفید پوشی کا نباہ بڑے بھلے کسی طرح ہو جاتا
تھا۔ چنانچہ ابا جان کے لئے چار ہزار کی یکمشت رقم مہیا کرنا آسان نہ تھا،
مگر مجبوری میں کرتے کیا، مجھ کو پتھر کی سل کی طرح اپنے سینے پر لادے
کب تک رہتے، باپ دادا کی بچی کھچی جائداد کو فروخت کر کے چار ہزار
کی رقم تو پیش کر دی گئی، مگر پھر شادی کے لین دین کے لئے ان کے
پاس روپے نہ رہے، سرکاری ملازم تھے، اسلئے پروویڈنٹ فنڈ
سے اس شرط پر روپے قرض مل گئے کہ وہ اس کی وصولی اپنی تنخواہ
[illegible] سے ہر مہینہ کرتے رہیں گے [illegible] قرض کے
[illegible]
[illegible] سے صرف
[illegible]
[illegible] ابا جان نے شادی کی تاریخ [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible]

اور خاص خاص عورتوں کو آنے جانے کی اجازت تھی، مگر میں زیادہ
تر تنہا ہی رہتی تھی، اس تنہائی میں میرے دماغ میں خیالات کی
ایک دنیا آباد ہو گئی، میرے کسی خیال کی ابتدا کچھ بھی ہو لیکن اس کی
انتہا اسی پر ہوتی کہ میری شادی کے بعد ابا اور اماں کی مالی حالت بہت
ہی نازک رہیگی، جائداد تو فروخت ہی کر دی گئی، غلہ پھر کہاں سے آئیگا
تنخواہ میں دو سال تک ابا جان کو ایک حقیر رقم ملے گی، اس سے گھر کی
خانہ داری کیسے پوری ہوگی، گھر کے لوگ اچھا کھانے اور اچھا پہننے اور
پیسے پیسے کے لئے محتاج رہینگے، یہ شادی کا ہے کو ہوئی ابا جان کے
ہرے بھرے گھر کی بربادی ہوئی کاش میں اس دن کے لئے زندہ
نہ رہتی، میں پیدا ہوئی تھی تو زندہ دفن کر دی جاتی اس خیال کے
ساتھ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے، سہیلیاں مجھکو آنسو بہاتے
دیکھ کر سمجھتیں کہ میں ماں باپ سے علحدہ ہونیوالی ہوں، اسی لئے
میں رو رہی ہوں اور وہ بھی متاثر ہو جاتیں، میں اماں جان کی آیندہ
مالی پریشانی کو جتنا زیادہ سوچتی اتنا ہی زیادہ مجھکو اس کی ہولناک
تصویر نظر آتی پھر میری آنکھیں جھرنے کی طرح بہہ نکلتیں، روتے روتے
میری آنکھیں سوج گئیں، میرا چہرہ زرد ہو گیا، میرا کھانا پینا چھوٹ گیا
اماں جان کی ڈانٹ ڈپٹ اور سہیلیوں کے اصرار سے بمشکل دو چار
[illegible]

میں دیکھا کہ بہت دنوں کے بعد اماں جان کے گھر واپس آئی ہوں، وہ چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی ہیں، ان کی ساری جا بجا پھٹی ہوئی ہے۔ اور کہیں کہیں پیوند بھی لگے ہوئے ہیں، بال بالکل الجھے ہوئے اور میلے چکٹ ہیں۔ جیسے عرصہ سے سر میں تیل نہ پڑا ہو، پاؤں میں جوتیاں نہیں ہیں۔ اسی حالت میں وہ موٹی موٹی باجرے کی روٹیاں پکا رہی ہیں۔ میں اماں جان کے پاس جا کر بیٹھی ہی تھی کہ اباجان آ گئے، ان کے جوتے بالکل ٹوٹے ہیں، قمیص ایک مونڈھے پر بالکل پھٹی ہے، اور دوسرے مونڈھے پر جا بجا ٹلٹے ہیں، پائجامہ بہت ہی میلا ہے، مجھکو دیکھکر خوش ہو رہے ہیں، مگر دیر جانے کی عجلت ہے۔ اسلئے اماں جان نے جلدی جلدی باورچی خانہ ہی میں ایک پلیٹ میں باجرے کی روٹی اور ایک تشتری میں تیل اور نمک کھانے کے لئے دیدیا اباجان نے اس موٹے جھوٹے کھانے کو کھانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھکر میرے منہ سے ایک چیخ نکلی،

چیخ کے ساتھ میری نیند بھی ٹوٹ گئی، اور میں زور زور سے رونے لگی، گھبراہٹ میں عورتیں میرے کمرہ میں چلی آئیں، اور مجھکو اسطرح روتے دیکھکر پریشان ہو گئیں، اماں جان میرے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئیں، اور میں بے تحاشا ان سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگی، اماں جان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے، ان کا رونا تھا کہ گھر کی عورتیں بھی رونے لگیں، پھر تو کمرہ میں کہرام مچ گیا، اسی ہنگامہ میں پڑوس کی ایک عورت بولیں لڑکی ماں باپ سے چھوٹ رہی ہے، کیوں نہ روئے، پھر ماں باپ بھی ایسے جنہوں نے اس کو پرورش اور لاڈ پیار میں خون پسینہ ایک کر رکھا تھا،

یہ سنکر میں اور بھی زار و قطار رونے لگی، ہچکیاں پڑ گئیں گھگھی بندھ گئی، عورتوں نے ہر طرح کی تسلیاں دیں، مگر یہ بے آنسو نہ تھم سکے۔

ایک گھنٹہ کے قریب میں اس طرح روتی رہی اور جب چپ ہوئی تو میری طبیعت ہلکی تھی مگر میرا دل "ان" کی طرف سے غیظ و غضب سے بھرا ہوا تھا، اور میں سوچنے لگی کہ میں میموں پارسنوں اور پردہ سے باہر نکلنے والی عورتوں کی طرح آزاد اور بے باک رہتی تو میں "ان" کے پاس جا کر کہتی کہ انہوں نے اپنا رشتہ اور تعلق روپوں اور جہیز کی چیزوں سے پیدا کیا ہے، تو ان ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا اور شریک حیات بنائیں، اور "ان" پر لعنت ہے جو شادی کے بعد مجھ سے کسی قسم کا واسطہ رکھیں، وہ خوش ہونگے کہ شادی کے بازار میں ان کی قیمت خوب لگی، چار ہزار روپے اور جہیز کی چیزیں علاوہ، مگر روپوں کے لوبھی اور جہیز کی چیزوں کے لالچی کو کیا معلوم کہ سونے اور چاندی کی دولت حاصل کر کے ساس سسر اور جیٹھ کہ بیوی کی محبت کی بیش بہا دولت ہمیشہ کے لئے کھو دی، کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کی زندگی کی بنیاد دونوں کے دلوں کے میل ملاپ اور لگی لگی ہوئی ہو اس کی صورت یہی ہوتی ہے کہ جس کی کہ کھ میں بیوی نے جنم لیا ہے، اس کا خون چوس کر کے اور اس کو بے آب و دانہ کر کے چھوڑ دیا جائے یا جس گھر میں بیوی نے اپنی زندگی کے بہترین وقت گذارے اس کو ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کر دیا جائے،

ان کی خواہش ہو گی کہ میں ان کی لونڈی اور خادمہ بنکر رہوں گی، وہ تمنا کرتے ہونگے کہ میں ان کی گرویدہ اور شیفتہ بنکر ان کی محبت میں ہمیشہ دیوانی رہوں گی، ان کے دل میں حوصلہ ہو گا کہ میں اپنے جذبات اور خیالات کو ان کے جذبات اور خیالات میں گم کر دوں گی، مگر ان خواہشوں، تمناؤں اور حوصلوں کو پورا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہ مجھکو میرے ماں باپ کے گھر سے اسطرح لے جائیں کہ پھر وہاں بڑیاں گڑ گڑاکر [illegible] کے لئے [illegible] جائیں یہ سوچکر میرا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، اور میرے منہ سے [illegible]

نکلا" خدا کی پھٹکار ہو ایسے شوہر پر"!

اس غصہ کے ساتھ مجھ میں انتقام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر گیا، مگر میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ ایک عورت جس کی بیچارگی، مجبوری اور بے بسی مشہور ہے اپنے شوہر سے کیا بدلے سکتی ہے، بیوی کی حیثیت ہی کیا، تین کوڑی کی بھی نہیں، وہ تو شوہر کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے، جس کو وہ جس طرح چاہے نچائے اور اچھالے یہ سوچکر میری آنکھیں نم ہوگئیں، مگر پھر خیال آیا کہ بے بس سہی، مذہب اور شریعت کے مطابق ان کی محکوم سہی، اور رسم و رواج کے رو سے ان کی ادنیٰ خادم سہی، لیکن میرا دل تو ان کا محکوم نہیں، میری روح تو ان کی خادم نہیں، میرے ہاتھ اور پاؤں کو وہ اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں، مگر میرا دل تو ان کا تابع نہیں ہوسکتا ہے، میں دل رکھتی ہوں، دل کے اندر جذبات اور جذبات میں گہرائی اور اتار چڑھاؤ بھی، اپنے جذبات سے متاثر ہوکر ان سے اظہار کئے بغیر قلبی نفرت کروں تو پھر وہ کیا کر سکتے ہیں، ممکن ہے کہ اپنی نسوانی اور شرافت اور شرعی احکام کے ڈر سے مجبور ہوکر ان سے نفرت نہ کروں، مگر ان کی طرف سے میرے دل کی گہرائیوں میں کراہت کی لہریں اٹھ اٹھ کر میرے اور ان کے تعلقات میں جو ہلچل پیدا کریں گی اس کا ان کے پاس کیا علاج ہے، شاید ان لہروں کو [illegible] میں دبا کر رکھنے کی کوشش کروں، مگر ان سے غیر اختیاری طور پر میری اور ان کی محبت میں جو کشیدگی اور خلش پیدا ہوتی رہے گی، اس کی روک تھام کسی کے بس میں نہیں، اس معاملہ میں میری نسوانی شرافت اور ان کی جابرانہ قوت بھی بالکل بے سود رہیگی، مگر اس کی ذمہ دار میں نہیں ہونگی، بلکہ وہ خود ہوں گے، اور ان کا چھچھورا پن!

خیالات کے اسی طوفان اور سیلاب میں پندرہ دن گذر گئے، اور برات کی تاریخ اسی قمری مہینہ کی پندرھویں تاریخ کی رات کو جب افق پر چاند آگ کے ایک بڑے گنبد کی طرح نمودار ہو رہا تھا اور شفق پر سرخی چھائی ہوئی تھی، کہ برات کی آمد کا شور و غل ہوا، مجھکو ایسا محسوس ہوا کہ اس برات کے آنے سے چاند ابا جان کی آیندہ تکلیف اور عسرت بھری زندگی پر خونیں ماتم کرنے کو آج نکلا ہے، میں آبدیدہ ہوگئی، برات قریب پہونچی تو باجے اور ڈھول کی آواز میرے کانوں میں آئی، ان کو سنکر میں پھر غیظ و غضب سے بھر گئی، یہ باجے اور ڈھول! "وہ" آخر کس لئے لائے ہیں، اپنی امارت اور ریاست کی شان دکھلانے کے لئے! امارت اور ریاست ہوتی تو چار ہزار روپے کی بھیک مانگتے، توبہ، ڈھول اور باجے لاتے ہوئے شرم بھی نہ معلوم ہوئی، حلوائی کی دوکان پر باپ دادا کا فاتحہ پڑھنے چلے ہیں، مگر شرم ہوتی تو پھر روپے کے لئے گداگری کیوں کرتے، مگر آہ! یہ باجے! یہ ڈھول تو شادیانے ہیں، ابا جان کے گھر کے لٹ جانے اور ان کے مفلوک الحال ہو جانے پر، ان باجا بجانے والوں کا ستیا ناس ہو: ....

لونڈیاں گیت بھی گا رہی ہیں، کا ہیکو! اماں جان کی تباہی پر، خدا کرے ان گیت گانے والیوں کے حلق میں کیڑے پڑیں........ برات دروازے سے آ گئی، گھر کی عورتوں نے چیخ چیخ کر گیت گانا شروع [illegible] گیت گانے پر مجھکو بڑا غصہ آیا کہ یہ کیسی بے شرم ہیں کہ ایک سنگدل لٹیرے اور ظالم ڈاکو کا خیر مقدم گیت اور راگ سے کر رہی ہیں، میرا بس چلتا تو میں کمرہ سے نکل کر ان کو ڈانٹ کر چپ کر دیتی، بلکہ ان کے منہ اپنے ہاتھوں سے جاکر بند کر دیتی، "وہ" اندر داخل ہوئے تو اماں جان نے ان کی بلائیں لیں، زری کے ہار پہنائے اور پھر چاندی کے کٹورے میں شربت پلایا، اماں جان سے میری طبیعت جھلائی کہ وہ بھی کیسی بے حیثیت ہیں کہ جس نے ان کے آرام و آسائش کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے، اس کی آؤ بھگت اس شان سے کر رہی ہیں، "ان" کی اس فتح اور کامرانی اور اماں جان کی بزدلی اور شکست،

ری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے،

دوسری رات کو شاہانی رات تھی، دن کو عورتیں اور
یاں حجلۂ عروسی کو سجاتی رہیں، گیت گا گا کر چونے اور مختلف
کے رنگوں سے در و دیوار پر پھول، پتیاں، اور جالیاں بنائیں
ت میں سرخ رنگ کی چھت گیر لگائی، دروازوں پر پٹاپٹی چھاپ
پردے ڈالے، نیچے زمین پر دری اور چاندنی بچھائی، اس فرش
یک طرف سنگار دان کی میز لگائی اس پر اودے اودے رنگ
شیشے کے گلدستے رکھے، اور ان میں ہری ہری پتیوں کے
تھ گلاب کے بڑے بڑے پھول چن دئے، آخر میں بستر کو سہاگ
خوشبو سے بسایا، مجھکو یہ ساری آرائش بہت ہی گراں گزر رہی
ا، میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھکر دیواروں کے نقش و نگار کو مٹا دوں،
ت گیر کی کیلوں کو اکھاڑ دوں، پردے اور فرش کو اٹھا کر پھینک
وں، گلدستے کو توڑ دوں، یہ آرائش آخر کاہے کو ہے؟ ان کیلئے
در و دیوار پر روپوں کے نقشے چاہئیں تب ہی ان کی آنکھوں میں
رت کی لہریں دوڑ رہی ہوں گی۔ فرش، نقش و نگار اور خوشبو کے بجائے
ن کے لئے روپوں کی ڈھیر چاہئے۔ اسی پر بیٹھکر ان کے دل کو
ت اور کلیجہ کو ٹھنڈک پہونچیگی، مگر میرا سارا غصہ آنسو بن بن کر
ری آنکھوں سے نکلتا رہا۔

رات آئی تو رسمیں شروع ہوئیں، مگر تمام مراسم کے
رمیان نہ صرف میری آنکھیں روتی رہیں، بلکہ دل بھی روتا رہا،
جب سارے ہنگامے ختم ہوگئے تو میں حجلۂ عروسی میں لائی گئی
ہوتیں ایک ایک کرکے رخصت ہوئیں تو آخر میں میری انا رہ گئی،
نے لگی تو میں اس سے لپٹ گئی اور خوب روئی، اس نے
[illegible] مگر میرے آنسو نہ تھم سکے بالآخر وہ مجھ کو
[illegible] وہ [illegible] فرش پر بیٹھے تھے،

جب میری ہچکیاں بند ہوئیں تو وہ فرش سے اٹھکر مسہری پر آئے،
مسہری پر ان کا آنا تھا کہ میں پھر رونے لگی، مجھکو ایسا محسوس ہوا کہ ایک
بڑا سانپ جو گھر والوں کو ڈس چکا ہے، اب مجھکو کاٹ کھانے کو
آیا ہے، میرا جی چاہا کہ مسہری سے کود کر کمرہ سے بھاگ جاؤں، مگر
ہمت نہ پڑی، اور بے بس ہوکر روتی رہی، وہ خدا جانے کیا کیا
کہتے رہے، مگر میں مسہری کی پٹی پکڑے ہوئے اسی طرح کروٹ
لئے پڑی رہی۔

دوسرے دن رخصت ہوکر میں "ان" کے گھر آئی اور وہاں
تین دن رہی، ان تین دنوں میں انہوں نے مجھ سے طرح طرح کی
باتیں کرنے کی کوشش کی، مگر میں نے جواب میں "جی ہاں" "جی نہیں"
"کیا معلوم" "نہیں معلوم" "خدا جانے" کے کہنے کے سوا ان سے
کوئی بات نہیں کی، چوتھے دن میں ان کے ساتھ اپنے میکے آئی، انکا
کالج کھل رہا تھا اس لئے وہ ایک روز کے بعد ہی پٹنہ چلے گئے،

ان کے جانے کے بعد تیسرے روز مجھکو ان کا ایک خط
ملا، خط کاہے کو تھا عشق و محبت کا افسانہ تھا، رنگ برنگ کے القاب،
طرح طرح کے اشعار، اور اپنی محبت کی شدت کا اظہار، مجھکو خط پڑھکر
بے حد غصہ آیا کہ جس شخص نے روپے اور جہیز کی چیزوں کی خاطر
شادی کی ہو، وہ محبت کرنی کیا جانے میں لفافہ کو پھاڑ کر پھینک دیا
اور جواب دینے کی تکلیف گوارا نہ کی، تین روز کے بعد ان کا لفافہ
پھر آیا، اپنی محبت کی داستان پھر سنائی تھی، اور واپسی ڈاک سے
جواب کا تقاضا تھا، ان کے خط میں دو تین جملے یہ تھے "میں تمہاری
جدائی میں دیوانہ ہو رہا ہوں، میری محبت کی قدر کرو، میرے جذبات
کو پامال نہ کرو"۔ ان کے جذبات! کاش یہ جذبات گوشت و پوست
کے ہوتے اور میں ان کو ہاتھوں سے چھو سکتی، پھر تو اپنی مٹھی میں لیکر مسل
دیتی، اور پاؤں کے نیچے ڈال کر جوتیوں سے کچل دیتی، رہ جاتے بے چارے!

دولت کے حریص! عورت کی بیچارگی اور بےبسی سے فائدہ اٹھاکر اس کے ساتھ صرف الفاظ سے کھیلنا چاہتے ہو۔ میں نے اسی غصہ میں بغیر کسی القاب کے جواب لکھنا شروع کیا کہ "آپ کا لفافہ ملا جواب میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ میں خیریت سے تھی اس لئے خط لکھنا ضروری نہ سمجھا اور آپ بھی جب تک مع الخیر ہوں خط لکھنے کی زحمت گوارا نہ کریں، خواہ مخواہ پیسے کیوں برباد ہوں، البتہ یہ مودبانہ گذارش ہے کہ آپ کے خط میں عشق و عاشقی کی ایسی داستان تھی کہ اس کو پڑھنا ایک شریف گھرانے کی لڑکی کے لئے بالکل زیبا اور موزوں نہیں، آپ نے اپنے جذبات کی فراوانی دکھائی ہے اور مجھ سے بھی اپنے جذبات کا اظہار چاہتے ہیں۔ مگر ایک عورت کے پاس جذبات کہاں ہوتے ہیں، جو وہ ان کا اظہار کرے ایک عورت جب بیوی بنجاتی ہے تو اس کی جنس اور بھی ذلیل تر، اور کم مایہ ہوجاتی ہے۔ (یہاں پر میرا بے اختیار جی چاہا کہ لکھدوں کہ اتنی ذلیل اور کم مایہ کے اس کے والدین چار ہزار روپیے دیکر کسی کے گلے منڈھ دیتے ہیں، مگر مصلحتاً نہ لکھ سکی) تو پھر ایک ذلیل اور کم مایہ جنس جذبات سے کیسے آشنا ہوسکتی ہے، اور جب وہ جذبات سے خالی ہے تو وہ نہ اس لائق ہے کہ کسی سے محبت کرے اور نہ اس سے کوئی محبت کرے، بیوی تو مردوں کی منجملہ اور ضرورتوں کی ایک ضرورت ہے، پھر اس سے محبت کی شدت کا اظہار کیوں کیا جائے ...."

غصہ میں خدا جانے کیا کیا لکھنا چاہتی تھی، مگر میں نے قلم روک کر لفافہ بند کر دیا، اور ڈاک گھر بھجوا دیا، اس کو پڑھکر معلوم نہیں ان پر کیا اثر ہوا، انہوں نے پھر مجھکو کوئی خط نہیں لکھا، لیکن پندرہ روز کے بعد بلا اطلاع دو دن کے لئے خود ہی آگئے۔ وہ آئے تو مجھکو ایسا محسوس ہوا کہ مجھ میں ان سے [illegible] نہیں طاقت مانگ بھرے۔ اماں جان تو ان کے لئے کھانے کو تیاری کرنے لگیں۔ مگر میں انتقام کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اماں جان نے جلدی سے مرغ ذبح کیا اور بریانی کے لئے چولہے پر دیگچی چڑھادی، میں نے اماں جان کو پرتکلف کھانا پکانے سے روکا اور بہت ہی تیکھی ہوکر کہا "آخر اتنی خاطر و تواضع کی کیا ضرورت ہے، چار ہزار روپے تو حوالہ کرہی دئے گئے ہیں،" مگر ماں کا دل تھا۔ داماد پہلی بار آئے ہوئے بغیر کیسے رہتیں۔ اس شکست پر مجھ میں انتقامی جذبہ اور بھی ابھر آیا، اماں جان نے جلدی سے مجھکو کمرہ صاف کرنے اور کپڑے بدلنے کو حکم دیا۔ کمرہ بہت ہی گندہ ہو رہا تھا، مسہری پر کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا، فرش جا بجا الٹ گیا تھا اور اس پر کوڑا کرکٹ جمع تھا، سنگاردان بھی گرد آلود تھا، غرضکہ کمرہ بالکل کوڑا کباڑ خانہ ہو رہا تھا، میرے کپڑے بھی صاف نہ تھے، بال الجھے ہوئے تھے، چوٹی کئی روز سے نہیں گوندھی تھی، مگر میں نے نہ کمرہ صاف کیا اور نہ اپنے میلے کپڑے اتارے، وہ کھانا کھاچکے تو اماں جان نے ان کو اندر بلانا چاہا، مگر میں نے مختلف وجوہ بتاکر توقف کرنے کو کہا، آخر آنے کے پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ اندر بلائے گئے ملتے کے ساتھ ہی کہا۔

"میں باہر انتظار میں تمہارے لئے قیامت کی گھڑیاں کاٹ رہا تھا۔"

میری آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور فوراً کہا۔

"آخر جلدی کیا تھی"

یہ جملہ تیر کی طرح پیوست ہوا، مگر انہوں نے اپنے رنج و ملال کو چھپاتے ہوئے فوراً کہا۔

"تم ایسی میلی کچیلی کیوں ہو، کمرہ بھی پراگندہ ہو رہا ہے، آخر کیوں؟"

میں نے سنبھل کر یہ کہتے ہوئے پھر ایک [illegible]

"کپڑے بدلنے اور کمرہ صاف کرنے [illegible] تھی"

اسی وقت اپنی انا کو پکارا کہ وہ کمرہ کو آکر [illegible] کر دے، وہ کمرہ صاف

...تی رہی، اور وہ خاموش إدھر اُدھر چہل قدمی کرتے رہے، جب
...ہ صاف ہوا تو وہ مسہری پر آکر بیٹھے، میں بھی سر نیچا کرکے فرش پر ایک
...گوشہ میں چپ چاپ بیٹھی رہی، تھوڑی دیر تک بالکل خاموشی
...رہی، آخر وہ خود بولے "ذرا میری اٹیچی تو باہر سے منگوالو، اس میں
تمہارے لئے کچھ تحفے لایا ہوں"

اٹیچی آئی تو انہوں نے بڑے شوق سے تحفے کی ایک
ایک چیز نکالی اور کہنا شروع کیا، "یہ نہانے کے بعد استعمال کرنے
کا پاؤڈر، یہ چہرہ پر لگانے کا پاؤڈر ہے، یہ آئی سیما ہے رات کو
سوتے وقت چہرہ پر ملنے کے لئے، اور یہ دوسرا آئی سیما صبح کے
وقت چہرہ پر لگانے کا ہے، یہ پومائی ہے، اور یہ سینٹ چھڑکنے
کا ہے، اور تھوڑی سی لپ اسٹک بھی لے لی ہے، تاکہ تم اس کو
اپنے لبوں سے لگاکر بالکل میم معلوم ہونے لگو" وہ بہت شوق سے
چیزیں نکال کر میرے سامنے پیش کر رہے تھے، میں نے سوچا کہ میں
ان کو اپنی باتوں سے کافی گھائل کر چکی ہوں، اس لئے ان تحفوں
کو ہنسی خوشی قبول کرکے ان کی دلجوئی کردوں، یہ سوچ رہی تھی کہ
وہ اٹھے، اور میری طرف بڑھکر کہنے لگے،

"لاؤ تمہارے چہرہ پر پاؤڈر مل کر دیکھوں کہ تم
کیسی معلوم ہوتی ہو"

ان کے اٹھنے کے ساتھ میں بھی اُٹھ گئی، اور وہ پاؤڈر
ملنے کے لئے آگے بڑھے تو میں چھٹک کر ایک گوشہ میں چلی گئی، وہ
پھر میری طرف بڑھے، لیکن میری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکل گئے،

"میں کوئی بازاری عورت نہیں کہ اس قسم کا سنگار کروں"

یہ سنکر ان کا چہرہ بالکل پژمردہ ہوگیا، رنج وملال سے
...سیانے سے ہوگئے، اور میں ان کے چہرہ کی کیفیت دیکھتی ہوئی
...رہ سے باہر چلی گئی، ... گھنٹہ کے بعد لوٹی تو مصمم ارادہ تھا کہ

اب کوئی جلی کٹی باتیں نہ کہونگی، ورنہ میری زیادتی ہوگی، کمرہ میں
داخل ہوئی تو وہ ہنسکر بولے۔

"کہاں چلی گئی تھیں مجھکو چھوڑکر" اس کے جواب میں میری
زبان پھر نہ رکی، اور میں کہہ گئی۔

"جاکر کام میں مشغول ہوگئی، آپ کا خیال نہ رہا"

آخری جملہ سنکر وہ پھر مضمحل ہوئے، میری ان ہی زہریلی
باتوں میں دو روز گذر گئے۔

ڈیڑھ مہینے کے بعد وہ پھر آئے اور ایک ہفتہ رہے، میں نے
ان کا خیر مقدم اسی سرد مہری، بے رخی اور بے توجہی سے کیا، مگر
اس مرتبہ میری گفتگو میں تیکھاپن کم تھا، ایک روز میں بہت زیادہ
بے تکلف ہوکر باتیں کر رہی تھی، میری گفتگو میں نرمی اور ملائمت
پاکر وہ بولے "میرے بی، اے، کا امتحان قریب آرہا ہے،
دعا کرو کہ میں اچھے درجوں میں کامیاب ہوجاؤں" میں نے
آمین کہا اور نمازوں میں بھی دعا کرنے کا وعدہ کیا، اس سے ان کی
ہمت اور بھی بڑھی، اور بولے "پاس ہوجاؤں گا تو پھر ایک
اچھی نوکری کے لئے کوشش کروں گا" میری طبیعت میں گدگدی
پیدا ہوئی، اور میں نے ضبط کرنے کی ہزار کوشش کی لیکن پھر
بھی بول اٹھی،

"نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے"

وہ بولے،

"کیوں"

میری زبان بالکل بے قابو ہوگئی اور میں نے غیر اختیاری
طور پر یہ فقرہ چست کر ہی دیا۔

"چار ہزار روپے ہم دونوں کی زندگی کے لئے کافی ہیں"

یہ سنکر وہ تلملا گئے، ان کا چہرہ تمتما اٹھا، آنکھیں رنج وملال،

درعضہ کی ملی جلی کیفیت سے بہت ہی خوفناک ہوگئیں، قریب
تا کہ میں ڈر سے کانپنے لگوں، لیکن کچھ بہانہ کر کے کمرہ سے باہر
لی گئی،

شادی کے بعد چھ مہینے اور گذر گئے، انہوں نے امتحان
یا، اور بحمد اللہ کامیاب بھی ہوگئے۔ مجھکو اندرونی طور پر مسرت
ہوئی، مگر میں نے اس کا اظہار نہ کیا، نتیجہ نکلنے کے بعد وہ مجھکو اپنے
رے گئے، وہاں پہونچکر میں زیادہ تر کوٹھے ہی پر رہتی، میرے کمرہ
ں کوئی آجاتا تو میں اس سے باتیں کرلیتی، ورنہ میں کمرہ میں بستر
پڑی رہتی، میکے کی یاد ستاتی اور اس سے زیادہ اماں جان لعہ
جان کی تکلیف اور عسرت بھری زندگی کا خیال پریشان کئے
ہتا، اسی طرح کئی ہفتے گذر گئے، ایک روز وہ باتیں کر رہے
ھے کہ بولے۔

" اماں جان کو تم سے شکایت ہے کہ باورچی خانہ کے
وں میں تم ان کا ہاتھ نہیں بٹاتی ہو"

یہ سنکر میرے سارے بدن میں آگ لگ گئی، میں
بلا کر بولی۔

" کام کرنے کے لئے پھر کوئی دائی کیوں نہیں رکھ لیجاتی
ہے۔ آخر یہ چار ہزار روپے کس دن کام آئینگے۔ میرے گور و کفن
ں لگائے جائیں گے "

یہ سنکر وہ ایک زخمی سانپ کی طرح بل کھاکے رہ گئے۔

دو سال اور گذر گئے، اس اثنائیں انہوں نے ملازمت
لئے سارے جتن کئے مگر ملازمت کہیں نہیں ملی، روپے
ے پانی کی طرح بہائے، مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہوئے
ے بڑے عہدہ داروں کی دربانی کی، خطاب یافتوں کی مجلسوں
مصاحبت کی اور در در خاک چھانی، مگر کہیں امید بر نہ آئی، ہشتے

ئی کمی، آیندہ زندگی کی تاریکی اور بے روزگاری کی ذلت و خواری
سے ان کا جسم گھلنے لگا، تردد اور فکر سے ان کی ساری ہنسی خوشی
ملیامیٹ ہوگئی،

مصیبت تنہا نہیں آتی، وہ ایک ملازمت کی امید میں
پٹنہ گئے ہوئے تھے، کہ بیمار پڑ گئے، شروع میں خیال تھا کہ معمولی بخار
ہے۔ مگر چند روز کے بعد ڈاکٹروں نے خطرناک قسم کا ذات الجنب
(پلوریسی) بتایا، یہ سنکر میرے ہوش ٹھنڈے ہوگئے، اور مجھپر ایک
جنون کی کیفیت طاری ہوگئی، جی چاہا کہ اماں جان کو لیکر پٹنہ چلی جاؤں
اور ان کی خدمت میں اپنی جان گنوادوں، مگر جس مکان میں وہ مقیم
تھے وہاں عورتوں کے رہنے سہنے کا انتظام نہ تھا، علاج کی سہولت
کی وجہ سے وہ پٹنہ سے ہٹائے بھی نہیں جاسکتے تھے، میری سمجھ
میں نہ آیا کہ پھر کیا کروں، کچھ بس نہ چلا تو نمازیں پڑھ پڑھ کر سجدے
میں پڑی رہتی، اللہ تبارک تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی شفایابی کیلئے
زاری کرتی، گڑگڑاتی، روتی، جس کسی نے جو دعائیں بتائیں ان کو
چلہ باندھکر پڑھتی، کسی دعا کو لاکھ لاکھ بار رو رو کر پڑھا پھر بھی میری
تسکین نہ ہوتی، مجھکو بار بار خیال آتا کہ وہ میری جلی کٹی اور تیکھی باتوں
ہی کے صدمہ سے بیمار پڑے، میں نے ہمیشہ سخت باتیں کہہ کر ان کا
دل دکھایا، کبھی ان سے ہنس کر نہیں بولی، اب ان ہی گناہوں
کی سزا ہے، وہ حریص اور لالچی سہی، پھر بھی میرے شوہر تھے، میرے
سر تاج، میری دنیا کے مجازی خدا، میں نے ان کو دکھ پہنچایا تو اب
اس کی سزا کیوں نہ بھگتوں، یہ سوچکر میں اضطراب میں کبھی رونے اور کبھی
ٹہلنے لگتی، اور پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتی کہ میں اب انکے
دل کو کبھی دکھ نہیں دوں گی، ان سے پھر کبھی سخت باتیں نہیں کرونگی،
اور ان کو نیچی نظر سے نہیں دیکھوں گی، اس عہد کے باوجود مجھکو تسلی
نہ ہوتی، اور میں نے اپنے گناہوں کے کفارہ میں روزے رکھے،

مسکین کو کھانے کھلائے، خیرات تقسیم کی، لیکن خدا کی مصلحت سے ان کی حالت نہیں سنبھلی، میری حالت اور بھی بدتر ہو گئی، میں جنون اور بے بسی میں اماں جان کو لیکر حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد بہاری کے یہاں بہار پہونچ گئی، درگاہ کے پھاٹک پر پہونچی تو بھکاری اور بھکارنوں کا ہجوم لگ گیا، میں نے دل کھول کر ان کے ہاتھوں میں دو نی چونی، اٹھنی، اور روپے دیدئے، جو کچھ میرے پاس تھا، سب ان لوگوں میں تقسیم کر دیا کہ شاید ان ہی کی دعاؤں سے وہ صحت یاب ہو جائیں، مزار شریف کے پاس پہونچی تو بے تحاشا قبر سے جا کر لپٹ گئی، رو ئی، گڑگڑائی، بلکہ قبر سے سر کو ٹکر مار کر زاری کی، جی چاہا کہ قبر کو پھاڑ دوں اور مخدوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں سے جا کر لپٹ جاؤں کہ خداوند قدوس سے وہ میرے شوہر، میرے آقا، دنیا کی تمام عزیز ترین چیزوں سے زیادہ عزیز صحت کی بھیک دلا دیں، خدا جانے میں کتنی دیر تک مزار مبارک سے اسی طرح لپٹی رہی، اماں جان نے یہ کہہ کر اٹھایا اب چلو کافی دیر ہو گئی، مگر میں نے کہا، جب تک ان کے شفا یابی کی خبر نہ آئے گی میں اسی طرح مزار شریف سے لپٹی رہوں گی، لیکن مجاوروں نے کہا کہ یہ بے ادبی ہے، تو میں ڈر سے اٹھ کر علحدہ ہو گئی، وہاں سے چلی تو مجاوروں نے درگاہ میں روشنی جلانے کے لئے کچھ نذرانے مانگے، فقیروں کو دیدینے کے بعد میرے پاس ایک پیسہ بھی باقی نہ رہا، مگر میں نے فوراً اپنے کانوں کی [illegible] نکال کر پیش کر دئیے کہ شاید یہ نذرانے مخدوم صاحب کے یہاں [illegible] جائیں، اور ان کو صحت ہو جائے،

[illegible] ان کی حالت اچھی نہیں [illegible] تو آنکھوں نے خطرے سے خالی نہیں [illegible] ان کو دیکھنے [illegible] بے چین ہو گئی، [illegible] اماں جان کو لیکر پٹنہ پہونچ گئی، [illegible] کمرہ میں داخل ہوئی تو میں ان کو پہچان نہ سکی، آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، چہرہ پر جھریاں [illegible] رنگ گئی تھیں، بدن میں [illegible] ہڈیاں اور پسلیاں نظر آتی تھیں - ہاتھ پاؤں دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا تھا، میں ان کو دیکھکر تاب نہ لا سکی، فوراً کمرہ سے باہر آ گئی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، مگر پھر اپنے کو سنبھالا، ہشاش بشاش ہو کر ان کے پلنگ کے پاس پہونچی، اور پنکھا جھلنے لگی،

معلوم ہوا کہ پیسے کی کمی سے بھی علاج میں کوتاہی ہو رہی ہے، میں نے "ان" کے چھوٹے بھائی کو بلا کر چپ چاپ سے اپنے گلے کے سارے زیورات دے کر ان کو فروخت کر کے روپے خرچ کریں، ان کو تامل ہوا، لیکن میں نے قسمیں دیں، ضد اور اصرار کیا، تو وہ راضی ہو گئے، روپے کے آجانے سے اچھے اچھے ڈاکٹر بلائے گئے، اور ہر قسم کی دوائیں آئیں، کمرہ بھی میلا کچیلا ہو رہا تھا، میں نے فنیل سے دھویا، تمام چیزیں ترتیب سے رکھیں، ان کے کپڑے اور بستر کی چادر بدلی، اور ان کے تمام کام اپنے ذمہ لے لئے ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ اسپنج روز ہو، میں نے خود اسپنج کرنا شروع کیا، وقت سے دوائیں پلائیں، غذائیں دیں، پلنگ کی پٹی کے کنارے ہمیشہ بیٹھی پنکھا جھلتی رہی، اور وہ رات کو سو جاتے تو میں رات کی تنہائی اور تاریکی میں خدا کی بارگاہ میں ان کی صحت کے لئے گڑگڑاتی روتی، زاری کرتی، اکثر راتیں مصلے پر بیٹھی بیٹھی گذار دیتی -

اکیس ۲۱ دن تک میں نے ایک پاؤں پر کھڑی ہو کر ان کی تیمار داری کی، اور اکیس ۲۱ راتیں مسلسل جاگ کر ان کے لئے دعائیں کیں، [illegible] اللہ میری محنت بارآور اور دعائیں مقبول ہوئیں اور خداوند تعالیٰ نے ان کو صحت دی، مگر ڈاکٹروں نے مزید صحت کے لئے رانچی میں کچھ دنوں قیام کرنے کی ہدایت دی، علاوہ [illegible] سارے [illegible] روپے خرچ ہو گئے تھے، اس لئے [illegible] دیو [illegible]

میں نے پوشیدہ طور پر اس مرتبہ اپنے کانوں اور ہاتھوں کے زیورات فروخت کئے، اور ان کو ہر طرح اطمینان دلا کر ساتھ لیکر رانچی چلی گئی۔

رانچی میں ٹھیکیدار ... کے پاس سستے داموں میں ایک بنگلہ مل گیا، اور وہاں ہم لوگوں کا قیام تین مہینے تک رہا اس اثناء میں ان کے ساتھ میں سایہ کی طرح آگے پیچھے رہی صبح اور شام وہ ٹہلنے جاتے تو میں بھی برقعہ پہنکر ساتھ ہو جاتی، ٹہلتے ٹہلتے تھوڑی دور جاکر پہاڑ کے ایک ٹیلہ پر ہم لوگ بیٹھ جاتے، نظروں کے سامنے ایک بہت حسین اور پر فضا وادی ہوتی جہاں جو کھیتوں کی ہریالی، جنگلی پھولوں کی خوشنمائی اور درختوں کی شادابی کی وجہ سے ایک جنت آباد تھی، اس جنت میں ہم لوگ بیٹھکر قدرت کے نظارے دیکھکر محظوظ ہوتے، دور سے جنگلی باشندوں کے گیت کے نغمے فضا کو اور بھی پر کیف بنا دیتے صحت بخش مگر شوخ ہوائیں کبھی میرے برقعہ کے پلو اور دامن اور کبھی میری زلفوں سے اٹھکھیلیاں کرتی گذرتیں اور مجھکو ایسا معلوم ہوتا کہ قدرت کی طرف سے یہ خوشگوار مناظر اور دلا دیز نغمے صرف ہم دونوں کے لئے ہیں، اور اسوقت دنیا میں ہم دونوں سے زیادہ مسرور اور بشاش افراد شاید کوئی بھی نہیں۔

تین مہینے کے بعد ہم لوگوں کا قافلہ ٹیکسی سے وطن کی طرف واپس ہوا، رانچی سے جس وقت موٹر روانہ ہوئی مجھکو محسوس ہوا کہ میں کوئی بہت بڑی سلطنت فتح اور ایک بیش بہا دولت حاصل کر کے جا رہی ہوں، موٹر جو بل کے جنگلوں سے اچھی اور بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی، تو دونوں طرف شیشم اور صنوبر کے درخت جھک جھک کر میری نصرت و کامیابی پر مبارکباد دے رہے تھے ... جنگلی پھولوں کے پودے بھی جھوم رہے تھے اور ان کی ... کہ ... گھر پہنچ کر ... پابندی سے پھر

رانچی سے آنے کے چھ مہینے بعد ان کو مظفرپور کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی، تنخواہ تھوڑی تھی مگر اس کو میں خدا کی رحمت و برکت سمجھکر سجدہ شکر بجا لائی، ملازمت پر جانے کے ایک مہینہ بعد انہوں نے مجھکو بھی بلا لیا، دس روپے کرایہ کا ایک مکان لے لیا گیا تھا جو چھوٹا تھا لیکن ہم دونوں کے لئے آرام دہ تھا، اوپر کے کام کرنے کے لئے ایک ملازم بچہ بھی رکھ لیا گیا یہاں میری صرف دو دلچسپیاں تھیں، صبح سے شام تک ان کے ناشتے اور کھانے کے لئے انتظام کرتی اور چار بجے شام کو جب ان کے اسکول سے واپس ہونے کا وقت ہوتا تو میں دروازے پر ان کے انتظار میں کھڑی رہتی اور کبھی کبھی ان کے آنے میں دیر ہو جاتی تو صحن اور سائبان میں تردد اور اضطراب کے عالم میں ٹہلتی رہتی، رات کو کھانے کے بعد ہم دونوں میں گھنٹوں میٹھی میٹھی باتیں ہوتی رہتیں مگر گفتگو کیسی ہی ہو، وہ کسی نہ کسی طرح اپنی علالت اور اس کے ساتھ ہی میری محبت، خدمت، ایثار اور قربانی کا ذکر چھیڑ دیتے اور مجھکو وفا کی دیوی محبت کا پیکر، ایثار کا مجسمہ اور نجانے کن کن القاب سے مخاطب کرتے، ان کو سنکر میں شرما جاتی لیکن اندرونی طور پر خوش بھی ہوتی۔ ایک رات اسی طرح وہ اپنی بیماری اور میری خدمت کا ذکر کر رہے تھے، کہ مجھ میں گدگدی پیدا ہوئی اور میں نے ... کہہ دیا۔

"آپ کی علالت کے زمانہ میں میرے پاس چار ہزار روپے ہوتے میں آپ کے لئے یہ روپئے اور انکو انڈین نرسیں رکھ دیتی، وہ مجھ سے زیادہ آپ کی خدمت کرتیں"

یہ سنکر وہ پانی پانی ہو گئے، اور ندامت سے ان کی آنکھیں جھک گئیں۔

——— + ———

انتظار

از

جناب خواجہ عبدالقیوم صاحب ایم، اے

روپا کو جب خط ملا تو اس کے دل کا اندرونی ارتعاش
ں کے ہاتھوں پر تھر تھر کانپ رہا تھا،
اس نے خط کھولا، یہ اس کے سندر کا خط تھا،
سے قدرے اطمینان ہوا، لکھا تھا،

”میری روپا۔ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے سندر کا
سلام۔ دیر سے خط لکھ رہا ہوں معاف کرنا، اسمیں میرا کوئی
بس نہیں۔ پرماتما تمہیں آنند سے رکھے، تمہارا خط ملا تھا جس میں
نے برہا کا دکھڑا رو دیا تھا، ہم دونوں کے درمیان اسوقت سمندروں
کی بے پناہ لہریں ہیں جو برہا کی آگ کے جوالوں سے کم نہیں،
س کی کوئی چنتا نہ کیا کرو سجنی۔ میں آؤں گا اور جلد آؤں گا، پر!
گھڑیاں جتنی کٹھن میرے لئے ہیں اتنی شاید تمہارے لئے نہ
وں، کیونکہ مجھکو یہاں گرم گرم ریت کے سوا اور کچھ نہیں ملتا،
کے خوفناک دھماکے، بندوق کی گولیوں کی سمع خراش آواز
ستم زدہ لوگوں کی چیخ و پکار کے سوا ہمارے کان اور کچھ نہیں سنتے
ہماری نظروں کے سامنے دھنواں ہی دھنواں ہے جس میں کسی طرح
رنگینی نظر نہیں آتی، دھنوار، بارود اور انسانوں کی دا۔۔ ز
ہوں ہی سے پالا پڑتا ہے۔ اب کہاں گاؤں کی وہ ہم کو ڈی
بن کے نیچے ہم تم دونوں پریم کی پینگیں بڑھاتے تھے، اور کہاں
وہ لطف جب تم مجھ سے پریم کی اٹھکھیلیاں کرتی کرتی روٹھ
جاتی تھی، اور مجھے منانا پڑتا تھا اور جب میں تمہیں منا لیتا تو تم
ہنس کر کہتی ”کہاں میں تو روٹھی ہی نہیں تھی، مجھے تو آپ کے منانے
میں مزا آ رہا تھا“ تمام باتیں یاد آتی ہیں مجھے روپا۔ انہیں کی یاد
میں جیون بیت رہا ہے، ورنہ شاید کب کا یہ ختم ہو گیا ہوتا،
گاؤں میں تو آج کل ساون آیا ہو گا، کوئل کی حادوبھری کو کو،
گوالوں کی لمبی لمبی تانیں اور کھیتوں کی سرسبزیاں دل کو موہ لیتی
ہونگی، تم اپنی سہیلیوں جمنا اور رادھا کے ساتھ اسی دریا کے کنارے
شاید اب بھی جھولا جھولتی ہو، مگر یہاں میرے لئے تو افریقہ کے
گرم گرم ریگستان کے سوا اور کوئی ساتھی نہیں میرے
لئے یہی طبعیت ہے یمتیں تو بر۔ وں۔ ترم ویز جیجھا نانالی دنیا
ہو گا، اور مجھے وار و زنجوا کے پھٹنے کی گرج۔ نہ معلوم جنگ
کب ختم ہو گی، اور کب میں اپنے گھر لوٹوں گا، روپا۔ میرے ہر دے
کی منوہر آشا۔ تیرے ہی سہارے جی رہا ہوں، کچھ مہینے ہسپتال
بیمار پڑا رہا، اب اچھا ہوں۔ اس آشا پر زندگی تو کہاں لئے دے
کر بہلاتا ہوں کہ کسی دن تمہارے چندر ان کے سے ۔۔۔
سکوں گا۔ اس کو شش میں اپنی جیون ۔۔۔
[illegible]

جب پھر آتو اس زندگی کا کیا بھروسہ؟ اس لئے اگر میں نہ آسکوں تو تمہارے جیون کی کو میں کمی نہیں آنی چاہئے، روپا! ...... بہت وقت اور کچھ نہیں لکھ سکتا، فرصت نہیں۔ اچھا پیاری روپا سلام۔ میری طرف سے میری ماتا کے چرنوں کو چھونا اور کہنا کہ اس کا [illegible] اچھا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں۔

تمہارا، سندر

خط پڑھکر روپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بسنت آیا۔ کلیاں کھلیں۔ چڑیا چہچہائیں۔ گاؤں کی کنیاؤں نے جھولے ڈالے اور منوہر گیت اپنے دلوں کی گہرائی سے نکال کر اپنے اپنے منوہر ساجن کو سنائے، مگر روپا! ایک شام کو گا رہی تھی "آئے بسنت پیا بھی آئے سجنی" مگر پیا نہیں آئے،

دوسرے سال پھر بسنت نے منہ دکھلایا مگر جس کا منہ دیکھنے کی تمنا روپا کے دل میں تھی، وہ چھپا ہی رہا۔ ایک شام روپا کی ماں نے اس سے کہا۔

"روپا بیٹی۔ دو سال بیت گئے مگر سندر کا کوئی خط نہیں آیا"۔ روپا کی زبان پر جیسے کسی نے تالہ لگا دیا ہو۔ وہ چپ چاپ ساکت بیٹھی رہی۔ "میں تمہارے دل کی باتوں کو جانتی ہوں بیٹی۔ مگر تم کو یہ بھی تو سمجھنا چاہیے کہ تمہارے دل سے صرف ہمیں کو تعلق نہیں۔ سماج کے ان تمام لوگوں سے ہے جو تم کو ابھی تک کنواری دیکھ دیکھ کر طعنہ دینا شروع کر چکے ہیں۔ تم کو کشور سے شادی کرنا ہی پڑے گی، روپا!"

"ماتا" روپا کی آواز لڑکھڑا کر رہ گئی، اس کی زبان بند ہوگئی۔

"روپا۔ انسان آشا کے سہارے جیتا ضرور ہے مگر اس کے آسرے پر پڑا نہیں رہتا۔ اسے اپنے جیون کے نباہ کیلئے کوئی ساتھی تلاش کر ہی لینا پڑتا ہے۔ کون تعجب ہے کہ سندر کو دشمن [illegible] نے ...."

روپا بھڑک اٹھی "ماتا [illegible] ایک [illegible]" اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا [illegible]

روپا کے دل کی آواز کو سماج کے کان نہ سن سکے، وہ گاؤں کے پٹواری کے لڑکے کشور کے ساتھ بیاہ دی گئی، یا باندھ دی گئی، بہرحال اس کے جذبات کی ترجمانی نہ ہو سکی۔ اس کی شریر سہیلی رادھا نے سگائی کی رات کو طعنہ دیا تھا "سندر کو آخر بھول گئیں!"

"کیسی بہکی باتیں کر رہی ہو رادھا؟"

"وہ تو ترنے کی ہے روپا۔ تمہیں اپنے باغیچہ کا جھوڑ تو بڑا پیارا لگتا ہو گا، جبھی تو ہر پھول کا رس چوسنا چاہتی ہو۔ سندر، کشور، وغیرہ وغیرہ" رادھا ہنسنے لگی، مگر روپا کی آنکھوں سے گنگا بہہ رہی تھی۔

"تمہیں دکھ ہوا روپا؟" اور پھر اسی رات روپا رادھا کے سامنے کتنا روئی تھی!

بیاہ کے چھ ماہ بعد روپا کا مصنوعی باغ بھی مرجھانے لگا اس کا باغباں اس سے چھین لیا گیا۔ کشور کی اچانک موت اس کی ساری مصنوعی خوشیوں کی موت تھی، وہ بیوہ ہوگئی، سماج نے اپنا فرض سمجھکر اسے ایک نوجوان کا ہاتھ پکڑا دیا تھا۔ مگر اب اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ تھا۔ بے پناہ آنسو اور اپنے سندر کی یاد کے سوا اور کوئی آسرا نہ تھا جس کے سہارے وہ اپنی زندگی کے دن گذارتی، تنہائی میں وہ اپنی مٹتی ہوئی زندگی کے مٹتے ہوئے دھندلے نقوش سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتی، مگر اسے [illegible]

رہی سہی آس بھی گھٹ کر رہ جاتی، اس کے دیہاتی وضع کے کمرہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تو جل رہا تھا، مگر جیسے جل کر روشنی پیدا کرتی تھی وہ دل شب دیجور کی طرح سیاہ تھا، روشنی کو کچھ حق نہ تھا کہ روپا کے بیوہ دل کو اپنا آشیانہ بنا سکے۔ سماج کی نظروں میں اُسے ظاہراً تو کپڑے سفید ہی پہننے تھے،

"روپا کے کانوں میں بہت دور سے ایک ہلکا ہلکا ساز سنائی دیتا تھا، جو پیدا وار تھا ایک دھندھلی آشا کا اپنے کرشن کنہیا کی آشا، سندر کی یاد، اس کی زندگی کی بنیاد تھی۔ سماج خواہ کوئی کروٹ ہی کیوں نہ لے دونوں کے بندھن کا یہ پھول کبھی روندا نہ جا سکتا تھا۔

〰〰〰

روپا کے بربط کے ٹوٹ جانے کے بعد اس کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو مضراب زمانہ نے کتنا ہی چھیڑا تاکہ اس سے کوئی ساز نکل سکے، جو اوروں کے نہیں تو کم از کم اسی کے کانوں کو بھا سکے مگر بجھے ہوئے دل میں ترنم کہاں؟

روپا کے سہاگ کو اُجڑے دو سال گذر گئے۔

ایک رات وہ اپنی سہیلی رادھا سے باتیں کر رہی تھی،

"جنگ کب ختم ہوگی رادھا؟"

"ایشور ہی جانتے ہیں"۔

"میرا سندر آئے گا۔ نا رے گا رادھا؟ اتنے سال بیت گئے اس نے اپنی روپا کو یاد نہیں کیا۔ ایک پتر بھی نہیں بھیجتے"

"تم کیوں اتنی چنتا کرتی ہو؟ دھیرج رکھو روپا۔

من کو دکھی نہ کرو، بھاگ کا لکھا کون مٹائے"

روپا جن جہازوں کے غرق ہونے کی خبر سنتی جو ہندوستان آ رہے تھے، تو اس کا دل نہ جانے کیوں بیٹھ جاتا، وہ شمالی افریقہ میں شدید بمباری کی خبر گاؤں میں جنگ کا پروپگنڈا کرنے والوں سے سنتی تو سندر کا چہرہ گہرے بادلوں میں ڈھکا ہوا اس کی آنکھوں سے پھر جاتا۔

اس نے سنا کہ اس کی سہیلی رادھا کا بھائی مادھو جنگ سے واپس آ رہا ہے، اس کو یقین ہو گیا کہ اس کا سندر بھی مادھو کے ساتھ ضرور لوٹ آئیگا۔ اسی گاؤں میں پھر وہی چہل پہل ہوگی اس کے آشاؤں کی پیاس بجھ سکے گی۔

〰〰〰

تین ماہ بعد ایک دن رادھا کے گھر باجا بج رہا تھا، مادھو واپس آ گیا تھا۔

ایک تڑپتے دل کو ساتھ لیکر روپا مادھو سے ملی۔

"سندر نہیں آئے بھیا۔ اچھے تو ہیں؟" یہ کہکر روپا نے اپنی سانس روک لی۔

"ہاں بہن، اچھے ہی ہیں" روپا کے چہرے پر جیسے کسی نے سرخ پچکاری مار دی ہو۔ سرخ خوشی اس کے چہرہ سے چھلکنے لگی۔

"تو وہ آئے کیوں نہیں بھیا؟"

"وہ نہیں آ سکتے تھے"۔ روپا جیسے کسی نے خون چوس لیا ہو۔

مادھو کہے جا رہا تھا، "ہم دونوں ایک ہی جہاز پر تھے ہمارا جہاز دشمنوں پر بمباری کرنے نکلا تھا۔ طبروق کے پاس ہمارے اور دشمنوں کے درمیان کافی بمباری ہوئی، اچانک ایک

زبردست بم کے پھٹنے کی وجہ سے ہمارا جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

روپا نے چیخ مارنی چاہی مگر نہ جانے کیوں یہ اندر ہی گھٹ کر رہ گئی،

"اس رات ہم دونوں بچھڑ گئے۔ ہمارے بہت سے ساتھی سمندر میں کود پڑے۔ سندر بھی کودا ہوگا، اس کا مجھے صحیح علم نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ بم پھٹنے کے وقت وہ میرے پاس ہی کھڑا تھا، بم کے دھماکے کے ساتھ ساتھ تاریک دھوئیں نے ہم سب کو گھیر لیا، اس کے بعد مجھے ہوش اسوقت آیا جب میں نے ہسپتال میں آنکھ کھولی اور اپنے سر اور چھاتی میں ایک شدید درد محسوس کیا، دو مہینہ میں ہسپتال میں پڑا رہا۔"

رادھا نے اپنے بھائی کے چھاتی کی طرف دیکھا، سینہ کے بائیں طرف جلنے کا نشان موجود تھا،

روپا کا آنچل سرک گیا تھا، رادھا نے اسے ٹھیک کیا۔ اور اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جہاں ایک ڈبڈبائی ہوئی آشا ٹمٹما رہی تھی، اس کی پلکیں ساکت تھیں جیسے کسی سحر نے انہیں بالکل بے جان کر دیا ہو۔ وہ رادھا کی طرف جھک گئی۔ اس نے اپنا سر اس کی چھاتی پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی،

روپا کی زندگی اپنی انتہائی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی ابتدا سندر کے پریم سے ہوئی اور زندگی کے درمیانہ دور میں سماج نے اپنے اندھے تھپیڑے مارے مگر اسکی انتہا ابھی تک نہ ہوئی، وہ ابھی تک اپنے سندر کا انتظار کر رہی ہے۔ ایک بے پایاں انتظار جسے ماضی کے قید سے رہا کرنے کی طاقت اس میں نہیں ہے، نہ جانے اس کی مانند کتنی عورتیں اپنی مضراب حیات کی چھیڑ کے لئے مضطرب ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے نازک تاروں کو کسی نے چھیڑ ہو، مگر اس کا ساز بالکل ہمیشہ کے لئے مفقود نہ کر دیا ہو؟

روپا کو ابھی تک انتظار ہے ایک غیر محدود لامتناہی انتظار۔ ریل کی پٹریاں چوڑی چوڑی آگے کی طرف بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کی حیات ان متوازی لکیروں پر دوڑتی جا رہی ہے، اسکا انتظار پھل لا سکے گا؟ وہ نہیں جانتی، مگر ایک دھندلی سی آشا اسکو تھپکیاں دے دے کر تسکین دلانے کی کوشش کرتی ہے۔

اس کا افسانہ حیات اس کے فطری انتظار کی بنا پر ابھی تک ناتمام ہے۔ اور شاید اسوقت تک رہے جب تک اس کے انتظار کی یہ گھڑیاں ختم نہ ہو جائیں۔

درسِ عبرت

معمور خباثتوں سے سینہ نہ رہے
مکر و حسد و فریب و کینہ نہ رہے
دنیا میں جئیں تو جینے والوں کی طرح
مردوں کی طرح ہمارا جینا نہ رہے

رنجور کوئی ہو اسے مسرور کرو
سینوں کو محبت ہی سے معمور کرو
مل جاؤ کہ ہے یہی تو ملنے کا وقت
آپس کے اختلاف کو دور کرو

سیلاب زمانہ و برق پھر کچھ بھی نہیں
یہ دوری غرب و شرق پھر کچھ بھی نہیں
ایماں کی حلاوت جو دلوں کو بھا جائے
قلت کثرت کا فرق پھر کچھ بھی نہیں

[illegible] کاکوری

خوش انجام

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شکسپیر کے مشہور ڈرامہ TUWELFTHNIGHT کا اردو ترجمہ

مترجمہ

جناب سعید الحق صاحب عاشق دسنوی ایم۔ اے

۶

مسخرہ ۔ مسٹر میلو ولیو!

میلو ولیو ۔ ہاں، مسخرے۔

مسخرہ ۔ اچھا، تم پاگل کیونکر ہو گئے،

میلو ولیو ۔ مسخرے، اگر تیرا دماغ اچھا ہے تو میرا بھی دماغ اچھا ہے۔

مسخرہ ۔ اگر تمہاری دماغی صلاحیت مسخرے کی دماغی صلاحیت سے زیادہ نہیں تو تم ضرور پاگل ہو۔

میلو ولیو ۔ مجھ کو لوگوں نے اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا ہے اور وہ گدھے سب میرے پاس پادری بھیجتے ہیں اور مجھ کو ماؤف الدماغ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسخرہ ۔ پادری تو نہیں ہے میلو ولیو، اللہ تیرا دماغ درست رکھے، سونے کی کوشش کر اور ادل فول بکنا چھوڑ دے

میلو ولیو ۔ مجھے کچھ روشنائی، کاغذ اور روشنی لا دو، اور جو کچھ میں لکھوں اس کو میری مالکہ کو دے آؤ، میں تم کو اس کا معاوضہ دوں گا۔

مسخرہ ۔ لا دیتا ہوں، لیکن سچ بتاؤ کہ تم پاگل ہو یا نہیں،

میلو ولیو ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ پاگل نہیں ہوں۔

مسخرہ ۔ مجھے تو پاگل کی باتوں کا یقین اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کا مغز سر نہ دیکھ لوں، میں تجھکو روشنی، کاغذ اور روشنائی لا دیتا ہوں۔

میلو ولیو ۔ میں تجھ کو اس کا بہترین صلہ دونگا۔

مسخرہ ۔ میں ابھی آتا ہوں۔

(گانے لگتا ہے)

تیسرا سین — اولیویا کا باغ

سیبسٹین داخل ہوتا ہے

سیبسٹین۔ کیا خوشگوار ہوا چل رہی ہے، آفتاب کیا ہی روشن ہے، کیسی اچھی ہیں اس نے مجھ کو یہ موتی دیا ہے، اسکو دیکھتا ہوں اور چھوتا ہوں۔ یہ سب تعجب ہے لیکن جنون نہیں ہے۔ آخر انٹونیو کہاں چلا گیا میں اس کا پتہ نہیں۔ اور وہاں یہ معلوم ہوا کہ وہ میری تلاش میں نکلا ہے۔ اس وقت مجھے اس کی رائے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے یہ کوئی غلطی ہو اور جنون نہ ہو۔ مگر یہ تمام واقعات کچھ ایسے انوکھے ہیں، کہ اپنی آنکھوں پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا ہے، خواہ میں پاگل ہوں یا یہ عورت پاگل ہے، لیکن اگر وہ پاگل ہوتی تو وہ اپنے مکان کا اس حسن و خوبی سے نظم و نسق نہیں کر سکتی۔

(اولیویا اور ایک پادری داخل ہوتے ہیں)

اولیویا۔ اس جلد بازی کے لئے مجھ کو برا بھلا نہ کہیے، نزدیک کے معبد میں آپ میرے اور پادری کے ساتھ چلے اور اس مقدس جگہ پر عمر بھر کا پیمان وفا باندھیے، تاکہ میری روح کو چین حاصل ہو۔ اور آپ جب تک اسکو پوشیدہ رکھنا چاہیں، پادری صاحب اسکو مخفی رکھینگے، آپ کی کیا رائے ہے۔

سیبسٹین۔ مجھے دل و جان سے پسند ہے۔

اولیویا۔ پادری صاحب، ہم لوگوں کی رہبری کیجئے، آسمان کی رحمتیں ہم لوگوں پر نازل ہوں۔

(چلے جاتے ہیں۔)

پانچواں ایکٹ

سین اول۔ اولیویا کے مکان کے سامنے والی سڑک

مسخرہ اور فیبین داخل ہوتے ہیں۔

فیبین۔ اس کا خط مجھے دیکھنے دو۔

مسخرہ۔ میری ایک درخواست قبول کرو۔

فیبین۔ کیا؟

مسخرہ۔ اس خط کو دیکھنے کی خواہش مت کرو۔

فیبین۔ اس کی تو یہی مثال ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ایک کتا دیا اور اس کے معاوضہ میں کتا واپس لے لیا۔

(ڈیوک، وایلا، کیوریو اور نوکر داخل ہوتے ہیں)

ڈیوک۔ تم لوگ لیڈی اولیویا کے آدمی ہو۔

مسخرہ۔ جی ہاں ہم لوگ اسی کے ساز و سامان ہیں؟

ڈیوک۔ میں تم کو خوب پہچانتا ہوں، تم کیسے ہو؟

مسخرہ۔ خدا کرے میرے دشمن اچھے رہیں اور میرے دوست خراب حالت میں ہوں

ڈیوک۔ یہ تو الٹی بات ہے، تیرے دوست اچھے رہیں گے۔

مسخرہ ۔ نہیں، وہ خراب حالت میں ہوں۔

ڈیوک ۔ یہ کیوں؟

مسخرہ ۔ اس لئے کہ وہ لوگ میری تعریفیں کرتے ہیں اور مجھ کو نرا گدھا کا گدھا رہنے دیتا ہوں، میرے دشمن صاف صاف کہدیتے ہیں کہ میں گدھا ہوں۔ اسلئے میرے دشمن مجھکو نقائص سے متنبہ کر دیتے ہیں۔

ڈیوک ۔ خوب!

مسخرہ ۔ میں تو یہی کہونگا اگرچہ آپ بھی میرے دوست ہی ہوں۔

ڈیوک ۔ لو یہ تمہارے لئے ایک اشرفی ہے۔

مسخرہ ۔ اگر یہ دو رخی بات نہ ہو تو میں کہوں کہ اسکو دو نا دیجیئے۔

ڈیوک ۔ تیری رائے پر عمل نہیں کرونگا۔

مسخرہ ۔ جیب میں ہاتھ ڈالئے اور نکالئے،

ڈیوک ۔ اچھا تو لو ایک اور بھی۔

مسخرہ ۔ ایک، دو، تین، پرانی کہاوت ہے کہ جو کچھ ہے وہ تین ہی ہے۔ سینٹ بنیٹ کی گھنٹیاں بھی ایک، دو، تین بجتی ہیں۔

ڈیوک ۔ اگر تم اپنی مالکہ سے جاکر یہ کہدو کہ میں یہاں ان سے گفتگو کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں اور تم ان کو اپنے ساتھ لیتے آؤ تو پھر میری سخاوت بھی جاگ اٹھیگی،

مسخرہ ۔ اچھا جناب! میں جاتا ہوں لیکن اس کو میری طمع پر محمول نہ کیجئے۔

وایلا ۔ جس نے مجھکو چھڑایا تھا وہ شخص آگیا۔

(انٹونیو اور افسر داخل ہوتے ہیں)

ڈیوک ۔ اس کا چہرہ مجھے خوب یاد ہے، لیکن اس کے متعلق جو میں نے اس ... دیکھا ... دھواں ...

سیاہ ہو گیا تھا، وہ ایک چھوٹے جہاز کا کپتان تھا اور اس نے ہم لوگوں کے جہازوں کے بیڑے پر ایسے حملے کئے کہ ہر زبان پر اسکی تعریف کے قصیدے تھے،

پہلا افسر ۔ یہ وہی انٹونیو ہے جس نے فنیکس نامی جہاز اور اس کے تمام سامان دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور یہ وہی شخص ہے جو (Tiger) نامی جہاز پر تھا جب آپ کے بھتیجے اپنے پاؤں سے ہمیشہ کے لئے ... ہو گئے، یہاں سڑکوں پر وہ لڑائی جھگڑا کر رہا تھا اور وہیں یہ گرفتار ہوا،

وایلا ۔ اس نے مجھ پر احسان کیا، اور میرے بچاؤ کے لئے اسنے تلوار نکالی لیکن اسکے بعد اول فول ... میری سمجھ سے باہر تھا،

ڈیوک ۔ مشہور ڈاکو! بحری قزاق! تو کیونکر ان لوگوں کے پنجے میں گرفتار ہوا۔

انٹونیو ۔ معزز ڈیوک! آپ نے مجھکو جن القاب سے پکارا میں انہیں واپس کرتا ہوں، انٹونیو کبھی بھی چور یا ڈاکو نہیں تھا، ہاں وہ چند وجوہ سے اورسینو کا دشمن ضرور تھا، اس کو بھی ایک سحر سمجھئے کہ میں یہاں کیونکر آیا، وہ احسان فراموش لڑکا جو آپ کے پاس کھڑا ہے اسکو میں نے سمندر کی بے رحم اور خونخوار ... سے نجات دلائی اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی ... نے اسکی جان ... اور محبت سے پیش آیا ... شہر میں دشمنوں ... شہر میں آیا، اور اپنی جان جوکھوں ... دشمنوں سے گھر گیا تھا ...

... میں گرفتار ہو گیا ...

... دیکھو ...

... سے

وایلا ۔ یہ ناممکن ہے

ڈیوک یہ کب اس شہر میں آیا،

انٹونیو آج ہی آیا ہے، اور تین مہینہ تک ہم دونوں ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے

(اولیویا اپنے خادموں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

ڈیوک وہ دیکھو کونٹس آرہی ہے، گویا بہت اس زمین پر اتر کر چل رہی ہے، لیکن تیری باتیں تو جنوں کی سرحد پر ہیں۔ تین مہینہ سے یہ نوجوان تو میری خدمت کر رہا ہے

اولیویا ۔ سیزریو تم اپنے وعدہ پر قائم نہیں ہو؟

وایلا ۔ میڈم

ڈیوک ۔ اچھی اولیویا

اولیویا سیزریو کیا کہتے ہو؟

وایلا ۔ میرے آقا کچھ کہیں گے، میرا فرض ہے کہ میں خاموش ہوں

اولیویا ۔ اگر وہی پرانا راگ ہے اور وہی سر تال ہے تو یہ سب محض فضول ہے

ڈیوک اب تک وہی سنگدلی!

اولیویا ۔ وفاداری بشرط استواری، اپنے اصول پر قائم ہوں

ڈیوک ابتک وہی ضد وہی ہٹ، بیرحم عورت، تیری محبت کی پرستش گاہ پر میرا دل عقیدت کے نذرانے چڑھاتا ہے اور تجھے رحم بھی نہ آیا۔ اب میں کیا کروں

اولیویا ۔ جو جی چاہے اور جو مناسب ہو کیجئے

ڈیوک اگر میرا دل مجھکو اجازت دیتا تو میں وہی کرتا جو مصری چور دم مرگ کیا کرتا تھا۔ یعنی اپنی محبوبہ کو مار ڈالتا، اچھا تو تم نے تو میرے عشق کو ٹھکرا دی ہے، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب کس کی وجہ سے ہو رہا ہے ر اسے

سنگدل ظالمہ تو زندہ رہ لیکن جس پر تو جان دیتی ہے اور جس پر میں بھی لطف و کرم کرتا ہوں اسکو تیری نظروں سے اوجھل کردونگا۔

(چلا جاتا ہے)

وایلا ۔ میں بخوشی اس کے لئے ہزاروں بار جان دینے کو تیار ہوں۔ (پیچھا کرتی ہے)

اولیویا ۔ سیزریو، تم کہاں جاتے ہو؟

وایلا ۔ اس کے پاس جس کو میں اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں

اولیویا میں مکر و فریب کے جال میں پھنس گئی۔

وایلا کس نے تم سے بے وفائی کی؟

اولیویا ۔ تم اتنا جلد بھول گئے، مقدس پادری کو بلاؤ،

(ایک خادم جاتا ہے)

ڈیوک (وایلا سے) آؤ۔

وایلا ۔ میرے پیارے آقا! میرے سیزریو میرے شوہر کہاں جاتے ہو؟

ڈیوک شوہر؟

اولیویا ہاں شوہر؟ کیا وہ انکار کر سکتا ہے؟

ڈیوک تم اس کے شوہر ہو گئے کب؟

وایلا میرے آقا ہرگز نہیں۔

اولیویا افسوس! تم خوف سے انکار کر رہے ہو، سیزریو خوف نہ کرو، تم اپنی حقیقت آشکار کر دو۔

(پادری داخل ہوتا ہے)

پادری صاحب آپ کو آپ کی عزت کی قسم دیتا ہوں کہ میرے اور نوجوان کے درمیان جو معاملہ گزرا ہے اس کا انکشاف کر دیجئے اگرچہ ہم لوگوں کی یہ خواہش

نہ تھی کہ اس راز کو آشکارا کیا جائے مگر اب تو مجبوراً کرنا ہی پڑیگا۔

پادری۔ دائمی محبت کا پیمان! دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ ملا کر اس کو استوار کیا۔ اور اپنے لبوں کے پوترسنگم سے اس کی تصدیق کی۔ اور ایک دوسرے کو اپنی انگوٹھی دیکر اس عہد کو اور بھی مستحکم کیا۔ اور یہ سب میرے سامنے ہوا، میں گواہ ہوں اور میں نے اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ صرف دو گھنٹے پہلے یہ سب کام ہوا۔

ڈیوک۔ او دغاباز کُتے کے بچے! جب تم سن رسیدہ ہو گے تو نہ معلوم کیا کیا کرو گے۔ تمہارا مکر و فریب تمہاری تباہی کا باعث ہوگا۔ جاؤ اس کو لیجاؤ۔ میں تمہاری شکل کبھی بھی دیکھنا نہیں چاہتا ہوں۔

وائیلا۔ میرے آقا، میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔

اولیویا۔ قسم نہ کھاؤ، اگرچہ تم خوف زدہ ہو، لیکن کچھ بھی تو عہد و پیمان پر قائم رہو۔

(سر اینڈرو ایگوچیک جن کا سر ٹوٹ گیا ہے داخل ہوتے ہیں)

سر اینڈرو۔ خدا کے لئے ایک سرجن (ڈاکٹر) کو بلا دو، اور کسی آدمی کو سر ٹوبی کے ہاں بھیجو۔

اولیویا واقعہ کیا ہے؟

سر اینڈرو۔ اس نے میرا سر توڑ دیا اور سر ٹوبی پر بھی ایک زبردست وار کیا، کاش میں گھر پر ہوتا۔

اولیویا۔ کس نے؟

سر اینڈرو۔ کونٹ کے آدمی سیزریو نے۔ ہم لوگوں نے اسے بزدل سمجھا تھا مگر وہ تو مجسم ابلیس ہے۔

ڈیوک۔ میرے آدمی سیزریو نے؟

سر اینڈرو۔ ہاں، قسم ہے اسی نے، وہ تو یہیں ہے۔ تم نے میرا سر توڑ دیا۔ حالانکہ جو کچھ میں نے کیا وہ سر ٹوبی کی ترغیب سے۔

وائیلا۔ میں نے تم کو ضرب نہیں لگائی، تم نے بلا وجہ مجھ پر تلوار نکال لی۔ لیکن میں خوش اخلاقی سے پیش آیا اور ضرب نہیں لگائی۔

بلاشبہ تم نے مجھے ضرب لگائی ہے، وہ دیکھو سر ٹوبی لنگڑاتے ہوئے آرہے ہیں۔

سر ٹوبی بلبش نشہ کی حالت میں مسخرہ کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔

اگر وہ مخمور نہ ہوتے تو وہ تمہاری خبر لیتے۔

ڈیوک کہو کیا حال ہے؟

سر ٹوبی۔ اس نے مجھے ضرب لگائی ہے، اسے خوار، سرجن ڈک کو دیکھا ہے۔

مسخرہ۔ ایک گھنٹہ سے وہ مخمور ہیں۔

سر ٹوبی۔ تب وہ ایک بدمعاش شخص ہے۔ میں مے خواروں سے نفرت کرتا ہوں۔

اولیویا۔ اس کو لے جاؤ۔ یہ سب کس کا کام ہے۔

سر اینڈرو۔ سر ٹوبی۔ میں تم کو مدد دوں گا۔ ہم دونوں کی مرہم پٹی ایک ساتھ ہوگی۔

اولیویا۔ ان کو بستر پر لیجاؤ اور زخم کی دیکھ بھال ہو۔

(مسخرہ، فیبین، سر ٹوبی اور سر اینڈرو چلے جاتے ہیں)

سبیسٹین داخل ہوتا ہے

سبیسٹین۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے چچا کو میں نے ضرب لگائی لیکن اگر وہ میرا بھائی بھی ہوتا تب بھی میں یہی کرتا۔ تم مجھ کو

جس نگاہ سے دیکھ رہی ہو اس سے تمہاری آنکھ کا
ثبوت ملتاہے، میری پیاری اپنے عہد
کی خاطر تو مجھے معاف کردو۔

ڈیوک ۔ ایک ہی صورت ایک ہی آواز ایک ہی لباس
یہ تو ایک ٹیپ منظر ہے

میرے پیارے انٹونیو میرے دل سے پوچھو کر

بیسٹین ۔ تمہارے فراق میں میرا کیا حال تھا۔

انٹونیو ۔ تم بیسٹین ہو ؟

بیسٹین ۔ تم مجھ سے ڈور رہے ہو ؟

انٹونیو ۔ واللہ کیا مشابہت ہے ایک سیب کے دو حصے بھی ایک
دوسرے کے اتنا مشابہ نہیں ہوتے بیسٹین کون ہے ؟

اولیویا ۔ تعجب ! تعجب !

بیسٹین ۔ میرا تو کوئی بھائی نہ تھا، میری ایک بہن تھی جس کو
بے رحم اور خونخوار موجوں نے نگل لیا ، تم کس ملک
کے رہنے والے ہو ؟ تمہارا نام ؟ تمہارا خاندان ؟

وایلا ۔ میرا مرز وبوم میسلائن ہے ۔ میرے والد کا نام سیبسٹین
تھا، تمہاری شکل کا سیبسٹین میرا بھائی تھا لیکن
وہ تیری میں مدفون ہے، اگر روحیں انسانی شکل میں
آسکتی ہیں تو تم کہیں، میرے بھائی تو نہیں ہو ؟

بیسٹین ۔ اگر تم عورت ہوتے تو تمہارے گالوں پر اشکباری
کوتا اور چلا اٹھتا "خوش آمدید میری
ڈوبی ہوئی وایلا"۔

وایلا ۔ میرے والد کے ابرو پر ایک خال تھا۔

بیسٹین ۔ اور میرے والد کے ابرو پر بھی۔

وایلا ۔ اور جب وایلا زندگی کے تیرہویں سنگ میل
پہنچی تو والد کا انتقال ہوگیا۔

سبیسٹین ۔ وہ واقعہ مجھکو اب تک یاد ہے۔ جب میری بہن تیرہ
سال کی ہوئی تو میرے والد نے اس دنیا کو خیرباد کہہ

وایلا ۔ جب تک واقعات سے یہ ثابت نہ ہوجائے کہ میں ہی
وایلا ہوں اسوقت تک مجھے گلے نہ لگائے اس
کی تصدیق کے لیے میں آپکو اس شہر میں ایک
کپتان کے پاس لے جاؤنگی ۔ اور اسی کے ہاں
میرے یہاں آنے کے پہلے کے کپڑے رکھے ہوئے
ہیں اسی کی مدد سے میں اس شریف ڈیوک کے
ہاں نوکر ہوگئی اور اس ڈیوک اور اس لیڈی کے
درمیان پیغامبری کے فرائض انجام دیتی تھی۔

سبیسٹین ۔ (اولیویا سے) شریف خاتون آپ کو غلط فہمی
ہوگئی، لیکن یہ سب قدرت کا کھیل ہے آپ تو ایک
عورت پر وارفتہ ہوئی تھیں، لیکن آپ نے دھوکہ
نہیں کھایا۔ آپ کا بیاہ مرد سے بھی ہوا اور عورت سے بھی

ڈیوک ۔ تعجب نہ کرو، وہ ایک شریف زادہ ہے میں بھی اس خوشی
میں شریک ہونگا۔ (وایلا سے) تونے اکثر مجھ سے اظہار
محبت کیا ہے۔

وایلا ۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں، اور جسطرح آفتاب کی گرمی ہمیشہ
قائم رہتی ہے اسیطرح میں بھی اپنی باتوں پر ہمیشہ قائم رہونگی

ڈیوک ۔ اپنا ہاتھ مجھکو دو میں تجھکو زنانہ کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں

وایلا ۔ جو کپتان مجھکو ساحل پر لایا تھا اسی کے پاس میرے
زنانہ کپڑے ہیں وہ میو ولیو کے کہنے سے قید۔

(ڈایا) کے ہاں تو کرے۔

اولیویا۔ میلوولیو کو یہاں لاؤ۔ اس بیچارہ کی جان عجیب تنگی میں ہے۔ میں تو اس کو بالکل بھول گئی تھی۔

(مسخرہ ایک خط لئے ہوئے فیبین کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔)

اس کا کیا حال ہے۔

مسخرہ۔ اس نے آپ کو ایک خط لکھا ہے۔ میں صبح ہی آپ کو دیتا لیکن پاگلوں کے خطوں کی وقعت ہی کیا؟ جس وقت بھی دیدیا جائے کوئی ہرج نہیں۔

اولیویا۔ کھولو اور پڑھو۔

مسخرہ۔ اچھا تو سنئے مسخرہ پاگل کا خط سناتا ہے۔
"قسم خدا کی میڈم"

اولیویا۔ یہ کیا! تو پاگل ہوگیا ہے۔

مسخرہ۔ میں تو پاگل کا خط پڑھ رہا ہوں۔

اولیویا۔ ٹھیک سے پڑھو۔

مسخرہ۔ اچھا آپ کا حکم بجا لاتا ہوں۔ غور سے سنئے۔

اولیویا۔ (فیبین سے) تم پڑھو۔

فیبین۔ "قسم خدا کی میڈم، آپ میرے ساتھ بے انصافی کرتی ہیں اور دنیا اس سے آگاہ ہو جائے گی۔ اگرچہ آپ نے مجھ کو اندھیرے میں بند کر دیا ہے اور اپنے نشہ خوار چچا کو میرا مالک بنا دیا ہے لیکن میرے ہوش و حواس آپکے ہوش و حواس کی طرح بالکل درست ہیں میرے پاس آپ ہی کا [illegible]

چاہیئے سو چیئے۔ یہ سب میں نے رنجش کی وجہ سے لکھ دیا ہے۔
"بدسلوکی کا شکار میلوولیو"

اولیویا۔ اس کا لکھا ہوا ہے؟

مسخرہ۔ ہاں۔

ڈیوک۔ اس سے تو پاگل پن کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

اولیویا۔ فیبین۔ اس کو رہا کر کے یہاں لاؤ (فیبین چلا جاتا ہے)
شریف ڈیوک! ایک ہی دن تمام خوشیاں رچائی جائیں اور میرے ہی گھر پر اور میرے ہی خرچ پر۔

ڈیوک۔ آپ کی رائے دل وجان سے پسند ہے۔
(وایلا سے) تمہارا آقا تم کو غلامی سے رہا کرتا ہے اور تمہاری خدمات کے صلہ میں تم کو اپنی بیوی بناتا ہے۔

اولیویا۔ اور تم میری بہن ہو۔

(فیبین میلوولیو کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔)

ڈیوک۔ یہی وہ پاگل ہے۔

اولیویا۔ یہی ہے، میلوولیو، کیسے ہو؟

میلوولیو۔ آپ نے میرے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔

اولیویا۔ میں نے؟ نہیں، یہ کیا بولتے ہو۔

میلوولیو۔ ہاں آپنے۔ اس خط کو پڑھیئے۔ کیا یہ آپکی تحریر نہیں ہے کیا یہ آپکی مہر نہیں ہے؟ آپنے کیوں اظہار محبت کیا، کیوں مجھ سے کہا کہ مسکراتے ہوئے اور زرد موزے پہنکر اور صلیب نما موزہ بند لگا کر آؤ۔ اور کیوں یہ کہا کہ [illegible] اور دوسرے نوکروں

تعمیل کی تو آپ نے مجھے کوٹھری میں مقید کر دیا۔ کالی کوٹھری میں رکھ دیا۔ پادری کو تو بھیج دیا، اور مجھ کو خوب ہی احمق بنایا۔

اولیویا۔ افسوس! میلوولیو۔ یہ میری تحریر نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ میری تحریر سے بہت ملتی جلتی ہے، بلاشبہ یہ میریا کی تحریر ہے، اور اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے مجھے کہا تھا کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ تم اس مذاق کے شکار ہوئے ہو، جب مجرموں کا نام معلوم ہو جائیگا تو تم ہی اپنے مقدمے کے مدعی اور منصف دونوں رہوگے۔

فیبین۔ میری بات سنیئے، تاکہ آج کی خوشیوں میں کسی قسم کا رخنہ نہ ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اور ٹوبی نے میلوولیو کو زک دینے کی یہ تدبیر سوچی تھی، اس لئے کہ وہ نہایت بدسلوکی سے پیش آتا تھا، سر ٹوبی کے کہنے پر میریا نے خط لکھا، اور اس کے صلہ میں سر ٹوبی نے اس سے بیاہ کر لیا ہے۔

اولیویا افسوس! ہم لوگوں نے تجھ کو زک دی۔

مسخرہ۔ کیوں "بعض برتر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض برتری حاصل کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں پر عظمت چپکا دی جاتی ہے"۔ اس تماشہ میں میرا بھی حصہ رہا ہے۔ میں سر ٹوپاز بنا تھا۔

میلوولیو۔ میں تم سبھوں سے انتقام لوں گا۔

(چلا جاتا ہے)

اولیویا۔ اس کو لوگوں نے بہت ستایا ہے۔

ڈیوک۔ اس کو جا کر منائیے، اس نے ابتک کپتان کا پتہ نہیں دیا، جب اس کا پتہ چل جائے تو ہم لوگوں کی روحیں دائمی محبت کا لطف اٹھائیں گی، پیاری بہن ہم لوگ یہیں رہیں گے، سیزریو۔ آؤ، جب تک تم مرد کے لباس میں ہو اسی نام سے پکاری جاؤگی، جب دوسرا لباس پہن لوگی تو اورسینو کی بیوی اور اس کے دل کی ملکہ بنا
(سوائے مسخرے کے سب چلے جاتے ہیں، مسخرہ ایک گیت گاتا ہے۔)

تمت

انسانی پھول

از جناب ح۔ خاتون صاحبہ

بہار کی خوشگوار صبح تھی. نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے، ننھا جاوید اپنے والد کے ساتھ ہوا خوری کو چلا گیا تھا، اور فرصت کا موقع پا کر میں خانہ داری کے کسی کام میں مشغول ہونا چاہتی تھی۔ کہ یکایک بے تکلف سہیلی یاسمین نازل ہو گئیں۔ اور بے اختیار راز کہنے لگیں۔ کہ اوہ عجیب دیکھو کام! پیاری کیا تمہارا دل ان خانگی بکھیڑوں سے اکتا نہیں! دیکھو صبح کیسی سہانی نمودار ہوئی ہے۔ میں تمہارے پاس باغ سے ہوتی ہوئی آ رہی ہوں۔ وہاں حسن و جمال اور رنگ و بو کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ پھولوں کے چہرے نکھرے ہوئے اور پتوں کی سبز رنگت چمک دمک میں زمرد کو شرما دیتی ہے۔ ہوا کیسی نرم نرم اور دل کو کھلا دینے والی چل رہی ہے مگر تمہیں کوئی احساس نہیں، تم سے زغفل سے محروم مخلوق چڑیائیں اچھی۔ کہ اس نعمت ہی سے لطف اندوز ہو رہی ہیں بہت مزے کے راگ الاپ رہی ہیں۔ میں جواب دئے بغیر مسکراتی ہوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر پائیں باغ میں آ گئی اب کی دفعہ بہار رسیدہ چمن کو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی، یاسمین کی تعریفیں صحیح نہ تھیں۔ کیونکہ باغ پورے شباب پر تھا مگر نہ جانے کیوں میرے دل نے کوئی کشش محسوس نہ کی۔ شاید میرے دل کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اور میری سہیلی کا خیال درست تھا میں ہر ہر تختۂ گل پر بے پروائی کی نگاہیں ڈال رہی تھی، اور ٹہل رہی تھی، کہ یکایک پیچھے سے ایک معصوم ہنسی کی آواز آئی "اور اماں میں کتنا جلد آ گیا" کہتا ہوا ایک بھولا بھالا حسین بچہ آ کر پیروں میں لپٹ گیا۔ میں چونک پڑی۔ اور میرے دل کی بند کلیاں کھل گئیں۔ میری سہیلی گلاب کے ایک تر و تازہ پھول کو بنظر غور دیکھ رہی تھیں۔ اور فرط مسرت سے ان کا سفید چہرہ ہلکا گلابی ہو رہا تھا، واہ کیا اچھا سرخ گلاب ہے! اور اس کی پنکھڑیوں کی نرمی اور یاقوتی رنگت کتنی دلفریب ہے۔ پیاری! کیا تمہیں یہ گلاب پسند نہیں میں تو اس لاجواب پھول کو کائنات کی ہر حسین چیز پر ترجیح دینے کو تیار ہوں۔ دراصل مجھے حسن فطرت کی عاشق سمجھا جاتا ہے۔ میں نے بچے کا منہ چوم کر جواب دیا۔ کہ میرے پاس اس سے رنگین و نرم اور مہکتا گلاب ہے۔ یہی میرا بھولا بھالا حسین جاوید۔ کیا بوستانی پھول کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میری آنکھیں اس کے لاجواب گلابی چہرے سے وہ ٹھنڈک حاصل کرتی ہیں. جو سارے

دنیا کے نظارے سے ممکن نہیں، اور اس کے مخمل جیسے چکنے جسم کی میٹھی بُو سے چمن کی ہوائیں زیادہ خوشگوار ہیں، میرے ننھے کے ریشمی گھونگھریالے بالوں کی بوئے پُر در خوشبو بوئے گلشن سے زیادہ کشش رکھتی ہے۔ چشم نرگس کو میں کیوں دیکھوں۔ اس کی بے نور آنکھیں میرے پہلو کی، نور برسانے والی معصوم آنکھوں کی برابری نہیں کر سکتیں، چڑیوں کا راگ بےشک کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے، مگر میرے ننھے کی ایک ہنسی اس سے زیادہ سُریلی اور شیریں ہے اور میں اس کی آواز میں ساری دنیا کے طیور کے نغموں اور تمام مشرقی و مغربی سازوں سے زیادہ سرور و انبساط محسوس کرتی ہوں، یاسمین مرجھا گئیں۔ کتنی بدذوق ہو تم! اور تمہاری نظر کتنی بھدی ہو گئی ہے۔ فخریہ لہجہ میں کہا۔ بےشک میں بدذوق ہوں اور میری نظر تو کیا دل و دماغ بھی بھدا ہے۔ مگر میں ایک مشرقی عورت ہوں اور انسانی پھول کو بوستانی پھول سے بہتر سمجھتی ہوں۔ مغرب کی تیتری! تمہیں مبارک ہو جنہیں اپنے گود کے پھولوں سے زیادہ پیارے گلستاں کے پھول نظر آتے ہیں اور اپنے خانگی جنت کو چھوڑ کر باہر کی موہوم جنتوں کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ معبود حقیقی کا شکر کیسے زبان سے ادا کروں، جس نے مجھے خانگی مسرتوں کا راز سمجھنے کی عقل بخشی۔

اب باغ میں سورج کی کرنیں پھیل گئی تھیں، اور اس کی حدت ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ اس لئے ہم کوٹھی میں واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد یاسمین کھسیانی ہنسی ہنس کر بولیں۔ اے توبہ! تم نے تو ایک لکچر دے ڈالا۔ خدا نہ کرے، میں مغرب کی تیتری کیوں ہونے لگی۔ اچھا آج معلوم ہوا کہ تمہیں موسیقی سے اس قدر نفرت ہے۔ پھر یہ گراموفون مشین کیوں میز پر رکھی رہتی ہے آہا ہا! نئے ریکارڈ بھی تو آئے ہوئے ہیں۔ (ننھے کا دل بہلانے کے لئے) میں یہ کہتی ہوئی ڈریسنگ روم میں چلی آئی اور جاوید کے کپڑے بدلنے لگی۔ دوسرے کمرے میں یاسمین گراموفون بجا رہی تھیں اور اس کی آواز سائبانوں اور کمروں سے گذر کر مدھم ہوتی ہوئی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی میں نغمہ سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اپنے کام میں مصروف رہی۔ ننھا جاوید البتہ جلد بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تصویر جذبات

کیا اچھا چمن کیسے اچھے پھول

مکان وہی، درخت وہی چمن وہی کلیاں چٹکتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں، سب کچھ ہے لیکن تم نہیں، پھول توڑتی ہوں دیر تک ہاتھ میں لئے سوچا کرتی ہوں۔ کہ پھول کس کیلئے کیسے خوبصورت پھول۔ نہ میں اس قابل ہوں کہ ان پھولوں کو سر میں لگاؤں نہ میرا پلنگ ان خوبصورت پھولوں کے لائق، پھول مجھے دیکھکر روتے ہیں۔ میری عمر ساٹھ برس کی ہے) نہ گلدان میں لگانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ پھول تمہارے مزار کے لئے ہیں۔ پھول مزار پر رکھ دے۔ پھول خوش ہوئے کہ ہمارے صاحب ہمارے مالک جس نے ہم کو اپنے مکان میں لگایا تھا آج ہم اس کے مزار پر ہیں پھول کھل کھلا کر ہنس پڑے اور میں رو دی (صغرا ہمایوں مرزا از دکن)

پاگل

وہ حسین تھی۔ بہت ہی حسین
گدڑی اور پھٹے کپڑوں میں ملبوس
صبح میں روزانہ وہ
نگار خانہ کے سامنے بیٹھی رہتی
اور
اک نوجوان مصور
اس کا ماڈل بنانے میں مصروف رہتا
نیم باز آنکھیں، سر سے سرکا ہوا آنچل
اور چہرے پر اُداسی!
گویا
وہ یاس و حسرت کی مجسمہ تصویر تھی۔

اک شاعر کی
اس راہ سے گذر ہوئی۔
ضعیف العمر۔ ناتواں
لیکن
اس کے تخیلات جوان تھے
اور
طبیعت رومان پرور
اس کی نظروں میں حسینہ
قلوبطرہ سے زیادہ حسین تھی
ان کی زبان سے بساختہ نکلا،
زمیں و آسمان ہے تیرے قدموں پہ

اے حسینہ — !
تیرا کیف انگیز شباب
نغمہ روح پرور
وہ سوچ رہا تھا ۔
اور — !
دور اک پاگل
کھڑا دیکھ رہا تھا — !

یک بارگی وہ چلا اٹھا
یہ دنیا — اور یہ لوگ !!
پھر
ڈھیلے کی آواز
ہوائیں شائیں شائیں آنے لگی ۔
حسینہ محو حیرت تھی !!!

اظہر قادری (سونبرساوی)

شمع اور پروانہ

شام ہونے کو تھی، سورج کی ارغوانی کرنیں گلزار کائنات پر لوٹ رہی تھیں۔ طائران چمن اپنے اپنے آشیانوں کی طرف آہستہ آہستہ پرواز کر رہے تھے، دنیا پر کسی قدر خاموشی مسلط تھی، سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ جو ایک سبزہ زار کی طرح لہلہا رہا تھا اسکے کنارے ایک چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی دور تک رواں تھی ندی کے کنارے لمبے لمبے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا درختوں پر تاریکی پھیل رہی تھی، جو دور سے ایک کوہستانی خطے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

میں اپنے کلبۂ احزان میں ایک شاعر رنگین طبع کی طرح خموش بیٹھا ہوا قدرت کے ان حسین مناظر کے دیکھنے میں دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو رہا تھا، یکایک مہر درخشاں نے دنیا کو پیام جدائی دیا اور اپنے دست شعاع سے چمن کے خوبصورت پھولوں کی بلائیں لیتا ہوا پردۂ مغرب میں جا چھپا شانۂ گیتی پر گیسوئے شب لہرانے لگی، آسمان میں بزم طرب منعقد ہوئی، فانوس انجم سے چرخ نیلی فام جگمگا اٹھا، چاند بھی دنیا والوں پر اپنی فرحت انگیز روشنی ڈالنے کیلئے سطح زمردیں پر بڑی آب و تاب سے نمودار ہوا۔ اس کی شفاف روشنی ندی کے بہتے ہوئے پانی اور اشجار کی قطاروں پر پڑ کر فطرت ایک حسین ترین منظر پیش کر رہی تھی، چاند کی سیمابی روشنی میدان کی ایک پگڈنڈی پر پڑ رہی تھی جو کہکشاں کے مانند ہری ہری گھاس اور درختوں کے درمیان بیچ و تاب کھاتی ہوئی بہت دور تک دکھائی دے رہی تھی، جس سے میدان کا منظر نہایت ہی دلکش اور جاذب نظر ہو رہا تھا چاند کی نورانی شعاؤں سے سارا جنگل رشک طور بن گیا تھا۔

میں بھی عالم محویت میں ان تمام کیف نظارے دیکھتا ہوا آبادی سے دور نکل گیا اور ایک سنسان جنگل میں پہنچا وہاں مجھے ایک بوسیدہ جھونپڑی نظر آئی، جہاں ایک شمع جل رہی تھی، شمعدان اسقدر کثیف اور شیشہ اتنا میلا تھا کہ نفرت کے طوفان نے جبراً میری آنکھوں کو بند کر دیا، میں آنکھیں بند کئے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے؟ یہ شمع کس نے جلائی ہے، یہاں کون رہتا ہے کیوں اس نے اپنی دنیا

سے باہر سکوت اختیار کی ہے؟ آخر کار میرے حقیقی جذبات کی فتح ہوئی' اور آنکھیں کھل گئیں۔ شمع کے گرد پروانوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ کوئی دم توڑ رہا تھا۔ کوئی سر ہو چکا تھا' کوئی سوزش شمع سے جل کر خاکستر ہو رہا تھا۔ کوئی جان نثار کرنے کے لئے دیوانہ وار کبھی شیشہ سے اور کبھی شمعدان سے سر ٹکرا رہا تھا۔

یکایک میں نے سُنا شمع کہہ رہی ہے :- "نادان پروانے! عقل کے کھوٹے' خرد سے بیگانے' مجھ پر کیوں اپنی ننھی اور پیاری جان قربان کرتے ہو۔ مجھ پر کیوں مرتے ہو۔ مجھ پر فدا ہو ہو کر اپنی جان کیوں گنوا رہے ہو۔ مجھ پر کیوں دیوانے اور فریفتہ ہو رہے ہو۔ اس طرح تڑپ تڑپ کر جان دینے سے کیا حاصل؟ مجھ میں کیا خوبی ہے؟ میں نہایت گندی ہوں۔ میرا شیشہ بیحد میلا ہے۔ تم جاؤ کسی اور کو تلاش کرو۔ جو حسین بھی ہو دل فریب بھی' جاذب نظر بھی ہو' دیدہ زیب بھی' جمیل بھی ہو اور شکیل بھی ...."

پروانے نے کہا :- "شمع تجھے دھوکا ہوا۔ تجھے کسی نے فریب دیا۔ یہ تیری غلطی ہے یا سمجھ کا قصور۔ میں نہ تجھ پر فدا ہوں' اور نہ مجھے تجھ سے محبت ہے' ہاں! جسے میں ڈھونڈتا ہوں' جو میرا مطمح نظر ہے' جو میرے دل کی تمنا ہے' جو میرا مدعا ہے۔ جس کا میں عاشق ہوں اور جسے میں چاہتا ہوں' اس نور کی ایک جھلک۔ اس کی تجلی کی ایک چمک تجھ میں ہے' اسی نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں تجھ پر نثار ہو جاؤں......"

یہ سن کر شمع خاموش ہو گئی۔ میں نے عالم بے خودی میں پوچھا :-

"شمع پر قربان ہونے والے پروانو! کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہارا حقیقی محبوب کون ہے۔ جس کی تنویر جمال تم شمع کے پرسوز شعلوں میں دیکھتے ہو۔ دیکھو! میں بھی اس ستمگر کی جستجو میں کتنی دُور سے تھکا ماندہ آیا ہوں کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے پروانو!"

پروانے غریب نے میرے حال پر ترس کھایا اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولا :-

نور........ ازل........!

عالم بیخودی میں یہ جملے میری زبان سے نکل رہے تھے۔

نور ازل!........ شمع!!........ پروانہ!!!

سید محمد حسنین عالم (بھاگلپوری)

آثار علمیہ ادبیہ
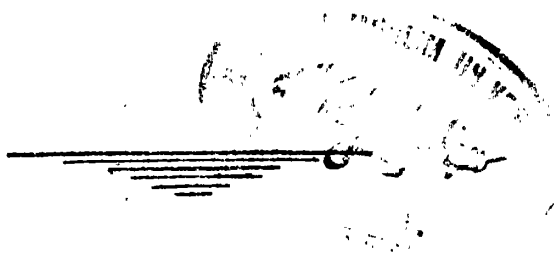
مولانا عبدالباری فرنگی محل مرحوم کا مکتوب

بنام

جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب پی، ایچ، ڈی، بار ایٹ لا

کرمی دام مجدہٗ ۔　السلام وعلیکم ۔

آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔ مجھے کرمی معظمی مسٹر مظہر الحق صاحب کے فرزند کی وفات کا علم جب ہوا تو سخت صدمہ ہوا اگر انکو مدینہ طیبہ کے واقعات کی مشغولیتوں میں تعزیت کا بھی کوئی خط نہ لکھ سکا اسکی ندامت ہے مجھے تو ان سے ملنے کا بحد اشتیاق ہے موقع نہیں ہوا کہ ارادہ پورا کروں جنکا اختیار ہے

آپ کا محبت نامہ میری نہایت مسرت کا باعث ہوا مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ مجھے اسقدر کوتاہ نظر سمجھتے ہیں کہ مجھے آپکی اس مخلصانہ تحریریت ناگواری ہوگی، اور حد اعتدال سے تجاوز کرکے خلاف واقعہ احکام کرنا شروع کرونگا تکفیر وارتداد کا حکم تو میرے یہاں سے کسی کلمہ گو پر نہیں لگایا جاتا ہے۔ تو اسکو کس وجہ سے اندیشہ ہے۔ آپنے یہ بہت اچھا کیا کہ پہلے مجھے خط لکھا اور اخبارات میں پہلے مضامین شایع نہیں کئے جس کا اثر مجھ پر کچھ نہ ہوتا اس خط کا اچھا اثر ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا آپ کا تعلق مخلصانہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے میری لغزش کو اگر آپ دفع کرنا چاہیں گے تو اس کا باعث محبت و اخلاص ہوگا اور کوئی امر نہ ہوگا، اب میں آپکے اصل مضمون کا مختصر جواب دیتا ہوں، میں نجدیوں کے خلاف بلا شبہ اسی وجہ سے ہوں کہ وہ بالکل آلۂ کار . . . . کا ہے اور یقینا جسوقت موصل پر ترک حملہ کرینگے، اور عراق آزاد ہو جائیگا تو یہی نجدی عراق پر قابض ہونا چاہینگے اور اسوقت بھی ہم ان کو معصوم سمجھیں گے مجھے اسکے یقین کرنیکے مضبوط اسباب ہیں اور بہم انکا ثبوت مجھے پہنچتا ہے جنکو میں تحریر نہیں کر سکتا مگر آپ کو کامل ثبوت اسکا دے سکتا ہوں صرف اسوجہ سے نہیں کہ وہ تنخواہ دار تھے اور انکو تنخواہ کیوں دی جاتی تھی انکی ابتدائی تاریخ سے لیکر آج تک کوئی لڑائی غیر مسلم سے نہیں ہوئی نہ وہ اس کا ارادہ رکھتے ہیں ان کی کتاب فصل الخطاب ملاحظہ ہو وہ عرب کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں نحن لانقاتل غیرھم ہم سوائے ان کے کسی سے مقابلہ نہیں کرتے اور انہوں نے یہ کرکے دکھا دیا ہے

میرا یقین ہے کہ حجاز پر اسوقت غیر مسلم بواسطہ قابض ہے چاہے بصورت علی ہو یا بصورت ابن سعود مجھے اس کا اخراج ضروری معلوم ہوتا ہے میرے نزدیک ان دونوں کی مدد حکومت . . . نہ کی مدد ہے میں اپنی رائے . . . ایک ہی رکھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جزیرۃ العرب فی . . . . بیانات منحصر ہے . . . . کی تباہی پر اور میں نے اپنا خیال لکھنؤ کے جلسہ میں ظاہر کر دیا ہے۔ جبا کی تعیین نہیں کر سکتا ہوں، وہ کیا راہ عمل ہو جس . . . دشمن اسلام کا استیصال ہو یہ تو میری مستقل رائے ہے اب یہ کہ موجودہ حالت میں ارض مقدس کو انہیں کیا کیا جائے، میری خواہش، وہی کو ملاقات میں . . . گا

مقصد ہے کہ اس پر کسی کی حکومت نہو یا کہ جمہوری حکومت ہو، شریف علی ابن سعود دونوں الگ ہوجائیں، ابن سعود اپنے وعدوں پر قائم ہیں تو ان کو بلا تکلف اپنے حملے موقوف کرکے نجد واپس جانا چاہیئے اور شریف علی کی معزولی کی پوری کوشش کرنا چاہیئے۔ میں مؤتمر اسلامی کو ایک وہمی سمجھتا ہوں، میرے روبرو دو گروہ ہیں ایک کہتا ہے کہ ابن سعود کو ہم نہیں چاہتے مگر دل سے انہیں کو چاہتے ہیں، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہم شریف علی کو نہیں چاہتے مگر وہ اسی کو چاہتے ہیں میں دونوں سے چاہتا ہوں کہ متفقہ صورت نکالیں اس کی امکانی کوشش کی گئی، جو خدا نے چاہا موقع پر تمام لوگوں کے روبرو ظاہر کی جائیگی۔ میں ابن سعود کی قبہ شکنی کا تدارک مشکل نہیں سمجھتا نہ وہ باعث میری منافرت کا ہے میں نے جو واقعات متبرہ اس کے فضائع کے سنے ہیں اور جو کچھ انہوں نے وعدہ کیا ہے اسکے اصلی الفاظ دیکھے ہیں اور جس طرح غلط پروپگنڈا کیا جارہا ہے اس کا مجھے علم ہے اور جو تار ابن سعود کے آرہے ہیں ان کا منبع وماخذ مجھے معلوم ہوگیا ہے اسواسطے میں نہ ان کے مشتہرہ وعدے پر اعتبار کرتا ہوں نہ واقعات کا فوراً انکار کرتا ہوں وہ بدؤں کا بادشاہ ہے اس نے سوائے توریہ کے کذب نہیں کیا نہ وہ جھوٹا ہے مگر جو کچھ اسکی طرف ملمع سازی سے کہا جارہا ہے وہ جھوٹ ہے اور وہ ابن سعود کی دشمنی ہے جس کو میں ابتدائے وقت سے برابر ظاہر کرتا چلا آرہا ہوں۔

میں شریف علی یا ابن سعود کسی کے تاروں پر اعتبار نہیں کرتا مگر جو تار مدینہ طیبہ سے آئے ہیں ان میں ایک خصوصیت ہے کہ اکثر معارلیف کے ہوتے ہیں مثلاً میرے نام جو تار آیا ہے اس میں حسن عبدالجواد اور دیگر میرے ملاقاتیوں کے نام ہیں مجھے حیرت ہے کہ شریف علی کو یہ کیسے دنیا بھر کے معارلیف کا علم ہوگیا پھر بھی عرض ہے کہ اگر یہ اخبار احتمال ورق نہیں رکھتے تو کذب کے یقین پر کیا اور ہیں۔

ایک غلط فہمی دفع کرنا اشد ضروری ہے وہ یہ کہ لکھنؤ میں جو کچھ ہورہا ہے وہ صرف مدینہ کی خبر وحشت اثر پر موقوف نہیں پہلے سے مستقل کاروائی کرنے کا ارادہ مصمم تھا اتفاقاً یہ واقعہ بھی پیش ہوگیا مستقل کاروائی اس وجہ سے کرنے کا ارادہ تھا کہ حجاج معتبرین سے معلوم ہوگیا تھا کہ مظالم ابن سعود حد سے متجاوز ہوگئے ہیں بعض ایسے ہیں کہ ان پر وقت خلافت کا بھی اتفاق ہوگا۔ ان مظالم کے بعد جن میں سے ایک قبہ شکنی بھی ہے کسی سنگدل کو بھی ابن سعود سے رغبت نہیں رہ سکتی ہے اب شریف کے خاندان کے مظالم سے مجھے تشفی نہیں دے سکتے، ہاں وہ مظالم جو ابن سعود سے سرزد ہوئے ہیں ان کی تکذیب ہوجائے تو مجھے تشفی ہوسکتی ہے جسے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا کہ بھائی شوکت علی محمد علی کے ساتھ ایمانداری سے اشتراک عمل رکھوں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بہت کچھ ملک میں ابن سعود کے خلاف غلط پروپگنڈا پھیل چکا ہے اور برابر بلالحاظ صدق وکذب پروپگنڈا ہورہا ہے آپ فرمایئے کہ کچھ اہل نجد اور ان کے بہی خواہوں پر بھی اتحاد قائم رکھنے کا حق ہے اور اگر آپ لوگ قوی ایمان رکھتے ہیں تو ہم ایسے ناقصوں کی ضعیف سے ضعیف ایمان کی کچھ وقعت ہونا چاہیئے۔ ہم نے ہر طرح چاہا کہ ہم کو تشفی دلادیجائے، یہاں تک حال میں تار دیا کہ براہ کرم تھوڑی دیر کیلئے لکھنؤ چلے آیئے اور آج بھی ڈاکٹر کچھلو صاحب کا اور میرا مشورہ ہے کہ پیشتر قبل لکھنؤ میں جلسہ کرنے کے آپ حضرات سے استدعا کی جائے کہ قدم رنجہ فرماکر یا ہم لوگوں کو طلب کرکے ہمارے شکوک رفع کردیجیے۔ ہم بخدا نہ انگریزوں کے دوست ہیں نہ تہذیب کا پروپگنڈا ہے اور نہ ہم کو ذاتی عناد یا کسی کے ترفع سے کوئی برا خیال ہے، مگر ہم کو بھی خدا کے یہاں جانا ہے، مروت ہماری ہم کو خدا کے ذلیل نہ کرے، صرف دیانت سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اب بھی آپ ہماری مدد کیجیے اور تشریف لایئے ہمارے واقعات سنیئے اور ہم کو صحیح راہ بتلایئے ہم حاضر ہیں۔

اس کے علاوہ جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ ہم اپنے ناکارہ اور نااہل ہونے کا اعتراف کرتے ہیں اور آپ سے طالب دعا ہیں، خدا ایک بھائی کی دعا دوسرے کے حق میں پس پشت قبول کرتا ہے، آپ ہمارے لئے دعا کیجیے کہ ہم سے کوئی دین کا کام ہوجائے۔ علاوہ دیگر امور کے متعلق عرض ہے ؎

گفتگو آئین درویشی نبود ❊ ورنہ باتو ماجراہا داشتیم

فقیر محمد عبدالباری عفا اللہ عنہ

ادبیات

تجلیاتِ نجم

از جناب نجم ندوی، بی اے

ہر قدم پر وہ نیا فتنہ اٹھاتے آئے
دل جو پایا اُسے مٹی میں ملاتے آئے

دل چلے جاتے ہیں ہر سمت سرِ راہ گذر
وہ جدھر آئے اُدھر آگ لگاتے آئے

آتے تھے بارگہِ پیرِ خرابات سے ہم
راستہ کعبے کا زاہد کو بتاتے آئے

بن گیا ہے دلِ بیتاب ہر اک ذرۂ قبر
آپ آئے بھی تو اک حشر اٹھاتے آئے

محفلِ حشر کو سمجھے کوئی صحرائے جنوں
اُن کے دیوانے کہاں خاک اڑاتے آئے

اُٹھ کر اس بزم سے آنا ہمیں دشوار ہوا
راستے بھر دلِ مضطر کو مناتے آئے

دلِ پُر سوز کو چھوڑ آئے ہیں جلنے کے لئے
ہم بھی اس بزم میں اک شمع جلاتے آئے

اُٹھے اس در سے مگر دل کو مٹا کر اُٹھے
آئے تو اس کو ٹھکانے سے لگاتے آئے

دیکھ آئے نجم ذرا نقشِ کفِ پا کی بہار
وہ سرِ راہ گذر پھول کھلاتے آئے

موجِ تغزّل

از جناب سید نعیم الرحمٰن صاحب صبا کاکوی

ہجر کی شب کیوں الٰہی مختصر ہوتی نہیں
کیوں مری فریادِ ممنونِ اثر ہوتی نہیں

اشکِ غم میں کچھ کمی اے چارہ گر ہوتی نہیں
آستیں بھی اب رفیقِ چشمِ تر ہوتی نہیں

دل [illegible] باقی اگر ہوتی نہیں
یار کی تصویر ہرگز جلوہ گر ہوتی نہیں

روئے روشن کا تصور اور شب غم کا یہ جوش　　جلوہ گر خورشید ہے لیکن سحر ہوتی نہیں

دیرسے مقتل میں مرنے کے لئے تیار ہوں　　میرے قاتل تیغ کیوں زیب کمر ہوتی نہیں

عارض روشن پہ ہے بکھری ہوئی زلف سیاہ　　کون کہتا ہے بہم شام و سحر ہوتی نہیں

رند دریا نوش ہوں ساقی بھی اب مجھ سے ہے تنگ　　خم ہوا خالی زباں تک اپنی تر ہوتی نہیں

الفتِ صیاد میں ہوں میں گرفتار قفس　　انتہا ہے آرزوئے بال و پر ہوتی نہیں

محو ہو جاتے ہیں بسمل حسنِ قاتل دیکھ کر　　کب چلا خنجر گلے پر کچھ خبر ہوتی نہیں

کاش ہو جاؤں کبھی گلشن بداماں اے صبا
جلوہ یک گل سے تسکیں نظر ہوتی نہیں

رنگ شفق

از جناب مولانا ابو احمد سید عبد الوہاب صاحب شفق کوپل گیا

ساقی تری فرقت میں اک خواب ہے بیداری　　وہ جام پلا جس کی مستی میں ہو ہشیاری

جب ضبط کی طاقت تھی دل راز کا مدفن تھا　　وہ صبر کہاں باقی جب جذب ہوا اظہار

اس محفلِ ماتم کو ہم لوگ نہیں کہتے　　جو غم سے کے ہو پردے میں ایک عیش کی تیاری

جو شیشۂ صافی میں پہچان گیا خود کو　　سو ہوش پہ بھاری ہے اس دل کی سرشاری

الفت کی شعاعوں سے معمور ہو جب سینہ　　اس خاک کے پتلے کو نوری کہو یا ناری

رحمت کے کئی قطرے تربت پہ گرا دینا　　جب یاد نہیں آئے عاشق کی وفاداری

غیروں کی نہ دینے جب مایوس ہوا طالب　　طاقت تھی مجبوری، چارہ ہوئی لاچاری

سچوں کی صفت مجکو ہے یاد بس اتنی سی　　اپنوں سے وفاداری غیروں سے رواداری

ناصح کو شفق! میرے یہ بات سے کیا نسبت
ہے عشق مجھے پیارا اور جان مجھے پیاری

رباعیات

از جناب افضل صاحب پھپھروی

آنکھوں میں چھلکتی ہے جوانی ساقی
بشرے سے ٹپکتی ہے جوانی ساقی
انگڑائی سے ٹپکتی پندار و غرور
خود حسن کو تکتی ہے جوانی ساقی

بھیگی ہوئی برسات کی رات پیاری ہے
اک کیف کا ہر سمت سماں طاری ہے
آجائے بس ایسے میں مرا جان بہار
اک پل بھی جدائی میں بہت بھاری ہے

جب حسن کا جادو نہیں جاتا ہے
تسکین کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے
دل سینہ میں کیا کیا نہ تڑپتا ہوگا
یوں آنکھ میں آنسو جو مچل جاتا ہے

تہذیب و تمدن کا اثر جانے دو
فطرت کو ذرا اب کے ابھر جانے دو
کھل جائے گا دو چار ہی داؤں میں بھرم
خول جو ریا کا ہے اتر جانے دو

آنکھوں سے چھلکتی ہے جوانی ساقی
چہرے پہ دمکتی ہے جوانی ساقی
آواز میں ہے شیشہ و ساغر کی کھنک
رگ رگ سے ٹپکتی ہے جوانی ساقی

صرف موہنی سے

از جناب عنایت الرحمٰن صاحب عنایت منصف رانچی

نہ ستاؤ تمہیں خدا کی قسم
آؤ آؤ تمہیں خدا کی قسم

خون کیوں آرزو کا کرتی ہو
پان کھاؤ تمہیں خدا کی قسم

تم اٹھو گی تو درد اٹھے گا
بیٹھ جاؤ تمہیں خدا کی قسم

میں لپٹ کر تمہیں مناؤں گا
روٹھ جاؤ تمہیں خدا کی قسم

زخم پھر دل کے بھرتے جاتے ہیں
مسکراؤ تمہیں خدا کی قسم

شربت وصل یا سم قاتل
کچھ پلاؤ تمہیں خدا کی قسم

اپنے موہن کو پریم کی بنسری
پھر سناؤ تمہیں خدا کی قسم

"وطن سے دور"

(از جناب جوہر فریادی)

دور تجھ سے اے وطن کی سرزمیں جاتا ہوں میں
جانے کیوں تیرے چمن زاروں سے گھبراتا ہوں میں

تیرے پھولوں میں نہ پائی میں نے خوشبوئے وفا
تجھ سے چھٹنا پھر بھی ہے میرے لیے صبر آزما

اے وطن شاید تجھے آئے کبھی میرا خیال
تیرے سایہ میں ہیں میری زندگی کے ماہ و سال

کچھ دنوں کے واسطے ہو انتظار تو اندوہگیں!
ہو نہ جائے تم کہیں غم کے پسینے سے جبیں

جانتا ہوں مجھکو ڈھونڈے گی تری فصل بہار
باغ کی رنگینیاں پوچھیں گی مجھکو بار بار

مسکراتے پھول دہرائیں گے میرے نام کو
تذکرے احباب فرمائیں گے اکثر شام کو

چٹکیاں لیگی دلوں میں مرے نغموں کی مٹھاس
شاید اب تالاب کی ساری فضا ہوگی اداس

غم کی ماری کو میرا دھیان آئے گا ضرور
کیا کروں خود ہو رہا ہوں دامنِ رحمت سے دور

چھٹ رہا ہوں اس کی آغوشِ محبت سے مگر
یاد اس کی ساتھ ہوگی اور دعائیں راہبر

بدگماں ہونا نہ میں رسمِ وفا سے دور ہوں
چھوڑ کر تجھکو نہ جاتا اے وطن مجبور ہوں

سرِ راہ ایک دوشیزہ کو مشغولِ کار دیکھکر

از:۔ جناب ایم ذکی اختر ہاشمی

یہ لڑکی ہے ابھی کمسن پیاری اس کی صورت ہے
پریشاں ہے یہ غربت سے پریشاں اس کی قسمت ہے

حسینانِ جہاں میں فرد ہے سیمیں بدن اس کا
مگر فاقہ کشی سے ہے فزوں رنج و محن اس کا

نہیں دیکھی ہو جس نے دیکھ لے یہ موہنی صورت
یہی ہے حسن کی دیوی یہی ہے حسن کی مورت

ابھی اس کمسنی میں تو غضب اس کی مشقت ہے
بلا اس کی ریاضت ہے قیامت اس کی محنت ہے

کھڑی ہے دھوپ میں دل سے بھلائے اپنی محبت کو
مجھے حیرت سی ہے اب دیکھکر اس کی مشقت کو

نہ پوچھو حال گرمی کا لپکتی تھی زمیں اس دن
چھپے تھے فرطِ شدت سے مکانوں میں مکیں اس دن

یونہی اس کی بسر ہوتی ہے ہر دن عرق ریزی میں
تشکر اپنا یہ بھرتی ہے یہ مشکل اس غریبی میں